ابابیل
محمد شعیب
URDU BOOKS POINT
www.urdubookspoint.com

محمد شعیب

انتساب:

اپنی فیملی کے نام جن کے بنا میں کچھ نہیں
جن کی دعائیں میرے لئے سب کچھ ہیں
جن کا ساتھ مجھے جہاں بھر کی نعمتوں سے زیادہ عزیز ہے

حرفِ آغاز

السلام علیکم!

سب سے پہلے تو اپنے تمام قارئین کا مشکور ہوں جنہوں نے میرے پچھلے ناول ''محرم نہ ملا کہیں'' کو اپنی پسندیدگی سے نوازا۔ جب وہ ناول میں تحریر کر رہا تھا تو مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنا سراہا جائے گا لیکن کہتے ہیں ناں قاری کی پسند ایک لکھاری سے الگ ہوتی ہے کیونکہ لکھاری فقط لکھتا ہے مگر ایک قاری اس تحریر کو پرکھتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ سب نے میرے پچھلے ناول کو نہ صرف اچھے پرکھا بلکہ اپنی پسند سے بھی ہمکنار کیا۔

اب بات ہو جائے زیرِ مطالعہ ناول ''ابابیل'' کی۔ اس ناول کے ٹائٹل کے لئے سب سے پہلے میں محترم حسن علی کا مشکور ہوں۔ جن سے مشاورت کے بعد ہی میں اس ناول کا نام چننے میں کامیاب ہو سکا۔

''ابابیل'' نام سے تو شاید کوئی تاریخی ناول لگتا ہے لیکن یہ اپنے اندر تاریخ کے ساتھ ساتھ کچھ ایسے زندگی کے حقائق کو بھی سمیٹے ہوئے ہے جنہیں انسان چھپانے کی کوشش کرتا ہے مگر چھپا نہیں سکتا۔ ''ابابیل'' لکھتے ہوئے میں نے خود کرداروں کو اپنے اردگرد چلتے پھرتے محسوس کیا ہے۔ کبھی ایسا نہیں لگا کہ میں کوئی افسانوی کردار لکھ رہا ہوں۔ کرداروں کی باتیں میری کانوں میں گونجتی رہی اور میں لکھتا رہا اور اب آپ کے سامنے پیشِ خدمت ہے۔

اس ناول کے تھیم کی بات کی جائے تو یہ فیصلہ میں نے آپ پر چھوڑا ہے۔ آپ کو خود اس ناول کے مرکز کو جاننا ہو گا۔ اس پوائنٹ کو کریدنا ہو گا جس پر یہ ناول منحصر کرتا ہے کیونکہ اکثر باتیں اگر شروع میں ہی کہہ دی جائیں تو وہ اپنا تاثر کھو دیتی ہیں۔ جو لذت، جستجو میں ہے وہ بیٹھے بٹھائے جاننے میں نہیں۔

امید ہے پچھلے ناول کی طرح آپ اس ناول کو بھی اپنی پسندیدگی سے نوازیں گے بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ آپ کی طرف سے ملنے والی رائے کا مجھے انتظار رہے گا۔ سب سے آخر میں ایک بار پھر میں حسن علی بھائی کا مشکور ہوں۔ جن کے توسط سے یہ ناول کتاب گھر kitaabghar.com پر شائع ہو رہا ہے۔ ناول پڑھ کر اپنی رائے کا اظہار ضرور دیجیے گا۔ آپ کی محبتوں اور عنایتوں کا مقروض۔

محمد شعیب

۲۱ مئی ۲۰۱۷

مَن تَشَآء

؎ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

صبح کی پہلی کرن چاند کی روشنی کو چیرتے ہوئے گاؤں کی دہلیز پر داخل ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں سورج نے پورے گاؤں کو اپنی آغوش میں لے لینا تھا مگر اسے تو اسی اندھیرے میں دبے پاؤں اس گاؤں کی حدود سے بہت دور نکلنا تھا۔ اتنی دور کہ گاؤں کی پرچھائی تو کیا اس کا نام بھی سماعت تک نہ پہنچے۔ وہ لمحے جو اس گاؤں کا وقار تھا۔ اِسے انہی سے دور جانا تھا۔ سفید رنگ کا بڑا سا جبہ پہنے اس نے بڑی ہی احتیاط سے مرکزی عبادت خانے میں پاؤں رکھا۔ پاؤں رکھنے کی دیر تھی کہ اسے اپنی سانسوں کی بھی قیمت چکانی پڑی۔ ایک سانس کے بعد کئی ثانیے اسے بنا سانس کے گزارنے تھے۔ بس یہی صورت تھی اُس کی جان بچانے کی۔ اس نے اپنے دائیں دیکھا، دس آدمیوں کا چھوٹا سا لشکر سوئے ہوئے پایا۔ بائیں دیکھا تو اس سے دوگنا لشکر پایا۔ سب کے ہاتھوں میں ڈنڈے اور دوسرے دستی ہتھیار تھے۔ انجانے میں کی گئی ایک غلطی عمر بھر کی سزا بن سکتی تھی یا شاید موت کا پروانہ۔۔۔

تھوک نگلتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا تو اس کا چہرہ خفیف سا کِھل اٹھا۔ پندرہ سال کا یہ لڑکا اب اپنے سامنے چند گز کے فاصلے پر لکڑی کے بنے جھولے کو دیکھ رہا تھا۔

ماحول میں خاموشی تھی۔ سانسوں کی روانی اس خاموشی کا قتل کرنے پر تلی ہوئی تھی تبھی اس نے اپنے سانسوں کو چند ثانیوں کے لئے روک لیا۔ اب فقط نوے لمحات تھے۔ انہی لمحات میں اسے اپنا کام سرانجام دینا ہے۔

پہلا قدم اٹھایا تو جان ہتھیلی پر آ گئی۔ پہلے ہی آدمی نے ایک جھرجھری لی۔ وہ بری طرح سہا مگر قدم نہ رکے۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ اتنا آگے کہ اس شیر خوار بچے اور اس کے درمیان فاصلہ ایک گز رہ گیا۔ سانسوں کو تھامنا مشکل ہوا تو اس نے دونوں ہاتھوں کو منہ کے آگے رکھ کر سانس لیا۔

"تیرے یہاں رہنے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔۔" اس نے دل میں سوچا اور عجلت کے ساتھ اپنی بغل میں دبائے پوٹلی میں سے ایک پڑیا نکالی۔ اس میں کوئی سفوف تھا۔ اس نے وہ سفوف اس شیر خوار بچہ کی ناک کے پاس کیا تو جلد ہی اس سفوف کی بُو اس شیر خوار بچے کے نتھنوں کے ذریعے جسم میں چلی گئی۔ چند لمحے یونہی گزرے اور پھر اس پندرہ سالہ لڑکے نے وہ سفوف کی پڑیا پیچھے ہٹائی اور زمین پر بڑی

ہی احتیاط کے ساتھ رکھ دی۔

''اب اگلا قدم۔۔۔'' اس نے سوچا اور پلٹ کر دائیں بائیں دیکھا

''المدد۔۔۔'' اس نے دل پر داہناں ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھیں مونديں اور دل ہی دل میں دعا کی۔

پھر پلٹ کر اس بچے کو پہلی بار بغور دیکھا۔ ننھا سا۔۔۔ فرشتہ صفت بچہ۔۔۔ جس نے ابھی تک اپنی زندگی کے بیس دن بھی مکمل نہیں کئے تھے۔ اس پندرہ سالہ لڑکے کے ارادوں سے بے نیاز خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ ایک باریک سا سفید رنگ کا کپڑا جو اس کے جسم کے گرد لپیٹا گیا تھا۔ اس کے دودھیا رنگ پر چاند کی مانند چمک رہا تھا۔ ہلکے ہلکے باریک سے ایک دو بال اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے مستقبل میں وہ حسین وجمیل زلفوں کا مالک ہوگا۔

اس لڑکے نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اس فرشتہ صفت بچے کو اٹھایا تو اس شیر خوار کے منہ سے ذرا ر بھی رونے کی آواز بلند نہ ہوئی۔ شاید وہ اس سفوف کا اثر تھا۔ جانے اس کے حسن کا اثر تھا یا بات کچھ اور تھی۔ اس لڑکے کے ہونٹ خود بخود شیر خوار بچے کی پیشانی تک بڑھنے لگے۔ بوسہ لینے کی دیر تھی کہ اس کے ارادوں میں ایک زلزلہ آیا۔ شاید ننھی جان خاموش زبان سے سوال کر رہی تھی۔

''میرے ساتھ ایسا سلوک مت کرو۔۔۔ مجھے میرے اپنوں سے دور مت لے جاؤ۔۔۔'' وہ خاموش رہا

''آخر ان بیس دنوں میں میں نے تمہارا کیا بگاڑ دیا جو تم نے میرے خلاف یہ منصوبہ بنایا۔۔۔''

''میں ایک ننھی سی جان ہوں۔ نہ بولنا مجھے آتا ہے، نہ چلنے کے قابل ہوں، کسی کام میں بھلا کیا بگاڑ سکتا ہوں؟''

''مجھ پر یہ ظلم مت کرو۔۔۔ مجھے یہیں رہنے دو۔۔۔ جہاں سے اٹھایا وہیں لیٹا دو۔۔۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔'' اس بچے کی معصوم اور خاموش فریاد اس لڑکے کی سماعت میں ایک بہت بڑا بھونچال لے آئی مگر ارادے تو جیسے پہاڑ تھے۔ متحرک ہو کر رہ گئے۔ شاید زلزلہ اتنا شدید نہ تھا جو ان پہاڑ جیسے ارادوں کو روئی کے گالوں کی طرح ہوا میں اڑا دیتے۔

''مجھے معاف کر دینا۔۔۔'' اس کی آنکھ سے ایک آنسو بہہ نکلا

''ننھے فرشتے۔۔۔ میں تمہارا مجرم ہوں۔۔۔ مجھے معاف کر دینا۔۔۔'' تشنگی ابھی باقی تھی۔ تبھی دوبارہ لب اس کی پیشانی پر نقش کر دیئے

''تمہاری منزل یہ نہیں ہے اور میں کبھی بننے بھی نہیں دوں گا۔۔۔'' لبوں کو ہٹاتے ہوئے اس نے اپنے جذبات کو ضبط کیا اور پلٹ کر دوبارہ دربانوں کو دیکھا جو ابھی تک اوندھے منہ سو رہے تھے۔ اس نے بچے کو اپنے جبے کے اگلے حصے میں بنے ایک تھیلی نما حصہ میں ڈالا۔ جس میں وہ با آسانی سما گیا۔ شاید اس نے یہ حصہ اسی دن کے لئے اور اسی کام کو سر انجام دینے کے لئے بنوایا تھا کیونکہ جو وہ کام کرنے جا رہا تھا وہ آسان نہیں تھا۔

اس نے سب دربانوں سے بچ بچاتے عبادت خانے سے باہر قدم رکھا۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق چل رہا تھا۔ مرکزی

عبادت خانے سے نکلنے کے بعد سامنے ایک سیدھی راہ داری تھی۔ جو تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مضبوط قدموں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ پیچھے سے وار کا خطرہ تھا۔ تبھی اپنی سماعت کو دربانوں کی چاپ پر گاڑھے رکھا۔ احتیاط برتتے ہوئے پہلے ہی وہ جوتے اتار کر عبادت خانے کی طرف بڑھا تھا۔ اس لئے اس کے قدموں کی چاپ نہ ہونے کے برابر تھی مگر کہتے ہیں ناں انسان خطا کا پتلا ہے۔ ہر قدم کے ساتھ وہ کوئی نہ کوئی خطا کر ہی جاتا ہے۔ اس لڑکے ساتھ بھی یہی ہونے جا رہا تھا۔

وہ اب راہداری کو عبور کر چکا تھا۔ سامنے بڑا سا دیو ہیکل دروازہ تھا۔ جسے پار کرنا آسان نہیں تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو دو دربان جدید ہتھیار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے ہوتے ہوئے ایک مکھی بھی اس عبادت خانے سے نہ تو باہر نکل سکتی تھی اور نہ ہی اندر آسکتی تھی اور یہ تو جیتا جاگتا انسان تھا۔ جہاں تک عبادت خانے میں داخل ہونے کی بات تھی، یہ کام وہ پچھلی رات ہی سرانجام دے چکا تھا۔ جب تمام گاؤں والے عبادت کے لئے آئے تھے تب وہ آیا مگر ان کے ساتھ جانے سے اجتناب کیا اور خود کو ایک درخت کی اوٹ میں چھپا لیا۔ ساری رات موقع کا انتظار کیا اور موقع ملتے ہی بچے کو اٹھا لایا۔ اب مسئلہ باہر نکلنے کا تھا۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھا تو اندھیرا چھٹتے ہوئے محسوس ہوا۔ موت قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ سورج کی پہلی کرن طلوع ہونے سے پہلے اگر وہ اس عبادت خانے دور نہ گیا تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یا تو قید کر دیا جاتا یا پھر سولی پر چڑھا دیا جاتا اور یہ بچہ اپنی اصل منزل پر پہنچ جاتا۔ جو وہ قطعاً نہیں چاہتا تھا۔ اس نے درخت پر چڑھنا شروع کیا جو دیوار کے ساتھ ساتھ اپنا سینہ تانے کھڑا تھا۔ سب دربانوں کی نظریں سامنے مرکوز تھیں۔ وہ لڑکا بڑی مہارت کے ساتھ درخت پر چڑھا۔ چڑھتے ہوئے اس نے ایک دوبار شیر خوار بچے کو چھوا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ خود تکلیف سہہ کر اس بچے کو رگڑ سے بچا رہا ہو۔

دیوار کے قریب والی ٹہنی پر پہنچ کر اس نے اپنا دائیاں پاؤں دیوار پر رکھا۔ اب وہ عبادت خانے کے حصار سے تقریباً نکل چکا تھا۔ اس نے پلٹ کر دوبارہ پیچھے دیکھا۔

"مجھے معاف کر دینا میں اس بچے کو یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے جا رہا ہوں۔۔۔" اس نے پختہ لہجے میں دل میں سوچا اور ایک جست لگاتے ہوئے باہر کی جانب کودا۔ سناٹے میں یہ آواز ایسی گونجی کہ دربان بھی ہوشیار ہو گئے۔ آنکھیں پھاڑ کر انہوں نے آواز کے ماخذ کو تراشنے کی کوشش کی۔ ایک دوسرے سے سوال کئے مگر کوئی خاطر خواہ جواب موصول نہ ہوا۔ سورج کی پہلی کرن دُور وادیوں میں کہیں طلوع ہو چکی تھی اور برق رفتاری سے اس گاؤں کا رخ کر رہی تھی کہ اندر عبادت خانے میں قہرام مچ گیا۔ تمام آدمی دوڑتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھے۔

"دیوتا اپنے جھولے میں نہیں ہے۔ دیوتا اپنے جھولے میں نہیں ہے۔ کوئی ہمارے دیوتا کو لے گیا۔۔" دو جملے تھے جو ہر ایک کی زبان سے جاری تھی۔ یہ سنتے ہی دربان کی آنکھیں شعلہ جنوں ہو گئیں۔ ان کا ذہن فوراً اُس آواز کی طرف گیا جو کچھ لمحے پہلے ان کی سماعت

سے ٹکرائی تھی۔ بیرونی دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھولا گیا۔ یہ آواز اُس لڑکے کی سماعت سے بھی ٹکرائی تھی جو اس شیر خوار کو اپنے جبے میں رکھے کہیں لے جا رہا تھا۔

"یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟ مجھے احتیاط سے کودنا چاہئے تھا۔" اس نے اپنے آپ کو کوسا لیکن وقت بیت چکا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ انسان خواہ حالات کو اپنے مطابق ڈھالنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کر لے مگر ہوتا وہی ہے جو لکھ دیا گیا۔ ایک منشا انسان کی ہوتا ہے اور دوسری خدا کی۔ انسان اپنی منشا کے مطابق وقت کو اپنے سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے اور وقت اپنے آپ کو خدا کی منشا کے مطابق سانچے میں ڈھالے رکھتا ہے۔ اب انسان پر منحصر ہے کہ اپنی منشا کے پیچھے بھاگتے ہوئے جو کچھ ہے اسے بھی کھو بیٹھے یا پھر جو خدا نے اُس کے لئے لکھ دیا ہے اسے جی جان سے قبول کرے۔

"اے دنیا کے دیوتا! میری منشا کو رد نہ کرنا۔" اس نے ہاتھ جوڑ کر دعا کی تھی۔ جانے قبول ہوئی بھی تھی یا نہیں؟ مگر اس کے مضمم ارادے اس بات کا ثبوت تھے کہ وہ کسی بھی قیمت پر اپنے ارادوں کو حقیقت کا رنگ دے کر ہی دم لے گا۔ اس نے کئی لمحوں تک اپنے آپ کو دو پیڑوں کی اوٹ میں چھپائے رکھا۔ جہاں سے وہ عبادت خانے کے وسط سے نکلتے ہوئے پادریوں اور دربانوں کو باآسانی دیکھ سکتا تھا مگر وہ اسے دیکھنے سے قاصر تھے۔ آخر اتنے دنوں سے وہ ایسی ہی جگہ کا متلاشی تھا جو نازک حالات میں اس کو حفاظت فراہم کرتی۔

"دیوتا کو اغوا کرنے والے کو ہم کبھی معاف نہیں کریں گے۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ دیوتا کو جس نے بھی عبادت خانے سے اغوا کیا، اسے دیکھتے ہی موت کی گھاٹ اتار دیا جائے مگر یاد رہے دیوتا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔" درخت کی اوٹ میں اسے اپنی موت کے جاری ہونے کا حکم نامہ سنائی دیا۔ اس کی سانسیں اکھڑتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ اس نے ایک نظر بچے کی طرف دیکھا جو ابھی تک اُس سفوف کے زیر اثر تھا۔ سارے حالات سے بے خبر وہ اس لڑکے کے رحم و کرم پر تھا۔ جانے اس کے ارادے کیا تھے؟ کیوں وہ اِس کو عبادت خانے سے اٹھا کر لایا تھا؟ کہاں لے جانا چاہتا تھا؟ کیا رشتہ تھا اِس کا اس شیر خوار سے؟ ان سب سوالوں سے بے خبر وہ آنکھیں موندیں خوابِ خرگوش کی نیند سوتا رہا۔

کچھ دیر کے بعد جب قدموں کی چاپ سنائی دینا بند ہوئی تو اس نے درخت کی چھال کی اوٹ سے باہر جھانکا۔ وہاں دور سے دھول اٹھتی دیکھائی دے رہی تھی۔ شاید وہ اسے ڈھونڈنے کے لئے آبادی کی طرف بڑھے تھے۔ یہی وقت تھا، جب اسے باہر نکل کر اپنی اگلی منزل کی طرف بڑھنا تھا۔ وہ دھیرے سے باہر نکلا اور چاروں اطراف نگاہ دوڑائی۔ کوئی آدم زاد نظر نہ آیا البتہ عبادت خانے کے مرکزی کمرے سے گھنٹیوں کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ جو کہ لوگوں کو بری خبر سنانے کے لئے بجائی جاتی تھیں۔ وقت سمٹتا جا رہا تھا۔ اگر وہ مزید وقت ضائع کرتا تو سارا گاؤں اس کا دشمن بن کر اسے ڈھونڈنے لگتا اور یوں گاؤں کی حدود سے نکلنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ اس نے مشرق کی جانب بھاگنا شروع کیا۔ مشرق کی طرف ایک کھائی تھی جو کہ اس گاؤں کی آخری حد سمجھی جاتی تھی۔ اس کھائی کے دوسری

طرف دشمن گاؤں تھا۔ وہ اب اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بھاگنے سے اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ راستے کے کانٹے ان چھالوں کو بری طرح زخمی کر رہے تھے مگر اسے پرواہ کب تھی؟ وہ تو اس گاؤں کی حدود سے نکلنا چاہتا تھا۔

سورج کی پہلی کرن نے بھی اس کے چہرے کا رخ کیا مگر وہ اپنا چہرہ کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تبھی سر کو ڈھانپتا کپڑا، ذرا آگے کو سرکایا اور اپنے چہرے کو بھی چھپا لیا۔ انسان پہلے عمل کرتا ہے اور بعد میں اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اُس عمل کو چھپانا ہی مقصود ہوتا ہے تو وہ عمل ہی کیوں کیا جائے؟ جو بعد میں بدنامی کا باعث بنے۔ لیکن اسے بدنامی سے زیادہ اس بچے کی فکر تھی۔ جان جاتی ہے تو جائے مگر اسے تو اس بچے کو ان لوگوں سے دور لے جانا تھا۔ اتنی دور کہ گاؤں کا عکس بھی اس بچے پر نہ پڑے۔

"وہ دیکھو۔۔۔!!" ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس آواز کو سنتے ہی اس نے پہلے سے زیادہ تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ پتھریلی زمین پر اس کے قدم ڈگمگائے ضرور تھے مگر وہ رکا نہیں۔

"اُس کے پاس ہے ہمارا دیوتا۔۔۔" دوسرا جملہ سنتے ہی اس کے حواس بپھرے ہوئے سمندر کی طرح بکھرنے لگے تھے۔ قدموں کی چال بھی لڑکھڑانے لگی تھی۔ سانسیں بھی بری طرح اکھڑنے لگیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب اگر وہ کچھ لمحے مزید بھاگا تو زمین بوس ہو جائے گا لیکن یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں تھا اور نہ ہی ذرا سا ٹھہر کر سانس کو بحال کرنے کا۔ وہ لوگ اس کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جوان اور مشق یافتہ تھے جبکہ یہ اناڑی تھا۔ بہت جلد وہ اس کے قریب پہنچ جاتے اور اس سے اپنا دیوتا بازیاب کر لیتے مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ ایک انسان کی نشانی بھی یہی ہے کہ وہ کبھی ہمت نہیں ہارتا۔ ہمت ہار جانا تو کمزوری کی علامت ہے اور وہ اپنی کمزور ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"رک جاؤ۔۔ ہم نے کہا رک جاؤ۔۔۔" پیچھے سے آواز سنائی دی مگر وہ رکا نہیں۔۔۔ جھکا نہیں۔۔۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہ ان آوازوں کے ماخذ سے اچھی طرح واقف تھا۔ بچے نے بھی اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا شروع کر دیئے۔ شاید سفوف کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ سورج کی چمک دار، آنکھوں کو چندھیا دینے والی کرنیں اس بچے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ بچے کو ہاتھ پاؤں ہلاتا دیکھ کر اس کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نے جنم لیا۔

"وہ دیکھو۔۔ دیوتا اسی کے پاس ہے۔۔ دیوتا کی آواز آ رہی ہے۔" بچے کی آواز سن کر ایک پادری چلایا۔ سب اب پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ ان کے پاس ہتھیار تھے لیکن وہ ہتھیار کا استعمال اُس وقت تک نہیں کر سکتے تھے جب تک دیوتا اُس لڑکے کے پاس تھا۔ وہ اپنے دیوتا پر ایک آنچ تک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

"دیکھو۔۔ ہمارا دیوتا۔۔ ہمیں واپس لوٹا دو۔۔ ہم وعدہ کرتے ہیں، تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔۔" ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ جس پر وہ طنزیہ مسکرایا۔ ان چالوں سے وہ بخوبی واقف تھا۔ پہلے بری ہونے کا وعدہ کر کے وہ ملزم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرتے

اور پھر جب وہ ہتھیار سے نہتا ہو جاتا تو اس پر ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالتے۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہونا تھا۔ لیکن ایسا تب ہوتا جب وہ دیوتا کو ان کے حوالے کرتا اور ایسا وہ اب کبھی خواب میں بھی نہیں ہونے دے سکتا تھا۔

''ہم آخری بار کہہ رہے ہیں، رک جاؤ۔۔۔'' اس بار بارعب آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔ یہ ان پادریوں کا سردار تھا۔ عبادت خانے کا سب سے بڑا پادری۔ جس کا حکم بجالانا سب کا فرض تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی اس کے پاؤں منجمد ہو گئے۔ سب پادری اور دربان بھی رک گئے۔ کچھ گاؤں والے بھی آموجود ہوئے تھے۔ وہ بھی ان کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ دونوں کے درمیان کچھ فرلانگ کا فاصلہ رہ گیا۔

لوگ سمجھے تھے کہ شاید وہ سردار کے حکم سے رُکا ہے لیکن اگلے لمحے جب ان کی نظر سامنے گئی تو ان کی سانسیں رک گئیں۔ وہ حکم کی تعمیل پر نہیں بلکہ زمین کے ختم ہو جانے پر رکا تھا۔

''دیوتا ہمیں واپس کردو۔۔۔'' سب دربانوں نے اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لئے۔

''کبھی نہیں۔۔'' اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ سب اس کے ارادوں کو بھانپ چکے تھے۔ سامنے کھائی اور پیچھے دربان۔ فراری کا کوئی راستہ نہ تھا۔ سردار نے اپنے بائیں جانب ایک دراز قد نشانے باز کو ابرو اچکاتے ہوئے اشارہ کیا تو اس نے حکم کو بجالانے میں ایک گھڑی بھی ضائع نہ کی۔ نشتر کو کمان سے نکالا تو سب آگے بڑھے اور دیوتا کو بچانا چاہا مگر تیر سیدھا اُس لڑکے کی پشت میں دائیں شانے سے ذرا نیچے جالگا۔ خون کا پھوارا نکلا اور دربانوں کی آنکھوں میں چبھنے لگا۔ آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے انہوں جب سامنے دیکھا تو ان کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ لڑکا دیوتا کے ساتھ کھائی میں جا گرا تھا۔

''دیوتا۔۔۔'' سب یک زباں ہو کر چلائے تھے مگر اب کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ لڑکا اپنی منشا پوری کر چکا تھا۔ جو اُس نے چاہا تھا، اس نے کر ڈالا۔ شاید قدرت نے بھی یہی لکھا تھا۔ تبھی تو اس کی چاہت پوری ہو گئی۔ دیوتا اپنوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا لیکن اپنی منشا کو پوری کرنے کی اسے اپنی جان کی قیمت چکانی پڑی۔

☆......☆......☆

؎ تجھے وہ شاخ سے توڑیں زہے نصیب ترے

سورج کی پہلی کرن اس گھر میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے اللہ سبحانہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرتے درختوں کے پتے ان نرم کرنوں کی حدت سے محظوظ ہوئے۔ ایک انگرائی لینے کے بعد انہوں نے اپنا چہرہ سورج کے سامنے کیا تو بادِ نسیم نے ان میں گدگدی کا احساس جگایا۔ آنکھوں کو فرحت بخشتا یہ سماں پورے لان کو اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھے۔ سنہری کرنیں آسمان سے لامحدود فاصلہ طے کرنے کے بعد زمین بوس ہو رہی تھیں۔ ہری ہری گھاس پر رات بھر بسیرا کرتی شبنم کسی آفتابے کی مثل چمک رہی تھیں۔ سفید روشنی دھنک کے ساتوں رنگ

میں منعکس ہو کر دیوار پر اپنا عکس بنا رہی تھی۔ جہاں ایک قطار میں گلاب و چنبیلی کے کئی پودے اس روشنی کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے دنیا کی رنگینوں سے مستفید ہو رہے تھے۔ سرخ و سفید رنگ کے یہ پھول لان کی جان تھے۔ بادِ نسیم کے ساتھ ان پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بوجھل ذہن کے لئے جنت کی معطر فضا سے کم نہ تھی۔ کوئی اگر اس ماحول میں ایک بار قدم رکھ لے تو شاید اپنی ساری تھکاوٹ بھول جائے کیونکہ آنکھوں کے سامنے ایسا سماں تھا جو گہرائی تک اتر جائے۔ پورا لان کسی ایکسپرٹ مالی کی نگہداشت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ گھاس کا ایک پیلا تنکا بھی مائیکروسکوپ سے دیکھنے پر نہ ملے۔ تمام درختوں کی کاٹ چھانٹ ایسے کی ہوئی تھی کہ قدرت بھی عش عش کر اٹھے۔

بادِ نسیم میں ایک آہٹ اس وقت سنائی دی جب کلیجی رنگ کے شاندار آرکیٹیکچر کے شہکار گیٹ کے اوپر سے ایک انگلش اخبار اندر کی جانب گرایا گیا۔ غالباً اس گھر کے مکین کسی اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے تبھی غیر ملکی نیوز پیپر اندر کی طرف اچھالا گیا تھا۔ ایک لمحے میں وہ نیوز پیپر گیٹ سے ایک فٹ کے فاصلے پر زمین بوس ہوا اور ایک بار پھر پورے ماحول میں خاموشی چھا گئی۔ گھر کے اندر سے بھی کوئی آواز فی الحال سنائی نہیں دے رہی تھی۔ جو شاید اس گھر کے مکین کے اس سہانے منظر سے بے خبر ہونے کا ثبوت تھا۔

گیٹ سے سیدھا آگے بڑھا جائے تو ایک اندرونی دروازہ آتا تھا۔ جو براؤن رنگ کا ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ آٹھ فٹ کی بلندی کو چھوتا یہ دروازہ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اس گھر کے مکینوں نے یہ دروازہ شہر کی اعلیٰ پایہ مارکیٹ سے آرڈر دے کر بنوایا تھا۔ اس کو بنوانے میں غیر ملکی کاریگروں کا بھی ہاتھ تھا۔ اندرونی دروازے کے ساتھ ہی بائیں جانب ایک لمبی سی راہ داری تھی جو گھر کے عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔ جہاں عموماً بے کار سامان یا پھر ملازموں کے فلیٹ ہوا کرتے ہیں۔

''آج پھر اخبار فروش کال بیل بجائے بغیر اخبار پھینک کر چلا گیا۔۔۔'' ایک ملازمہ نے بڑبڑاتے ہوئے اندرونی دروازہ کھولا اور سیدھا آگے بڑھ کر وہ انگلش نیوز پیپر اٹھا کر ایک بار ٹٹولا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ کے تاثر نمایاں تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی ڈیوٹی کرتے کرتے بری طرح تھک چکی ہو۔ اسے ایک لمبے آرام کی ضرورت تھی۔ اپنے دوپٹے کو گلے میں کسی رسی کی مانند ڈالے وہ دوبارہ اندر کی طرف بڑھی اور ٹی وی لاؤنج میں جا کر وہ اخبار صوفوں کے درمیان موجود ٹیبل پر رکھ دیا۔ دروازے کی طرح یہ صوفوں کا سیٹ بھی غیر ملکی معلوم ہو رہا تھا۔ سفید رنگ کے لحاف میں لپٹے یہ صوفے دیکھنے میں بھی گداز محسوس ہوتے تھے۔

''ماریہ۔۔!! نیوز پیپر بیڈروم میں لے آؤ۔۔۔'' یہ جہانزیب عالمگیر کی آواز تھی جو دائیں طرف موجود بیڈروم سے آئی تھی۔

''جی صاحب۔۔!!'' اس نے فوراً سے پہلے جواب دیا اور اخبار کو دوبارہ اٹھایا اور بیڈروم کی طرف چل دی۔ اس سے پہلے کہ وہ بیڈروم کا دروازہ کھولتی وہاں سے سحر فاطمہ باہر وارد ہوئیں۔ جو کہ چالیس سالہ ایک خاتون تھیں مگر کوئی بھی دیکھنے پر عمر کے معاملے میں غلطی کر جائے اور مشکل سے تیس سال کا گمان کرے۔ صحیح کہتے ہیں کہنے والے ''پیسہ عمر کو چھپا دیتا ہے''۔ ان کی خوبصورتی آج بھی ویسے ہی تھی جیسے اُس وقت، جب انہوں نے جہانزیب عالمگیر سے شادی کی تھی۔ بقول جہانزیب عالمگیر

"سحر فاطمہ! آپ کی خوبصورتی تو وقت گزرنے کے ساتھ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔" یہ جملہ سنتے ہی سحر فاطمہ کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی اور چہرے پر سرخی مزید بڑھ جاتی۔ شاید اس خوبصورتی کا راز بھی یہی محبت تھی۔ جب نکاح جیسے عظیم رشتے میں محبت و انس کا رشتہ قائم ہو جائے تو عمر واقعی ایک جگہ ٹھہر جاتی ہے۔ ایک دوسرے کا ساتھ کبھی بڑھاپا نہیں آنے دیتا۔ اس وقت بھی وہ اپنے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے باہر نکلی تھیں۔

"بیگم صاحبہ۔۔ یہ اخبار۔۔" ماریہ نے اخبار کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا تھا

"یہ مجھے دو۔۔ تم اس طرح کرو جا کر ناشتے کا بندوبست کرو۔۔ میں ابھی آتی ہوں کچن میں تمہاری ہیلپ کرنے۔۔" اخبار اس کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے انہوں نے حکم جاری کیا تھا۔ یوں تو ماریہ کے ذمے فقط گھر کی صاف ستھرائی تھی مگر کبھی کبھار سحر فاطمہ کے کہنے پر وہ کچن بھی سنبھال لیا کرتی تھی ورنہ عموماً کچن کی ذمہ داری سحر فاطمہ خود سرانجام دیا کرتی تھیں اور کبھی کبھار ان کی چھوٹی بیٹی جبیں عالمگیر بھی۔

"لیکن بیگم صاحبہ ابھی تو آٹھ بجے ہیں اور تقریباً سب سو رہے ہیں۔۔" ماریہ نے حجت بیان کی

"مجھے معلوم ہے مگر اریب کا آج انٹری ٹیسٹ ہے۔ گیارہ بجے اسے سینٹر پہنچنا ہے۔" سحر فاطمہ نے جواز بتاتے ہوئے پلٹا کھایا اور بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا۔ اریب کے انٹری ٹیسٹ کا سن کر ماریہ کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ وہ ہونقوں بند دروازے کو دیکھتی رہی۔

"اریب جی کا انٹری ٹیسٹ؟" جانے کیوں اس کے لبوں پر ایک ہنسی امڈ آئی تھی مگر زبان سے مزید کچھ کہے بغیر وہ گردن جھٹکتے ہوئے وہاں سے چل دی۔ کچن میں داخل ہوتے ہی اس نے فریج سے چار انڈے نکالے اور شلیف سے مصالحہ جات کے بکسز نکال کر سامنے رکھے۔ چولہا جلاتے ہوئے اس نے فرائی پین رکھا اور اس میں ایک چمچ آئل ڈال کر اسے گرم ہونے دیا۔ انڈے کو توڑ کر پھینٹنے کے بعد اس نے نمک، مرچیں، زیرہ مکس کیا اور فرائی پین پر پھیلا دیا۔ ایک شوں کی آواز پورے کچن میں گونجی تھی۔

"بلیک ٹی بنا لی تم نے۔۔؟" سحر فاطمہ نے کچن میں داخل ہوتے ہی پوچھا تھا۔

"نہیں بیگم صاحبہ۔۔ میں نے سوچا کہ پہلے انڈہ فرائی کر لوں۔۔" اس نے کہا تو سحر فاطمہ نے اثبات میں سر ہلا دیا اور خود آگے بڑھ کر بلیک ٹی بنانے لگی۔

"آپ رہنے دیں بیگم صاحبہ! میں بنا دونگی۔۔" ماریہ نے سحر فاطمہ کے ہاتھوں سے ٹی بیگ لینا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا

"تم بس انڈہ فرائی کرو اور پھر جا کر اریب کو اٹھاؤ۔۔" یہ کہہ کر انہوں نے ایک لمحے کے لئے خاموشی اختیار کی اور پھر کچھ یاد آنے پر دفعتہً پلٹ کر ماریہ کو مخاطب کیا۔

"اور ہاں۔۔!! اریب سے کچھ مت کہنا!! اگر کچھ پوچھے تو کہنا کہ جہانزیب صاحب نے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ آئی بات سمجھ میں" اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا تھا کیونکہ وہ ماریہ کی عادت سے بخوبی واقف تھیں۔ اگر وہ کچھ بھی الٹا سیدھا بول دیتی تو شاید کام

ہونے سے پہلے اپنے انجام کو پہنچ جاتا۔ جب وقت گزرنے کے بعد بھی سحر فاطمہ کی نظریں ماریہ کے چہرے سے نہ ہٹیں تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور دونوں اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

انڈہ فرائے کرنے کے بعد ماریہ اریب کے کمرے کی طرف چل دی اور سحر فاطمہ ناشتے کی پلیٹیں ڈائننگ ٹیبل پر لگانے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں وہاں جہانزیب عالمگیر بھی آموجود ہوئے۔ ہمیشہ کی طرح ان کے چہرے پر ایک تمکنت بھری مسکراہٹ تھی۔ پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ سینٹر کرسی پر براجمان ہوئے جس کی پشت کچن کی طرف تھی۔ سحر فاطمہ نے انہیں جوس کا ایک گلاس دیا تو انہوں نے ایک گھونٹ پینے کے بعد دوبارہ ٹیبل پر رکھ دیا اور استفہامیہ نگاہوں سے سحر فاطمہ کی طرف دیکھا۔ جس کا مطلب وہ اچھے سے سمجھتی تھیں۔

''ابھی تک تو اسے خبر نہیں ہے۔ آپ ہی بات کر لیجیے گا اُس سے۔۔'' سحر فاطمہ نے ابھی اپنا جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ وہاں پر جبیں آموجود ہوئی۔

''السلام علیکم ماما جان۔۔ السلام علیکم بابا جان۔۔'' خوش شکل ایک ماڈرن طرز کی لڑکی، ایک لمبی سی قمیض پہنے ہوئے تھی۔ جینز کے رنگ کا اندازہ لگانا اس کی قمیض کے اوپر سے مشکل تھا۔ چہرے پر ہنستے ہوئے جو ڈمپل نمودار ہوتے، وہ تو شاید اس کی نمایاں خصوصیت تھی، جس پر شاید سب فدا ہوتے تھے۔ بالوں کی بے بی کٹنگ تھی جو اس کے چہرے کی مناسبت سے عین جچ رہی تھی۔

''وعلیکم السلام۔۔'' دونوں نے بیک وقت جواب دیا۔ جبیں جہانزیب کے ساتھ ہی چیئر پر آبیٹھی تھی۔

''آج ادھر نہیں۔۔ ادھر اریب بیٹھے گا۔۔'' سحر فاطمہ نے فوراً ٹوک دیا، جس پر منہ بگاڑنے کی بجائے اس نے حیرت سے ابرو اچکائے تھے۔

''اوہ۔۔ یعنی۔۔۔ ضرور کوئی خاص بات کرنی ہے اریب سے۔۔'' اس نے ذومعنی لہجے میں کہا تھا جس پر دونوں مسکرا دیئے۔

''خاص بات تو واقعی کرنی ہے۔۔ اور پھر تم تو اپنے بھائی کو اچھے سے جانتی ہو۔۔۔ کتنی تگ و دو کرنی پڑتی ہے اس سے بات کرنے کے لئے۔۔'' جہانزیب نے دوستانہ لہجے میں کہا تھا۔ جو کہ ان کی خصلت تھی۔ اپنے بچوں کے ساتھ بالکل ایک اچھے دوست کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ان ہی کی کلاس کی دوسری فیملیز کی طرح نہیں۔۔ جہاں ایک باپ بزنس میں کھو کر اپنے بچوں کے لئے ٹائم ہی نہ نکال سکے۔ وہ ان باپوں سے یکسر مختلف تھے۔ بزنس اگرچہ اہم تھا مگر ہمیشہ سے دوسرے نمبر پر رہا۔ ان کی اولین ترجیح ان کی اولاد تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جہانزیب کے تینوں بچے ان کے ساتھ کوئی بھی بات کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ یہی حال سحر فاطمہ کا بھی تھا۔ پوری فیملی میں دوستانہ ماحول تھا۔ ہنسی مذاق، بات چیت کرنا اس گھر کے باسیوں کا شیوا تھا۔

''کیا بات ہے وہ؟ مجھے بھی بتایئے۔۔'' وہ ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تھوڑا صبر کرو۔۔ تمہارے سامنے ہی کرنی ہے وہ بات اریب سے۔۔'' سحر فاطمہ نے ٹوسٹ جبیں کی طرف بڑھاتے ہوئے

کہا تھا

"نہیں بابا جان۔۔۔ مجھے ابھی بتائیں۔۔" اس نے معمولی سی ضد کی تھی۔

"کون سی بات بتائی جارہی ہے اپنی لاڈلی کو۔۔۔ مجھے بھی تو بتائیں۔۔۔" یہ حسام کی آواز تھی۔ جو زینے اتر کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ بھی غیر معمولی کشش کا نوجوان تھا۔ جہانزیب کا عکس حسام میں صاف دیکھائی دیتا تھا۔ جوانی میں وہ بھی تقریباً اسی کی طرح نظر آتے تھے۔ صاف رنگت، بیضوی چہرہ، سیدھی کھڑی ناک، بالوں میں سائیڈ سے نکالی گئی مانگھ اس کے چند اوصاف تھے۔ انجینئرنگ کے آخری سال کا اسٹوڈنٹ تھا۔ عمر لگ بھگ اکیس سال کے قریب تھی مگر مردانہ وجاہت اس کے چہرے سے واضح دیکھائی دیتی ہے۔ چہرے پر اگر چہ ہمیشہ سنجیدگی کا ایک پہلو نمایاں رہتا مگر ہمیشہ اپنے بہن بھائی کے ساتھ ایک دوست کی طرح سلوک کرتا۔

"دیکھیں ناں بھائی۔۔۔ بابا جان اور ماما جان نے اریب سے کوئی بات کرنی ہے اور مجھے بتا نہیں کہ کیا بات کرنی ہے انہوں نے" اس نے حسام سے شکوہ کیا تھا مگر اسے کیا خبر تھی کہ اس شکوے کے بدلے اسے ایک عدد نصیحت سننے کو مل جائے گی۔

"کتنی بار کہا تم سے اریب کو بھائی کہا کرو۔۔ پورا ایک سال بڑا ہے وہ تم سے۔۔" جبیں کی سرزنش کرتے ہوئے حسام نے کہا تھا اور اس کے ساتھ ہی چیئر پر براجمان ہو گیا۔

"آپ کو اتنا برا کیوں لگ رہا ہے۔ جب اسے برا نہیں لگتا میرا نام لینا تو آپ کیوں مجھے نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو تو بھائی ہی کہتی ہوں ناں۔۔" اس نے ناک سکیڑ کر جواب دیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے اگر میں تمہیں نصیحت نہ کروں تو تم مجھے بھی میرے نام سے پکارو گی۔۔" مصنوعی انداز میں چونکتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر سحر فاطمہ نے گردن جھٹک دی۔

"ڈائننگ ٹیبل کا تو لحاظ کرلو تم دونوں۔۔ اپنی نصیحتیں اور شکوے ٹی وی لاؤنج میں جا کر کر لینا۔ ابھی آرام سے ناشتہ کرو۔۔ سمجھے تم دونوں۔۔" اس سے پہلے کہ جبیں حسام کی بات کا جواب دیتی، سحر فاطمہ نے دخل اندازی کی جو اس پر ناگوار گزری مگر گردن جھٹک کر اس نے اپنا ہاتھ بلیک ٹی کی طرف بڑھایا۔

"کیا ہوا بابا؟ اتنی صبح صبح کیوں اٹھا دیا؟" وہ انگڑائی لیتے ہوئے ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جمائی آنے پر اس نے اپنا بائیاں ہاتھ منہ کی طرف بڑھایا تھا۔

"اگر کوئی بات تھی تو بعد میں بھی تو کی جا سکتی تھی ناں۔۔" اس نے سست لہجے میں کہا تھا۔ وہ ڈھیلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ سحر فاطمہ نے اس کی طرف دیکھا تو نفی میں سر ہلا دیا۔ نائیٹ سوٹ میں وہ ژولیدہ مُو کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ جو اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ابھی تک گھوڑے بیچ سوئے ہوئے تھا اگر ماریہ اس کو جا کر نہ اٹھاتی تو شاید گیارہ بجے سے پہلے اس کے اٹھنے کے کوئی آثار نہ تھے۔

''تم نے ابھی تک منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا؟'' جہانزیب نے حیران کن لہجے میں پوچھا تھا۔

''آپ کو لگ رہا ہے کسی اینگل سے؟'' حسام نے تمسخرانہ انداز میں جملہ کسا تھا۔

''میرے حصے کا آپ نے تو دھولیا ناں۔۔۔ چلیں آپ کرلیں ناشتہ۔۔۔ جب ہوجائے تو مجھے بتادیجیے گا، میں جاکر دوبارہ کمرے میں سو جاؤں گا۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا اور پلیٹوں کو پیچھے کی طرف کھسکاتے ہوئے اپنے بازو پھیلا دیئے اور وہیں اپنا سر رکھ دیا۔ جبیں کی تو ہنسی نکل آئی۔

''اریب۔۔۔ اٹھو چلو۔۔۔ مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔'' لہجے میں سختی لائے بغیر جہانزیب نے کہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کیا بات کرنی ہے اور آپ اچھے سے میرا جواب بھی جانتے ہیں۔'' اس نے کسمساتے ہوئے کہا تھا۔ اریب کی اس بات پر سحر فاطمہ اور جہانزیب دونوں چونکے تھے۔ سحر فاطمہ نے سامنے سے آتی ہوئی ماریہ کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان نگاہوں میں اس قدر حدت پنہاں تھی کہ وہ فوراً آگے بڑھ کر اپنی صفائی دینے لگی۔

''نہیں۔۔۔ بیگم صاحبہ۔۔۔ میں نے اریب جی سے کچھ نہیں کہا۔'' دونوں ہاتھوں کو نفی میں ہلاتے ہوئے اپنی بے گناہی ثابت کرنا چاہی تھی۔

''ماما جان۔۔۔ اس بے چاری نے کچھ نہیں کہا۔ آپ کے چہرے دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے۔'' وہ غنودگی میں کہتا جا رہا تھا۔ جبیں نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

''واہ بھئی۔۔۔ مجھے تو پوچھنے پر بھی نہیں بتایا جا رہا اور اسے بنا بتائے پتا بھی چل گیا۔۔۔ حیرت ہے۔۔۔''

''یہ مت بھولو تم۔۔۔ میں اریب ہوں۔۔۔ اریب عالمگیر۔۔۔ مجھے کوئی بات بتانے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کے چہرے دیکھ کر ہی اصل بات تک رسائی حاصل کرلیتا ہوں'' اس نے غنودگی میں بھی ہر بات کا جواب دینا اپنا فرض عین سمجھا تھا۔

''چلو پھر۔۔۔ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے، مجھے کچھ بھی کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔۔۔ اب اچھے بچوں کی طرح اٹھ کر ناشتہ کرو۔۔۔ اور پھر۔۔۔'' اس سے پہلے جہانزیب اپنا جملہ مکمل کرتے اریب نے خود مداخلت کی۔

''اپنے کمرے میں جا کر اپنی نیند پوری کروں۔۔۔ شکریہ بابا جان۔۔۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔۔'' اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔ اس بار جبیں کے ساتھ ساتھ حسام کی بھی ہنسی نکل آئی تھی۔

''بالکل بھی نہیں۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔'' اس بار انہوں نے سخت لہجے میں کہا تھا جس کی نوعیت کو بھانپتے ہوئے اس نے اپنا سر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھایا اور ایک بار پھر جمائی لی۔ اس کے پور پور سے سستی ظاہر ہورہی تھی۔

''لیکن بابا جان۔۔۔'' اس نے ماتھے پر چند شکن لاتے ہوئے اکتاہٹ والے لہجے میں کہا تھا۔ اس بار جہانزیب کی بجائے

سحر فاطمہ گویا ہوئیں۔وہ اس وقت اس کے سامنے ہی بیٹھی ناشتہ کر رہی تھیں۔

''اریب۔۔ضد نہیں کرتے۔۔تمہیں احساس ہونا چاہئے کہ آج کل F.Sc کو کسی خاطر میں بھی نہیں لایا جاتا اور پھر ہم تم سے اس بات کی تھوڑی ڈیمانڈ کر رہے ہیں کہ تم نے پوزیشن ہی لینی ہے۔بس پاس جتنے نمبر بھی آجائیں۔کافی ہے ہمارے لئے۔۔۔''

''مگر میرے لئے نہیں۔۔۔'' کافی حد تک اب اس کی سستی اتر چکی تھی۔اس نے اپنی دونوں آنکھیں مسلتے ہوئے کہا تھا۔

''تو تمہارے لئے مشکل تھوڑی ہے اریب۔۔۔ذرا سی محنت کر کے تم کلاس تو کیا یونیورسٹی تک ٹاپ کر سکتے ہو۔۔'' حسام نے بھی سمجھانے میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔

''بس اسی بات کا تو رونا ہے بھائی۔۔۔محنت۔۔'' اس نے منہ بگاڑ کر کہا تھا جس پر ایک بار پھر جبیں مسکرا دی۔اریب بھی اتنی معصوم شکل بنائے ہوئے تھا جسے دیکھ کر کسی کو بھی ترس آجائے۔

وہ اب دوبارہ ڈائننگ ٹیبل پر اپنا سر رکھنے لگا تھا کہ سحر فاطمہ کی کرخت آواز نے اسے وہیں منجمد کر دیا۔

''اریب۔۔'' وہ اپنا سر ڈائننگ ٹیبل پر رکھتے رکھتے رہ گیا اور فی الفور سیدھا ہوا۔

''اتنا سستی کا مظاہرہ تو کوئی آٹھ سالہ بچہ بھی نہیں کرتا جتنا تم اٹھارہ سال کے ہو کر کر رہے ہو۔'' سحر فاطمہ نے اسے تنبیہ کرنا چاہی تھی مگر وہ باتوں کا سنجیدگی سے اثر قبول کرے، بھلا ایسا ممکن تھا؟

''تو ماما جان کچھ تو فرق ہونا چاہئے ناں آٹھ سالہ بچے اور اٹھارہ سال کے لڑکے میں۔۔'' اس نے غنودگی میں کہا جس پر جبیں کا قہقہہ ڈائننگ ٹیبل کی فضا میں گونجا۔حسام نے تنبیہہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بمشکل اپنے قہقہے کو ضبط کر پائی تھی۔

''واہ اریب۔۔آج تو مزہ آگیا۔لگتا ہے آج کا دن بہت اچھا گزرے گا۔دن کا آغاز میرے پیارے سے بھائی کی مزاح سے بھرپور باتوں سے ہوا ہے۔انجام بھی بخوب ہوگا۔۔'' وہ اپنے رائے دیئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔جس پر حسام نے زیر لب کہا

''ان دونوں کا کچھ نہیں ہو سکتا۔۔'' گردن جھٹک کر چائے کا ایک گھونٹ لیا اور پھر کھڑے ہوتے ہوئے کہا

''اچھا ماما جان۔۔آپ اپنا سمجھانا جاری رکھیے۔۔مجھے تو دیر ہو رہی ہے یونیورسٹی سے۔۔میں چلتا ہوں۔۔'' آگے بڑھ کر اس نے سحر فاطمہ اور جہانزیب سے پیار لیا۔

''بیسٹ آف لک بھائی، پیپر کے لئے۔۔'' اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اریب نے کہا تھا۔جس پر وہ باہر کی طرف جانے کی بجائے اریب کی طرف بڑھا اور اس کے بالوں کو پیار سے خراب کرتے ہوئے کہا۔

''کبھی کبھی بڑوں کی بھی بات مان لیتے ہیں۔۔''

''بڑوں کی بات مانتا ہوں، اسے لئے تو جان سے پیاری نیند کو قربان کر کے آیا ہوں۔۔'' اس نے منہ بگاڑ کر کہا تو سب کے

چہروں پر ایک بہار اُمڈ آئی۔ وہ اریب کے جملے پر خاصے حیران تھے۔

"کک کیا کہا تم نے؟" حسام کے بڑھتے قدم یک دم رک گئے۔ جہانزیب بھی اریب کی بات سن کر اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔ سحر فاطمہ بھی ایک لمحے کو چونکی تھیں۔

"یہی کہ کوشش کروں گا ٹیسٹ دینے کی۔۔۔" اس نے اکتاہٹ والے لہجے میں کہا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" جہانزیب نے تصدیق چاہی تھی۔ جس پر اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حسام نے کندھوں سے پکڑ کر اسے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

"بہت تنگ کرتے ہو تم سب کو۔" ہلکا سا سرزنش کرتے ہوئے اس کے رخسار کو تھپتھپایا اور اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ جہانزیب بھی اریب کے سامنے آموجود ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر بھی خوشی کا ایک جہاں آباد تھا۔

"صحیح کہہ رہا ہے حسام۔۔۔ بہت تنگ کرتے ہو تم۔۔۔ جب پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے تو یہ ڈرامہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" اس کے کان پکڑ کر دھیرے سے کھینچے۔

"وہ اس لئے کہ شاید آپ کو اپنے اس معصوم بیٹے پر رحم آ جائے اور آپ لوگ ناں کر دیں۔۔" ایک بار پھر ملتجانہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"معصوم اور تم۔۔۔" سحر فاطمہ نے دوسرے رخ سے آ کر اس کا کان پکڑ کر کھینچا اور اس کی سیاہ زلفوں کو جو رات سے زیادہ سیاہی سمیٹے ہوئے تھیں، خراب کرتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا۔

☆......☆......☆

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

کل ہی انڈین فلم ریلیز ہوئی تھی اور نئی فلم میں پہنے گئے ملبوسات اس کی کولیکشن میں شامل نہ ہوں، بھلا ایسا کہاں ممکن تھا؟ شام پانچ بجے کے قریب اس نے وہ فلم دیکھی تھی اور تاریخ بدلنے سے پہلے پہلے وہ تمام ملبوسات اس کی وارڈ روب میں موجود تھے جس میں اس فلم کی ہیروئن نے تمام سانگز پکچرائز کروائے تھے۔ کہاں سیاہ رنگ؟ کہاں نیلا۔۔ دنیا بھر کے رنگ اس کی وارڈ روب میں دیکھے جا سکتے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ڈریسز تھے جن پر خریدنے کے بعد دوسری نگاہ ڈالنا بھی اس نے گناہِ عظیم سمجھا تھا۔ اس کی تمام سہیلیاں اس کی قسمت پر رشک کرتی تھیں۔ اس کی چال اگرچہ زمین پر تھی مگر حوصلے شاہین کی مانند کھلی فضا میں بے باکی سے اڑتے تھے۔ شاید شاہین بھی ایک مسافت کے بعد کچھ لمحے ستانے کے لئے کسی شاخ پر یا کسی اونچے ٹیلے پر بیٹھ جائے مگر اس کے خواب، اس کی امیدیں، اس کے تسلسل ہر لمحہ، ہر گھڑی کسی ان کہی، کسی انجانی منزل کو تراش لیتے۔ ایک بے ہنگم سی، بے پرواہ سی، مبہوت سی خواہش کو اپنے دل کی بے ثبات گلیوں میں جگہ دے دیتی اور پھر اس فانی خواہش کو تعبیر کا درجہ دینے کے لئے انا کے ہر پہلو سے گزر جاتی۔ کھانا پینا تو وہ لوگ چھوڑتے ہیں

جنہیں اپنی زندگی پیاری نہ ہو یا پھر چلتی سانسیں ان پر بوجھ ہوں۔ وہ ایسی احمقانہ حرکتوں سے گریز کرتی کیونکہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ احمق تھی۔ ہیجانی کیفیت میں چیزوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکتی۔ کیا اعلیٰ شے، کیا ادنیٰ؟ سب اس کے لئے یکساں تھیں۔ پچھلے ماہ ہی سالگیرہ میں من پسند نہ ملنے والی فراک کے بدلے پانچ سوڈالر کی اعلیٰ پایہ کی فراک۔۔ جو کسی شاہکار سے کم نہ تھی۔ ریشمی دھاگے سونے کے تاروں کو بھی پیچھے چھوڑ رہے تھے۔ چاند ستارے تو کیا سورج دیوتا بھی اس کے آگے منہ چھپائے مغرب میں جا گھسے۔ جو کسی بھی عام لڑکی تو کیا کسی خاص کی پہنچ سے بھی دور تھا۔ پیسے کی ریل پیل میں پلنے بڑھنے والی بھی اس فراک کے حصول کے لئے اپنی پوری زندگی کی خواہشات قربان کر ڈالے۔ وہ فراک جو اس کے پاپا نے خاص کہہ کر اس کے برتھ ڈے کے لئے بنوائی تھی مگر اس کو تو فلم سٹار جیسی سکرٹ چاہیے تھی، پھر وہ اس کو کیسے اپنے کمرے میں برداشت کرسکتی تھی۔ ہاتھ میں لیتے ہی ناک منہ سکیڑا اور سیدھا اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ تمام مہمان موجود تھے۔ پیچھے سے آوازیں دی جا رہی تھیں مگر وہ کہاں کسی کی سننے والی تھی؟ پاؤں پٹختی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور دروازہ لاک کر کے چیزوں پر اپنا قہر برسایا۔ جو ہاتھ میں آیا، اجل کی گھاٹ اتار دیا مگر غصہ کہاں کم ہونے والا تھا؟ وہ فراک اس کے گلے میں کسی نوکیلے خار کی طرح خنک رہی تھی۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے اندر محرومی کا احساس اجاگر کر رہا تھا۔ اس کی خواہش اس پر ہنس رہی تھی۔ اس کی انا اس کے اندر کے لاوے کو دہکا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے انگارے نکل نکل کر اس کو اپنی لپیٹ میں جھلسا رہے تھے۔ وہ شاہانہ مسکراتی فراک کسی بھی لمحے جل کر راکھ بن سکتی مگر اسے کہاں پرواہ تھی؟ وہ تو بس اپنی چاہت کے درگور ہونے کا ماتم منا رہی تھی۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ایسے چمک رہے تھے جیسے جانے کتنے ارمانوں کا خون کر دیا گیا ہو؟ جانے کتنی چاہتوں کو آنکھوں کے سامنے نیست و نابود کر دیا گیا ہو۔ چلتی سانسوں کو جو جانے کتنی صدیوں سے دہکتے صحرا کی تپتی ریت پر جھلسنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہو۔ گلاب کی پنکھڑیوں کی مانند نازک رخسار پر یہ آنسو ایسے بہہ رہے تھے جیسے آسمان کے دروازے چھوٹی چھوٹی بوندوں کے لئے اپنا سینہ چاک کر دیا کرتے ہیں۔ بچوں کے طرح بلکتے ہوئے ہونٹ اس کے دکھے دل پر ہونے والے ستم کی عکاسی کر رہے تھے۔ اس کی جھیل آنکھیں سامنے ڈریسنگ پر رکھی شمع پر گئی جو کچھ دیر پہلے ہی اس کی موم نے اچھے شگون کے طور پر اس کے کمرے میں روشن کی تھی، اگلا لمحہ آنے سے پہلے اس کی طرف بڑھی اور نازک سے ریشمی ہاتھوں میں اس آگ کے ماخذ کو تھاما، زندگی میں شاید پہلی بار اس نے کسی شے کو اپنی پوری مضبوطی سے تھاما تھا اور شاید پہلی بار ہی آگ کو اتنے قریب سے محسوس کیا تھا۔ چھوٹا سا بھڑکتا ہوا شعلہ بھی اس کے لئے ناقابل برداشت تھا مگر اندر کی آگ ظاہری آگ سے کہیں زیادہ گرم تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آگے بڑھ اس فراک کو آگ لگا۔ پانچ سوڈالر کی یہ گڑیوں کی سی فراک، جو ابھی تک صحیح سے کھول کر دیکھی بھی نہیں گئی تھی، آگ کا مقدر بن گئی۔ دھویں کے سیاہ بادلوں نے کمرے میں اپنا مسکن بنانا شروع کیا تو اس کی سانسیں بھی اکھڑنا شروع ہوگئی۔ یہ سیاہ دھواں اس کی سانسوں میں کسی کانٹے کی مانند اٹکنے لگا تھا، آنکھوں میں تیرتی نمی جو کچھ دیر پہلے نفرت و حقارت سے بھرپور تھی اب زندگی کی تمنا لئے ہوئے تھی۔ وہ خود اب اپنے ہاتھوں سے لگائی آگ میں جھلسنے لگی۔ نازک سے بدن والی جس نے کبھی آگ کو دور سے

بھی جلتے نہ دیکھا تھا، اپنے اتنے قریب آگ و دھویں کے سیاہ بادلوں کو دیکھ کر گھبرا گئی۔ اس کا دل ڈھول کی تھاپ کی طرح تیزی سے دھڑکنے لگا۔ آنکھوں کے گرد اندھیرا چھانے لگا اور اگلے ہی لمحے وہ زمین پر گری پڑی تھی۔

☆......☆......☆

وائیٹ شرٹ اور گرے رنگ کی ڈریس پینٹ میں وہ اب بالکل تیار تھا۔ کتاب کو اس نے سوائے بیس منٹ کے ہاتھ میں لینا اپنے ذات کی توہین سمجھا تھا۔ ان بیس منٹوں میں اس نے طائرانہ نگاہ صفحہ اول سے صفحہ آخر تک دوڑائی تھی۔ اہم اہم پوائنٹ اس کی آنکھوں سے جو گزر گئے سو گزر گئے۔ ذہین سے ذہین آدمی کے لئے بھی کسی شے کو یاد رکھنے کے لئے ایک بار گہری نگاہ ڈالنا لازمی امر ہے لیکن اس کی ذات تو شاید کچھ زیادہ ہی پر اعتماد تھی۔ شاہین کی سی رفتار سے وہ ورق پلٹتا گیا۔ نو بجے کے قریب سحر فاطمہ نے جبیں کے ہاتھوں اس کو کتاب پہنچائی تھی اور نو بج کر بیس منٹ پر وہ اس کتاب سے مکمل طور پر بے زار ہو چکا تھا۔ نائیٹ سوٹ میں ہی پہلے اس نے میوزک سسٹم آن کیا اور پورے والیوم کے ساتھ سسٹم آن کرنے کے بعد خود اس میں مدہوش ہونے لگا تھا۔ جب سرور زیادہ چھاتا تو تھوڑا سا رقص بھی کر دیتا۔ دروازہ پہلے ہی لاک تھا اس طرح کوئی ڈسٹربنس کا جواز ہی نہیں بنتا تھا اور کرتا بھی تو اس کا کیا جاتا؟ اس نے کوئی دروازہ کھولنا تھا۔ اتنی دیر اس نے کتاب کو پڑھ کر بھی نہ دیکھا تھا جتنا کہ ان فضولیات میں غرق کر ڈالا۔ دس بجے تک وہ پاپ میوزک سے اپنے دل کو تسکین پہنچانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ آنکھوں سے نیند تو رخصت ہو ہی چکی تھی، اس لئے سونے کا تو کوئی تک ہی نہیں بنتا تھا۔ دس بجے اس کی نظر وال کلاک پر گئی تو منہ بگاڑتے ہوئے کھڑا ہوا اور غصے سے میوزک سسٹم کا والیوم دس درجے کم کر کے واش روم میں جا گھسا۔ وہاں بھی اس نے تقریبا دس منٹ اپنی زندگی کے صرف کیے۔

ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ جب وہ زندگی کے کسی امتحان میں بے فکری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ بچپن سے آج تک یہی اس کا طرز عمل رہا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی ایسی ذہانت کو اپنے قدموں کو چھوتے ہوئے پایا جو شاید ہی کسی اور کے پاس ہو۔ دوسروں کے دل کی باتوں کو چہرے پر آئے شکن سے اندازہ لگانا تو شاید اس کا شیوہ تھا، یہ علم نہ تو اس نے کسی سے سیکھا تھا اور نہ ہی اسے سیکھنے کی ضرورت تھی۔ کچھ علم پیدائشی سکھا دیئے جاتے ہیں۔ شاید یہ خصوصیت بھی قدرت نے خمیر بناتے ہوئے اس کے جسد خاکی میں شامل کر دی تھی۔

جماعت پنجم کے سالانہ امتحان تھے۔ رات بھر وہ بخار میں جلتا رہا۔ بڑے سے بڑے اسپیشلسٹ سے میڈیسن لی مگر کوئی افاقہ نہ ہوا۔ رات کے تین بج چکے تھے اور بخار سو کے ہندسے کو عبور کر رہا تھا۔ سحر فاطمہ اور جہانزیب بہت پریشان تھے۔ گھڑی گھڑی ٹھنڈے پانی کی پٹیاں اس کی پیشانی پر رکھ کر بخار کی شدت کو کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک طرف ان کے بیٹے کی یہ حالت تھی تو دوسری طرف کل ہونے والے پرچے میں غیر حاضری کا ڈر۔۔ وہ ایک ساتھ دو مصیبتوں میں گرفتار ہوئے تھے۔ کل کا پیپر خاص اہمیت کا حامل تھا۔ پورے سال کا دارومدار اس پرچے پر تھا۔ ایک پرچے میں غیر حاضری کا مطلب پورا سال ضائع ہو جانا تھا اور اگر بالفرض صبح تک بخار اتر بھی جاتا

تو ناکامی مقدر تھی۔ بھلا تین دنوں سے بخار میں تڑپتا بچہ یوں یک دم کیسے کمرہ امتحان میں بیٹھنے کے قابل ہوسکتا تھا؟ دونوں کی نیندیں یہ سوچ سوچ کر اڑ چکی تھیں۔ سحر فاطمہ ایک نظر جہانزیب کی طرف دیکھتیں تو دوسری نگاہ اپنے لخت جگر پر ڈالتیں۔ اس کا معصوم سا چہرہ بخار کی حدت میں سرخ ہو چکا تھا۔ ہاتھوں لگاؤ تو ایسا محسوس ہوتا جیسے آگ کی ایک لہر جسم میں سرایت کر گئی ہو۔ جب چھونے والے کے لئے یہ حدت ناقابل برداشت تھی تو اس بچے پر کیا بیت رہی تھی؟ جو پچھلے تین دنوں سے اس بخار میں جھلس رہا تھا۔

"تم فکر نہ کرو۔۔۔ بچے کی زندگی سے زیادہ اہم تو کوئی چیز نہیں ہے ناں؟" جہانزیب نے سحر فاطمہ کی فکر کو کم کرنے کی کوشش کی تھی مگر ایک ماں کا درد بھلا کوئی کیونکر محسوس کر سکتا تھا؟ آنکھوں سے آنسو ابر کرم کی طرح بہتے جا رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تو ایک آنسو اس کی پیشانی پر جا بیٹھا۔

رات سبک رفتاری سے اپنی منزلیں طے کرتی رہی اور ایسے میں جانے کب میں سحر فاطمہ اور جہانزیب کو نیند کی خماری نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ دونوں اس سے بے خبر تھے۔ جہانزیب صوفے پر دائیں ہاتھ کے سہارے پیچھے کی جانب ٹیک لگائے اونگھتے اونگھتے دنیا سے غافل ہوئے تو سحر فاطمہ بھی اریب کی پٹیاں تبدیل کرتے کرتے خوابوں کی دنیا میں غافل ہو گئیں۔ آنکھ تو ان کی تب کھلی جب کسی کے چلنے کی آہٹ ان کی سماعت میں گونجی۔ ہڑبڑاتے ہوئے آنکھ کھول کر دیکھا تو سامنے اریب ٹہلتے ہوئے کتاب کے ورق پلٹتے ہوئے دکھائی دیا۔

"اریب میری جان۔۔!! یہ کیا کر رہے ہو آپ۔ چلو ادھر آ کر آرام کرو۔۔۔" سحر فاطمہ نے فکرمندی والے لہجے میں کہا اور فی الفور بیڈ سے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی تھیں۔ سحر فاطمہ کی آواز نے جہانزیب کو بھی نیند کی دنیا سے باہر لانے میں اہم کردار ادا کیا۔

"ماما جان۔۔ آج پیپر ہے ناں۔۔ اس لئے ایک نظر دیکھ لوں۔۔" اس نے معصومانہ لہجے میں جواب دیا تھا۔ سحر فاطمہ فکرمندی کے ساتھ اس کے سامنے آ بیٹھیں اور پیار سے اس کی پیشانی کو چھوتے ہوئے بخار چیک کیا۔

"لیکن بیٹا آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔ دیکھو ابھی کچھ کم ہوا۔۔ آج کا پیپر رہنے دیتے ہیں کل دے دیجیے گا۔ ٹھیک ہے۔۔" ممتا بھرے لہجے میں وہ کہہ رہی تھیں۔

"نہیں ماما جان۔۔۔ مجھے آج کا پیپر دینا ہے۔ میری تیاری بھی ہو گئی بس آخری پیج دیکھنا باقی ہے اور پھر ابھی تو دن آور باقی ہے ناں۔۔ میں میڈیسن کھا کر جاؤں گا۔۔" وہ اپنی بات پر بضد رہا۔ جہانزیب نے آگے بڑھ کر اریب کی پیشانی کو چھوا تو بخار قدرے کم تھا۔

"اب آپ ہی اسے سمجھائیں ناں۔۔" سحر فاطمہ نے جہانزیب کی جانب حسرت بھرے انداز میں دیکھا تو وہ مسکرا دیئے اور جھک کر اریب کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے میرا بیٹا! میرا بیٹا آج کا پیپر ضرور دے گا۔۔" اس کی ڈھارس باندھتے ہوئے اس کے دائیں رخسار پر بوسہ دیا تو اریب نے خوشی سے نعرہ لگایا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ابھی تو طبیعت سنبھلی ہے اریب کی اور پھر اس نے تیاری بھی تو نہیں کی ناں۔۔" سحر فاطمہ نے اپنے دل کی بات کہی تھی

"آپ شاید بھول رہی ہیں اریب کی ماماجان کہ ہمارا اریب عام بچہ نہیں ہے۔ یہ extra ordinary صلاحیتوں کا مالک ہے۔ کیوں اریب؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور ایک بار پھر اس کے رخسار پر بوسہ دیا۔ جہانزیب نے صحیح کہا تھا۔ وہ واقعی عام بچہ نہیں تھا۔ فقط چند لمحوں میں تیاری کرنے کے بعد بھی اس نے کلاس میں ٹاپ کیا تھا۔ سب اس بات پر حیران تھا مگر وہ جہانزیب مطمئن تھے۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح تمکنت تھی۔

ایسا ہی کچھ میٹرک میں ہوا تھا۔ سحر فاطمہ کے اسرار پر اُس نے بائیولوجی رکھی تھی مگر مجال ہے اس نے کسی کتاب کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔ اور مزید ستم یہ کہ ہاتھ تو انسان تب لگائے جب اس کے پاس کتابیں اور نوٹس ہوں۔ ان دو سالوں میں اس نے ایک کتاب بھی نہیں خریدی تھی۔ بس ٹیچر کے دیئے گئے لیکچرز بغور سنتا اور ذہن نشین کر لیتا بقول اریب کے،

"کتابوں کی ضرورت انہیں پڑتی ہے جن کے concepts کلئیر نہ ہوں یا پھر جنہیں کتابی کیڑا بننے کا خمار چڑھا ہو۔ بھلا جو اسٹوڈنٹ ٹیچر کے لیکچر کو دھیان سے سنے اور پھر اپنی ریسرچ کر کے ہر بات کی گہرائی میں جائے تو اسے کتابوں کا سہارا لینے کی کیا ضرورت؟" یہ جملہ کہنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی مگر اریب کے لئے اس جملے کا ادا کرنا غلط بھی نہ تھا۔ جو extra ordinary صلاحیتوں کا مالک ہو، جو ایک بار کسی تصویر کو دیکھ لے تو اس کی باریکیوں سے آگاہ ہو جائے۔ جو ایک بار کسی کی پیشانی پر ابھرنے والی شکنوں کو دیکھ کر دل میں جھانک لے۔ اس کی ان کہی بات کو سمجھ جائے، اس کے لئے یہ سب کہنا غیر فطری نہیں۔

یہ سب باتیں اگرچہ سحر فاطمہ کے دل میں پریشانی کو اجاگر کر رہی تھیں مگر جہانزیب کو اپنے بیٹے پر پورا یقین تھا اور یہ بھرم اُس نے کبھی توڑا بھی نہیں۔ رزلٹ والے دن جہاں سحر فاطمہ کے چہرے پر یاسیت کے تاثر نمایاں تھے وہیں جہانزیب اور اریب پر اطمینان تھے۔ اُس نے نہ صرف سکول میں ٹاپ کیا تھا بلکہ بورڈ میں بھی فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ مزید برآں چیکر کے کومنٹ رزلٹ کارڈ پر اس کی قابلیت کی داد دے رہے تھے۔

"مجھے پیپر چیک کرتے ہیں چار دہائیاں بیت چکی ہیں مگر ایسا پرچہ میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ حرف بہ حرف علم کا دریا رواں تھا۔ لکھائی میں ایسا نکھار شاید کسی اعلیٰ کیلیوگرافر کے پاس بھی نہ ہو۔ لفظوں اور جملوں کا ایسا چناؤ جو شاید بڑے سے بڑے ادیب اور مفکروں کو بھی پیچھے چھوڑ دے۔ بات میں ایسی گہرائی کہ پڑھنے والا ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ جائے کہ یہ کسی انڈر میٹرک کے بچے کا پیپر ہے یا پھر پی ایچ ڈی کے اسٹوڈنٹ کا ریسرچ پیپر۔۔؟ لفظ بہ لفظ پڑھنے کے بعد بھی کوئی پوائنٹ ایسا نہیں تھا جہاں سے نمبر کاٹے جا سکیں۔ نہ کراس، نہ ہی اووررائٹنگ مگر ستم ظریفی ہی سمجھ لیجیے یا پھر قانون کے ہاتھوں مجبوری کہیے، گنتی کے دو نمبر مجھے کاٹنے ہی ہونگے۔ اردو

اور انگلش میں شاید ہی کبھی کسی نے اتنے مارکس لئے ہوں۔"

ایف ایس سی کا حال بھی ان سب سے جدا نہ تھا۔ جہاں جاتا اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑھ دیتا مگر اب جانے کیا ہو گیا اس کا دل پڑھائی سے اچاٹ ہونے لگا تھا۔ ایف ایس سی کے فرسٹ ٹرم میں ہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو غلط جگہ استعمال کر رہا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر شاید وہ کسی حق دار کی حق تلفی کر رہا ہے۔ یہ سب اس کا حق نہیں ہے۔ اس کے پاس تو سب کچھ ہے اور پھر آگے چل کر اس نے اپنا بزنس ہی تو سنبھالنا تھا۔ حسام تو ویسے بھی انجینئرنگ کر رہا تھا اور بعد ازاں کوئی اچھی سی جاب کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پاؤں پر خود کھڑے ہونے کے حق میں تھا اور یوں بزنس کی باگ دوڑ اسی نے سنبھالنی تھی۔ پاکستان اور انڈونیشیا میں ایکسپورٹ اور امپورٹ کا بزنس فیوچر میں اسے کے ہاتھوں میں آنا تھا۔ وہ ایف ایس سی میں اے گریڈ لے کر پاس تو ہو گیا مگر جہانزیب اور سحر فاطمہ کو ایک فکر میں لا کھڑا کیا۔ جب اس نے برملا کہا کہ وہ آگے نہیں پڑھنا چاہتا۔ یہ بات سن کر ان دونوں کو جتنی حیرانی ہوئی تھی۔ اتنا ہی جبیں اور حسام بھی چونکے تھے، یوں اچانک اس فیصلہ کا اس نے سوچ بھی کیسے لیا؟ مگر اریب بھی تو اریب تھا۔ ہر بات کا جواب جامد دلیل سے دیتا اور سننے والا خاموش ہو جاتا مگر سحر فاطمہ اور جہانزیب اپنے سپنوں کو یوں بکھرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ اریب کو آسمان پر اڑتا دیکھنا چاہتے تھے۔ بلند و بالا چوٹیوں کو اس کے پاؤں میں جھکتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ ایک عام والدین کی طرح ان کے بھی کئی سپنے اریب سے وابستہ تھے اور شاید انہی سپنوں کا پاس رکھتے ہوئے وہ آگے پڑھنے پر آمادہ ہوا تھا۔

"یہ لگ رہا ہے ناں میرا پرنس اریب۔۔" سحر فاطمہ کے الفاظ بناوٹ و لگاوٹ سے عاری تھے۔ وہ حقیقت میں ایک پرنس تھا۔ دودھیا رنگت پر سفید و گرے رنگ کا کنٹراسٹ اس پر قیامت ڈھا رہا تھا۔ درمیان سے نکلی مانگ کی بدولت اس کی حسین زلفیں دونوں جانب کے کانوں کی لو کو چھوتی جا رہی تھیں۔ ڈائمنڈ چہرے پر سوائے ابرو اور پلکوں کے کہیں بال نہ تھے۔ بے داغ روشن چہرہ گھنی پلکوں اور ابرو کے سائے میں کسی قدرت کے شاہکار سے کم نہ تھا۔ پہلی بار دیکھنے والا دوسری نظر ڈالنے پر مجبور ہو جاتا اور پھر جب مسکراتا تو موتی کی طرح چمکتے دانت دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے۔ وہ اب بھی مسکراتے ہوئے سحر فاطمہ سے محبت کے پروانے وصول کر رہا تھا۔

"وہ تو آپ نے ٹھیک کہا مگر اس پرنس کو آپ کبھی اپنی مرضی بھی کرنے دیا کریں۔۔" اس نے مسکراتے ہوئے شکوہ کیا تھا۔ جس پر سحر فاطمہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو سموتے ہوئے ماتھے کو چوما

"اور کبھی کبھی بڑوں کی باتوں میں خیر کو بھی جاننے کی کوشش کر لیا کرو۔۔"

"وہ تو کرتا ہی ہوں۔۔۔ جیسے اب آپ کی پیشانی کی لکیریں مجھے بتا رہی ہیں کہ آپ اب میرے لوٹنے تک کامیابی کی دعائیں کریں گی اور میرے آنے سے پہلے میری پسند کی تمام ڈشیں ڈائننگ ٹیبل پر سجا چکی ہونگی۔۔" اس نے ایک ہی لمحے میں سحر فاطمہ کے سارے سرپرائز کا پردہ فاش کر دیا مگر اب تو جیسے انہیں اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔

''تم باز نہیں آنے والے کبھی۔۔'' اس سے پہلے کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کی حسین زلفوں کو خراب کرتی وہ دبک کر پیچھے کھسک گیا۔

''نہیں ماما جان۔۔اب نہیں۔۔۔ یہ جو آپ کا پرنس ہے ناں۔۔خراب زلفوں کے ساتھ انٹری ٹیسٹ میں نہیں جانے والا۔۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر سحر فاطمہ سوائے گردن جھٹکنے اور مسکرانے کے کچھ نہ کر سکی تھیں۔ اتنے میں باہر گیراج سے ہارن کی آواز سنائی دی۔

''لیجیے۔۔ باباجان بھی مجھے ٹیسٹ دلوانے کے لئے کچھ زیادہ ہی ایکسائیٹڈ ہو رہے ہیں۔'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے باہر گیراج کی طرف اشارہ کیا تھا۔

''شرم کرو اریب۔۔باباجان ہیں تمہارے۔۔'' ہلکا سا اس کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔ ابھی اریب نے جواب دینے کے لئے لب ہلائے ہی تھے کہ دوبارہ ہارن کی آواز آئی۔

''اب جاؤ۔۔ورنہ تمہارے باباجان ایسے ہی ہارن بجاتے رہیں گے۔۔۔'' دعاؤں کے ساتھ اسے دروازے تک چھوڑنے گئیں اور جب تک وہ کار میں نہ جا بیٹھا اسے دیکھتی رہی تھیں۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک مسکراہٹ بھری نگاہ سحر فاطمہ پر ڈالی تھی۔

☆......☆......☆

ٹیسٹ کے شروع میں ہونے میں ابھی کچھ وقت بقایا تھا۔ داہنے ہاتھ میں موجود برانڈڈ واچ میں اس نے وقت دیکھا تو بے پرواہی سے گردن جھٹک دی۔ صرف پانچ منٹ بقایا تھے مگر چہرے پر کوئی تاثر غالب نہ تھا۔ اس کے برعکس وہاں موجود تقریباً ہر اسٹوڈنٹ کے چہرے پر فکر نمایاں تھی۔ خود اس کا دوست کامیش بھی اگرچہ ہشاش بشاش دیکھائی دے رہا تھا مگر ایک فکر، ایک تاسف وہاں بھی اپنی جگہ بنائے ہوئے تھا۔

''جسٹ چِل یار۔۔ یہ انٹری ٹیسٹ ہے۔ کوئی فائنل ایئر ایگزمز نہیں۔۔ انجوئے کر میری طرح۔۔'' کامیش کے داہنے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے اس نے دوستانہ لہجے میں کہا اور کوریڈور کی طرف چل دیا۔ وہ کامیش کے کندھے پر اپنا داہنا بازو رکھے ہوئے سب سے بے نیاز انداز میں چل رہا تھا۔ ہاتھ میں نہ کتاب تھی اور نہ ہی کوئی نوٹس سوائے بال پوائنٹ کے اس کے پاس کوئی بھی پیپر سے ریلیٹڈ مواد نہ تھا۔

''یہ سب تیرے لئے کہنا آسان ہے۔ جب وہاں جا کر question paper دیکھے گا ناں۔۔تب ہوگی بات۔۔۔ میں پچھلے دس دن سے اکیڈمی میں تیاری کے لئے جا رہا ہوں اور یہاں موجود جتنے بھی اسٹوڈنٹس ہیں ناں۔۔۔ سب کے سب کسی نہ کسی اکیڈمی سے تیاری کر کے ہی آئے ہیں۔ سب تیری طرح تو ہیں نہ کہ آخری بیس منٹ میں کتاب کو طائرانہ نگاہوں سے دیکھ کر حفظ کر لے۔۔'' کامیش نے طنز کا تیر چلایا تھا۔ یہی بات اریب کو کامیش کی اچھی لگتی تھی۔ وہ اوروں کی طرح کوئی بھی بات دل میں رکھنے کا روادار نہ تھا۔ جو دل میں ہوتا، من وعن زبان پر جاری کر دیتا۔ اگرچہ بعض اوقات کچھ تلخ باتیں بھی سننے کو ملتیں مگر ایسا سچا اور کھرا دوست بھلا کہاں ملتا ہے؟

شاید اسی لئے ان کی دوستی بچپن سے چلتی آ رہی تھی۔ کئی بار دونوں ایک دوسرے سے الجھے، ناراض ہوئے مگر دوستی کا ناتا نہ ٹوٹا۔ شاید کوئی ایسا جواز تھا جو اریب کو اس سے دور جانے ہی نہیں دیتا تھا مگر اس نے کبھی آشکار نہ کیا۔ مذہب کا فرق بھی دونوں کے درمیان دیوار نہ بنا اور نہ کبھی اریب نے یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ ان دونوں کی راہیں جداگانہ ہیں۔ وہ تو فقط راہی تھی جو ایک رستے پر چلتے جا رہے تھے اور پھر اریب بھی کہاں مذہب کے اتنے قریب تھا کہ باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا؟ ان کے پیچھے چھپے حقائق جانتا۔ اس کے نزدیک تو بس دنیا تھی اور وہ اسی دنیا میں خوش تھا۔

''یہ تو تم نے صحیح کہا ہر کوئی میرے جیسا تو ہے نہیں۔۔ آخر اسپیشل ہوں میں۔۔'' ہنستے ہوئے اس نے ہمیشہ کی طرح اپنی بڑائی ظاہر کی تھی مگر اس بڑائی میں بھی غرور کا عنصر شامل نہ تھا۔ جواب میں کامیش فقط گردن ہی جھٹک سکا تھا۔ اور کوئی جواب تو نہ بچا تھا اس کے پاس۔ چلتے چلتے وہ آڈیٹوریم کے صدر دروازے کے قریب تھے۔ وہاں کچھ سٹوڈنٹس کی لسٹ تھی۔

''چل دیکھتے ہیں ہمارا نام ہے یا نہیں؟'' کامیش نے اریب کے ہاتھ کو پیچھے جھٹک دیا اور خود آگے بڑھ کر دوسروں کے ساتھ اپنا اور اریب کا نام تلاش کرنے لگا، سٹوڈنٹس کے اس ہجوم میں گھسنا فقط کامیش کا ہی کام تھا۔ وہ ایک فاصلے پر کھڑا دوسروں کو بے نیازی کے ساتھ دیکھتا رہا تبھی اس کی نظر ایک وجود کی پشت پر پڑی تھی۔ مدھم مدھم سی آواز اس شور میں بھی وہ سن سکتا تھا۔ غالباً وہ کسی سوال کے جواب یا ایم سی کیو کو رٹا لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری تھی۔

''کیسے کیسے لوگ ہیں اس دنیا میں۔۔۔ پیپر شروع ہونے سے ایک منٹ پہلے تک کتابوں کی جان نہیں چھوڑتے۔۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا اتنے میں کامیش منہ لٹکائے اس کے پاس آ موجود ہوا۔

''ہمارا نام نہیں ہے یہاں۔۔۔'' اس کے چہرے کا رنگ بری طرح اڑا ہوا تھا۔

''تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ہوگا کسی روم میں۔۔ آ جا دیکھتے ہیں۔۔'' اریب کو یہ سن کر ذرا بھی جھٹکا نہیں لگا۔ وہ اچھے سے کامیش کی پریشانی کا سبب سمجھتا تھا۔ آڈیٹوریم میں وہ باآسانی نقل کر سکتا تھا اور کمرے میں قدرے فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث چیٹنگ کرنا ذرا مشکل تھا اور پھر وہاں sequence کا بھی کچھ زیادہ ہی خیال رکھنا پڑتا تھا۔ آڈیٹوریم میں تو ڈھیرے سے کوئی سوال پوچھنا وغیرہ ہو تو پوچھ لیا مگر کمرے میں تو سوئی کے گرنے کی آواز بھی بادلوں کی گرج محسوس ہوتی ہے۔ ابھی وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر متعلقہ روم کی طرف جا ہی رہا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر دوبارہ اس لڑکی پر پڑی جو ابھی تک نوٹس کو حفظ کرنے میں مصروف تھی۔

''کچھ لوگ تو قبر کی گھاٹ میں اترتے ہوئے بھی کتابوں کی جان نہیں چھوڑتے۔۔'' وہ جملہ اس نے اس قدر بے باکی اور باآواز بلند کہا تھا کہ اس بات کا غالب گمان تھا کہ سننے والے نے ضرور سنا ہوگا اور کسی قسم کے شک کی گنجائش بھی نہ تھی جملہ ایک فٹ کے فاصلے سے کسا گیا تھا مگر وہ لڑکی تو جیسے دنیا سے انجان اپنی ہی دنیا میں مست تھی۔

''بس ہمارے ساتھ ہی ایسا ہوتا تھا۔ سینکڑوں اسٹوڈنٹ تھے کسی اور کا روم میں کر دیتے۔۔۔'' کامیش مسلسل بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ جس کی کیفیت دیکھ کر اریب کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر رہی تھی۔ وہ دونوں پانچ منٹ بعد اپنی اپنی نشست پر براجمان تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں دس چیئرز کو ارینج کیا ہوا تھا۔ یعنی کامیش کا ڈر صحیح ثابت ہوا۔ یہاں تو سانسوں کی روانی کو بھی گنا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر اب واقعی بارہ بج چکے تھے۔ اس نے پھیکا سا منہ بنا کر اریب کی طرف دیکھا تو اس نے حیرت سے کندھے اچکا دیئے۔ دوسرے اسٹوڈنٹ بھی وہاں موجود تھے لیکن سب سے آگے ایک کرسی ابھی تک خالی تھی۔ جانے وہ کس کی جگہ تھی؟ اریب کا رول نمبر سب سے پیچھے آیا تھا۔

''آرام سے پرسکون ماحول میں ٹیسٹ دینے کا مزہ ہی الگ ہے۔'' اس نے دل میں سوچا تھا کیونکہ ساتھ ہی ایک کھڑکی تھی جس کے باہر ایک خوبصورت سا لان اپنی مسحور کن فضا کو کمرے میں داخل کر رہا تھا۔ وہ اپنی نظریں اسی لان میں جمائے ہوئے تھا۔ دونوں ہاتھوں کو کرسی کے بازو پر رکھے وہ بنا پلکیں جھپکائے لان کا قدرتی حسن اپنی آنکھوں کے مسکن میں اتار ہی رہا تھا کہ انوجیلیٹر نے اس کے سامنے Question Paper رکھ دیا مگر اس نے سرسری نگاہ انوجیلیٹر پر دوڑائی اور پھر دوبارہ باہر لان میں دیکھنے لگا، وقت سبک رفتاری سے گزرتا رہا مگر اس نے آنکھ اٹھا کر بھی Question Paper کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ باقی سب کی نظریں اپنے پیپر پر ایسے جمی تھیں جیسے دنیا میں کسی اور شے کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ کامیش کا چہرہ تو جیسے آگ کی مانند سرخ ہو چکا تھا۔ MCQs کی بھرمار دیکھ کر ایک لمحے کے لئے اس کا دل گھٹا ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر اریب کی طرف دیکھا جو سب سے انجان باہر لان میں دیکھ رہا تھا۔

''اُس کو دیکھو۔۔ کیسے بے فکر بیٹھا ہے۔۔'' وہ دل میں کڑھنے لگا تھا مگر خیر اب کیا ہو سکتا تھا۔ رنگ برنگے منہ بناتے ہوئے اس نے پہلے آپشن کو سرکل کیا تھا اور پھر یہ پروسس جاری رہا۔ ایک ایک سوال کو دو دو بار پڑھتا اور پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے میں کچھ وقت گزار کر کسی ایک کو سرکل کر دیتا۔ باقی سب بھی کچھ ایسا ہی کر رہے تھے مگر ان میں ایک وجود ایسا بھی تھا جو پورے انہماک سے پیپر solve کر رہا تھا۔ وہ وجود اسی کرسی پر براجمان تھا جو اریب اور اس کے دوست کے آنے تک خالی تھی۔ شاید عین وقت پر وہ وجود داخل ہوا تھا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ جس کی زلفیں دائیں جانب جھکی ہوئی تھیں۔ جو ایک آڑ کا کام کرتے ہوئے اس کے چہرے کو سب سے اوجھل کر رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت بال پوائنٹ پر اس قدر مضبوط تھی کہ اس کی نازک ہاتھوں میں ابھار پیدا ہونے شروع ہو چکے تھے مگر اسے کہاں پرواہ تھی؟ پورے انہماک سے وہ اپنا پیپر solve کر رہی تھی مگر اریب وہ تو ابھی تک باہر ہی دیکھتا جا رہا تھا۔ انوجیلیٹر بھی قدرے حیران تھا مگر اس کے دل میں باہر دیکھنے کا سبب سمجھ نہ آیا۔ شاید وہ اسے چیٹنگ کا کوئی نیا طریقہ سمجھ رہا تھا۔

''اگر آسمان سے وحی اترنا ہو گئی ہے تو پیپر شروع کر دیا جائے؟'' انوجیلیٹر کے یوں اچانک وار سے اریب بری طرح بوکھلایا تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ انوجیلیٹر اس کے سر پر ہی کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اریب کے چہرے پر ناگواری کے تاثر نے جنم لیا تو انوجیلیٹر

نے ابرو اچکاتے ہوئے اسے اپنی نگاہیں پیپر پر ٹکانے کو کہا۔ اریب کو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا حکم ماننا پڑا۔

وال کلاک پر ۱۱ بج کر ۱۵ منٹ ہوئے تھے، جب اریب نے اپنی بال پوائنٹ ہاتھ میں تھامی تھی۔ سب سے پہلے نام اور رول نمبر لکھا اور پھر عجلت کے ساتھ ایک کے بعد ایک آپشن کو سرکل کرتا چلا گیا۔ انویجیلیٹر نے ابھی دو چکر ہی مکمل کیے تھے کہ اریب نے غصے میں اپنا ہاتھ کرسی کے بازو پر رکھا تھا۔ جس سے ایک تھاپ کی آواز پیدا ہوئی جس نے پورے کمرے میں ڈسٹربنس پیدا کی تھی۔ سب اسٹوڈنٹ نے اس کی طرف غصے میں دیکھا تھا سوائے اس پہلی کرسی پر بیٹھی لڑکی کے۔ جسے شاید یہ آواز سنائی ہی نہیں دی تھی۔ انویجیلیٹر نے قریب آکر اسے کھڑا کیا

"یہ کیا حرکت ہے؟" اس سوال کا جواب اس نے **question paper** اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے دیا تھا۔ انویجیلیٹر تو جیسے سکتے میں آچکا تھا۔ اس نے وال کلاک پر نظر دوڑائی تو وہاں ابھی ۱۱ بج کر ۲۲ منٹس ہوئے تھے۔ یعنی فقط سات منٹ میں اس نے پچاس کے قریب **MCQs** نہ صرف **Solve** کیے تھے بلکہ اسے اپنے آپ پر اس قدر یقین تھا کہ دوبارہ دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

"کیا اب میں جا سکتا ہوں؟" اریب نے روکھے پن سے پوچھا تو انویجیلیٹر نے بے یقینی کے ساتھ اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ اریب کے اس قدر جلدی پیپر **attempt** کرنے پر تجسس کے سمندر میں غوطہ زن ہوا تھا۔ اریب نے بال پوائنٹ کو وہیں چھوڑا اور آگے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس کے قدم اتنے جان دار تھے کہ پورے کمرے میں آواز پیدا کر رہے مگر اس بار انویجیلیٹر نے اسے کچھ نہ کہا۔ دروازے پر پہنچ کر جیسے ہی اس نے مقفل دروازہ کھولنا چاہا تا مخالف سمت کا ہاتھ ایک وجود کے بالوں میں بری طرح الجھ گیا۔ اس کی کفوں کے بٹن ذرا باہر کو ابھرے ہوئے تھے جو شاید اس کے کھلی زلفوں میں پھنسنے کا بہانہ بن گئے۔

"آہ۔۔" وہ لڑکی بری طرح کراہی تھی۔ اریب نے پلٹ کر دیکھا تو اس کے چہرے پر بال بے ترتیب بکھرے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر اس کے دل میں حقارت آمیز جذبات پیدا ہوئے تھے۔

"بڑی آئی پیپر دینے۔۔" اس نے زیرِ لب کہا اور بری طرح اپنے بازو کو کھینچ لیا۔ وہ لڑکی بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی شاید اس لئے پلٹ کر کوئی جواب نہ دیا اور دوبارہ اپنے پیپر پر نظریں جمالیں۔ مگر ان سب میں ایک منٹ کا وقت صرف ہو چکا تھا۔ جس کے ضائع ہونے کا ملال اس کے دل میں اب ہمیشہ رہے گا۔ اس کی آنکھوں سے شبنم کے قطروں سے بھی زیادہ حجم رکھتے آنسو ٹپکنے لگے مگر یہ وقت آنسو بہانے کا نہیں تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی پشت سے انہیں وہیں بند لگایا اور دوبارہ پیپر کرنے لگی۔ کسی نے بھی بالوں کی اوٹ سے ان آنسوؤں کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ دیکھانا چاہتی تھی۔ جو وقت بیت چکا تھا، وہ واپس تو مل نہیں سکتا تھا اور پچھتانے کا اب وقت نہیں تھا۔ اگر گزرے وقت کو کوستی تو مزید وقت ہاتھ سے ریت کی مانند پھسل جاتا جو وہ کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

سب یکے بعد دیگرے اٹھتے چلے گئے۔ وقت کی دھار ختم ہونے کو تھی مگر وہ ابھی تک بیٹھی اپنے پیپر کا جائزہ لے رہی تھی۔ سب

سے آخر میں اس نے ہی پیپر دیا تھا۔ انوبجیلیٹر پیپر کو سیٹ کرنے کے بعد کمرے سے چلا گیا۔ اب وہاں کوئی نہ تھا۔ ایک منٹ کے ضائع ہونے کا اب وہ اچھے سے ماتم منا سکتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو اس قدر تیزی سے بہنے لگے جیسے جانے کتنی اذیتوں کو اس نے ایک منٹ میں سہا ہو۔ جانے کتنے درد اُس ایک منٹ میں اس کی جھولی میں آگرے ہوں؟ جانے کتنے پر خطر لمحات سے وہ اُس ایک منٹ میں گزری ہو۔ اپنے لبوں کو دباتے ہوئے اس نے اپنی آواز کو حلق میں ہی دفنانا چاہا تھا مگر دل کا ملال بھلا کہاں چھپتا ہے؟ دھیمی سی آواز کمرے کی خاموش فضا میں گونجنے لگی۔ آنکھوں میں سپنے دم توڑنے لگے۔ جانے اس ایک منٹ کے بدلے کتنی بار اس نے اُس وجود کو کوسا تھا جو اس منٹ کو ضائع کرنے کا موجب بنا تھا۔ وقت کی دھاڑا آگے بڑھتی گئی اور رزلٹ کا دن قریب سے قریب تر ہوتا گیا۔

اُس دن اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ جانے اس کا خواب پورا بھی ہوا ہوگا یا نہیں؟ اس کی محنت کا صلہ اسے ملا بھی ہوگا یا نہیں؟ راتوں کی نیند سے خفگی، اس کے خوابوں کو تعبیر کا درجہ دینے میں جانے کتنی پیش خیمہ ثابت ہوئی ہوگی۔ وہ سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ عام سی لڑکی یا پھر عام نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چہرے پر اتنا نکھار تو نہ تھا مگر وہ چہرہ اتنا عام بھی نہ تھا تبھی ایک بار دیکھنے والا دوبارہ نگاہ اٹھا کر ضرور دیکھتا مگر آنکھوں میں چھپی تشنگی کچھ اور ہی ڈیمانڈ کرتی تھی۔ وہ ان سب سے بے خبر نوٹس بورڈ کی طرف بڑھی مگر وہاں تو ایک لمبی قطار تھی۔ لڑکوں کی بھرمار نوٹس بورڈ کو اچک لے جانے کو تیار تھی۔ وہ بے چینی سے اپنا نام دیکھنے کی تاک میں کھڑی اچھل اچھل کر دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب اس کی سماعت سے وہ آواز ٹکرائی تھی۔

”یار حیرت ہے، اتنے نمبر۔۔۔ وہ لڑکی ہے یا کوئی جن زادی۔۔“ یہ آواز سن کر اس کے دل میں ایک کسک ابھری۔ وہ اب مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

”ایکسکیوزمی۔۔“ وہ لڑکوں کی بھرمار کو نظرانداز کرتی چلی گئی اور سب سے آگے بڑھ کر اپنا نام ٹاپ پر دیکھ جیسے اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ہاں! یہ وہی تھی۔ اسی کا نام ٹاپ پر تھا

”ہانیہ عمر دراز۔۔۔!!!“ وہ زیر لب بڑبڑائی تھی

”عجیب لڑکی ہے ۱۰۰ پرسنٹ نمبر۔۔۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟“ مختلف چہ مگوئیاں اس کی سماعت میں گونج رہی تھی مگر اس کی آنکھوں سے آنسو ہی تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ایک منٹ کا ملال اس کے دل سے نکل چکا تھا۔ اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر سب کو اپنی طرف متوجہ کر کے بتائے کہ وہ ہے ہانیہ عمر دراز۔۔ جس نے پوری یونیورسٹی میں ٹاپ کیا ہے۔ جس نے ان امیر زادوں کو ناکوں چنے چبوائے ہیں۔ ان امیر زادیوں کو آسمان سے دھرتی پر دے پھینکا ہے جو پیسوں کی آڑ میں اسے پیچھے چھوڑنے چلی تھیں۔ اس کے قدم اگرچہ زمین پر تھے مگر وہ فضا میں جھول رہی تھی۔ ہر شے کو اپنے اوپر رشک کرتا وہ دیکھ سکتی تھی۔ اپنے نازک سے جسم کو فضا کی آغوش میں آسمانوں کی سیر کرتا وہ محسوس کر سکتی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ پیچھے ہٹی تو ایک اور اس پر انکشاف کیا گیا۔ شاید وہ اپنا نام دیکھ کر

باقی لسٹ دیکھنا بھول ہی گئی تھی اور صحیح تو کیا تھا اس نے۔ بھلا باقیوں کو وہ کیونکر دیکھتی؟ ظاہری بات تھی اگر وہ ٹاپ پر ہے تو باقی اس سے نیچے ہی ہونگے مگر ایسا نہیں تھا۔ وہ اکیلی ہی ٹاپ پر نہ تھی۔ کوئی اور بھی ٹاپ پر تھا۔ جو اس کی پوزیشن کو بانٹ رہا تھا جو کہ اس کی انا پر ایک حملہ تھا۔

''یار لڑکی تو لڑکی۔۔۔ یہ لڑکا بھی؟'' ایک انجان آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی

''ہاں یار۔۔ سنا ہے یہ وہی لڑکا ہے جس نے فقط سات منٹ میں ٹیسٹ دیا تھا۔۔'' دوسرے نے نیا انکشاف کیا تھا۔ جس پر وہاں موجود تمام اسٹوڈنٹس مارے حیرت کے اس کو تکنے لگے جیسے اس نے کوئی ان ہونی بات کر دی ہو۔ ویسے ان ہونی بات ہی تو کی تھی اس نے۔ خود ہانیہ عمر دراز کے قدم بھی ایک لمحے کو منجمد ہو گئے۔ ایک سرد لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ بن دیکھے اسے نہ جانے کیوں اسے اس وجود سے کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے حقارت آمیز نگاہوں سے پلٹ کر اس ماخذ کو تراشنا چاہا تھا جہاں اس انجان وجود کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔ جن لبوں سے اس کی تعریف ہونی چاہیے تھی، ان لبوں سے اُس اجنبی کی خداداد صلاحیتوں کے پھول بکھیرے جا رہے تھے۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو تم سب؟ وہ میرے ساتھ کمرے میں ہی تھا۔ پندرہ منٹ تک وہ وقت ضائع کرتا رہا باہر جھانکتے ہوئے اور پھر جب انویجیلیٹر نے اسے ڈانٹا تو اس نے صرف سات منٹ میں پیپر اس کے منہ پر دے مارا۔۔۔'' وہ اب اپنی بات کی وضاحت کرر ہا تھا

''لیکن تمہیں کیسے معلوم کہ یہ وہی لڑکا ہے؟'' پوچھنے والے نے تصدیق چاہی تھی

''ہاں یار۔۔ تم اتنے وثوق کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو؟ ہو سکتا ہے کہ کوئی اور ہو یہ۔۔۔'' ساتھ والے لڑکے نے بات کو آگے بڑھایا مگر اس نے نفی میں گردن ہلا دی

''نہیں۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔۔ اس کے جانے کے بعد انویجیلیٹر نے اس کا نام زیرِ لب پکارا تھا۔۔۔ اریب عالمگیر۔۔۔ اور تم خود دیکھ لو لسٹ میں کہیں بھی دوسرا اریب نامی لڑکا نہیں ہے۔'' اس کے کہنے پر ہانیہ نے پلٹ کر لسٹ کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں واقعی کوئی اور اریب نہیں تھا۔ سب آوازیں آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئی۔ ہواؤں کی سرگوشیاں بھی ایک لمحے کو تھم گئی۔

''تو تم ہو میرے ٹارگٹ۔۔۔؟ میرے راستے میں آنے والی رکاوٹ۔۔۔'' اس نے حقارت آمیز نگاہوں سے اس نام کی طرف دیکھا تھا جو اس کے نام سے کچھ فاصلے پر ہائی لائیٹ تھا۔ جسے کچھ دیر پہلے اس نے نظر انداز کر دیا تھا مگر وقت نے بڑی تیزی کے ساتھ بازی پلٹی تھی۔ اس کے خواب کو بری طرح کرچیوں کی مانند بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ وہ ٹاپر ہونے کے باوجود بھی گمنام تھی۔ لڑکی ذات ہونے کے باوجود تمام اُس لڑکے کی شان میں قصیدے پڑھ رہے تھے جس نے فقط سات منٹوں میں ٹیسٹ کلئیر کیا تھا؟ اسے اس بات کی پرواہ نہ تھی یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اسے تو بس یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ وہ اس سے آگے کیسے نکل گیا؟ ٹاپ پوزیشن پر فقط اس کا حق تھا۔ کوئی اس کی شراکت داری کیسے کر سکتا تھا؟ کیسے؟

☆......☆......☆

آج وہ اپنی کلاس فیلو کے ساتھ شوپنگ پر گئی تھی۔ اگرچہ اس کی عمر پندرہ برس تھی مگر اس کے ناز نکھرے کسی بگڑی اولاد سے کم نہ تھے۔ مال میں شاپنگ کرتے ہوئے اس نے جتنی بے دردی کے ساتھ ایک فقیر کو جھڑ کا تھا سب کی استفہامیہ نگاہوں نے ایک ثانیے تک اس کا تعاقب کیئے رکھا تھا۔

''تمہیں کیا ضرورت تھی اس سے الجھنے کی؟ تم آرام سے بھی تو منع کر سکتی تھی ناں اسے؟'' اس کی دوست نے سمجھانے کی اپنی تئیں کوشش کی تھی مگر نصیحت کا اثر تو ان پر ہوا کرتا ہے جن کے دل میں کچھ پانے کی حرص ہو، جن کے دل خیر کو قبول کرنے کی طلب رکھتے ہوں مگر اس کا دل تو جیسے ان سب سے عاری تھا۔ اپنی دوست کی بات پر اس نے ناک منہ چڑھالیا اور لمبے لمبے ڈگ بڑھتی ہوئی شاپ سے باہر نکل آئی۔

''تم نے دیکھا نہیں کیسے وہ بے غیرت انسان کا بچہ میرے پرس کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ مٹی میں کتنی بڑی طرح اس کے ہاتھ اٹے ہوئے تھے۔ کل ہی پاپا سے کہہ کر یہ پرس منگوایا تھا اور آج ہی اس نے اسے چھو کر میلا کرنے کی کوشش کی۔ دیکھو کتنی گرد لگ گئی ہے اس کے چھونے سے ہی۔۔'' وہ سفاکیت کے ساتھ اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔ آنکھوں میں غرور و متکبرانہ عنصر دور سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔

''لیکن اس نے کچھ پیسے ہی تو مانگے تھے۔۔ دے دیتی تم۔۔ کیا جاتا تمہارا؟''

''ایسے کیسے دے دیتی؟ حرام کی کمائی تھوڑی ہے، جو ان فقیروں پر لٹاتی پھروں؟ ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے ہوئے مانگتے پھرتے ہیں۔'' اس نے اپنے لفظوں کا بھی پاس نہ رکھا تھا۔ اس کی دوست ایک لمحے کے لئے اپنی جگہ پر ساکت رہ گئی۔ صحیح کہا تھا اِس نے، حرام کی کمائی تھوڑی تھی یہ۔۔۔ جو وہ فقیروں پر لٹاتی۔۔ اس سے بہتر تو اس کمائی کو جلا دینا تھا۔ جیسے ایک سال پہلے اس نے اپنی سالگیرہ کے موقع پر کیا تھا۔ پانچ سو ڈالر کی فراک کو لحہ بھر میں نظر آتش کر دیا تھا۔ پورے گھر کو دھوئیں کے بادلوں سے بھر دیا تھا۔ فقط ایک خواہش کے پورا نہ ہونے پر ہزاروں ڈالرز کا نقصان کیا تھا۔ اسے تھوڑا اجاڑنا کہتے ہیں؟ پیسے تو تب اجڑتے ہیں جب کسی فقیر کو دیئے جائیں۔

اس کی دوست سوچ کر رہ گئی۔ جب کہ وہ آگے بڑھ چکی تھی۔ غرور و تکبر کی راہوں میں خاک اڑاتی اس کی ذات ہر شے کو مسمار کرتی جا رہی تھی۔ گھر آنے کے بعد بھی وہ اس فقیر کے احساس کو اپنے پرس کے گرد محسوس کر سکتی تھی۔ ایک عجیب سی بو، جو اس کی ذات میں بے چینی کے سمندر میں طوفان برپا کیئے ہوتی تھی، اس کو اندر ہی اندر سے غرق کر رہی تھی۔ سامنے ڈریسنگ پر رکھا وہ پرس اس کو منہ چڑھا کر اس کی انا کو ٹھیس پہنا رہا تھا۔ وہ اپنی چیزوں میں کسی کی بھی شراکت کو قطعا برداشت کرنے کی روادار نہ تھی۔ ایک ملازمہ کو بھی اس کی چیزوں کو چھونے کی اجازت نہ تھی اور یہاں تو ایک عام سا فقیر تھا جس کے ہاتھ مٹی میں بری طرح اٹے ہوئے تھے۔ جس کے منہ سے بدبو کے بھبکے نکل رہے تھے۔ اُس نے اس کے پرس کو چھونے کی جسارت کی تھی۔ اب بھلا وہ ایسے پرس کو کیسے اپنے کمرے میں برداشت کر سکتی تھی۔ چیخ کر ملازمہ کو بلایا اور اس پرس کو اٹھا کر باہر پھینکوا دیا۔

☆......☆......☆

پاکستان اور انڈیا کا میچ جاری تھا۔ جہانزیب اور حسام صوفے پر بیٹھے میچ میں اس قدر محو تھے کہ آس پاس کی انہیں کچھ خبر نہ تھی۔ سحر فاطمہ کچن میں ان کے لئے نگٹس بنانے میں مصروف تھی جبکہ جبیں حسام کے سامنے صوفے پر بیٹھے ہی موبائل پر اپنی دوست کے ساتھ چیٹنگ میں مصروف تھی۔ اریب تو ان سب سے عاجز تھا۔ صوفے کے سامنے رکھی ٹیبل کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھا جبیں کی پریکٹیکل کاپی بنانے میں مصروف تھا۔ جبیں ہمیشہ سے اپنی پریکٹیکل کی کاپی اریب سے بنواتی رہی تھی۔ ویسے بھی اریب کو آرٹس میں انٹرسٹ تھا اور کافی اچھی ڈرائنگ بنالیا کرتا تھا۔ اب بھی وہ پچھلے ایک گھنٹے سے بیٹھا بائیولوجی کی ڈرائنگ بنارہا تھا۔ ویسے تو یہ اس کے لئے بیس منٹ کا کام تھا لیکن میچ کی کمنٹری مسلسل اس کا دھیان بانٹ رہی تھی۔

”اُف۔۔ آپ لوگ بور نہیں ہوتے۔۔ اس بے کار کھیل کو دیکھ کر۔۔ کیا ہی بور کھیل ہے؟ سب پاگلوں کی طرح ایک گیند کے پیچھے بھاگتے رہیں گے۔ ہنوں۔۔“ اریب نے منہ چڑھا کر کہا تھا۔

”تم تو خاموش ہی رہو۔۔۔ تمہیں کیا معلوم کتنا مزہ آتا ہے میچ دیکھنے میں۔۔۔“ حسام نے ٹی وی پر نظریں جمائے کہا تھا۔ جس پر اریب نے ایک نظر ٹی وی کی طرف دیکھا جہاں پاکستان ٹیم بیٹنگ کر رہی تھی اور بری طرح مشکلات کا شکار تھی۔ صرف دو اوورز میں تین کھلاڑی آوٹ ہو چکے تھے۔ اس نے طنزیہ انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے اپنی نظریں دوبارہ بائیولوجی کی پریکٹیکل کاپی مر پر کوز کیں۔

”اف۔۔ ایک اور کھلاڑی آوٹ۔۔۔“ حسام نے ایک زوردار ہاتھ صوفے پر دے مارا تھا

”لگتا ہے آج کا میچ بھی پاکستان کے ہاتھوں سے گیا۔۔“ جہانزیب عالمگیر نے بجھے ہوئے دل سے کہا تھا۔ جس پر حسام کا چہرہ بھی بجھا بجھا سا دکھائی دینے لگا۔ جبیں نے ایک نظر ٹی وی پر دوڑائی اور پھر دوبارہ اپنی دوست کے ساتھ چیٹنگ میں مصروف ہوگئی۔

”یہ میچ تو یونہی چلتا رہے گا۔۔ آپ ذرا یہ نگٹس کھائیں۔۔“ سحر فاطمہ نے کچن سے آتے ہوئے کہا تھا اور پلیٹ کو ٹیبل پر رکھ دیا۔ ساتھ ہی کیچپ کو سائیڈ پر پلیٹ میں ڈالا اور حسام کے ساتھ ہی براجمان ہو کر ٹی وی کی طرف سرسری نگاہ دوڑائی۔

”اب دیکھنے کا کیا فائدہ؟ چار کھلاڑی آوٹ ہو چکے ہیں۔۔ ہار یقینی ہے پاکستان کی۔۔“ سحر فاطمہ نے کڑوا سچ بولا تھا۔ جس پر حسام کو غصہ آ گیا۔

”ماما جان۔۔ کم سے کم اچھا بولا تو جا سکتا ہے ناں۔۔“ اُس نے چڑ کر کہا تھا۔ عین اسی وقت اریب نے ہاتھ بڑھا کر نگٹس اٹھائے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نظر ٹی وی سکرین پر نئے آتے بیٹس مین پر گئی۔ جسے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہنسی کی لہر آ گئی۔

”اب تم کیوں ہنس رہے ہو؟“ حسام جو پہلے ہی دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ اریب کو یوں ہنستا دیکھ کر جل کر بولا۔

”وہ اس لئے کہ یہ بھی ٹُو چل میں آیا کی ریت پوری کرنے آیا ہے۔۔“ یہ سننا تھا کہ حسام نے ہاتھ میں موجود ریموٹ سامنے دے مارا۔ بے چارا بے موت مارا گیا اور پرزے پرزے ہو کر زمین پر بکھر گیا۔

''یہ کیا بھائی۔۔اس میں بھلا اس بے چارے ریموٹ کا کیا قصور؟'' اریب نے بمشکل اپنی ہنسی کو ضبط کیا تھا

''میرا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔۔'' بات ٹالنے کی غرض سے جھٹ اریب نے کہا

''اندازہ غلط ہوا اور وہ بھی تمہارا۔۔۔'' مصنوعی طور پر چونکتے ہوئے حسام نے کہا اور اپنی نظریں ٹی وی سے ہٹا کر نگٹس پر مرکوز کر لیں۔جبیں جوان سب باتوں کو سن رہی تھی۔مزہ لینے کی غرض سے ٹی وی کی طرف دیکھا۔اریب اپنی جان بخشوانے کی غرض سے پہلے ہی چیزیں سمیٹ کر ایک طرف ہو چکا تھا۔سحر فاطمہ نے گردن جھٹکتے ہوئے جہانزیب کو نگٹس سرو کیے۔اتنے میں ٹی وی سے ایک زوردار آواز آئی۔جس پر ایک زبردست قہقہ گونجا۔یہ قہقہ جبیں کی طرف سے سنائی دیا تھا۔حسام کی کچا چبا جانے والی نگاہوں نے اس قہقوں کو چپ کروا دیا۔

''دیکھا۔۔۔ہو گیا نہ تمہارا اندازہ صحیح۔۔۔کم سے کم پہلے امید تو تھی ناں۔۔۔'' وہ دفعتہً صوفے سے اٹھا اور وہاں سے اپنے روم کی طرف جانے لگا تھا۔

''کہاں چل دیئے تم؟'' سحر فاطمہ نے استفسار کیا تو اس نے پلٹ کر بجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''اپنے کمرے میں اور کہاں۔۔۔اب یہاں مزید بیٹھا رہا تو میرا خون تو سڑ سڑ کر ختم ہی ہو جائے گا۔۔'' اس بار اریب گردن جھکا کر ہنس دیا۔

''بھائی۔۔اگر آپ کا خون زیادہ ہی فالتو ہے تو جا کر کسی کو ڈونیٹ کر دیں۔۔ویسے ہی جلنے سے تو بہتر ہے ناں۔۔'' اریب نے فوراً چٹکلہ چھوڑا تھا۔جس پر حسام کی تیکھی نگاہوں میں مزید حدت آ گئی۔

''اریب۔۔تم۔۔۔'' وہ اپنے غصے کو ضبط کر کے رہ گیا۔سحر فاطمہ کے گھورنے پر اریب نے گردن کو جھکا کر ترچھی نگاہ سے ٹی وی کی جانب دیکھا جہاں سے اب نیا بیٹس مین آتا دکھائی دے رہا تھا۔اس کو دیکھ کر ہی وہ پر جوش انداز میں چلا اٹھا۔

''بھائی۔۔'' وہ اس قدر پر جوش انداز میں بولا تھا کہ اس کے ہاتھ سے نگٹس نیچے زمین پر آ گرا مگر اس نے ذرا پرواہ نہ کی۔جبیں کی بھی توجہ موبائل سے ہٹ کر اریب کی طرف ہو گئی۔سحر فاطمہ اور جہانزیب بھی اس کے یوں بولنے کا سبب نہ سمجھ سکے۔

''اس بیٹسمین نے انڈیا کے چھکے چھڑا دیئے ہیں۔۔'' یہ سننے کی دیر تھی کہ حسام کے جاتے قدم رک گئے۔سارا غصہ اڑنچھو ہو گیا اور فی الفور اریب کی جانب لپکا اور اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بڑے ہی پیار سے پوچھا۔

''تم سچ کہہ رہے ہو ناں۔۔'' اس کے الفاظ سے شہد ٹپک رہا تھا۔ایسا بالکل بھی نہیں لگ رہا تھا کہ ابھی ابھی وہ غصے میں تھا یا جلا بھنا وہاں سے جا رہا تھا۔سحر فاطمہ یہ دیکھ کر مسکرا دی اور آگے بڑھ کر گرا ہوا نگٹس اٹھا کر پلیٹ میں رکھا۔

''اب مجھے جھوٹ بولنے سے بھلا کیا حاصل ہوگا؟'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر ایسا ہو گیا ناں۔۔تو مزہ آ جائے گا۔۔''اس نے فرط جذبات میں کہا تھا۔

''بھلا اریب کی بات آج تک کبھی غلط ہوئی ہے جواب ہوگی؟''جبیں نے اریب کی تائید کی تھی اور سب کی نظریں اب ٹی وی پر مرکوز تھیں۔سب اریب کے الفاظ کو سچ ہوتا دیکھنا چاہتے تھے اور پھر وہی ہوا جو اریب نے کہا تھا۔فقط ایک اوور میں پاکستان کے سکور بورڈ میں بائیس رنز کا اضافہ ہوا۔پاکستان کو میچ میں دوبارہ آتا دیکھ کر حسام نے اریب کو پکڑ کو جھولایا۔جس پر سب ہنس دیئے۔

''اب بس۔۔بس۔۔''اریب نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا

''میں نہ کہتی تھی کہ اریب کی بات کبھی غلط ثابت نہیں ہو سکتی۔۔''جبیں نے کہا اور دوبارہ چیٹنگ میں مصروف ہوگئی۔کچھ ہی دیر میں وہ دوبارہ اریب سے مخاطب ہوئی۔

''تمہیں پتا ہے اریب میں اُس سے تمہارے بارے میں بات کر رہی ہوں۔۔۔''یہ سنتے ہی اریب نے سب کچھ چھوڑا اور جبیں کی طرف چل دیا

''اچھا۔۔مطلب میری برائی ہو رہی ہے۔۔''وہ اس کے پاس آ بیٹھا تھا۔جبیں نے کشن اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور سارا وزن اس پر جما دیا

''جی نہیں۔۔اسے تمہارے اس اندازے کے بارے میں بتا رہی تھی جو تم نے ابھی ابھی لگایا ہے۔''جبیں نے وضاحت کی۔

''اچھا۔۔لیکن اسے بتانے سے کیا ہوگا؟وہ کوئی میری حمایتی ہے۔''اس کا جوش یک دم ماند پڑ گیا تھا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔۔وہ آج کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔''جبیں نے کہا

''سچ۔۔۔اور کیا پوچھا اُس نے میرے بارے میں؟''جبیں کے جواب پر اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ٹی وی لاؤنج میں باقیوں کو وہ دونوں یکسر فراموش کر چکے تھے۔وہ آگے کو جھک کر دھیرے سے بولا تھا

''دونوں بہن بھائیوں میں کیا کھسر پھسر ہو رہی ہے؟''میچ میں ذرا وقفہ آیا تو حسام بھی دونوں میں آ گھسا اور اریب کو سائیڈ کی طرف دھکیلتے ہوئے خود دونوں کے درمیان آ بیٹھا

''بھائی۔۔کباب میں ہڈی نہیں بنتے۔۔''اریب چڑ کر بولا تھا۔خدا خدا کر کے وہ آج دلچسپی لے ہی بیٹھی تھی تو حسام بیچ میں آ گیا۔

''میں کباب میں ہڈی کب بنا۔۔یہ میری بھی بہن ہے۔''اریب نے جھٹ جواب دیا جس پر جبیں ہنس دی۔

''بھائی کو چھوڑو۔۔تم بتاؤ کہ کیا پوچھ رہی تھی وہ میرے بارے میں؟''اس نے حسام کی پشت کے پیچھے سے پوچھا تھا۔

''پشت کے پیچھے سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔سامنے سے بھی تو ہو سکتی ہے ناں۔۔''حسام نے مداخلت کی

جس پر اریب مزید چڑ گیا۔

"بھائی۔۔آپ خاموش تو رہو ناں۔۔۔" اس کے چہرے پر شکن نمودار ہو گئے۔

"تم پھر سے شروع ہو گئے۔۔کبھی ایک جگہ چین سے نہیں بیٹھو گے۔۔۔اور تم جبیں۔۔اٹھو یہاں سے، جا کر کل کے پیپر کی تیاری کرو۔۔زرا بھی فکر نہیں ہے کل پیپر ہے تمہارا۔۔بیٹھے ایسے چیٹنگ کر رہی ہو جیسے امتحان ختم ہو چکے ہوں۔۔" سحر فاطمہ نے جبیں کی سرزنش کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے موبائل چھین لیا۔

"ماما۔۔اسے خدا حافظ تو کہنے دیں۔۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل لینے کی کوشش کی تو سحر فاطمہ نے نفی میں گردن ہلا دی جس پر اس کا چہرہ اتر گیا۔

"میں کہہ دوں گی خدا حافظ۔۔تم جاؤ یہاں سے۔۔چلو۔۔اریب نے پریکٹیکل کاپی تو بنا ہی دی ہے۔جا کر ایک بار دیکھ لو۔۔ چلو شاباش۔۔" سحر فاطمہ نے ابرو اچکاتے ہوئے کہا تھا۔جس پر اس نے ناک سکیڑتے ہوئے کشن کو پورے زور سے دائیں جانب دے پھینکا۔اریب کا بھی چہرہ اتر سا گیا تھا۔اتنے عرصے بعد اس کے بارے میں بات ہو رہی تھی اور بنا کسی نتیجے کے ختم ہو گئی۔

"تمہارا چہرہ کیوں اتر گیا؟" حسام نے انجان بنتے ہوئے پوچھا

"کچھ نہیں۔۔" وہ چڑ کر بولا اور اٹھ کر کمرے کی طرف جانے لگا

"اب اسے کیا ہوا؟" سحر فاطمہ نے پوچھا تو حسام نے شانے اچکا دیئے۔

☆......☆......☆

؎ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

آج یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا۔ہمیشہ کی طرح بنا کوئی نوٹس یا پیپر بک لئے وہ نیورسٹی میں آیا تھا۔کامیش ہمیشہ کی طرح اس کا پہلے سے منتظر تھا۔صبح کے دس بج چکے تھے۔گرمیاں اپنے اختتام کی طرف گامزن تھیں مگر جانے سے پہلے بھی انسان کی یادداشت میں اپنی یادیں نقش کر رہی تھیں۔آسمان پر اگرچہ ہلکے ہلکے بادل نمایاں تھے مگر ان بادلوں کے سینے کو چیر کر سورج کی باریک کرنیں بھی حدت کا ایسا طوفان برپا کیے ہوئے تھیں کہ ان بادلوں کا ہونا بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔لوگ دھوپ سے ایسے اپنے دامن کو بچا رہے تھے جیسے ابھی یہ روشنی ان کو جھلسا کر خاک کر دے گی۔وہ اپنی کار میں پارکنگ ایریا آیا تھا۔سیاہ رنگ کی کار جو اس کی پرسنیلٹی سے عین میچ کھاتی تھی۔دیکھنے والوں کی نظریں جتنی اس کی ذات کی طرف کھنچی چلی جاتی تھی۔اتنا ہی اس کی شوخیوں کو بام عروج پر پہنچا دیتیں۔اگرچہ وہ سب سے بے نیاز تھا مگر اپنی ذات کو ممتاز رکھنے میں بھی اسے تاحد درجہ کمال حاصل تھا۔زلفوں کی شوخیاں ہو یا لبوں پر مچلتی جان شکن مسکراہٹ، رخسار پر چھائی رعنائیں ہوں یا اپنے اندر غرق کرتی سیاہ آنکھیں، پرکشش شخصیت ہو یا بے نیازی سے اٹھتے قدم۔۔

وہ اب مسکراہٹ کو اپنے لبوں پر بکھیرتے ہوئے کامیش کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس کے سامنے چند قدم کے فاصلے پر سینے پر دونوں ہاتھوں کو باندھے کار کے ساتھ ٹیک لگائے اسی کو گھور رہا تھا۔ وہ بنا پلکیں جھپکیں اسی کو تکتا جا رہا تھا۔ پاس پہنچ جانے پر اس نے چٹکی بجا کر اس کو پلکیں جھکانے پر مجبور کر دیا

''تم نے کیا قسم کھا رکھی ہے مجھے انتظار کروانے کی؟'' وہ غصیلے انداز میں بھڑکا تھا

''شانت۔۔۔ شانت۔۔۔ میری جان۔۔۔'' وہ اس کے غصے کو کم کرنے کی غرض سے بولا تھا۔

''شانت کے بچے۔۔ پچھلے بیس منٹ سے کھڑا ہوں یہاں پر۔۔ اگر دیر سے ہی آنا تھا تو کم سے کم ایک میسج ہی کر دیتا کہ مجھے آنے میں دیر ہو جائے گی مگر نہیں تمہیں تو مجھے انتظار کروانے میں مزہ آتا ہے۔۔'' وہ بری طرح بھڑکا ہوا تھا۔ اس کا انداز بالکل شہد کی مکھیوں کے بپھرے ہوئے جھنڈ کی طرح تھا لیکن سامنے کھڑا کوئی عام شخص تو تھا نہیں۔ اریب بھی بخوبی اس کو ہینڈل کرنا جانتا تھا۔

''میسج کیسے کرتا؟ برین سگنلز سے۔۔ ہاں اگر ایسی ٹیکنالوجی ایجاد ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔ ادھر دماغ میں کوئی بات سوچو اُدھر دوسرے کے دماغ تک پہنچ جائے۔ یقین جان کامیش اگر ایسی ٹیکنالوجی ایجاد ہو گئی تو قسم سے سب سے پہلے تجھے میسج کروں گا۔۔'' وہ اس کے بپھرے وجود کو کنارے پر آخر لے ہی آیا تھا۔ اس کی بات پر اگرچہ اس کا دل ہنسنے کو چاہا تھا مگر وہ ضبط کر گیا۔

''تجھ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے اریب۔۔ اتنا بڑا ہو گیا ہے اور ایک فون نہیں رکھ سکتا۔۔ تجھ جیسے لڑکوں کے پاس تو دو دو سمارٹ فون ہوتے ہیں اور تیرے پاس تو نو کیا گیارہ دس بھی نہیں ہے۔ ہنوں'' وہ اس پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔

''اوہ ہیلو۔۔۔ میرا اسٹینڈرڈ اب اتنا بھی گرا ہوا نہیں ہے کہ نو کیا گیارہ دس لے کر گھوموں۔۔'' وہ جھٹ اس کے ساتھ ہو لیا اور فی الفور جواب دیا

''اچھا جی۔۔ لیکن مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ تمہارا اسٹینڈرڈ تو نو کیا گیارہ دس سے بھی گرا ہوا ہے، تبھی تو ابھی تک یہ فون بھی نہیں لے سکے۔۔'' پلٹ کر اس نے دوسرا نشتر برسایا تھا

''دیکھو۔۔ اب تم کچھ زیادہ سمارٹ بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ حالانکہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں موبائل کیوں نہیں رکھتا۔۔ ماما جان اور بابا جان نے منع کیا ہوا ہے۔'' وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولا تھا

''اوہ۔۔ آئی سی۔۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ انکل آنٹی کو ڈر ہے کہ کہیں ان کا معصوم سا بچہ موبائل استعمال کرنے پر بگڑ نہ جائے۔'' اس نے جملہ کستے ہوئے کہا تھا۔ جس پر اریب نے تیکھی نگاہوں سے اس کے وجود کو ٹٹولا

''اب تم میری بے عزتی کر رہے ہو۔۔'' گردن پھیرتے ہوئے کہا وہ بے رخی سے بولا تھا

''تمہیں اب بھی شک ہے۔۔؟'' وہ دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھتے ہوئے استفہامیہ انداز میں گویا ہوا

''کامیش۔۔۔!!'' وہ اس کی بات پر بری طرح تپ چک تھا لیکن کہا تو اس نے سچ ہی تھا۔تبھی آگے کچھ نہ بول سکا اور آگے کو بڑھ دیا۔کامیش کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آگے بڑھ کر ذرا دوستانہ لہجے میں گویا ہوا

''ویسے یار تمہاری بہن تم سے چھوٹی ہے انکل آنٹی نے اسے تو منع نہیں کیا کبھی موبائل رکھنے سے۔۔اور تمہارے بقول وہ تو کالج میں بھی اپنا فون لے کر جاتی ہے اور تمہیں لڑکے ہو کر ایک معمولی سا موبائل رکھنے سے بھی منع کیا ہوا ہے۔عجیب بات نہیں ہے یہ۔۔'' وہ متجسس ہو کر گویا ہوا۔اس بات پر ایک لمحے کے لئے اریب بھی سوچ میں پڑ گیا لیکن زیادہ دیر تک اس نے اس بات کو دل میں جگہ نہ دی اور فوراً گردن جھٹک کر گویا ہوا

''مجھے کیا۔۔بابا جان اسے موبائل دے کر دیں یا پھر ٹیب۔۔مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' وہ چلتے چلتے ڈیپارٹمنٹ کے نوٹس بورڈ کے سامنے پہنچ چکے تھے۔ جہاں کئی دوسرے لڑکے اور لڑکیاں کھڑے کلاس ٹائم اور لیکچر روم نوٹ کرنے میں مصروف تھے۔اریب بھی وہاں لیکچر روم کا نمبر دیکھنے کے لئے ذرا سی دیر کو ٹھہرا۔جبکہ کامیش کا پورا دھیان اسی پر تھا

''یار میں یہ نہیں کہہ رہا کہ فرق پڑتا ہے یا نہیں۔میں تو بس یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آخر کیا بات ہے کہ انکل آنٹی نے صرف گھر میں تمہیں موبائل رکھنے سے منع کیا ہوا ہے۔آخر کوئی گہری بات ضرور چھپی ہے۔میرے خیال سے تمہیں ایک بار اُن سے ضرور پوچھنا چاہئے۔'' وہ بات کی گہرائی میں غوطہ زن ہو چکا تھا مگر اریب اسے کسی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔اس نے آگے بڑھ کر ایک نظر نوٹس بورڈ پر ڈالی جہاں سے ایک جھلک میں ہی اس نے لیکچر روم اور ٹائمنگ نوٹ کی۔

''تم سن رہے ہو ناں میں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟'' اس نے اریب کے شانوں کو ہلکا سا چھوا تھا جس پر وہ مسکرا دیا اور آگے کوریڈور کی راہ لی

''یہ سب تمہارا گمان ہے کامیش۔۔مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا۔'' اس نے بے اعتنائی برتتے ہوئے کہا تھا اور ایسا ظاہر کیا جیسے ان سب باتوں سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔شاید یہ بات حقیقت ہی تھی۔اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔بچپن سے آج تک اس نے کبھی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔اگرچہ حسام اور جبیں کے برعکس اس پر کئی پابندیاں تھیں۔موبائل نہ رکھنا تو ایک عام سی بات تھی لیکن اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔کامیش ہمیشہ اس کو اس بات پر ٹوکتا۔وہ اسے بدتمیزی پر نہیں اکساتا تھا بس اپنا حق مانگنے کی طرف راغب کرتا تھا جسے وہ بخوبی سمجھتا تھا تبھی تو اس کی باتوں کا برا نہیں منایا۔

''ایک تو میں تمہارے اس جملے سے تنگ آ چکا ہے۔مجھے تو ایسا کچھ نہیں لگتا۔'' اس نے چڑ کر کہا اور گردن جھٹکتے ہوئے اپنا چہرہ پھیر لیا۔

''میں تو تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتا ہوں مگر مجھے کیا۔۔؟؟ جب تم ہی اپنے بارے میں نہیں سوچتے تو مجھے کیا پڑی تمہارے

بارے میں سوچنے کی۔۔۔میری بلا سے تم بھاڑ میں جاؤ۔‘‘اس کا لہجہ تلخ ہو چکا تھا جسے پانی کی طرح ٹھنڈا کرنا اریب بخوبی جانتا تھا۔

’’چل پھر دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔وہ کیا ہے ناں۔۔۔مجھے راستہ نہیں معلوم بھاڑ میں جانے کا۔۔‘‘اتنا کہنے کی دیر تھی کامیش کے چہرے پر چھایا روگ اڑنچھو ہو گیا۔ہلکی سی مسکراہٹ دبے لبوں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

’’جب دل ہنسنے کا چاہ رہا ہو تو انسان کو جچتا نہیں ہے کہ وہ اپنی ہنسی چھپائے۔‘‘وہ ہمیشہ کی طرح اس کی ماتھے پر آئی شکن کو پڑھ چکا تھا۔تبھی اپنا مشورہ پیش کیا۔

’’اریب تم کبھی سیریس بھی ہو جایا کرو۔۔‘‘اریب کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وہ ہنس دیا مگر ساتھ ہلکا سا سرزنش کیا۔

’’میں سیریس ہی ہوں یار۔۔بس تم کچھ زیادہ ہی ٹریک سے اتر گئے تھے۔۔‘‘ایک لمحہ کے لئے دونوں خاموش رہے اور کوریڈور کے رنگین ماحول کو تکتے رہے۔غالباً سب اپنے پہلے دن کو انجوائے کر رہے تھے۔لڑکے اپنی شوخیاں دیکھا رہے تھے تو لڑکیاں بھی کسی سے کم نہ تھیں۔اپنی جھیل آنکھوں سے رنگ باز لڑکوں کو ایسے جھانسے میں لے رہی تھیں کہ وہ ان پر لٹو ہوتے جا رہے تھے۔کامیش کی نظر بھی ایک لڑکی پر جا کر ٹھہر سی گئی تھی۔

’’وہ دیکھ اریب۔۔کیا غضب لڑکی ہے۔کیا ادائیں ہیں ظالم کی۔۔‘‘وہ رنگین مزاج میں گویا ہوا تھا اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ بالوں پر پھیرتے ہوئے نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹا۔اریب نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کرنے کی بجائے اس پر نگاہ دوڑائی۔

’’بہت بدتمیز ہو تم کامیش۔۔۔اتنا برا سوچتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔۔‘‘اس نے فوراً کامیش کی سرزنش کی تھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ دیا۔اریب کی بات پر وہ بری طرح چونکا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا آگے بڑھنے لگا تھا۔

’’میں نے کیا سوچا اب؟‘‘اس نے انجان بنتے ہوئے کہا اور پلٹ کر دوبارہ اس لڑکی کی طرف نگاہ دوڑانے کی کوشش کی تھی لیکن اریب نے اس کی چال کو ناکام بنا دیا اور گردن سے پکڑ کر اس کا رخ آگے کی جانب کیا

’’یہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کس بارے میں بات کر رہا ہوں اور سب سے اہم بات تمہارا اتنا چونکنا بنتا تو نہیں ہے۔تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم اس وقت اریب عالمگیر کے ساتھ ہو۔جسے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہ ماتھے پر آئے شکن سے ہی دل میں بننے والی کھچڑی کو سمجھ جایا کرتا ہے۔‘‘یہ سنتے ہی کامیش کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا تھا۔

’’شکریہ تمہارا۔۔۔جو تم نے مجھے یاد کروا دیا کہ میں کسی عام شخص کے ساتھ نہیں چل رہا بلکہ ایک ایسے شخص کے ساتھ چل رہا ہوں جو کسی بھی اینگل سے عام نہیں لگتا۔‘‘وہ تیکھے لہجے میں گویا ہوا تھا۔جس پر وہ ہلکا سا مسکرا دیا۔وہ دونوں اب لیکچر روم کے دروازے کے قریب تھے۔جہاں پہلے سے کئی سٹوڈنٹس باہر کھڑے لیکچر روم کے کھلنے کے منتظر تھے۔

’’دیکھا۔بس یہی وجہ ہے کہ کامیش کہ میں ماما جان اور بابا جان سے کوئی سوال نہیں کرتا۔‘‘اس نے اب اپنا جواز اس کے

سامنے رکھا تھا لیکن کامیش اس کو بھی سمجھ نہ سکا تھا۔

''مطلب؟'' وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا

''مطلب یہ کہ جس طرح میں تمہارے دل کی باتوں کو سمجھ لیا کرتا ہوں بالکل اسی طرح ماما جان یا بابا جان کے دل کی باتیں بھی مجھ سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ میں نے کبھی اپنے عوض ان کے دل میں کوئی برائی نہیں دیکھی اور پھر سب سے بڑھ کر وہ میرے والدین ہیں۔ میرا اچھا برا مجھ سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ اگر انہوں نے مجھ پر پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں تو ان سب کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔ اب وہ مقصد کیا ہے؟ یہ تو میں نہیں جانتا اور میرا نہیں خیال مجھے جاننے کی بھی ضرورت ہے کیونکہ مجھے اپنے والدین پر پورا بھروسہ ہے۔'' اس نے تحمل کے ساتھ کامیش کو آمادہ کرنا چاہا تھا۔

''اور کامیش میں یہ نہیں کہتا کہ تم میرے دل میں نفرت یا تجسس کو جنم دے رہے ہو۔ تمہارے علاوہ کوئی اور بھی ہوتا تو شاید وہ بھی یہی کرتا لیکن ایک بات میں واضح کردوں مجھے اپنے والدین پر اپنی ذات سے زیادہ اعتماد ہے اور ہو بھی کیوں ناں؟ ہر بیٹے کی کامیابی کے پیچھے اس کے والدین کی دعائیں ہوتی ہیں جو اسے زندگی کے کسی بھی پر اوٗ پر ڈگمگانے نہیں دیتیں۔'' شاید وہ اب بھی خاموش نہ ہوتا اگر تمام اسٹوڈنٹس کلاس میں جاتے دیکھائی نہ دیتے۔ پروفیسر احتشام کلاس میں داخل ہو چکے تھے۔ لہٰذا انہیں بھی کلاس میں جانا پڑا۔

کلاس میں داخل ہونے کے بعد انہیں تھرڈ Row میں دائیں طرف دیوار کے ساتھ جگہ ملی تھی۔ دونوں وہاں جا کر براجمان ہو گئے۔ کامیش کے ہاتھوں میں ایک عدد رجسٹر تھا جبکہ اریب خالی ہاتھ تھا۔ بال پوائنٹ بھی لانا اس نے گوارا نہ کیا تھا۔ اس نے بے پرواہی سے ادھر ادھر دیکھا۔ پوری کلاس میں ایک شور برپا تھا۔ چہ مگوئیوں نے آسمان کو سر پر اٹھایا ہوا تھا۔ ان میں فقط لڑکیاں ہی سرفہرست نہ تھیں۔ بعض لڑکے بھی لڑکیوں سے آگے نکل جاتے ہیں۔ پروفیسر احتشام نے آگے لیپ ٹاپ کو ملٹی میڈیا سے اٹیچ کرنے کے بعد یونہی اسے کھلا چھوڑ دیا اور ڈائس سے ذرا آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ یک دم کلاس کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ پہلی والی ہی کلاس ہے جس نے کچھ دیر پہلے تک ہنگامہ بڑپا کیا ہوا تھا۔ شاید اس کی وجہ پروفیسر احتشام کی غیر معمولی آواز تھی۔ جو آسمان کے بادلوں کی طرح گرج اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ اریب پوری یکسوئی کے ساتھ پروفیسر کا تعارف سن رہا تھا۔

''میرا نام پروفیسر احتشام الحق ہے۔ فیشن ڈیزائنگ میں ماسٹر کرنے کے علاوہ تین سال انڈسٹری میں کام بھی کر چکا ہوں اور اس وقت نہ صرف اس یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں بلکہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا CEO بھی ہوں۔'' ان کے مختصر مگر جامع تعارف نے سب طلبہ میں اپنی ڈھاٹ بٹھا دی۔ دیکھنے میں وہ کہیں سے بھی چالیس سے اوپر کے نہیں لگتے تھے مگر experience تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ خیر انہوں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد طلبہ کو اس یونیورسٹی اور اس ڈگری کی مستقبل میں افادیت بتائی تا کہ جو طلبہ بائے چانس اس ڈگری میں آئے ہیں۔ انہیں اپنی ڈگری کے بارے میں آگاہی ہو۔ وہ ڈسکشن کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کا بھی بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔

ماحول میں کچھ دیر تو سناٹا قائم رہا پھر طلبہ جیسے اکتاہٹ محسوس کرنے لگے۔ پیچھے سے چہ مگوئیوں کی آواز سلو میوزک کی شکل اختیار کر گئی۔ اریب نے سپاٹ نگاہ پیچھے کی طرف دوڑائی اور دوبارہ پروفیسر احتشام کی طرف متوجہ ہوا۔

''یہ تو بریف انٹرو تھا اس یونیورسٹی اور آپ کی موجودہ ڈگری کا۔۔'' انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کی تو کامیش اکتاہٹ والے لہجے میں گویا ہوا۔

''اسے بریف انٹرو کہتے ہیں؟ خدا جانے پھر جامع انٹرو کتنا ہوگا۔۔''

''اگر کچھ دیر خاموشی اختیار کرو گے تو عنایت ہوگی آپ کی۔۔'' اس بار طنز کرنے کی باری اریب کی تھی۔ کامیش برا مان گیا مگر اریب نے پرواہ نہ کی۔ پروفیسر احتشام نے اب سٹوڈنٹس سے ان کا انٹروڈکشن لینا شروع کیا تاکہ تمام طلبہ ایک دوسرے کے ناموں اور ان کے چہروں سے واقف ہو جائیں۔ انٹروڈکشن بائیں جانب گرل سائیڈ سے سٹارٹ کیا گیا۔

''یہ کی ناں پروفیسر نے کام کی بات۔۔ مجھے تو بس اس لڑکی کے انٹرو کا انتظار ہے۔۔'' کامیش دھیمے لہجے میں گویا ہوا اور ساتھ ہی ایک فیشن ایبل گرل کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی یوں کسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔'' اریب نے فوراً ٹوک دیا۔

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ وہ ہے ہی اتنی اٹریکٹو۔۔ دیکھو ذرا تمام لڑکے اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔۔'' اس نے وضاحت کی تو اریب نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا۔

''شہد کے چھتے کے گرد اکثر بھڑ ہی منڈلاتے نظر آتے ہیں۔۔'' لمحہ بھر کے لئے کامیش نے اثبات میں گردن ہلا دی مگر جیسے ہی اس پر الفاظ واضح ہوئے تو اس نے گھور کر اریب کی جانب دیکھا۔

''تم نے مجھے بھڑ کہا؟'' وہ نتھنے پھولا کر گویا ہوا تھا۔

''میں نے تو اسے شہد کا چھتا کہا ہے۔'' اس بار اریب نے ابرو اچکاتے ہوئے اُس لڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ان دونوں کی چہ مگوئیوں کی آواز قدرے بلند ہوتی جا رہی تھی جو ماحول میں ڈسٹربنس پیدا کر رہی تھی۔

''آپ دونوں کو اگر باتیں کرنے کا زیادہ ہی شوق چڑھا ہے تو باہر چلے جائیں۔'' پروفیسر احتشام نے ان دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جس پر دونوں بری طرح چونکے تھے۔

''سوری سر۔۔'' اریب نے فوراً سے پہلے معذرت کی۔ پوری کلاس ان کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔

''آپ دونوں باہر جا سکتے ہیں۔۔'' پروفیسر نے باہر کا راستہ دیکھایا تو اریب نے گھور کر کامیش کی طرف دیکھا جو کندھے اچکاتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھا اور باہر کی راہ لی۔

''پہلے دن ہی اچھی خاصی عزت کروادی۔۔'' وہ بس سوچ کر رہ گیا اور دو لمحے یونہی کھڑے رہنے کے بعد وہ باہر کی طرف چل دیا

''اپنا نام بتانا پسند کریں گے۔۔۔'' جیسے ہی وہ دونوں کلاس روم سے باہر نکلنے لگے تو پروفیسر کی آواز آئی جس پر وہ دونوں پلٹے۔

سب سے پہلے کامیش نے اپنا نام بتایا اور پھر اریب نے۔ اریب کا نام سن کر پوری کلاس سمیت پروفیسر کو بھی ایک دھچکا لگا تھا۔

''پورا نام کیا ہے تمہارا؟''

''میرا پورا نام اریب عالمگیر ہے۔'' اس نے بنا کوئی تاثر دیئے کہا تھا

''اوہ۔۔تو تم ہو اریب جس نے ٹاپ کیا تھا انٹری ٹیسٹ۔۔''

''اچھا۔۔تو یہ ہے وہ لڑکا جس نے فقط سات منٹ میں question paper solve کیا تھا۔'' ایک آواز ابھری۔ جو پروفیسر کی بھی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''ریئلی۔۔تم نے سات منٹ میں پیپر attempt کیا تھا؟'' پروفیسر کو جیسے یقین ہی نہ آیا تبھی انہوں نے تصدیق چاہی تھی۔

''اگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو جا کر انوِجیلیٹر سے پوچھ لیجیے۔'' اس بار اریب نے شانِ بے نیازی کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''اتنے ذہین ہو تو پھر اپنے حلیے کو بھی ویسا بناؤ۔۔۔کلاس میں بیٹھنے کے بھی کچھ مینرز ہوتے ہیں۔ چلو جا کر بیٹھو، اپنی جگہ پر'' انہوں طنز کرتے ہوئے کہا تھا۔

''تھینک یو سر۔۔'' دونوں گردن جھکا کر اپنی اپنی جگہ پر جا بیٹھے لیکن سب کی نظریں ابھی تک اریب پر مرکوز تھیں۔

''چلیں اب باقی سٹوڈنٹس اپنا نام بتائیں۔۔'' پروفیسر نے فرسٹ روم میں بیٹھی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ سب اُس کی طرف متوجہ ہو گئے مگر کوئی تھا جس کی نظریں ابھی تک اریب پر مرکوز تھیں۔ جو اس کی ذات کو فراموش کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شاید وہ خود بھی اس وقت انجان تھا۔ اس کے دل میں جانے کیا چل رہا تھا؟

☆......☆......☆

کالج میں فرسٹ ڈے بھی اس کا یادگار ثابت ہوا تھا۔ باقی گرلز کی طرح وہ بھی عام یونیفارم میں ہی ملبوس تھی لیکن کچھ تو خاص تھا جو اسے سب میں ممتاز کیے ہوئے تھا۔ شاید وہ خود اپنی ذات بے مثال تھی۔ فیشن ایبل ہیئر کٹنگ، دو انچ کی ہیل، آدھ انچ تک بڑھے ہوئے ناخن اور ان پر لگی نیل پالش کو دیکھ کہیں سے بھی وہ سٹوڈنٹ نہیں لگ رہی تھی اور پھر رہی سہی کسر اس کے پنکھڑی نما لبوں پر لگی پیازی رنگ کے لپ لوز نے پوری کر دی۔ ہاتھوں میں لگی مہندی کے دیدہ زیب ڈیزائن بھی دیکھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے اور پھر اُس کا چال چلن بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ جو دیکھتا بس دیکھتا ہی رہ جائے۔

وہ اپنی دوست کے ساتھ لاسٹ رو میں بیٹھی ہاتھوں پر لگی مہندی کے ڈیزائن دکھانے میں مصروف تھی۔ اس کی دوست اگرچہ

دیکھنے میں اس جیسی پرکشش اور دیدہ زیب تو نہ تھی مگر اس کے ساتھ ہونے کے باعث پہلے دن ہی لڑکیوں کی نظر میں آگئی۔ وہ دونوں دھیمے لہجے میں باتیں کررہی تھیں اور باقی لڑکیاں بھی کن انکھیوں سے انہی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پیریڈ ٹیچر جیسے ہی کلاس روم میں انٹر ہوئی تو زبردست باڈی سپرے نے ان کا استقبال کیا۔ وہ ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گئی۔ انہوں نے آج تک ایسا باڈی سپرے سونگھا تک نہ تھا۔ انہوں نے طائرانہ نظر کلاس میں دوڑائی تو جلد ہی اس باڈی سپرے کے ماخذ تک پہنچ گئی۔ انہوں نے گھور کر اُس لڑکی کی طرف دیکھا جو ابھی تک لاپرواہ اپنی دوست کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھی۔ پیریڈ ٹیچر ڈائس کی طرف گئی اور ہاتھ میں موجود نوٹس کو وہاں رکھ کر ایک لمحے خاموشی سے اس لڑکی کی طرف دیکھتی رہیں مگر وہ انجان بنے اپنی باتوں میں مصروف تھی۔ باقی کلاس پر تو جیسے سکتا طاری ہوگیا۔ دم سادھے باقی لڑکیاں بھی پیچھے مڑ مڑ کر ٹیچر کی نگاہوں کا تعاقب کررہی تھیں۔

"ایکسکیوزمی۔۔ اگر آپ کی باتیں ختم ہوگئی ہیں تو کلاس سٹارٹ کی جائے؟" انہوں نے انتہائی تلخ لہجے میں کہا تھا

"میں نے آپ کو منع نہیں کیا۔۔۔ جو آپ مجھ سے اجازت طلب کررہی ہیں۔" یہ ان کی بھول تھی کہ وہ ان کی آمد سے انجان ہے۔ وہ باخبر تھی بس مسلسل اگنار کررہی تھی اور اس کے بے باک جواب نے جیسے ان کی آنکھوں میں خون کھول دیا۔ باقی لڑکیوں کو بھی جیسے ایک دھچکا لگا تھا۔ خود اس کی دوست بھی ایک لمحے کو ٹھٹک کر رہ گئی۔

"تمہیں کسی نے مینرز نہیں سکھائے کہ ٹیچر سے کس لہجے میں بات کرتے ہیں۔ کھڑی ہوجاؤ اپنی جگہ پر۔" وہ کراخت لہجے میں گویا ہوئیں تو وہ گردن جھٹکتے ہوئے کھڑی ہوئی اور ساتھ ہی اپنے چہرے پر آئی زلفوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے ایسے اڑسیا جیسے کسی لڑکے سامنے ادائیں دیکھا رہی ہو۔

"کتنی بے شرم ہو تم۔۔۔ معافی مانگنے کی بجائے ادائیں دیکھا رہی ہو۔۔" وہ پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں گویا ہوئی تھیں

"معافی کس بات کی؟ اور آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ سے۔۔۔ معافی مانگوں گی۔۔" اس نے لفظ آپ پر زور ڈالتے ہوئے ان کے لباس کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھا تھا۔ وہ سادہ سے لباس میں ملبوس ایک عام سے ٹیچر تھیں۔ شاید ان کا تعلق کسی متوسط خاندان سے تھا۔ کوئی بناؤ سنگھار بھی نہ تھا۔ بس سادہ لان پر ایک عدد سکارف تھا اور پاؤں میں عام سی جوتی تھی۔ جسے دیکھ کر اس نے گردن جھٹک دی تھی۔

"یہ کس لہجے میں بات کررہی ہو تم۔۔۔ تم جانتی بھی ہو میں تمہاری ٹیچر ہوں۔۔" انہوں نے گہری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا تھا

"جانتی ہوں۔۔ آخر ہماری ادا کی گئی فیسوں سے ہی تو آپ لوگ پلتے ہیں۔۔" اس نے گردن جھٹکتے ہوئے اپنی بڑائی ظاہر کی اور بنا اجازت طلب کیے دوبارہ بیٹھ گئی۔ اس کے بے باک جواب پر وہ ٹیچر بھی حیران تھی۔ اتنی سی عمر میں اتنا غرور۔ شاید تبھی وہ کچھ نہ بولیں اور اپنے لیکچر کا آغاز کردیا۔

فقط ایک یہی ٹیچر ہی نہیں، تمام پیریڈ ٹیچرز کی نگاہوں میں اس کا وجود تھا۔ تمام ٹیچرز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا تو جیسے اس کا شیوہ تھا اور پھر آخری بات اپنی بڑائی پر ختم کرتی۔

''اگر ہم لوگ آپ جیسوں کے کالج میں نہ پڑھیں تو آپ فاقوں مر جائیں۔۔۔'' اس کے غرور کی حد، عروج پر پہنچ چکی تھی۔ سٹاف روم میں بیٹھ کر جب تمام ٹیچرز اس کے بارے میں گفتگو کرتیں تو کوئی اچھی بات اس کے متعلق نہ کی جاتی۔

''توبہ کتنی مغرور لڑکی ہے وہ۔۔'' پہلی ٹیچر کہتی

''اس میں لڑکی کا کیا قصور۔۔۔والدین نے تربیت ہی ایسی دی ہے۔'' دوسری کا موقف ہوتا

''انسان کو اتنا بھی غرور نہیں کرنا چاہئے اپنی شان وشوکت پر، یہ تو سب اللہ کا کرم ہے وہ جس پر چاہتا ہے کرتا ہے۔ جس کو چاہے دولت دے اور جس کو چاہے غریب رکھے۔ میں اور آپ کون ہوتے ہیں کسی کو فقط غربت کی بنیاد پر اپنی نظروں سے گرانے والے؟'' یہ اسلامیات کی پروفیسر کے الفاظ تھے۔

''صحیح کہا آپ نے یہ تو اللہ کی تقسیم ہے۔ وہ کسی کو دے کر آزماتا ہے اور کسی سے لے کر۔۔۔سب اسی کی منشا سے ہوتا ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' ساتھ بیٹھی ٹیچر نے تائید کی تھی۔

''لیکن دولت کے آجانے کے بعد انسان اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے جیسا کہ وہ لڑکی بھولی بیٹھی ہے۔ مشکل سے سولہ سال کی ہوگی اور انا ایسے بھری ہوئی اس کی ذات میں جیسے فرعون کی بیٹی ہو۔''

''شاید فرعون کی بیٹی نے بھی اتنا غرور اپنے دل میں نہ بٹھایا ہو جتنا اس کے دل میں ہے۔۔ اللہ بچائے ایسے لوگوں سے۔'' ایک ٹیچر نے اپنے ہاتھ بلند کر دیئے۔

''انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔ آج جس غرور نے اس کی گردن کو تانا ہوا ہے۔ دیکھنا ایک دن وہی غرور اسے خاک میں ملا دے گا۔''

''اللہ کرے ایسا ہو۔۔ ایسے ناسور کو اس دنیا میں سزا لازمی ملنی چاہئے۔۔'' ایک ٹیچر نے یہ کہہ کر بات کو ختم کیا تو سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

ے کافی ہیں اشک دو ہی جو دل پر اثر کریں

اسلام آباد کا موسم کب بدل جائے شاید محکمہ موسمیات والے بھی پیشین گوئی کرنے سے پہلے ہزار بار اپنی statement پر نظرثانی کرتے ہونگے۔ دن بھر موسم گرم گزرا مگر رات ہوتے ہی جیسے اکتوبر نومبر میں ضم ہوا تو آسمان کو سیاہ بادلوں نے آگھیرا۔ رم جھم شروع

ہوگئی اور کھڑکیوں پر لٹکے پردے ہوا کے سنگ راگ الاپنے لگے۔وہ اس موسم سے بے خبر اپنے کمرے میں بیڈ کے سامنے رکھی ٹیبل کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھا اسائنمنٹ بنا رہا تھا۔ورق اڑتے جا رہے تھے۔جنہیں وہ پہلے تو ہاتھ سے سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب ہوا کے جھونکے پوری طاقت کے ساتھ کمرے میں داخل ہونے لگے تو مجبوراً اسے کھڑکی بند کرنے کی غرض سے اٹھنا پڑا۔وہ اس وقت سیاہ سلیولیس ٹی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ڈھیلے قدموں کے ساتھ وہ کھڑکی کی طرف بڑھا تو ہوا کے سنگ چند بوندیں رات کے اندھیرے میں اس کے چہرے سے جا ٹکرائیں۔اسے اتنی دیر میں پہلی بار خنکی کا احساس ہوا تھا۔

''موسم تو کافی خراب ہے'' اس نے دھیرے سے کہا اور دونوں ہاتھوں کو سینے پر لپیٹ کر ایک لمحے کے لئے وہیں کھڑا باہر سیاہ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ہوا کے جھونکے بے ہنگم اس کا رخ کرتے اور اس کی زلفوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آگے نکل جاتے۔

''کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گم ہے میرا بیٹا؟'' سحر فاطمہ کی آواز پر اس نے چونک کر پیچھے دیکھا۔وہ اس وقت کافی کا ایک گرما گرم کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اسائنمنٹ کے بکھرے ورقوں کو سمیٹ رہی تھیں۔

''ماما جان۔۔۔آپ۔۔۔آپ سوئی نہیں ابھی تک؟'' یک دم ہوا کے جھونکے نے کمرے کا رخ کیا تو بوندیں بھی ان کے ساتھ ہولیں۔وہ اب ہلکا ہلکا بھیگ رہا تھا

''جب تک میرا بیٹا جاگ رہا ہے، بھلا میں کیسے سو سکتی ہوں؟'' بکھرے ورقوں کو سمیٹنے کے بعد وہ کھڑکی کی طرف بڑھیں

''کتنے لاپرواہ ہوگئے ہو تم۔اتنی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور کھڑکی بند کرنے کی بجائے اس کے پاس آ کر کھڑے ہوگئے۔'' تیز ہوا میں ان کی آواز دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔اریب ہلکا سا مسکرایا اور آگے بڑھ کر کھڑکی بند کرنے میں سحر فاطمہ کی مدد کی۔اس نے کھڑکی کے دروازوں کو بند کرنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تو ایک ثانیے میں ہی اس کے برہنہ بازو بوندوں میں نہا گئے۔کمرے کے فرش پر ٹپ ٹپ پانی کی بوندیں گرنے لگیں۔

''کتنی طوفانی بارش ہو رہی ہے۔۔دیکھو ذرا ایک سیکنڈ میں کتنے بھیگ گئے تم۔۔'' سحر فاطمہ وارڈروب کی طرف بڑھیں اور وہاں سے ایک عدد ٹاول لے آئیں۔

''شکریہ۔۔'' مسکراتے ہوئے اریب نے وہ ٹاول لے کر اپنے بازو صاف کئے۔

''ایک ماں فقط شکریہ سننے کے لئے اپنی اولاد کے کام نہیں کرتی۔۔سمجھے تم۔۔چلو اب یہ کافی پی لو۔۔دیکھو باتوں میں ٹھنڈی بھی ہوگئی ہوگی۔۔'' ٹاول کو سحر فاطمہ کے ہاتھوں میں تھمایا اور پھر مسکراتے ہوئے ٹیبل کی طرف بڑھ کر کافی کا مگ اٹھایا

''اچھا تو پھر کس لئے کرتی ہے ایک ماں اپنے اولاد کے کام؟'' اس کے لہجے میں شرارت تھی۔کافی کا ایک لمبا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے شریر آنکھوں سے سحر فاطمہ کی طرف دیکھا تھا

''بہت بدتمیز ہو گئے ہو تم۔۔لگتا ہے یونیورسٹی کا رنگ چڑھ گیا ہے۔'' ٹاول کو واش روم میں لے جا کر بغیر دھلے کپڑوں کے ساتھ رکھ دیا

''اسی لئے تو میں کہتا تھا ماما جان کہ مجھے آگے نہیں پڑھنا مگر آپ کی اور بابا جان کی ہی ضد تھی کہ مجھے آگے پڑھنا چاہئے۔۔دیکھا ہو گیا ناں نقصان یونیورسٹی بھیجنے کا مجھے۔۔آپ کا بیٹا بگڑ گیا ہے۔'' اس نے فوراً اپنے حق میں دلائل دینا شروع کر دیئے۔ یہ سنتے ہی سحر فاطمہ کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نے جنم لیا۔

''تمہیں تو بس ایک موقع ملنا چاہئے ہماری بات سے اختلاف کرنے کا۔۔'' وہ اب وارڈ روب کی طرف بڑھنے لگیں اور تمام کپڑے نکال کر صوفے پر رکھ رہی تھیں۔

''اختلاف کہاں ماما جان۔۔صحیح بات ہی تو کہتا ہوں۔۔دیکھیے ذرا۔۔'' اس نے ہاتھ میں موجود کافی کا مگ واپس ٹیبل پر رکھا اور آگے بڑھ کر سحر فاطمہ کو دونوں شانوں سے پکڑ کر ان کے چہرے کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے مزید کہا۔

''حسام بھائی تو انجیئرنگ کے بعد کوئی جاب سٹارٹ کر دیں گے اور جبیں تو ابھی چھوٹی ہے اور پھر اسے تو آگے پڑھنے کا بھی شوق ہے۔اب باقی بچا میں۔۔اگر میں ہی بابا جان کا بزنس نہیں سنبھالوں گا تو اور کون سنبھالے گا؟ ہنوں؟'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے کہا تھا جس پر استہزائیہ انداز میں سحر فاطمہ نے گردن جھٹک دی۔

''بہت تیز ہو گئے ہو تم۔۔مگر یہ مت بھولو ہم بھی تمہارے والدین ہیں۔تمہاری ایک ایک رگ سے واقف ہیں۔یہ سب دلائل جا کر کسی اور کو سنانا۔۔'' اس کے رخسار کو پیار سے تھپتھپاتے ہوئے پلٹا کھایا اور دوبارہ کپڑے باہر نکالنے لگیں۔

''اور کس کو جا کر سناؤں؟ کوئی سنتا ہی کہاں ہے؟'' اس نے پھیکا سا منہ بنا کر دھیرے سے کہا تھا۔

''کچھ کہا تم نے؟'' اس کے بڑبڑانے کی آواز سن کر وہ یک دم پلٹیں تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''خیر۔۔تم جا کر اب اپنی اسائنمنٹ مکمل کر لو۔۔میں اتنے تمہاری وارڈ روب سیٹ کر دوں۔۔ماریہ کو ہزار بار کہہ چکی ہوں مگر مجال ہے وہ کوئی کام ڈھنگ سے کر دے۔۔دل تو چاہتا ہے کہ اسے نکال ہی دوں مگر پھر سوچتی ہوں کہ دس سال سے ہمارے ہاں کام کر رہی ہے۔بھروسے کے قابل بھی ہے۔بس اسی لئے خاموش کر جاتی ہوں۔۔'' وہ خود میں بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ان باتوں میں اریب کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی۔ان باتوں کو سننے سے بہتر تھا کہ وہ اپنی اسائنمنٹ مکمل کر لے اور وہ ایسا ہی کرنے جا رہا تھا۔تمام اوراق اب اپنی اپنی جگہ پر جامد تھے۔کوئی جنبش ان میں نہ تھی۔اس نے گردن پھیر کر باہر کھڑکی کی طرف دیکھا تو جل تھل اب بھی جاری تھی البتہ ہواؤں کا رخ اب کھڑکی سے ٹکرانے کے بعد واپس مڑ جاتا۔

''کیا فائدہ صبح تک تو بارش ختم ہی جائے گی۔'' اس نے زیر لب کہا اور پھر جا کر اسائنمنٹ بنانے کے لئے فرش پر جا بیٹھا۔اس نے بال پوائنٹ اٹھائی مگر خیال تو کہیں اور ہی مرکوز تھے۔وہ ایک لمحے تک اس بال پوائنٹ کو دیکھتا رہا جیسے اس کے میٹریل پر ریسرچ پیپر لکھ ڈالے گا۔

”اگر بے چاری بال پوائنٹ کا معائنہ ختم ہو چکا ہے تو براہِ کرم پیپر پر بھی کچھ لکھ لیں۔۔“ سحر فاطمہ ہمیشہ کی طرح اس کے بجھے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب رہیں۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں اس پر ریسرچ پیپر لکھنے کا سوچ رہا ہوں؟“ اس نے اچھنبے انداز میں کہا تھا۔

”بیٹا، میں تمہاری ماں ہوں۔۔ تمہارے چہرے کے تاثر پڑھ کر بتا سکتی ہوں کہ تم کب کیا سوچ رہے ہو؟“ سحر فاطمہ کے اس جواب پر اس کے جسم میں جیسے کرنٹ لگا تھا۔ برق رفتاری سے وہ اٹھا تو اس کا ہاتھ انجانے میں بیڈ سے جا ٹکرایا۔ آواز سن کر سحر فاطمہ فوراً پلٹیں

”آرام سے اٹھا کرو۔۔ دیکھا لگ گئی ناں چوٹ۔۔ دیکھاؤ ذرا۔۔“ اس کی سرزنش کرتے ہوئے آگے بڑھیں اور اس کا ہاتھ دیکھ کر رگڑ کو ہلکا سا سہلایا۔

”ماما جان۔۔ اس کو چھوڑیے۔۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ کر انہیں بیڈ پر بٹھایا اور خود ان کے قدموں میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”یہ جو مجھ میں extra ordinary صلاحیتیں ہیں۔ وہ کیوں ہیں؟“ اس نے پہلی بار ایسا سوال کیا تھا۔ جس پر سحر فاطمہ نے غیر یقینی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ انہوں نے اپنی نگاہیں اسی کے چہرے پر جمائے ہوئی تھیں۔ اریب خود بھی سنجیدہ ہو چکا تھا۔

”ماما جان۔۔ یہ جو لکریں پڑھنے کی صلاحیت ہے وہ مجھ میں کیوں ہے؟ بھائی، جبیں، بابا جان یا پھر آپ میں سے کسی کے پاس بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ دوسروں کے چہروں کو پڑھ سکے۔ ان کے بارے میں پیشین گوئی کر سکے۔ پھر مجھ میں یہ صلاحیت کیسے پیدا ہو گئیں؟ میں کیسے دوسروں کے چہرے پڑھ لیتا ہوں؟“ اریب کے اس سوال پر سحر فاطمہ ہونق اسے دیکھتی رہیں۔ اسے اریب سے ایسے سوال کی قطعاً امید نہ تھی۔ الفاظ بھی بکھرے بکھرے معلوم ہوئے۔

”بتائیں ماما۔ آخر مجھ میں یہ صلاحیت کیونکر پیدا ہوئی؟“ اس نے سحر فاطمہ کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔

”تم کچھ زیادہ ہی گہرائی میں جا رہے ہو۔ اتنا مت سوچو۔“ الفاظ کے سمندر میں سے انہوں نے ان دو جملوں کو منتخب کیا تھا مگر یہ بات وہ بھی اچھے سے جانتی تھیں کہ یہ الفاظ اریب کے تجسس کو کم کرنے کی بجائے بڑھا دیں گے۔

”ماما۔ میں بھولنے والا نہیں ہوں اس بات کو۔۔ بے شک آپ بات کو ٹال دیں مگر مجھے ہر حال میں جواب چاہیے۔“ اریب نے ان کے دل کی بات پڑھ لی تھی۔ اس بار وہ نظریں نہ ملا سکیں۔

”ماما یہ بات آپ بھی اچھے سے جانتی ہیں اگر آپ نہ بھی بتائیں تب بھی مجھے معلوم ہو ہی جائے گا لیکن میں یہی بات آپ سے سننا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی صلاحیتوں سے زیادہ آپ کے الفاظ پر یقین ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے کچھ نہیں چھپائیں گی؟“ وہ بنا پلکیں

جھکائے سحر فاطمہ کے پیچھے کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔اس بار وہ مسکراہٹ کو چہرے پر سجائے پلٹیں اور پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

''بہت ضدی ہو تم۔۔ادھر آؤ۔۔میں بتاتی ہوں تمہیں۔۔'' وہ بیڈ پر آ بیٹھی تو اریب ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔اب وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''دیکھو بیٹا! ہر انسان میں کچھ ایسی خوبیاں ہوتی ہیں جو اسے لوگوں کے ہجوم میں ممتاز بناتی ہیں۔ہزاروں آدم میں بھی وہ انسان اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر پہنچانا جاتا ہے۔یہ صلاحیتیں مادی بھی ہو سکتی ہیں اور روحانی بھی۔مادی صلاحیتیں تو ہر کوئی دیکھ سکتا ہے۔پرکھ سکتا ہے۔جانچ سکتا ہے اور شائد ان کے حصول کے لئے جستجو بھی کر سکتا ہے مگر جو صلاحیتیں روحانی ہوں وہ قدرت کی عطا کردہ ہیں۔جن کا حصول ریاضت کے بل بوتے پر تقریباً ناممکن ہے۔یہ قدرت ہی جو کچھ بندوں کو چُن لیتی ہے اور پھر مصلحتاً انہیں اُن خوبیوں نے نواز دیتی ہے۔یہ صلاحتیں، کسی کی جاگیر نہیں۔لہٰذا کوئی قدرت پر سوال نہیں اٹھا سکتا کہ اُس نے یہ صلاحیتیں فلاں کو کیوں دیں اور فلاں کو کیوں نہیں دیں؟ ایسا کرنا اپنے آپ کو تباہی کے دہانے پر لے جاتا ہے۔اسی سے حسد جنم لیتا ہے مگر ایک حاسد اپنے سوا کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔

''تو پھر میں ہی کیوں؟'' اس نے غنودگی میں پوچھا تھا۔شاید نینداس پر مہربان ہونے جا رہی تھی۔ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں میں بھلا بے چین دل کیونکر قرار نہ پاتا۔ماں کی چھاؤں تو ایسی راحت سمیٹے ہوتی ہے جو صدیوں سے خاک چھانتے مسافر کو بھی ایک لمحے میں قرار کے عروج سے سرفراز کر دیا کرتی ہے۔

''اس سوال کا جواب تو شاید میرے پاس بھی نہیں ہے مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ کچھ فیصلے اوپر سے اترتے ہیں۔جن میں ہماری منشا کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔خدا کی واحد ذات جو چاہتی ہے کرتی ہے۔شاید تم بھی اسی کی منشا کا ایک روپ ہو۔اس نے جو چاہا جیسا چاہا تمہیں بنا دیا۔جو خوبیاں تم میں ڈالنا چاہی، ڈال دیں۔جن صلاحیتوں سے تمہیں ہمکنار کرنا چاہا، کر دیا۔کیونکہ سب خزانوں کا مالک تو فقط ایک اسی کی ذات ہے۔وہ اپنے خزانوں کی بارش جس پر چاہتا ہے کرتا ہے۔جس کو چاہتا ہے نوازتا ہے۔بھلا کسی کے اندر اتنی ہمت ہے کہ وہ رب سے سوال کر سکے؟ اس کے فیصلے کو چیلنج کر سکے؟ اس سے پوچھ سکے کہ اس نے فلاں خوبی کسی کو کیوں دی؟ نہیں اریب۔۔کوئی بھی ایسا نہیں ہے۔وہ جیسے اپنی ذات میں یکتا ہے بالکل اسی طرح اپنے فیصلوں میں بھی یکتا ہے۔اس کے ہر فیصلے میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور چھپی ہوتی ہے۔'' انہوں نے اریب کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے خوابوں کی دنیا میں کھو چکا تھا۔شاید وہ پوری بات بھی سن نہیں سکا تھا۔انہوں نے نرم ہاتھوں سے اس کا سر اپنی گود سے اٹھا کر سرہانے پر رکھا اور پھر ایک شال اس پر اوڑھا دی۔ٹیبل پر بکھرے ہوئے ورقوں کو سمیٹ کر یکجا کیا اور ایک نظر باہر کھڑکی کی طرف دیکھا تو رم جھم ابھی تک ہو رہی تھی۔ان کے چہرے کا رنگ کچھ پھیکا سا تھا۔ایک گہری نگاہ انہوں نے اریب کے چہرے پر ڈالی جو ماحول سے بے خبر نیند کی وادی میں جا چکا تھا۔لائیٹ آف کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے کی

طرف چل دیں۔ جہاں جہانزیب صاحب ان کے منتظر تھے اور اس انتظار کے زہر کو میگزین پڑھ کر دور کر رہے تھے۔ بیڈروم میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کے چہرے کا رنگ ویسا ہی پھیکا تھا۔ کچھ کہنے کی بجائے وہ وارڈروب سے شال لینے کے لئے بڑھیں مگر ایک لمحے تک وہ بے حس وحرکت کھڑی کچھ سوچتی رہیں۔

''خیریت ہے بیگم؟ اتنا کیا سوچ رہی ہیں آپ؟'' انہوں نے مسکراہٹ کو دباتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اریب کے بارے میں سوچ رہی تھی۔'' انہوں نے دوغلے پن سے کام نہ لیا اور حقیقت سامنے رکھ دی۔

''اریب کے بارے میں؟ مطلب؟'' انہوں نے میگزین کو بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گئے۔

''جہانزیب صاحب! اریب آج اپنی خداداد صلاحیتوں کے بارے میں سوال کر رہا تھا'' بس اتنا کہنے کی دیر تھی۔ جہانزیب صاحب سمجھ گئے۔ مزید کچھ کہنا بے معنی تھا۔ جو بات ایک جملے میں سمجھائی جا سکے تو وضاحت کرنے کے لئے دوسرے جملے کا سہارا لینا لغو بات کہلاتا ہے اسی لئے سحر فاطمہ خاموش ہو گئیں۔

''آپ فکر نہ کریں سحر فاطمہ۔۔ دیکھیے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا اور پھر یہ سوال اُس نے آج نہیں تو کل پوچھنا ہی تھا اور اس کے لئے تو میں نے آپ کو پہلے ہی تیار کر دیا تھا۔'' انہوں نے کہا۔

''جی بالکل۔۔ لیکن۔۔'' انہوں نے مزید کچھ کہنا چاہا تھا لیکن جہانزیب صاحب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اپنے دل میں کسی بھی شک کو جگہ نہ دیں اور ویسے بھی آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ اریب کو کیسے ڈیل کیا جاتا ہے؟ اس لئے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بچہ ہے اور آپ سمجھدار۔۔۔ آپ کو سمجھداری کا ثبوت دینا ہوگا۔۔'' انہوں نے سحر فاطمہ کی ہمت باندھی اور آگے بڑھ کر دائیں رخسار کو ہلکا سا تھپتھپایا۔ شاید وہ سمجھ چکی تھی تبھی معمولی سی گردن ہلا دی۔

''گڈ۔۔ میرے خیال سے اب سو جانا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ رات باتوں میں ہی کٹ جائے اور اگر ایسا ہو گیا تو کل کی میٹنگ اٹینڈ نہیں کر پاؤں گا۔۔'' مسکرا کر جہانزیب نے کہا تھا۔

''بس یہی بہانہ ہوتا ہے آپ کے پاس۔۔ سارا دن آفس کے کام اور رات کو جب بات کرنے بیٹھو تو آپ کو نیند یاد آ جاتی ہے۔'' سحر فاطمہ نے شکوہ کیا۔

''آپ کا شکوہ جائز ہے بیگم مگر بزنس کے اتار چڑھاؤ بھی تو دیکھنے پڑتے ہیں ناں۔۔'' وہ اب اپنی سائیڈ کا لیمپ آف کر چکے تھے۔

''بس آپ یہ بزنس کے اتار چڑھاؤ ہی دیکھتے رہیے گا۔۔۔'' یہ کہتے ہی سحر فاطمہ نے بھی لیمپ آف کر دیا اور یوں بات ایک بار پھر ادھوری رہ گئی۔ شاید ابھی ایک زمانہ باقی تھا، جب وہ بیت جاتا تب تمام سوالوں کے جواب خود بخود سامنے آ جاتے۔

☆......☆......☆

جبیں لان میں ٹہلتے ہوئے اپنے پیپر کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کر رہی تھی۔ ہاتھوں میں ایک کیمسٹری کی بک تھی۔ جس پر آرگینگ کیمسٹری کی چند ایک ڈایا گرام بنی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے فضا میں ڈایا گرام ڈرا کرتی اور پھر تھیوری کو رٹا لگانا شروع کر دیتی۔

"افف۔۔ کتنا مشکل ہے کیمیکل پروپرٹیز یاد کرنا۔۔" منہ بسوڑ کر خود کو مخاطب کیا اور پھر دوبارہ کتاب کو آنکھوں کے سامنے کیا اور یاد کرنا شروع کر دیا

"جبیں جی۔۔۔ یہ لیجیے بلیک ٹی۔۔" ماریہ نے کپ جبیں کے ہاتھوں میں تھما دیا

"شکریہ۔۔۔" ٹہلنے کی بجائے اس نے آرام سے کرسی پر براجمان ہو کر بلیک ٹی پینے کو فوقیت دی۔ کتاب کو سامنے ٹیبل پر رکھ دیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر وہ اب لان کا بغور مشاہدہ کرنے لگی۔

"جبیں جی۔۔ ویسے آپ اریب جی کی طرح کیوں نہیں ہیں؟" ماریہ نے حسب عادت کام کے دوران باتوں کو فوقیت دی۔ وہ اس وقت ٹیبل کو صاف کر رہی تھی

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" جبیں نے ایک عمیق نگاہ اس پر ڈالی۔ جس پر اسے کام چوری کا بہانہ مل گیا۔ صاف ستھرائی چھوڑ کر جھٹ جبیں کے سامنے بیٹھ گئی۔

"میرا مطلب ہے کہ میں نے اریب جی کو تو کبھی یوں پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا۔ امتحان کے دنوں میں بھی ایک دو بار کتاب کو ہاتھ لگاتے ہیں اور پھر امتحان دے دیتے ہیں اور پھر ٹاپ بھی کرتے ہیں" اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا

"تو اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟ یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ وہ کتنا ذہین ہے۔" وہ ماریہ کی بات کا اصل مقصد نہیں سمجھ سکی

"وہ تو میں جانتی ہوں مگر میرے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آپ یا حسام جی اریب جی کی طرح کیوں نہیں ہیں؟" وہ نکتے پر آئی تھی

"سوال اچھا ہے، مگر اس کا جواب میرے پاس نہیں ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

"اگر آپ کے پاس نہیں ہے تو پھر کس کے پاس ہے؟" اس نے بات کو کھریدنے کی نیت سے پوچھا تھا

"اس کے پاس جس نے ہمیں بنایا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ تھی

"جبیں جی۔۔ آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔۔۔" ماریہ نے دباؤ بڑھاتے ہوئے کہا تھا

"کیا بات نہیں سمجھ سکی جبیں؟" یہ سحر فاطمہ کی آواز تھی۔ جو کب وہاں آ موجود ہوئیں، ماریہ کو علم ہی نہ ہوا۔

"کچھ نہیں بیگم صاحبہ۔۔۔" سحر فاطمہ کو دیکھ کر وہ فوراً چونک گئی اور جھٹ اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"ماما جان! کہاں جانے کی تیاری ہیں؟" جبیں نے سحر فاطمہ کو نئے سوٹ میں دیکھ کر پوچھا تھا۔ ماریہ ابھی تک وہاں موجود تھی

اور کام سے زیادہ باتوں کی طرف ہی کان جمائے ہوئے تھی۔

"ماریہ۔۔تم اس طرح کرو، لاؤنج کی جا کر صفائی کرو۔۔" ماریہ کو وہاں سے بھیجنے کی غرض سے کہا

"لیکن بیگم صاحبہ، صبح تو لاؤنج کی صفائی کی تھی۔" جھٹ عذر پیش کر دیا

"تم سے جتنا کہا ہے اتنا کرو۔۔۔" سحر فاطمہ نے سخت لہجہ اپنایا تو وہ منہ بسوڑ کر چل دی

"ماما جان! یہ کیا آپ نے بلاوجہ ماریہ کو ڈانٹ دیا۔۔" جبیں نے ماریہ کے حق میں آواز بلند کی

"بیٹا تم نہیں جانتی اسے۔۔۔ کتنی کام چور ہو گئی ہے۔۔ اگر اسے کچھ نہ کہو تو اپنا ہاتھ پاؤں بھی نہ ہلائے۔۔" سحر فاطمہ نے حقیقت سے آگاہ کیا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔۔" ہنستے ہوئے جبیں نے کہا اور کپ ٹیبل پر رکھ دیا

"اچھا بتایا نہیں آپ نے۔۔۔" جبیں کو جیسے دفعتہً یاد آیا تھا

"ہاں۔۔ میں اسی سلسلے میں تو آئی تھی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے پیپر کب ختم ہو رہے ہیں؟"

"بس یہی کوئی دو چار دنوں میں۔۔۔" اس نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا جس پر سحر فاطمہ نے ذہن میں ہی اندازے لگانا شروع کر دیئے۔

"بات کیا ہے ماما جان۔۔ بتائیں نہ مجھے۔۔" اس میں ایک تجسس نے جنم لیا۔ وہ اب مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

"ایک تو تمہیں ہر بات جاننے کی جلدی بہت ہوتی ہے۔" اس کے انتظار کو مزید بڑھاتے ہوئے کہا

"تو آپ بھی تو مجھے اتنا انتظار کرواتی ہیں۔ کوئی بات جلدی سے بتاتی ہی نہیں۔۔۔" اس نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا جس پر سحر فاطمہ ہنس دیں

"اچھا پھر سنو۔۔ جہانزیب حسام کے رشتے کی بات کر رہے تھے صبح۔۔۔" یہ سنتے ہی جبیں نے خوشی سے چیخ ماری

"سچ ماما جان۔۔" جبیں نے پر جوش انداز میں کہا

"آہستہ۔۔۔ ابھی تو فقط بات کی ہے اور تم اتنی excited ہو رہی ہو" اس نے جبیں کی خوشی کی انتہا دیکھتے ہوئے کہا

"لیکن بات تو کی ہے ناں۔۔ تو پھر کب ہم حسام بھائی کے لئے لڑکی دیکھنے جا رہے ہیں؟ آج یا کل؟ اور آپ نے حسام بھائی سے بات کی؟ اگر نہیں تو یہ کام آپ مجھے سونپ دیں۔ میں خود حسام بھائی سے پوچھ لوں گی کہ انہیں کس قسم کی لڑکیاں پسند ہیں؟ وہ کس قسم کی لڑکی کو اپنی لائف پارٹنر بنانے کے خواہ ہیں؟" وہ اس قدر خوش تھی کہ اسے معلوم ہی نہ ہوا کہ اس نے ایک بار ہی کتنے سوال پوچھ ڈالے تھے۔ سحر فاطمہ اس کی یہ حالت دیکھ کر ہنس دیں۔

''خوشی کے مارے لگتا ہے پاگل ہو گئی ہو تم؟ اتنے سوال۔۔۔ مجھے تو اب صحیح سے یاد بھی نہیں تم نے پوچھا کیا ہے مجھ سے؟''

''ماما جان۔۔خوشی کی بات تو ہے۔۔۔ حسام بھائی کی شادی ہے۔۔واؤ۔۔میری بھابھی آرہی ہیں۔'' وہ خیالوں کی دنیا میں ہی خوش ہونے لگی تھی۔

''ویسے مجھے تو اپنی بھابھی ہنس مکھ چاہئے۔بالکل میری طرح۔۔۔''اس نے اپنی رائے پیش کی

''اس کا مطلب ہے ہمیں اس کا الٹ ڈھونڈنا ہوگا۔۔'' سحر فاطمہ نے کہا تو یک دم جبیں کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔

''کیوں؟''اس نے بجھے ہوئے چہرے کے ساتھ جواز جاننا چاہا

''کیونکہ تم دونوں کی پسند تو الٹ ہے۔تمہیں ہنس مکھ چاہیے تو اس کا مطلب ہے کہ حسام کو سنجیدہ لڑکی پسند ہو گی۔۔''سحر فاطمہ نے کہا تو جبیں نے منہ بنا لیا۔جسے دیکھ کر ہنسی کو ضبط کرنا ان کے لئے مشکل ہو گیا۔

''میں مذاق کر رہی تھی۔۔تم حسام سے پوچھ لینا۔۔پھر بات کو آگے بڑھائیں گے۔۔اب خوش۔۔'' کھڑے ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو تھپتھپایا تو اس کا بجھا چہرہ اگلے ہی لمحے دوبارہ روشن ہو چکا تھا۔

''تھینک یو ماما جان۔۔''اس نے پیار سے سحر فاطمہ کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

☆......☆......☆

وہ اس وقت ڈپارٹمنٹ کے سامنے فوٹو شاپ پر موجود تھا۔ہاتھ میں اسائنمنٹ کے پیج تھے۔اسائنمنٹ کور لینے کے بعد اس نے وہیں شیلف پر رکھ کر ان پیجز کو اندر سیٹ کیا تھا۔

''بہت خوب۔۔اب تو اسائنمنٹ بھی ہم سے چھپائی جا رہی تھی۔'' کامیش نے دفعتہً وہاں ہلا بولا تھا۔

''ہمیشہ شیطان کی طرح ہلا بولنا۔۔کبھی سکون سے مت آنا اور اپنی قیاس آرائیاں تو بند ہی کرو۔۔ میں کوئی اسائنمنٹ نہیں چھپا رہا۔سمجھے تم''اس نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا

''اچھا۔۔لیکن مجھے تو یہی لگ رہا ہے۔ذرا دیکھو تو۔۔۔ میں دیکھ نہ لوں، اس سے پہلے فوٹو شاپ پر آ کر جلدی سے کور میں قید کر دیئے پیجز۔۔''اس سے پہلے کہ کامیش اس سے مزید کچھ کہتا،اُس نے اپنی دونوں ہاتھوں میں اسائنمنٹ کو انتہائی ادب کے ساتھ پکڑتے ہوئے آگے بڑھایا۔

''یہ کیا؟'' وہ اریب کی اس حرکت کو سمجھ نہ سکا

''تم یہی مانگنے جا رہے تھے اور اگر میں منع بھی کرتا تب بھی تم منع تو ہونے سے رہے۔اس لئے بات بڑھانے کا فائدہ؟''اس نے دو جملوں میں ہی اس کی اچھی خاصی سرزنش کر دی تھی مگر کامیش اثر قبول کرے۔۔ایسا کہاں؟

"تم کتنے اچھے ہو یار۔۔۔بن کہے دل کی بات سمجھ جاتے ہو۔تمہاری ایک خوبی کا کتنا فائدہ ہے مجھے۔۔۔" سیکنڈ سے پہلے اس کے ہاتھوں سے وہ اسائنمنٹ لی اور اس کے رخسار کر پکڑ کر نوچا

"بس بس۔۔اب زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" مسکرا کر اس کی خوش آمد کو ہوا میں اڑا دیا

"ضرورت ہے یار۔۔اگر اس بار مکھن لگاؤں گا تو اگلی بار بھی تم میرے کام آؤ گے۔۔" کامیش نے پھلجڑی چھوڑی تو اریب کے پاس سوائے گردن جھٹکنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔وہ کامیش کو بخوبی جانتا تھا۔اس کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔ہاں کبھی کبھی صاف گوئی گراں ضرور گزرتی تھی مگر دوغلے پن کا وہ کبھی قائل نہ تھا۔بس یہی بات اریب کو پسند تھی۔آج بھی اس نے الفاظ کی بجائے دل میں جھانکا تھا۔جانے کیوں وہ اس کا دل پڑھنے کی صلاحیت رکھتا تھا؟شاید اس کی بھی ایک وجہ تھی جو بس وہ خود جانتا تھا۔کامیش بھی اس جواز سے لاعلم تھا۔

"اچھا پھر میں لیب میں بیٹھ کر ذرا اسائنمنٹ بنا لوں۔۔تم اتنے لائبریری چلے جاؤ۔" کامیش نے خود ہی ڈیسائیڈ کر لیا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔

"صحیح۔۔ویسے بھی کلاس شروع ہونے میں ابھی بیس منٹ ہیں۔۔" رسٹ واچ دیکھتے ہوئے اریب نے کہا اور پھر لائبریری کی طرف چل دیا۔کامیش نے ایک نگاہ اسائنمنٹ کور پر ڈالی اور پھر لیب کی طرف چل دیا۔وہاں زیادہ سٹوڈنٹس نہ تھے۔اس لئے اسے جگہ ڈھونڈنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔وہ آرام سے بیٹھا اسائنمنٹ کاپی کرنے میں مشغول تھا کہ اسے ایک عکس پیپرز پر دیکھائی دیا۔گردن اٹھا کر دیکھا تو وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔دیکھنے میں ایک عام سی مگر پرکشش۔سیاہ حسین زلفیں دونوں شانوں سے آگے جھکتی جا رہی تھیں۔دوپٹے کو شانوں سے لٹکایا ہوا تھا۔کامیش نے یوں تو سرسری نگاہ ڈالی تھی مگر پلکیں جھپکنا بھول گیا۔

"جی۔۔میں نے آپ کو پہنچانا نہیں۔۔" کامیش نے عجلت سے پیپرز سمیٹے اور ساتھ والی چیئر کو کھسکا کر آگے بیٹھنے کے لئے بڑھایا۔

"جی شکریہ۔۔میرا نام ہانیہ ہے۔۔ہانیہ عمر دراز۔۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلایا تو کامیش اس پر لٹو ہو گیا۔

"ریئلی۔۔۔تو آپ ہے مس ہانیہ عمر دراز۔۔۔ہماری کلاس کی ٹاپر۔۔۔ مجھے تو یقین ہی نہیں ہو رہا کہ آپ خود میرے پاس آئیں۔۔آیم سو لکی۔۔۔" وہ جی بھر کے اس کی خوش آمد کرنے لگا جسے اریب کے سوا کوئی بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔اسی لئے وہ فوراً اسے سچ سمجھ بیٹھی۔اپنی زلفوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی نگاہیں ایک لمحے کو جھک سی گئیں۔

"جی اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔۔وہ آپ کے دوست بھی تو ہیں۔۔کیا نام ہے اُن کا۔" وہ اس کا نام بھول گئی تھی۔

"جی اریب۔۔اریب عالمگیر نام ہے اُس کا۔۔لیکن ہماری باتوں میں یہ اریب کہاں سے آ گیا؟" اس نے نام بتاتے ہوئے بات کو ٹالنا چاہا۔

"جی وہی۔۔وہ بھی تو ٹاپر ہے اور پھر آپ کا دوست بھی۔۔۔" اپنی نظروں کو ٹیبل پر دوڑایا تو وہاں اسائنمنٹ کور کھا ہوا پایا۔

”یہ تو ہے لیکن آپ تو میرے پاس آئی ہیں ناں۔۔میرے لئے کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔“ وہ دونوں کہنیوں کو ٹیبل پر رکھ کر یک ٹک اسی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔جانے کیا تھا اس عام صورت میں وہ پہلی نظر میں ہی اس پر فریفتہ ہو گیا۔

”تم اسائمنٹ بنا رہے تھے؟“ اس کی نظر جیسے ہی اسائمنٹ کے صفحات پر گئی تو برجستہ سوال داغا

”ہاں بس۔۔نیکسٹ پیریڈ میں سمٹ کروانی ہے ناں۔۔“

”اچھا۔۔کیا میں دیکھ سکتی ہوں؟“ اسائمنٹ لینے کے لئے اس نے ہاتھ بڑھایا

”ہاں ہاں۔۔کیوں نہیں۔۔یہ لو“ اس کا انداز اس قدر دلکش تھا کہ وہ ناں نہ کر پایا اور فی الفور اسائمنٹ اس کی طرف بڑھا دی۔ ہانیہ نے سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا۔

”تمہارے دوست کی ہے ناں؟“ اس نے اچھنبے لہجے میں سوال کیا

”ہاں۔۔ایسی نیٹ اسائمنٹ اب بھلا میں تو بنانے سے رہا۔“ وہ دبے لہجے میں ہنس دیا۔ہانیہ بھی مسکرا دی

”کافی ہنس مکھ ہو تم۔۔“ ایک بار پھر زلفوں میں ایک ادا سے اُس نے ہاتھ پھیرا تھا۔جو کامیش کے دل میں ٹھہری گئی۔

”اچھا۔۔لیکن اریب تو ہمیشہ یہی کہتا ہے کہ میں سوائے ژاژ خائی (بکواس) کے کچھ نہیں کرتا۔۔“ شریر لہجے میں بات کو بڑھانے کی غرض سے کہا

”ویسے ٹھیک کہتا ہے تمہارا دوست۔۔۔“ اس بار وہ دھیمی آواز میں ہنس دی

”بہت خوب۔۔اس کا مطلب اب آپ بھی میرے دوست کی حمایتی ہو گئیں لیکن یہ بات تو قطعاً غلط ہے۔“ دوسرے جملے پر اس نے بناوٹی انداز اپنایا تھا جس پر وہ چونک گئی اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا

”میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اس وقت میرے ساتھ ہیں مگر موضوع اریب بنا ہوا ہے۔یہ تو بہت غلط بات ہے۔“

”اس کا مطلب موصوف حسد کا شکار ہو رہے ہیں؟“ وہ اب کامیش کے ساتھ گھل مل چکی تھی اور اسی کے لہجے میں جواب دینے لگی۔

”اور کیا نہیں۔۔بھلا ایک لڑکی میرے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے اگنار کرے اور میرے دوست کو اہمیت دے تو حسد کرنا تو بنتا ہے ناں؟“ اس نے نچلے ہونٹ کو پرکشش انداز میں دانت سے کاٹا تھا۔جس پر اس کی آنکھیں ذرا سا جھک گئیں۔

”اگر برا نہ مناؤ تو کیا میں یہ اسائمنٹ لے سکتی ہوں۔بس کچھ پوائنٹس نوٹ کرنے ہیں۔میں خود اریب کو واپس کر دونگی؟“ اس نے لجاجت کے ساتھ دریافت کیا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔میں بھی تقریباً اپنی اسائمنٹ complete کر ہی چکا ہوں۔“ اس نے خندہ پیشانی سے اسے اجازت دے دی۔

''بہت بہت شکریہ تمہارا۔۔'' یہ کہتے ہی وہ وہاں سے کھڑی ہوگئی۔آنکھوں میں ایک دلفریب سی کشش تھی جیسے ایک محاظ سر ہو چکا ہو۔

''ارے یہ کیا؟ اس کا مطلب آپ فقط اسائنمنٹ لینے کے لئے میرے پاس آئی تھیں؟'' اس نے برا ماننے والے لہجے میں کہا تھا

''جی بالکل۔۔'' اس کی صاف گوئی پر وہ ہکا بکا رہ گیا لیکن اگلے ہی لمحے وہ دبی آواز میں قہقہ لگاتے ہوئے پلٹی۔

''میں مذاق کر رہی تھی۔'' آنکھوں کے تیر ایسے چلائے کہ کامیش وہیں ڈھیر ہو کر رہ گیا

''اوہ اچھا۔'' ہانیہ کے جانے کے بعد اُس نے دل پر ہاتھ رکھا تو وہ بے ترتیب دھڑک رہا تھا۔آنکھوں میں اسی کا عکس لہرا رہا تھا۔وہ مورنی کی سی چال چلتے ہوئے لیب سے باہر نکل گئی مگر اس کی نگاہوں کے حصار سے نکلنا اتنا آسان نہ تھا۔وہ اب بھی اپنے خیالوں میں اسے گمان کئے ہوئے تھا۔

☆......☆......☆

وہ سیدھا لائبریری کی طرف بڑھی۔چہرے پر شادابی تھی۔چال میں بھی ایسا ٹھہراؤ تھا جیسے سب کچھ اس کے گمان کے مطابق چل رہا تھا۔نارنجی رنگ کے سوٹ میں اگر زیادہ متاثر کن نہیں تھی تو عام بھی نہیں تھی۔وہ عام ہوتے ہوئے بھی بہت خاص تھی۔دیکھنے والا ایک نظر اٹھا کر دیکھتا تو چند ثانیے کے لئے پلکیں جھپکانا بھول جاتا۔یہ اس کی نظر کا قصور تھا یا پھر اس عام سے چہرے میں کچھ خاص تھا؟ نہ میک اپ کا سہارا تھا اور نہ ہی بناؤ سنگھار کا عارضہ۔صاف رنگت قدرت کا عطیہ تھی جسے کسی نمود و نمائش کی ضرورت نہ تھی۔بیضوی چہرہ، باریک ناک اور پھر بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔۔اس عام سی صورت میں بس یہی خاص تھا۔

جیسے ہی وہ لائبریری کے دروازے پر پہنچی تو اریب کو وہاں سے نکلتے ہوئے پایا۔پہلی نظر میں ہی وہ اسے پہچان گئی۔وہ اگرچہ عام تھی مگر وہ عام نہ تھا۔اس کی پرسنیلٹی کی سب لڑکیاں دلدہ تھیں۔اس کے بات کرنے کا انداز ایک خاص اہمیت رکھتا تھا۔اس کا سب لڑکیوں کو اگنور کرنا، جیسے آگ کو مزید بھڑکا دیتا۔ان کے ارمانوں میں پیدا ہوتی تشنگی کو مزید بھڑکا دیتا۔شاید ہانیہ بھی انہی میں سے ایک تھی۔تبھی ایک لمحے کے لئے اپنے قدم آگے نہ بڑھا سکی اور اس کے چہرے کو یک ٹک دیکھتی رہی اور وہ ایک بار پھر اس کے وجود کو اگنور کرتے ہوئے کینٹین کی طرف بڑھ دیا۔ہوش تو اسے تب آیا جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''اوہ۔۔وہ تو چلا بھی گیا۔۔'' اس نے دل میں کہا اور پھر عجلت کے ساتھ کینٹین کی طرف بڑھی۔وہ وہاں پر شیک کا آرڈر دے رہا تھا۔کچھ لمحے یونہی سوچنے میں ضائع کرنے کے بعد وہ آگے بڑھی مگر اس کی پشت ابھی تک ہانیہ کی طرف تھی۔الفاظ بھی کچھ کھوئے کھوئے سے تھے۔سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بات کو کہاں سے شروع کرے؟ کن الفاظ میں اسے مخاطب کرے؟ ایک بار تو اس نے اریب کے شانوں کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر جانے کیا سوجھی پھر پیچھے کھینچ لیا۔وہ اسائنمنٹ کو سینے سے لگائے اس کے عین پیچھے کھڑی تھی۔مٹھیاں ذرا بھینچ کر ایک گہرا سانس لیا۔

"چلیں رہنے دیں۔۔" یہ اریب کی آواز تھی۔ شاید مطلوبہ شیک ختم ہو چکا تھا۔ وہ دفعتہً پلٹا تو برجستہ نگاہیں آپس میں ٹکرا گئیں۔ دونوں تا پر ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ایک انجان تھا جبکہ دوسرے کو خبر تھی۔ کچھ لمحے یونہی بیتے تو اریب کی پیشانی پر شکن نمودار ہوگئی۔ نگاہوں کی حدت میں احساس کی نوعیت تبدیل ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتی اریب نے بے رخی کے ساتھ گردن جھٹکی اور وہاں سے چل دیا۔

"عجیب لڑکا ہے۔ میں اُس سے بات کرنے آئی ہوں اور وہ۔۔" اریب کے یوں چلے جانے کا وہ مطلب نہ سمجھ سکی مگر وہ تو جیسے ارادہ کرکے آئی تھی تبھی اس کے نقش قدم پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کینٹین سے باہر آگئی۔ وہ اس وقت لائبریری کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے نے بھی وہی راہ لی۔

"اریب۔۔" جب فاصلہ کچھ کم ہوتا دکھائی دیا تو اس نے آواز دے کر روکنا چاہا جو کافی کارآمد ثابت ہوا۔ اس نے بڑھتے قدم روک لئے مگر پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ بے جان سا مورت بنا اس کی طرف پشت کیئے کھڑا رہا۔ تیز چلنے کی وجہ سے اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا مگر اسے ابھی بھی کچھ فاصلہ طے کرنا تھا۔

"اریب میں نے تمہیں یہ اسائنمنٹ دینی تھی۔۔۔ دراصل۔۔۔" وہ ہانپتے ہوئے کہہ رہی تھی جب اریب دفعتہً پلٹا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال دیکھ کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ سفید رنگت اب سرخ ہو چکی تھی۔ پیشانی پر غصے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اریب کا یہ روپ دیکھ کر آگے ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ اس نے متجل ہانیہ کے ہاتھوں سے اپنی اسائنمنٹ کھینچی اور دھیمے مگر سخت لہجے میں گویا ہوا

"کتنی بے شرم اور گھٹیا لڑکی ہو تم۔۔۔" حقارت آمیز لہجے میں جملہ کسا اور پھر قدم پٹختا ہوا وہاں سے چل دیا جبکہ ہانیہ کو سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ وہ اس نفرت کا مطلب سمجھ نہ سکی اور ہکا بکا اس کی پرچھائی کا نگاہوں سے تعاقب کرتی رہی۔

"کتنی بے شرم اور گھٹیا لڑکی ہو تم۔۔۔" اب جانے کب تک ان جملوں کا ورد ہوتا رہنا تھا؟

☆......☆......☆

؎ آئینہ دیکھ کر اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

آج پیریڈ ٹیچر نے اس کی اچھی خاصی سرزنش کی تھی اور پہلی بار کسی نے اس کو ترکی بہ ترکی جواب دیا تھا اور بات اگر یہیں تک ہوتی تو شاید ٹھیک مگر بات یہاں ختم نہ ہوئی۔ ٹیچر نے اس کے گال پر ایک تھپڑ مار دیا۔ اس کا حسین وجمیل گال لحہ بھر میں سرخ ہوگیا۔ ٹیچر کی انگلیاں اس کی جلد میں نقش ہوتی چلی گئیں۔ آنکھوں سے ایسے آنسو نکلے جیسے جانے کتنے ظلم کے پہاڑ ٹوٹے ہوں لیکن غلطی بھی تو خود اسی کی تھی۔ ٹیچر اپنا لیکچر دینے میں مصروف تھیں مگر وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی چیٹنگ کر رہی تھی۔ اس بات سے قطع نظر ٹیچر کی نگاہیں اس کی حرکت کو نوٹ کر رہی ہیں۔ ایک دو بار ٹیچر نے اس کو ٹوکا مگر وہ باز نہ آئی اور مجبوراً انہیں اس کا موبائل ضبط کرنا پڑا۔ جس پر اس کا خون کھول اٹھا۔ آج تک گھر میں بھی کسی میں اتنی جرات نہ ہوئی تھی اس کی کوئی شے ضبط کرنے کی تو پھر ان کی کیسے ہوئی؟

''آپ کی ہمت کیسے ہوئی، میرا موبائل چھیننے کی؟'' اپنی غلطی ماننے کی بجائے الٹا وہ چیخی تھی

''آواز نیچی رکھ کر بات کرو۔۔ یہ مت بھولو میں تمہاری ٹیچر ہوں۔۔'' انہوں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا

''تو ٹیچر ہیں تو ٹیچر بن کر رہیں۔ ماں بننے کی کوشش نہ کریں۔۔'' اس نے اشتعال انگیز نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا اور معجل ان سے موبائل چھین لیا۔ اس کے بڑھے ہوئے ناخن اور دفعتہً حملہ وہ برداشت نہ کر سکیں اور اُن کے دائیں ہاتھ کی پشت پر ایک زبردست خراش آئی۔ خون کی ایک باریک دھاڑ صاف دیکھائی دینے لگی۔ تمام لڑکیاں ہونقوں اس تکرار کو دیکھ رہی تھیں جبکہ اُسے اپنے کیے پر ذرا سی بھی شرمندگی کا احساس نہ تھا۔ الٹا وہ گردن جھٹکتے ہوئے واپس بیٹھنے لگی تھی جب انہوں نے اس کا بازو کھینچ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور دائیں رخسار پر ایک زوردار طمانچہ دے مارا۔ وہ بائیں جانب تقریباً آدھی سے زیادہ جھک گئی تھی۔ آنکھوں کا پانی لمحہ بھر میں بپھرے ہوئے دریا کی مثل موگان سے چھلکنے لگا۔ اس نے چہرہ پلٹ کر شیر ژیاں نگاہوں سے کلاس ٹیچر کو گھورا۔

''نگاہوں کو نیچا رکھنا سیکھو۔۔ ورنہ یہ جو غرور ہے ناں تمہارا خاک میں ملا دوں گی۔۔'' سپاٹ لہجے میں انہوں نے کہا

''آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی؟'' اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی نے اس پر ہاتھ اٹھایا ہے۔

''اگر ان نگاہوں کو نیچے نہ جھکایا تو ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر بتا دوں گی کہ کیسے ہمت ہوئی میری؟'' انہوں تلخ لہجے میں اسے جھاڑ دیا۔

''یہ آپ کو بہت مہنگا پڑے گا مس۔۔۔'' اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہنا چاہا تھا مگر اس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہتے جا رہے تھے۔

''تم جیسی بہت دیکھی ہے میں نے لڑکیاں۔۔ سمجھی تم۔۔ ایک منٹ میں سیدھا کر دیتی اگر تم میری بیٹی ہوتی تو۔۔۔'' انہوں نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور پھر دوبارہ ڈائس کی طرف بڑھ کر اپنا ادھورا لیکچر دوبارہ شروع کیا۔ کلاس کو ابھی تک سانپ سونگھا ہوا تھا۔ وہ سب اسے ہونقوں دیکھی جا رہی تھیں۔

''اب بیٹھنا ہے تو بیٹھو ورنہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔'' اس بار بھی ان کے لہجے میں فقط بے رخی کے کچھ نہ تھا اور یہ بے رخی بھی خود اسی کی پیدا کی ہوئی تھی۔ جو وہ پہلے دن سے ٹیچروں کو دیکھاتی آ رہی تھی مگر اپنی غلطی بھلا کس کو نظر آتی ہے؟ جب انسان کی عقل پر غرور و تکبر کی چادر لپٹی ہو تو دوسرے تو حقیر ہی نظر آیا کرتے ہیں اور جب کوئی انہیں ان کی اوقات یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے تو ان کی حالت کچھ ایسی ہی ہوا کرتی ہے جیسے اب اس وقت اِس کی تھی۔ اس نے سپاٹ نگاہوں سے ٹیچر کو دیکھا اور پھر اپنا موبائل اور پرس کو اٹھا کر پاؤں پٹختی ہوئی کلاس روم کے دروازے کی طرف بڑھی۔ جاتے ہوئے بھی اس نے کلاس روم کا دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ بند کیا جس سے اکثر لڑکیاں بری طرح سہم گئیں۔ کلاس ٹیچر نے بھی سپاٹ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا

''خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔۔'' جب کردار دوسروں کے لئے اذیت بن جائے تو سوائے بددعا کے کچھ نہیں نکلتا۔ اس کے

کردار نے بھی انہیں بد دعا دینے پر مجبور کیا تھا۔ان کے الفاظ اُس کی سماعت سے شاید جا ٹکرائے تھے تبھی ایک تلخ نگاہ ان کے وجود پر ڈالی مگر اگلے ہی لمحے وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

پارکنگ ایریا میں پہنچتے ہی اس نے ڈرائیور کو کار نکالنے کا حکم دیا تو اُس نے حکم کی تعمیل کرنے میں لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر وہ پچھلی سیٹ پر براجمان ہوئی اور کار اپنے راستے پر چل نکلی۔

''میڈم خیریت تو ہے ناں؟ آج اتنی جلدی گھر جا رہی ہیں؟'' پیسا عمر کے تقدس کو بھی بھلا کر رکھ دیتا ہے۔تبھی ایک چالیس سالہ مرد جو اس وقت کار ڈرائیو کر رہا تھا اپنی بیٹی کی عمر کی لڑکی کو میڈم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''تم سے مطلب۔۔تم کار ڈرائیو کرو۔۔۔'' تلخ لہجے میں اس کی ہمدردی کا صلہ دیا۔وہ اپنا سا منہ لے کر فرض نبھانے لگا۔اس وقت وہ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے باہر اس کی کار کا مقابلہ کرتی کاروں کو دیکھ رہی تھی۔مژگان اس وقت بھی پر نم تھیں۔دل میں میل اس وقت بھی موجود تھا۔

''تم جیسی بہت دیکھی ہے میں نے لڑکیاں۔۔سمجھی تم۔۔ایک منٹ میں سیدھا کر دیتی اگر تم میری بیٹی ہوتی تو۔۔۔'' اُس ٹیچر کی آواز ابھی تک سماعت میں گونج رہی تھی۔

''اب بیٹھنا ہے تو بیٹھو ورنہ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔'' اس جملے پر اس کا خون کھول اٹھا۔اس نے ہاتھ میں موجود موبائل کو بری طرح نوچا۔بس نہیں چل رہا تھا ورنہ کوئی شے اٹھا کر اسی وقت زمین پر دے پھینکتی۔

''خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔۔'' اس بار وہ برداشت نہ کر سکی اور اپنا غصہ اس بے چارے ڈرائیور پر نکالا۔

''پاگل ہو گیا؟ کار ڈرائیو کرنی نہیں آتی؟ کیا بچوں کی طرح کار ڈرائیو کر رہے ہو؟ تیز چلاؤ کار۔۔'' اس نے جھلا کر کہا تھا۔

''میڈم! یہ مین روڈ ہے۔اسی لئے آہستہ ڈرائیو کر رہا ہوں۔'' اس نے دھیمے لہجے میں جواز پیش کیا۔

''مین روڈ ہے تو تم بچوں کی طرح کار ڈرائیو کرو گے؟ دوسروں کو دیکھو۔۔تم سے آگے نکل رہے ہیں۔'' اس نے دوسری کاروں کا حوالہ دیا جو زوں کی آواز سے ان کو اوور ٹیک کر رہی تھی۔

''میڈم! انسان کو اپنی زندگی کی خود پرواہ کرنی چاہئے۔اگر انہیں اپنی زندگی پیاری نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' اس نے دھیمے لہجے میں سمجھانا چاہا تھا جس پر وہ مزید طیش میں آ گئی۔

''بکواس بند کرو تم۔۔۔اور سیدھی طرح تیز چلاؤ کار ورنہ ڈیڈ سے کہہ کر آج ہی تمہیں نوکری سے نکلوا دوں گی۔۔'' اس نے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تو مجبوراً اسے کار کی سپیڈ بڑھانا پڑی۔

''اللہ ایسی اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔۔'' وہ بڑبڑایا۔

”کیا کہا تم نے؟“ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں کو صحیح سے نہ سن سکی تھی

”کک کچھ نہیں۔۔“ وہ بوکھلا گیا اور ہڑبڑاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔اس وقت کار کی سپیڈ سو کے قریب تھی جب ایک خاتون سڑک کراس کرتے ہوئے ان کی کار کے سامنے آ گئی۔

”خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔۔“ الفاظ سچ ہوتے دیکھائی دیئے۔وہ عورت تیز رفتار کار کو اپنے قریب آتا دیکھ کر حواس باختہ رہ گئی۔قدم زمین میں گڑھتے دیکھائی دیئے۔ڈرائیور نے بھی مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بمشکل کار کو بریک لگائی تھی مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔کار کی ٹکر اس عورت سے ہو چکی تھی۔ڈرائیور فوراً گھبرا گیا۔بیک سیٹ پر بیٹھے ہوئے بھی اسے ایک دھچکا لگا تھا۔آنکھیں ایک لمحے کے لئے چندھیا گئیں۔اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔

”خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔۔“ ایک بار پھر وہی الفاظ سماعت سے ٹکرائے۔کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر باہر نکلی تو لوگوں کا ایک ہجوم اس عورت کی طرف بڑھا۔

”دور ہو جایئے۔۔میں ٹھیک ہوں۔۔“ ایک راہگیر نے اسے اٹھانے کی غرض سے ہاتھ بڑھانا چاہا تو اُس نے فوراً روک دیا۔وہ کوئی عام خاتون نہ تھی۔سیاہ برقعے میں اپنے وجود کی حفاظت کرتی وہ ایک باپردہ خاتون معلوم ہوتی تھیں۔دونوں ہاتھوں میں بھی سیاہ دستانے تھے۔سر کو بھی چادر سے اس انداز میں ڈھانپا ہوا تھا کہ ایک بال بھی چمکتے سورج کو دیکھنے سے قاصر تھا۔پاؤں بھی سیاہ جرابوں میں روپوش تھے۔چہرے کو نقاب کے پیچھے چھپایا ہوا تھا۔یہ بات تو سب کی سمجھ میں آ گئی مگر جو بات سب کو ایک تشویش میں مبتلا کر رہی تھی وہ آنکھوں پر موجود سیاہ سن گلاسز تھے۔جن کے پیچھے سے کوئی بھی ان کی آنکھوں کو دیکھنے سے قاصر تھا۔یعنی اس عورت نے اپنے روم روم کو روپوش رکھنے کی کوشش کی تھی۔

”لیکن خاتون۔۔آپ کو مدد کی ضرورت ہے۔“ درد کی ٹیس بڑھنے کی وجہ سے وہ خاتون اٹھنے سے قاصر تھی۔اس پر ایک آواز فضا میں گونجی۔

”مجھے کسی نامحرم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔بہتر یہی ہوگا،آپ سب یہاں سے چلے جائیں“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔سب نے مذہبی خاتون ہونے کے ناتے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا اور اس ڈرائیور کی طرف متوجہ ہوئے

”تمہیں نظر نہیں آتا؟ یہ مین روڈ ہے اور کوئی مین روڈ پر اس قدر تیزی کے ساتھ ڈرائیو کرتا ہے۔شکر کرو۔۔خاتون کو کچھ نہیں ہوا ورنہ تم اس وقت سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔۔“ سب کی باتوں کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔وہ گردن جھکائے کھڑا تھا۔ساری غلطی تو اس لڑکی کی تھی۔

”اور لڑکی تم۔۔تمہیں نظر نہیں آتا،وہ کتنی تکلیف میں ہیں۔اتنا نہیں ہوتا کہ جا کر ان کی مدد کر دو۔۔“ ایک آواز اس کی سماعت

سے ٹکرائی۔

''صحیح لہجے میں بات کرو تم مجھ سے۔۔ جانتے ہو نہیں تم مجھے۔۔'' سخت لہجے کو وہ برداشت نہ کر سکی۔

''اچھی طرح جانتے ہیں تمہیں۔۔ تمہارے ڈرائیور نے ہی اس عورت کا ایکسیڈنٹ کیا ہے۔ اب شرافت کے ساتھ انہیں کسی اچھے سے اسپتال لے کر جاؤ ورنہ ابھی پولیس کو فون کر کے تمہیں اور تمہارے اس ڈرائیور کو اندر کروا دیں گے۔۔'' لوگوں کے ہجوم میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس کو دھمکی دینے لگا۔ پولیس کا نام سن کر ڈرائیور کا حلق خشک ہو گیا۔

''تمہاری اتنی ہمت تم مجھے پولیس کی دھمکی دو گے۔۔۔ جاؤ کرو فون۔۔ میں بھی دیکھتی ہوں کیا بگاڑ لیتی ہے پولیس میرا۔۔'' اس نے دوٹوک کہا تھا سب اس کو ہونقوں دیکھتے رہ گئے۔

''میڈم۔۔ لے چلتے ہیں ناں اسے اسپتال۔۔ پولیس میں رپورٹ ہو گئی تو۔۔۔'' ڈرائیور نے بات کو ٹالنا چاہا مگر وہ تو جیسے سمجھنے کے لئے تیار ہی نہ تھی۔

''تم اپنی بکواس بند کرو۔۔ میں اچھے سے جانتی ہوں کہ ان لوگوں سے کیسے نمٹا جاتا ہے۔۔'' جھلاتے ہوئے وہ دوبارہ اس شخص کی طرف متوجہ ہوئی جس نے اسے پولیس کی دھمکی دی تھی۔

''اب کرو پولیس کو فون۔۔ ڈر گئے کیا؟'' اس نے دونوں بازوؤں کو سینے پر لپیٹ لیا۔

''توبہ کتنی لڑاکا لڑکی ہے۔ اپنی غلطی ماننے کی بجائے ہم پر ہی چڑھائی کر رہی ہے۔'' لوگ چہ مگوئیاں کرنے لگے مگر اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ یک ٹک اس شخص کو دیکھے جا رہی تھی جو اس وقت ژولیدگی کا شکار تھا۔ وہ عورت بھی اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑی ہو چکی تھی بس چند خراشیں تھیں جو اسے سڑک پر گرنے کی وجہ سے آئی تھیں مگر اس نے انہیں عیاں نہ ہونے دیا۔

''اس لڑکی سے الجھنا بے کار ہے دوست۔۔ بہت امیر خاندان کی لگتی ہے۔ پولیس میں بھی رپورٹ کروانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں تو ان کا کاروبار چلتا ہے۔ اُلٹا ہمیں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔۔'' ساتھ کھڑے آدمی نے کہا۔

''ہاں چھوڑ اس لڑکی کو اس کے حال پر۔۔ خدا خود اس کا کیا اس کے سامنے لے آئے گا'' ایک ہی دن میں ملنے والی یہ دوسری بددعا تھی۔ اس کا دل مزید کھٹا ہو گیا۔ اس نے حقارت آمیز نگاہوں سے اس شخص کی طرف دیکھا جو اب اس کو پشت دکھا کر جا چکا تھا۔ لوگوں کا ہجوم اب منتشر ہو چکا تھا۔ بس وہ عورت وہاں موجود تھی۔ اب وہ واپس کار کی طرف پلٹی ہی تھی کہ کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ جس پر اس نے ایک جھٹکے سے اُس ہاتھ کو نیچے جھٹک دیا۔

''تمہاری اتنی ہمت۔۔۔'' پلٹتے ہی اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''یہ بات درست ہے کہ لڑکیوں کو غیر مردوں سے سخت لہجے میں ہی بات کرنے کا حکم ہے لیکن کردار کو اوروں کی نگاہ میں گرا کر

نہیں۔‘‘اس عورت کے لہجے میں انتہا کی شیریں تھیں۔وہ ایک خیر خواہ کی طرح اسے سمجھا رہی تھی اس بات سے قطع نظر کہ ابھی کچھ دیر پہلے اسی کی کار کے ساتھ اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔

’’جسٹ شیٹ اپ۔۔اپنی سو کالڈ نصیحتیں اپنے پاس رکھو تم۔۔سمجھیں۔۔‘‘اس نے عقابی نگاہوں سے اس خاتون پر جھپٹنا چاہا تھا

’’میں نصیحت نہیں کر رہی تھی بس سمجھا رہی ہوں۔اس وقت کے آنے سے قبل سمجھ جاؤ، وگرنہ پچھتانے کا بھی وقت نہیں ملے گا۔‘‘

اس جملے پر وہ ایک بار پھر طیش میں آ گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی اسی خاتون نے موضوع تبدیل کر دیا۔

’’ویسے نام کیا ہے تمہارا؟‘‘ وہ نقاب کے پیچھے چہرہ چھپا ہونے کے باوجود محسوس کر سکتی تھی کہ اس کے لبوں پر مسکراہٹ ہے۔

’’کیوں؟ پولیس میں جا کر رپورٹ درج کروانی ہے؟‘‘اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

’’اگر رپورٹ درج کروانی ہوتی تو ان آدمیوں کو جانے سے نہ روکتی۔ بلکہ کہتی کہ تمہیں خود پکڑ کر پولیس سٹیشن چھوڑ کر آئیں اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا کرنے سے دریغ نہ کرتے۔‘‘اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

’’اوہ۔۔تو تمہارا یہ پلان تھا۔ویسے تم جیسوں سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے۔‘‘ یہ کہتے ہی اس نے پلٹا کھایا اور جھک کر کار سے اپنا پرس نکال کر اس کے اندر سے چند پانچ پانچ سو کے نوٹ نکال کر اس خاتون کے ہاتھوں میں زبردستی تھما دیئے۔

’’یہ پکڑو۔۔اور چلتی بنو۔۔‘‘اب وہ دوبارہ کار میں بیٹھنے لگی تھی جب اس خاتون نے اس کی کلائی کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور وہ نوٹ دوبارہ اسی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔

’’ان پیسوں سے انسان تو خریدے جا سکتے ہیں مگر رشتے اور سکون نہیں۔‘‘ایک بار پھر اس نے نصیحت کی تھی

’’مجھے ان پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔اللہ پاک کا دیا ہوا میرے پاس سب کچھ ہے۔اگر یقین نہیں آتا تو میرے ساتھ میرے گھر چل کر دیکھ لو۔۔یہ جو سامنے گلی نظر آ رہی ہے۔اس کے موڑ پر ہی تیسرا گھر میرا ہے۔ پیلے رنگ کا لکڑی کا دروازہ ہے۔‘‘اس نے اشارے سے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھایا۔جس پر اس نے اپنا ناک منہ چڑھا لیا۔

’’میرے اتنے برے دن نہیں آئے کہ تم جیسی عورتوں کے گھروں میں تانک جھانک کرتی پھروں۔۔ہنوں۔۔‘‘ یہ کہتے ہی وہ کار میں جا بیٹھی۔ڈرائیور پہلے ہی اپنی سیٹ سنبھال چکا تھا۔

’’اللہ ہدایت دے تمہیں۔۔۔‘‘جب وہ ونڈ سکرین اوپر کر رہی تھی تو اس کے لبوں سے جاری ہوتی دعا اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔یہ دو بد دعاؤں کے بعد ملنے والی پہلی دعا تھی۔وہ یک ٹک اس خاتون کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔جس کا چہرہ نقاب اور بڑی بڑی سیاہ سن گلاسز کے اندر کہیں چھپا ہوا تھا۔جس بنا پر وہ اس کے چہرے کے خدوخال دیکھنے سے قاصر رہی مگر ایک بن مانگی دعا اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔اس نے اُس کے ساتھ اتنا برا سلوک کیا مگر رخصت ہوتے ہوئے پھر بھی دعا دی۔وہ اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔

"خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔۔" پہلی بد دعا اس کے ذہن سے ٹکرائی۔

"اللہ ایسی اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔۔" ڈرائیور کی دعا اس کو بری طرح چبھ رہی تھی۔

"ہاں چھوڑ اس لڑکی کو اس کے حال پر۔۔خدا خود اس کا کیا اس کے سامنے لے آئے گا" دوسری بد دعا نے اس کا سانس لینا بھی دوبھر کر دیا۔

"اللہ ہدایت دے تمہیں۔۔۔" سب سے آخر میں دعا دی۔ جانے اب کس کے الفاظ حقیقت کا روپ اختیار کرنے والے تھے؟

خاک ہُوا، برباد ہُوا

راز چھپتا نہیں ہے دل میں کبھی
لوگ آنکھوں سے جان جاتے ہیں

''کتنی بے شرم اور گھٹیا لڑکی ہو تم۔۔۔'' وہ الفاظ کانٹے بن کر اس کی سانسوں میں اٹک کر رہے تھے۔ ہاتھ میں دبے بے جان سے کاغذ بے ترتیب اس کی سختی کو جانے کب سے برداشت کیے جا رہے تھے۔ مشتعل آنکھیں ابھی تک اسی وقت کو اپنے اندر سینتے ہوئے تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی اتنی تذلیل برداشت کی تھی مگر جانے کیوں اس کی زباں کچھ بھی کہنے سے قاصر رہی۔ خاموش نگاہوں کو دیوار پر گاڑھے وہ یک ٹک مٹی کے ذروں کی گنتی کر رہی تھی یا اپنی تذلیل کا بدلا لینے کے لئے کوئی منصوبہ بن رہی تھی؟ رات کی تاریکی نے فضا پر ایک عجب سی وحشت طاری کی ہوئی تھی اور وہ اسی وحشت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے کھڑکی کے کنارے دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے سامنے کی دیوار پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

''ہانیہ۔۔!! تم ٹھیک تو ہو ناں؟'' پاکیزہ کی آواز سن کر وہ دفعتہً پلٹی۔ دن کا اجالا رات کے اندھیرے میں قدم رکھنے لگا۔

''جی آپی۔۔'' ہڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میں موجود بے دردی کے ساتھ کچلے ہوئے کاغذ کو دیکھا۔ شاید وہ ابھی اتنی بری طرح نہیں کچلا گیا تھا جتنی شدت کے ساتھ وہ الفاظ ادا کئے گئے تھے۔

''تو ایسے کیوں کھڑی ہو؟ جا کر سو جاؤ۔۔ آٹھ بج چکے ہیں۔'' پاکیزہ نے ایک نظر ہانیہ کو ٹٹولا اور پھر پلنگ کی طرف بڑھ کر چادر کو جھاڑنے میں مصروف ہو گئی۔ کمرے میں ہر شے پر ایک تاسف نمایاں تھا۔ چھوٹا سا کمرہ ایک عدد پلنگ، دو کرسیوں، ایک عدد سٹڈی ٹیبل جو برسوں کی خستہ حالی کا ترجمان تھا اور ایک عدد وال کلاک دائیں طرف کی دیوار پر لٹکا اپنی زبوں حالی کو چیخ چیخ کر بیان کر رہا تھا۔ کچی اینٹوں سے بنا یہ کمرہ اس گھر کی خستہ حالی ظاہر کر رہا تھا۔

''آپی آپ سو جاؤ۔۔ مجھے نیند نہیں آ رہی اور ویسے بھی مجھے ابھی یونیورسٹی کا کام کرنا ہے۔ دیر لگ ہو جائے گی مجھے۔۔'' وہ اپنی کھلی زلفوں کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔ پاکیزہ چادر جھاڑ کر نہ صرف پلنگ پر بچھا چکی تھی بلکہ کمبل اوڑھ کر نیم دراز بھی ہو چکی تھی۔

''ایک تو جب سے تم نے یونیورسٹی جانا شروع کیا ہے ناں، اپنی بہن کے لئے وقت نکالنا جیسے بھول ہی گئی ہو۔'' اُس نے شکوہ

کیا۔ جو شاید یہ سن بھی نہ سکی تھی۔ سٹڈی ٹیبل پر نظریں جمائے وہ ابھی تک اریب کے بارے میں سوچ رہی تھی

"ان لفظوں کو میں کبھی نہیں بھولوں گی۔۔" وہ بڑبڑائی تھی

"کیا نہیں بھولو گی؟ میں تم سے کیا بات کر رہی ہوں اور تم جانے کیا کہتی جا رہی ہو؟" پاکیزہ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی کھینچ کر پلنگ پر گھسیٹا۔

"آپ کیا کہہ رہی تھیں؟" اس نے اپنے حواس مجتمع کرنے کی کوشش کی تھی۔

"پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کیا سوچ رہی تھی؟" پاکیزہ نے گہری نگاہ سے اس کے چہرے پر چھائے تاثر کو پڑھنا چاہا مگر ناکام رہی۔ وہ چہرے کے تاثرات کو چھپانا بخوبی جانتی تھی مگر وہ تو نہ صرف اس کے تاثرات کو پڑھ چکا تھا بلکہ اس کی نیت کو بھی بھانپ چکا تھا۔

"کچھ بھی تو نہیں۔۔ بس۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ چہرے پر تاسف قدرے گہرا ہو گیا۔ رات کی سیاہی دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہونے لگی تھی۔ یک دم کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ ہاتھ سے ہاتھ بھائی دینا بھی مشکل ہو گیا

"لو۔ ایک طرف تو یہ واپڈا والے سردیوں میں بھی چین نہیں لینے دیتے، مجال ہے جو رات کو بھی سکون سے سو جائیں؟ لگتا ہے وہ اپنا ایک ہاتھ سوئچ سے لگا کر ہی سوتے ہیں، تاکہ جیسے ہی کروٹ بدلیں۔ جھٹ سوئچ آف کر دیں۔۔ ہنوں۔۔" پاکیزہ نے منہ بسوڑ کر خوب برا بھلا کہا تھا۔ جس پر وہ گردن جھکا کر ہلکا سا مسکرا دی۔

"چلو۔۔ لائٹ جانے کا ایک فائدہ تو ہوا میری پیاری سی ہانیہ مسکرا دی۔۔" ٹارچ آن کر کے جیسے ہی پاکیزہ پلٹی تو ہانیہ کی ہنسی اس سے نہ چھپ سکی۔ پیار سے اس کے چہرے کو تھپتھایا

"چلو اب سو جاؤ۔۔ اس اندھیرے میں اب کیسے پڑھو گی؟" پاکیزہ کے کہنے پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور بائیں جانب کروٹ لے کر لحاف کو اوڑھ کر آنکھیں موند لیں

"کتنی بے شرم اور گھٹیا لڑکی ہو تم۔۔۔" ان الفاظ کی گونج نے یہاں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ کروٹ بدل کر اس نے پاکیزہ کو دیکھا، جو اب تک نیند کی وادیوں میں جا چکی تھی۔

"کتنی بے شرم اور گھٹیا لڑکی ہو تم۔۔۔" اس نے اس گونج کو روکنے کے لئے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے مگر ناکام رہی۔ جانے کب تک اب اسے انہی لفظوں کی گونج سنائی دیتی رہنی تھی۔

☆......☆......☆

کیا درد میں لذت تھی کیا رات سہانی تھی

اک چاند کے چہرے پر بادل کی کہانی تھی

کھڑکی کے پردوں سے تانک جھانک کرتی چاندنی اندھیر کمرے میں نیلی روشنی بکھیر کر اس کے چہرے کو بھی کسی قدر روشن کر رہی تھی۔ شب خوابی کے لباس میں سویا ہوا وہ اس پرفسوں ماحول سے بیگانہ تھا۔ صاف آسمان پر آج گذشتہ راتوں سے زیادہ تارے طلوع تھے۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔ خاموشی کا لبادہ اوڑھے یہ سماں مسحور کن ساز الاپ رہا تھا جسے سننے والے سن رہے تھے مگر اکثر غافل نیند کی پرفریب وادیوں میں گھومتے ہوئے، جنت سے سماں کو اپنے ہاتھوں سے گنوار ہے تھے۔ وہ بھی انہی میں سے ایک تھا لیکن بہت جلد وہ ان لوگوں کی فہرست سے نکلنے جا رہا تھا۔

سامنے دیوار پر پنڈلم سے مشابہہ وال کلاک دیکھنے میں غیر ملکی معلوم ہوتا تھا اور یقیناً وہ غیر ملکی ہی تھا کیونکہ ایسا کلاک ابھی پاکستان میں بننا شروع ہی نہیں ہوا تھا۔ اریب نے خاص جہانزیب سے کہہ کر یہ کلاک بولیویا سے منگوایا تھا۔ اس کلاک کی خاص بات یہ تھی یہ اس پر نمبر کلاک وائز ڈائریکشن کی بجائے اینٹی کلاک وائز لکھے گئے تھے۔ نیڈل سیدھی گھومنے کی بجائے الٹی گھومتی تھی جو کہ صدیوں بعد ایک غلطی کی تصیح تھی۔ دنیا میں موجود قدرتی طور پر متحرک اشیا کا بغور جائزہ لیا جائے تو ان میں سے اکثر اسی ڈائریکشن میں موو (حرکت) کر رہی ہیں۔ اس میں چاہے سولر سسٹم ہو یا پھر زمین کا اپنے ایکسز کے گرد گھومنا، پھولوں کی پیٹلز کا کھلنا ہو یا پھر کسی سانپ کا شکار کے لئے جھپٹنا، بہت سی مثالیں اس دنیا میں مل جائیں گی جو کہ اشیا کے اینٹی کلاک وائز موومنٹ پر زور دیتی ہیں۔ بس کلاک کی موومنٹ بھی ایک قسم کی تصیح ہے۔

ایک مدہم سی گونج کمرے گونجی۔ رات کے ایک بج چکے تھے۔ کچھ لمحوں بعد یہ گونج تو بند ہو گئی مگر لاؤنج میں رکھے فون سے بیل کی آواز کمرے تک سنائی دینے لگی۔ یہ آواز دھیرے دھیرے شدت پکڑتی گئی اور خواب کی وادیوں میں حقیقت سے آشنا روح اس آواز سے مضطرب ہونے لگی۔ کروٹیں بدلتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں کو ذرا سا مسلا تو بے ہنگم سی آواز ایک بار پھر سماعت سے ٹکرائی۔ خماری کے سبب ذہن بوجھل ہوا جاتا تھا۔ تبھی مبہم سا وال کلاک دیکھائی دیا۔ وقت سمجھ میں نہ آیا مگر باہر کا سماں جتلا رہا تھا کہ دور دور تک اجالے کا کوئی امکان نہیں۔ فون کی بیل ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ منہ بسوڑ کر کروٹیں بدلتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''اتنی رات کو کون ہے؟'' وہ بڑبڑایا تھا مگر اس کے یوں بڑبڑانے سے بھلا کیا فرق پڑتا تھا؟ فون کی رنگ مسلسل تیز ہوتی گئی۔ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ سب حسام کے رشتے کے لئے گئے ہوئے تھے اور شاید کسی وجہ سے جلدی واپسی ممکن نہ ہو سکی۔ اریب کو بھی سب فورس کر رہے تھے مگر سر درد کی وجہ سے وہ آج جلد ہی سو گیا تھا۔ اس نے بمشکل آنکھیں وا کرتے ہوئے اپنی ٹانگیں بیڈ سے اتاری تھیں۔

''رات کو بھی چین نہیں ہے۔۔۔'' اس نے ناک سکیڑ کر کہا اور نیم آنکھیں کھولے وہ تقریباً اندازے سے ہی سلیپر پہن کر کمرے سے نکلا تھا۔ لاؤنج میں بھی مدہم سی روشنی تھی۔ نیند کا غلبہ ابھی تک تھا۔ تبھی وہ زینے اترتے ہوئے ہچکولے کھا رہا تھا جبکہ فون کی بیل اسے بہت جلد حقیقت میں لانے جا رہی تھی۔

''ایک تو سارے فون اسی وقت آتے ہیں جب کوئی گھر پر نہ ہو۔۔'' وہ نیند میں بڑبڑایا تھا اور شاید سچ ہی کہا تھا۔ ایسا پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔ اس نے فون کے پاس پہنچ کر ایک گہری سانس لی اور اپنی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ اتنے میں فون بند ہو چکا تھا۔

''توبہ ہے۔ اتنی سردی میں پہلے بستر سے اٹھایا اور پھر۔۔'' وہ غصہ کر کے رہ گیا اور گردن جھٹک کر واپسی کے لئے پلٹا ہی تھا کہ دوبارہ فون کی بیل ہوئی۔ اس بار اس نے کریڈل سے ریسور اٹھانے میں ذرا دیر نہ کی۔

''ہیلو۔ اریب عالمگیر سپیکنگ۔۔'' اس نے بیزار لہجے میں کہا تھا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

''آپ خاموش کیوں ہیں؟ کہیے آپ نے اتنی رات کو کیوں فون کیا؟'' اس کی نیند اب دھیرے دھیرے اترنا شروع ہو چکی تھی۔ اس سوال کے جواب میں بھی ایک گہری خاموشی سگنل کے ذریعے اس کی سماعت میں اتر رہی تھی۔ وہ اب اس خاموشی کو پہنچان رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ بھی اب قدرت بدلنا شروع ہو گیا۔ اس نے ریسور کو دونوں ہاتھ سے مضبوطی کے ساتھ تھاما اور ایک بار پھر استفسار کیا

''میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے۔ کون ہیں آپ؟ اور کس سے بات کرنی ہے؟'' بدستور خاموش چھائی رہی۔ ایک پراسرار خاموشی۔۔ جس نے اریب کے وجود کو بری طرح جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ نیند کا خمار اب مکمل طور پر اتر چکا تھا۔ خوابوں کی دنیا سے وہ اب حقیقت میں قدم رکھ چکا تھا۔ آنکھیں جو پہلے نیم وا تھیں اب مکمل طور پر نیم اندھیر کمرے میں فون کرنے والے کے وجود کو تراشنے کی بے سود کوشش کر رہی تھیں۔

''لگتا ہے آپ کو بلینک کال کرنے کا زیادہ ہی خمار چڑھا ہوا ہے۔'' کراخت لہجے میں کہہ کر اس نے ریسور بری طرح کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس کے چہرے کے تاثر بتا رہے تھے کہ وہ اب کافی وقت تک سو نہیں پائے گا۔ چند ساعتیں یونہی کریڈل کو گھورتے رہنے کے بعد وہ دوبارہ زینے کی طرف پلٹا ہی تھا کہ ایک بار پھر وہی فون کی بیل اس کی سماعت سے ٹکرائی جو گذشتہ کئی برسوں سے رات کے اندھیروں میں اس کی نیندوں کو اڑا رہی تھی۔ بیل کی آواز سنتے ہی اس نے ایک جھرجھری لی اور پلٹ کر دوبارہ ریسور اٹھایا۔

''آپ کیوں بار بار مجھے تنگ کرتے ہیں؟ آپ ہیں کون؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟'' اس نے ایک جملے میں کئی سوال پوچھ ڈالے تھے مگر خاموشی نے اپنی وضع نہ بدلی۔ یہ خاموشی اب اسے کاٹنے کو آ رہی تھی۔ کئی سوال۔۔ جو برسوں سے وہ کرتا آ رہا تھا ایک بار پھر خاموشی کے ذریعے اُن کا جواب دیا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر غصے کے تاثر نمایاں ہو گئے۔ اس نے مشتعل انداز میں مٹھی بند کی اور ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اپنے حواس کو ضبط کر کے دوسرے وجود کو شیشے میں اتارنا چاہا۔

''دیکھیے۔۔ ایک بار آپ اپنا نام تو بتائیں۔ آپ ہیں کون؟ اور کیا چاہتے ہیں یا پھر چاہتی ہیں؟ یوں بار بار مجھے تنگ کرنے سے آپ کو کیا ملتا ہے؟ یہ بات میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ کو جو بھی مسئلہ ہے وہ میری ذات سے وابستہ ہے مگر کیا؟ شاید اگر آپ مجھے بتائیں تو اس کا حل ممکن بنایا جا سکے۔۔!!'' وہ کچھ دیر کے لئے جواب کا منتظر رہا مگر وہی کاٹتی ہوئی خاموشی۔۔ اس کے لئے اب اپنے غصے کو کنٹرول

کرنا مشکل ہو چکا تھا۔

''دیکھیے ۔۔ایک بار آپ اپنا نام تو بتائیں۔۔'' آواز میں قدرے سختی ابھری تھی مگر خاموشی نے اس سختی کو آتش فشاں بنا دیا تھا

''اب آئندہ اگر آپ نے مجھے فون کیا تو میں۔۔۔'' وہ غصے میں اپنے الفاظ ہی بھول گیا اور ایک بار پھر ریسور کریڈل پر بری طرح پٹخ دیا۔

''جانے کس کس طرح کے لوگ بستے ہیں اس دنیا میں؟'' منمناتے ہوئے اس نے ایک بار پھر زینے کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن ایک بار پھر وہ اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ وہی بیل اس کی سماعت سے دوبارہ جا ٹکرائی۔ اس نے مشتعل آنکھوں سے نمبر دیکھا تو وہی نمبر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

''اے خدا!'' اس نے گہرا سانس لیتے ہوئے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کی تھیں۔ اس کے سر میں پہلے ہی درد تھا اور اب وہ دوبارہ فون اٹھا کر اپنے درد میں اضافہ کرنے کا خواہ نہ تھا۔ فون کی بیل ہوتی رہی اور اس کے دماغ میں لگاتار ایک ضرب لگتی رہی۔ اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر اس آواز سے کہیں دور فرار ہونا چاہا مگر یہ آواز ہر جگہ اس کا پیچھا کرتی رہی۔ وہ آدھ گھنٹے تک لاؤنج میں رہا مگر اس دوران جانے کتنی بار بلینک کالز آتی رہی۔ اس کا سر درد سے بری طرح پھٹ رہا تھا۔ وہ اب اگر ایک بار پھر اس کی آواز سنتا تو یقیناً اس کے دماغ کی شریانیں پھٹ جاتیں۔ اس نے لاشعوری طور پر ریسور اٹھا کر زمین پر پھینک دیا اور اسی جگہ صوفے کے ساتھ ہی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اپنا چہرہ دونوں گھٹنوں کے درمیان ٹھونس لیا۔

آنکھیں کھلیں تو اپنے اوپر ایک عدد لحاف پایا۔ پہلے تو اس نے آنکھیں مسل کر حالات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ رات کا منظر ایک لمحے میں اس کے سامنے آ گیا۔ ریسور کو دوبارہ کریڈل پر رکھا جا چکا تھا۔ اس نے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کھڑا ہو کر نیند کو الوداع کہا

''تو صبح ہو گئی نواب ذادے کی۔۔'' دائیں جانب سے آواز آئی تھی۔ اریب نے پلٹ کر دیکھا تو سحر فاطمہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا لگانے میں مصروف تھیں۔ جواب میں اریب ہلکا سا مسکرا دیا

''کسی کے فون کا انتظار تھا کیا؟ جو لاؤنج میں ہی سو گئے؟'' سحر فاطمہ نے ابرو اچکاتے ہوئے لبوں پر ہلکی سی تبسم بکھیری تھی۔

''نہیں ماما جان۔۔ وہ کوئی بلینک کال کر رہا تھا۔۔'' یہ سنتے ہی سحر فاطمہ کے چہرے کا رنگ ذرا سا پھیکا ہو گیا۔

''لو۔۔ پھر سے تمہیں بلینک کال آنے لگ گئی۔''

''لگتا ہے کوئی لڑکی ہو گی جو اریب کو بلینک کال کر کے تنگ کرتی ہے۔'' جبیں نے زینے سے اترتے ہوئے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔

''نہیں جبیں۔۔ ایسا کوئی بات نہیں ہے مجھے تو کوئی اور ہی ماجرا لگتا ہے۔'' اریب نے قدرے سنجیدگی سے کہا

''اچھا۔۔کیا ماجرا لگتا ہے پھر جناب کو؟'' سیب کو اٹھا کر ایک بائیٹ لی اور ابرا چکاتے ہوئے اپنی توجہ اریب کی طرف مرکوز کی جو اب اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا

''مجھے خود نہیں معلوم۔۔۔'' اس نے گردن جھکا کر دھیرے سے جواب دیا اور عمیق سوچوں میں ایسا غوطہ زن ہوا کہ قدم کس سمت اٹھ رہے ہیں اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ کمرے میں پہنچ کر بھی وہ انہی سوچوں میں گم تھا۔

''آخر کون ہے وہ؟'' وہ بڑبڑایا تھا مگر جواب لا حاصل تھا۔ بلینک کالز اس کی زندگی کا وہ تاریک اور پیچیدہ حصہ تھیں جن کی ڈوری سلجھانے میں وہ اب تک ناکام تھا۔

''کیا چاہتا ہے مجھ سے؟'' اس نے اندازہ لگایا تھا کہ دوسری طرف ایک مرد تھا مگر یہ گمان بھی مشکوک تھا تبھی اگلا سوال اس کے ذہن میں خود بخود ابھر آیا۔

''یا پھر چاہتی ہے؟'' اس کا سر اتنی بری طرح چکرایا تھا کہ وہ بیڈ پر آ گرا۔ دونوں ہاتھوں کے درمیان سر کو اڑیس کر وہ لامتناہی سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن اپنی ذات سے وابستہ ان سوالوں کے جواب تراش رہا تھا جن کا جواب خود اس کے پاس بھی نہ تھا۔

☆......☆......☆

ہمیشہ کی طرح اریب آج بھی کامیش سے کچھ نہ چھپا سکا۔ اریب کی بات سن کر پہلے تو ایک گہری نگاہ اُس نے اریب کے وجود پر ڈالی تھی بعد میں مزاح سے بھرپور لہجے میں کہا

''تو بھائی صاحب کو کسی موصوف کی کالز آ رہی ہیں۔۔اس کا مطلب معلوم ہے کیا ہوتا ہے؟'' اریب جو پہلے ہی پریشان تھا، کامیش کی بات سن کر پل بھر کے لئے خوش ہو گیا

''اریب عالمگیر کسی کے دل کی دھڑکن کا حصہ بن چکا ہے۔ کسی کی راتوں کی نیندوں کو چرا کر اپنے سحر میں ایسے جکڑ لیا ہے کہ بے چاری جب تک جناب کی آواز نہ سن لے، سماعت کو قرار ہی نصیب نہیں ہوتا۔۔'' مروجہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اریب کے بدلتے تیور سے بھرپور حظ اٹھایا تھا۔

''شیٹ اپ کامیش۔۔۔ یہ ایسا کوئی چکر نہیں ہے'' جھٹ اس نے تردید کر دی

''شروع میں سب یہی کہتے ہیں مگر جب وقت کی ندیا بہتی چلی جاتی ہے، الجھی ڈوریں سلجھتی جاتی ہیں۔ صدیوں سے درمیان میں حائل فاصلے مٹنے لگتے ہیں، دل ایک بار فون کی رنگ سننے کے لئے بے تاب رہتا ہے، کان اس پراسرار مگر دلفریب خاموشی کو سننے کے لئے بے قرار رہتے ہیں تو تب ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہم کس منزل پر آ چکے ہیں'' وہ یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا تبھی تمہید پر تمہید باندھ کر بات کو طول دیتا جا رہا تھا۔

”لگتا ہے میرے دوست کا کچھ زیادہ ہی تجربہ ہے ان کاموں میں۔۔“ ایسے کو تیسا۔۔اسی مثل کا سہارا لیا اور جھٹ اسی کے انداز میں اپنا مسئلہ پیش کیا

”تو یہ بتایئے کہ تقریباً دس برس کی عمر میں کون سی لڑکی ہے جو کسی لڑکے کو اپنا دل دے بیٹھتی ہے؟“ اس کے انداز بھی اب کسی قدر شریر تھا۔اس پر وہ بری طرح اچھلا تھا۔

”کک کیا مطلب؟“ شاید اس کا جواب کامیش کے پاس بھی نہیں تھا۔یہ حالت دیکھ کر اریب دوبارہ نقطے پر آیا

”یہی تو کہنے کی کوشش کر رہا ہوں میں تم سے۔۔یار اگر سال دو سال پہلے کی بات ہوتی تو شاید۔۔مجھے بھی یہی لگتا مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے گذشتہ آٹھ سالوں سے میرے ساتھ ایسا ہو رہا ہے اور اگر آٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا کیونکہ ایک بچہ کہاں اپنی یادیں سنبھال کر رکھتا ہے؟“ یہ کہہ کر اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر دوبارہ اپنی بات شروع کی۔

”جب کبھی میں گھر میں اکیلا ہوتا ہوں تبھی وہ کالز آتی ہیں۔مجھے ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ اسے بھنک کیسے ہو جاتی ہے کہ میں گھر میں اکیلا ہوں؟ کبھی کوئی رات ایسی نہیں گئی کہ میں گھر میں تن تنہا ہوں اور وہ فون کال نہ آئی ہو“ اس کے چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔نچی نگاہوں میں بھی ایک عجیب سی اضطرابی کیفیت تھی۔وہ چاہ کر بھی اسے چھپا نہیں پا رہا تھا۔

”دیکھ یار۔۔!! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اریب کی یہ حالت دیکھ کر کامیش نے اس کی ہمت باندھی اور اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ کر ذرا سا تھپتھپایا۔کچھ سمے یونہی بیت گیا۔گہری خاموشی کے ساتھ۔۔آس پاس اگرچہ ایک شور برپا تھا مگر دونوں پر تو جیسے صفِ ماتم تھا۔دوستی کا حق ادا کیا جا رہا تھا۔اریب کی پریشانی، کامیش کو بھی سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”اریب تمہیں وہ نمبر تو یاد ہے ناں۔۔۔“ یک دم کامیش نے کہا تو اریب ایک سوچ میں ڈوب گیا۔

”شاید ہاں یا شاید نہیں۔۔“ وہ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

”ذہن پر زور ڈالو میرے دوست۔۔کچھ تو یاد ہوگا ناں۔۔کوڈ۔۔سٹی کوڈ۔۔وہ لوکل نمبر تھا یا پھر کسی اور شہر کا۔۔“ کامیش کے الفاظ اس کی سوچ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔وہ جتنا ہو سکتا تھا اس نمبر کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا

”نہیں۔۔وہ نمبر لوکل نہیں تھا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا

”اس کا مطلب وہ آوٹ آف سٹیشن سے کال آتی ہے“ کامیش نے جھٹ رائے دی

”نہیں۔۔“ اس نے نفی میں سر ہلا دیا

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ وہ نمبر لوکل نہیں ہے، کسی دوسرے شہر کا نہیں ہے؟ پھر کیا موبائل سے آتا ہے فون؟“ کامیش نے ایک بار پھر اندازہ لگایا تھا

’’نہیں۔۔یا پھر شاید۔۔۔‘‘ وہ بری طرح الجھ چکا تھا۔مبہم سے نمبر اس کی سوچوں کی دیوار پر اپنا عکس چھوڑنے میں ناکام تھے۔ وہ جتنا دیکھنے کی کوشش کرتا، الفاظ اتنے ہی مبہم ہو جاتے۔

’’اریب۔۔سوچنے کی کوشش کر۔۔۔‘‘ کامیش کہتا جا رہا تھا اور اس کا ذہن بری طرح کھچاؤ کا شکار تھا۔پیشانی کی شریانیں اس قدر پھیل چکی تھیں کہ خون کی آمدورفت میں بھی اضافہ ہو گیا۔وہ دونوں ہاتھوں کو سر پر رکھے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔یوں تو کوئی بھی نمبر وہ ایک بار دیکھ لے زندگی بھر نہیں بھولتا تھا، پھر یہ کیسے؟ مگر بات تو دیکھنے کی تھی۔اس نے تو کبھی اس نمبر کو سرسری طور پر بھی صحیح سے نہیں دیکھا۔ بس ایک جھلک تھی جو غشی میں آنکھوں کے سامنے لہراتی اور پھر کہیں غائب ہو جاتی۔

’’کاش اُس نمبر کو میں ایک بار پڑھ تو لیتا۔۔‘‘ وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔یوں ہڑبڑا کر طیش میں آنے کی بجائے ایک بار معاملے کی تہہ میں جانے کی کوشش تو کرتا اور نمبر۔۔۔وہ تو اسے نوٹ کرنا چاہیے تھا۔جانے کیا کیا خیالات اس کے دماغ کی بستی کی طرف امڈتے چلے آ رہے تھے۔

’’چل اچھا۔۔بعد میں بات کرتے ہیں اس بارے میں وہ سر آ رہے ہیں۔۔‘‘ کامیش نے کہا تو وہ بے جان قدموں کے ساتھ کلاس روم میں داخل ہوا مگر اس کا ذہن ابھی تک اسی نمبر کے جال میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔جب تک وہ اس نمبر کو یاد نہ کر لیتا تب تک اسے ایک پل بھی چین نہیں آنا تھا۔

’’زیرو۔۔مگر یہ تو ہر نمبر کے سٹارٹ میں آتا ہے۔۔اُس کے بعد کون سا نمبر تھا۔۔۔‘‘ وہ ذہن پر زور ڈالے سوچ رہا تھا۔سب سے بیگانہ ہو کر۔۔۔پروفیسر اپنے لیکچر میں مصروف تھے اور پوری کلاس انہیں سننے میں۔وہ بیٹھا تو فرسٹ رو میں تھا مگر ذہن کسی لاسٹ رو میں بیٹھے سٹوڈنٹ کی طرح آوارہ جگہوں پر گھوم رہا تھا مگر نمبر یاد کرنا آوارہ گھومنے سے کہیں بہتر تھا۔۔شاید اس کے لئے تو ہاں۔وہ اپنے سامنے رکھے سادہ کاغذ پر بال پوائنٹ سے نہ جانے کتنی بار زیرو لکھ چکا تھا۔ہر بار لکھتا اور پھر اسے کاٹ دیتا۔اس کا دماغ اس کبوتر کی طرح جال میں پھنسا ہوا تھا جس سے نکلنے کا کوئی چارہ نہ تھا۔شکاری پورے سامان کے ساتھ آیا تھا اور اس کے وجود کو اپنے جال میں بری طرح جکڑ چکا تھا۔وہ پھڑپھڑا کر اڑنے کی کوشش کرتا مگر ایک دو انچ زمین سے اوپر اٹھ کر واپس زمین پر گر جاتا۔وہ حسرت کے ساتھ کلاس میں بیٹھے دوسرے سٹوڈنٹس کی طرف دیکھنے لگا۔سب میں دوغلا پن غالب تھا۔یوں تو سب پوری توجہ سے پروفیسر پر نظریں گاڑھے اس بات کا ثبوت دے رہے تھے کہ اُن کا پڑھایا گیا ایک ایک حرف ان کی سماعت کے راستے دل میں اتر رہا ہے مگر ذہن تو کہیں اور ہی تھا۔کوئی نئی فلم کے آنے والے پرومو کے بارے میں سوچ رہا تھا تو کوئی کلاس کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔کوئی باہر سے گزرتی لڑکیوں کے قدموں کی چاپ کا منتظر تھا تو کوئی اپنی منگیتر کے ساتھ گزارے گئے حسین لمحات کو ایک بار پھر تازہ کر رہا تھا۔کسی کے ذہن میں کل ہونے والے میچ کی کشمکش چل رہی تھی تو کوئی پچھلی کلاس میں لئے گئے ٹیسٹ کے بارے میں پریشان تھا مگر ان سب کے باوجود سب دوغلے پن کا مظاہرہ کر

رہے تھے۔اس نے ان پر تنقید کرنا چاہی مگر ایک جھماکے سے خود کا خیال آیا۔وہ بھی تو یہی کر رہا تھا۔کلاس میں بیٹھے ہوئے نمبر کو یاد کرنے کی کوشش۔

''زیرو۔۔'' ایک بار پھر دماغ نے الجھنا شروع کر دیا۔وہ بار بار زیرو لکھتا رہا اور پھر کاٹتا رہا۔زیرو سے آگے رسائی فی الحال اس کے بس کی بات نہ تھی۔

☆......☆......☆

''تو پھر کیسی لگی آپ کو ہماری ہونے والی بھابی؟'' جبیں نے حسام کو چھیڑتے ہوئے کہا تھا۔بھابی کا لفظ سنتے ہی اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ چھا گئی۔جسے اس نے گردن جھکا کر سب سے چھپانا چاہا تھا۔

''دیکھا بابا جان۔۔اب تو جناب شرمانے بھی لگ گئے۔۔'' ایسے میں بھلا اریب کہاں پیچھے رہنے والا تھا؟ جبیں کے ساتھ حسام کو زچ کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔

''اریب تم بھی۔۔'' اریب کے زچ کرنے پر اس نے حیرت سے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا جو اس کے بائیں جانب صوفے کے بازو پر ہی بیٹھا تھا۔

''ویسے مجھے تو تمام خوبیاں نظر آئیں صبا میں جو میں اپنی ہونے والی بہو میں دیکھنا چاہتی تھی۔'' سحر فاطمہ نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔

''اور کیا ماما جان۔۔۔کتنی خوبصورت تھیں بھابی۔۔'' جبیں کے یوں یک دم بھابی کہنے پر سب چونکے تھے

''ذرا اطمینان رکھو۔۔وہ ابھی بھابی بنی نہیں ہے۔سمجھ آئی۔۔'' حسام نے فوراً ٹوک دیا

''چلو اگر بنی نہیں ہے تو بن جائے گی۔۔'' اس بار جہانزیب نے کہا تھا جو خاموشی سے تمام گفتگو سے حظ اٹھا رہے تھے۔ماریہ سب کے لئے فریش جوس بنا کر لائی تھی

''تمام سامان تو تم نے صحیح سے رکھ دیا ناں؟'' سحر فاطمہ نے جوس کا گلاس لیتے ہوئے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر واپس کچن میں جا کر باقی کے کام نمٹانے لگی۔

''بابا جان۔۔'' اس کی نگاہوں میں خفگی کی جگہ حیا کا عنصر نمایاں تھا۔شادی کی بات چاہے لڑکی کی ہو یا لڑکے کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے جھکتی ضرور ہیں۔شاید یہی وجہ تھی۔

''کہاں چلے بھائی جان۔۔ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ابھی تو محض بات چل رہی ہے۔پھر منگنی۔۔پھر شادی اور پھر۔۔۔'' ہنستے ہوئے اس نے جبیں کے ہاتھ پر تالی ماری تھی۔دونوں کے قہقہے لاؤنج میں گونجنے لگے۔سحر فاطمہ اور جہانزیب اپنے بچوں کو

یوں ہنستا کھیلتا دیکھ کر مسکرانے لگے۔

''اور پھر سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' یک دم حسام اریب سے سنجیدہ لہجے میں مخاطب ہوا مگر دل میں کتنے لڈو پھوٹ رہے تھے، اس کا علم وہاں موجود سب کو تھا

''بتادوں؟'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے ذو معنی لہجے میں کہا تو اس کی پلکیں جھپکتی چلی گئیں۔ جس پر ایک بار پھر جبیں اور اریب کا قہقہ گونجا۔

''ابھی جتنا ہنسنا ہے ہنس لو۔۔۔ جب تمہاری باری آئے گی ناں۔۔تب میں بتاؤں گا تمہیں۔۔'' حسام نے چڑ کر کہا اور کشن اٹھا کر گود میں ٹھونس لیا

''میری باری میں ابھی بہت وقت ہے'' اریب نے فوراً سے پہلے جواب دیا

''جھوٹ۔۔۔ زیادہ جھوٹ مت بولو اریب۔۔۔ مجھے سب معلوم ہے۔'' ایسے میں بھلا جبیں کہاں خاموش رہنے والی تھی؟ اریب کے خلاف کوئی بات ہو اور جبیں اپنا حصہ نہ ڈالے ایسا کبھی نہ ہوا تھا، اور نہ کبھی ہوگا۔

''جبیں خاموش۔۔۔ دیکھو تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا؟'' جبیں کے لب ابھی متحرک ہی ہوئے تھے کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ اب جب اریب کو زچ کرنے کی باری آئی تھی تو حسام کیوں خاموش بیٹھتا؟ پلٹ کر جبیں سے مخاطب ہوا

''کون سا جھوٹ بول رہا ہے اریب؟ میری پیاری بہن ہے ناں۔۔ پلیز بتاؤ ناں'' وہ جتنی خوش آمد کر سکتا تھا، کر رہا تھا مگر اریب بھی پورا زور لگا کر جبیں کو خاموش کروانے کی کوشش کر رہا تھا

''دیکھو جبیں اگر تم نے کچھ کہا ناں۔۔۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جبیں کی طرف بھاگا، جبیں بھی اس سے جتنا بچ سکتی تھی، بچ رہی تھی۔ حسام بار بار جبیں کو راز اگلنے پر ابھار رہا تھا، جبیں کے قہقہوں سے پورا لاؤنج گونج اٹھا تھا

''یہ تینوں کبھی باز نہیں آئیں گے۔۔'' سحر فاطمہ کے لبوں پر ہلکی سی کسک ابھری۔

''باز آئیں گے بھی کیسے؟ یہ تینوں تو ہمارے آنگن کے پھول ہیں۔ ان کے یونہی ہنسنے کھیلنے سے ہی تو اس آنگن کی رونقیں بحال ہیں۔'' جہانزیب نے جوس کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔

''صحیح کہا آپ نے۔۔'' لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد سحر فاطمہ دوبارہ گویا ہوئیں

''ویسے جبیں کا آئیڈیا بھی برا نہیں ہے۔'' سحر فاطمہ کے چہرے پر شرارت سوجھی تھی۔ جسے جہانزیب فوراً سمجھ گئے اور ہلکا سا مسکرا دیئے۔ جبیں کا تعاقب کرتے جیسے ہی اریب کی نظر سحر فاطمہ اور جہانزیب کی طرف گئی تو لمحے سے پہلے وہ سب کچھ بھانپ گیا۔

''ایسا سوچنا بھی مت آپ۔۔'' فوراً ان کے خیالوں کی تردید کر دی۔ اریب کے لفظوں پر دونوں کو کوئی دھچکا نہیں لگا۔ وہ اریب

کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے۔

"اِس میں برا ہی کیا ہے؟ آخر حسام کے بعد تمہاری ہی تو باری ہے۔ابھی سے ڈھونڈنا شروع کریں گے تو حسام کی شادی تک ملے گی۔" جہانزیب نے کہا تھا

"نہیں بابا جان۔۔آپ کو ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔موصوف نے پہلے سے ہی ایک لڑکی کو پسند کیا ہوا ہے۔" جبیں کی زبان پر جتنی گرہیں لگا سکتا تھا اریب نے لگانے کی کوشش کی تھی مگر وہ بھول چکا تھا وقت آنے پر اس کی زبان قینچی کی طرح ٹر ٹر کرتے ہوئے سب کچھ اگل دیتی ہے۔

"جبیں۔۔۔دیکھو اگر تم نے آگے کچھ کہا ناں۔۔تو میں تمہیں آئندہ اپنی کوئی بات نہیں بتاؤں گا۔" اس نے آخری بار تنبیہہ کی تھی

"ٹھیک ہے نہ بتانا۔" شانے اچکاتے ہوئے جبیں نے بے نیازی کے ساتھ کہا تو وہ مزید چڑ گیا۔اس بار حسام اریب کی اس حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"چلو اچھا۔۔اب بتا بھی دو ناں۔۔آخر کون خوش قسمت ہے جو ہمارے اریب کی دھڑکنوں کا حصہ بن چکی ہے اور ہمیں بھنک تک بھی نہیں ہونے دی۔" حسام نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا

"بھائی۔۔اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔۔میں نے آپ کو اتنا تنگ نہیں کیا تھا۔" منہ بسور کر اریب نے شکوہ کیا

"او ہو۔۔اب اپنی باری آئی تو منہ بنالیا جناب نے۔۔ویسے میں بھی جان کر ہی دم لوں گا،اس خوش نصیب کا نام۔۔" یہ حربہ بھی ناکام چلا گیا۔

"اب بس بھی کرو۔۔کیوں میرے لاڈلے کو تنگ کر رہے ہو تم دونوں؟" سحر فاطمہ نے آگے بڑھ کر اس کے بجھے ہوئے چہرے کو پیار سے تھپتھپایا

"اب کوئی حاعفہ کا نام نہیں لے گا یہاں سنا سب نے۔۔" حاعفہ کا نام سحر فاطمہ کے منہ سے سن کر اریب ہکا بکا رہ گیا۔فقط وہ ہی نہیں جبیں بھی حیران تھی۔ابھی تک اس نے اُس کا نام تک نہیں لیا تھا۔

"ماما جان۔۔"اریب نے محوِ حیرت سے سحر فاطمہ کی طرف دیکھا تھا۔جہانزیب بھی اب صوفے سے اٹھ کر اس کے پاس آئے تھے

"ویسے جبیں کے ساتھ اکثر میں نے دیکھا ہے اسے۔۔دیکھنے میں کافی خوبصورت ہے۔" ان کا لہجہ بھی کسی قدر شریر تھا۔

"بابا جان۔۔آپ بھی۔۔"اریب کی بات سن کر وہ بھی ہنس دیئے۔

"اچھا اس کا نام حاعفہ ہے۔نام تو اچھا ہے اور کیا جانتے ہیں آپ اُس کے بارے میں مجھے بھی تو بتائیں۔۔" حسام نے دلچسپی سے استفسار کیا تھا

"لیکن ماما جان ۔۔آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" جبیں کے دل میں جو بات کھٹک رہی تھی، وہ پوچھ کر ہی دم لی

"ماں باپ اپنی اولاد سے اتنے غافل نہیں ہوتے کہ ان کی بدلتی عادتوں کو نہ سمجھ سکیں۔ بچوں کی ایک ایک حرکت کو والدین سے بڑھ کر کوئی نہیں سمجھ سکتا جبیں۔۔ہم پہلے دن سے ہی جانتے تھے کہ اریب تمہاری دوست حاعفہ میں دلچسپی لیتا ہے۔" سحر فاطمہ نے کہا تو اریب کے چہرے پر بھی ایک کسک ابھر آئی۔ جسے حسام نے فوراً بھانپ لیا

"ویسے جبیں۔۔اگر لڑکی ہنستی ہے تو کہتے ہیں بات بن گئی اور اگر لڑکا ہنس دے تو؟" حسام کا لہجہ انتہا درجے کا شریر تھا۔

"آپ سب۔۔۔" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ کیا کہے؟

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی آپ سے۔۔ میں جا رہا ہوں۔۔" اس نے آخری حربہ ہی استعمال کیا تھا۔ گردن جھٹک کر وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"کہو تو بابا جان سے بات کروں کہ میری منگنی کے ساتھ تمہاری بھی نسبت طے کر دیں۔۔" جاتے جاتے بھی حسام نے اریب کو زچ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی

"اب بہت ہو گیا حسام۔۔اتنا بھی زچ نہیں کرتے چھوٹے بھائی کو۔۔" جہانزیب نے حسام کو سمجھایا

"اور جب وہ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہوا تھا تب تو آپ نے اسے کچھ نہیں کہا۔" اپنی سرزنش پر اس نے ہلکا سا منہ بگاڑ کر کہا۔

"ویسے بھائی ہاتھ تو اس نے صبح ہی دھو لئے تھے۔۔۔" جبیں نے فوراً مداخلت کی، جس پر سب ہنس پڑے۔ تبھی ماحول میں موبائل کی رنگ ٹون نے مداخلت کی۔ یہ جہانزیب کا موبائل تھا۔

"ایکسکیوز می۔۔" وہ موبائل ریسیو کرتے ہی ایک سائیڈ میں چلے گئے اور کچھ لمحوں بعد لوٹے تو ان کے چہرے پر سنجیدگی تھی

"کیا ہوا؟ کس کا فون تھا؟" سحر فاطمہ نے پوچھا

"ایجنٹ کا فون تھا۔ دو دن بعد کی ٹکٹ ملی ہے۔" انہوں نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا

"تو اس میں اتنے افسردہ ہونے کی کیا بات ہے؟ آپ دو دن بعد چلے جانا۔ ویسے بھی اپنا بزنس ہے۔ اگر دیر سویر ہو بھی گئی تو کیا ہرج ہے؟" سحر فاطمہ نے ان کی پریشانی کو کم کرنا چاہا تھا۔ جس پر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

ملتا جلتا ہے چاند سے کتنا

وہ جو رہتا ہے کچھ کچھ اوجھل بھی

کمرے میں پہنچتے ہی وہ بیڈ پر اوندھے منہ دھڑام سے جا گرا۔ چہرے پر انتہا کی کسک تھی۔ آنکھوں میں حاعفہ کی ایک جھلک

لہرائی۔طمانت کا احساس اس کے دل میں گھر کر گیا۔

"حاعفہ۔۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے دھیرے سے اُس کا نام پکارا تھا۔آنکھیں بند کرتے ہی اس کی کئی پرچھائیں یکے بعد دیگرے اس کے ذہن کی ویران گلیوں میں اپنے نقش گاڑھنے لگی۔ہوا کے پروں پر سوار، رات سے مشابہہ گہری سیاہ حسین وجمیل زلفیں جو اپنے اندر کسی سیپ کے موتیوں سے بھی زیادہ چمک سینتے ہوئے تھیں، ایسے لہرا رہی تھیں جیسے کوئی ریشمی کپڑا ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہا ہو۔بڑی بڑی سیاہ پلکیں جو جھیل آنکھوں کے گرد حفاظتی بند کی طرح سکیورٹی کا کام کر رہی تھیں مگر وہ اس سکیورٹی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ان عمیق گہرائیوں میں غوطے لگا چکا تھا۔محبت تھی یا پھر پسند یا پھر بس ایک چاہت۔وہ اس بات سے انجان تھا بس جانتا تھا تو یہ کہ اس کو دیکھے بغیر دل کو سکون نہیں ملتا۔ایک بار نام سماعت کا حصہ بن جائے تو جب تک اُس کا قصہ نہ سن لے، قرار نہیں آتا۔کہنے والا صبح سے شام تک اس کی باتیں کرتا جائے اور وہ خاموشی سے زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے مبہوت اپنی سماعت میں وہ لفظ اتارتا جائے تو اسے اس بات کا احساس تک نہ ہوگا کہ کب سورج اپنی نرم گرم شعاعوں کو سمیٹے مغرب کی مسافت طے کرتا سمندر کی عمیق گہرائیوں میں پانی پر اپنا عکس چھوڑتے دھیرے دھیرے سیاہی کے سامنے اپنے ہتھیار ڈال دے۔رات کی سیاہی آسمان کو اپنی گرفت میں لے کر چاند کو بادلوں کی اوٹ میں چھپائے ایک وقت تک اندھیرے کا قہر اس کے وجود پر برساتی رہے مگر ہوش میں لانے سے ناکام رہے گی۔اب یہ عشق ہے یا محبت، پسند ہے یا چاہت یا پھر فقط دل لگی؟ وہ خود بھی کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔تبھی اپنے خیالات کو اگلے لمحے جھٹک کر کروٹ بدل لی۔جو جذبہ سچائی سے ناآشنا ہے، پھر بھلا اس کے بارے میں سوچ کر اپنا وقت کیوں ضائع کرے؟ مگر دل کو بھلا کون سمجھائے؟

"نگاہیں جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو بہت غضب ڈھاتی ہیں۔اس لئے بہتر ہے کہ اپنی نگاہوں کی حفاظت کرو، کہیں ایسا نہ ہو آنکھوں کی گستاخیاں بے چارے دل کو سہنی پڑے۔۔" اُس کا تلخ انداز بھی اپنے اندر ایک لطیف سی خماری لئے ہوئے تھا۔الفاظ کو کہے اگرچہ ایک عرصہ گزر چکا تھا مگر گونج ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔

"کبھی تو اظہار ہوگا۔کبھی تو اقرار ہوگا۔محبتیں نہ سہی۔۔۔کبھی تو تکرار ہوگا" اس نے شوخ لہجے تصورات میں ایک بار پھر اسی کے عکس کو گمان کرتے ہوئے کہا تھا۔

☆......☆......☆

؎ دشمنِ جاں فلک، غیر ہے یہ زمیں کوئی اپنا نہیں

ہمیشہ کی طرح زلفوں کو آزاد چھوڑے وہ اریب کے قریب جا رہی تھی۔

"یار پھر کچھ یاد آیا؟" کامیش کے پوچھنے پر اس نے افسردگی کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر ایک نظر

بادلوں سے گھرے آسمان پر دوڑائی، جو سورج کو اپنی آغوش میں لئے خنکی میں اضافہ کر رہے تھے۔ دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے وہ کچھ دیر یونہی کھڑا سوچتا رہا۔ تبھی ایک بار پھر اس کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''ہیلو کامیش۔۔۔ہیلو اریب۔۔۔'' چہرے پر مسکراہٹ کا دیا جلائے اس نے کہا تھا۔ کامیش تو اُس کے وہاں آنے پر جیسے لٹو ہی ہو چکا تھا۔

''ہانیہ تم۔۔۔کیسی ہو تم؟'' وہ ایسے ری ایکٹ کرنے لگا جیسے جانے کتنی صدیوں بعد وہ اس سے ملاقات کر رہا ہو مگر اُس کی تو نظریں کہیں اور ہی مرکوز تھیں جو اس کے وجود کو مسلسل نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ چہرے پر تغافل و اضطرابی کے ملے جلے تاثر تھے۔ وہ اس کو ایک آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنے کا روادار نہیں تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔۔۔تم سناؤ، تم کیسے ہو؟'' کامیش سے بات کرتے ہوئے بھی وہ کن انکھیوں سے اسی کے چہرے کو تک رہی تھی۔ جانے کیا کشش تھی اس چہرے میں جو ان نگاہوں کو ایک لمحے کے لئے بھی خود سے دور جانے ہی نہیں دے رہی تھیں مگر کامیش کی باتیں اس کے تسلسل کو توڑ رہی تھیں۔

''میں تو بالکل فٹ فاٹ۔۔۔ویسے یہ گرے سوٹ تم پر بہت جچ رہا ہے۔'' اگلے ہی لمحے وہ اپنی عادت سے مجبور اس کی خوش آمد کرنے لگا

''شکریہ۔۔۔'' بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کامیش کے سوال کا پاس رکھا اور دوبارہ اریب کی طرف متوجہ ہوئی جو ابھی تک بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں کھویا جانے کس عروج کو اپنی قسمت کا حصہ بنانے کی چاہ کر رہا تھا؟

''تم پریشان ہو اریب؟'' آگے بڑھ کر اس نے پوچھا تو پیشانی پر شکن ابھارے وہ متغجل ذرا پیچھے کو کھسکا اور سپاٹ لہجے میں گویا ہوا

''تمہیں اس سے مطلب؟'' مشتعل آنکھوں نے ایک بار پھر اس کے بھرم کا پاس تک نہ رکھا۔ اس کی معصومیت کو، نرم لہجے کو ترشی کے ساتھ پاش پاش کر دیا اور وہ ایک بار پھر خاموشی کے ساتھ اس تلخ لہجے کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہی۔

''کامیش۔۔۔میں لائبریری جا رہا ہوں۔ فارغ ہو کر تم بھی آ جانا۔۔'' یہ کہتے ہی وہ وہاں سے ایسا کھسکا کہ پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا۔ ہانیہ کے ساتھ ساتھ کامیش بھی اس بار اریب کے رویے کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ ایسی بے رخی، ایسی تلخی اس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ پیشانی پر تغافل کے ایسے تاثر جو شاید پہلے کبھی نہ ابھرے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی ان سب کی؟

''یہ تمہارے دوست کو کیا ہوا؟ جب بھی میں اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہوں وہ ایسے ری ایکٹ کیوں کرتا ہے؟'' ہانیہ نے کامیش سے پوچھا تو اس نے لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن کو جھکا لیا۔ وہ خود بھی اریب کی اس حرکت پر شرمسار تھا۔ اگرچہ اُس کی طبیعت میں سنجیدگی تھی مگر ایسا روکھا پن۔۔۔؟؟ تانے بانے بنتے گئے مگر کوئی سرا ہاتھ نہ لگا۔

''انسان کو اتنا کھڑوس نہیں ہونا چاہئے'' ہانیہ نے سخت لہجے میں کہا تو کامیش نے بات ٹالنا چاہی اور بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی سنجیدگی کو گُل کرنا چاہا۔

''چھوڑو اریب کو۔۔تم بتاؤ، فری ہو تو کافی پینے چلیں کینٹین۔۔؟'' معجل اسے آفر کی جسے اس نے بنا کسی تردد کے قبول کر لی۔

''چلو پھر۔۔'' ایک جست لگا کر اس نے درمیان میں حائل بینچ کو پار کیا اور پھر دونوں باتوں میں ایسے مشغول ہوئے کہ اریب کی شخصیت ایک بار پھر ان کے درمیان سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

بجلیوں کی یورش سے شاخ شاخ لرزاں ہے

کیا یہی بہاراں ہے کیا یہی گلستاں ہے

دائیں ہاتھ میں ریکٹ کو گھماتے ہوئے وہ کار سے اترا تو سامنے لان میں جہانزیب کو سوٹ کیس کے ساتھ کھڑا پایا۔ سحر فاطمہ اور جبیں بھی وہیں موجود تھیں۔ لمحے بھر وہیں ٹھہرنے کے بعد وہ ان کے پاس گیا۔

''بابا جان۔۔آپ جا رہے ہیں؟''

''ہاں۔۔!! انڈو جا رہا ہوں، بزنس کے سلسلے میں۔۔دو دن بعد ایک ضروری میٹنگ ہے'' جہانزیب کے کہنے پر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور کسی خیال میں کھو گیا

''کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گم ہو؟'' جبیں نے چٹکی بجائے اس کو خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا

''بابا جان میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ انڈو سے واپس آتے ہوئے میرے لئے ایک عدد موبائل لے آئیں تو۔۔'' اس نے ذرا جھجکتے ہوئے فرمائش کی تھی جس پر ایک لمحے کے لئے جہانزیب اور سحر فاطمہ سکتے میں آگئے۔ مبہوت اسی کے چہرے کو دیکھتے رہے۔

''وہ دراصل بابا جان۔۔کامیش سے بعض اوقات بات کرنی ہوتی ہے سٹڈی کے سلسلے میں۔۔'' اس نے اپنی نگاہیں ایسے جھکا لیں جیسے کسی غلطی کا برملا اعتراف کر رہا ہو۔

''تو کامیش سے بات کرنے کے لئے گھر کا فون ہے تو صحیح۔۔'' سحر فاطمہ نے بنا وقت ضائع کئے اس کی فرمائش کو رد کر دیا

''ماما جان مگر یونیورسٹی میں تو اسے نہیں لے کر جایا جا سکتا۔۔اتنی لمبی تار کہاں سے لائیں؟'' اس نے ہلکا مزاح کا تڑکا لگانا چاہا مگر سوائے جبیں کے کسی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آئی۔

''تو یونیورسٹی میں کیا ضرورت موبائل فون کی؟ مل تو لیتے ہو تم کامیش سے۔۔'' سحر فاطمہ نے اس حیلے کو بھی رد کر دیا

''اور کتنی بار کہا ہے کہ اپنی فرینڈ لسٹ ذرا چھوٹی رکھو۔۔یونہی کسی انجان بندے سے دوستی نہیں کرنی۔۔'' اس بار سحر فاطمہ کے

لہجے میں سختی کم، پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔ایسی پریشانی جو کسی کے کھونے سے دلِ ویراں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لے۔ایک ایسا احساس ان کے لفظوں سے چھلک رہا تھا جو اپنے اندر جدائی کی تشنگی، درد کی ٹیسیں، بچھڑنے کا غم سمیت طرح طرح کے جذبات کو اپنے اندر سینتے ہوئے تھا۔ان کی آنکھوں کی رعنائی ایک انکشاف کر رہی تھی۔ایک ایسا انکشاف جو ایک گہرا راز سمیٹے ہوئے تھی مگر کیا یہ سب سچ تھا یا پھر وہ اکیلا یہ سب کچھ محسوس کر رہا تھا۔سب کی باتوں کو بن کہے سمجھ لینے والا جانے کیوں ان خیالات و تاثر کو ہمیشہ سے سمجھنے سے قاصر رہا۔اس شکنوں کا مطلب جو اکثر بات کرتے ہوئے سحر فاطمہ اور جہانزیب کی پیشانی پر نمودار ہوتے تھے، کبھی نہ جان سکا۔

"ماما جان۔۔میری فرینڈ لسٹ کا میش سے سٹارٹ ہو کر اسی پر ختم ہو جاتی ہے۔"اس نے پھیکے سے لہجے میں کہا تھا

"تو اس دوستی کو یونیورسٹی کی حدود تک ہی رکھو۔"سحر فاطمہ کا دلخراش لہجہ اریب کے لئے ایک شاک سے کم نہ تھا۔جبیں بھی سحر فاطمہ کے اس رویے پر حیراں تھی مگر جہانزیب نے بات کو سنبھال لیا

"دیکھو بیٹا! ضد نہیں کرتے۔تمہاری ماما سب کچھ تمہارے بھلے کے لئے ہی تو کہہ رہی ہیں"انہوں نے پیار سے اس کے دائیں رخسار کو تھپتھپایا تھا۔

"موبائل نہ رکھنے میں آخر کون سی بھلائی پنہاں ہے؟"اس نے سنجیدہ لہجے میں استفسار کیا۔اس بار دونوں کے لبوں پر ایک مہر لگ گئی۔وہ اس خاموشی کا مطلب سمجھنے سے ایک بار پھر قاصر رہا۔

"ویسے ماما جان۔۔اریب ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ایک عدد فون رکھنے میں کیا ہرج ہے؟میرے پاس بھی تو ہے بلکہ آپ نے بنا مانگے مجھے برتھ ڈے پر گفٹ دیا تھا۔اب اگر اریب نے موبائل لینا چاہا ہے تو اس میں برا کیا ہے؟"جبیں نے اریب کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"اب تم مت سمجھاؤ کہ کیا برا ہے کیا اچھا ہے؟"سحر فاطمہ نے جبیں کو جھاڑ دیا۔جس پر وہ ہونقوں انہیں دیکھتی رہی۔

"اور اریب تم۔۔سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا۔۔۔ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں، آج تمہیں شاید ہماری باتیں بری لگیں مگر کل جب تم ہماری عمر کو پہنچو گے تو، تمہیں لگے گا کہ ہم ٹھیک کرتے تھے۔ماں باپ ہمیشہ اپنے بچوں کا بھلا چاہتے ہیں اور ہم بھی یہی چاہتے ہیں"انہوں نے پیار و محبت کے ساتھ اس کے رخسار کو چھوا تھا۔ممتا کا احساس اس کے جسم میں سرایت کرنے لگا

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں کہ آخر اس میں کون سی بھلائی ہے میرے لئے؟"اس نے ایک بار پھر وہی سوال داغا تھا۔اس بار سحر فاطمہ جواب سوچ چکی تھیں۔

"اس کا جواب تم بہتر طور پر جانتے ہو۔"ان کی ذومعنی باتوں کا مطلب ایک بار پھر وہ سمجھنے سے قاصر رہا

"مطلب؟"اس نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا

''مطلب تو بعد میں سمجھنا اور سمجھانا، فی الحال تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ میں چلتا ہوں'' جہانزیب نے مداخلت کرتے ہوئے اپنا سوٹ کیس اٹھایا سب سے الوالدائی دعا سلام کرنے کے بعد اسی کار میں رکھ دیا۔

''اپنا خیال رکھیے گا۔'' جیسے ہی انہوں نے فرنٹ ڈور اوپن کیا تو سحر فاطمہ نے کہا تھا جس پر انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا

''آپ بھی میرے بچوں کا خیال رکھیے گا۔'' انہوں نے ابرو اچکاتے ہوئے اریب کی طرف اشارہ کیا تھا۔ جو منہ لٹکائے کھڑا ریکٹ کو بے پرواہی کے ساتھ گھماتا جا رہا تھا۔ سحر فاطمہ نے پلٹ کر دیکھا اور پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے یقین دہانی کرانا چاہی تھی۔ اگلے ہی لمحے انہوں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور پھر وہاں سے ائیر پورٹ کے لئے رخصت ہو گئے۔

''اریب ذرا۔'' سحر فاطمہ کچھ کہنے کے لئے پلٹی تو اریب منہ بنائے وہاں سے سے کھسک گیا۔

''لگتا ہے جناب کا منہ بگڑ گیا ہے۔'' سحر فاطمہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جبیں کی طرف دیکھا تھا۔

''اس بار میں اریب کے ساتھ ہوں ماما۔'' جبیں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا اور اندر کی جانب چل دی۔

''یہ دونوں سمجھیں گے نہیں۔'' گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

☆......☆......☆

نگاہوں کی زباں کوئی جو سمجھے
سرِ محفل کبھی ہم لب نہ کھولیں

سرد رات کی ٹھنڈی ہوائیں کھڑکی کے راستے سٹڈی ٹیبل پر بکھرے اسائنمنٹ کے صفحات میں گدگدی کا احساس اجاگر کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کی زلفیں بھی آنکھوں کے سامنے آ کر اس کے دھیان کو بانٹنے کی کوشش کرتیں مگر وہ ان شوخ زلفوں کو کانوں کے پیچھے اڑستے ہوئے ان کی شوخ اٹکھیلیوں کو ٹھکانے لگا رہی تھی۔ وہ پچھلے ایک گھنٹے سے اپنی اسائنمنٹ بنانے میں مصروف تھی اور اسی دوران کیا وقت ہو چکا ہے، اسے خبر تک نہ تھی۔ رات کا اندھیرا اس کی سوچوں کے سنگم کے چھونے سے بھی اجتناب برت رہا تھا۔ نیم مدہم روشنی اگرچہ پورے کمرے میں دن کا سماں پیدا کرنے میں ناکام دیکھائی دے رہی تھی مگر سٹڈی ٹیبل پر اچھی خاصی روشنی بکھیر رہی تھی۔ اس کی بہن جو کتابوں کے اوٹ سے چھنتی روشنی کے سبب کروٹیں بدل کر سونے کی کوشش کر رہی تھی فوراً اٹھ بیٹھی۔

''ہانیہ۔ باقی کا کام صبح کر لینا۔ دیکھو کتنی رات ہو گئی ہے۔'' اس نے جمائی لیتے ہوئے کہا تھا

''آپی میں آج کا کام کل پر چھوڑنے کے حق میں نہیں ہوں، یہ بات آپ بھی اچھے سے جانتی ہیں۔'' اس نے کتاب کو لیمپ کے بالکل سامنے لا کھڑا کیا تا کہ چھنتی روشنی بھی پلنگ پر جانے سے اجتناب کرے مگر روشنی تو اپنا راستہ خود بنا رہی تھی۔

"خدا کے لئے ہانیہ مجھ پر رحم کرو۔۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد رات ہی تو سونے کے لئے ملتی ہے اور تبھی تم لیمپ جلا کر میری نیند خراب کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔۔" وہ جمائی پر جمائی لے رہی تھی اور نیم غنودگی میں ہانیہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ہانیہ نے پلٹ کر پاکیزہ کی طرف دیکھا تو واقعی وہاں غنودگی کا ایک جہاں آباد تھا۔نیم مدہم روشنی میں بھی وہ پاکیزہ کے چہرے پر ایک افسردگی کی لہر کو دیکھ سکتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔۔" ایک پل سوچنے کے بعد اس نے اسائنمنٹ کو سمیٹا اور لیمپ آف کر کے پاکیزہ کے ساتھ ہی پلنگ پر آلیٹی۔

"ویسے آپی۔۔!! اسلم بھائی کی طرف سے کوئی خبر؟" ہانیہ کا سوال سنتے ہی پاکیزہ لیٹتی لیٹتی رہ گئی۔اس سوال نے جیسے پاکیزہ کی نیندیں چرا لیں۔وہ مبہوت دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا آپی؟" ہانیہ نے شانوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا

"کچھ نہیں تم سو جاؤ۔۔۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے" بات کو ٹالنے کی غرض سے کہا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"اب ہم سے مزید انتظار نہیں ہوتا۔۔۔ ہمیں بس نکاح کی تاریخ چاہیے ورنہ۔۔۔" ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

آنکھوں میں اشک خود بخود جمع ہونا شروع ہو گئے۔ہانیہ ان آنسوؤں کو نہ دیکھ سکی شاید وہ خود بھی کسی اور دنیا میں کھوئی ہوئی تھی

"آج بھی اریب کی اسائنمنٹ لاجواب تھی۔۔۔ ویلڈن اریب۔۔" پروفیسر کے تعارفی کلمات اس کی سماعت میں زہر گھول رہے تھے۔اریب کی مسکراتی ہوئی پرچھائی اس کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھتی جا رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ میں اتنی آسانی سے تمہیں آگے نہیں نکلنے دوں گی مسٹر اریب عالمگیر۔۔ جن خوابوں کو میں نے بچپن سے اپنی آنکھوں میں سینت کر رکھا، جن خوابوں کو تعبیر کا عملی جامہ پہنانے کے لئے میں نے شب و روز کی پرواہ نہ کی۔انہی خوابوں کو میں اب کسی اور کا مقدر بنتا نہیں دیکھ سکتی۔میرے خواب فقط میرے ہیں۔میں ان خوابوں کے بنا ادھوری ہوں اور یہ خواب میرے بنا۔" اس نے خوابیدہ لہجے میں کسی انجانے وجود کو اپنے سامنے گمان کرتے ہوئے مدہم لہجے میں کہا تھا

☆......☆......☆

سونی ہیں آنکھوں کی گلیاں دل کی بستی ویراں ہے

ایک خموشی ایک اندھیرا چاروں جانب رقصاں ہے

صبح سے ہی ایک عجیب سی اضطرابی کیفیت طاری تھی۔آنکھیں سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی بوجھل محسوس ہو رہی تھیں۔دل میں بھی ایک شور برپا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کچھ غلط ہونے والا ہے مگر کیا؟ وہ کچھ سمجھ نہ سکا تھا مگر اضطراب تھا کہ کم ہونے کی بجائے کسی بپھرے ہوئے طوفان کی مثل بڑھتا ہی جا رہا تھا۔دل مضطر کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے تغافل کا شکار تھا۔فکر کا ایک جہان مٹھی بھر دل

میں آن بسا۔ اس نے کئی بار اپنی توجہ بانٹنا چاہی۔ دھیان کو دوسرے کاموں میں لگانا چاہا مگر موسم کے رنگین تیور بھی اس کے دل کی اداسی کو کم کرنے سے قاصر تھے۔ بادلوں کی اٹکھیلیاں، سورج کی سرد تپش، ہواؤں کی سرگوشیاں بھی افکار کے لشکر کو منتشر نہ کر سکیں۔ کھوئے کھوئے ذہن کے ساتھ وہ گھر کے بیرونی دروازے کو عبور کر رہا تھا جب اس کا وہم سچ ہوتا دکھائی دیا۔ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں نے پیشگی خبر دے دی۔ اس نے دائیں طرف دیکھا تو سحر فاطمہ اداس لان میں بیٹھی تھیں۔ وہ دھیمے قدموں سے ان کی طرف بڑھا۔ ان کی پیشانی کی شکنیں اسے سب کچھ بتا چکی تھیں مگر وہ سننا چاہتا تھا کہ شاید اس بار اس کی صلاحیتیں دھوکہ دے چکی ہوں۔

"ماما جان۔۔!! خیریت تو ہے ناں؟" اس نے گندھے ہوئے لہجے میں دھیرے سے کہا تھا۔ سحر فاطمہ نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ وہ سب سچ تھا۔ خاموش نگاہوں نے سب کچھ کہہ ڈالا۔ ایک گہری نگاہ۔۔۔ اگرچہ کئی لمحے خاموش رہی مگر کبھی کبھار خاموشی بھی باتیں کر لیا کرتی ہیں اور پھر یہ تو خاموشی کو سمجھتا تھا۔

"حاعفہ کے والدین کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ایک لمحے کے لئے وہ سانس لینا بھی بھول گیا۔ اگر قدرت نے سانسوں کو انسان کے اختیار میں دیا ہوتا تو شاید وہ واقعی سانس نہ لیتا مگر کچھ چیزیں انسان کے اختیار سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔ سانسوں کی روانی بھی انہی میں سے ایک تھی۔ وہ بنا پلکیں جھپکائے سحر فاطمہ کو دیکھتا رہا۔ جو اس کے چہرے پر بدلتے رنگوں کو بھانپ سکتی تھیں۔ تبھی کھڑے ہو کر اس کے شانوں کو دھیرے سے چھوا۔

"رو رو کر اس نے اپنے آپ کا برا حال کیا ہوا ہے؟" سحر فاطمہ بھی حاعفہ کے دکھ میں شریک تھیں مگر شاید وہ اریب کا درد سمجھ نہ سکیں۔

"مگر۔۔ یہ سب ہوا کیسے؟" بڑی مشکل سے حواس کو مجتمع کیا تھا

"پتا نہیں۔۔ وہ آج جب جبیں نے اسے فون کیا تو تب اسے پتا چلا۔۔"

"تو وہ کیا اب وہاں اکیلی ہے؟" اسے بس حاعفہ کی فکر کھائے جا رہی تھی۔ دل چاہا کہ ابھی اُس کے پاس چلا جائے۔ اس کا دکھ بانٹے، اس کے آنسو پونچھے، اسے سہارا دے مگر سوچیں خود بخود پیچھے کھسک جاتیں اور دل سے سوال اٹھتا، کس حیثیت سے؟

"نہیں۔۔ جبیں اسے اپنے ساتھ لے آئی ہے فی الحال تو۔۔۔ اور ابھی وہ اسی کے کمرے میں ہے۔" سحر فاطمہ نے کہا تو اس کی جان میں کچھ جان آئی۔ وہاں اکیلے درد میں کڑھنے سے تو بہتر تھا کہ وہ یہاں رہے۔ کم سے کم یہاں اس کا خیال تو رکھا جا سکتا تھا۔ اس نے دھیرے سے پلکیں جھپکائیں تو چشم میں ابھرتا پانی، یک دم اکٹھا ہو گیا۔ بھیگی پلکیں موتی کی طرح چمکنے لگی تھیں مگر وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

"خیر۔ تم بیٹھو۔۔۔ میں تمہارے لئے کھانا لگاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر کچن کی طرف بڑھیں جبکہ وہ کھڑا اپنے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

کچھ وقت کے بعد وہ جبیں کے کمرے کے باہر کھڑا تھا۔اندر جبیں حاعفہ کے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھی اس کو حوصلہ دے رہی تھی مگر اُس کے آنسو تھے کہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔بارش کی بوندوں کی طرح رم جھم مسلسل جاری تھی۔روشن رخسار پر، بارش کی یہ بوندیں کسی سیپ میں چمکتے موتی سے کم نہ تھیں مگر وہ اس موتی کو بہتا دیکھ کر انہیں ضائع کرنے کے حق میں نہ تھا۔اسے روتا دیکھ کر اس کا دل بری طرح مچل رہا تھا۔دل چاہا فوراً آگے بڑھ کر ان آنسوؤں کو اپنی انگلی کے پوروں سے پونچھ ڈالے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

''حاعفہ۔۔۔خاموش ہو جاؤ۔۔دیکھو۔اس طرح رونے سے انکل آنٹی واپس تو نہیں آجائیں گے ناں؟'' وہ اس کی ہمت باندھ رہی تھی مگر جن کے اپنے خود سے جدا ہو چکے ہوں ان کے درد کو بھلا دوسرے کہاں سمجھ سکتے ہیں؟ دوسرے درد بانٹ تو سکتے ہیں مگر کم نہیں کر سکتے تھے۔

''موم ڈیڈ۔۔کیوں چھوڑ کر گئے مجھے؟ کیوں جبیں؟'' وہ گلوگیر لہجے میں شکوہ کر رہی تھی مگر اس شکوے کا جواب تو جبیں کے پاس بھی نہ تھا تبھی وہ خاموش کر گئی۔اس کے گلوگیر لہجے نے اریب کے دل پر بھی ایک ضرب لگائی تھی۔وہ ایک لمحے کے لئے تو یقین ہی نہ کر سکا کہ کیا یہ وہی حاعفہ ہے جو شانِ بے نیازی کے ساتھ بات کیا کرتی تھی؟ جس کا چہرہ ہمیشہ کسی کھلتے گلاب کی طرح خوشبوؤں کو پورے بن میں بکھیرتا تھا۔نہیں۔۔۔یہ وہ حاعفہ نہیں تھی۔اُس حاعفہ میں بھی توانا تھی۔ایک غرور تھا اور سامنے بیٹھی حاعفہ تو بالکل الگ تھلگ سی لگ رہی تھی۔جس سے قسمت نے سب کچھ چھین لیا تھا۔

''میں حاعفہ سکندر ہوں۔۔کوئی عام لڑکی نہیں جو تم جیسے لڑکوں کے لئے پاگل ہو جاؤں'' ماضی میں چہرے کا غرور آج افسرگی میں تبدیل ہو چکا تھا۔وہ روتے ہوئے اپنی قسمت کا شکوہ کرتی جا رہی تھی۔وہ ڈھیلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا تو قدموں کی چاپ سن کر جبیں پلٹی۔اریب کو وہاں دیکھ کر جبیں ایک جھماکے سے اٹھی۔

''دیکھو ناں اریب۔۔اب تم ہی سمجھاؤ حاعفہ کو۔۔ مسلسل رو رہی ہے۔اس طرح تو اس کی بھی طبیعت خراب ہو جائے گی۔'' وہ ایک آس کے ساتھ اریب کی طرف دیکھنے لگی تو اس نے کھوئی کھوئی نگاہ جبیں پر ڈالی۔امید کی آخری کرن اُس کی آنکھوں میں دیکھ کر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور حاعفہ کے ساتھ ہی کچھ فاصلے پر بیڈ پر بیٹھ گیا۔جبیں وہاں سے چلی گئی۔وہ حاعفہ کو یوں روتا ہوا اب نہیں دیکھ سکتی تھی۔

حاعفہ نے ایک گہری نگاہ اریب پر ڈالی تو وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔نگاہوں میں ایسی گہرائی جو شاید اس نے کبھی گمان بھی نہ کی تھی۔بام عروج پر پہنچ کر پستی کا ایسا منظر دیکھ کر حیران رہ گیا۔اس کی ویران آنکھیں اس کے کرب کو بیان کر رہی تھیں۔اس کا بجھا ہوا معصوم سا چہرہ اس وقت کسی قفس میں قید پنچھی کی مثل پھڑ پھڑا رہا تھا۔بچوں کی طرح بلکتے ہوئے ہونٹ کسی من چاہی چیز کے کھونے کا غم سنا رہے تھے۔

''حاعفہ۔۔دیکھو۔اتنا دکھی نہیں ہوتے۔۔۔اپنے ہمیشہ ہمارے ساتھ تو نہیں رہتے۔ہر انسان اس دنیا میں اکیلا ہی آیا ہے اور اکیلے ہی اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔اگر تم ایسے ہی روتی رہو گی تو انکل آنٹی کی روح کو تکلیف پہنچے گی۔'' وہ اسے سمجھانے کی کوشش کر

رہا تھا مگر وہ تو شاید اس کے الفاظ بھی سننے سے قاصر تھی۔ اشک بہاتی آنکھوں میں اس کا چہرہ بھی مبہم سا تھا۔ ایک انجان وجود، جس کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو، بھلا اس کے الفاظ بھی دل پر اثر کرتے ہیں؟ وہ بھی ہر ذات کو بے گانہ تصور کر رہی تھی۔ اپنے دکھ کو دنیا کا عظیم ترین دکھ گمان کرتے ہوئے، اپنی ذات پر ایک ناانصافی سمجھ رہی تھی۔

''مگر میرے ساتھ ہی کیوں؟'' اس نے درد سے بھری آواز میں کہا تھا۔ اس کا یہ لہجہ اریب کے دل کو بھی زخمی کر گیا۔ جس کو ہمیشہ ایک ادا سے بات کرتے سنا تھا آج اس کا لہجہ اس قدر درد سے کراہ رہا تھا جیسے کبھی اس لہجے میں نزاکت تھی ہی نہیں۔

''شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔ اس جملے کے سوا وہ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ حقیقت تو بتانے سے رہا۔

''نہیں۔۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔۔ میری وجہ سے۔۔'' اریب کی بات کی نفی کرتے ہوئے وہ اپنے آپ کو موجب الزام ٹھہرا رہی تھی۔ اریب نے نظریں اٹھا کر ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو پیشانی کی شکنیں ایک بار پھر بول اٹھیں۔ اپنے اوپر ہونے والی ستم ظریفی کو جیسے وہ سمجھ چکی تھی۔ ایسے ہی اریب بھی جان چکا تھا۔ تبھی خاموش رہا۔ بس یونہی روتا دیکھتا رہا۔

''کاش میں تمہارے آنسوؤں کو پونچھ سکتا۔۔'' ایک کسک دل میں ابھر کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

؎ پھر بام و در کی تاریکی دیدہ و دل پر خنداں ہے

اپنے وجود کو سمیٹ کر اسے اشک بہاتے گھڑیاں بیت چکی تھیں۔ رات کے اندھیرے نے ایک طرف دنیا جہاں کو اس کے غم سے بیگانہ کر دیا وہیں اس کے وجود کو سمندر کی خاموش لہروں کے عین وسط میں لا کھڑا کیا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ دائیں بائیں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ خاموش موجویں چپکے سے ساحل کی طرف بڑھتی اور دھیرے سے اس کی خوشیوں کو اپنے ساتھ لے جاتیں۔ وہ ان بے رحم موجوں کے آگے منت سماجت کرتی، اپنی خوشیوں کی زندگی مانگتی مگر کسی کو اس پر رحم نہ آتا۔ ہر طرف سے اندھیرے کے بادل اس کی ذات کی طرف بڑھنے لگتے اور اس کا پورا وجود یوں تنہائیوں کے سمندر میں غرق ہو جاتا۔

''''خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔'' باریک سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس کے آنسو یکدم ٹھہراؤ کا شکار ہو گئے۔ ماضی کے پنوں کو پلٹ کر اس نے اس بددعا کے ماخذ کو جاننا چاہا تو جلد ہی وہ نکتے پر پہنچ گئی۔

''اللہ ایسی اولاد کسی دشمن کو بھی نہ دے۔۔'' اس کا دل بھر آیا تھا۔ آنکھوں میں لحہ بھر کے لئے ٹھہرے آنسو ایک بار پھر بپھرے سمندر کی بے ضبط موجوں کی طرح بہتے چلے گئے۔ ہونٹوں کو دباتے ہوئے اپنے درد کو اپنی ذات سے باہر نکلنے سے روکنا چاہا لیکن درد کی ٹیسیں بھلا کہاں وجود کے اندر سماتی ہیں؟ اس کی سسکیوں سے پورا کمرہ کراہنے لگا۔

''ہاں چھوڑ اس لڑکی کو اس کے حال پر۔۔ خدا خود اس کا کیا اس کے سامنے لے آئے گا'' وہ پہلے سے زیادہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس اجنبی کی دی گئی بددعا رنگ لے آئی۔ خدا نے اس کا کیا، اس کے سامنے رکھ دیا۔ جس عروج پر پہنچ کر اس نے دوسروں کو حقیر جانا تھا، وہاں سے ایسے گری کہ منہ اٹھانے کے بھی قابل نہ رہی۔ پورا وجود خاک میں مل گیا۔ اس کا غرور، اس کی انا، اس کی ناک، اس کا لہجہ سب کچھ خاک ہو کر رہ گیا۔ مٹی سے بن کر ہوا کے پروں میں سوار ہونا چاہا مگر شاید وہ یہ بھول چکی تھی بھلا ہوا نے بھی کسی سے اپنا تعلق نبھایا ہے؟ جب تک خوشگور ہے، بھلی مانس لگتی ہے مگر جب تیور بدلتی ہے تو قوم عاد کی طرح مسمار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ وہ تو بس ایک حکم کی پابند ہے لیکن شاید وہ یہ بھول چکی تھی۔ تبھی ان ہواؤں کو اپنے زیر اثر خیال کیا مگر جلد ہی اس کا یہ خیال بے اثر ثابت ہو گیا۔

''اللہ ہدایت دے تمہیں۔۔۔'' دفعتہً ایک ہچکی نے اس کے عنکبوت کے الجھے ہوئے جالے کو سوچ کے ڈگر پر گامزن کیا۔ منتشر خیالات دھیرے دھیرے ایک مرکز پر مجتمع ہونا شروع ہو گئے۔ آنکھوں میں غالب بے یقینی کے پردے دھیرے دھیرے ہٹتے چلتے گئے۔ اندھیر نگر میں امید کی معمولی کرن نمودار ہوئی۔ اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس نے اس امید کی کرن کو اپنے پاس لانا چاہا مگر وہ روشنی مبہم سے غلاف میں قید دور کہیں وادیوں میں دیکھائی دے رہی تھی۔

''جب سب کی بددعائیں قبول کر لی تُو نے، تو اس دعا کو کیوں نہیں؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں شکوہ کیا تھا۔ منت سماجت، عاجزی انکساری، شکوے شکایت مختصر اس کے لہجے میں ہر عنصر شامل تھا۔ چمکتی آنکھیں امید کے اس دیئے کو تراشنے لگیں۔

''اگر میں ان بددعاؤں کی حق دار تھی تو اُس نے مجھے دعا کیوں دی؟ کیوں؟'' وہ اپنے پچھلے غم بھول کر ایک نئے غم میں مبتلا ہو چکی تھی۔ اپنی ذات اس کو ایک کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

''میں اس دعا کی حق دار نہیں ہوں۔۔۔ بالکل بھی نہیں ہوں۔۔'' اس کے آنسوؤں کی روانی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اپنے چہرے کو اس نے ایک بار پھر دونوں گھٹنوں کے درمیان ٹھونس لیا اور پھر جانے رات کے کتنے پہلو اس نے آنسو بہانے میں گزر دیئے۔

☆......☆......☆

سیاہ پینٹ کوٹ میں ملبوس ان کی شخصیت سب میں ممتاز تھی۔ تیز قدموں کے ساتھ وہ کچھ لمحے پہلے ہی اپنے روم سے نکلے تھے اور اب وہ میٹنگ روم کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ان کے سیکرٹری اور سٹاف کے دیگر ممبرز بھی میٹنگ روم کی طرف گامزن تھے۔

''تمام تیاریاں ہو گئیں؟'' جہانزیب عالمگیر نے گھمبیر لہجے میں پوچھا تھا

''جی سر۔۔ میں نے مسٹر ارچند باسو کو پانچ منٹ پہلے ریمائنڈ کروادیا ہے ایس ایم ایس کے ذریعے۔۔'' سیکرٹری کی بات سن کر انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور سرسری طور پر اپنے دائیں جانب دیکھا جہاں کئی رنگ کے پھولوں کے گلدستے سجائے گئے تھے۔

"کوئی خاص موقع ہے ہوٹل میں؟"

"جی سر۔۔آج گرینڈ میراہاٹل (Grand Mirah Hotel) کو بیس سال مکمل ہو چکے ہیں۔اسی سلسلے میں شام کو یہاں ایک پارٹی آرگنائز کی جارہی ہے انتظامیہ کی طرف سے، تمام سیاح اور بزنس پارٹنرز کو مدعو کیا جارہا ہے۔" یہ کہتے ہی اس نے اپنے کوٹ سے ایک انویٹیشن کارڈ نکال کر جہانزیب کی طرف بڑھایا۔سرسری طور پر دیکھنے کے بعد انہوں نے نفی میں ہلاتے ہوئے اسے واپس کر دیا

"ابھی وقت نہیں ہے، کسی پارٹی کو اٹینڈ کرنے کا۔۔"

"لیکن سر!انہوں نے آپ کو بالخصوص شامل ہونے کا کہا تھا۔"

"میری طرف سے شکریہ کے ساتھ معذرت کر لینا۔۔ویسے کیا وقت ہے پارٹی کا؟" وہ اب میٹنگ روم کے عین سامنے پہنچ چکے تھے۔یہاں بھی تیاریاں عروج پر تھیں۔لال رنگ کی ڈوریوں سے سجا ہوٹل آج بھی اپنی کشش آپ تھا۔یہی وجہ تھی کہ عالمگیر گروپ آف انڈسٹریز کا گرانڈ میراہاٹل کے ساتھ برسوں سے چلتا آرہا کنٹریکٹ آج بھی بدستور قائم تھا۔عالمگیر انڈسٹریز کے ذمے ہاٹل کے تمام اسٹاف کی یونیفارم تیار کر کے کم ریٹ پر دینا تھا۔جس کے بدلے ہاٹل کا ایک سنگل بیڈ روم انڈسٹری کے آنر کے لئے ہمیشہ بُک رہتا۔انتظامیہ یہ روم کبھی کسی سیاح یا سیر کو آئے مقامی لوگوں کو Allot نہیں کرتی تھی۔

"شام سات بجے۔"

"ٹھیک۔۔جاتے ہوئے میری طرف سے پھولوں کا ایک بکٹ لے جانا مت بھولنا۔۔" یہ کہتے ہی انہوں نے میٹنگ روم کے مقفل دروازے کو کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ انہیں روک دیا گیا

"سوری سر۔۔!! آج یہاں کوئی میٹنگ نہیں ہوسکتی۔" یہ اس ہاٹل کا جنرل مینجر تھا۔

"مگر کیوں؟" انہوں نے اچنبھے لہجے میں استفسار کیا

"سر! آج انتظامیہ کی طرف سے ہاٹل میں ہونے والی تمام میٹنگ منسوخ کر دی گئی ہیں۔" اس نے معذرت خواں لہجے میں کہا تھا۔جہانزیب کا چہرہ میٹنگ کے منسوخ ہونے پر یک دم سرخ ہو گیا۔

"جانتے بھی ہو تم کیا کہہ رہے ہو؟" انہوں نے ذرا سے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"جی سر۔۔!! ہاٹل کے آنر کی طرف سے یہ حکم جاری کیا گیا ہے۔" اس نے مودبانہ کہا۔اس سے پہلے جہانزیب ایک بار پھر برستے سیکرٹری نے آگے بڑھ کر معاملہ سنبھالنا چاہا۔

"اچھی طرح سمجھاؤ اسے۔۔کہ یہ میٹنگ کسی بھی قیمت پر منسوخ نہیں ہوسکتی" یہ کہتے ہی انہوں نے اپنی نظریں پھیر لیں۔سیکرٹری اثبات میں سر ہلاتا جی ایم کے پاس گیا۔

”دیکھیے۔۔آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔سر پاکستان سے فقط اس میٹنگ کے لئے آئے ہیں۔“ آوازیں مدہم ہونا شروع ہو گئیں۔تیز قدم اٹھاتے ہوئے جہانزیب ان سب سے ذرا سا دور نکل آئے۔

”کیا سمجھ رکھا ہے انتظامیہ نے؟یوں کسی بھی میٹنگ کو منسوخ کرنے والے یہ ہوتے کون ہیں؟“ وہ مسلسل بڑبڑاتے ونڈ سکرین کے بالکل سامنے آ گئے۔آنکھوں میں غصے اور سنجیدگی کے ملے جلے تاثر تھے۔کچھ لمحے یونہی فضا میں اپنی نظریں دوڑانے کے بعد انہوں نے نیچے دیکھا۔جہاں ایک بڑا سا سرسبز میدان تھا۔جس کے عین وسط میں ایک سوئمنگ پول آنکھوں کو فرحت بخش رہا تھا۔آسمان پر بھی ہلکے سرمئی رنگ کے بادل تھے۔جو آنے والی شام کو مزید حسین بنانے میں مصروف تھے۔

اپنا غصہ کم کرنے کی غرض سے انہوں نے اپنی جیب سے ایک سگار نکالا ہی تھا کہ ان کی نگاہ سوئمنگ کے اطراف میں کھڑے ایک شخص کی پرچھائی پر گئی۔ہاتھ خود بخود اپنے ماخذ سے لوٹ آئے۔ان کے چہرے کا رنگ یک دم فق ہوتا دکھائی دیا۔وہ شخص سوئمنگ پول کے گرد بے مقصد گھوم رہا تھا،غیر موسمی اوورٹ میں اپنے وجود کو ڈھانپے۔اُس نے سن گلاسز کے ذریعے اپنے چہرے کو بھی دوسروں کی نظروں سے اوجھل کرنے کی کوشش کی تھی۔دائیں سے بائیں،بائیں سے دائیں چکر کاٹتے اسے لگ بھگ بیس منٹ سے زیادہ کا وقت بیت چکا تھا۔جہانزیب کافی دیر یونہی یکسوئی کے ساتھ اس وجود کو دیکھتے رہے۔

”ہاں۔۔یہ وہی ہے۔۔“ متجل وہ بڑبڑائے تھے۔اب وہ ایک لمحے کی بھی دیری کرنے کے حق میں نہیں تھے۔تبھی لفٹ کی طرف بڑھے۔

”سر۔۔!!بات ہو چکی ہے۔انہوں نے میٹنگ کی اجازت دے دی ہے۔“ سیکرٹری نے راستہ روکنا چاہا

”منسوخ کر دو۔۔“ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مختصر کہا۔وہ غیر ضروری باتوں میں وقت ضائع کر کے اُس شخص کو اپنے ہاتھوں سے جانے دینے کے روادار نہ تھے۔

”لیکن سر۔۔“ اس نے جواز جاننا چاہا مگر تب تک وہ لفٹ میں جا چکے تھے۔سیکرٹری نے حیرت سے شانے اچکائے اور مبہوت ان کی اس کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

گراؤنڈ فلور پر آنے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔شام میں ہونے والی پارٹی کی وجہ سے وہاں غیر معمولی ہجوم جمع تھا۔ورکرز ہاٹل کو سجانے میں مصروف تھے۔جگہ جگہ سجاوٹ کا سامان بکھرا پڑا تھا مگر انہوں نے ان کی ذرا پرواہ نہ کی اور آنکھیں باہر سوئمنگ پول پر جمانے کی کوشش کی جہاں کچھ دیر پہلے انہوں نے اس پرچھائی کو دیکھا تھا۔

”مسٹر عالمگیر۔۔سوری!میرے جی ایم نے آپ کو میٹنگ روم میں جانے سے روکا۔۔“ یہ اس ہاٹل کے آنر کی آواز تھی مگر انہوں نے اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔اس نے حیرت سے شانے اچکائے اور نہیں ہڑبڑاہٹ کے ساتھ ہاٹل سے باہر جاتا دیکھا۔

''کہاں گیا وہ؟'' سویمنگ پول کے پاس پہنچ کر انہوں نے گردونواح میں نظر دوڑائی مگر وہ شخص نظر نہ آیا۔ صرف تین منٹ کے مختصر سے وقت میں وہ شخص وہاں سے ایسے غائب ہوا جیسے وہاں پر تھا ہی نہیں۔ انہوں نے سویمنگ پول سے لے کر لان تک ہر شے کو بغور دیکھ ڈالا مگر اس شخص کا وجود تو کیا پرچھائی بھی نظر نہ آئی۔

''ایسے کیسے جا سکتا ہے وہ؟'' وہ متذبذب نظر آ رہے تھے۔ پیشانی پر کئی شکنیں نمودار ہونے لگیں۔ جیسے انہیں اس شخص کے نہ ملنے کا دکھ ہو۔

''ایکسکیوزمی! آپ نے کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جس نے ایک بڑا سا اوورکوٹ پہنا ہوا تھا؟'' انہوں نے سویمنگ پول پر تعین سیکرٹری سے انڈونیشین زبان میں پوچھا تھا۔ اس نے اسی زبان میں نفی میں جواب دیا۔ چہرے پر افسردگی مزید چھا گئی۔

''اب کہاں ڈھونڈوں میں اسے؟'' وہ ڈھیلے قدموں کے ساتھ اب واپس ہاٹل کے اندر کی طرف بڑھ رہے تھے مگر ہر قدم اٹھانے کے بعد ایک بار پلٹ کر ضرور دیکھتے کہ شاید وہ نظر آ جائے۔

''دینا پاسار میں کہاں تلاش کروں اب میں اسے؟'' وہ اب مایوسی کا غلاف اوڑھے سویمنگ پول سے اوجھل ہو چکے تھے تبھی ایک درخت کی اوٹ سے وہی شخص نمودار ہوا۔ چہرے کو سن گلاسز کے پیچھے چھپانے کی کوشش کرتا یہ وجود اب ہاٹل کے اندرونی دروازے کی طرف یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ لبوں پر ذومعنی مسکراہٹ اس کے دل کے خیالات کی عکاسی کر رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر سیکرٹری کی طرف دیکھا اور اپنے اوورکوٹ کی پاکٹ سے مقامی کرنسی کے چند نوٹ نکال کر اسے تھما دیئے۔ سیکرٹری نے بھی کسی کی نگاہوں میں آنے سے پہلے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لئے اور دوبارہ کام میں مشغول ہو گیا۔

☆......☆......☆

معمول کے مطابق لیکچر جاری تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح فرنٹ سیٹ پر بیٹھے لیکچر نوٹ بھی کر رہی تھی مگر نہ جانے کیوں پہلی بار اس کا دھیان پروفیسر کے الفاظ اور اپنے رجسٹر پر ہونے کی بجائے کہیں اور ہی منتشر تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے پیچھے تھرڈ رو میں بیٹھے کامیش کے ساتھ والی جگہ پر اٹھتی جا رہی تھیں۔ کبھی بال پوائنٹ نیچے گرا کر اٹھانے کے بہانے تو کبھی بالوں کو ٹھیک کرنے کے بہانے وہ بار بار پیچھے ہی دیکھ رہی تھی۔ کامیش اس بات سے قطع نظر پروفیسر کے لیکچر کو نوٹ کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ اگرچہ یہ بات واضح تھی کہ پروفیسر کا کہا گیا ایک لفظ بھی اس کے ذہن میں داخل نہیں ہوا تھا مگر وہ دوغلے پن سے کام ضرور لے رہا تھا۔

''خیریت ہے، آج وہ آیا نہیں۔۔'' اس نے نظروں کو ایک بار پھر رجسٹر پر گاڑھنا چاہا مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ وہ اس کے دل و دماغ یہاں تک کہ سوچ پر بھی حاوی ہو چکا تھا۔ زندگی میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اپنی تعلیم سے ایسے بے گانہ تھی۔ گھر میں بھی کئی مسائل آئے مگر اس نے کبھی لیکچر کے دوران یوں اپنی سوچ کو منتشر نہ ہونے دیا۔ پھر آج کیوں؟ وہ بھی کسی اجنبی کے لئے؟ وہ خود سوچ سوچ کر ہلکان

تھی مگر جواب ندارد۔

لیکچر کے مکمل ہوتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہاں کامیش نہیں تھا۔شاید پروفیسر کے کلاس سے جانے سے بھی پہلے وہ پچھلے دروازے سے کھسک چکا تھا۔

"یہ کامیش کہاں گیا؟" اس نے معجّل اپنے چیزیں سمیٹیں اور تیز قدموں کے ساتھ کوریڈور میں آ گئی۔ وہاں کئی سٹوڈنٹس تھے۔ اتنے ہجوم میں وہ کامیش کو نہ دیکھ سکی۔

"وہ تو کہیں نظر ہی نہیں آ رہا۔اتنی جلدی کہاں جا سکتا ہے وہ؟" اس نے دل میں سوچا اور انجان سوچوں میں کھوئے ڈیپارٹمنٹ کی طرف بڑھنے لگی۔

"ہیلو ہانیہ۔۔میرے بارے میں ہی سوچ رہی تھی ناں؟" دفعتہً اسے اپنے عقب سے آواز سنائی دی۔وہ جیسے ہی پلٹی تو کامیش کو اپنے ہاتھ میں دو عدد چائے کے کپ پکڑے ہوئے پایا۔ایک آگے بڑھا کر اس نے ہانیہ کو پیشکش کی۔

"کامیش تم۔۔تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" اس کے حواس واقعی ایک لمحے کے لئے بوکھلا گئے تھے۔

"یہ تو میرا کام ہے۔چائے۔۔" ہانیہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے چائے کا کپ تھاما اور دونوں اب ڈیپارٹمنٹ کے سامنے موجود لان کی طرف بڑھنے لگے۔دھوپ کی تمازت میں بھی ایک عجب سی لجاجت تھی۔خاموش ہوائیں بھی جانے کیا راگ الاپ رہی تھیں۔وہ دونوں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔چائے کے ڈسپوزل کپ کو بڑی ہی احتیاط کے ساتھ پکڑے وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ بات کہاں سے شروع کرے؟ جبکہ کامیش تو شاید کسی اور ہی سوچوں میں گم تھا۔بے لگام نگاہوں کو دائیں بائیں دوڑاتا ہوا ماحول کی نزاکت کو اپنے وجود کا حصہ بناتے ہوئے گرم گرم چائے کا مزہ لے رہا تھا۔

"تمہارا دوست نہیں آیا آج؟" ہانیہ نے دھیرے سے کہا مگر اس نے ہنوں کے سوا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا

"کوئی خاص وجہ۔۔" ایک بار پھر اس نے ہنوں میں ہی جواب دیا اور اپنی نگاہوں کو لگام نہ دی۔

"کیا؟" اس کے اندر تو جیسے بے چینی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔وہ چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اریب کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔شاید جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ان سب کے لئے یہ کرنا ضروری تھا۔

"وہ کیا ہے ناں، ان کے گھر ایک گیسٹ آئی ہوئی ہے۔شاید اس لئے۔۔" اس بار ہانیہ نے ہنوں میں جواب دیا۔کامیش ایک بار پھر قدرت کے حسن کو اپنی آنکھوں میں بسانے لگا۔ہانیہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔تبھی کامیش کو جیسے کوئی بات اچانک یاد آئی تھی۔

"ویسے تم اریب کو میرا دوست کہہ کر کیوں مخاطب کرتی ہو؟ تم ڈائریکٹ اس کا نام بھی تو لے سکتی ہو۔" اتنی دیر میں وہ پہلی بار ہانیہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ہی حسن کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل بھر چکا تھا۔

''کہہ تو سکتی ہوں مگر اس کے ساتھ میری زیادہ بول چال تو ہے نہیں۔۔بس اس لئے۔۔''اس نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میرے ساتھ تمہاری بول چال ہے۔''اس کا لہجہ معنی خیز تھا جس کا مطلب سوائے اریب کے کوئی بھی پہچاننے سے قاصر تھا۔

''ہاں۔۔''ہانیہ نے بنا کوئی تاثر دیئے اثبات میں سر ہلایا تو کامیش کے چہرے پر ایک مسکراہٹ نے جنم لیا۔وہ اب معنی خیز نگاہوں سے ہانیہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔وہ اس نگاہوں کی حدت سے بے نیاز اب چائے کا گھونٹ بھر رہی تھی۔

''نظریں چراتے ہوئے بھی تم کتنی اچھی لگتی ہو۔۔''اس نے نچلے ہونٹ کو ہلاتے ہوئے دھیرے سے کہا۔یہ الفاظ ہانیہ کی سماعت تک تو نہ پہنچ سکے مگر اس نے کامیش کے لب کو ہلتا ضرور دیکھ لیا تھا

''کچھ کہا تم نے؟''اس نے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا تھا

''کہا بھی ہے اور بہت کچھ کہنا بھی ہے مگر کوئی سنے تو۔۔''اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں تھامی چائے کا ایک گھونٹ بھرا

''اُف۔۔ساری چائے کا مزہ کڑکڑا ہو گیا۔۔سرد ہواؤں نے لہجوں کے ساتھ ساتھ چائے کو بھی ٹھنڈا کر دیا۔''اس بار ہانیہ اس کے لفظوں کا مطلب اچھے سے سمجھ چکی تھی تبھی گردن جھٹک کر اپنے قدم پیچھے کو کھسکا لیا۔ہانیہ کی اس حرکت پر وہ بس مسکرا کر رہ گیا اور دوبارہ چائے کا گھونٹ بھرا۔

☆......☆......☆

دسمبر کی ستم ظریفی اپنے عروج پر تھی۔درختوں کے پتے سرد آہیں بھرتے ہوئے شبنم کے قطروں کو قطرہ قطرہ زمین بوس کر رہے تھے۔لوگ یخ برستہ ہواؤں کے شر سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو جانے کتنی تہوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔کاروں کا شور بھی ہواؤں میں اپنا رال الاپ رہا تھا۔آسمان سے اترتی سرمئی رنگ کی دھند چند گز کے فاصلے پر موجود اشیاء کو بھی آنکھوں سے اوجھل کئے ہوئے تھی لیکن وہ اس دھند کے سینے کو چیرتے ہوئے فٹ پاتھ پر ایک انجانی منزل کی طرف گامزن تھی۔بلیو جینز پر ایک لمبی سی سیاہ قمیض میں ملبوس وہ اپنے دونوں ہاتھ سیاہ رنگ کے اوور کوٹ میں دیئے ایک معمولی سی گرم چادر کو گلے کے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔آنکھوں میں ابھرنے والی کسک شاید اب بھی اس کے غم کو اجاگر کر رہی تھی۔بھیگی پلکیں موسم کا اثر تھیں یا پھر دل کے غبار کے زیر اثر؟ دیکھنے والا شاید کوئی بھی تخمینہ لگانے سے قاصر تھا۔وہ کبھی سست روی سے چلتی تو کبھی قدموں کی رفتار میں یک دم تیزی لے آتی۔وہ ایک سیدھ میں بنا ادھر ادھر دیکھے چلے جا رہی تھی۔اگرچہ اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے مگر سردی کے سبب لوگ بلاوجہ باہر نکلنے سے احتیاط برت رہے تھے۔

''یہ جو سامنے گلی نظر آ رہی ہے۔اس کے موڑ پر ہی تیسرا گھر میرا ہے۔پیلے رنگ کا لکڑی کا دروازہ ہے۔''چلتے چلتے وہ اسی مقام پر

آن پہنچی تھی جہاں پر وہ پہلی بار اس خاتون سے ملی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ناک کی سیدھ میں دیکھا تو تا حد نگاہ پھیلی وہ گلی نظر آئی۔

''اس کے موڑ پر ہی تیسرا گھر میرا ہے۔ پیلے رنگ کا لکڑی کا دروازہ ہے۔'' وہی آواز بار بار اس کی سماعت سے ٹکراتی گئی۔ اس کے قدم اس کی گرفت سے باہر تھے تبھی بنا اجازت طلب کئے وہ اس گلی کی طرف چل دیئے۔ وہ اب ایک ایک گھر کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ایک عام سے رہائشی علاقے میں شاید اس نے پہلی بار قدم رکھا تھا۔ اگرچہ شہر اقتدار میں واقع ہونے کی وجہ سے اسے غلاظت سے بالاتر رکھا گیا تھا مگر محل جیسے گھر میں پلنے بڑھنے والی کے لئے یہ علاقہ کسی نچ علاقے سے کم نہ تھا۔ گھروں کے کھلے دروازے اس کو منہ چڑھا رہے تھے۔ اس پر طنز کر رہے تھے۔

''کہاں تم ہمیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی اور کہاں اب تم خود چل کر ان گلی کوچوں میں آئی ہو۔'' ایک ایک لفظ زہر میں گندھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھتے ہوئے ان آوازوں سے فرار ہونا چاہا مگر بھلا کوئی ضمیر کی آواز سے بھی نجات حاصل کر سکا ہے؟ ضمیر کی آواز تو انسان کو خواب خرگوش کی نیند سے بھی بیدار کر دیا کرتی ہے۔

''آج کہاں گیا تمہارا اسٹیٹس؟ کہاں گئی تمہاری انا؟ کہاں گیا تمہارا عروج؟'' اب در و دیوار بھی بولنے لگے تھے۔ آنکھوں میں شبنم بڑھتی چلی گئی۔ راہ گزر پلٹ کر اس کی طرف ایک نظر دیکھتے اور پھر آگے نکل جاتے۔ کسی کو بھی اس سے کوئی غرض نہ تھی۔ وہ اب گلی کے موڑ پر کھڑی تھی۔

''یہ جو سامنے گلی نظر آ رہی ہے۔ اس کے موڑ پر ہی تیسرا گھر میرا ہے۔ پیلے رنگ کا لکڑی کا دروازہ ہے۔'' اس نے ذرا آگے نگاہ دوڑائی تو لکڑی کا ایک پرانا سا بوسیدہ دروازہ نظر آیا۔ اس کے ہونٹ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا چاہ رہے تھے۔ تبھی تیزی کے ساتھ اس دروازے کی طرف لپکی اور کپکپاتے ہاتھوں سے پہلی بار کسی بوسیدہ چیز کو اپنے ہاتھوں سے چھوا تھا۔ دستک دینے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو دروازے کے پینٹ کی پاپڑی سی اس کے ہاتھوں سے جا لگی تھی۔

''میرا اسٹیٹس اتنا گرا ہوا نہیں ہے کہ کسی گری ہوئی چیز کو ہاتھ لگاؤں۔ میرے ہاتھوں سے اگر ہزاروں روپوں کا پرس بھی گر جائے ناں تو میں تب بھی اسے اٹھانے کے لئے نہ جھکوں۔'' اس کے اپنے الفاظ لوٹ آئے تھے۔ بھیگی پلکیں اب آنسوؤں سے تر ہو چکی تھیں۔ دروازے کا رنگ بھی مبہم سا دکھائی دے رہا تھا۔

''کون ہے؟'' اندر سے ایک خاتون کی آواز آئی۔ وہ اس آواز کو بخوبی جانتی تھی۔

''اللہ ہدایت دے تمہیں۔۔۔'' بھلا کوئی دعا دینے والے کو بھی بھلا دیا کرتا ہے؟ وہ تو گہری نیند میں سوئے ہوئے بھی اب اس آواز کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

''جی میں۔۔ حاعفہ سکندر۔'' اس نے گلوگیر لہجے میں اپنا تعارف کروایا جو اسے شاید اسی وقت کروا دینا چاہیے تھا جب اس

خاتون نے اس کا نام دریافت کرنا چاہا تھا لیکن تب تو اس میں ایک انا تھی۔ ایک میں تھی۔

دھیرے سے کنڈی کھولنے کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نوعیت تبدیل ہوتی گئی۔ پلکیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔ شرمسار آنکھیں اب اٹھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ تھوڑا سا دروازہ کھول کر کسی نے اسے اندر آنے کو کہا تو وہ بنا سوچے سمجھے اندر چلی گئی اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

''السلام علیکم!'' اس خاتون نے ایک بار پھر اسے سلامتی کی دعا دی تھی۔ اس نے بھیگی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جو وہ سوچ کر آئی تھی۔ یہاں تو سب کچھ اس کا الٹ تھا۔ وہ سمجھی تھی شاید وہ ایک عمر رسیدہ خاتون ہوگی مگر ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔ وہ تو ایک نہایت خوبصورت اور خوب سیرت دوشیزہ تھی۔ سادہ سے لباس میں بھی اس کے چہرے پر ایک نور چمک رہا تھا۔ اس نور کی چمک میں اس کا حسن بھی زائل ہو چکا تھا۔ وہ بنا پلکیں جھپکے ایک ثانیے تک اسے دیکھتی رہی۔

''تم شاید وہی ہو نہ جو اس دن مجھے سڑک پر ملی تھی۔۔'' اس دوشیزہ نے پہچاننے کی کوشش کی تھی جبکہ وہ ہونقوں اسے دیکھتی ہی جا رہی تھی۔ اتنی سی عمر میں اتنا سخت پردہ؟

''پورے وجود کو ایک بھدے سے پردے میں ڈھانپ کر ایک بڑی بڑی سن گلاسز پہننا اور اپنے آپ کو مزید عمر رسیدہ ظاہر کرنا ۔۔ ایسا تو شاید کوئی لڑکی نہیں چاہے گی پھر یہ کیوں؟'' کئی سوال اس کے بھٹکے ہوئے ذہن میں کھٹک رہے تھے۔

''اندر آؤ۔۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کمرے میں لے گئی۔ وہ گھر میں موجود کسی شے کو نہ دیکھ سکی۔ آنکھیں تو بس یک ٹک اپنے کئے پر شرمسار اور اس وجود کی مہربانیوں پر مرکوز تھیں

''بیٹھو۔۔'' شیریں لہجہ اس کو کانٹے کی مثل چبھ رہا تھا۔ اس کے جارحانہ رویے کا اتنی خوش اسلوبی کے ساتھ جواب دیا جا رہا تھا۔ وہ اسے اپنی تذلیل سمجھنے لگی اور پہلی بار اپنے آپ کو کسی کے سامنے اتنا گرا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ اس کے قدموں میں گر گئی۔

''مجھے معاف کر دیں۔۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔۔'' وہ آہ و زاری کرتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ قدرت کی لگائی ایک ضرب نے اس کے وجود کو چور چور کر دیا۔ اس کی انا، اس کے غرور کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ اس کے اندر کی 'میں' کو خاک میں ملا دیا۔

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' کھڑی ہو جاؤں۔۔'' اس کو شانوں سے پکڑ اپنے سامنے کھڑا کیا اور اس کی آنکھوں میں ندامت کے آنسوؤں کو دیکھ کر مزید پوچھنا بھی گوارا نہ کیا۔

''میں اسی لائق ہوں۔۔۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دیں۔۔ میں نے اس دن آپ سے بہت بدتمیزی سے بات کی تھی۔ خدا نے مجھے اس کی بہت بڑی سی سزا دی ہے۔ میرے موم ڈیڈ کو مجھ سے چھین لیا۔ میرا گھر، جس پر مجھے مان تھا، اسے اپنی آگ سے جلا کر راکھ کر دیا۔

میرا غرور خاک میں ملا دیا اُس نے۔۔۔ خاک میں ملا دیا۔ جس جھوٹی شان کی بنیاد پر میں دوسروں کو حقیر سمجھتی تھی، خدا نے مجھ سے وہ سب کچھ چھین کر انہی لوگوں کے درمیان لا کھڑا کیا۔۔ میرے غرور کو خاک کر دیا، میری ذات کو برباد کر دیا۔۔۔'' وہ روتے ہوئے اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی جبکہ اس دوشیزہ کے چہرے پر نہ ہی غم خواری کے تاثر تھے اور نہ ہی ترس کے۔۔۔ بلکہ وہ ایک دوست کی نظر سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''لگتا ہے کافی پیدل کر آئی ہو۔ میں تمہارے لئے ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔'' لبوں پر ایک کسک بکھیرے اس نے انگلیوں کے پوروں سے اس کے آنسوؤں کو بنا کسی دلاسے کے پونچھا اور پھر بنا پلٹ کر دیکھے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے یوں بنا کچھ کہے باہر چلے جانے پر حاعفہ کو دوسری بار دھچکا لگا تھا مگر دل میں کھٹکنے والے غم نے اس کی توجہ بانٹ دی اور وہ دھیرے سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

پانچ منٹ بعد وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو کپ لئے کمرے میں دوبارہ داخل ہوئی۔ تب تک اس کے درد کو بھی کچھ کنارہ مل چکا تھا مگر آنکھیں ابھی تک چمک رہی تھیں۔

''چائے پیو۔۔۔ کچھ سردی کم ہو جائے گی تمہاری۔'' اس نے دوستانہ لہجے میں کہا اور خود اس کے سامنے چارپائی پر براجمان ہو گئی۔

''میرا نام خدیجہ ہے۔ میں اپنے بیٹے عاطی کے ساتھ رہتی ہوں۔ دراصل عاطی اس وقت ٹیوشن پڑھنے گیا ہوا ہے ورنہ چائے کے ساتھ بسکٹ بھی پیش کر دیتی۔'' وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے جانے کتنے عرصے سے وہ اسے جانتی ہو۔ اس کا دل ابھی تک بکھرا پڑا تھا۔

''ویسے تم ابھی تک نہیں بدلی۔۔۔ اس دن بھی تم فیشن ایبل تھی اور آج بھی۔۔۔ تم نے تو سردی سے بچنے کا بھی انتظام نہیں کیا، کیا تمہیں سردی نہیں لگتی؟'' وہ معمولی باتوں کی طرف اس کی توجہ بانٹنا چاہتی تھی۔

''یہ شال بہت گرم ہے۔'' اس نے مختصر کہا اور ایک بار پھر پلکوں سے آنسو چھلک پڑے

''یہ کیا میرے جملے کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہو تم؟ اس دن کی حاعفہ اور آج کی حاعفہ میں بس ان آنسوؤں کا ہی فرق ہے۔ ویسے سچ مانو تو مجھے اس دن کی حاعفہ زیادہ پسند آئی تھی۔ سخت مزاج اور چلبلی سی۔۔'' اس کے مزاج میں ذرا سا شرارت کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ وہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے خدیجہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا؟ چائے اچھی نہیں بنی؟'' حاعفہ کے یوں دیکھنے پر اس نے جھٹ پوچھا

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ چائے اچھی ہے۔ میں دیکھ رہی تھی کہ آپ نے مجھ سے کچھ کہا نہیں۔'' وہ اپنے اندر ابھرنے والے سوالوں کا جواب تراشنے کی کوشش کر رہی تھی

''میرے کہنے سے کیا ہوگا۔ جو سبق قدرت نے تمہیں سکھایا ہے میرے خیال سے تم نے اس سے بہت کچھ سیکھ لیا ہے اور مزید کچھ سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' اتنی دیر میں اس نے پہلی بار پچھلی زندگی کا ذکر کیا تھا۔ حاعفہ کی آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔

''دیکھو حاعفہ میں تمہیں عار دلانا نہیں چاہتی لیکن ایک بات کہوں گی کہ جو کچھ ہو چکا ہے اس پر پچھتاؤ مت لیکن بھولو بھی مت۔

اسے اپنے لئے عبرت سمجھو اور خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہیں معافی مانگنے کی مہلت عطا کی۔ اگر تم اسی حال میں اس دنیا سے چلی جاتی تو خود سوچو کیا انجام ہوتا تمہارا؟ تمہیں تو اللہ پاک کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے تمہیں ایک اور موقع دیا ہے تاکہ تم اس کی طرف رجوع کر سکو۔ جو کچھ تم نے کھویا ہے اسے دوبارہ پا سکو۔۔'' وہ کسی اپنے کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔

''ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کبھی غرور مت کرنا کیونکہ غرور انسان کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ جھک کر چلنے والا کبھی نہیں گرتا۔ گرتے ہمیشہ وہی لوگ ہیں جو آسمان پر نظریں جمائے رکھتے ہیں اور اپنے قدموں کی جگہ پر بھی نظر دوڑانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔'' خدیجہ کی بات پر وہ نیچے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ شاید خدیجہ کی باتیں اسے مزید شرمسار کر رہی تھیں۔ جس کا اندازہ وہ لگا چکی تھی۔ تبھی بات کا موضوع بدلا۔

''تم نے ظہر کی نماز پڑھ لی؟'' خدیجہ کے اس سوال پر وہ بری طرح چونکی۔

''کیا ہوا؟ ایسے کیوں چونکی؟ اگر نہیں پڑھی تو آؤ اکٹھے پڑھ لیتے ہیں۔ آج مجھے بھی دوسرے کاموں کی وجہ سے نماز پڑھنے میں دیر ہوگئی ورنہ اس وقت تو میں نماز سے فارغ بھی ہو چکی ہوتی ہوں۔'' خدیجہ نے کپ کو دوبارہ ٹرے میں رکھ کر ایک طرف کھڑکی کے ساتھ ہی بنی الماری میں رکھ دیا۔

''جی۔۔وہ۔۔میں۔۔'' وہ ہکلاتے ہوئے بول رہی تھی۔ آنکھوں میں ندامت پہلے سے کہیں زیادہ تھی۔

''کیا ہوا، کوئی مجبوری ہے کیا؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ دراصل میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی۔'' اس نے آنکھیں موندتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا گمان تھا کہ خدیجہ یہ بات سن کر اس پر غصہ کرے گی۔ شاید اسے یہاں سے جانے کو بھی کہہ دے مگر ایک بار پھر اس کا گمان غلط ثابت ہوا۔

''یہ تو بہت بری بات ہے لیکن خیر جو ہوا۔۔سو ہوا۔۔آج تم میرے ساتھ نماز پڑھو۔۔'' اس نے پیشانی پر شکن لائے بغیر کہا تھا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھنے لگی مگر حاعفہ پہلے کی طرح منجمد رہی

''کیا ہوا؟ کوئی اور بھی وجہ ہے؟'' ایک بار پھر اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تھا

''مجھے نماز پڑھنا نہیں آتی۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ آنکھوں میں ندامت کا پہاڑ بن چکا تھا۔ وہ اب خدیجہ سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

''اچھا۔۔۔!!'' یہ سن کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموشی اختیار کئے رہی

''چلو پھر آؤ وضو کر لیتے ہیں، تم مجھے دیکھ دیکھ کر نماز پڑھ لینا۔'' یہ سن کر تو جیسے اس کا پورا وجود پاش پاش ہو گیا۔ اتنی چوٹ تو اسے تب بھی نہیں لگی تھی جب اس کا سب کچھ چھن چکا تھا۔ اتنی ندامت تو اسے اپنی غلطیوں پر بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی جتنی اب ہو رہی تھی۔ وہ

اب یہاں مزید نہیں ٹھہر سکتی تھی۔ آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو ابھر آئے اور وہ تقریباً بھاگتی ہوئی خدیجہ کے سائیڈ سے باہر دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیا ہوا حاعفہ؟" اس نے پر اطمینان لہجے میں پوچھا تھا

"مجھے وضو کرنا بھی نہیں آتا۔۔" وہ گلوگیر لہجے میں گویا ہوئی اور ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ جبکہ خدیجہ کھڑی سوچوں میں گم تھی۔

"شاید وہ اب یہاں نہیں آئے گی۔۔" اس کے دل سے آواز آئی تھی جس پر اسے کافی ملال تھا۔

"میں نے اسے کافی ٹھیس پہنچائی ہے۔ شاید مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا" حاعفہ کے آنسو ابھی تک اس کی نظروں کے سامنے تھے۔

☆......☆......☆

وہ زینے اتر رہا تھا جب ٹی وی لاؤنج میں رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے نظر دوڑا کر پہلے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔

"ماما جان ٹھیک کہتی ہیں۔ ماریہ تو ہے ہی کام چور۔۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ فون کی طرف بڑھا اور بنا نمبر دیکھے کریڈل سے ریسور اٹھا کر سلام کیا۔

"بابا جان آپ۔۔؟ کیسے ہیں آپ؟ کتنے دن بعد فون کر رہے ہیں آپ؟ میں تو سمجھا تھا کہ آپ دیپا سار جا کر ہمیں بھول ہی گئے۔" اس نے ایک جملے میں کئی گلے شکوے کر ڈالے تھے۔ جس پر جہانزیب صاحب مسکرا دیے

"ذرا سا سانس بھی لے لو اریب۔۔ اتنے سوال ایک ساتھ۔۔۔"

"اچھا تو سب سے پہلے یہ بتائیں کیسا رہا آپ کا ٹور؟" وہ ساتھ ہی صوفے پر براجمان ہو گیا

"ٹور تو اچھا رہا اور خوب انجوائے بھی ہو رہا ہے۔"

"اچھا۔۔ تو پھر آپ کا واپس آنے کو دل بھی چاہ رہا ہے یا نہیں؟" اس نے پر جوش انداز میں پوچھا تھا

"ایسے کیسے نہیں دل چاہے گا واپس لوٹنے کو؟ بھئی۔۔ پاکستان میں تو ہماری جان بستی ہے۔ بھلا کوئی اپنی جان سے بھی دور رہ سکتا ہے؟ اور پھر اگر پاکستان نہ آیا تو تمہیں وہ موبائل کیسے دونگا جو میں نے کل ہی تمہارے لئے خریدا ہے۔" موبائل کا سن کر وہ خوشی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا

"سچ بابا جان؟ آپ نے سچ میں میرے لئے موبائل خریدا ہے؟" اسے اپنی سماعت پر جیسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا

"سچ۔۔ میری جان۔۔!! اب بھلا میرا بیٹا میرے کہنے پر یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے سکتا ہے تو کیا میں اپنے بیٹے کی ایک معمولی سی خواہش کو بھی پورا نہیں کر سکتا؟" انہوں نے اپنی محبت نچھاور کرتے ہوئے کہا تھا۔ اس پر اریب کے الفاظ ہی معدوم ہو گئے۔ اسے سمجھ ہی

نہیں آرہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کرے۔

"تھینک یو بابا جان۔۔تھینک یو سو مچ۔۔آپ جانتے نہیں ہیں میں کتنا خوش ہوں۔۔یہ بتائیں کون سا ماڈل خریدا ہے آپ نے؟اوراینڈرائیڈ ہے یا پھر آئی فون؟"

"یہ تم خود دیکھ لینا۔۔جب میں تمہیں دوں گا۔۔اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری ماما جان کہاں ہیں؟ مجھے ان سے کوئی بات کرنی ہے۔" ان کے لہجے میں یکدم سنجیدگی آگئی۔

"ماما میرے خیال سے کچن میں ہیں۔آپ ذرا ہولڈ کریں۔میں ابھی ماما کو بلا کرلاتا ہوں۔۔"فون کو ٹیبل پر رکھتے ہی وہ بھاگتا ہوا کچن میں گیا اور سحر فاطمہ کو وہاں سے ٹی وی لاؤنج میں لے آیا۔

"سنبھل کرذرا۔۔۔بلاوجہ کوئی چوٹ لگا کر بیٹھ جاؤ گے۔۔"اس کو جست لگا تا دیکھ کر سحر فاطمہ نے ٹوکا

"ماما کوئی جان بوجھ کر بھی چوٹ لگواتا ہے؟ ساری چوٹیں بلاوجہ ہی تو لگتی ہیں۔"فی الفور اس نے جواب دیا جس پر سحر فاطمہ مسکرا دیں۔ریسور اٹھا کر جہانزیب کو سلام کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے اریب کی طرف دیکھا جو ابھی تک وہیں کھڑا اپنے نئے موبائل فون کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟ اپنے کمرے میں جا کر پیپر کی تیاری کرلو۔۔ایگزام سر پر آن پہنچے ہیں۔"سحر فاطمہ تقریباً اسے وہاں سے بھیجنے کی نیت سے کہا تھا ورنہ وہ بخوبی جانتی تھی امتحان کی رات سے قبل تو اس نے ایک لفظ بھی نہیں پڑھنا۔اریب نے ایک عمیق نگاہ سحر فاطمہ پر ڈالی پھر شانے اچکاتے ہوئے وہاں سے جانے لگا تو اس کی نگاہ فون پر جا ٹھہری۔اس کا ذہن بری طرح ہچکولے کھانے لگا۔

"یہ کوڈ۔۔۔"وہ بڑبڑایا اور سنجیدہ چہرے کے ساتھ واپس زینے کی طرف بڑھنے لگا۔

"دیپا سار۔۔۔"وہ جہانزیب کو اٹھاتے ہوئے فون پر آئے نمبر کو دیکھنے لگا۔نمبر تو شاید صحیح سے نہ دیکھ سکا تھا مگر کوڈ وہ تو اسے ازبر یاد تھا۔

"01"وہ بڑبڑاتا گیا۔

"ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے اس کوڈ سے آئی گئی فون کال میں نے پہلے بھی ریسیو کی ہے۔"وہ سوچوں کے بھنور میں بری طرح الجھ چکا تھا۔

"جی ہاں۔۔وہ اب اپنے کمرے کی طرف ہی جا رہا ہے۔"دھیمے لہجے میں سحر فاطمہ نے کہا اور پھر سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئیں

"جی بتائیں۔۔۔کیا کہہ رہے تھے آپ؟"آوازیں دھیرے دھیرے معدوم ہوتی گئیں اور اس کی سوچ کا محور کوڈ میں الجھ کررہ گیا۔

"بابا بھی تو اکثر دیپا سار جاتے ہیں۔ان کی کالز بھی تو کئی بار میں نے ریسیو کی ہیں۔۔شاید تب ہی۔۔"اندر سے ایک آواز آئی مگر

وہ اس سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے آخری سٹیپ پر قدم رکھنے کے بعد پلٹ کر نیچے دیکھا تو سحر فاطمہ انتہائی دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھیں۔

''یہ ماما جان مجھے وہاں سے بھیجنا کیوں چاہتی تھیں؟ آخر کیا بات کرنا چاہتے تھے بابا جان ماما سے؟'' کئی سوال خالی الذہن میں کھٹک رہے مگر جواب ندارد۔

☆......☆......☆

چاند ستاروں کی جھرمٹ میں پھولوں کی مسکاہٹ میں

تم چھپ چھپ کر ہنستے ہو تم روپ کا مان بڑھاتے ہو

وہ بے چینی کے ساتھ بالکونی میں ٹہل رہا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس وہ خاصا خوبرو لگ رہا تھا۔ ایک نظر آسمان کی طرف دیکھتا جہاں بادلوں کے جھنڈ سیاہ رات میں بسیرا کرنے چلے آ رہے تھے تو کبھی ایک نظر نیچے لان میں کھلے ہوئے پھولوں کی رعنائی کو اپنی آنکھوں میں سمانے کی کوشش کرتا۔ اضطرابی کیفیت میں وہ مسلسل اپنے نچلے ہونٹ کو بھی کاٹ رہا تھا۔ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ ہی اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں سے جبیں کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

''کتنی دیر لگا دی تم نے۔ تمہیں پتا بھی ہے میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' آگے بڑھتے ہوئے حسام نے جبیں کی سرزنش کی۔

''تو آپ انتظار ہی کر رہے تھے۔ میری طرح تو نہیں۔۔۔ کتنی مشکل سے صبا بھابھی کا نمبر ڈھونڈ کر لا رہی ہوں۔۔'' اس نے معجّل جواب دیا تو حسام نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا

''اچھا۔۔ چلو اب مجھے دے دو۔'' حسام کے ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی کہ جبیں نے بھی اپنے تیور بدل لئے۔ آخر حسام کو ستانے کا موقع ہاتھ آیا تھا وہ ایسے کیسے جانے دے سکتی تھی؟

''اتنی آسانی سے نہیں۔۔۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے بالکونی کی راہ لی اور دائیں ہاتھ کی مٹھی کو مضبوطی سے بند کئے رکھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ابرو اچکاتے ہوئے حسام نے پوچھا

''مطلب یہ کہ میری محنت کا صلہ؟'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا تھا

''اب اس دنیا میں کہاں کسی کو اپنی محنت کا صلہ ملتا ہے؟ ہاں اگر تم اوپر پہنچ جاؤ تو شاید فوراً تمہیں اپنی محنت کا صلہ مل جائے۔۔'' سامنے کھڑا شخص بھی آخر اسی کا بھائی تھا۔ حاضر دماغی سے جواب دیا جس پر وہ گھور کر رہ گئی۔

''بھائی۔۔۔ آپ کو مجھے اوپر پہنچانے کی زیادہ ہی جلدی ہے؟'' اس نے ناک سکیڑ کر کہا تھا

''مجھے کہاں جلدی ہے؟ بس تمہیں ہی اپنی محنت کا صلہ جلدی چاہیے'' وہ بیڈ پر بازو پھیلا کر بیٹھ گیا۔

''تو پھر ٹھیک ہے۔۔ بیٹھیں رہیں آپ ایسے ہی۔۔ میں بھی جا رہی ہوں نمبر دیئے بغیر۔۔۔'' وہ غصے میں ناک سکیڑ کر اور بھی

کیوٹ لگ رہی تھی۔ تبھی وہ مسکرا دیا اور ابرو اچکاتے ہوئے جانے کا کہہ دیا

''بھائی۔۔'' وہ پاؤں پٹختے ہوئے سچ مچ وہاں سے جانے لگی تھی

''ارے یہ کیا؟ یہ تو سچ میں جا رہی ہے۔'' اس نے سوچا اور فوراً اس کا نام پکارا جس پر اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اب اتنا ظلم تو نہ کرو اپنے بھائی پر۔۔۔'' وہ اب منتوں بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا

''اچھا جی۔۔اب میں آپ پر ظلم کر رہی ہوں۔ تو پھر ایسا ہی سمجھیے۔۔'' وہ اب اپنی ناک اونچی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

''اچھا سوری۔۔اب تو دے دو۔۔'' اس نے داہنے ہاتھ سے کان کو پکڑ کر معصوم سا منہ بنا کر کہا تھا

''بس بس۔۔کان پکڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ورنہ بابا جان سے میری شکایت کریں گے کہ میں نے آپ کو ستایا۔'' اس نے اپنی بڑائی جتلاتے ہوئے کہا

''وہ تو میں اب بھی کروں گا۔'' حسام نے ایک بار پھر پھلجڑی چھوڑی تھی

''بھائی۔۔'' جبڑے بھینچتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا

''اچھا اب دے بھی دو ناں۔۔'' آخر کار جبیں کو حسام کی حالت پر ترس آ ہی گیا۔ اپنے ہاتھ میں موجود کاغذ کے ٹکڑے پر لکھے ہوئے نمبر کو حسام کی طرف بڑھایا۔ جسے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی رعنائی بڑھتی چلی گئی۔ ہونٹ ایک اوجھل سی خوشی کو اپنے سامنے دیکھ کر کھل اٹھے۔ کاغذ کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھ میں لے کر جانے وہ کتنے سے ان ہندسوں کو اپنی نظروں میں سماتا رہا۔ سماعت کے پردوں سے ہوا کی بے جا سرگوشیاں ایک الگ ہی راگ الاپ رہی تھیں۔ وہ دھیرے سے پیچھے ہٹا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا بالکونی کی طرف بڑھا۔ حسام کے حاضر مگر غائبانہ وجود کو دیکھ کر جبیں کے ذہن میں بھی شرارت سوجھی تھی۔

''محبت کی انتہا تو دیکھیے، نہ وجود سامنے اور نہ ہی کوئی تصویر۔۔ فقط اُن کے نمبر سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں۔'' اس نے حسام کے کانوں کے پاس جا کر سرگوشی کی تھی۔ جس پر وہ قدرے چونکا اور ہچکاتا ہوا نفی میں سر ہلا دیا

''یہ کیا اول فول کہتی جا رہی ہو؟ اور یہ محبت؟ محبت کہاں سے ہو گئی بھلا مجھے صبا سے؟ ابھی تو صحیح سے جان پہنچان بھی نہیں ہوئی ہے۔'' وہ حقیقت سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''اس کا مطلب محبت کے لئے جان پہنچان کا ہونا ضروری ہے؟'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لئے۔

"بالکل۔۔۔!!" اس نے اچھنبے لہجے میں جواب دیا

"تو پھر بڑھا لیجیے جان پہنچان۔۔ آخر یہ نمبر آپ نے اسی لئے تو حاصل کیا ہے۔" وہ اسے تنگ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہی تھی

"تو کرلوں گا فون۔۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے، ابھی کافی رات ہوگئی ہے۔کل کرلوں گا۔" حسام نے بات کو ٹالنے اور جبیں کو یہاں سے بھیجنے کی غرض سے کہا تھا

"اچھا۔۔تو پھر اس طرح کیجیے۔ یہ نمبر مجھے دے دیں۔ میں آپ کو صبح واپس کردونگی۔" جیسے ہی جبیں نے نمبر لینا چاہا تو حسام نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ سمجھی تم۔۔" وہ ذرا جھجکتے ہوئے بول رہا تھا

"تو پھر صبا بھابھی سے ابھی بات کرنے کا ارادہ ہے ناں؟" جبیں نے اس کی چوری پکڑلی تھی تبھی اس کا چہرہ محبت کی سرخی میں سرخ ہوچکا تھا۔ چہرے پر ابھری شکنیں اس کے دل کی ترجمانی کررہی تھیں۔ ہونٹوں کے متحرک ہونے کا انداز تو جیسے جذبات کا کمال ظاہر کررہا تھا۔

"تو ابھی کیجیے ناں۔۔ میرے سامنے۔۔" اس نے موبائل اٹھا کر حسام کے ہاتھوں میں پکڑایا تو وہ اس کی چال سے واقف ہوگیا۔فون پکڑتے ہی اس کو دروازے کی طرف دھکیلا

"بہت بدتمیز ہوتی جارہی ہو تم۔۔ چلو اب بچوں کی طرح اپنے کمرے میں۔۔" وہ اپنے مچلتے جذبات کو ضبط کرتے ہوئے اس کو دواز ے کی طرف لے جارہا تھا۔ اگر چہ وہ احتجاج کررہی تھی مگر حسام کے آگے بے کار ثابت ہوا۔ کمرے سے باہر نکال کر وہ اب دروازہ بند کررہا تھا۔

"یہ اچھی بات نہیں ہے بھائی۔۔کوئی اپنی بہن کو ایسے کمرے سے باہر نکالتا ہے کیا؟" اس نے منہ بسوڑ کر شکوہ کیا

"ایسا کرنا پڑتا ہے میری بہن۔۔ جب بہنیں بھائیوں کی جاسوسی شروع کردیں تو ان کے ایسا ہی کیا جاتا ہے"اس نے معجل جواب دیا اور دروازہ لاک کرنا چاہا مگر جبیں نے اپنا ہاتھ بیچ میں ٹھونس دیا۔ اب وہ آسانی سے دروازہ لاک نہیں کرسکتا تھا

"میں نے کون سی جاسوسی کی بس یہی تو کہا تھا کہ بھابھی سے جو باتیں کرنی ہے میرے سامنے کرلیں۔۔" اس نے شریر لہجے میں وہی جملہ دہرایا۔

"تمہیں تو میں۔۔" اس نے سائیڈ پر رکھے صوفے سے کشن اٹھا کر اس پر پھینکنا چاہا لیکن وہ خود کو بچانے کی غرض سے پیچھے ہٹ گئی۔ اسی موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے حسام نے فوراً دروازہ لاک کردیا۔ باہر سے جبیں کے بڑبڑانے کی آوازیں آتی رہیں مگر اس نے کان نہ دھرے اور مسکراتے ہوئے ایک بار پھر نمبر کی طرف دیکھا۔

''تو اب میں تم سے بات کر سکتا ہوں۔۔'' پُراطمینان لہجے میں اس نے نمبر کو نازکی کے ساتھ مٹھی میں بند کیا اور فون اٹھا کر کچھ دیر سوچتا رہا۔

☆......☆......☆

انداز میں اکتاہٹ اور چہرے پر بے رخی کا عنصر نمایاں تھا۔ایک ہاتھ ٹیبل پر بچھائے دوسرے ہاتھ کے سہارے ٹھوڑی کو جمائے وہ سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا پچھلے دس منٹوں سے نوٹس کو گھورتا جا رہا تھا۔رات کی تاریکی نے باہر کی ہر شئے کو اپنے آغوش میں لیا تو گھروں کے اندر مصنوعی سورج نے اپنی جگہ بنالی۔اس کا کمرہ بھی لائٹوں سے جگ مگ کر رہا تھا مگر سستی نے اس کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔وال کلاک پر اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

''ایک۔۔دو۔۔تین۔۔۔'' وہ بے دھیانی کے ساتھ پیجز کی تعداد گن رہا تھا۔ہاٹ کافی جو پانچ منٹ پہلے ماریہ نے آکر سٹڈی ٹیبل پر رکھی تھی کولڈ کافی کا روپ دھاڑ چکی تھی۔

''پورے پچاس۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اسے نہ کوئی شاک لگا اور نہ ہی کوئی گھبراہٹ کا عنصر ابھرا۔

''یہ سب تو صبح یونیورسٹی جا کر بھی ہو جائیں گے، پھر میں یہاں کیوں بیٹھا ہوں؟'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے خود سے ہی سوال کیا تھا تبھی دماغ کی لائٹیں آن ہوئیں اور خیال ذرا شام کے منظر کی عکاسی کرنے لگا

''جب تک تمام نوٹس کم سے کم دوبار نہیں پڑھ لیتے، تم نے سونے کا نام نہیں لینا۔۔'' سحر فاطمہ نے اسے پہلی بار پڑھائی کے معاملے میں تنبیہ کی تھی۔

''ماما جان۔۔۔آپ بابا جان کی غیر حاضری کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔'' خیال آتے ہی وہ منہ بسوڑتے ہوئے گویا ہوا مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔

''بابا جان۔۔آپ کو بھی میرے ایگزمز کے دنوں میں ہی جانا تھا انڈو۔۔۔اگر آپ یہاں ہوتے تو کم سے کم آپ سے سفارش تو کروا لیتا۔۔'' وہ نوٹس پر جھکتا چلا گیا۔اس کو یہ نوٹس پہاڑ تو معلوم نہیں ہو رہے تھے مگر جب نیت خراب ہو تو ذرہ بھی گراں گزرتا ہے۔ایسا ہی معاملہ کچھ اریب کے ساتھ تھا۔

''لیکن اب۔۔۔'' اس نے اوپر کا ہونٹ کاٹا اور پھر کچھ دیر ستانے کے لئے آنکھیں موندیں مگر نوٹس کے الفاظ اس کی آنکھوں کے گرد ایسے منڈلانے لگے جیسے وہ بھی اس کے دشمن بن چکے ہوں۔

''کیا ہے یہ؟'' اس نے اکتاہٹ والے لہجے میں نوٹس کو پٹخنا چاہا تبھی اس کے دماغ کے تار متحرک ہوئے۔وہ پرجوش انداز میں اٹھا اور شاہانہ مسکراہٹ کے ساتھ آستینیں فولڈ کیں۔

"یہ آئیڈیا میرے ذہن میں پہلے کیوں نہیں آیا۔ ایسے تو یہ بورنگ نوٹس بھی برے نہیں لگیں گے۔ اور دو دو ہاتھ بھی ہو جائیں گے ان سے۔" اگلے ہی لمحے وہ وارڈ روب کے ساتھ رکھے میوزک سسٹم کی طرف بڑھا اور میوزک کو مدہم آواز میں آن کیا، اپنی چیئر کو کھسکا کر میوزک سسٹم کے عین سامنے لے آیا۔ دوبارہ سٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھا اور نوٹس کو دائیں ہاتھ میں تھامے وہ اب میوزک سسٹم کے سامنے بیٹھا نوٹس کو نگاہوں سے گزار رہا تھا۔ چہرے پر پہلے کی سی اداسی دم توڑ چکی تھی۔ لب خود بخود متحرک ہوتے چلے گئے۔ بے قرار سا دل خود بخود نوٹس کی طرف مائل ہوتا چلا گیا مگر کہتے ہیں ناں فطرت نہیں بدلتی۔ وہ نوٹس پر لکھے گئے الفاظ کی بجائے میوزک سسٹم سے آنے والے لفظوں کو دہرا رہا تھا

It's a quarter after one, I'm all alone and I need you now.

Said I wouldn't call but I've lost all control and I need you now.

☆......☆......☆

کسی کے جانے سے زندگی رک نہیں جاتی مگر ایک پل کے لئے ٹھہرتی ضرور ہے۔ جیسے کوئی موج ساحل کے کنارے سے ٹکرانے کے بعد ایک لمحے کے لئے سکوت اختیار کرنے کے بعد سمجھتی ہے جیسے اب کبھی واپس سمندر میں لوٹنا نہیں ہوگا مگر یہ سوچ اس وقت پاش پاش ہو جاتی ہے جب وہ پہلے سے کہیں زیادہ بپھرے ہوئے انداز میں پیچھے کی طرف کھنچی جاتی ہے۔ ایک انجانی طاقت اسے اپنے ماخذ پر لے آتی ہے۔ شاید اس کی زندگی میں بھی یہی ہو رہا تھا۔ کئی راتیں آنسو کو بہانے میں گزار کر اب آنسو بھی اس کے خشک ہو چکے تھے۔ زندگی واپس اپنی ڈگر پر دھیرے دھیرے آرہی تھی۔ جبیں نے اگرچہ کافی سمجھایا کہ وہ اب کالج جانا شروع کر دے لیکن وہ ابھی کچھ دن مزید تنہائی میں گزارنا چاہتی تھی۔ سحر فاطمہ نے بھی اس کی اندرونی کیفیت کو سمجھتے ہوئے اسے مزید چھٹیاں کرنے کی اجازت دے دی۔

"تم اکیلی کمرے میں بیٹھی بیٹھی تھکتی نہیں ہو؟" جبیں نے کالج سے آتے ہی اس کے کمرے کی راہ لی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک سی ڈی تھی۔ جسے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ ابھی تک یونیفارم میں ملبوس تھی،

"جب زندگی سے سب کچھ نکل جائے تو تنہائی ہی دل کو بھاتی ہے۔" اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

"میری چھوڑو تم سناؤ۔ کیسی جا رہی ہے سٹڈی؟" اس نے پھیکے سے لہجے میں استفسار کیا

"سٹڈی تو اچھی جا رہی ہے، ابھی تو پیپرز ختم ہوئے تھے۔ کچھ دنوں میں رزلٹ آجائے گا لیکن تمہیں معلوم ہے تمام ٹیچرز کو انتہائی دکھ ہوا تمہارے بارے میں سن کر۔" جبیں کی اس بات پر اسے کافی دھچکا لگا تھا

"کیا؟ تم سچ کہہ رہی ہو؟" اس نے غیر یقینی لہجے میں پوچھا

"اور کیا؟ آج بھی مس شگفتہ تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ تم ابھی تک کالج آنا شروع نہیں ہوئی۔" جبیں کے اس جملے

پر اسے ایک بار پھر ماضی میں دھکیل دیا۔

"خدا غارت کرے اس لڑکی کو۔۔۔" مِس شگفتہ کی بد دعا ایک بار پھر اس کے کانوں کے پردوں کو پھاڑتی ہوئی دل کو چیر رہی تھی۔ آنکھیں ایک بار پھر بھیگنا شروع ہو گئیں۔

"یقین نہیں آ رہا کہ مس شگفتہ میرے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔۔" اس کا لہجہ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ وقت کی ایک چوٹ نے اس کے خمار کو اتار کر رکھ دیا۔ اس کی گردن کے اکڑاہٹ کو پل بھر میں بے جان روئی کے گالوں کی طرح ہوا کے جارحانہ جھونکوں کی نذر کر دیا تھا۔ وہ اب اس بات پر مسکرائے، حیران ہو یا پھر زندگی کی ایک تلخ یاد سمجھ کر بھلا دے؟

"جبیں جی۔۔ بیگم صاحبہ نے کھانا لگا دیا ہے آپ کے لئے۔۔" ماریہ نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔۔ میں آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور حاعفہ کو بھی ساتھ کھانا کھانے کی پیشکش کی مگر اس نے یہ کہہ کر مسترد کر دی کہ اسے ابھی بھوک نہیں ہے۔ کچھ دیر یونہی اس کا بجھا ہوا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ واپس جانے لگی تو حاعفہ نے آواز دی

"یہ سی ڈی تو لیتی جاؤ۔۔۔"

"یہ۔۔۔ یہ ذکیہ نے دی تھی لیکن بھلا میرے کس کام کی۔۔ ہاں اگر تم چاہو تو تم دیکھ سکتی ہو۔۔" یہ کہتے ہی وہ وہاں سے چلی گئی۔

حاعفہ نے بھی اپنی نظریں دروازے سے ہٹا کر قدموں پر براجمان کیں تو اپنے آپ کو کمتر جانا۔ جانے کیوں وہ اپنے آپ سے بدظن ہو چکی تھی۔ اگر جبیں اسے اپنے گھر لے کر نہ آتی تو شاید وہ اپنی جان لینے کی بھی کوشش کر چکی ہوتی مگر قسمت نے جانے کیوں اسے زندہ رکھا تھا؟ آنکھوں میں ایک قطرہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ ماضی کی یادیں اس کے دل و دماغ پر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ شدت سے ضرب لگاتیں۔

"انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کے لئے اس نے کوشش کی، جس طرح کسان جیسا بیج زمین میں دباتا ہے پھر ویسی ہی فصل کاشت کرتا ہے۔ اگر وہ کسی اعلیٰ قسم کا نایاب بیج زمین میں دفنائے تو اس بیج سے پھوٹنے والی ننھی جان بھی لاکھوں میں ایک ہوگی۔ اس کی نرم کونپلیں، ان سے نکلنے والی بھینی بھینی خوشبو اور پھر اس میں سمانے والی غذائیت بھی حد درجہ کمال ہونگی مگر اگر کسان شروع میں ہی کوتاہی برتے۔ نہ ہی وہ اچھی قسم کا بیج بوئے اور نہ ہی وقت پر پانی دے۔ موسموں کی شدت سے نہ ہی اس ننھی جان کو بچائے تو پھر بھلا ایسے کیسے ممکن ہے اس کے لئے بھی وہی کچھ ہو جو اپنا خون پسینہ ایک کرنے والے کسان کے لئے ہے؟" ماضی کی یادداشت سے الفاظ نکل کر اس کے سامنے آ رہے تھے۔ اس کو دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ آج وہ اپنے آپ کو اس کاہل کسان کی مثل محسوس کر رہی تھی جس نے وقت کے تقاضوں کو بھلا کر حال کے آرام کو ترجیح دی تھی۔ مستقبل کے ہولناک انجام سے بے خبر اپنی ذات میں کھوئی رہی۔ موسموں کے نزاکت کا ذرا خیال نہ رکھا بس اپنی دھن میں مگن رہی اور آج وہی بیج ایک وحشت ناک فصل کی مانند اس کے سامنے تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تن تنہا وہ فصل کاشت کرنی تھی۔ نہ ہی اس میں کوئی ساجھی تھا اور نہ ہی کوئی ذمہ دار۔ سب اس کا کیا دھرا تھا۔

گہری سانس لیتے ہوئے اس نے چمکتے آنسوؤں کو انگلیوں کے پوروں سے پونچھا تو ماضی کی ایک زبردست ضرب نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ایک وقت تھا جب اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کو دیکھ کر اس کے موم ڈیڈ تڑپ اٹھتے تھے۔کئی ہاتھ ان آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے بڑھتے تھے مگر اب ایسا کچھ نہ تھا۔آنسوؤں کو پونچھنے والے ہاتھ منوں مٹی تلے دفن ہو چکے تھے۔اس کا دل چیخ چیخ کر رونے کو چاہا مگر سوائے آنسو بہانے کے وہ کچھ نہ کر سکی۔

☆......☆......☆

آج پہلا پیپر تھا۔نگران پیپر منقسم کرنے کے بعد اپنی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔تمام طلبہ پیپر پڑھنے میں مصروف تھے سوائے اریب کے۔اس نے جوابی کاپی پر سب سے پہلے بے نیازی کے ساتھ اپنا نام اور ضروری کاروائی لکھنے میں اچھا خاصا وقت صرف کیا تھا۔تمام طلبہ تقریباً پہلا سوال شروع کر چکے تھے جبکہ وہ آرام سے ستا رہا تھا۔ایک نظر اس نے تمام طلبہ پر دوڑائی تو سب سے پہلے ہانیہ کو بیٹھا پایا۔آج بھی اس کو دیکھتے ہی اس کے دل میں حقارت آمیز جذبات نے جنم لیا

"سیلف فش۔۔" وہ بڑبڑایا اور اپنی گردن جھٹک کر اس سے نظریں چرا لیں۔

ہانیہ کے پیچھے کامیش براجمان تھا جو اس تاک میں تھا کہ نگران ہٹے اور وہ ہانیہ کا پیپر دیکھے۔اگر چہ اپنے ذہن کو بھی بروئے کار لا رہا تھا مگر عادت کہاں بدلتی ہے؟اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔جوں جوں وہ دوسرے طلبہ کو دیکھتا،اس کے چہرے پر تاثر بدلتے رہتے۔تقریباً آدھا وقت اس نے ادھر ادھر دیکھنے میں ضائع کر ڈالا تھا۔نگران جو کافی دیر سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا

"پیپر آتا نہیں ہے یا پھر کرنے کا موڈ نہیں ہے لیکن بات جو بھی ہو چیٹنگ کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا" اس نے پاس آکر ذرا تنبیہ کی۔جس پر وہ مسکرا دیا اور اپنی بال پوائنٹ اٹھا کر پہلے سوال کا نمبر درج کیا۔

نگران ٹکٹکی باندھے اسی کی طرف دیکھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے فقط پانچ منٹ میں اریب کا پیپر اس کے ہاتھوں میں تھا۔سب سے آخر میں شروع کرنے والا آج بھی سب پر بازی لے گیا۔نگران کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔اریب نے بنا ہاتھ لگائے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔

☆......☆......☆

واش روم سے آنے کے بعد اس کی نگاہ اسی سی ڈی کی طرف گئی جو جیبیں لے کر آئی تھی۔پہلے تو کچھ دیر وہ اسے گھورتی رہی پھر جانے کیا دل میں آئی اس کو اٹھا کر بیڈ پر لے آئی اور ساتھ ہی رکھے لیپ ٹاپ کے سی ڈی روم میں پلے کی۔اس کا دل اگر چہ اچاٹ ہو چکا تھا۔تمام تمنائیں دم توڑ چکی تھیں مگر پھر بھی وہ سانسیں لے رہی تھی۔

وی ایل سی میڈیا پلئیر پلے کرنے پر آواز سسٹم سے پورے کمرے میں گونجنے لگی۔یہ ملک کے مشہور و معروف مذہبی سکالر کی تقریر

تھی۔ پہلے تو اس کا دل چاہا کہ فوراً بند کر ڈالے۔ آج سے پہلے بھلا کہاں اس نے دین کی طرف نگاہ دوڑائی تھی؟ لیکن وہ ایسا نہ کر سکی۔ وقت کاٹنے کی خاطر اس نے سکالر کے الفاظ پر ذرا دھیان دیا

"اللہ تعالیٰ روزانہ نماز کی ہر رکعت میں مرد عورت سے، عالم جاہل سے، نیک غافل، پڑھا ہوا، ان پڑھ۔۔۔غرض ہر ہر بندے بندی سے ایک اعتراف کراتا ہے کہ تم یہ مانو کہ مجھے زندگی گزارنے کا طریقہ نہیں آتا۔

تم یہ مانو کہ میں جاہل ہوں۔۔۔

تم یہ مانو کہ مجھے کچھ نہیں آتا۔۔۔

جب تک یہ تسلیم نہ ہو کہ مجھے کچھ نہیں آتا، کون سیکھنے کا ارادہ کرتا ہے؟ جب پہلے ہی یہ ذہن میں سمایا ہوا ہو کہ مجھے تو سب پتا ہے۔"

تقریر کے آغاز میں ہی اس کے ذہن پر ایک زبردست چوٹ لگی تھی۔ اپنے ہی الفاظ اس کے خالی الذہن سے آ ٹکرائے۔

"مجھے نماز پڑھنا نہیں آتی۔"

"مجھے وضو کرنا بھی نہیں آتا۔۔۔" اسے اپنے سوالوں کا جواب ملتا دکھائی دیا۔ دل پر چھایا اس دن سے بوجھ ایک لمحے میں کم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ پہلے وہ بے پرواہی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ان الفاظ کو سنتے ہی اس نے اپنی نگاہیں لیپ ٹاپ کی سکرین پر ٹکائیں اور سماعت کو نکلنے والے الفاظ پر مرکوز کیا۔

"حالانکہ کسی زمانے میں کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے سب پتا ہے۔ وہ صرف اللہ ہے کہ جسے سب پتا ہے

کہ یہ دعوی وہ کر سکتا ہے جو پیدا نہ ہوا ہو۔

یہ دعوی وہ کر سکتا ہے جس سے پہلے کوئی نہ ہو

یہ دعوی وہ کر سکتا ہے جس کے بعد کوئی نہ ہو

یہ دعوی وہ کر سکتا ہے جس کے اوپر کوئی نہ ہو

یہ دعوی وہ کر سکتا ہے جس سے چھپا ہوا کوئی نہ ہو

تو وہ صرف ایک اکیلا اللہ ہے۔" اس کی آنکھیں یک ٹک سکرین کو دیکھتی رہ گئیں۔ سماعت الفاظ کو سننے کی بجائے اپنی آغوش میں سمانے لگے۔ خدیجہ کے چہرے پر چھائی طمانت اس کے سامنے لہرانے لگی۔ دین سے اتنا دور ہونے کے باوجود وہ اس پر غصہ کیوں نہ ہوئی؟ ایک ایک گرہ اس کے سامنے کھلتی چلی گئی۔ آنکھوں میں ندامت کے آنسو لئے وہ اپنے آپ کو کوسنے لگی۔ آگے بھی تقریر جاری رہی مگر وہ تو جیسے ان دو منٹوں کی باتوں کے اثر سے ہی نہ نکل سکی تھی۔

"جب تک یہ تسلیم نہ ہو کہ مجھے کچھ نہیں آتا، کون سیکھنے کا ارادہ کرتا ہے؟" اس کے ذہن کے گرد لپٹی لاعلمی کی چادر اب دھیرے

دھیرے ہٹتی چلی گئی۔صبح کی روشنی دل و دماغ کی دنیا میں داخل ہونے کی راہ ڈھونڈ رہی تھی حالانکہ راہ کے ساتھ ساتھ اسے تو منزل بھی مل چکی تھی بس اس طرف قدم بڑھانا باقی تھا۔

☆......☆......☆

کتنی خوابیدہ تمناؤں کو

اس کی آواز نے بیدار کیا

واپسی کی تمام تیاریاں ہو چکی تھیں۔مسٹر جہانزیب عالمگیر نے بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس اپنے کمرے کا طائرانہ جائزہ لیا۔ہر شے مشرقی طرز کی تھی اور ترتیب کے ساتھ اپنے درست جگہ پر براجمان تھی۔بیڈ پر رکھا گیا ایک بڑا سا سوٹ کیس ادھ کھلا تھا جس میں کچھ سوٹ اور گفٹس وغیرہ رکھے ہوئے تھے جو فارغ وقت میں انہوں نے گھر والوں کے لئے خریدے تھے۔

''ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے کچھ بھول رہا ہوں میں؟'' وہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔تبھی وہ آگے بڑھے اور گفٹس وغیرہ کو ٹٹولا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔کندھے اچکاتے ہوئے وہ وارڈ روب کی طرف بڑھے اور دھیرے سے دروازہ وا کیا تو ایک جھماکے سے بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔ان کے لبوں پر تشکرانہ مسکراہٹ ابھری۔ہاتھ بڑھا کر سیکنڈ روم میں دائیں جناب رکھا گیا بکس اٹھایا۔

''تھینک گاڈ۔۔!! یاد آ گیا، ورنہ اریب کا ایک بار پھر موڈ آف ہو جاتا۔۔'' انہوں مسکراتے ہوئے وہ بکس اٹھایا جو کہ ایک موبائل فون کا بکس تھا۔ایک سمارٹ فون کی تصویر بکس کے باہر سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔

''نٹ کھٹ اریب۔۔ ہمیشہ مسکراتا رہے'' خیالوں کی دنیا میں اس کی تصویر کو ذہن میں لاتے ہوئے بلائیں لیں اور وارڈ روب کا دروازہ بند کئے بغیر واپس بیڈ کی طرف بڑھے اور موبائل فون کا بکس سوٹ کیس میں رکھا۔ابھی وہ صحیح سے مڑے بھی نہ تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔انہوں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔

''لگتا ہے ڈنر کا کہنے آیا ہے کوئی۔۔'' خود کلامی کی اور آگے بڑھ کر دروازہ وا کیا۔ان کا اندازہ آدھا ٹھیک تھا، وہاں ہاٹل میں کام کرنے والا ملازم ہی تھا مگر اس کے وہاں آنے کا مقصد تو شاید کچھ اور ہی تھا۔

''سر یہ آپ کے لئے۔۔'' ایک خاکی رنگ کا لفافہ آگے بڑھایا جو دیکھنے میں شفاف تھا۔سیاہی کا ایک نقطہ بھی آویزاں نہ تھا۔

''یہ اینویلپ ۔۔۔کس نے بھیجا؟'' ہاتھ بڑھاتے ہوئے استفسار کیا

''پتا نہیں۔۔مگر مجھے یہی حکم ملا ہے کہ آپ کو یہ اینویلپ پہنچا دیا جائے'' یہ کہتے ہی وہ آدمی واپس مڑا۔دروازہ بند کئے بغیر ہی جہانزیب صاحب پلٹے اور اینولپ کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے بھیجنے والے کا نام جاننا چاہا۔

''شاید اندر نام لکھا ہو اس نے۔۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اینویلپ کو کنارے سے پھاڑا تو اندر سے ایک سفید رنگ کا کاغذ نمودار ہوا۔

نظروں کے سامنے موجود سائیڈ پر کچھ نہیں لکھا گیا تھا مگر جیسے ہی انہوں نے کاغذ کو پلٹا تو ان کا ذہن بری طرح چکرایا۔ بظاہر کمرہ روشن تھا مگر ان کا ذہن تاریکی میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ کاغذ کا چھوٹا سا ٹکڑا ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے ہوا میں معلق ہو گیا۔ ایک انجانی سی سرد لہر نے ان کے پورے جسم کو ماؤف کرنا چاہا تھا مگر وہ بچے رہے۔ دفعتہً پلٹے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس ملازم کو راہ داری میں روک لیا۔

''جی سر!'' وہ ادب کے ساتھ نظریں جھکائے حکم کا انتظار کر رہا تھا

''کس نے اور کب یہ اینویلپ دیا تمہیں؟'' اکھڑی اکھڑی سانسیں، سخت لہجے میں گویا تھیں

''کس نے دیا، اس کی تو خبر نہیں مگر ابھی چند لمحوں پہلے ہی کاؤنٹر پر میں نے ایک شخص کے ہاتھوں میں ایسا ہی اینویلپ دیکھا تھا۔'' اس نے مختصر کہا

''اب وہ وہاں ہے؟'' سانسیں بحال ہونا شروع ہو گئی تھیں مگر پسینے کی بوندیں پیشانی سے بہتی چلی گئیں۔ ملازم نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو ایک لمحے کے لئے سہم گیا۔ خوف کا پسینہ ان کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

''نہیں سر۔۔۔'' اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کو پوری گرفت کے ساتھ کھولا تھا

''وہ۔۔۔ یہاں۔۔۔'' وہ بڑبڑائے مگر پھر انہیں اس ملازم کا خیال آیا

''سر میں جا سکتا ہوں؟'' اس نے خود ہی پوچھا تو جہانزیب نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اب وہ چار قدم آگے بڑھا اور دائیں جانب کی راہ داری میں چل دیا

کمرے میں لوٹتے ہی انہوں نے سب سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ مقفل کیا اور ایک گہری سانس لی۔ پیشانی پر پریشانی کے تاثر عروج پر تھے۔ ستانے کے لئے آنکھیں لحہ بھر کے لئے بند کیں تو کاغذ پر لکھی گئی سطر ڈراؤنے خواب کی طرح ان کے سامنے آ گئی۔

''نہیں۔۔۔'' جھٹ انہوں نے آنکھیں کھولی اور آگے بڑھ کر بیڈ سے دو قدم فاصلے پر زمین بوس ہوا وہ کاغذ کا ٹکڑا اٹھایا۔ سطر ابھی تک من و عن تحریر تھی۔

''یہ سطر مٹ کیوں نہ گئی؟'' دل نے چاہا تھا مگر حقیقت بھلا کہاں بدل سکتی تھی؟ وہ دھیمے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے بالکونی کی طرف گئے تو آسمان پر ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ جہاں تک ہاٹل کے لان کی بات تھی وہاں ابھی تک سورج چمک رہا تھا۔ ایک مصنوعی سورج۔۔۔ جو رات کو بھی دن میں تبدیل کئے ہوئے تھا۔ ان کی نگاہیں لان میں موجود ٹہلتے ہوئے لوگوں پر جا ٹھہری۔ وہ لاشعوری طور پر لوگوں کے عکس کو ٹٹول رہے تھے۔ جب ان کی نگاہ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگائے ہیولے سے جا ٹکرائی۔ ان کی بحال ہوتی سانسیں ایک بار پھر دم توڑتی محسوس ہوئیں۔ وہ ہیولہ شاید اسی انتظار میں تھا کہ کب وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ان کی سوجھ بوجھ کی صلاحیت مفلوج ہو چکی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا وہ نیچے جا کر اسے پکڑتے، سکیورٹی کے حوالے کرتے، پوچھ گچھ کرتے کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟

مگر وہ ایسا کچھ نہ کر سکے۔ شاید یہ سب بے کار تھا۔ ان کی پہلی نگاہ پڑتے ہی وہ وجود سیاہی میں ہی کہیں غائب ہو گیا اور جہانزیب اپنی مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے۔

''اریب کا خیال رکھیے گا۔۔۔'' وہ سطران کے لئے جیسے کسی آنے والے طوفان کا پیشِ خیمہ تھی۔

☆......☆......☆

ہم سے پوچھو چمن پہ کیا گزری

ہم گزر کر خزاں سے آئے ہیں

سرد ہواؤں نے اگرچہ ماحول میں ایک لرزا طاری کیا ہوا تھا۔ آسمان پر اڑتے پرندے بھی کپکپا رہے تھے۔ معصوم بچے جو ابھی انڈوں سے باہر نکلے تھے، مائیں انہیں اپنے پروں کی آغوش میں چھپا کر یخ بستہ ہواؤں سے بچانے کی اپنی تئیں سعی کر رہی تھیں۔ راہ گیر بھی لمبے لمبے اوور کوٹ پہنے، گردن کے گرد مفلر لپیٹے، تیز قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے موسم سے لڑ رہے تھے مگر ان سب سے الگ تھلگ، فقط ایک قمیض میں ملبوس وہ نگاہیں نیچے کئے چلا جا رہا تھا۔ مناسب قد کاٹھ اور چست جسم کا مالک یہ نوجوان نگاہوں کو فٹ پاتھ پر جمائے اپنی منزل پر گامزن تھا۔ چہرے سے زمانے کی تلخیاں اگرچہ عیاں تھیں مگر تا حد نگاہ فقط خاموشی کا عالم تھا۔ گندمی رنگت اگرچہ چاند کے مشابہہ سفید نہ تھی لیکن خدوخال دیکھنے والوں کی نگاہ میں نقوش ضرور کر رہے تھے۔ وہ درختوں کے نیچے فٹ پاتھ کے کنارے کنارے چلتا جا رہا تھا۔ پاس سے گزرتے راہگیر اسے ایک قمیض میں دیکھتے تو حیران ہوتے مگر کچھ نہ کہتے۔ ایک دو نے تو کندھے بھی اچکائے مگر اسے کسی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ سنجیدہ چہرے کو جھکائے وہ چلتا جا رہا تھا۔

فٹ پاتھ کے ختم ہوتے ہی دائیں جانب ایک گلی تھی۔ وہ اسی جانب مڑا مگر سر اٹھا کر نہ دیکھا شاید اسی لئے اس کی ٹکر ایک جسم سے ہوئی۔ پورے جسم میں جنبش پیدا ہوئی۔ چہرے پر غصہ کے آثار بھی نمایاں ہوئے لیکن غلطی خود اسی کی تھی۔ اسے دیکھ کر چلنا چاہئے تھا۔ اسی لئے معذرت خواں لہجے میں کہا۔

''مجھے معاف کیجیے۔۔ میں نے دیکھا نہیں۔۔'' یہ کہتے ہی اس نے سامنے دیکھا تو لبوں پر ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ یک ٹک ٹکرائے جانے والے وجود کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک ستائیس سالہ عورت تھی۔ جس کے چہرے سے بھی زمانے کے بدلتے رنگ چھلک رہے تھے۔ یک ٹک اسی کی طرف دیکھنے لگی۔

''ابان تم۔۔۔!!'' بمشکل اس نے یہ الفاظ کہے تھے۔ آنکھوں میں عجب سی چاشنی تھی۔ جسے فرط جذبات کا نام دے یا پھر کسی اور کا؟ وہ کچھ بھی سمجھنے سے فی الوقت قاصر تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ہاتھوں میں طاری لرزہ روکنا چاہا تھا جو کسی بھی زاویے سے موسم کا اثر نہ تھا۔ یہ تو وہ جذبات تھے جو دل میں کسی بھڑکے ہوئے لاوے کی طرح ہوتے ہیں۔ جن کی کوئی سمت نہیں ہوتی، کوئی زمین نہیں ہوتی،

کوئی آسمان نہیں ہوتا۔ ایسے جذبات جو فضاؤں میں اپنا راستہ خود بخود بناتے ہیں۔ جنہیں راہ میں حائل رکاوٹوں سے کوئی لینا دینا نہیں ،جنہیں سردی گرمی، بہار و خزاں سے کوئی سروکار نہیں۔ جن کے لئے برستی بارش یا پھر دہکتا سورج یکساں ہے۔ جو ماضی کے پنوں میں چھپے ہونے کے باوجود حال میں پنا اثر غالب رکھتے ہیں۔ وہی جذبات اب اس کی آنکھوں سے چھلک رہے تھے۔ سب کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دینے لگا۔ دھند کا اثر اگرچہ غالب تھا مگر اس نمی کا سبب تو شاید کوئی اور ہی تھا۔ جنہیں وہ بخوبی سمجھتا تھا اور شاید وہ بھی یا پھر شاید نہیں؟

''کیسے ہو؟'' ایک بار پھر اسی نے سوال کیا تھا۔ اس نے لب ہلانے چاہے تھے مگر جذبات غالب آ گئے۔

''میں ٹھیک۔۔ تم کیسی ہو؟'' اس نے بمشکل چند الفاظ ادا کئے تھے۔

''میں تو ٹھیک ہوں۔'' اس کی حالت ڈھکی چھپی نہ تھا تبھی وہ خاموشی سے اس کے چہرے کے بدلتے انداز کو پڑھنے لگی تھی یا پھر شاید آج بھی وہ غلطی پر تھا۔

آسمان پر موسم نے کروٹ بدلی۔ بادل جو پہلے بھی ڈیرہ جمائے ہوئے تھے، مزید گہرے ہوتے چلے گئے۔ ہوا پر دھند کا راج بڑھا تو پانی کی بوندیں آسمان سے ٹپکنے لگیں۔

''مجھے گھر جلدی پہنچنا ہے۔۔'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا، اور نظروں کو چراتے ہوئے بکھرے دل کو بند باندھنا چاہا۔

''لیکن ابان۔۔'' اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر کچھ کہتی وہ وہاں سے بہت دور جا چکا تھا۔ حقیقت میں بھی اور رشتے میں بھی۔ چہرے پر ایک عمیق سنجیدگی نے جنم لیا۔ بڑھا ہوا ہاتھ واپس پلٹ آیا۔ چہرہ پھیر کر وہ دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل دی۔ جو عرصہ پہلے ہی جدا ہو چکی تھیں۔

کئی فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ آنکھوں سے بہت دور۔۔ چمکتی آنکھیں آسمان سے برستی بوندوں کے سنگ بہنے لگیں مگر کوئی چاہ کر بھی ان پانی کے قطروں کی پہنچان حاصل نہ کر سکا۔

''کاش۔۔۔'' دل میں ایک کسک ابھر کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

گھر میں آتے ہی اس نے ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بھنچا تھا جس پر زلیخا بی بی نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا جو اس وقت چولہے کے پاس بیٹھی گاجریں کاٹ رہی تھیں۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا سیدھا اپنے کمرے کی طرف ہو لیا۔

''ارے ابان۔۔ آج اتنی جلدی آ گئے؟ خیریت تو ہے ناں؟'' چھری والے ہاتھ سے ماتھے پر آئے بالوں کو کان کے پیچھے کیا مگر ابان نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں شاید اس نے ان کی باتوں کو سنا ہی نہیں تھا۔ تبھی اپنے کمرے سے پاکیزہ باہر آئی۔ جو ابان کے پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ رویے کو دیکھ کر چونک گئی۔

''ابان۔۔۔''اس سے پہلے کہ زلیخا بی بی کچھ اور پوچھتیں وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر چکا تھا۔جس پر ان کے چہرے پر حیرت اور فکر کے ملے جلے تاثر ابھرے۔پاکیزہ بھی ان کے پاس آبیٹھی اور دھنیا چننے لگی۔

''عجیب لڑکا ہے۔۔'' گردن جھٹکتے ہوئے وہ بڑبڑائی تھیں

''امی۔۔آج بھائی کے چہرے پر پہلے سے زیادہ سنجیدگی نہیں تھی؟''پاکیزہ نے فکر کا اظہار کیا تھا

''تو یہ کوئی نئی بات ہے۔۔اس کا چہرہ ہی ایسا ہے۔۔''پاکیزہ کی بات کو ہلکا جانتے ہوئے انہوں نے ایک بار پھر گردن جھٹکی اور شاپر کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے آخری گاجر اٹھائی۔

''وہ تو صحیح کہا آپ نے۔۔جب سے شکیلہ بھابھی نے۔۔۔''ماضی کی تلخ حقیقت زبان پر آ ہی رہی تھی کہ زلیخا بی بی نے جھڑک دیا۔

''خبردار! جو ایک بار پھر اس منحوس کا نام لیا ہو۔۔کم بخت خود تو چلی گئی اور میرے بیٹے کی زندگی اجیرن کر گئی۔۔''ہمیشہ کی طرح اس کو ایک بار پھر کوسنا شروع کر دیا۔

''اور تجھے کتنی بار کہا ہے کہ میرے سامنے اس کم بخت کا نام نہ لیا کر۔۔تجھے سمجھ نہیں آتی۔۔'' گاجر اور چھری کو زمین پر پٹختے ہوئے اسے بری طرح گھورا تھا۔

''امی۔۔میں۔۔تو بس۔۔''الفاظ معدوم ہوتے دیکھائی دیئے۔

''میں تو بس کیا۔۔اُس منحوس کو چھوڑ اور اپنی فکر کر۔۔'' تلخ لہجے میں کہا

''اپنی فکر کیا کرنی۔۔۔؟ جو قسمت میں لکھا ہے ہونا تو وہی ہے۔۔''پھیکا سا لہجہ گویا ہوا تھا

''بس تم دونوں بہن بھائی کا یہی رونا ہے۔۔ایک کو بیوی کا غم لے ڈوبا تو دوسری کو دنیا سے کوئی لینا دینا ہی نہیں اور جو تیسری ہے۔۔وہ تو سبحان اللہ۔۔!! کیا کہنے اُس کے؟ اسے تو جیسے اپنے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آتا۔۔ہنوں''ایک ہی جملے میں اس نے تینوں کو اچھی طرح رگڑ دیا تھا۔

''اب آرام سے بیٹھ کر آلو کاٹ۔۔۔گاجریں میں نے کاٹ دی ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھی اور کسی کام سے اندر کمرے میں چلی گئی۔

''ہمارے خواب پورے نہ ہو سکے کم سے کم ہانیہ کے ہی خواب پورے ہو جائیں۔۔۔''کھویا کھویا انداز جانے کس پہر کو تک رہا تھا؟

☆......☆......☆

جہانزیب صاحب سرِ شام ہی لوٹ آئے تھے۔سب کے چہروں پر خوشی نے بسیرا کر لیا تھا۔سب اس وقت لاؤنج میں جمع خوش گپیوں میں مصروف تھے۔اریب بھی اس محفل میں پیش پیش تھا حالانکہ سحر فاطمہ نے کئی بار اسے ٹوکا کہ جا کر اپنے آخری پیپر کی تیاری کرے

مگر وہ کہاں سننے والا تھا اب؟ جہانزیب تو آگئے تھے، اس کی سپورٹ کرنے۔

''بیٹھنے تو دو میرے بیٹے کو۔۔۔ پڑھ لے گا۔ ویسے بھی ابھی پوری رات باقی ہے؟'' اس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے حوصلہ بڑھایا تو سحر فاطمہ گردن جھٹک کر رہ گئیں۔ ماریہ اس وقت سب کے لئے چائے بنانے میں مصروف تھی۔

''سب خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔۔ اور مجھے چائے بنانے یہاں بھیج دیا۔۔۔'' وہ جل بھن کر دھیمے لہجے میں خود سے کہتی جا رہی تھی۔

''ویسے تو بیگم صاحبہ کہتی ہیں کہ ماریہ تم صرف صاف ستھرائی کیا کرو۔۔ کچن کا انتظام میں خود سنبھال لوں گی۔۔ ہنوں'' نقل اتارتے ہوئے اس نے بری طرح منہ بنایا تھا

''ویسے کیسا رہا آپ کا ٹور بابا جان؟'' جبیں نے پوچھا تھا

''ٹور تو بہت اچھا رہا۔ تم سناؤ تمہاری دوست نظر نہیں آ رہی۔'' جہانزیب کے پوچھنے پر ایک لمحے کے لئے یاسیت نے بسیرا کیا

''وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔''

''اچھا۔۔ میں تو اس کے لئے گفٹ لایا تھا۔ چلو پھر اس طرح کرنا، تم خود اسے دے دینا'' جہانزیب کے کہنے پر جبیں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا آپ حاعفہ کے لئے لے آئے اور میرے لئے؟'' حسام نے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''تمہارے لئے بھی لایا ہوں اور تمہاری ہونے والی بیوی کے لئے۔۔'' جہانزیب نے مزاح کے موڈ میں کہا تو سب کے چہرے پر مسکراہٹ چھا گئی۔ حسام کا چہرہ بھی قدرے جھک گیا۔

''واؤ۔۔ یعنی بھابھی کے ابھی سے ناز نکھرے اٹھائے جا رہے ہیں۔ ویسے بابا جان کہیں آپ بھابھی کے لئے انگوٹھی تو نہیں لے آئے؟'' جبیں کی ذو معنی بات کا اشارہ کس طرف تھا؟ کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ حسام نے فوراً کشن اٹھا کر اس پر دے مارا جسے اُس نے ہاتھوں میں کیچ کیا۔

''چہرے پر غصہ اور دل میں خوشی کے لڈو۔۔۔!! ایسا نہیں چلے گا بھائی جان۔'' اریب بھی بھلا کہاں پیچھے رہتا؟

''اریب۔۔۔'' غصے میں گھورنا چاہا تھا مگر نگاہوں سے سوائے رعنائی کے کچھ نہ چھلک سکا

''تم تینوں ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے مت دینا۔۔'' سحر فاطمہ نے کہا تھا تبھی ماریہ چائے کو ٹرے میں سرو کرنے کے لئے لے آئی۔ سحر فاطمہ نے اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے چائے کی ٹرے لی اور اسے جانے کو کہا۔ جس پر وہ گردن ہلا کر چل دی۔

''جہاں چائے بنا کر دے دی، وہاں سرو بھی تو کر سکتی تھی میں؟'' جلے بھنے لہجے میں وہ دل میں کہتی جا رہی تھی

''صاف صاف کیوں نہ کہہ دیا کہ جاؤ مار یہ جا کر اپنا کام کرو۔۔۔ یہاں ہماری باتیں نہ سنو۔'' ناک منہ چڑھا کر وہ اپنے کوارٹر کی طرف چل دی تھی۔

''یہ لیجیے۔۔ پہلے چائے پی لیں آپ۔۔ان کی نوک جھونک تو چلتی رہے گی۔'' سحر فاطمہ نے سب سے پہلے جہانزیب کو ہی چائے سرو کی تھی باقیوں کو بعد میں۔ چائے پیتے ہوئے بھی تینوں کی نوک جھونک جاری رہی۔ چائے پینے کے بعد جہانزیب نے سوٹ کیس کو کھسکا کر ٹیبل پر رکھا اور اس میں سے گفٹس کو باہر نکالا۔

''یہ لیجیے سحر فاطمہ۔۔ آپ کے لئے۔۔'' مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک خوبصورت سا کاسنی رنگ کا جوڑا دیا تھا۔ سحر فاطمہ نے اسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے تشکر آمیز نگاہوں سے انہیں دیکھا تھا

''اس کی کیا ضرورت تھی؟ آپ فقط بچوں کے لئے لے آتے گفٹس، میرے لئے وہی کافی تھا۔''

''اور میرے لئے بچوں کی ماما جان کے لئے گفٹس خریدنا مقدم تھا'' ان کے لہجے سے شرارت و نزاکت چھلک رہی تھی۔ سحر فاطمہ کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔

''واہ بابا جان۔۔۔ کیا ڈائیلاگ ادا کیا ہے آپ نے؟ سچی سے۔۔ میں تو آپ کا فین ہو گیا۔'' یہ اریب کی آواز تھی۔ جس پر سب ہنس دیئے۔

''یہ تمہارے لئے جبیں۔۔۔'' کچھ جیولری اور کاسمیٹکس کا سامان تھا جو وہ انڈو سے لائے تھے۔ ایسے تین گفٹس ہیمپر تھے، ایک جبیں کے لئے، دوسرا عاعفہ کے لئے اور تیسرا صبا کے لئے۔ جس پر جبیں اور اریب نے ایک ساتھ حسام کو زچ کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ بچارا رہا اور ان کی باتوں پر ذرا کان نہ دھرے۔ حسام کے لئے جہانزیب پرفیوم لائے تھے۔ جس کی خوشبو واقعی بہت تیز اور مسحور کن تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی سب سے پہلے حسام کے گفٹ کو جبیں نے ہی استعمال کیا تھا۔ اپنا گفٹ ایک طرف صوفے پر رکھا اور حسام کے ہاتھوں سے پرفیوم کی بوتل چھین کر ہتھیلی پر لگایا۔

''قبضہ گروپ۔۔۔ کبھی میری چیز چھوڑ نا مت۔۔'' ہلکے پھلکے لہجے میں حسام نے سرزنش کی تھی

''بہن بھائیوں کی چیزوں میں کوئی قبضہ نہیں ہوتا۔۔ کیوں بابا جان؟'' طمانت بھرے لہجے میں جبیں نے کہا

''ہاں ہاں۔۔ بھلا بہن بھائی ہی اپنی چیزیں شیئر نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟'' جہانزیب نے بھی جبیں کی حمایت کی

''اچھا۔۔ تو پھر یہ بات ہے۔۔'' حسام نے بھی اپنے دماغ کا بھرپور استعمال کیا اور پیچھے جھک کر جبیں کا گفٹ ہیمپر اٹھایا اور اس میں سے ایک عدد کریم کو کھول کر اپنی ہتھیلی پر لگالی۔

''بابا جان۔۔'' جبیں جھلا کر چیخی تھی اور جھٹ اس کے ہاتھوں سے اپنی کریم واپس لے لی

''اب کیا ہوا؟ اب شیئر کرنے والی نصیحت کہاں چلی گئی؟'' منہ چڑھا کر حسام گویا ہوا تھا

''شرم نہیں آتی آپ کو، بہن کی چیزیں استعمال کرتے ہوئے۔۔۔ یہ لڑکیوں کی کریمیں ہیں'' وہ منہ بسور کر گویا ہوئی تھی۔ جس پر حسام نے گردن جھٹک دی۔ اریب ان سب باتوں سے صحیح سے حظ تو نہیں اٹھا رہا تھا البتہ اس کی نگاہیں کسی شے کی متلاشی تھیں

''کیا ہوا؟ تم اپنا حصہ نہیں ڈال رہے؟'' جہانزیب نے کہا تھا

''میرا موبائل کہاں ہے؟ وہ کہیں وہیں انڈو تو نہیں بھول آئے؟'' اس کے انداز کی رعنائیاں کھوئی کھوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ چہرے کا رنگ بھی ہلکا سا اترا ہوا دکھائی دے رہا تھا

''ایسا ہو سکتا ہے؟ بھلا ہم اپنے لاڈلے بیٹے کے گفٹ کو بھول آئیں'' انہوں نے اب سوٹ کیس سے ایک عدد موبائل بکس نکال کر اریب کے ہاتھوں میں تھمایا تھا جس کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کی بہاریں لوٹ آئیں۔ وہ فرط جذبات میں کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا اور جہانزیب کے گلے لگ گیا

''مجھے تو دکھاؤ۔۔'' جبیں نے اریب کا موبائل بھی پہلے خود استعمال کرنا چاہا تھا۔ تبھی ہاتھ بڑھا کر موبائل چھیننا چاہا مگر وہ بھی اپنے نام کا اریب تھا۔ جبیں کو کیسے ہاتھ لگانے دے سکتا تھا؟

''بالکل بھی نہیں۔۔۔ میں حسام بھائی نہیں ہوں، جو تمہیں اپنی چیزیں استعمال کرنے دوں'' اس نے صاف انکار کر دیا

''بابا دیکھیں۔۔'' وہ تپ کر بولی تھی

''بھئی۔۔ یہ تم دونوں بہن بھائی کا معاملہ ہے'' شانے اچکاتے ہوئے جہانزیب نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ اریب نے بھی منہ چڑھا کر اپنے کمرے کی راہ لی۔ اب بھلا جبیں کیسے پیچھے رہ سکتی تھی۔ کشن کو صوفے پر دے پھینکا اور اریب کا تعاقب کرنے لگی۔ اب اریب دو دو سٹیپ پھلانگتا ہوا زینے چڑھ رہا تھا جبکہ جبیں اس کے پیچھے تھی۔ حسام بھی ہنس کر وہاں سے کھڑا ہوا۔

''اچھا بابا جان، ماما جان۔۔ میں بھی اپنے کمرے میں جا کر رپوٹ پر کام کر لوں۔۔'' جہانزیب نے اثبات میں سر ہلا دیا تو وہ بھی اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ان کے جانے سے لاؤنج ایک گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کبھی کوئی ہنس کر بولا ہی نہ ہو۔ ہر شے خاموش تھی۔ سردیوں کی خاموش راتیں، جب ہوائیں بھی ذرا دیر کو ٹھہر سی جائیں۔ سانسیں بنا آواز کے جاری ہوں۔ ایسی طویل خاموشی۔۔۔ جہانزیب نے گہرا سانس لیتے ہوئے اپنا سر صوفے کی پشت سے ٹکایا تو سحر فاطمہ نے اٹھ کر سوٹ کیس کو بند کیا۔

''ان کے جانے سے کتنی خاموشی چھا گئی۔۔۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے آباد گلشن یک دم ویران ہو گیا ہو۔ جسم روح سے علیحدہ ہو چکی ہو۔۔'' سحر فاطمہ اب چائے کے خالی کپوں کو ٹرے میں واپس رکھ رہی تھیں

''کہیں یہ سب کچھ سچ ہی نہ ہو جائے۔۔'' جہانزیب کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوئے تھے۔ آنکھوں کے سامنے وہی منظر محو

رقص تھا۔ایک انجان سایہ۔۔ جہانزیب کی اس بات پر سحر فاطمہ بری طرح چونکی تھیں۔ ہاتھ کپ کو تھامے ہوا میں معلق تھے اور نگاہیں جہانزیب کے چہرے کی طرف مرکوز تھیں جہاں ایک عمیق یاسیت نمایاں تھی۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' فکر و حیرانی کا عنصر نمایاں تھا

''کچھ نہیں۔۔۔'' اپنے خیالوں کو یکدم جھٹکتے ہوئے حقیقت میں قدم رکھنا چاہا مگر دماغ تھا کہ اس کاغذ کے ٹکڑے پر لکھی سطر سے ہٹنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

''اریب کا خیال رکھیے گا۔۔'' وہ سطر اب آواز کا روپ دھاڑ چکی تھی۔ڈھیلے قدموں کے ساتھ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔ان کی چال میں لڑکھڑاہٹ کسی شکست خوردہ انسان کی طرح واضح تھی۔ جسے سحر فاطمہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ نگاہیں ان کی پشت پر ایک لمحے تک مرکوز کیئے رہیں

''''اریب کا خیال رکھیے گا۔۔۔''عکس آنکھوں کے سامنے لہراتے رہے مگر زبان پر جیسے مہر خاموشی رہی۔شاید اس لئے کہ اگر سحر فاطمہ کو علم ہوتا تو ان کی فکر بڑھ جاتی۔

☆......☆......☆

آخری پیپر اور پہلا سمیسٹر تمام ہوا۔بس رزلٹ باقی تھا جس کی اریب کو کہاں پرواہ تھی؟ چہرے پر ایک بھاری بھرکم بوجھ اترنے کا احساس نمایاں تھا۔ یہ بوجھ پڑھائی کا نہیں بلکہ پیپر کی وجہ سے لگنے والی بے جا پابندیوں کا تھا۔ پڑھنا تو اس نے وہی ایک دو گھنٹہ پہلے ہی تھا مگر سحر فاطمہ کے حکم کو بھی تو بجا لانا تھا بس اسی لئے نوٹس کو ہاتھوں میں پکڑے رکھنے کی رسم نبھاتا رہا تھا۔

خدا خدا کر کے اب یہ رسم بھی پوری ہوگئی۔ کامیش کو وہ فوراً اپنی کار کے پاس لایا۔اس کے چہرے پر انتہا کی خوشی تھی۔ جسے کامیش بھی سمجھنے سے فی الحال قاصر تھا۔

''بتاؤ تو صحیح یار اریب؟ کیا دیکھانا چاہ رہے ہو تم؟'' وہ پوچھتا رہا مگر اریب نے کچھ نہ بتایا

''تم چلو تو، تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔'' وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔کار کا فرنٹ ڈور اوپن کرنے کے بعد وہ اندر کی جانب جھکا اور ایک غیر ملکی کمپنی کا سمارٹ فون اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر واپس پلٹا۔

''یہ دیکھ۔۔۔ یہ میرا فون ہے۔ بابا جان نے خود دیا ہے مجھے۔'' وہ جتلاتے ہوئے بول رہا تھا۔

''واؤ۔۔یار۔۔امیزنگ۔۔۔''اس کے موبائل کا اچھے سے معائنہ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک لہر دوڑی تھی۔

''دیکھا۔۔ میں ناں کہتا تھا کہ بابا جان میری ہر خواہش پوری کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار کہا بابا جان نے خود لا کر دیا موبائل۔۔''اس نے ایک جھٹکے سے کامیش کے ہاتھوں سے اپنا موبائل چھینا اور ابرو اچکاتے ہوئے کہا

''اچھا۔۔تو پھر اب مجھ پر طنز کیا جا رہا ہے؟'' دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھتے ہوئے اس نے عمیق نگاہ اس پر ٹکائی تھی

''بالکل۔۔''اس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا

''چلو۔۔اچھا۔۔بات جو بھی ہو۔۔مجھے تو اب ٹریٹ چاہیئے۔۔'' بندھے بازوؤں کو یکدم آزاد کیا اور دائیں ہاتھ اریب کے شانوں پر رکھتے ہوئے کہا

''کس خوشی میں۔۔۔؟''اس نے سنجیدہ لہجے میں کامیش کا بازو جھٹک دیا

''کتنا خودغرض انسان ہے تو اریب؟ انڈو سے تیرے لئے موبائل آیا ہے اور تُو اپنے اکلوتے دوست کو ٹریٹ بھی نہیں کھلا سکتا۔۔کنجوس انسان۔۔۔''اس نے منہ بسوڑ کر شکوہ کیا تھا

''تم دونوں یہاں ہو۔۔۔!! میں نے تمہیں پورے ڈپارٹمنٹ میں چھان مارا۔'' اس سے پہلے کہ اریب کچھ کہتا وہاں ہانیہ آموجود ہوئی تھی۔اس کے چہرے پر تھکان کے آثار تھے جیسے وہ کافی دیر سے چل رہی ہو۔

''اسے بھی ابھی ٹپکنا تھا۔۔'' اریب نے دل میں جل بھن کر کہا تھا۔آنکھوں میں سوائے حقارت کے کچھ نہ تھا۔اس کے آتے ہی جیسے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

''اوہ۔۔کوئی خاص بات تھی کیا؟'' کامیش کا دھیان اریب سے ہٹا اور ہانیہ کی طرف چلا گیا

''بس ویسے ہی، سوچا اب تو اگلے سمیسٹر میں بات ہوگی۔اس لئے آج ہی کیوں ناں کوئی بات وغیرہ کر لی جائے۔۔!!'' ہانیہ نے کہا تھا جس پر اریب نے گردن جھٹک دی اور اکتاہٹ والے لہجے میں کامیش سے گویا ہوا

''تم بات کرو پھر اس سے۔۔میں چلتا ہوں۔۔''اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو ہانیہ کی نظر اس کے ہاتھ میں موجود موبائل پر گئی۔

''واؤ۔۔اریب، تم نے موبائل لے لیا۔نمبر دینا پسند کرو گے؟''اس نے دوستانہ لہجے میں کہا تھا، چہرے پر موجود تھکاوٹ اب غائب ہوتی دیکھائی دی۔

''میں اجنبی لوگوں کے منہ نہیں لگتا۔۔''اس کے لفظوں کی کاٹ انتہا کی زہریلی تھی۔پیشانی پر شکن بھی عیاں تھے۔کامیش نے پلٹ کر استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔جسے شرمندگی ہو رہی تھی۔

''اریب۔۔۔!!'' وہ محض اتنا ہی کہہ سکا تھا

''مجھے ذرا گھر پر کام ہے، میں چلتا ہوں۔۔'' یہ کہہ کر وہ کار کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ہانیہ نے ایک بار پھر اسے پکارا۔شاید وہ آج ہر حال میں اس سے بات کرنا چاہتی تھی

''اریب۔۔تم مجھ سے اس انداز میں بات کیوں کرتے ہو؟ آخر میں نے تمہارے ساتھ کیا غلط کیا ہے؟ جو تمہارے لہجے میں اتنی

کڑواہٹ ہے میرے لئے۔۔۔!!'' اس کا انداز آبدیدہ تھا۔ ایسا کامیش کو محسوس ہوا مگر اریب ان احساسات سے عاری تھا۔ وہ یک دم پلٹا اور نہایت سفاکیت کے ساتھ گویا ہوا

''اس کا جواز تم سے بہتر بھلا کون جان سکتا ہے؟''

''میں جانتی ہوں؟'' اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے استفہامیہ لہجے میں کہا تھا

''ہاں۔۔!! اور ویسے بھی میں وہ سبب بتا کر کسی کی نگاہوں میں تمہیں گرانا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری حقیقت بتا کر تمہیں کامیش کی نظروں میں بھی گرادوں۔۔'' وہ سفاکیت کے ساتھ کہتا جا رہا تھا جبکہ ہانیہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔ ہر لمحہ اس کی پیشانی پر شکن ابھر رہے تھے۔ کامیش کی سمجھ میں تو کچھ نہ آیا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے اریب؟ بھلا ہانیہ نے ایسا کیا کیا؟'' کامیش نے متجس انداز میں پوچھا تھا

''یہ بتانے کا میں روادار نہیں۔۔۔'' وہ دوبارہ کار کی طرف پلٹا تھا

''ٹھیک ہے، کامیش کو نہیں بتا سکتے مگر مجھے تو بتا سکتے ہوناں؟ آخر مجھے بھی تو معلوم ہو کہ میں نے آخر ایسا کیا برا کیا؟'' اس بار وہ قدرے سخت لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''میرا مقصد کسی کے سامنے، کسی کو ذلیل کرنا نہیں ہے۔'' اس نے بنا پلٹے، دھیمے لہجے میں کہا تھا

''ٹھیک ہے پھر۔ کامیش تم کچھ دیر کے لئے جا سکتے ہو پلیز۔۔۔'' ہانیہ نے درخواست کی تھی

''مگر۔۔۔'' اس نے مزاحمت کرنا چاہی مگر ہانیہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر درخواست کی۔

''ٹھیک ہے۔۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک نگاہ اریب کی طرف دوڑائی جو ابھی تک پشت کئے کھڑا تھا۔

''جانے کیا چل رہا ہے اس کے ذہن میں؟'' وہ کسمسا کر رہ گیا اور دھیمے قدموں سے اپنی کار کی طرف چل دیا جو پارکنگ ایریا کے دوسرے کنارے پر تھی۔ لاک اوپن کرنے کے بعد اس نے پلٹ کر دوبارہ دیکھا تو وہ ابھی تک ہانیہ کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔

''لکیریں کبھی کبھی جھوٹ بھی بول دیا کرتی ہیں اریب۔۔۔!!'' عمیق گہرائیوں سے نکلنے والے الفاظ زبان تک آتے آتے کہیں معدوم ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں ہانیہ کے لئے ترس اور فکر تھی۔ تبھی وہ ایک جھٹکے سے پلٹا اور کار میں جا بیٹھا۔ جب تک کامیش کی کار پارکنگ ایریا سے نہ نکل گئی وہ ویسے ہی پشت کئے کھڑا رہا۔ پاس سے گزرتے ہوئے بھی کامیش نے ایک نظر اس کو دیکھا تھا۔ مگر جانے کیوں وہ آج نظریں نہ ملا سکا۔ آنکھوں میں انتہا کی سفاکیت نمایاں تھی۔ گردن جھٹکتے ہوئے وہ زوں کر کے وہاں سے گزر گیا۔ پیچھے فقط ایک دھول تھی جو ہانیہ اور اریب کے درمیاں ایک دیوار کی مثل تھی۔ وقت کی دھاڑیں آگے بڑھتی چلی گئیں اور ہانیہ اریب کی پشت کو یک ٹک دیکھتی رہی مگر وہ نہ پلٹا۔

"اب بتاؤ۔۔؟ کیا بات ہے؟ کامیش جا چکا ہے۔" ہانیہ نے پر اطمینان لہجے میں استفسار کیا تھا

"میں جھوٹ نہیں بولوں گا مگر سچ تم برداشت نہیں کر سکو گی۔" وہ دفعتہً پلٹا اور عمیق آنکھوں سے اس کے وجود کو اپنے لپیٹ میں لینا چاہا تھا۔

"تم کہو۔۔ جو بھی کہنا چاہتے ہو، میں بھی تو سنوں کہ آخر کیا کیا بدگمانی پال رکھی ہے تم نے اپنے دل میں۔۔" اس کا لہجہ ذرا بھی نہ بدلا تھا۔

"اگر سننا چاہتی ہو تو سنو۔۔۔" ایک پل کے لئے اس نے توقف کیا اور اپنے دونوں بازوؤں کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور نظروں کی حدت پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی۔

"تم نے جو اتنا گھٹیا منصوبہ بُنا ہے ناں۔۔۔ وہ مجھ سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔۔" بڑی بڑی آنکھیں اس وقت ہانیہ کو ایسے گھو رہی تھیں جیسے کوئی شکاری شکار کی گھات میں بیٹھا ہو اور پلکیں جھپکنا بھی بھول چکا ہو

"مم مم منصوبہ؟" وہ ذرا سا ہڑبڑائی

"اریب عالمگیر۔۔۔ چہروں پر ابھرنے والے شکنوں سے دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو بھانپ جایا کرتا ہے۔" لفظوں کی ایسی کاٹ تھی کہ اس کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔ ہاتھوں کو ایک دوسرے میں دبوچے وہ اپنی انگلیاں بھینچتی جا رہی تھی۔

"جس دن میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، تمہاری نیت کو اسی دن بھانپ گیا تھا۔۔ تمہارا رویہ کسی منافق سے کم نہ تھا۔ چہرے پر ایسی مسکراہٹ جیسے تمہارے جیسا خوش اخلاق کوئی اور ہے ہی نہیں۔۔۔ اور من میں ایسا زہر کہ سانپ بھی تم سے بھیگ مانگیں" وہ اب ایک قدم آگے بڑھا تھا جبکہ وہ اپنی ہی جگہ پر کسی مورت کی مثل ساکت تھی۔ ایک رائی کے دانے کے برابر بھی جنبش نہ تھی۔ آنکھیں پشیمانی کے سبب جھکتی چلی جا رہی تھیں۔

"مجھے تم سے نفرت نہیں ہے مگر تمہارے دل میں جو میرے لئے زہر ہے، اس سے نفرت ہے۔" اس کا لہجہ اب پہلے سے کم کاٹ رکھتا تھا۔

"دیکھو ہانیہ عمر دراز۔۔ ہار جیت، فرسٹ یا سیکنڈ پوزیشن سب قسمت کی مہربانیاں ہیں۔ ان میں میرا یا پھر تمہارا کوئی کمال نہیں۔۔ تم محنتی ہو، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ محنت قدرت کا تحفہ ہے۔ تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے تھی نا کہ ناقدری۔۔ تم نے اس تحفے کو اپنا حق مان لیا اور اپنے اندر غرور کو جگہ دیکر تم نے بہت بڑی غلطی کی۔" اس بار اس کی جھکی پلکیں اریب کی جانب اٹھی تھیں۔ جو قدرے پر نم تھیں۔ مگر وہ انہیں ضبط کرنا بخوبی جانتی تھی تبھی ایک عمیق نگاہ اس پر دوڑائی۔

"مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ کوئی مجھ سے آگے نکل رہا ہے۔۔۔ لیکن کوئی میرے بارے میں ایسی گھناونی چال چلے۔۔ یہ میں

قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔۔سوری مس ہانیہ عمر دراز۔۔میں ان لڑکوں میں سے نہیں ہوں، جو لڑکیوں کے لئے مرے جاتے ہیں۔فار گاڈ سیک، اپنے دل سے اس بات کو نکال دو کہ تم کامیش کے ذریعے مجھ تک پہنچ پاؤ گی اور پھر مجھے اپنے مکر میں الجھا کر مجھ سے آگے نکلنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔یہ سب تمہاری غلط فہمی ہے۔" بھیگی پلکیں اب بہنے لگی تھیں۔یہ الزام تھا یا پھر حقیقت؟ فی الحال اس کی حالت قابل رحم تھی۔

"پہلے رزلٹ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ میں تم سے آگے نکلوں۔۔تاکہ تمہیں منہ کی کھانی پڑے۔۔" یہ کہتے ہی وہ یک دم پلٹا اور آنکھیں پھیر کر کار میں جا بیٹھا۔وہ یونہی بے بسی کے ساتھ اس کو تکتی رہی۔آنکھوں میں موجود نمی نے سب کچھ دھندلا سا کر دیا تھا۔وہ کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھی۔بادلوں کا ایک غبار تھا۔جو چاروں سو دیکھائی دے رہا تھا۔اسی غبار میں اسے کار کا عکس دیکھائی دیا جو دھول اڑاتا دور چلا گیا اور وہ تن تنہا کھڑی اس کی باتوں کی گونج سنتی رہی۔
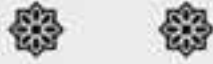
جَمَالُ الاِنسَانِ فِی اللِّسَانِ

حکمِ قاضی ہے کہ ماضی میں رکھا جائے ہمیں
موسمِ رفتہ رہے، عمرِ رواں کا موسم

آج پھر قسمت اسے خدیجہ کے در پر لے آئی تھی۔ آنکھیں اگرچہ ابھی تک شرمسار تھیں، ندامت کے سبب پلکیں کسی موتی کی طرح چمک رہی تھیں مگر دل کے ارادے کے سبب وہ وہاں موجود تھی۔ پہلے کی طرح وہ آج بھی گھر میں تن تنہا تھی۔ عاطی سکول گیا ہوا تھا۔ گھر کے کاموں میں مصروف ہونے کے باوجود، حاعفہ کے آنے پر وہ اس کے پاس آ بیٹھی۔ جھکی جھکی پلکیں بات کا آغاز کرنے سے دریغ برت رہی تھیں۔

''میں تو سمجھی تھی کہ شاید میں تمہیں پھر نہ دیکھ سکوں، لیکن یقین جانو حاعفہ مجھے انتہائی خوشی ہوئی ہے تمہیں ایک بار پھر سے دیکھ کر'' الفاظ میں کوئی دوغلا پن نہیں تھا۔ آنکھوں کی چمک دل کی حقیقت کو آویزاں کر رہی تھی مگر وہ سمجھنے سے قاصر تھی تبھی نظریں جھکائے رہی۔

''لیکن مجھے آج تمہاری ایک بات بالکل پسند نہیں آئی۔'' خدیجہ کے کہنے پر اس نے دفعتاً اپنا چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا تو اُس کے چہرے وہی نور غالب تھا۔ ایسا نور جو قسمت سے نصیب ہوتا ہے۔ جس کے آگے چاند کی چاندنی بھی مغلوب ہو کر رہ جائے، ایسی تابنا کی کہ سورج کی شعاعیں بھی اپنا وجود چھپاتی پھریں، ایسی طمانت کہ اضطرابی کا معمولی سا عنصر بھی نظر نہ آئے۔

''کیا؟'' اس ایک جملے نے اس کے پورے وجود میں اضطرابی کی لہر پیدا کر دی۔ پہلے ہی وہ نامکمل تھی، پہلے ہی اس میں ہزاروں کمیاں موجود تھیں۔ اب نا جانے کون سی کمی، کون سی کوتاہی اس سے سرزد ہو گئی جو کہ خدیجہ پر ناگوار گزری تھی۔ وہ ششدر اسی کو تکتی جا رہی تھی۔

''پہلے حاعفہ بولتی تھی اور آج بالکل خاموش۔۔ جیسے بولنے کی سکت ہی چھین لی گئی ہو۔ زبان بولنے کے لئے دی گئی ہے۔ اسے ہمیشہ اچھی باتوں میں استعمال کرنا چاہیے۔'' اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کو حقیقت میں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسی مسکراہٹ جسے دیکھ کر دل کو سکون حاصل ہو۔ ایسی مسکراہٹ جو آنکھوں میں موجود تشنگی کو لمحہ بھر میں بجھا دے۔ ایسی مسکراہٹ جو دن بھر کی مشقت کے بعد راحت کا سماں پیدا کرے۔

''بولنے کے لیے الفاظ چاہیے اور میرے پاس تو کوئی لفظ ہی نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے زندگی سے ہر رنگ نکل چکا ہو، ہر لفظ چھن چکا ہو۔'' مایوسی کی انجان دنیا میں اس کا پورا وجود بھٹک رہا تھا۔ آنکھوں میں ایسا سونا پن جسے دیکھ کر غشی کے ہول اٹھتے ہوں۔ بظاہر وہ خدیجہ کی

طرف دیکھ رہی تھی مگر نگاہیں تھر کے کسی بیاباں صحرا میں جون جولائی کی تپتی دوپہر میں، دہکتے سورج کے نیچے، آگ کی مانند جھلستی ریت پر بھٹک رہی تھیں۔اس نے اپنے ناخن سے ہتھیلی پر کسی ان دیکھی شے کو کھردنے کی کوشش کی تھی۔خدیجہ کو حاعفہ کے الفاظ کچھ ناگوار گزرے۔ شاید اسی لئے وہ چارپائی سے اٹھی۔

''ایک تو تم ماضی میں بہت جیتی ہو حاعفہ۔۔۔!! یہ سچ ہے کہ انسان کے لئے ماضی یاد رکھنا انتہائی ضروری ہے لیکن حال کو فراموش کر کے ماضی کے پنوں میں الجھے رہنا بھلا کہاں کا انصاف ہے؟ جو غلطیاں پچھلی زندگی میں بھول چونک سے ہوگئی انہیں فقط حال میں ہی سدھارا جاسکتا ہے۔ماضی کو یاد کرنے سے انسان کو اپنی اوقات یاد رہتی ہے اور پھر سے وہی غلطی نہ دہرانے کی ہمت بندھتی ہے مگر ہر وقت پچھلے وقت کو یاد کر کے روتے رہنے سے حال بھی ماضی میں ضم ہو جاتا ہے اور پھر مستقبل حال میں اور پھر یہ تسلسل بنا رکے جاری رہتا ہے اور سوائے ندامت کے کچھ مقدر نہیں بنتا۔۔۔'' ہمت باندھتے الفاظ کسی مہرباں کی طرح تھے۔وہ اٹھ کر دائیں طرف موجود ایک الماری کی طرف گئی۔وہاں کچھ کتابیں رکھی تھیں۔جنھیں ایک سرخ رنگ کے کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا شاید مٹی سے بچانے کے لئے۔ایک پھونک سے اُس نے مٹی کی تہہ اڑائی اور پھر سب سے نیچے رکھی ایک کتاب اٹھا کر اس کے اوراق الٹ پلٹ کرنے لگی۔

''لیکن خد۔۔۔'' وہ اس کا نام لینے لگی تھی پھر یاد آیا وہ تو اس سے عمر میں بڑی ہے تبھی خاموش کرگئی۔خدیجہ نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی حالت سمجھ گئی۔

''تم مجھے آپی کہہ سکتی ہو۔'' ماہتاب سے مشابہہ چمکتا دمکتا چہرہ اس کی طرف پلٹا اور دھیرے سے گویا ہوا تھا۔نظریں دوبارہ کتاب میں کچھ تلاشنے لگیں۔

''آپی۔۔۔!!'' تغافل کے عمیق اندھیروں میں غرق لہجہ دھیمے سے گویا ہوا تھا۔دلِ مضطر میں جانے کیسی لہر اٹھی تھی جو پل بھر میں اس کی آنکھوں میں نمی کو ابھارنے کا موجب بنی تھی۔ایسی اپنائیت کی وہ قطعاً حق دار نہ تھی۔

جب دل میں ابھرنے والے جذبات اور آنکھوں میں تیرنے والی نمی پُر ہوگئی تو وہ کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر عجلت کے ساتھ اٹھی اور خدیجہ کے گلے جا لگی۔اس کے ہاتھوں میں موجود کتاب گرتے گرتے بچی تھی۔اس نے ہڑبڑاہٹ کے ساتھ اس کتاب کو تھاما تھا۔حاعفہ اسے کسی ایسے بچے کی طرح مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھی جیسے ایک لمبے عرصہ بعد وہ اپنی ماں سے ملا ہو۔آنکھوں میں اشک کا تانابانا بندھا ہوا تھا۔ہونٹ بلک بلک کر اپنے جذبات کو ظاہر کر رہے تھے۔

''آپی۔۔'' گندھا ہوا جذبات سے پُر لہجہ دھیمے انداز میں ایک بار پھر گویا ہوا تھا۔خدیجہ نے مسکراتے ہوئے اپنے ہاتھ اس کی پشت کی طرف بڑھائے اور ہلکا سا تھپتھپاتے ہوئے حوصلہ دیا۔

جب کافی وقت یونہی بیت گیا تو اسے احساس ہوا۔دفعتہً پیچھے ہٹ کر اپنے آنسو پونچھے مگر خدیجہ نے کچھ نہ کہا۔اسے کچھ دیر کے

لئے حالات سے لڑنے دیا تا کہ وہ اس قابل ہو جائے کہ وقت کی دھاڑوں کے ستم سہہ سکے۔ بائیں ہاتھ میں کتاب کو پکڑے، دائیں ہاتھ سے ورق الٹتے جا رہے تھے۔

''سوری۔۔میری کوئی بہن نہیں تھی۔ بس اس لئے۔۔'' اس نے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا

''اچھا۔۔میری بھی کوئی چھوٹی بہن نہیں ہے۔ اس کا مطلب آج سے ہم دونوں بہنیں۔۔'' اس کے لہجے میں ایک عجب سا ولولہ اور سحر تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک جسے دیکھ کر کوئی بھی اپنا غم بھول جائے۔

''سیریسلی۔۔آج میں بہت خوش ہوں۔۔خدا نے ایک رشتہ چھینا تو دوسرا رشتہ عطا کر دیا۔۔'' بھیگی پلکیں چھلکنے لگی تھیں۔ اس نے خدیجہ کے ہاتھوں کو تھام کر کہا تھا۔ جواباً وہ بھی مسکرادی۔

''ایک بات یاد رکھنا حاعفہ۔۔خدا کبھی اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا، یہ خود انسان ہے جو اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے اور پھر نسبت خدا کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ شامت اعمال خود کرے اور نسبت کرے رحمٰن کی طرف۔۔۔!! بھلا یہ کیسا انصاف ہوا؟ وہ تو محض انسان کو ایک جھٹکا دیتا ہے کہ ابھی بھی وقت ہے ایسے اعمال کو ترک کر دے جن کی منزل اندھیر وادی ہے۔ جہاں روشنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جہاں کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا۔ بس اسی لئے وہ اسی دنیا میں اپنے بندوں کو جھنجوڑتا ہے کہ شاید کوئی بندہ لوٹ آئے۔۔!!'' کتاب پر نظریں جمائے وہ کہتی جا رہی تھی جبکہ وہ مبہوت اس کی ذات میں کھو چکی تھی۔ آج تک کبھی اس نے کسی نصیحت کو پلے باندھنا تو درکنار سننا بھی گوارا نہیں کیا تھا مگر جانے کیوں وہ خدیجہ کے لبوں سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سنتا رہنا چاہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بولتی جائے اور یہ سنتی جائے۔ ایسا شیریں لہجہ جس سے نصیحت بھی نصیحت نہ لگے۔

''تو کیا کوئی بندہ آج تک لوٹا ہے اس ذات کی طرف؟'' اس کا سوال کچھ عجیب سا تھا۔ تبھی ورق پلٹتے پلٹتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا جو اپنے جواب کی منتظر تھیں۔ اس نے ایک گہری سانس لینے کے بعد وہ کتاب دوبارہ الماری میں رکھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر لے آئی۔ اس کو اپنے پاس بٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کے ہاتھوں کو تھاما۔

''کوئی ایک ہو تو بتاؤں تمہیں۔۔۔ایسی ہزاروں مثالیں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، کیا تم نے کبھی صحابہ اکرام کی زندگی کو نہیں پڑھا؟ کیسے وہ بعثت نبوی ﷺ سے قبل اندھیروں میں زندگیاں گزارتے تھے اور پھر جب رحمت دو عالم ﷺ کا ظہور ہوا تو کیسے ان کی زندگیوں میں انقلاب آیا؟'' اس سوال پر ایک بار اس کی نگاہیں ندامت کے جھک گئیں۔ وہ کتنی بدنصیب تھی جسے دین کے بارے میں کچھ پتا نہ تھا۔ نماز، وضو تو شائد صحیح سے لکھنا بھی نہیں آتا ہوتا اگر نصابی کتب میں یہ الفاظ شامل نہ ہوتے۔ اس کا ضمیر اس کو بری طرح ملامت کئے جا رہا تھا۔ بھیگی پلکیں نفی میں سر ہلانے لگیں تو ایک جھماکے سے وہ الفاظ اس کے خالی الذہن سے ٹکرائے۔

''سیکھنے کا ارادہ وہ کرتا ہے جسے کچھ نہ پتا ہو'' بس یہ الفاظ گونجنے کی دیر تھی، اس کی ویران و بیاباں آنکھوں میں ایک چمک پیدا

ہوئی۔اس نے ایک امید کے ساتھ خدیجہ کی طرف دیکھا تھا

''آپی! آپ سے کچھ سیکھوں تو آپ مجھے سکھائیں گی؟''غم کے آنسو کی نوعیت بدل چکی تھی۔لہجے کا انداز بھی بدلا بدلا سا محسوس ہو رہا تھا۔تبھی خدیجہ نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا

''مجھے دین سیکھنا ہے۔۔'' حاعفہ کے لبوں سے یہ الفاظ سننے کی دیر تھی کہ اس کی پلکیں بھی بھیگ سی گئی تھیں۔ایک چمک ان آنکھوں میں ابھری۔

''بولیں۔۔سکھائیں گی ناں آپ مجھے دین؟'' وہ بس اس کے جواب کی منتظر تھی۔کسی بے چین بچے کی طرح۔۔جو کسی شے کو سیکھنے کی ضد کرتا ہے اور آنکھوں میں حسرت کا جہاں لئے دوسرے کی طرف دیکھتا ہے کہ شاید وہ اس کی آنکھوں میں جستجو کو دیکھ کر ہاں کر دے۔وہ بھی کچھ ایسا ہی کر رہی تھی۔اپنی تڑپ اور جستجو اس کے سامنے عیاں کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

''بولیے۔۔'' اس نے تیسری بار سوال داغا تھا۔اس بار اشک پلکوں سے ذرا نیچے کو بہتے چلے گئے اور اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

''شکریہ آپی۔۔۔بہت بہت شکریہ۔۔آپ جانتی نہیں ہیں مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔۔۔'' جذبات میں گندھا ہوا لہجہ کہتا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

جہانزیب صاحب بستر میں لیٹے فائل پڑھ رہے تھے۔دائیں طرف کی ٹیبل پر ہاٹ کافی رکھی تھی۔جس سے تسلسل کے ساتھ نکلتی بھاپیں ہوا میں فنا ہو رہی تھیں۔وال کلاک صبح کے گیارہ بجنے کی نوید سنا رہا تھا مگر باہر کا موسم ابھی تک ابر آلود تھا۔آسمان پر بادلوں کی یلغار تھی۔ہلکی ہلکی ہوا سردی کی شدت میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔محکمہ موسمیات والوں نے شام تک بارش کی نوید سنائی تھی۔جس کا مطلب تھا کہ آج رات سردی پچھلی راتوں سے زیادہ ہو گی۔

''ایک ملین کی ایکسپورٹ ہوئی لاسٹ منتھ۔۔۔'' سرد موسم نے لہجے بھی سرد کر دیئے تھے۔گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے ایک ملین کے ہندسے کو بغور دیکھا تھا۔بظاہر ناگواری کے تاثر ان کے چہرے پر آویزاں تھے۔

''اگر ایسا ہی چلتا رہا تو نیکسٹ منتھ ورکرز کو سیلری کیسے دی جائے گی؟'' انہوں نے ایک زوردار جھٹکے سے فائل کلوز کی اور نیم دراز اٹھ بیٹھے۔مگر لحاف ابھی تک سینے پر موجود تھا۔چھت کی طرف بغور دیکھتے ہوئے انہوں نے پلس مائنس شروع کر دی۔

''fifty thousand multiply by 5 is......!!!'' انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کیلکولیشن ادھوری چھوڑ دی۔نچلے ہونٹ کو ہلکا سا بھینچا۔تبھی کمرے کا دروازہ کھلا اور سحر فاطمہ اندر آئیں۔

''یہ کیا ابھی تک آپ نے کافی نہیں پی۔میں دس منٹ پہلے رکھ کر گئی تھی۔اب تو یہ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہو چکی ہے۔'' جیسے

ہی ان کی نظر کافی پر گئی تو انہوں نے شکوہ کیا۔ آگے بڑھ کر مگ کو چھوا تو واقعی وہ برف کی مانند ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ بھلا اسلام آباد کا سرد موسم بھی کسی شے کو گرم رہنے دیتا ہے اور وہ بھی جنوری کے دنوں میں؟

''اب تو یہ پینے کے قابل بھی نہیں رہی۔'' افسوس کرتے ہوئے انہوں نے جہانزیب کی طرف دیکھا تھا مگر وہ تو ان کی بات سننے سے ہی قاصر تھے۔ خیالات تو کہیں اور ہی مرکوز تھے اگرچہ بظاہر آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں۔

''کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟'' انہوں نے دھیرے سے ان کے بائیں ہاتھ کو چھوا تو وہ بری طرح چونکے اور غیر یقینی نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔

''سحر فاطمہ آپ؟ آپ کب آئیں یہاں؟'' وہ اب صحیح سے بیٹھ رہے تھے۔

''اس وقت جب آپ کا ذہن بزنس میں الجھا ہوا تھا'' وہاں سے اٹھتے ہوئے انہوں نے کافی کا ٹھنڈا مگ اٹھایا اور بیڈ کے سامنے ٹیبل پر لے جا کر رکھ دیا تاکہ ہاتھ لگنے سے نیچے نہ گر جائے۔ اس بات پر جہانزیب بھی مسکرا دیئے تھے۔

''بیٹے کا اثر ہو گیا ہے آپ پر۔۔۔'' جمائی لیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا

''بالکل۔۔۔'' ایک مان کے ساتھ انہوں نے کہا تھا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ سحر فاطمہ نے وارڈ روب سے جہانزیب کے لئے سوٹ نکالا اور اسے صوفے پر رکھ دیا۔ بعد از بیڈ کے پاس آ کر لحاف کی تہہ لگانا شروع کی۔

''آپ نے اریب کو فون اُس کے کہنے پر دیا؟'' یکدم ان کے ذہن میں یہ سوال ابھرا تو انہوں نے پوچھ ڈالا جس پر وہ قدرے چونکے اور کھڑے ہوتے ہوئے اپنی نگاہیں چرانا چاہیں۔

''یہ کافی کا مگ کہاں گیا؟'' بات کو ٹالنے کی غرض سے کہا تھا

''ابھی تو آپ کے سامنے ٹیبل پر رکھا ہے۔۔'' اشارہ کرتے ہوئے سحر فاطمہ نے یاد دہانی کروائی تھی۔

''اوہ۔ لگتا ہے بزنس کے خیالات میں کچھ زیادہ ہی محو تھا تبھی صحیح سے دیکھ نہ سکا۔'' انہوں نے بائیں ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔

''صحیح کہا آپ نے، میں نے نوٹ کیا، دیپا سار سے واپس آنے کے بعد آپ کچھ زیادہ ہی بزنس میں کھوئے کھوئے رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر سحر فاطمہ جہانزیب کے بالکل سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں جو اس وقت پیشانی پر ہاتھ رکھے کسی شے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

''نہیں۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔'' مسکرانے کی ناکام کوشش کی گئی۔ مگر استفہامیہ آنکھوں کو ابھی تک اپنا جواب نہ ملا تھا

''یہ سب آپ کا وہم ہے۔ بھلا میرے نزدیک کبھی بزنس رشتوں سے اہم ہوا ہے؟ جواب ہو گا؟'' خوش اسلوبی کا لبادہ اوڑھ کر

انہوں نے دھیرے سے ان کے رخسار کو تھپتھپایا تھا لیکن آج پہلی بار ان کے احساس میں وہ کشش نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ کچھ تو اجنبی تھا یا پھر کوئی راز۔۔ جو وہ چھپا رہے تھے۔ گہری نگاہیں ابھی تک ان کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ مسلسل مسکراہٹ کے ساتھ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بھلا مضطرب لہجے میں بھی آسانی سے مطمئن ہوئے ہیں؟ انہیں تو قرار کی منزل تک پہنچنے کے لئے جانے کتنے دلائل کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ بس یہی دلائل جہانزیب کے پاس نہیں تھے۔ بس ایک مسکراہٹ تھی جو گزرتے لمحوں کے ساتھ ماند پڑتی جا رہی تھی۔

''ویسے حسام کے بارے میں کیا سوچا پھر آپ نے؟'' یک دم انہوں نے گفتگو کا موضوع بدلا تھا۔

''حسام کے بارے میں کیا سوچنا؟'' یہ لہجہ ابھی تک غیر مطمئن تھا لیکن حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا بھی ضروری تھا۔ شاید خاموشی نے سب کچھ ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''ارے بھئی۔۔ حسام اور صبا کی منگنی بھی کرنی ہے یا نہیں؟'' صوفے کی طرف بڑھ کر سوٹ اٹھاتے ہوئے کہا تھا

''ہاں سچ۔۔!! میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ سرِ شام ان کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اگلے ہفتے منگنی کی رسم ادا کر دی جائے؟''

سحر فاطمہ کو اچانک یاد آیا تھا۔ گفتار میں ایک بار پھر جوش کا پہلو ابھرا تھا۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے۔ ہمارے دل کی بات انہوں نے بنا کہے ہی سمجھ لی۔۔'' جہانزیب کے چہرے پر بھی حقیقی مسکراہٹ ابھری۔

''اب کل سے منگنی کی تیاری شروع کر دیں؟'' ان کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ چیزیں سمیٹنے کے بعد وہ ٹیبل کی جانب بڑھیں، جہاں کافی کا کپ رکھا تھا۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟ بلکہ اس طرح کیجیے گا۔ اس معاملے میں اریب کو بھی اپنے ساتھ رکھیے گا۔ ویسے بھی فی الحال اس کی چھٹیاں ہیں اور پھر اسے گلہ بھی رہتا ہے کہ ہم نے اس کے باہر آنے جانے پر بے جا پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ اس طرح اس کا یہ شکوہ بھی ختم ہو جائے گا اور آپ کو آنے جانے میں ہیلپ بھی مل جائے گی۔''

''جی بالکل۔۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔۔ حسام تو جا نہیں سکتا۔۔ اگلے مہینے تک اسے رپورٹ مکمل کرنی ہے'' ٹرے اٹھا کر انہوں دروازے کی راہ لی۔ جہانزیب نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا تو سحر فاطمہ نے کچھ ان کہی باتوں کو کھریدنا چاہا تھا۔ خاموش نگاہوں میں ایک طوالت پکڑتی جستجو نکتے پر پہنچ ہی چکی تھی جب انہوں نے اپنی نگاہوں کو برجستہ پھیر لیا تھا اور واش روم کی طرف چل دیئے۔ کچھ لمحے اپنے پاؤں کی طرف بنا مقصد کے دیکھا اور کمرے سے باہر چل دیں۔

☆......☆......☆

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید

اس رنج بے خمار کی اب انتہا بھی ہو

چھت کو گھورتے ہوئے کئی گھڑیاں بیت چکی تھیں مگر نیند تھی کہ اب تک خفا تھی۔ بے ہنگم و بے صورت ٹائلیں جن کے خدوخال اندھیرے میں مزید بھیانک لگ رہے تھے، وہ انہی پر نظریں جمائے ایک لامتناہی سوچ میں ایسے ڈوبا ہوا تھا جیسے صدیوں کی مسافت طے کر رہا ہو۔ ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا، وہ انجانی منزل کی طرف سوچ کے گھوڑوں کو بھگا تا لے جا رہا تھا۔ آنکھیں جو نیند سے اگرچہ بوجھل ہو چکی تھیں اور جنہیں آرام کی اشد ضرورت تھی مگر وہ انہیں جبراً سوچوں کی ڈگر پر گامزن کیے ہوئے تھا۔

ایک عکس۔۔۔ جو مبہم بھی تھا اور واضح بھی۔ دل و دماغ کی دنیا میں رچ بس جانے والا، خوابوں کے بیج کو سیراب کرتا، ایک بیگانے وجود کا تعاقب کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ لہراتا ہوا آنچل، ایک ادا سے مسکراتا ہوا چہرہ اس کی ویران آنکھوں میں نمی کا باعث بن رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں ابان؟'' اس کا شوخ لہجہ آج بھی کسی قدر اس کے دل میں گھر کیا ہوا تھا۔ تبھی تو وہ اس خیال کو بھی حقیقت گمان کیے ہوئے تھا۔

''ہاں پوچھو۔۔'' اس دن وہ اس کے لئے گجرے لایا تھا۔ جن کی خوشبو کو وہ اپنے جسم میں اتارتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی

''کتنی محبت کرتے ہو تم مجھ سے؟'' ایک بے تکا سا سوال تھا، جسے سن کر وہ ایک لمحے کے ششدر رہ گیا۔ یک ٹک ایسے شکیلہ کو دیکھنے لگا جیسے اس نے میتھ کا ایسا سوال حل کرنے کو کہہ دیا ہو جس کو حل کرنے کا کوئی کوئی فارمولا نہ ہو۔ جبکہ وہ اپنے نظروں کو ابھی تک گجروں پر مرتکز کیے ہوئے تھی۔

''بتایا نہیں تم نے۔۔۔ کتنی محبت کرتے ہو تم؟'' بے دھیانی سے سوال دہرایا اور اپنا آنچل اس شوخ سے لہرایا کہ اس کا چہرہ ایک لمحے کو ڈھک گیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے نیچے کو سرکتا چلا گیا۔ اس کے آنچل کی خوشبو سانسوں کے ذریعے جسم میں اترنے لگی تھی جبکہ وہ اس سے بے خبر تھی۔

''اتنی محبت کے لفظوں میں اظہار نہیں ہو سکتا۔۔'' خوابیدہ لہجہ گویا ہوا تو اس نے عمیق نگاہوں سے حقیقت دیکھنا چاہی تھی۔ وہ بھی کھوئے کھوئے لہجے میں اس کی صورت تکتا جا رہا تھا جب اس نے ایک نیا انکشاف کیا تھا۔

''اس کا مطلب ہے تم میرے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو'' دیکھتے ہی دیکھتے وہ انتہائی قریب آ چکی تھی مگر خوابیدہ لہجہ ابھی تک اپنے محبوب کو تک رہا تھا

''کوئی شک ہے تو کچھ کہہ کر دیکھو۔۔'' محبت کا خمار ہر حد کو پار کر چکا تھا

''تو اپنی فیملی سے قطع تعلق اختیار کر لو۔۔۔ مجھے صرف ابان چاہیے، ابان کی فیملی نہیں۔۔'' یکدم ایک بم اس کے سر پر پھوڑا گیا

تھا۔ وہ ہچکولے کھاتا ہوا خواب محبت سے ہوش میں آیا تو سب کچھ دھندلا سا دکھائی دیا۔ وہ چاہت، وہ محبت جو خوش نما لبادے میں لپٹی اس کو بھلے لگ رہی تھی یک دم کسی تاریک اور اندھیر رات میں بھٹکے ہوئے اس مسافر کی طرح لگنے لگی جو بیاباں صحرا کے بیچ و بیچ آ کھڑا ہوا ہو اور منزل گمنام ہو۔

یہ کک کیا کہہ رہی ہو تم؟'' ہکلاتے ہوئے وہ دو قدم پیچھے کو کھسک گیا تھا

''وہی جو تم نے سنا۔۔'' وہ یک دم سپاٹ لہجہ اختیار کر گئی تھی مگر اس لہجے کی سفاکیت کہیں نہ کہیں آج بھی اس کمرے کی فضا میں گم تھی۔ وہ اس سیاہ رات میں ان لفظوں کی گونج محسوس کر سکتا تھا تبھی آنکھوں سے نہ چاہتے ہوئے بھی آنسو لڑھک گئے تھے۔ کروٹ بدلی تو دیواروں کو اپنے اوپر ہنستا ہوا پایا۔ آنکھیں موندیں تو اس کا چہرہ ایک بار پھر اپنے سامنے محسوس کیا۔

''کیوں شکیلہ کیوں؟ کیوں کیا تم نے یہ ایسا؟'' وہ گلوگیر لہجے میں دھیرے سے انجان وجود کو سامنے گمان کرتے ہوئے مخاطب ہوا تھا اور برجستہ اٹھ بیٹھا۔ شاید وہ اب سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ تبھی کمرے سے نکل کر اس در و دیوار کی قید سے باہر نکل آیا۔ مگر یادیں بھلا در و دیوار کی محتاج ہوا کرتی ہیں؟ باہر صحن میں بھی اس کی یادیں تعاقب کرتی رہیں اور وہ بے سدھ ان یادوں کا شکار ہوتا چلا گیا۔

سرد یادوں کی طرح موسم بھی اگرچہ سرد تھا مگر وہ ننگے پاؤں آگے بڑھتے ہوئے پانی کے نل کے پاس جا رہا تھا تبھی اسے سیڑھیوں کی طرف سے کسی شے کے گرنے کی آواز آئی۔ وہ پلٹا اور اپنے گمان سے نکل کر حال میں داخل ہوا۔

''اس وقت کون ہے وہاں؟'' اس نے سوچا تھا اور دھیمے قدموں کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ وہاں پاکیزہ تھی جو سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کے پاس ہی ایک گلاس گرا ہوا تھا۔ شاید سرد ہوا کے جھونکے کو برداشت نہ کر سکا۔

''پاکیزہ تم؟ ابھی تک جاگ رہی ہو؟'' وہ اسے رات کے اس پہر جاگتا دیکھ کر چونکا تھا اور آگے بڑھ کر اسے بغور دیکھا تو بے جان سی آنکھوں میں ہزاروں خوابوں کو بھٹکتا ہوا دیکھا۔ خواب بھی ایسے جن کا کوئی کنارہ نہیں تھا۔ بنا زمین و آسمان کے، ہوا میں معلق، روئی کے گالوں کی طرح کبھی یہاں تو کبھی وہاں اڑتے جا رہے تھے۔ جیسے ان کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ اُس نے اگرچہ نظریں چرا کر اپنی مضطر کیفیت کو چھپانا چاہا تھا لیکن وہ تو پہلی ہی نظر میں بھانپ چکا تھا۔ اس کی نگاہوں اور سوچ کے زاویوں کو منتشر کرنے کی خاطر اس نے گرے ہوئے گلاس کو اٹھایا اور ساتھ ہی سیڑھی پر رکھ کر در و دیوار کی سیاہی کو دیکھا تو ہر سو ہو کا عالم تھا۔ ہوا کی سرگوشی سماعت میں گونج رہی تھی۔

''اسلم کے بارے میں سوچ رہی ہو؟'' اس نے خود ہی سوال کیا تھا مگر وہ مسلسل اپنی نظریں چرا رہی تھی۔ دوپٹے کے گرے ہوئے پلو کو دوبارہ کندھے پر لپیٹا اور نفی میں گردن ہلائی۔

''نن نہیں۔۔'' آواز میں نمی کا ایک جہاں آباد تھا۔ اگرچہ موسم میں خنکی حد سے زیادہ تھی مگر لہجے ابھی تک آبدیدہ تھے

''تم فکر کیوں کرتی ہو؟ میں ہوں ناں۔۔'' اس کے جواب کی تردید کرتے ہوئے دو بول حوصلے کے بولے تو اس کے لبوں

پر جانے کیوں بے معنی، بے وزنی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو شاید اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ سکی

''آپ کا تو پہلے ہی ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔۔۔'' ماضی کی یادیں امڈتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ بھی نظریں چرا کر رہ گیا۔

''وہ احسان نہیں میرا فرض تھا۔۔'' مدہم سی آواز فضا میں گونجی تھی۔ پاکیزہ بھی اب چولہے کی طرف چل دی تھی۔ ہاتھ میں گلاس تھا۔ جسے وہ دائیں جانب رکھے سٹینڈ پر رکھ رہی تھی۔

''لیکن میرے لئے یہ فرض کسی احسان سے کم نہیں۔۔ اگر آپ بھابھی کے کہنے پر چلے بھی جاتے تو ہم کیا کر لیتے؟'' ایک پل کے لئے خاموشی انجان وجود کی طرح دونوں میں حائل ہو گئی۔ وہ سٹینڈ پر نظریں جمائے اپنی قسمت کی لکھی تحریر کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی جبکہ وہ مبہوت رات کے اندھیرے میں بننے والے عکس کو زمین پر کہیں تراش رہا تھا۔ جنہیں غم کے موسموں نے اپنی لپیٹ میں لے کر نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا۔

''ویسے بھائی بھابھی کا جواز بھی صحیح تھا۔ ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کو اپنے ہاتھوں سے سینتے، اسے سجائے، شوہر کی کمائی پر فقط اسی کا حق ہو۔ آخر وہ اسی ایک شخص کی خاطر تو اپنا سب کچھ چھوڑ کر آتی ہے۔ اب بھلا اس شخصیت میں بھی کوئی شریک ہو جائے تو اس لڑکی کی قربانیاں تو رائیگاں چلی گئی ناں۔۔!!'' وہ یکدم پلٹ کر گویا ہوئی تھی اور ابان کے ویران چہرے پر اپنے جواب تراشنے لگی جو آج بھی انہی لمحوں میں جی رہا تھا جن پر اب اس کا کوئی حق نہیں تھا۔ آنکھیں کسمسا سی گئیں۔ ابھرتی چمک میں نمی نے بھی اپنا حصہ ڈالا لیکن اس نے بڑی مہارت کے ساتھ اپنے گلوگیر لہجے کو ضبط کیا۔

''لیکن مرد محض ایک شوہر بن کر ہی تو زندگی نہیں گزار سکتا؟ اور بھی کئی رشتے ہیں جن کا اسے پاس رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی بیٹے کی صورت میں تو کبھی ایک بھائی کی صورت میں۔۔۔ فقط ایک فرض کی خاطر باقی فرائض کو پس پشت ڈالنا زندگی تو نہیں۔۔۔!!'' خوابیدہ لہجے میں اس نے حقیقت کو جتلانا چاہا تھا۔ شاید اسے یا پھر شاید اپنے آپ کو۔۔۔!!!

''ٹھیک کہا آپ نے مگر بھائی۔۔۔ کوئی بیچ کی راہ بھی تو نکالی جا سکتی تھی ناں؟'' اس نے پلٹ کر عمیق نگاہوں میں جھانکنا چاہا تو سوائے ویرانی کے کوئی ہمنوا نہ ملا۔ ایک طویل خاموشی۔۔۔ دل چیر دینے والی مگر پھر بھی اپنی جگہ پر قائم۔۔۔

''نکالی جا سکتی تھی اگر۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ جس کا مطلب وہ اچھے سے جانتی تھی۔ تاریک رات میں چمکتی آنکھیں ایک عجیب سی کشش سموئے ہوئے تھیں۔ وہ پلٹا اور برآمدے میں بچھی چارپائی کی طرف بڑھا تھا۔ پاکیزہ بھی کچھ لمحے یونہی کھڑی رہی اور پھر اس کے پاس گئی۔

''شاید ہماری قسمت میں ہی سمجھوتہ کرنا لکھا ہے۔'' اپنی قسمت کو بھی ابان سے تشبیہ دیتے ہوئے وہ کھوئے کھوئے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ جس پر وہ تڑپ اٹھا۔

''نہیں۔۔۔ایسا مت کہو، سمجھوتہ کرنا بہت مشکل ہے۔ جیتے جاگتے انسان کو کانٹوں سے بجے سیج پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ سمجھوتہ ایک ایسی شے ہے جس کا کوئی وجود تو نہیں مگر ایک وجود سے بڑھ کر ہے۔ جس کی راہیں خوشبوؤں سے خالی، خوشیوں سے دور، چاہتوں سے الگ تھلگ، ویران و بیابان جنگلوں کے گرد منڈلاتی ہیں۔ جس کے اطراف میں فقط کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ جن سے دامن چھڑانا انتہائی مشکل ہے۔ ان جھاڑیوں میں اگر ایک بار بھی دامن الجھ جائے تو چاک ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ آنسو بہتے چلے جاتے ہیں۔ درد بڑھتا چلا جاتا مگر اس سمجھوتے نامی شے کو کوئی ترس نہیں آتا۔ جو اگر ایک بار سمجھوتہ کر لے تو ساری عمر انہی سمجھوتوں میں گزر جاتی ہے اور آخر میں صرف خالی ہاتھ باقی رہ جاتے ہیں۔ فقط خالی ہاتھ۔۔۔'' خوابیدہ لہجے نے ایک نیا انکشاف کیا تھا۔ انکشاف بھی ایسا جو شاید حقیقت سے بالاتر ہی صحیح مگر اپنی حیثیت ضرور رکھتا تھا۔ پاکیزہ کی نگاہیں یک ٹک اندھیرے میں ابان پر جمی ہوئی تھیں۔ رشتوں کی محرومی، حدت میں اس قدر اضافے کا باعث بنی ہوئی تھی کہ سرد ہوائیں بھی تھر کے علاقے میں، دوپہر میں چلتی لو کے مترادف تھیں۔

''میں نہیں چاہتا کہ میری طرح تم بھی سمجھوتہ کرو۔۔۔ اس کڑوے زہر کو میں تمہاری زندگی کا حصہ کبھی نہیں بننے دونگا'' وہ ایک ولولے کے ساتھ۔۔۔ جو بظاہر کسی شکست خوردہ شخص کی طرح تھا۔۔۔ پلٹا تھا۔ پاکیزہ ان نگاہوں میں ہجر کے لمحات میں جھلسنے والے وجود کو دیکھ سکتی تھی، جس کا پور پور آج بھی ماضی میں جی رہا تھا۔

''اسلم نے نکاح کی تاریخ مانگی ہے ناں۔۔۔ تو پھر ٹھیک ہے۔ اگلے ہفتے ہی تمہارا نکاح ہوگا۔ اگلے ہفتے۔۔۔'' لہجہ آہستہ آہستہ دھیمہ ہوتا چلا گیا جبکہ وہ ابھی تک ان لفظوں پر غور کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ جو حسین تھا یا پھر قابل افسوس۔۔۔!! اس کا فیصلہ کرنا ابھی باقی تھا۔

''لیکن۔۔۔'' اس نے اپنا ہاتھ ابان کے شانوں تک بڑھایا تھا۔ فقط انگلی کے پور ہی مس کئے ہونگے کہ وہ ان کی پرواہ نہ کرتا ہوا آگے بڑھ دیا اور اس کا ہاتھ ایک وقت تک فضا میں معلق رہا۔ آنکھوں میں تیرتی نمی رات کے دھند لکے میں مزید گہری ہوتی جا رہی تھی۔ چلتی ہوائیں بھی ایک لمحے کو تھم گئیں۔

''کوئی سوال نہیں۔۔۔ کوئی جواب نہیں۔۔۔ میں کل امی سے کہہ دونگا کہ تمہارے نکاح کی تیاری کرنا شروع کر دے اور جو بن پاتا ہے بنائے۔۔۔'' ایک پل توقف کرنے کے بعد اپنی ادھوری بات مکمل کی

''شاید تمہاری تقدیر معمولی سی تدبیر سے بدلی جا سکے؟'' یہ کہتے ہی وہ اپنے کمرے کی طرف واپس چل دیا۔ جبکہ وہ ہونقوں اس کو جاتا دیکھتی رہی۔ ہوا میں معلق ہاتھ بھی اب ہوا کے پروں پر سوار نیچے آ رہا تھا۔ بھیگی پلکیں بھی اب آنسو کے قطرے کو جنم دے چکی تھیں جو اب بہنے کا جواز ڈھونڈ رہا تھا لیکن جواز تو ہزاروں تھے، پھر کیا بات تھی جو اس آنسو کو بہنے سے روکے ہوئی تھی؟

☆......☆......☆

زندگی اپنے ڈگر پر آہستہ آہستہ واپس آ رہی تھی۔ اگرچہ وہ شوخ پن کھو چکا تھا مگر تسلسل ایک بار پھر ابھرنے کو تیار تھا مگر اس بار کچھ نیا تھا۔ کچھ تو الگ تھا۔ پہلے سے بالکل الگ مگر اس نئے پن میں ایک عجیب سی رعنائی تھی۔ ایک عجیب سی کشش تھی تبھی اس کے لبوں پر چھایا تاسف اب دھیرے دھیرے چھٹتا جا رہا تھا۔ پہلے کی سی انا نے دوبارہ جنم تو نہ لیا مگر وہی حوصلہ دھیرے دھیرے اجاگر ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے اب جبیں کے ساتھ کالج جانا بھی شروع کر دیا تھا۔ کالج کی اساتذہ بھی حاعفہ کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلی کو دیکھ کر حیراں تھیں۔ وہ کسی بھی زاویے سے پہلے کی سی حاعفہ نہیں لگ رہی تھی۔ سادہ سی ایک معمولی سی لڑکی۔۔۔ جن ہونٹوں پر ہمیشہ لپ لوز کا ایک جہاں آباد رہتا تھا وہاں اب خشکی چھائی ہوئی تھی۔ جن آنکھوں میں کاجل بسیرا کرتے تھے اب سرے نام کی بھی کوئی شے نہیں تھی۔ بڑھے ہوئے ناخن بھی اب کسی افسردہ و شکستہ درخت کی مانند خستہ حالی کا شکار تھے۔ بالوں کی کٹنگ بھی بے ہنگم سے تھی۔ یونیفارم میں اگرچہ کشش تھی مگر چہرے پر انتہائی سنجیدگی کا دور دورہ تھا۔ جو کوئی اسے دیکھتا ہمیشہ کی طرح دیکھتا ہی رہ جاتا مگر اس بار ان نگاہوں میں رشک کی بجائے افسوس کے جذبات ابھرتے تھے۔

آج بھی وہ کالج سے سیدھی اپنے کمرے کی طرف آ رہی تھی جب اریب اس کے راستے میں آ موجود ہوا۔ وہ اس وقت بالائی منزل کی راہداری میں تھی۔

”السلام علیکم!“ اریب کو دیکھتے ہی حاعفہ نے دعا سلام کا آغاز کیا۔ اریب نے بھی بنا چونکے جواب دیا تو وہ دھیرے سے سائیڈ سے کھسکتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ جبکہ اریب بھی اس کے تعاقب میں تھا۔

”کیسی ہو تم؟“ کی چین کو دائیں ہاتھ کی انگلی میں گھماتے ہوئے وہ لاپرواہ سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہاف بازو ٹی شرٹ پر بلیو کلر کی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ جس کے بٹن کھلے تھے اور اس کے تیز تیز قدم اٹھانے پر ہوا میں لہرا رہے تھے۔

”مجھے کیا ہونا تھا؟ ٹھیک ہوں میں۔۔“ ہمیشہ کی طرح اریب کے ساتھ بات کرتے ہوئے اس کے رویہ میں ترشی تھی۔ ایک پل کے لئے شکن کو پیشانی پر ابھارا مگر اگلے ہی لمحے وہ پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے صوفے پر اپنا ہینڈ بیگ رکھا۔

”لیکن لگتا تو نہیں ہے۔ تمہاری لکیریں بتا رہی ہیں تم آج بھی افسردہ ہو بس زندگی کی طرف واپس آنے کی کوشش کر رہی ہو۔“ یکدم اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پر وہ پلٹی اور ایک گہری نگاہ اس کے وجود پر ڈالتے ہوئے وارڈروب کی طرف بڑھ دی۔

”تو اس میں برا ہی کیا ہے؟ واپس آ رہی ہوں۔۔۔ کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟“ وہ اریب کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھی۔ جبیں سے دوستی کے بعد بھلا اس گھر کی خبریں کہاں راز رہ سکتی تھیں؟

”اچھی بات ہے۔۔“ وہ بنا پوچھے بیڈ پر دراز ہوا اور اثبات میں گردن ہلا دی

''لیکن انسان کو منافقانہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہئے۔۔''اس نے چھت پر نظریں جمائے ہوئے کہا تھا۔جس پر اس کے ہاتھ برجستہ ساکت ہو گئے۔وارڈ روب سے کیا نکالنا چاہ رہے تھے؟ لمحہ بھر میں بھول گئے۔آنکھیں جانے کس منزل پر مرکوز تھیں؟ کون سے مناظر کو اپنے سامنے سے گزار رہی تھیں؟ فی الحال وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔جب سے خدیجہ سے ملاقاتیں ہو رہی تھیں۔اس کا دل جانے کیوں ہر شے سے اچاٹ ہوتا جا رہا تھا۔کوئی شے بھی اس کو پہلے کی سی حسین نہیں لگتی تھی۔وہ خود بھی حیران تھی کہ ہر شے کو اپنی انا پر تولنے والی لڑکی آج کیسے ہر شے پر سمجھوتہ کر رہی ہے؟ دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر اپنے وجود سے باہر دیکھنے سے بھی اجتناب کرنے والی لڑکی ،آج کیسے اپنے وجود کو بھول کر ایک انجان منزل کی طرف چل پڑی تھی۔منزل بھی ایسی جس کی پہلی سیڑھی چڑھتے ہی اس کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔وہ خود نہیں جانتی تھی کیا اس راستے پر چل کر منزل مقدر بنے گی بھی یا نہیں۔۔مگر اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

''کیا ہوا کن خیالوں میں گم ہو؟'' چھت کے کنارے سے سرکتے ہوئے جیسے ہی نگاہیں حاعفہ پر گئیں تو اسے عمیق سوچوں میں ڈوبا ہوا پایا۔خیالوں کی دنیا کو جھٹکتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔۔جھوٹ بولنے کی کیوں کوشش کر رہی ہو؟'' وہ کب میں کو اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔اسے علم تک نہ ہوا تھا۔اس کو اپنے بالکل قریب دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے بوکھلا گئی تھی۔لمحے سے پہلے خود کو پیچھے کی طرف کھسکایا تو اریب نے بھی اس کی سوچوں کو پڑھ لیا۔

''ابھی بھی تم مجھے ناپسند کرتی ہو؟'' سنجیدہ لہجے میں اس نے استفسار کیا تھا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔۔۔'' جواب دینے کی بجائے اس نے بیچ کا راستہ اختیار کیا تھا۔چہرے پر ابھرنے والی شکنوں کو پڑھنا چاہا تو اس نے اپنی نگاہیں پھیر لیں،ہاتھوں میں موجود ڈریسز کو ہینگر سے نکالتے ہوئے مزید کہا

''مجھے کسی سے ملنے بھی جانا ہے۔۔۔سو پلیز ڈانٹ مائنڈ۔۔'' وہ ابھی تک نگاہیں ملانے سے اجتناب کر رہی تھی۔

''اچھا۔۔کس سے ملنے جانا ہے؟ میں لے کر چلا جاتا ہوں۔۔''اس نے بات کو ٹالتے ہوئے گفتگو کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔لبوں پر گہری مسکراہٹ کو نقش کرتے ہوئے اس نے حاعفہ کی طرف دیکھا جو فی الوقت اس کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

''تمہیں تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔۔میں چلی جاؤں گی۔۔''اس نے بنا کوئی تاثر دیئے جواب دیا تھا۔

''تکلیف۔۔۔!! اور وہ بھی مجھے؟'' وہ اپنے آپ پر تمسخرانہ ہنس دیا۔شاید بجھے ہوئے چہرے پر روشنی کی ایک کرن ابھارنا چاہی تھی جس میں وہ بری طرح ناکام ہوا تھا۔

''مجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا۔۔۔ہاں البتہ میں بہت سے لوگوں کے لئے تکلیف بنا ہوا ہوں۔۔'' ولولہ یک دم بجھتا دکھائی دیا اور ہانیہ کا تصور نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے دماغ میں ابھرا جسے جھٹکنے میں اس نے لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔وہ کسی بھی طور پر اس کے بارے میں

سوچنے کے حق میں نہ تھا۔

''لیکن۔۔'' اس نے ابھی بھی تکلف برتتے ہوئے کہا تھا۔ وقت نے اسے ایسا کرنا سکھا دیا تھا۔ جو کام ماں باپ نہیں سکھا سکتے، وہ وقت بہت اچھے سے سیکھا دیتا ہے اور اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔ تمہیں آج کے بعد جہاں بھی جانا ہو۔۔۔ غلام حاضر ہے۔۔'' وہ تقریباً آدھا جھک گیا تھا جس پر پہلی بار اس کے چہرے پر ہلکی سی کسک نے جنم لیا۔ اس کا مقصد پورا ہو گیا۔ دل کو قرار آ گیا۔ جب دل میں بسنے والے آنکھوں کے سامنے خوش دیکھائی دیں تو ایک حقیقی خوشی خود بخود آپ کے مقدر کا حصہ بن جاتی ہے۔ وہ بھی پلکیں جھپکتے ہوئے مسکرا دیا اور دروازے کی طرف بڑھ کر ایک گہری سانس لی۔

کمرے سے نکل جانے کے بعد وہ سیدھا گیراج کی طرف بڑھا تھا۔ جہاں سحر فاطمہ پہلے سے ہی اس کی منتظر تھیں۔

''کتنی دیر لگا دیتے ہو تم؟ تمہیں پتا بھی ہے میں کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی؟'' معمولی سی خفگی ان کے لہجے سے عیاں تھی مگر وہ سمجھنے سے قاصر تھا

''کیا ہوا ماما جان؟ کوئی کام تھا کیا؟'' وہ پر تجسس انداز میں گویا ہوا تھا

''اور کیا نہیں۔۔ تمہیں کل بھی کہا تھا کہ جیولر کے پاس جانا ہے۔ اور آج بھی صبح سے تم دیکھائی ہی نہیں دے رہے تھے۔ چلو اب یہ شاپنگ بیگ اٹھاؤ۔۔'' اپنی نشست سے کھڑے ہوتے ہوئے انہوں نے حکم صادر فرمایا تو اس کے چہرے پر شکن خود بخود ابھر آئے۔ کسمساتے ہوئے جانے وہ کیا کہتا جا رہا تھا۔ سحر فاطمہ دو قدم چل کر دوبارہ پلٹیں تو اسے وہیں شش و پنچ میں کھڑا پایا۔

''اب کن سوچوں میں گم ہو تم؟ جانا نہیں ہے کیا؟''

''ابھی جانا ضروری ہے کیا؟'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ چہرے کی شادابیاں بھی کھوئی کھوئی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اسے حاعفہ کے ساتھ کہیں جانے کا موقع ملا تھا اور وہ بھی اس سے چھنتا معلوم ہوا۔

''جی ہاں۔۔ بہت ضروری ہے۔ حسام کی منگنی کی تیاریاں نہیں کرنی کیا؟ چلو اب جلدی سے یہ سب سامان اٹھاؤ اور جلدی سے کار میں آؤ'' یہ کہتے ہی وہ آگے بڑھ دیں اور کار میں جا بیٹھیں۔ جبکہ وہ منہ بسوڑتا ہوا سامان اٹھانے لگا

''اب ماما جان کو کیسے منع کروں میں۔۔۔!!'' وہ منہ لٹکائے سوچ رہا تھا۔ ڈھیلے قدم کار کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اس نے سارا سامان پچھلی سیٹ پر رکھا اور نظر دوبارہ اندرونی دروازے کی طرف دوڑائی جو ابھی تک بند تھا۔ حاعفہ ابھی تک وہاں نہیں آئی تھی۔

''کیا ہوا اریب؟'' سحر فاطمہ نے ونڈ سکرین کو ناک کرتے ہوئے استفسار کیا تھا

''کک کچھ نہیں۔'' ہڑبڑاتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلا دیا

''تو پھر جلدی کرو۔۔دیر ہو رہی ہے۔'' سحر فاطمہ کے بار بار اصرار پر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا اور منہ لٹکائے ان کے ساتھ چل دیا۔

☆......☆......☆

خیالوں میں ہی اکثر بیٹھے بیٹھے

بسا لیتا ہوں اک دنیا سہانی

سو کر اٹھے اسے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔تبھی وہ ابھی تک ٹراوزر اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔دھیمے دھیمے قدموں کے ساتھ وہ کچن کی طرف بڑھا اور جمائی لیتے ہوئے اس نے ایک نظر میں ہی پورے فلیٹ کو ٹٹولا تھا۔ہر شے تقریباً بکھری پڑی تھی۔صوفے کے کشن زمین کے رحم و کرم پر تھے تو قالین بھی سمٹا ہوا تھا۔ٹیبل پر کافی کے خالی کپ ابھی تک ویسے ہی پڑے تھے۔بسکٹ کے ٹکڑے بھی ٹیبل سے صوفے تک ایک قطار بنائے ہوئے تھے۔ریموٹ بھی اپنی جگہ کا تعین کرنے میں ناکام دکھائی دے رہا تھا۔کھڑکیوں کے آگے پردے بھی بے ہنگم سے دکھائی دے رہے تھے۔سورج کی روشنی اگرچہ چھنتے ہوئے فلیٹ میں داخل تو ہو رہی تھی مگر آنکھوں کو چبھنے کی بجائے راحت کا سماں پیدا کر رہی تھی۔اس نے پلٹ کر دوبارہ نظروں کو کچن کی طرف مبذول کیا تو وہاں کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔رات کو سونے سے قبل اس نے نل تقریباً کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی جا رہی تھیں۔کافی کے دانے میں شیلف پر اپنا حصہ بنائے ہوئے تھے۔گویا پورے فلیٹ میں آخور کی بھرتی تھی۔وہ سیدھا وارڈ کی طرف بڑھا اور توتھ پیسٹ کو نکال کر دیکھا تو وہ بھی بالکل خالی ہو چکی تھی۔اس نے منہ بسوڑ کر اسے وہیں دے پھینکا۔شیلف کی خوبصورتی میں ایک اور چیز کا اضافہ ہو گیا۔وہ واپس پلٹا اور بیڈروم کی طرف بڑھا۔سستی اور کاہلی ابھی تک اس کے تعاقب میں تھی۔

''اب اتنے سارے سامان میں ٹوتھ پیسٹ کہاں سے تلاش کروں؟'' وہ کمرے میں آتے ہی دھڑام سے بیڈ پر جا گرا۔آنکھیں چھت پر جمائیں تو غنودگی بڑھ چڑھ کر اس پر ہلا بولنے لگی۔

''کامیش۔۔!! تم یہ سب ایسے ہی چھوڑ کر جاؤ گے؟'' اریب کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھیں

''اور کیا۔۔۔!! اب لاہور ہی تو جانا ہے وہ بھی صرف ایک ہفتے کے لئے۔۔۔اب ایسے میں چیزیں کیا سمیٹنی؟ آ کر بھی تو ان کا یہی حال ہونا ہے۔'' وہ شان بے نیازی کے ساتھ گویا ہوا تھا اور پلٹ کر واپس چیزوں کو بیگ میں تقریباً ٹھونس ہی رہا تھا۔جس پر وہ گردن جھٹک کر رہ گیا۔

''پڑھائی میں تو سست اور کاہل تو تھے ہی تم۔۔۔اب گھر داری کے معاملے بھی تم ایسے ہی ہو۔۔؟؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔میں تو سمجھا تھا کہ ہاسٹل یا فلیٹ میں رہنے والے سٹوڈنٹ زیادہ punctual اور obedient ہوتے ہیں لیکن تمہیں دیکھ کر تو لگتا ہے کہ۔۔۔'' وہ دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ گیا تھا۔جس پر اس نے جواب دینا اپنا فرض عین سمجھا تھا

"جی نہیں۔۔۔ یہ سب تمہاری غلط فہمی ہے جناب۔۔ ہاسٹل یا فلیٹ میں رہنے والے سٹوڈنٹ زیادہ کام چور، نکمے اور disobedient ہوتے ہیں۔۔" اس نے جیسے اریب کے من کی بات کہی تھی جس پر وہ مسکرا دیا تھا۔

"صحیح کہتے ہو تم اریب۔۔۔ کتنا نکما اور کام چور ہوں میں۔۔" سرد آہ بھرتے ہوئے اب اس نے اثبات میں گردن ہلائی تھی مگر مجال ہے کہ اثر اب بھی قبول کیا ہو۔۔۔!!! اس وقت بھی وہ دونوں بازوؤں کو سینے پر حمائل کئے چھت کو بغور گھورے جا رہا تھا اور ایسا شاید وہ اب سارا دن کرتا رہتا اگر موبائل کی رنگ نہ سنائی دیتی۔

"اس وقت کس نے یاد کر لیا مجھے؟" وہ حیرت و تجسس کے ملے جلے تاثر لیے اٹھ بیٹھا اور بیڈ کے سامنے رکھے صوفے پر کپڑوں کے ڈھیر کی طرف دیکھا۔ جہاں سے مسلسل موبائل کے بجنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"اُفف۔۔۔ اب اس ڈھیر میں موبائل ڈھونڈوں۔۔" ایک بار پھر وہ دھڑام سے لیٹ گیا اور موبائل کو ایک لمحے کے لئے اگنار کر دیا لیکن جب دوبارہ رنگ ہوئی تو مجبوراً اسے اٹھنا پڑا اور اس ڈھیر میں سے اپنے موبائل کو نکالنا پڑا جو شاید اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ کپڑوں کے ڈھیر سے نکلتے ہی موبائل نے بھی جیسے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"ہانیہ۔۔؟؟" سکرین پر ہانیہ عمر دراز کا نام دیکھ کر اس کا بجھا ہوا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ ایک سیکنڈ بھی ضائع کیے بغیر اس نے فون ریسیو کیا۔

"ہیلو ہانیہ۔۔ تم؟ کیسی ہو؟ اچانک سے مجھے کیسے یاد کر لیا؟" خوشی میں اس نے ایک ساتھ ہی کئی سوال داغے تھے اور سستی کا عالم تو دیکھو، واپس بیڈ پر جانے کی بجائے وہ وہیں کپڑوں کے ڈھیر پر ہی براجمان ہو گیا تھا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟ اتنے دن ہو گئے کوئی خیر خبر ہی نہیں۔۔" اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا

"وہ میں دراصل گھر گیا ہوا تھا۔ رات ہی لوٹا ہوں۔۔" اس نے جواز بتایا

"اوہ۔ اس کا مطلب ہے جناب اپنی خوب آؤ بھگت کروا کر آئے ہیں" اس کا مزاج اب حد سے زیادہ دوستانہ تھا۔ جس سے وہ خوب حظ اٹھا رہا تھا۔

"جی بالکل۔۔ آخر پورے ایک سمیسٹر بعد گیا تھا واپس۔۔ تمہیں پتا ہے ہانیہ، موم تو مجھے واپس ہی نہیں آنے دے رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ ابھی چھٹیاں ختم ہونے میں دو ہفتے باقی ہیں۔ واپس جا کر کیا کرو گے؟ وہ تو میں ہی بضد رہا کہ مجھے وہاں کوئی کام ہے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑوا کر آیا ہوں۔۔" اس نے اس انداز میں کہا جیسے کسی جنگی محاذ سے زندہ بچ کر آیا ہو۔ جواباً ایک مدھم سا قہقہ موبائل کے سپیکر سے گونجا جسے سنتے ہی اس کے لبوں پر بھی ایک کسک ابھر آئی تھی۔

"اس میں جان چھڑوا کر آنے کی کیا بات ہے؟ رہ لیتے تم کچھ دن مزید وہاں۔۔" ہانیہ بھی جیسے اس کی باتوں سے حظ اٹھا رہی تھی

تبھی بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ پہلے وہ کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ بعد میں وارڈ روب کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک دراز سے ٹوتھ پیسٹ نکال کر کچن کی طرف بڑھنے لگا۔ شانوں سے فون لگائے وہ ساتھ ساتھ ٹوتھ پیسٹ بھی کرتا رہا اور باتیں بھی۔ بیس منٹ بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف دانت صاف کر چکا ہے بلکہ کچن میں بکھری اشیا کو بھی سمیٹ چکا ہے۔ جس پر اس نے حیرت سے کندھے اچکائے تھے۔

''لو جی۔۔!! تمہارے فون کرنے کا ایک فائدہ تو ہوا مجھے، میرا آدھا کام نمٹ گیا'' اس نے پر جوش انداز میں کہا تھا۔

''اچھا۔۔!! یہ تو اچھی بات ہے۔ ویسے جس کام کے لئے تمہیں فون کیا تھا وہ تو کیا بھی نہیں۔۔'' اس نے جیسے اپنے آپ کو کوستے ہوئے کہا تھا۔

''زہے نصیب۔۔ اب ہانیہ عمر دراز کو بھی اس نکمے انسان سے کام پڑنے لگ گیا'' اس حیرت و طنز کے ملے جلے تاثر سمیٹنے کی کوشش کی تھی۔ جس پر وہ ہنس دی۔

''کام تو نہیں ہے لیکن اگر چاہو تو تم یہاں آنے کے بعد کئی کام کر سکتے ہو؟'' اس نے ذو معنی لہجے میں کہا تھا۔ جس پر وہ چونکا اور ہاتھ میں موجود کافی کا مگ ذرا ہوا میں معلق رہنے دیا

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اگلے ہفتے میری آپی کی شادی ہے۔ جس میں تم نے ضرور شرکت کرنی ہے۔'' اس نے لفظ ضرور پر کافی دباؤ ڈالا تھا۔

''واؤ۔۔ بہت بہت مبارک ہو تمہیں۔۔ میں ضرور آؤں گا'' یہ کہتے ہی ایک لمحہ خاموشی چھائی رہی۔ پھر دھیرے سے اس نے اٹکتے ہوئے اگلے الفاظ ادا کئے تھے۔

''اور اگر ہو سکے۔۔۔ تو۔۔۔ اپنے۔۔ دوست۔۔ اریب کو بھی۔۔۔ ساتھ لے۔۔ آنا''

''ہاں۔۔ ہاں کیوں نہیں۔۔ لیکن اس کا میں پکا تو نہیں کہہ سکتا لیکن میں خود ضرور آؤں گا۔۔ یہ پکا ہے۔'' اس نے عجلت سے جواب دیا تھا۔ جس پر وہ فقط مسکرا کر رہ گئی تھی۔ اس کے بعد بھی کامیش کافی دیر تک ہانیہ سے باتیں کرتا رہا مگر وہ بے دلی کے ساتھ ہنوں، ہاں کرتی رہی۔

☆......☆......☆

حیرت سے عارفوں کو نہیں راہِ معرفت

حال اور کچھ ہے یاں انہوں کے حال و قال کا

الماری کی کتابیں نکال کر وہ حافظہ کو پکڑاتی جا رہی تھی اور وہ بغور ان کتابوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس نے

تقریباً سات دس کتابیں حاعفہ کو میز پر رکھنے کے لئے دی تھیں۔ جنہیں وہ خدیجہ کے کہنے پر بڑی احتیاط کے ساتھ میز پر رکھ رہی تھی۔

"آپی آپ کے پاس تمام کتابیں دین سے ریلیٹڈ ہیں کیا؟" وہ ایک ایک جلد کو بغور دیکھ رہی تھی۔ کوئی کتاب نماز کے احکام سے متعلق تھی تو کوئی روزے کی اہمیت کو اجاگر کر رہی تھی۔ کسی کتاب میں حلال و حرام کا ذکر تھا تو کسی کتاب پر ایمان کے بنیادی اجزا کا ٹائٹل جگ مگ کر رہا تھا۔

"ہاں بالکل۔۔۔ آخر یہی تو ہمارا سرمایہ ہے۔" وہ شائستہ لہجے میں گویا ہوئی اور پلٹ کر الماری کی طرف دیکھا۔ وہاں مزید کچھ کتابیں تھی۔ جنہیں اس نے وہیں رکھے رکھے صاف کیا۔ مٹی کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے ایک بار کھول کر دیکھا تو آنکھیں ایمان کے نور سے جگمگا اٹھیں۔ یہ نور اتنا تھا کہ حاعفہ کی آنکھیں بھی رشک کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ یک ٹک خدیجہ کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ جو نرم ہاتھوں سے ان کتابوں کو سینت رہی تھی۔ مٹی کی باریک سی تہہ کو کپڑے سے صاف کرتی جا رہی تھی۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔" اتنے میں بھاگتا ہوا وہاں عاطی آموجود ہوا تھا۔ حاعفہ نے پہلی بار عاطی کو دیکھا تھا۔ بالکل خدیجہ کا سا نور چہرے پر جگ مگ کر رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بکھری زلفیں، پیشانی پر چار چاند لگا رہی تھیں۔ رنگت سرخ و سفید تھا۔ عاطی کو دیکھتے ہی خدیجہ نے بھی اپنا کام چھوڑ دیا۔ آگے بڑھی اور جھک کر اس کے رخسار کو بوسہ دیا

"کتنی بار کہا ہے آپ کو۔۔ گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے سلام کرتے ہیں۔" احسن انداز میں اس کی سرزنش کی تو اس نے پشیمان گردن جھکائی اور دوبارہ سلام کیا تو حاعفہ کے لب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بیٹا! ان سے ملو، یہ ہیں حاعفہ آنٹی۔۔" خدیجہ نے تعارف کراتے ہوئے کہا تھا۔ حاعفہ کو دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا اور سلام کرنے کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا

"وعلیکم السلام! کیسے ہو بیٹا؟" زندگی میں پہلی بار وہ کسی بھی بچے سے ملنے کے لئے اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ خاک اگرچہ اس کے کپڑوں کو گرد آلود کر چکی تھی مگر اس کو پرواہ نہ تھی۔ وہ ہاتھ جو خوشبوؤں میں غسل کرتے تھے آج خاک نشین ہو رہے تھے۔ ماضی کی یادیں آنکھوں میں سمانے کے لئے آگے بڑھیں مگر وہ ان سے لڑنا سیکھ چکی تھی۔

"میں بہت اچھا ہوں۔ آپ امی کی بہن ہو کیا؟" اس نے بچگانہ انداز میں کہا تھا۔ جس کے جواب میں وہ بس مسکرا دی تھی اور پلٹ کر خدیجہ کی طرف دیکھا جو عاطی کے معصوم سوال پر مسکرا رہی تھی۔

"عاطی بیٹا! آپ کا سکول کیسا رہا آج؟" "ٹیسٹ اچھے سے ہو گیا" خدیجہ نے اس کی ٹائی کی ناٹ اتارتے ہوئے پوچھا تھا

"جی امی۔۔!! آپ کو پتا ہے مس نے آج سرپرائز ٹیسٹ لیا تھا۔ کسی بچے کو نہیں آتا مگر میں نے فل مارکس لئے۔۔" وہ ہاتھوں کے اشارے سے بھی بتا رہا تھا۔ خدیجہ کے ساتھ حاعفہ بھی عاطی کی باتوں پر مسکرا رہی تھی۔ اس کی باتیں جانے کیوں حاعفہ کے دل کو

بھانے لگی تھیں۔ بچے تو ہمیشہ اس کے چڑ رہی تھی لیکن عاطی کو دیکھ کر اس کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا تھا۔ چمکتی آنکھیں ماضی کو کوسنے لگیں کہ جانے کتنے حسین پل اس نے اپنے ہاتھوں سے گنوائے تھے۔

''چلو۔۔ پھر آپ جا کر چینج کرو، میں ابھی آپ کے لئے کھانا گرم کر کے لاتی ہوں۔'' کرسی پر رکھے آسمانی رنگ کے سوٹ کو عاطی کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر باہر کو چل دی۔ حاعفہ بھی خدیجہ کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی تھی۔ یہ کچن بھی زیادہ بڑا نہ تھا۔ بمشکل تین سے چار افراد کے کھڑا ہونے کی جگہ تھی لیکن ہر شے اپنی جگہ پر آراستہ کی گئی تھی۔ کوئی شے بکھری ہوئی نہ تھی۔ الماری سے سالن کا ٹفن نکال کر چولہا جلایا اور اسے گرم کرنے کے لئے رکھ دیا۔

''ویسے تم نے تو آج سے پہلے کچن کا چہرہ بھی نہیں دیکھا ہوگا۔۔'' خدیجہ نے اس کے چہرے کے بدلتے خدوخال سے اندازہ لگایا تھا جس پر وہ حیرت سے چونکی

''آپ کو کیسے معلوم؟'' اس نے محو حیرت سے استفسار کیا تھا

''بس دیکھ لو۔۔ پتا چل گیا۔'' ہلکے پھلکے انداز میں شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا اور پھر ہاٹ پاٹ سے روٹی نکال کر گرم کرنے لگی۔

''آپ باسی کھانا دیں گی؟ عاطی کو؟'' روٹی سالن کو گرم کرتا دیکھ کر حاعفہ سے سوال کیے بغیر رہا نہ گیا

''باسی کہاں ہے؟ ابھی تمہارے آنے سے پانچ منٹ پہلے تو بنا کر فارغ ہوئی تھی۔'' خدیجہ کے سوال پر ماضی کی ایک جھلک نے اس کے دل و دماغ پر ایک زبردست ضرب لگائی تھی۔

اس دن وہ کالج سے سیدھا اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب ایک سرونٹ کو اس نے ہاٹ کافی کا کہا تھا۔ اس بے چاری سے غلطی فقط اتنی ہوئی تھی کہ اس نے پانچ منٹ پہلے کی بنائی گئی کافی سرو کر دی۔ جس کا خمیازہ یہ نکلا کہ حاعفہ نے وہ ساری کافی اس کے چہرے پر انڈیل دی تھی۔

اپنی کی گئی نادانیاں اس کی آنکھوں کے سامنے عیاں تھی۔ چمکتی آنکھیں پشیماں دیکھائی دے رہی تھیں۔

''ویسے جب سے آئی ہو، میری مدد ہی کرتی جا رہی ہو۔ پہلے کتابیں ترتیب دینے میں مدد کی اور اب یہاں بھی۔۔ خیریت تو ہے ناں؟'' ہلکے پھلکے انداز میں اس نے بنا دیکھے سوال کیا تھا۔ گلوگیر لہجے میں وہ بس اثبات میں ہی سر ہلا سکی۔

''تو پھر آج سے شروع کر دیں؟'' چولہا بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا جس پر وہ چونکی

''کیا؟''

''بھئی دین۔۔۔ بھول گئی کیا؟'' حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا جس پر وہ پشیمان ہوئی۔ وہ واقعی بھول چکی

تھی۔ عاطی کے وہاں آنے پر اس نے کھانا دیا تو وہ کھانا لے کر چھت کی طرف چل دیا اور وہ دونوں کمرے میں واپس آ گئیں۔ ایک کتاب ہاتھ میں لینے کے بعد وہ دوبارہ حاعفہ سے مخاطب ہوئی

''تو سب سے پہلے کیا سیکھنا چاہو گی؟''

''نماز۔۔'' اس نے مختصر کہا تھا

''لیکن نماز سے پہلے تمہیں وضو سیکھنا ضروری ہے کیونکہ نماز کی کنجی ہی وضو ہے۔ اگر وضو پورے اہتمام کے ساتھ کیا جائے، کوئی کمی بیشی نہ رہے تو یقیناً نماز بھی بہترین ہو گی لیکن اگر وضو ہی ناقص رہا تو بھلا نماز کیسے سکون کا باعث بن سکتی ہے؟ جس طرح نماز جنت کی کنجی ہے بالکل اسی طرح نماز کی کنجی وضو ہے۔'' یہ کہہ کر وہ حاعفہ کا ہاتھ پکڑ کے باہر لے آئی۔

''ویسے بھی اب ظہر کا وقت شروع ہونے والا ہے۔ پہلے تم مجھے وضو کرتے ہوئے دیکھو، پھر ویسے ہی تم بھی عمل دہرانا۔'' یہ کہتے ہی اس نے حاعفہ کے سامنے وضو کیا تو حاعفہ ایک ایک شے کو بغور دیکھ رہی تھی۔ ہر عمل نوٹ کر رہی تھی۔ دیکھنے میں کتنا آسان مگر وہ کتنی غافل تھی۔ آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ زندگی کی کتنی بہاریں وہ اس نیک عمل سے محروم رہی۔

''تمہیں معلوم ہے حاعفہ، قیامت کے روز جب انسان اپنے بداعمالیوں کے سبب اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہو گا تو وضو کے دوران جن اعضاء کو دھویا جاتا ہے، وہ وضو کے سبب نور سے چمکیں گے۔'' کہنیوں تک ہاتھوں کو دھوتے ہوئے کہا تھا۔ پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ چہرے سے گرتی جا رہی تھیں۔ حاعفہ نے اندازہ لگایا کہ اسے قیامت کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ آج بھی وہ نور اس کے چہرے پر موجود تھا۔ جو اس دنیا میں بھی روشنی کا سبب بن رہا تھا۔ اسی نور کے سبب ہی تو وہ اندھیر نگر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس ایک نور نے کیسے اس کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔

''چلو اب تم بالکل ایسے ہی وضو کرو۔۔۔ میرے سامنے۔۔'' وضو مکمل کرتے ہی خدیجہ نے حاعفہ کو کہا تھا جس پر اس نے اپنی آستینیں فولڈ کیں اور بڑی مشکل کے ساتھ پاؤں کے بل بیٹھی تھی۔ زندگی میں پہلی بار وہ اس طرح بیٹھی تھی۔ اور پھر خدیجہ کی رہنمائی میں وہ وضو کے اعضاء کو دھوتی چلی گئی۔ ایک دو بار غلطی ہوئی مگر خدیجہ سے تصحیح کرائی۔ کمرے میں آنے کے بعد اس کا دل کچھ ہلکا محسوس ہوا۔ زندگی میں پہلی بار وضو کرنے کے بعد اسے جو سکون محسوس ہوا تھا، شاید ایسی کبھی فیلنگز اجاگر ہی نہ ہوئی تھیں۔ وہ کھوئی کھوئی فرش کو تکتی رہی۔ مژگان اگرچہ چمک رہی تھیں مگر ان کا سبب کیا تھا؟ پانی یا آنسو۔۔۔!!؟؟

''کیا ہوا کن سوچوں میں گم ہو؟'' حاعفہ کو عمیق سوچوں میں غرق دیکھ کر اس نے پوچھا تھا

''میں سوچ رہی تھی، میں کتنی غافل تھی ان سب باتوں سے، ان سب ارکان سے۔۔ جو دین نے فقط ہمارے لئے ذریعہ نجات بنائے ہیں۔'' آنکھیں برجستہ بہنا شروع ہو گئیں۔

''سچ کہا تم نے۔۔ یہ سب ہمارے لئے ذریعے نجات ہیں مگر ہم ہیں کہ نجات حاصل کرنا ہی نہیں چاہتے تبھی تو حی علی الفلاح پر بھی اپنے کام کاج چھوڑنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ جو جس کام میں مشغول ہے، اسی میں غرق ہے اور عنقریب یہی کام اسے ہمیشہ کے لئے غرق کردے گا کیونکہ اذان کے بعد نماز کے علاوہ کسی اور شے میں فلاح کیسے پنہاں ہو سکتی ہے؟'' خدیجہ کے الفاظ اس کے دل میں اترتے چلے گئے۔ وہ ساکت کھڑی اس کے ہلتے لبوں کو آنکھوں میں بسا رہی تھیں۔ بھیگی مژگان جانے کیوں آج اس کو بھلی محسوس ہو رہی تھیں۔ دل کے بدلتے ہوئے جذبات آج اس کو راحت بخش رہے تھے۔

''انسان کی فلاح صرف اور صرف نماز میں ہے۔۔'' یہ کہتے ہی خدیجہ نے جائے نماز کی طرف ہاتھ بڑھایا جو بیڈ کے سرہانے رکھا تھا۔ دل نے اس کی تائید کی۔

''سچ کہا۔۔'' زبان بھی اثبات میں متحرک ہوئی۔ چہرے پر ندامت اور خوشی کے ملے جلے تاثر تھے۔ ماضی بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے آ کر اس بات کا احساس دلا رہا تھا کہ وہ کتنی نادان تھی۔ کتنی نا سمجھ تھی۔ اپنے ہی غرور میں اپنے آپ کو تباہ کر رہی تھی۔ اس نے مشکور نگاہوں سے خدیجہ کی طرف دیکھا جو اس کے لئے رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئی تھی۔ جس نے اسے حقیقی و ظاہری رسوائی میں فرق کرنا سکھایا۔ اگرچہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ زیادہ بڑا نہیں تھا مگر زبان کی مٹھاس، نے اس سلسلے کو ایسا بنا دیا جو شاید اب صدیوں بھی ٹوٹ نہیں سکتا تھا۔

☆......☆......☆

بے نشاں ہے سفر رات ساری پڑی ہے مگر
آ رہی ہے صدا دم بہ دم صبر کر صبر کر

رات بھر ایک خاص بے چینی نے اس کو سونے نہ دیا۔ وال کلاک کے آٹھ بجاتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ سورج کی باریک کرنیں کھڑکی کے پردوں سے چھنتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ سارا کمرہ سورج کی نرم کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔ صاف آسمان سفید پردوں کی اوٹ سے ہی دیکھا جا سکتا تھا مگر اس کے چہرے پر ایک عمیق تاسف تھا۔ جمائی لیتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر وہ شادابی نہ تھی جو عموماً روز ہوتی تھی۔ گزرے دن کی بات آج بھی اسے کھٹک رہی تھی۔ کل کتنا سنہری موقع ملا تھا اسے حاعفہ کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا اور وہ بھی یہ ناں گزار سکا۔ مزید ستم یہ کہ وہ اپنی بات میں جھوٹا قرار پایا۔

''کیا سمجھتی ہوگی حاعفہ میرے بارے میں؟'' فی الفور اس کے ذہن میں خیال کھٹکا۔ سامنے وال کلاک پر نظر دوڑائی تو آٹھ بج کر دو منٹ ہوئے تھے۔

''ابھی جا کر اس سے معافی مانگوں یا پھر۔۔۔'' وہ ایک عجیب سی کشمکش میں تھا۔ دل جانے کیوں اس کے خیال سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ جب سے حاعفہ گھر میں آئی تب سے وہ اپنی ذات کو یکسر فراموش کر چکا تھا۔ بس دل و دماغ پر حاعفہ سوار رہتی۔ اس

نے لحاف کو پرے پھینکا اور بیڈ سے نیچے پاؤں رکھا مگر سوچیں تھی کہ اب بھی اس پر حاوی تھیں۔ کافی سوچ و بچار کے بعد وہ تقریباً ایک گھنٹے بعد نیچے ڈائننگ ٹیبل پر آیا تھا۔ سحر فاطمہ ماریہ کے ساتھ ناشتہ ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ جبیں اور حسام بھی وہاں موجود تھے۔ جہانزیب صاحب حسب معمول انگلش نیوز پیپر پڑھنے میں مصروف تھے۔ جبکہ حاعفہ ابھی تک غیر حاضر تھی۔

''کیا ہوا؟ آج ناشتہ نہیں کرنا کیا؟'' جبیں نے اس کا بازو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا تھا

''کیوں بھئی؟ آج کیا بات ہوگئی، جو ناشتے سے احتراز برتا جارہا ہے؟'' سحر فاطمہ نے ٹوسٹ حسام کے آگے سرو کیے تو وہ مسکرا کر چیئر کھسکاتے ہوئے وہاں براجمان ہوگیا۔

''ماما جان آپ تو جانتی ہیں جبیں کو۔۔'' کھویا کھویا لہجہ گویا ہوا تھا۔

''چلو شاباش۔۔ جلدی سے ناشتہ کرلو۔۔ پھر تم نے میرے ساتھ مارکیٹ بھی جانا ہے۔۔'' سحر فاطمہ نے بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر وہ تقریباً اچھل پڑا تھا۔ ہاتھ میں موجود فریش جوس کا گلاس بھی تقریباً گرتے گرتے بچا تھا

''آج پھر؟'' پیشانی کی شکن عیاں تھی

''آج پھر سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ منگنی کی تیاری اب ایک دن میں تو ہونے سے رہی۔۔ کل تو محض جیولر کے پاس گئے تھے۔ آج اس سے جیولری واپس لینی ہے پھر اس کے بعد بوتیک بھی جانا ہے۔ آخر منگنی کے لئے سوٹ بھی تو سیلکٹ کرنے ہیں اور پھر مہمانوں کے لئے گفٹس بھی تو خریدنے ہیں۔'' سحر فاطمہ نے جیسے ایک کے بعد ایک کام نکالنا شروع کردیا۔ جسے سنتے ہی اریب کے چہرے کے رنگ متغیر ہوتے چلے گئے۔ آزردگی کے تاثر اس کے چہرے پر عیاں تھی۔

''لیکن میں ہی کیوں؟'' اس نے منہ بگاڑ کر دھیرے سے کہا تھا۔

''وہ اس لئے کہ تمہارا سمسٹر اینڈ ہوچکا ہے جبکہ حسام اور جبیں کی پڑھائی ابھی جاری ہے۔'' سحر فاطمہ نے جواز بتایا تو جبیں نے بات کو مزید آگے بڑھایا

''اور ویسے بھی تم ہی تو کہتے تھے کہ ماما جان تمہیں شاپنگ پر نہیں لے کر جاتیں، آج جب لے کر جارہی ہیں تو تم نخرے کررہے ہو، تمہاری کچھ سمجھ نہیں آتی۔۔'' جبیں کے طنز پر حسام بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اریب غصے میں آنکھیں نکالے اس کو گھورنے لگا مگر اس نے ذرا پرواہ نہ کی اور ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے دوبارہ ناشتے میں مصروف ہوگئی۔

''اب کوئی بات نہیں۔۔ چپ چاپ ناشتہ کرو۔۔۔ سب'' جہانزیب نے سب کے جھگڑے کو ختم کروانا چاہا تو بے دلی کے ساتھ اریب بھی کھانے میں شریک ہوگیا۔ اس کی نظریں بار بار زینے کی جانب اٹھ رہی تھیں۔ شاید حاعفہ آجائے مگر وہ اپنے کمرے میں ہی رہی۔ انڈے پر چمچ گھماتے ہوئے بھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا

"سوچا تھا آج معافی مانگ لوں گا مگر۔۔۔!!" اس نے بے دلی اور افسوس کے ساتھ گردن جھٹک دی۔ سحر فاطمہ نے حسام کی پلیٹ میں انڈہ ڈالتے ہوئے اس کی طرف ایک نظر دیکھا مگر اگنار کرتے ہوئے دوبارہ کھانے میں مشغول ہوگئیں

کچھ دیر تک بے مقصد پلیٹ میں چمچ اور کانٹے کی جنگ لڑنے کے بعد وہ یک دم چیئر کو پیچھے کی طرف کھسکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب کی نظریں استفہامیہ اس کو تکنے لگیں۔

"میرا ناشتہ ہوگیا ہے۔ میں کمرے میں جا رہا ہوں فریش ہونے۔۔" جملے کی تکمیل تک وہ زینے پر تھا۔ سحر فاطمہ نے اس کے پورے وجود کو سرتاپا دیکھا تو انداز کچھ بدلا بدلا محسوس کیا۔

"یہ اریب کو اچانک کیا ہوا؟" وہ منہ میں بڑبڑائی تھی لیکن بعد میں گردن جھٹک کر دوبارہ ناشتے پر توجہ مبذول کی۔

ناشتے سے فراغت کے بعد اریب سحر فاطمہ کے ساتھ مارکیٹ چلا گیا۔ جہانزیب صاحب بھی آفس چلے گئے۔ حسام بھی معمول کے مطابق فائنل رپورٹ کی تیاری میں مصروف ہوگیا جبکہ جبیں کی آج چھٹی تھی۔ اس لئے آرام سے بہتر پلان بھلا کیا ہوسکتا تھا؟

سارا دن تھکا دینے والی شاپنگ کے بعد وہ افسردہ چہرے کے ساتھ گھر واپس آیا تھا۔ سحر فاطمہ اس کے مزاج کو نظر انداز کئے رہی۔ شاپنگ بیگ کو صوفے کے سامنے ٹیبل پر رکھتے ہی وہ سستانے کے لئے وہیں بیٹھ گئیں۔

"ماریہ۔۔۔!! ذرا پانی پلانا" آنکھیں بند کئے انہوں نے حکم صادر فرامایا تھا۔

"آج تو واقعی بہت تھکا دینے والا دن تھا کیوں اریب؟" انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہاں اریب موجود نہیں تھا۔ پلٹ کر زینے کی طرف نگاہ دوڑائی تو وہ آخری سٹیپ تھا اسی بنا پر وہ ان کی آواز نہ سن سکا تھا۔

"یہ آج اسے کیا ہوگیا؟" حیرت سے انہوں نے شانے اچکاتے تھے تبھی ماریہ ان کے لئے پانی کا گلاس لئے حاضر ہوگئی۔

"مجھے ابھی اس سے بات کرنی چاہئے۔ شاید وہ ابھی اپنے کمرے میں ہی ہو۔۔" وہ یہی سوچتا ہوا حاعفہ کے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا، دونوں ہاتھوں کو جینز میں ڈالے وہ تھوڑا تذبذب کا شکار دیکھائی دے رہا تھا۔ کمرے کے بالکل باہر پہنچ کر اس نے نگاہیں اٹھائیں تو دروازے کو مقفل پایا۔

"کہیں وہ آرام نہ کر رہی ہو۔۔" ایک گمان نے اس کے قدموں کو پیچھے کی طرف ہٹنے کے لئے مجبور کیا

"لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے اس نے ویسے ہی بند کیا ہو دروازہ۔۔۔" اگلے ہی لمحے گمان کا رخ بدلا۔ وہ مضطرب وہاں کھڑا سوچتا رہا۔ دائیں ہاتھ کو جینز سے نکال کر دروازے کی طرف بڑھا کر ناک کرنا چاہا لیکن پھر وہی گمان۔۔۔!!

"کہیں اس کو برا محسوس نہ ہو۔۔۔!!"

"کہیں وہ غلط مطلب نہ سمجھے۔۔۔!!"

''کہیں اس کے آرام میں مخل نہ ہو۔۔۔!!'' ایک ہی گمان انداز بدل بدل کر دماغ پر دستک دیتا رہا مگر جیت دل کی ہوئی۔ اضطرابی کیفیت اپنے آپ کو ضبط میں نہ رکھ سکی اور دھیرے سے اس کے دروازے پر ہاتھ مس ہو ہی گئے۔ اب اسے کچھ پشیمانی ہوئی۔ جبیں سرد موسم میں بھی پسینے کے قطروں سے شرابور ہوگئی۔ وہ بنا مژگان جھپکائے یک ٹک دروازے کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔ اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دی۔

''کہیں وہ آرام تو نہیں کر رہی۔۔؟؟'' اس نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا تو ساڑھے چار ہو رہے تھے۔

''لیکن اس وقت؟'' وہ تذبذب کا شکار تھا تبھی دھیرے سے دروازے کے چرچراہٹ کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو وہاں حاعفہ کھڑی تھی۔ اپنے چہرے کے گرد دوپٹے کو لپیٹے۔ ایسے جیسے کوئی دینی خاتون اپنے سر کو ڈھانپے رکھتی ہے۔ وہ اس وقت بالکل ویسی لگ رہی تھی۔ وہ کئی ثانیے مژگان جھپکانا تک بھول گیا تھا۔ اپنی نگاہوں کی حدت کو یک ٹک اس کے وجود کی طرف بڑھاتا رہا جبکہ وہ دروازہ کھولنے کے بعد واپس پلٹ چکی تھی۔ لبوں کو نظر نہ آنے والے انداز میں متحرک کیئے وہ جانے کس شے کا ورد کر رہی تھی؟ وہ اجازت طلب کیئے بغیر اندر چلا گیا۔

''مصروف تھی کیا؟'' اس نے سوال کیا مگر جواب ندارد۔ وہ بیڈ سے کچھ فاصلے پر بچھے جائے نماز کو اٹھا کر تہہ لگانے لگی۔

''نماز پڑھ رہی تھی؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا مگر خاموشی بدستور قائم رہی۔ اب وہ مزید سوال نہ کر سکا شاید وہ نماز کے بعد کوئی ورد کر رہی تھی۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ بیڈ پر بیٹھ گیا جبکہ وہ جائے نماز تہہ لگانے کے بعد صوفے پر بڑے احتیاط سے اسے رکھ چکی تھی۔ خوبصورت سے حجاب کو وہ اب کھولنے لگی اور دوبارہ پہلے کی سی حاعفہ میں تبدیل ہوگئی۔ دوپٹے کو صوفے پر رکھ دیا اور خود ڈریسنگ کے سامنے اپنے بالوں کو سیٹ کیا۔ وہ گردن کو ذرا سا خم دیئے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ پشت کو ڈھانپے لمبے سیاہ بال، دیکھنے میں ریشم معلوم ہوتے تھے۔

''تمہیں کوئی کام تھا؟'' یکدم وہ اپنے پرانے انداز میں واپس آ گئی۔ جس بے رخی سے وہ ہمیشہ سے بات کرتی آئی تھی۔ اسی انداز میں ایک بار پھر گویا ہوئی

''ہاں۔۔کام تو تھا'' وہ اپنی انگلیوں کو مروڑتا ہوا گویا ہوا۔

''ہاں کہو۔۔'' اس نے سپاٹ نگاہوں سے اس کے وجود کو دیکھا تو وہ ان نگاہوں میں اپنے لئے چاہت ڈھونڈتا رہ گیا۔ تاحد نگاہ بس بیگانہ پن، انجانہ پن، شناسائی نام کی کسی شے کا کوئی وجود نہیں۔ وہ الفت جس کی حدت وہ خود محسوس کرتا تھا۔ سامنے کھڑا وجود اس حدت سے محروم تھا یا پھر وہ بذات خود محسوس ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گھنی مژگان جنہیں کاجل کی ضرورت نہ تھی، بنا جھپکے اسی پر گھات لگائے ہوئے تھیں۔

''کل کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔۔'' وہ اس کی خود اعتمادی کے آگے جانے کیوں ڈھیر ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ نگاہوں کو جھکائے وہ بیڈ سے کھڑا ہوا اور دو قدم ڈریسنگ کی جانب چلا۔ جہاں سے وہ اب دو قدم پیچھے ہٹ چکی تھی۔ ایک بار پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی ایسے راستے پر چل رہا ہے جس پر چلنے سے کوئی منزل مقدر نہیں بنے گی۔ ایسے ہمراہی کی جستجو میں ہے جس کے نزدیک اس کی حیثیت ایک معمولی سے ذرے کے برابر بھی نہیں۔ جو اپنی ذات میں مدہوش ہے۔ جس کے نزدیک آج بھی اپنی انا قابل ترجیح ہے۔

''معذرت۔۔؟؟ مگر کس بات کی؟'' وہ اچھنبے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''وہ کل میں نے کہا تھا میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں باہر گیراج میں لیکن پھر ماما جان کے ساتھ چلا گیا۔۔'' وہ رک رک کر اپنا جملہ مکمل کر رہا تھا مگر اس ذات کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

''تو اس میں معذرت والی کون سی بات ہے؟'' اس بے رکھے انداز پر وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جواب اپنی زلفوں کو لہراتے ہوئے کندھے کے پیچھے دھکیل رہی تھی

''تمہیں برا نہیں لگا'' وہ یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا

''تمہیں ایسا لگتا ہے؟'' وہ ذو معنی انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔ نگاہوں کی تابنا کی ایسی تھی جس نے اسے نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔ اس کی عقل ایک لمحے کے لئے دنگ رہ گئی۔ کوئی جواب بن نہیں پا رہا تھا

''میں سمجھا کہ شاید۔۔'' وہ اب دروازے کی طرف کھسکنے لگا تھا۔ حاعفہ ہی وہ واحد وجود تھا جو اسے اکثر بے بس ولا جواب کر دیا کرتا تھا۔ آج بھی اس کی باتوں نے اس کو لاجواب کر دیا تھا۔ اس کی حاضر دماغی اس کے دل کو شکست سے دوچار کر دیتی اور وہ اپنی ہار قبول کر کے دھیرے سے کھسک جایا کرتا تھا۔

''تمہیں غلط سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور ویسے بھی تم تو اوروں کی لکیریں پڑھنے کے ماہر ہو۔۔ پھر بھی تم اس خوش فہمی میں ہو کہ۔۔'' وہ دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ گئی تھی۔ ہاں۔۔!! وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ تو لکیریں پڑھنے کا ماہر تھا۔ اس کی لکیریں بھی پڑھ کر سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ مگر ایک دل ہے، اسے کون سمجھائے؟ ایک آس کے ساتھ ہر بار اس کی طرف کھینچا چلا جاتا۔ ایک امید کے ساتھ کہ شاید لکیریں جھوٹ بول دیں۔ تقدیر دل کی کیفیات کو بدل دے مگر ہر بار اسے بری طرح شکست ہوتی۔ وہ دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے یک ٹک اس کی کیفیت کو دیکھ رہی تھی جو اس وقت بری طرح تناؤ کا شکار تھا۔

''صحیح کہا تم نے۔۔۔ لیکن'' اس نے آگے بڑھ کر بات کو بڑھانا چاہا تھا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا

''مجھے ابھی کام ہے، اس لئے باقی باتیں ہم کیا پھر کبھی کر سکتے ہیں؟'' اس کا انداز سفاکیت سے بھرپور تھا۔ اس کے پاس بھی اثبات میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"شکریہ۔۔" وہ یہ کہہ کر وارڈ روب کی طرف بڑھی اور وہ دھیمے قدموں کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔دل و دماغ کی جنگ جاری تھی۔تبھی وہ یکدم پلٹا

"اب جانا رہنے دو، جلد ہی اندھیرا ہو جائے گا۔صبح چلے جانا۔" یہ کہتے ہی وہ کمرے سے باہر چلا گیا جبکہ حیرت سے پلٹی اور ہونقوں اس کو دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔وہ اس کے ارادے کو بھانپ چکا تھا۔اس کے جانے کی خبر بھلا اس کو کیسے ہوئی؟ کہیں وہ اس کا تعاقب تو نہیں کرتا؟ کئی سوال اس کے دماغ میں دستک دے کر رہ گئے۔ہاتھ میں موجود ایک سیاہ چادر دوبارہ وارڈ روب میں رکھ دی گئی۔

☆......☆......☆

فرصت شوق بن گئی دیوار

اب کہیں بھاگنے کا رستہ نہیں

نکاح کی تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔بس ایک دن بعد نکاح تھا۔ہانیہ بھی گھر کے کاموں میں پیش پیش تھی۔زلیخا بی بی اگرچہ ایک ذمہ داری سے سبکدوش ہونے جا رہی تھی مگر ہانیہ کی ذمہ داری ابھی تک ان کے کندھوں پر ہی تھی۔

"کل ایک تو بوجھ اترے گا۔۔" انہوں نے دھیرے سے خود کلامی کی تھی۔وہ اس وقت چولہے کے پاس شام کا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔تبھی ہانیہ وہاں آموجود ہوئی تھی۔

"بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتی امی۔۔۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا جو ہمیشہ کی طرح اگرچہ ترش تھا مگر سچائی سمیٹے ہوئے تھے۔زلیخا بی بی نے اس کو دیکھتے ہی گردن جھٹکی اور پرانت کھینچ کر چاول چگنے لگی

"آج کل کے ترقی یافتہ معاشرے میں بھی حیرت ہوتی ہے مجھے کہ لوگ اپنی بیٹیوں کو بوجھ سمجھتے ہیں" وہ آئی تو کام کرنے کی نیت سے تھی مگر زلیخا بی بی کی کڑوی باتوں کو سن کر اس کا دل کھٹا ہو گیا اور وہ سامنے چارپائی پر براجمان ہو گئی۔جہاں کئی سوٹ بکھرے پڑے تھے۔وہ انہیں سخت ہاتھوں سے ٹٹولنے لگی

"اب پھر سے اپنا لیکچر شروع مت کر دینا۔ایسی پڑھائی کا کیا فائدہ جو ماں باپ کے آگے بولنے کی تمیز ہی ختم کر دے۔تجھ سے اچھے تو ابان اور پاکیزہ ہیں۔کم سے کم میرے آگے اتنی زبان درازی تو نہیں کرتے۔۔۔" سخت الفاظ میں جواب دیا۔تیز لہجے کو بھانپتے ہوئے پاکیزہ بھی اپنے کمرے سے باہر آ چکی تھی۔دونوں ہاتھوں پر لگی مہندی کو کپڑوں سے دور کیے سکھانے کی کوشش کر رہی تھی

"میرا سچ کہنا آپ زبان درازی میں شمار کرتی ہیں اور جو بھائی اور آپی آپ کے سامنے خاموش رہتے ہیں، ان کی خاموشی آپ حق تلفی میں شمار کیوں نہیں کرتیں؟" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

''ہانیہ خاموش۔۔'' جھڑکتے ہوئے پاکیزہ نے خاموش کروانا چاہا تھا اور اس کے بالکل سامنے آ موجود ہوئی۔ ہانیہ نے پاکیزہ کی سخت نگاہوں کی ذرا پرواہ نہ کی۔

''ہاں بالکل۔۔۔ میں تو جیسے دونوں کے حقوق کو غصب کئے بیٹھی ہوں۔ بس تم ہی رحمت کا فرشتہ ہو جو دونوں کے حق میں آواز بلند کرنے اس دنیا میں تشریف لے کر آئی ہو'' زلیخا بی بی کی تلخ باتیں ہمیشہ سے ہی ہانیہ کی مخالفت میں ہوتی تھیں۔ وہ ہمیشہ سے اس کی پڑھائی کے خلاف تھیں لیکن جب سپنے زندگی پر گرفت حاصل کر چکے ہوں تو راہ میں حائل ہر رکاوٹ خود بخود کچلی جاتی ہے۔ ان کی مذاحمت بھی کوئی کام نہ آسکی۔ ابان کے کہنے پر اس نے اپنے بل بوتے پر پڑھائی کی اجازت لی اور سکالرشپ کے ذریعے اپنے سپنوں کو ایک نئی ڈگر پر گامزن کیا۔

''امی۔۔۔ آپ تو لے دے کر میری پڑھائی کو درمیان میں لے آنا'' وہ تپ کر بولی تھی

''تو چھوڑ دے اس پڑھائی کو، نہیں لاؤں گی درمیان میں۔۔'' انہوں نے دوٹوک کہا تھا۔ جس پر آذرفشاں کی سی صورت اختیار کرگئی۔ یک دم کھڑی ہوئی۔

''یہ تو کبھی نہیں ہوسکتا۔ ہانیہ عمر دراز سے تعلیم کو کوئی الگ نہیں کرسکتا۔ کوئی بھی نہیں۔۔'' وہ مضم ارادوں کو ایک بار پھر مجتمع کرتے ہوئے بولی تھی۔ جس پر وہ فقط گردن ہی جھٹک سکی تھیں۔

''ہانیہ۔۔'' پاکیزہ نے ہانیہ کو روکنا چاہا تھا لیکن وہ آگے بڑھ گئی۔ اور دو دو قدم پھلانگتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی

''میں دیکھتی ہوں۔۔'' ایک پل کے لئے زلیخا بی بی کی طرف دیکھا پھر خود بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ دی۔

''اس کا کچھ نہیں ہوسکتا۔۔ پاکیزہ بھی تو اسی کی بہن ہے مگر مجال ہے جو کبھی اف تک بھی کہا ہو مگر اس کے تو نخرے ہی نرالے ہیں۔ بھاڑ میں جائے ایسی تعلیم جو ماں کا ادب ہی بھلا دے۔۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ کام کرنے لگی تھی

''یہ کیا بدتمیزی تھی ہانیہ۔۔۔!!! امی سے اس انداز میں بات کرتے ہیں کیا؟'' وہ ذرا سخت لہجے میں گویا ہوئی تھی جبکہ وہ پشت دکھائے کھڑی دیوار کو گھور رہی تھی۔ چہرے پر غصے کے تاثرعیاں تھے۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جو بالوں کو اپنے سنگ جھومنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے؟'' مہندی کو بچ بچاتے ہوئے اس نے دھیرے سے اس کے شانوں کو چھوا تھا۔ جس پر جھلاتے ہوئے پلٹی۔

''میں ایسی ہی ہوں۔۔ کوئی میرے سپنے کے بارے میں کچھ کہے، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا مگر ان سفاک نگاہوں کے پیچھے ایک معصوم سا چہرہ چھپا تھا۔

''بس اتنی سی بات۔۔'' وہ ذرا سمجھانے والے انداز میں گویا ہوئی

''دیکھو ہانیہ۔۔۔!! امی کے کہنے کا مقصد فقط اتنا تھا کہ تم اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ذرا گھر داری کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔ اب تو چلو میں ہوں، امی کا ہاتھ بٹانے کے لئے لیکن کل جب میں اپنے سسرال چلی جاؤں گی تو امی کا ہاتھ کون بٹائے گا؟ بیٹیاں تو ماؤں کا بازو ہوا کرتی ہیں۔ ہر کام میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتی ہیں۔ وہ تم سے بھی بس یہی چاہتی ہیں۔'' وہ شفقت بھرے انداز میں سمجھا رہی تھی مگر اس کے تیور تھے آسمان کو چھو رہے تھے۔ منہ بسوڑ کر گویا ہوئی

''تو میں پڑھ بھی تو اسی لئے رہی ہوں۔ میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ پڑھ لکھ کر ایک اچھی سی جاب کروں۔ پھر امی کو کوئی کام نہ کرنا پڑے۔ ایک اچھا سا گھر ہو، جینے کا ایک سٹینڈرڈ ہو۔ کھانے پینے کے لئے ہر شے کی فراوانی ہو۔۔'' اس کی مژگان اب چمکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ دل بھی قدرے نرم ہوتا دکھائی دیا تھا۔ بچپن سے دیکھتی آ رہی محرومی آنکھوں کے آگے ایک بار پھر محو رقص تھی۔ وہ اب دھیرے سے آگے بڑھی شاید نظریں چرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''ہم مڈل کلاس لڑکیاں بس یہی تو چاہتی ہیں کہ زندگی کو کسی قدر بہتر بنایا جاسکے۔۔۔ بس اسی لئے تو کر رہی ہوں محنت۔ بس ایک بار گولڈ میڈلسٹ بن جاؤں۔۔ پھر ہر جاب خود بخود میرے قدم چومے گی۔'' لہجے کی ترشی جذبات کے زیر اثر معلوم ہو رہی تھی۔ نمی مژگان کے کناروں پر جمع ہونا شروع ہو گئی۔

''لیکن بڑوں کا دل دکھا کر تو گولڈ میڈلسٹ نہیں بنا جاسکتا ناں؟'' اس کی ٹھوڑی کو اپنی طرف کرتے ہوئے کہا تھا

''لیکن مجھے گولڈ میڈلسٹ سے کم کچھ بھی نہیں بننا۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔ اگر میرے نام کے آگے گولڈ میڈلسٹ نہ لگا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔۔'' اشک بار آنکھوں نے یک دم بارش کی بوندوں کی طرح رم جھم برسنا شروع کر دیا۔ پاکیزہ نے اسے اپنے سینے سے لگایا تو دل کو کچھ قرار آیا تھا۔

''ہانیہ۔۔'' وہ اسے کبھی سمجھ نہ سکی تھی۔ ایک پل میں سنگ مرمر کی طرح سخت دل موم کی طرح بہنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے کچھ حوصلہ دیا مگر دل مضطر بھلا اتنی جلدی کہاں قرار پاتا ہے؟

''آپی، میرے جینے کا وجود، میرا مقصد حیات فقط گولڈ میڈلسٹ بننا ہے۔ میں لائف میں ہر مقام پر فرسٹ رہنا چاہتی ہوں اور اپنے اس خواب کو نہ تو میں ٹوٹنے کے لئے چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی ان خوابوں میں کسی کو شریک کر سکتی ہوں۔ جو حق میرا ہے وہ صرف میرا۔ کوئی اس میں میرا شریک نہیں۔۔'' گلوگیر لہجے میں ایک عجیب سی اضطرابی کیفیت تھی۔ ڈھکے چھپے الفاظ میں وہ ایک بار پھر اریب کا ذکر کر چکی تھی۔

☆......☆......☆

گرد فشاں ہوں دشت میں، سینہ زناں ہو شہر میں
تھی جو صبائے سمتِ دل، جانے کہاں چلی گئی

مہمان کافی جمع تھے۔ پورا لاؤنج مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نہ صرف رشتے دار بلکہ جہانزیب کے بزنس پارٹنر بھی وہاں موجود تھے۔ جن کا تعلق پاکستان کے ساتھ ساتھ انڈونیشیا کے سے بھی تھا۔ صبا کو حسام کے ساتھ بٹھایا گیا تھا۔ حسام سرمئی رنگ کی شیروانی جبکہ صبا اسی رنگ کے جوڑے میں ملبوس تھی۔ بالوں کا جوڑا دوپٹے کی اوٹ میں سیٹ کیا گیا تھا۔ نینوں میں لگا کاجل ان کی خوبصورتی میں اضافہ کرر ہا تھا۔ لانبی مژگان دیکھنے سے ہی رات کی تاریکی کا گمان ہوتا تھا۔ لبوں پر بجی دلفریب مسکراہٹ جو حسام کے دل کو بھی اپنے سحر میں جکڑے ہوئے تھی۔ سب کی نظریں عنقریب نکاح کے بندھن میں بندھنے والے اس حسین جوڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ اریب پہلے پہل تو جہانزیب کے ساتھ مہمانوں کے ساتھ دعا سلام کرتا رہا پھر اپنے کمرے کی طرف بڑھ دیا۔ وہ اکثر ایسی پارٹیوں سے اجتناب برتتا تھا۔ کچھ دیر اپنی حاضری لگانے کے بعد اپنے کمرے میں چل دیتا۔ آج بھی وہ یہی ریت نبھار ہا تھا۔ دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے اپنے قدم پیچھے کھسکا تا رہا۔ نیچے اگرچہ منگنی کی رسم ابھی ادا کی جانی تھی لیکن ابھی اس میں کچھ وقت تھا۔ اسی لئے وہ اس شور شرابے سے دور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ جبیں اور حاعفہ بھی نیچے ہال میں ہی موجود تھیں۔ سحر فاطمہ مستورات کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھیں۔

''یہ موقع اچھا ہے۔۔'' وہ دھیرے سے کھسکا اور زینے پر چڑھنے لگا۔ وہ آج آف وائیٹ شیروانی میں ملبوس تھا۔ جو اس کے رنگت پر بہت جچ رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنے روم میں تھا۔

''تھینک گاڈ۔۔۔!!'' وہ دفعتہً بیڈ پر دھڑام سے آ گرا تھا۔ ابھی اس نے ستانے کے لئے آنکھیں بند ہی کی تھیں کہ اس کے موبائل کی رنگ ہوئی۔

''اُفف۔۔!! میرے آرام سے جیسے سب کو دشمنی ہے۔ مجال ہے جو ایک پل بھی مجھے آرام کرنے دیا جائے'' وہ منہ بسورتے ہوئے بنا اٹھے اپنے ہاتھ سائیڈ ٹیبل پر مارنے لگا۔ ہاتھ کے تھپ تھپ کی آواز رنگ کے ساتھ مسلسل سنائی دیتی رہی۔

''یہ موبائل کہاں گیا؟'' کروٹ لیتے ہوئے وہ تھوڑا سا دائیں جانب اٹھا تو موبائل کو ٹیبل کے کنارے پر پایا۔ اس سے پہلے کہ وہ انگلی کے مس ہوتے ہی زمین بوس ہوتا وہ ایک جھماکے سے اٹھا اور موبائل کو اٹھایا۔ موبائل کی رنگ اب بند ہو چکی تھی۔

''بس مجھے اٹھانے کا شوق تھا۔'' موبائل کو ایسے گھورا جیسے ابھی کچا چبا جائے گا مگر بے جان اشیا بھی بھلا چبائی جاتی ہیں؟ تبھی پیچھے بیڈ پر دے پھینکا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو ایسے پھیلایا جیسے آفتاب لب بام کی مثل تھک چکا ہو۔ جو مسلسل صبح صادق سے رات گئے تک اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا ہو۔

''منگنی میں بھی ابھی آدھا گھنٹا بقایا ہے۔۔ اتنے کچھ دیر آرام ہی کر لیا جائے۔'' ابھی اس نے اپنے بازو سینے کے گرد لپیٹے ہی تھے کہ موبائل کی دوبارہ رنگ سماعت سے جا ٹکرائی۔ اس نے پلٹ کر موبائل کی جانب دیکھا تو اس کی لائیٹ بلنک کر رہی تھی

''کس کا فون ہے یہ؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا اور بنا نمبر دیکھے فون ریسیو کیا

”ہیلو۔۔اریب عالمگیر سپیکنگ۔۔“اس نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی اکتاہٹ اڑنچھو ہوگئی۔اس کے چہرے کا سکون اضطرابی کا موجب بننے والا تھا۔

”ہیلو۔۔کون ہیں آپ؟“اس نے دوبارہ سوال کیا تھا مگر بدستور خاموشی چھائی رہی۔اس کی چھٹی حس یک دم متحرک ہوئی اور وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔سانسوں میں تیزی آگئی۔

”میں نے پوچھا کون ہیں آپ؟کس سے بات کرنی ہے آپ کو؟“وہ سوال پر سوال پوچھا جارہا تھا مگر ہر سوال کا جواب سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا۔اس نے فی الفور موبائل کان سے ہٹا کر نمبر دیکھا تو اس کی سانسیں جیسے ساکت دیکھائی دیں۔اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔آنکھوں کے آگے ہر شے اوجھل ہو چکی تھی۔چمکتی سکرین پر فقط ایک نمبر ہی چمک رہا تھا۔وہ ہڑبڑاتے ہوئے کھڑا ہوا اور کپکپاتے ہاتھوں سے بمشکل فون کو تھامے ہوئے تھا۔اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پوری زمین گھوم رہی ہے اور وہ کسی چٹان کی طرح اپنے قدم زمین میں گاڑھے کھڑا ہے مگر ہوا اتنی تیز تھی کہ بہت جلد اس کے قدم اکھڑ جانے تھے اور اس کا پورا وجود اس تیز ہوا کے زیر اثر ریزہ ریزہ ہو جانا تھا۔اس کا دماغ بھی بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔فون دوبارہ کان کے لگا کر اس نے بولنے کی کوشش کی تھی مگر لب تھے کہ متحرک ہونے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

”آپ۔۔کو۔۔میرا۔۔نمبر۔۔۔کہاں۔۔۔سے ملا؟“اس نے بمشکل سوال داغا تھا۔اس بات کے قطع نظر کہ یہ وجود تو آج تک بولا ہی نہیں تھا۔ہر سوال کا جواب خاموشی سے دیا جاتا رہا تھا

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔۔!!بتایئے؟کہاں سے ملا آپ کو میرا نمبر؟“اس کا بی پی یکدم ہائی ہونا شروع ہوگیا۔تلخ آواز جانے کب لبوں سے نکلی،اسے خود علم نہ تھا۔

”سنتا نہیں آپ کو؟کہاں سے ملا آپ کو میرا نمبر؟اور کیا چاہتے ہیں آپ مجھ سے؟“وہ یکے بعد دیگرے سوال کر رہا تھا مگر خاموشی بدستور قائم تھی۔اسے ایسا لگا جیسے یہ خاموشی آج اس کی جان لے کر ہی دم لے گی۔کسی کمرے سے ہوا نکال دینے کے بعد خلا میں بھی اتنی خاموشی نہیں ہوتی جتنی اسے اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔کون کہتا ہے خاموشی نہیں بولتی۔خاموشی بولتی ہی نہیں،بلکہ چیختی ہے اور چیخ بھی ایسی جو سماعت کے پردے پھاڑ دے۔جس کی گونج کے آگے کوئی آواز سنائی نہ دے۔ایسا ہی کچھ اس کے ساتھ ہو رہا تھا۔وہ چیختے ہوئے اس اجنبی کا نام جاننے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ اجنبی تو ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنا وجود غالب رکھے ہوئے تھے۔

”گوٹو ہیل۔۔۔“وہ لب بھینچتا ہوا گویا ہوا تھا۔اور موبائل آف کر کے بیڈ پر دے پھینکا۔اس کا لب ولہجہ یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔آنکھوں کی چمک عجیب سی دیکھائی دے رہی تھی۔ایک عجیب سی وحشت،ایک عجیب سا سماں اس کی آنکھوں کے آگے رقص کر رہا تھا۔ایک کے بعد ایک ضرب اس کے ذہن پر لگ رہی تھی۔اسے اپنا سر پھٹتا دیکھائی دے رہا تھا۔دونوں ہاتھوں سے سر کو مضبوطی سے بھینچے وہ ہچکولے

کھاتا ہوا بیڈ پر جا گرا تھا۔

"خدایا۔۔۔!!" وہ درد سے کراہا تھا مگر اس درد کو کوئی سننے والا نہ تھا۔ سانسوں کی روانی میں تیزی یکدم سست روی میں تبدیل ہوگئی۔ آنکھوں کے آگے چمکتا ہوا نمبر یکدم غائب ہوتا دیکھائی دیا تو اس کے دل و دماغ کی حس روشن ہوگئی۔ وہ اگلے ہی لمحے ایک جست لگاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"وہ نمبر۔۔۔ ہاں وہ نمبر۔۔۔ ریسیونگ لسٹ میں ہوگا۔۔" درد اگرچہ برداشت سے باہر تھا لیکن ایک امید کی کرن نے اس کے بجھے چہرے پر روشنی بکھیر دی۔ اس نے پلٹ کر موبائل اٹھایا اور لاک اوپن کرنے کے بعد ریسیونگ لسٹ نکالی۔

"وہ نمبر۔۔" جلدی جلدی میں اس نے نمبر تو نکال لیا مگر کہتے ہیں ناں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ آنکھوں کے آگے جانے کیسا اندھیرا چھایا۔ نمبر کے ساتھ ہی اس نے ڈیلیٹ کا آپشن بھی غلطی سے پریس کر دیا۔ سکرول کو کافی بار اوپر نیچے کیا مگر مطلوبہ نمبر نگاہوں کے سامنے نہ آیا۔ آتا بھی تو کیسے وہ تو ہسٹری سے مکمل طور پر ڈیلیٹ ہو چکا تھا۔ تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ چہرے پر چھایا تاسف حقیقت میں تبدیل ہوگیا۔ بائیں ہاتھ کی مٹھی مضبوطی سے بھینچتے ہوئے اس نے موبائل کو مضبوطی سے بیڈ پر پٹخ دیا۔

"اتنی بڑی غلطی میں کیسے کر سکتا ہوں؟" وہ پشیمان تھا مگر وقت ہاتھ سے گزر چکا تھا۔ ایک بار پھر وہ شکست خوردہ شخص کی مانند دونوں ہاتھوں میں اپنا سر لئے بیڈ پر دھڑام سے بیٹھا تھا۔ دماغ سوجھ بوجھ کی صلاحیت فی الوقت کھو چکا تھا۔ رہ رہ کر اس کے ذہن کی سوئی نمبر پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"اتنا سنہرا موقع میں کیسے ضائع کر سکتا ہوں؟ کیسے؟ اتنی مشکل سے تو وہ نمبر میرے پاس آیا تھا اور میں نے خود۔۔۔ اپنے ہاتھوں سے۔۔" اس نے اپنے ہاتھوں کو نگاہوں کے سامنے کیا تو ایک حقارت دل میں خود بخود جنم لینے لگی۔

"اہوں۔۔" اس نے کراہتے ہوئے دونوں ہاتھ بیڈ پر رکھے اور گردن کو خم دیتے ہوئے جتنا نیم دراز ہو سکتا تھا، وہ ہوا۔

ہر طرف سے ایک سناٹا اس کی اور خود بخود بڑھنے لگا تھا۔ آنکھیں بظاہر روشن تھیں مگر وہ فی الوقت رات کے ایسے حصے میں کھڑا تھا جہاں سے ہر طرف اندھیرا اس کی اور امڈتا چلا آ رہا تھا۔ دائیں سے بائیں، اوپر سے نیچے، آگے سے پیچھے تک ہر سو اندھیرے کا راج تھا۔ روشنی کی کوئی امید، کوئی آس بظاہر آنکھوں سے اوجھل تھی۔ درد سے ہلکان مژگان بند ہوتی جا رہی تھیں۔ دل کی دھڑکن میں بھی نمایاں کمی تھی۔ دھک دھک کی آواز اتنی دھمی تھی کہ کوئی بچہ بھی با آسانی اس کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ سانسیں تو تھی ہی برائے نام۔ ایسے میں اسے دور کہیں سے ایک تھاپ سنائی دی۔ ایک دستک۔۔۔ جو امید کی ہوتی ہے۔ کسی اندھے کنویں سے نکلنے کے لئے جیسے کوئی مسیحا پکارتا ہے بالکل ویسی آواز مگر وجود ناشناسا، اوجھل اور مبہم سا۔ اس نے بمشکل گردن اٹھا کر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک بار پھر کمرے میں ہی پایا مگر دستک

بدستور جاری تھی۔ سماعت کے دروازے بند ہوتے دیکھائی دے رہے تھے۔ آواز محض دستک سے ہونے والی تھرتھراہٹ سے محسوس کی جا سکتی تھی۔ وہ بغور دروازے کو دیکھتا رہا۔

''اریب۔۔!! تم ٹھیک ہو؟'' وہی آواز جو وہ ہمیشہ سے سنانا چاہتا تھا۔ جس آواز میں وہ اپنے لئے فکر دیکھنا چاہتا تھا، آج وہی پرفسوں آواز اس سے مخاطب تھی مگر اس پر اس وقت ہر آواز گراں تھی۔ ماؤف دماغ کچھ بھی سننے کے حق میں نہ تھا۔ اس نے گھور کر دروازے کی طرف دیکھا جیسے ابھی اپنی نگاہوں کی حدت سے اسے جلا کر خاک کر دے گا۔ پیشانی پر ایسے شکن جیسے وہ ان شکنوں کا مطلب سمجھ کر تھرتھرانا بند کر دیں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا

''اریب۔۔!! تمہارے دوست کامیش کا فون ہے، ہولڈ پر لگا ہے۔'' یہ کہتے ہی ماخذ دور جاتا محسوس ہوا۔ قدموں کی چاپ دھیرے دھیرے معدوم ہو گئی مگر اس کی نگاہیں ابھی تک شعلہ جنوں تھیں۔ جانے کیوں اس بلینک کال کے بعد اس کا رویہ بدل جایا کرتا تھا۔ اتنی شائستہ شخصیت کے حامل لڑکے میں بھی ایک عجیب سی وحشت جنم لے لیتی۔ نفسیات انسانی ایک لمحہ بھر میں ایسا پلٹا کھاتی ہے؟ کوئی دیکھ کر نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی ہنس مکھ اریب عالمگیر ہے۔

''اریب۔۔!! تمہارے دوست کامیش کا فون ہے، ہولڈ پر لگا ہے۔'' کچھ وقت کے بعد ذہن پر دوبارہ ضرب لگی تو وہ ہوش میں آنے لگا۔

''کامیش۔۔۔'' وہ آناً فاناً موبائل کی طرف لپکا۔ وہاں بھی کئی مس کالز تھیں۔ اس نے حیرت سے سکرین کو دیکھا۔ اس کا دماغ واقعی کچھ لمحوں کے لئے ماؤف ہو چکا تھا تبھی مس کالز نہ سن سکا۔

''ہیلو کامیش۔۔۔ آج بھی مجھے وہی بلینک کال آئی تھی لیکن کیا تمہیں معلوم ہے آج مجھے وہ کال گھر کے نمبر پر نہیں بلکہ میرے خود کے موبائل پر آئی۔ جانے کیسے اور کس طرح اسے معلوم ہوا کہ میرے پاس موبائل ہے اور اس وقت میں اکیلا ہوں۔ پلیز۔۔۔ کامیش۔۔۔ میری مدد کرو۔ میرے ذہن نے تو بالکل کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا کیا کروں کیا نہ کروں۔۔۔''فون کرتے ہی اس نے آپ بیتی سنانا شروع کر دی۔ کامیش بھی بنا کچھ کہے اس کی باتیں سنتا رہا۔ بنا یہ جواز جانے کہ وہ فون کیوں کر رہا تھا؟ جواب میں وہ بھی خاموش رہا۔

''اریب۔۔۔ ذرا حوصلہ رکھو۔۔۔ اور تسلی سے بتاؤ کہ آخر ہوا کیا ہے؟'' اس نے حوصلہ دیتے ہوئے پوچھا تھا تو اس نے بھی ایک گہری سانس لی۔ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی تک کا سفر طے کیا اور پھر پورا واقع اس کے سامنے رکھ دیا۔ یہ سننے کے بعد وہ بھی کچھ لمحوں کے لئے خاموشی اختیار کئے رہا۔

''پلیز۔۔۔ کامیش۔۔۔ اب تم تو خاموش نہ ہو، اس بلینک کال کی سبب مجھے خاموشی سے نفرت ہونے لگی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ خاموشی میری جان لے لے گی، میری سماعت کے راستے دل میں اتر کر دھڑکنوں کو ٹھہرا دے گی۔ ان آنکھوں کی بینائی کو چھین کر کسی اندھے

کنویں کے سپرد کردے گی مجھے۔۔۔" اس نے خوف وڈر سے بھرے لہجے میں کہا تھا جبکہ آنکھیں کسی نادیدہ وجود کو اپنے سامنے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں، جسے وقت نے نہ جانے کتنے پنوں میں لپیٹا ہوا تھا۔

"اریب۔۔ منفی سوچ کو اپنے ذہن سے نکال دو۔ انسان کو ہمیشہ مثبت پہلو کے بارے میں سوچنا چاہئے۔" وہ اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہہ رہا تھا مگر اس کا دل تو آخری حد تک بے چین تھا۔ قرار نام کی کسی شے کے وجود کا وہ فی الوقت قائل نہ تھا۔

"کیسے سوچوں مثبت۔۔ جب تمام راستے ہی منفی سوچ کو اجاگر کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ آخر کیا جرم ہے میرا جو اس کال کی وجہ سے میری نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔ آخر کیا بگاڑا ہے میں نے اس وجود کا جو وہ مجھے ایک پل بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ جب جب میں اس واقعے کو بھلا کر زندگی کی ڈگر پر واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ تب تب وہی خاموشی میری سماعت کا حصہ بن کر میرے پورے وجود کو ڈسنے لگتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خاموشی چاہتی ہی نہیں کہ میں اسے بھولوں۔۔۔ اسے فراموش کروں۔" وہ دوبارہ بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔ آنکھوں کی اضطرابی، چہرے کی بے چینی دیکھنے والے کی نظر سے پنہاں نہیں تھیں مگر بند کمرے میں بھلا کون اس کی ذاتِ بے قرار کی حالت کو بھانپ سکتا تھا؟

"اچھا اریب۔۔ تم پریشان مت ہو، میں کچھ کرتا ہوں۔ تم ذرا اپنے دماغ کو فریش کرو۔۔ میں کچھ سوچتا ہوں اس بارے میں۔۔" اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح تسلی بخش تھا۔

"ہاں یار۔۔ پلیز۔۔ اب تم ہی میری ہیلپ کرو۔۔ میں تو سوچ سوچ کر ہلکان ہو چکا ہوں۔۔" اس نے اپنے بائیں ہاتھ سے سر کو پکڑ کر ذرا سا دبایا۔ پیشانی پر شکن پہلے سے زیادہ عیاں ہو گئیں۔ وقت سبک رفتاری سے منزلیں طے کرتا رہا۔ باہر کا شور وغل اب اس کے لئے نہ ہونے کے برابر تھا۔ بھلا جب اندر طوفان برپا ہو تو باہر کی آوازیں کیا حیثیت رکھتی ہیں؟

"ایک منٹ اریب۔۔ ابھی ابھی تم نے کہا کہ اس نے فون سے پہلے کال کی تھی جو تم اٹینڈ نہ کر سکے۔۔" اس نے دفعتہً پر جوش انداز میں کہا تو اس نے بھی الجھے الجھے انداز میں زمین کی طرف دیکھا جہاں ایک نرم وملائم قالین بچھا تھا۔

"ہاں۔۔ میں نے کہا تھا۔۔" اس نے غیر یقینی لہجے میں اپنے الفاظ کی تصدیق کی تھی

"تو پھر تم اس نمبر کو مس کالز کی لسٹ میں دیکھو۔۔۔ لیکن یاد رہے اس بار کوئی جلدی نہیں، آہستہ آہستہ اور پرسکون انداز میں سمجھے کچھ۔۔" کامیش کے الفاظ جیسے امید کی کرن لے کر طلوع ہوئے تھے۔ چہرے پر چھائی یاسیت لحہ بھر میں دور ہوتی دیکھائی دی۔ شکنیں بھی اپنے انجام کو پہنچ چکی تھیں۔ آفتاب لب بام چہرے پر پھر سے شباب ابھرنے لگا تھا۔

"یار، یہ میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا پہلے؟" وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا تھا

"وہ اس لئے کہ تم نے بہت جلدی مچائی ہوئی تھی اور جلدی میں کوئی کام بھی صحیح نہیں ہوتا۔ چیز ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی

ہے اور ہمیں دیکھائی نہیں دیتی لیکن اگر ہم وہی کام پرسکون انداز میں کریں اور اضطرابی وعجلت کو خود پر حاوی نہ ہونے دیں تو ناممکن کام بھی ممکن ہو جاتا ہے۔"

"صحیح کہا تم نے کامیش۔۔۔میں ابھی دیکھتا ہوں۔۔"

"اور ہاں۔۔!!ذرا پرسکون انداز میں۔۔" کامیش کی تلقین پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ الجھا ہوا لہجہ دھیرے دھیرے خود بخود سلجھتا چلا گیا۔

"اچھا پھر میں تمہیں بعد میں فون کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور پھر بڑے ہی محتاط انداز میں اس نے فون کو پکڑ کر مس کال لسٹ اوپن کی کامیش کا نمبر سرفہرست تھا۔

"کامیش سے پہلے ہوگی وہ مس کال۔۔۔" اس نے مژگان جھپک کر دھیرے سے نمبر پر نگاہیں مرکوز کیں تو اس کی سانسیں جیسے پل بھر کے لئے ساکت ہو گئیں۔

"یہ نمبر۔۔" وہ غیر یقینی انداز میں خود سے گویا ہوا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی نمبر سے پہلے موجود کوڈ پر مرتکز ہو گئیں۔

"01۔۔کوڈ" وہ بڑبڑایا۔ آنکھوں کے آگے وہی منظر کسی فلم کی ریل کی طرح چلنے لگا جب اس نے سحر فاطمہ کو فون دیتے ہوئے کریڈل پر نگاہ دوڑائی تھی۔ وہاں بھی ایسا ہی کوڈ تھا۔

"یہ کوڈ۔۔۔ناممکن۔۔" اس کا دماغ ہچکولے کھانے لگا تھا۔ وہ غیر دانستہ طور پر بیڈ پر جا گرا۔ موبائل ہاتھوں کی گرفت سے آزاد ہو کر بیڈ پر جا گرا۔

"انڈونیشیا۔۔!! یہ بلینک کالز مجھے انڈونیشیا سے آتی ہیں؟" پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت کو بغور دیکھنے لگا، ایسا لگا جیسے چھت ابھی ٹوٹ کر اس کے سر پر آن گرے گی اور وہ اس ملبے تلے دب کر ہمیشہ اس راز کو اپنے سینے میں دفن کیے اس جہان فانی سے رخصت ہو جائے گا۔

"انڈونیشیا۔۔ میں کون ہو سکتا ہے یہ؟" ہر شے اسے اپنے گرد گھومتی دیکھائی دی۔ اس انجان شخصیت کو سوچ سوچ کر وہ بری طرح ہلکان کا شکار ہو چکا تھا۔ دونوں ہاتھوں کے درمیان سر کو اڑلیس کر وہ کئی ثانیے یونہی بیٹھا رہا۔

"بابا جان کا بزنس بھی تو انڈو میں ہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی میرے ذریعے بابا جان کو۔۔۔" یک دم ایک خیال اس کے خالی الذہن میں ابھرا لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود ہی تردید کر دی

"نہیں۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ بھلا اس طرح اسے کیا فائدہ؟ اور پھر اتنے سالوں سے بلینک کالز۔۔۔؟؟" ہر سوال فقط دو لفظوں کے آگے بے معنی ہو جاتا، بلینک کالز۔۔۔ بلینک کالز۔۔۔ بلینک کالز۔۔۔

☆......☆......☆

ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو وچشمِ یار
سر سے ہمارے تیغ کا سایہ نہ جائے گا

سیکنڈ سمیسٹر کی فیس سمٹ کروانے کے بعد کامیش اور اریب بینک سے واپس پارکنگ ایریا کی طرف جا رہے تھے۔ گفتگو کا موضوع وہی تھا۔

"پھر کس نتیجے پر پہنچے تم؟" کامیش نے پوچھا تھا

"نتیجہ۔۔۔ میں تو ابھی اس پہیلی کو صحیح طرح سے ہی سمجھ نہیں سکا۔۔ اور تم نتیجے کی بات کر رہے ہو۔۔!!" اس نے طنزیہ گردن جھٹکتے ہوئے دائیں جانب دیکھا تو کئی لڑکوں کو ایک لائن میں لگا ہوا پایا۔ جو آپس میں باتیں کرتے ہوئے بینک سے باہر فیس سمٹ کروانے میں مصروف تھے۔ صبح کے دس بج چکے تھے اور لائن کا یہ عالم تھا کہ آخری لڑکے کی باری آتے آتے شام کے تین بج جاتے۔ یہ حال تو فقط لڑکوں کی قطار کا تھا۔ لڑکیوں کا واللہ اعلم۔

"لیکن پھر بھی کوئی کڑی تو سلجھانے کی کوشش کی ہو گی تم نے۔۔ بھلا ایک ایسے ملک سے بلینک کال کا آنا جہاں تم نے ایک بار بھی قدم نہیں رکھا، میرے خیال سے کسی گہرے راز کو اپنے اندر پنہاں کیے ہوئے ہے۔" وہ مبہوت کسی شے کے سحر میں جکڑا دکھائی دے رہا تھا۔

"بس اسی راز کو سوچ سوچ کر میری ذہن کی دیواریں مفلوج ہو چکی ہے۔ تغافل کے ساحلوں سے سوچ کی لہریں ٹکرا کر ایسے واپس آ رہی ہیں جیسے وہ آوارہ ہوں، کھوج کا کوئی سرا ہاتھ نہیں لگتا۔ ہر بار ناکامی ہی مقدر بنتی ہے لیکن ایک امید کے ساتھ دوبارہ لہریں سمندر کی طرف دوڑی چلی جاتی ہیں کہ شاید اس بار کوئی الجھتی ڈوری سلجھتی دکھائی دے، شاید اس بار شہہ مقدر میں لکھی ہو۔ بس ایک ہی امید ہے لیکن تسلسل اپنے آپ کو برقرار رکھتا ہے۔" تغافل کی اندھیر وادیوں میں امید کی روشنی کو ڈھونڈتا ہوا وجود ناکام محسوس ہو رہا تھا۔ گردن میں ذرا سا خم دیئے وہ ماحول کو بصارت کا حصہ بنانے کی بجائے قدموں کی دھول میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ شاید رازوں میں الجھی کسی ڈور کو، یا پھر اس ڈور کو سلجھاتی کسی شے کو؟

"اس بات کا ذکر تم نے اپنی فیملی سے کیا؟" کچھ سوچنے کے بعد وہ یک دم گویا ہوا تھا اگرچہ اس کی نگاہوں کے سامنے کسی اور ہی وجود کا عکس تھا۔

"نہیں۔۔ میں انہیں یہ سب بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا۔" ہوا کے سنگ اس کی پیشانی پر بال جھوم رہے تھے مگر وہ اس سے بے خبر تھا۔ کامیش نے اردگرد دیکھا تو آنکھوں کو فرحت بخشنے والا سماں پایا لیکن اریب کی پریشانی اور دل میں ابھرنے والی ایک کسک کی وجہ سے اس کا دل اچاٹ سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بظاہر تو اریب کے ساتھ تھا لیکن دل۔۔ وہ تو کہیں اور ہی الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کسی اور کے عکس کو اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ ایک لہراتا ہوا عکس جیسے ہی اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا تو اس کے لب بھی مسکرائے بغیر نہ رہ

سکے۔لبوں کو بھینچتے ہوئے وہ بنا آواز کے ہنس دیا۔

''انہیں یہ تو معلوم ہے کہ مجھے بلینک کالز آتی ہیں مگر کہاں سے؟ یہ ابھی میں نے نہیں بتایا اور شاید بتا بھی نہ سکوں۔۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں جانب دیکھا تو کامیش کو غائب پایا۔قدرے الجھے لہجے میں وہ پلٹا تو وہ گلاب کے پھول کے پاس کھڑا، پھولوں میں کسی چہرے کو تراش رہا تھا۔پیشانی کی شکن، چہرے کی مسکراہٹ اریب سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔وہ آگے بڑھنے کی بجائے اس کے پاس گیا اور کچھ دیر اس کو یونہی خیالوں کی دنیا میں کھویا دیکھتے رہنے کے بعد دھیرے سے اس کے شانوں کو چھوا

''اگر محبوب کی وادیوں سے باہر آنا مناسب سمجھیں تو گھر چلیں؟'' اس نے ذو معنی مسکراہٹ کو لبوں پر بکھیرا تھا جس پر وہ قدرے جھجکا اور چہرے پر چھائے شکن کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کی

''یہ۔۔تت تم کک کیا کہہ رہے ہو؟'' اپنا چہرہ پلٹ کر اریب کی مخالف سمت کیا۔

''آنکھیں پھیر لینے سے حقیقت بدل تو نہیں سکتی ناں؟ اور پھر اریب عالمگیر کے سامنے تو لب ہلانے کی بھی ضرورت نہیں۔''

اس نے اپنے بازو اس کے شانوں پر قدرے پھیلا لئے تھے اور کچھ لمحوں کے لئے اپنا غم سمیٹ کر کامیش کے دل میں جھانکنا بہتر سمجھا۔

''جسٹ شیٹ اپ یار! مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اریب کے بازو جھٹکتے ہوئے وہ دو قدم آگے بڑھا اور تیوری چڑھاتے ہوئے پلٹ کر بھی نہ دیکھا

''انجان وہ بنتے ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہوں لیکن جن کے سامنے حقیقت کھلی ہوئی کتاب کی مانند ہو تو پیشانی کی شکن اور آنکھوں کے دیکھنے کا انداز سب کچھ بتا دیتا ہے'' ایک بار پھر اس نے مسکراہٹ کے ساتھ اس کے بازوؤں کو پکڑ کر بھینچا تھا۔جس پر اس نے جھنجلاتے ہوئے احتجاج کرنا چاہا مگر اریب کے سامنے بھلا ایسا کہاں ممکن تھا؟ گھور کر ایک نظر اریب کی جانب دیکھا تو اس کی عمیق نگاہوں کے آگے وہ بے بس دکھائی دیا اور منہ چڑھا کر اس نے نظریں پھیر لیں

''اب اس حسینہ کا نام بتانا پسند کرو گے؟'' ابرو اچکاتے ہوئے اس نے کامیش کو انتہا کی حد تک زچ کرنے کی کوشش کی تھی

''اریب۔۔۔!!'' وہ ناک پھلا کر سخت لہجے میں گویا ہوا تو وہ ہنسے بغیر نہ رہ سکا جس پر اس نے ایک زوردار گھونسہ اس کے پیٹ میں رسید کیا۔

''کامیش۔۔۔'' وہ ہنستے ہوئے اس کا تمسخر اڑا رہا تھا جبکہ وہ بری طرح زچ ہو چکا تھا۔تیز قدموں کے ساتھ وہ پارکنگ ایریا کی طرف بڑھنے لگا

''کامیش میری بات تو سن۔۔۔'' وہ پیچھے سے آواز دیتا رہا مگر اس نے ایک نہ سنی۔

☆......☆......☆

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ بیڈ کی جانب مڑا تو اندر کا خالی پن ظاہر پر حاوی ہونے لگا۔ وہی سادہ سا لباس پہنے وہ سونے جا رہا تھا۔ پہلے تو کبھی کبھار دل کی باتیں وہ پاکیزہ سے کر لیا کرتا تھا لیکن اب تو اس کا بھی نکاح ہو چکا تھا۔ اس گھر میں ایک اور فرد کی کمی واقع ہو چکی تھی۔ ہر طرف سے خاموشیاں اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو انہیں بالکل خالی پایا۔ لکیریں بھی سیاہی میں ڈوبی ہوئی، مبہم سی غیر واضح تھیں۔

"کہتے ہیں لکیروں میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے۔ کتنی چاہت اُس انسان کے نصیب میں، کتنی دولت اس کا مقدر بنے گی، کتنا پیار وہ سمیٹے گا سب کچھ۔" ایک دن یونہی باتوں ہی باتوں میں شکیلہ نے اس کے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے کہا تھا۔ وہ بھی سردیوں کی راتیں تھیں، دونوں ایک ہی لحاف میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

"میں نہیں مانتا ان باتوں کو۔۔ سمجھی تم۔۔" اس نے اپنے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا تھا

"لیکن تو مانتی ہوں ناں۔۔ دیکھاؤ ذرا اپنا ہاتھ۔۔ دیکھاؤ ناں؟" وہ منہ بگاڑ کر اپنی بات منوا کر ہی دم لیتی تھی

"یہ لکیر تم دیکھ رہے ہو یہ شادی کی لکیر ہوتی ہے۔۔ میری دوست نے بتایا تھا مجھے۔" وہ ابان کے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کے نیچے والی لکیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہی تھی

"کہتے ہیں اس لکیر کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ جیون ساتھی کا ساتھ کہاں تک نصیب ہوگا" اس نے بڑے ہی مان سے کہا تھا

"اچھا۔ تو پھر ذرا بتاؤ کہ ہمارا ساتھ کہاں تک لکھا ہوا ہے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا تھا جس پر اس نے لکیر کو پڑھنے کی کوشش کی تو اسے کچھ پلے نہ پڑا

"یہ کیا تمہاری تو لکیریں ہی اتنی مبہم سی ہیں مجھے کچھ پتا ہی نہیں چل رہا۔۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ لکیریں واقعی غیر واضح تھیں۔

"اچھا تم مجھے بتاؤ میں دیکھتا ہوں آخر کیا ہے ان لکیروں کا راز؟" اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا تھا۔ جس پر اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ سمٹے ہوئے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئی تھی

"کہتے ہیں اگر اس لکیر کا انجام کانٹے پر ہو تو میاں بیوی کی نہیں بنتی اور انجام علیحدگی پر ہوتا ہے۔" آج بھی وہ آواز اس کی سماعت میں رقص کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو ذرا قریب کیا اور اس لکیر کو بڑے ہی دھیان سے دیکھا، وہاں کچھ دھول تھی، کچھ ماحول کی اور کچھ آنکھوں میں تیرتے پانی کی۔

اس نے بیڈ پر رکھے تولیے سے ہاتھوں کی دھول صاف کی جبکہ آنکھوں میں تیرتی نمی کو آستینوں سے پونچھا اور دوبارہ لکیر کے

انجام کو بغور دیکھا۔ایک مبہم سا کانٹا دو مخالف سمتوں میں جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

"کہتے ہیں اگر اس لکیر کا انجام کانٹے پر ہو تو میاں بیوی کی نہیں بنتی اور انجام علیحدگی پر ہوتا ہے۔" وہی آواز ایک بار پھر گونجی۔ اس نے ہاتھ کو مسلتے ہوئے دوبارہ دیکھا، شاید کوئی شکن غیر فطری طور پر ابھر چکا ہو۔ہاتھ میں آئے تناؤ کو ختم کر کے دوبارہ دیکھا مگر کانٹا ختم ہونے کی بجائے مزید واضح ہو گیا۔شاید ان کا بچھڑنا قسمت میں پہلے ہی لکھا جا چکا تھا۔بے جان ہاتھ خود بخود ہوا میں معلق ہو کر پستی کا سفر طے کرتے رہے اور وہ بے سود بیڈ جا بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

نعمتیں بانٹنے والے کا تھا احسان عظیم
میرے حصے میں حسینوں کی ثنا رکھ دی تھی

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے ہانیہ کا منتظر تھا۔کبھی یہاں تو کبھی وہاں، ٹہلتے ہوئے وہ بری طرح تھک چکا تھا۔آسمان پر چھائے سرمئی رنگ کے بادل اور ان بادلوں کے سنگ جھومتے موسمی پرندے اپنا اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ہوا کی اٹکھیلیاں درختوں کے پتوں کو بھی اپنے سنگ جھومنے پر مجبور کر رہی تھی۔پرسکون ماحول میں واقع یہ ماحول ٹریفک کی آلودگی سے پاک تھا تبھی دور دور تک کوئی شور سنائی نہیں دے رہا تھا۔کئی لوگ اس پرفسوں ماحول کو اپنی یادوں کی دنیا کا حصہ بنانے اس سہانی شام میں اپنے دلعزیز ساتھی کے ساتھ یہاں موجود تھے۔بچوں کی چہل پہل نے ماحول کو ایک الگ رنگ دے رکھا تھا۔وہ خود گہرے براؤن رنگ کی جینز اور شرٹ میں ملبوس اور اسی رنگ کی سن گلاسز پہنے ہوئے تھے۔جس کی اگرچہ آج خاطر خواہ ضرورت نہ تھی مگر شوخ پن بھلا موسم کا کہاں محتاج؟

"کافی دیر ہو گئی، وہ ابھی تک آئی نہیں؟" اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھتے ہوئے فکرمندانہ لہجے میں سوچا تھا۔

"ایک بار فون کر کے مجھے پوچھنا چاہئے اس سے۔کہیں۔۔!!" اپنے اندر پیدا ہونے والے شک کو دور کرنے کی خاطر اس نے جینز سے موبائل نکالا اور ابھی نمبر ڈائل کر کے کان کے لگایا ہی تھا کہ سامنے سے وہ وجود آتا دکھائی دیا۔ہاتھ خود بخود کان سے نیچے سرک گیا۔دوسرے ہاتھ کو سن گلاسز کی طرف بڑھایا تا کہ اس کے دیدار میں کوئی اور شے حائل نہ ہو۔ہلکے جامنی رنگ کا سوٹ پہنے وہ زلفوں کو کان کے پیچھے سمیٹتے ہوئے چلی آ رہی تھی۔نہ ہاتھوں میں لرزہ اور نہ ہی انگلیوں کا یوں مروڑنا، وہ کسی بھی طرح ایک عام لڑکی کی طرح ری ایکٹ نہیں کر رہی تھی۔ایک وقار تھا جو اس کے کردار سے چھلک رہا تھا۔

"امیزنگ۔۔" اس کے لب خود بخود متحرک ہوئے تھے۔وہ قدرت کا ایک لاجواب تحفہ تھا۔حسن میں اگرچہ اتنا خاص نہ تھا یہ چہرہ مگر ایک کشش اپنے اندر سینتے ہوئے تھا۔تبھی تو کامیش جیسا حسن پرست بھی اس کشش سے اپنے دامن کو نہ بچا سکا اور اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

''ہیلو کامیش۔۔'' وہ قریب آ کر گویا ہوئی تھی مگر اس کی نگاہیں تو ابھی تک اس کی سادہ مگر فریفتہ شخصیت پر فدا تھیں۔ بنا مژگان جھپکائے وہ یک ٹک اس کے دیدار کی چاشنی کو اپنے وجود کا حصہ بنائے جا رہا تھا۔ ایک دو بار آواز دینے پر بھی جب وہ خوابوں کی دنیا سے باہر نہ آیا تو مجبوراً اسے ایک ہلکا سا تھپڑ اس کے دائیں بازو پر مارنا پڑا۔ اس کے دیدار کی طرح لمس کا احساس بھی جان لیوا تھا۔ نگاہیں چہرے سے ہٹ کر بازو کے اس حصے کی طرف گئیں جہاں کچھ ثانیے پہلے اس نے چھوا تھا۔ ایک خوشبو کا غول وہاں سے پھوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ گہری سانس کے ذریعے اس احساس کو اپنے جسم کا حصہ بنایا تو اس کے پورے وجود میں جیسے ایک ہلچل مچ گئی۔ ایک عجیب سی کیفیت خون کے ساتھ پورے جسم میں گردش کرنے لگی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں'' اس کا کھویا کھویا انداز اس کو ایک تشویش میں مبتلا کر گیا تھا

''پر تپاک اور دلفریب شخصیت کو دیکھ کر بھلا کوئی کہاں ٹھیک رہ سکتا ہے؟'' اس کا لہجہ انتہا کا ذو معنی تھا۔ کوئی طنز نہیں، کوئی تمسخر نہیں۔ بس سنجیدگی کا پہلو نمایاں تھا

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ بے معنی باتوں کا مطلب سمجھ نہ سکی تو وہ ٹھٹکا اور اپنے حواس کو بحال کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی اور چہرے پر وہی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی

''آؤ۔۔۔بیٹھو۔۔۔'' اس نے دائیں ہاتھ کے اشارے سے ایک خالی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا سب سے الگ تھلگ سبزے کے عین درمیان میں سجائی گئی تھی۔ ایک خوشنما رنگ کی چھتری کسی مہربان سائباں کی طرح دونوں کرسیوں اور ٹیبل کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی۔

''گڈ چوائس۔۔'' وہ تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی اور ہوا کے سنگ اٹکھیلیاں کرتے بالوں کو ایک بار پھر کان کے پیچھے کیا اور آگے بڑھی۔ کامیش نے بیٹھنے کے لئے کرسی کو ذرا پیچھے کھسکایا تو وہ نگاہوں سے شکریہ کہتے ہوئے وہاں براجمان ہوگئی۔ خود تیزی کے ساتھ وہ اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہوا اور کہنیوں کے سہارے اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کے دیدار جام سے اپنی تشنگی بجھانے کا سامان پیدا کیا۔

''کیا ہوا ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سوال داغا تھا

''بس ویسے ہی۔۔۔ کیوں دیکھنا منع ہے کیا؟'' ذو معنی مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے کہا تھا

''منع تو نہیں ہے لیکن ایسے دیکھنے سے کوئی غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔۔'' اس نے بات کو جیسے آگے بڑھایا تھا۔ جس پر اس نے اپنا دائیاں ہاتھ بالوں پر پھیرا تو ہوا کے جھونکے کے ساتھ وہ مزید بکھر سے گئے تھے

''تو ہونے دو۔۔۔ اوروں سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟'' وہ دھیرے دھیرے باتوں کی حدود پار کر رہا تھا۔ کچھ لمحے خاموشی نے دونوں کو آگھیرا۔ ہانیہ نے پلٹ کر بائیں جانب دیکھا تو کئی لوگوں کو اس موسم سے لطف اندوز ہوتے دیکھا۔

"جگہ واقعی بہت اچھی ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اس جگہ پر پہلی بار آئی تھی۔ تبھی ایک ایک شے کو اپنی یاداشت میں نقش کر رہی تھی

"لیکن تم سے کم۔۔۔" اس کے حسن کا جلوہ ابھی تک اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔ جس پر اس نے چونک کر کامیش کی طرف دیکھا جو یک ٹک اس کے چہرے کی طرف ہی دیکھا جا رہا تھا۔ سرد ہواؤں میں بھی اس کی نگاہوں کی حدت اس کو کسی گرم سورج کی تپش کی مثل محسوس ہوئی۔ آنکھوں کے آگے لہراتی بالوں کی لٹوں کو اس نے کان کے پیچھے کیا۔

"لہراتی زلفوں کے ساتھ تمہارے حسن میں مزید نکھار آ جاتا ہے۔ انہیں اسی طرح بے لگام رہنے دو" لہجے میں انتہا کا خمار تھا جو اسے اب کھٹکنے لگا تھا۔ آنکھوں کو چراتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا تو ایک ویٹران کے پاس آتا دکھائی دیا۔

"جی سر! آپ کیا آرڈر کرنا پسند کریں گے؟" اس نے مینولسٹ کامیش اور ہانیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا

"جو میڈم کہیں۔۔ وہ لے آؤ۔۔" اس نے ہانیہ پر فیصلہ چھوڑا تو اس کی نگاہیں مزید جھک گئیں۔ پھیلتی آنکھیں مینو پر ادھر ادھر دوڑنے لگیں۔ الفاظ مبہم سے تھے مگر آواز میں خمار انتہا کا تھا۔

"کہیں اس نے یہاں آ کر کوئی غلطی تو نہیں کی۔۔" ایک آواز اندر سے سنائی دی۔

"اس کی بے تکلفی کہیں کامیش کے دل میں کسی قسم کے خیالات کو تو ہوا نہیں دے رہی؟" سوچ کا ایک بھنور اس کی طرف امڈتا چلا آ رہا تھا۔

"کہیں وہ اس کے بارے میں کچھ ایسا ویسا تو نہیں سوچتا؟" ایک پرزور لہر اس کے ذہن کے ساحل سے ٹکرائی تھی

"نہیں۔۔ یہ میں کیا سوچ رہی ہوں؟" لہر کے ٹکراتے ہی ایک شور برپا ہوا جو خیالات کو کرچی کرچی کر گیا۔ اپنے آپ کو جھٹکتے ہوئے اس نے منفی سوچوں سے فرار ہونا چاہا تھا۔

"کامیش۔۔ بھلا ایسے کیسے سوچ سکتا ہے؟ جبکہ ہم دونوں کی راہیں جدا ہیں۔ دونوں کا انداز زندگی جدا ہے اور سب سے بڑھ کر ہمارا مذہب۔۔" وہ خود ہی تانے بانے بنتی جا رہی تھی

"ہانیہ۔۔ ہانیہ۔۔" کامیش کے الفاظ کی گونج اس کو خیالات کی دنیا سے باہر لے آئی۔ وہ بے یقینی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"کن سوچوں میں گم ہو؟ آرڈر کرو۔۔" اس کا اندازِ گفتگو جانے کیسی چاشنی سمیٹے ہوئے تھا تبھی اس نے دو شیک آرڈر کیے۔ ویٹر آرڈر لینے کے بعد وہاں سے چلا گیا

"بس۔۔ شیک؟" حیرت سے اس نے کندھے اچکائے

''ہاں۔۔ مجھے زیادہ طلب ہی نہیں ہے اور ویسے بھی شادی کا کھانا ابھی ہضم ہی کہاں ہوا ہے؟'' اس نے باتوں کا رخ موڑنا چاہا تھا جو کافی حد تک کارآمد ثابت ہوا

''ہاں۔۔ یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔ تمہاری بہن کے نکاح میں جو کھانا تھا انتہائی لذیذ تھا۔ میں تو اپنی انگلیاں چاٹتا رہ گیا۔'' اس نے دائیں ہاتھ کی انگلیاں دیکھاتے ہوئے کہا تھا

''اچھا۔۔!! بھائی نے خاص آرڈر دے کر بنوایا تھا وہ۔۔'' اس نے مزید کہا

''سچ کہوں تو میں نے بہت سے مہنگے ہوٹلوں کا کھانا کھایا مگر وہ کھانا۔۔ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔۔ کبھی نہیں۔۔'' بات کرتے کرتے اس کے منہ میں پانی آ گیا تھا۔

''کھانا پسند کرنے کے لئے تمہارا شکریہ مگر ایک شکوہ مجھے تم سے رہے گا۔'' اس نے منہ بگاڑ کر کہا تو وہ حیرت سے ٹھٹک گیا۔ جھٹ اپنی توجہ اس کی طرف مبذول کی

''شکوہ؟ مگر کیسا شکوہ؟'' فکر و پریشانی کی شکنیں اس کی پیشانی پر ابھر آئی تھیں

''میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اریب کو بھی ساتھ لانا مگر تم۔۔'' اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی

''اوہ۔ تو یہ شکوہ ہے تمہیں۔۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی اور دونوں ہاتھوں کو سر کے پیچھے رکھ لیا۔

''جی ہاں۔ شکوہ بھی ایسا جو معافی طلب بھی نہیں ہے''

''مگر میں نے کوشش کی تھی ہانیہ۔۔ اب مجھے کیا معلوم تھا جس دن تمہاری بہن کا نکاح ہے اسی دن اس کے بھائی کی منگنی ہے۔'' اس نے جواز بتایا

''اگر حسام بھائی کی منگنی نہ ہوتی تو شاید میں اسے کسی بہانے سے لے بھی آتا حالانکہ مجھے تب بھی پورا یقین تھا کہ وہ نہ آتا لیکن تمہاری خوشی کی خاطر میں اسے کسی بھی قیمت پر لاتا ضرور۔۔ لیکن حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ اب کوئی بھائی کی منگنی چھوڑ کر تو آ نہیں سکتا ناں۔۔!!'' اس نے یقین دلانے کی اپنی تئیں ہر ممکن سعی کی تھی۔

''اچھا۔۔'' اس نے پھیکے سے لہجے میں کہا تھا تبھی وہاں ویٹر وہاں پر دو گلاس لے کر آ موجود ہوا۔ جنہیں اچھی طرح سے آراستہ کیا گیا تھا۔

''شکریہ۔۔!!'' کامیش نے مسکراتے ہوئے ایک گلاس ہانیہ کی طرف بڑھایا

''تو اس نے تمہیں منگنی پر نہیں بلایا؟'' ایک گھونٹ لینے کے بعد اس نے پوچھا تھا

''بلایا تھا۔۔ مگر میں نے منگنی پر نکاح کو ترجیح دی۔'' اس نے مژگان جھپکتے ہوئے کہا تھا۔

''مگر کیوں؟ وہ تو تمہارا برسوں پرانا دوست ہے جبکہ ہماری جان پہچان ہوئے ابھی ایک سمیسٹر ہی ہوا ہے۔ پھر ایسا کیوں کہ تم نے اس دوستی کو نظر انداز کر دیا۔'' اس نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا، شاید وہ اس کے تاثرات کو پڑھنا چاہتی تھی۔

''شاید اس لئے کہ ایک نئے رشتے کے لئے یہ سب کچھ ضروری ہے'' اس نے ایک بار پھر ذومعنی انداز میں جواب دیا تھا۔ وہ باتوں کے مطلب میں بری طرح الجھ گئی مگر دوبارہ سوال کر کے اپنے آپ کو مزید الجھانے سے اجتناب کیا۔

''کبھی کبھی نئے رشتے پرانے رشتوں پر بہت گہرے اثر انداز ہوتے ہیں'' اس نے دوسرا گھونٹ بھرنے کے بعد دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ آنکھیں شیک کی بجائے اس کی چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ ان نگاہوں کی حدت بنا دیکھے محسوس کر سکتی تھی۔ دائیں ہاتھ سے سٹرا کو شیک میں پھیرتے ہوئے وہ ان نگاہوں کی حدت سے بہت دور نکل جانا چاہتی تھی مگر ایک عجیب سا حصار اسے روکے ہوئے تھا۔ وہ چاہ کر بھی کسی بات کو رد کرنے سے قاصر تھی۔ جانے کیوں؟

☆......☆......☆

خوب ہیں گل پھول بھی تیرے چمن میں مگر

صحن چمن میں کوئی نغمہ سرا چاہیے

جبیں کے کہنے پر وہ بمشکل اس کے ساتھ شاپنگ کرنے پر آمادہ ہوئی تھی۔ حسام کی منگنی ہو جانے پر جتنا وہ خود کو ریلیکس محسوس کر رہا تھا شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ شاید اس کی وجہ سحر فاطمہ کے ساتھ دن بھر کی تھکا دینے والی شاپنگ تھی۔ جو اسے مجبوراً کرنی پڑ رہی تھی۔

''ویسے شاپنگ بھی ایک وبال جان ہے۔ مجال ہے جو جان بخش دے بنا جان نکالے۔'' اس کے کومنٹ یکسر تبدیل ہو چکے تھے۔ پہلے جتنا وہ باہر جانے کے لئے بہانے ڈھونڈتا تھا، حسام کی منگنی کی شاپنگ کے بعد وہ برسوں باہر کا نام لینے سے بھی پہلے ہزاروں بار سوچتا لیکن حاعفہ وہ ایک ایسا نام تھا جس کے ساتھ کچھ لمحے بیتانے کے لئے وہ اپنی اس نئی ریت کو بھی گرانے کے لئے تیار تھا۔

پہلے پہل تو حاعفہ نے ہمیشہ کی طرح ناں سے ہی شروعات کی مگر جیسے ہی جبیں منہ لٹکائے پلٹی تو جانے کیا دل میں آئی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبیں نے جیسے ہی یہ خبر اریب کو سنائی تو اس کی خوشی کا تو ٹھکانا ہی نہ رہا تھا۔ جبیں کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے چھوٹے بچوں کی طرح بیڈ پر چڑھ کر زور زور سے چھلانگیں لگانا شروع کر دی۔ معصوم سا بچہ اس وقت انتہائی خوش تھا۔ من چاہی شے تو مل چکی تھی اسے۔ آناً فاناً تیار ہو کر وہ باہر گیراج میں اب اس کا منتظر تھا۔ رسٹ واچ کی طرف وہ بار بار ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وقت کاٹنا اس کے لئے انتہائی کٹھن ہو چکا ہو۔ ہر لمحے بعد اس کی نظر واچ کی سوئیوں پر جا کر ٹھہر جاتی جو بمشکل ایک سیکنڈ جتنا فاصلہ طے کر پاتی تھیں۔

''آج یہ وقت کیوں نہیں گزر رہا؟'' پانچ منٹ اس کے لئے پانچ برس کے مترادف تھے۔ اس نے ٹہلتے ہوئے لان کا رخ کیا تو ہلکا سا جھونکا اس کے رخسار کو تھپتھپاتا ہوا گزر گیا۔ بھینی بھینی گلاب و چنبیلی کی خوشبو جہاں سونگھنے میں بھلی تھی وہیں آنکھوں کے لئے بھی فرحت

کا سماں تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک عدد سرخ گلاب توڑا۔ کانٹوں کو بڑے ہی احتیاط سے صاف کرنے کے بعد اس کی خوشبو کو نتھنوں سے جسم کا حصہ بنایا تو ایک پر کیف احساس خود بخود جسم میں سرایت کر گیا۔ گلاب کی پنکھڑیوں کو ہر زاویے سے ٹٹولنے کے بعد وہ واپس کار کی طرف پلٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھول کار میں رکھتا اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دو انچ کی ہیل اسے کار کی کھڑکی سے دیکھائی دے رہی تھی۔ وہ جو پہلے آدھا جھک چکا تھا۔ دھیرے دھیرے سیدھا کھڑا ہونے لگا۔ دھیمی چال سے وہ مسلسل اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ نظریں اس کے لباس کی طرف گئیں تو انہیں کریمی رنگ کا پایا۔ موسم کی مناسبت سے عین مطابقت پاتا لباس۔۔ نظریں ذرا مزید اٹھیں تو شانوں کو ایک بڑی سی سیاہ چادر سے ڈھکا ہوا پایا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سیاہ چاند کو سیاہی نے گھیر لیا ہو مگر وہ سیاہی اس پر غلبہ پانے میں ناکام رہی۔ تب بھی وہ مہتاب پورے آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ لمبی مژگان کے کناروں پر چمکتی خواہشیں جو کبھی عروج پر ہوتی تھیں آج بھی ان میں کسی قدر جان باقی تھی۔ وہ چمک آج بھی وہ دیکھ سکتا تھا۔ ان میں موجود انا کی روش آج اگرچہ کسی قدر بدل چکی تھی مگر ادا آج بھی انہیں دوسروں میں ممتاز کیے ہوئے تھی۔

ہاتھوں کی گرفت گلاب پر کمزور ہو رہی تھی لیکن اس قدر نہیں کہ وہ خود بخود زمین بوس ہو جائے۔ وہ بنا پلکیں جھپکے یک ٹک اسے دیکھا جا رہا تھا۔ فاصلہ دھیرے دھیرے ایسے سمٹتا چلا گیا جیسے منزلیں آپس میں مل چکی ہوں۔ راہی جو برسوں سے جدا ہوں، آج ملنے جا رہے ہوں۔

''چلیں۔۔'' خوابوں کی دنیا سے وہ اس پر فسوں آواز کے زیر اثر باہر نکلا۔ قدرے جھجکتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مخالف سمت کا فرنٹ ڈور اوپن کرنے کے بعد اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک مان کے ساتھ گردن میں تناؤ لئے وہاں براجمان ہو گئی۔

''اریب۔۔ تُو بھی ناں۔۔!!'' اس سمت کا دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے دھیرے سے سر پر چپت رسید کی اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

''یہ تمہارے لئے۔۔۔'' اس نے کار میں بیٹھتے ہی سب سے پہلے سیٹ بیلٹ باندھی اور پھر جیسے ہی اس نے سٹیئرنگ سنبھالنا چاہی تو اس کا دھیان پھول کی طرف گیا۔

''شکریہ۔۔'' بنا کوئی تاثر ظاہر کئے وہ پھول لے کر اس نے بنا سونگھے سامنے ایک چھوٹے بکس کے ساتھ ٹھونس دیا۔ ایسا کرنا اگرچہ اریب کے لئے باعث شرمندگی تھا مگر اس نے ہمیشہ کی طرح نظر انداز کر دیا اور بنا کچھ کہے یہ راہی منزل کی طرف گامزن ہو گئے۔

''ویسے اگر چاہو تو تم مجھ سے کچھ بھی پوچھ سکتی ہو'' دورانِ سفر اس نے خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی تھی مگر وہ ونڈ سکرین سے نگاہیں ہٹائے بغیر نفی میں سر ہلانے پر بھی خوش تھی۔

''بولنا گناہ ہے کیا؟'' ابرو اچکاتے ہوئے کہا تو اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ نگاہیں باہر راہگیروں پر مرکوز تھیں جو پیدل

اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔

''بولنے کو دل نہیں چاہ رہا؟''اس نے بات سے بات نکالنے کی کوشش کی تھی

''شاید۔''اس بار اس نے ریت توڑی اور شانے اچکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا

''تب تو تمہیں ضرور بولنا چاہئے۔''اس نے پر جوش لہجے میں کہا تو اس نے حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا

''کیوں؟''

''کیونکہ بات کرنے کو دل اس وقت نہیں کرتا جب آپ غمگین ہوں یا پھر بہت زیادہ اداس ہوں اور اس حالت میں میرے نزدیک بولنا انتہائی ضروری ہے ورنہ آپ تنہائی کا شکار ہو سکتے ہیں۔''اس نے اپنا فلسفہ پیش کیا تھا۔ چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ تھی جو حقیقت کا روپ دھاڑنے کے لئے بے تاب تھی۔

''میرا نہیں خیال تمہارا یہ نظریہ درست ہے''اس نے سپاٹ لہجے میں تردید کی۔ جس پر اچھنبے انداز میں اس کی طرف دیکھا

''مگر کیوں؟''جواز جاننا چاہا

''کیونکہ خاموشی ٹوٹنے کی نہیں بلکہ جڑنے کی علامت ہے۔ یہ انسان کو رب سے جوڑتی ہے۔ بظاہر خاموش انسان دنیا سے لاتعلق دکھائی دیتا ہے مگر اس خاموشی میں وہ ایک ڈور سے بندھا ہوتا ہے۔ ڈور بھی وہ جو سیدھی رب کی طرف جاتی ہے۔ اس خاموشی میں وہ رب کی نعمتوں، اور اپنے ذات پر غور کرتا ہے۔ اپنی ذات بے نشان اور خدا کی قدرت کاملہ کی طرف غور و فکر کرتا ہے۔ اس طرح یہ خاموش رہنا بھی ایک انسان کے لئے سودمند ہوتا ہے''اندازِ گفتگو اس کا تھا مگر الفاظ شاید کسی اور کے۔ جسے اریب کو سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے اس پر ایک نیا انکشاف کیا تھا

''لگتا ہے ایک نیا دوست مل گیا ہے، جس نے بڑی بڑی باتیں کرنا سکھا دیں''اس کا انداز بیاں کچھ عجیب سا تھا۔ نہ ہی طنز اور نہ دوستانہ۔ اس نے چونک کر اریب کی طرف دیکھا تو وہ نارمل انداز میں ڈرائیو کر رہا تھا۔

''دوست نہیں مسیحا۔۔''اس نے تصیح کرائی تھی

''مسیحا۔۔۔!! گڈ، ویسے اس مسیحا سے مل کر لگتا ہے تم کافی بدل چکی ہو اور اگر ایسا ہی چلتا رہا تو مزید بدل جاؤ گی۔''ایک گہری نگاہ دوڑانے کے بعد کہا اور پھر اپنی نظریں سڑک پر مبذول کر دیں۔ اریب کا یہ جملہ گہرائی تک اس کے وجود میں اتر گیا۔ بڑی بڑی آنکھوں سے اس کے چہرے کا محاصرہ کیا تو وہ خود اپنے آپ میں کھو گئی۔ شاید ٹھیک ہی کہا تھا اس نے۔ وہ واقعی بدل چکی تھی۔ نگاہیں پھیر کر دوبارہ ونڈ سکرین پر جمائی تو ماضی کی حاعقہ کی جھلک اسے شیشے میں اترتی دکھائی دی۔

''جسٹ شٹ۔۔۔جسٹ یو شیٹ۔۔۔''تلخ و توہین آمیز لہجہ جانا پہچانا سا تھا

''میں حاعفہ سکندر ہوں۔۔حاعفہ سکندر۔۔۔کوئی عام سی لڑکی نہیں۔جو اپنی کمٹمنٹ سے پیچھے ہٹے۔۔'' کچا چبا جانے والی نگاہیں آج اس کے لئے وحشت کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔

''میرے نزدیک میری انا سب سے زیادہ عزیز ہے۔۔'' اپنے ہی الفاظ اسے کاٹنے کو آرہے تھے۔اس نے بے دھیانی میں اپنے ہاتھ کان کی طرف بڑھائے تو احساس ہوا کہ زندگی کا وہ حصہ تو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح کافی پہلے گزر چکا ہے۔کالی رات عرصے بعد ایک سنہری صبح میں تبدیل ہو چکی ہے۔جہاں ایک سورج خدیجہ کے نام سے اس کی زندگی میں داخل ہو چکا ہے۔وہ سورج جس نے ایسی روشنی بکھیری کہ اس کی زندگی کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔اس کی سوچ کے محور کو تبدیل کر دیا۔

''کیا ہوا؟ ماضی وحال کے بھنور میں الجھ گئی ہو؟'' اریب نے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ بری طرح چونکی۔پیشانی سے پسینے کی ایک بوند سرد دوپہر میں بھی بہنے لگی۔

''تمہیں دوسروں کو چونکانے میں مزہ آتا ہے کیا؟'' اس نے بمشکل جملہ ادا کیا تھا

''مزہ تو نہیں آتا خیر۔۔۔لیکن من کی باتوں کو زبان سے کہہ دینے میں حرج کیا ہے؟'' ایک ثانیے کے لئے خاموشی چھائی رہی۔وہ اپنی نظریں چرانے لگی تھی۔

''جو باتیں دل میں کھٹکنے لگیں،دل کو بوجھل محسوس ہوں،انہیں کہہ دینے میں ہی بھلائی ہے۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے شانِ بے نیازی سے کہا تھا جس پر طنزیہ مسکرا دی

''یہ تمہارا خیال ہے اریب۔۔۔کہہ دینے میں ہمیشہ بھلائی پنہاں نہیں ہوتی۔کبھی کبھی غیر شعوری طور پر کہی گئی باتیں دوسرے پر گراں گزرتی ہے اور بعد از خود ہی انسان پشیمانی کا شکار ہو جاتا ہے۔تو بہتر نہیں ہے کیا کہ انسان بولنے سے پہلے سوچ لے؟'' حاعفہ کی باتوں پر حیرت انگیز انداز میں چونکا تھا۔ایک معنی خیز نگاہ اس کے چہرے پر دوڑائی تو اسے شک ہوا جیسے اس کے ساتھ بیٹھی حاعفہ باتوں کے انداز میں کافی آگے بڑھ چکی ہے۔زندگی کی ایک ضرب نے اس کے انداز سے وہ شوخ پن چھین لیا ہے جو کبھی اس کے چہرے سے چھلکتا تھا۔آج وہاں فقط ایک ویرانی و بیابانی کا عالم تھا۔ایک ایسی کھیتی تھی،جو بنجر زمین پر سیراب ہونے کے سپنے دیکھ رہی تھی۔جس کے آسمان پر کوئی بادل نہیں تھا۔جس کی ہوائیں انتہائی گرم اور سخت تھیں۔

''یہ الفاظ ہی تو ہوتے ہیں جو کسی بھی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔انسان اپنے لفظوں میں ہی تو چھپا ہوتا ہے۔بظاہر حسن کا دیو یا دیوی نظر آنے والا انسان اپنے کڑوے بول کی بدولت انسان کے الف تک بھی پہنچ نہیں پاتا۔بس انسان کا لبادہ اوڑھ کر وہ جانوروں کی سی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے کیونکہ یہ جانور ہی تو ہیں جن میں سوچنے کی فہم نہیں۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی مژگان کے کنارے بھیگ چکے تھے۔اپنا ماضی حال میں کھٹک رہا تھا۔گہری سانس لیتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں ونڈ سکرین پر مرکوز کر لیں۔اریب نے اس کی طرف

دیکھنا چاہا تو ایسا لگا جیسے وہ اب کبھی بول نہ سکے گی۔ ماضی کی یادوں میں آخری حد تک کھویا ہوا وجود بظاہر اس کے سامنے تھا مگر روح نہیں۔

''کیا ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں؟'' حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے خود ہی باتوں کا رخ بدلنا چاہا تھا۔

''کوئی اور بات؟ ہر بات کی شروعات تو فہم سے ہی ہوتی ہے۔'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ جھرجھری لیتے ہوئے اس نے دائیں جانب باہر کی طرف نگاہ دوڑائی تا کہ وہ کھل کر سانس لے سکے۔ حاعفہ کی باتوں نے اس کے سانس لینے کی سکت بھی تقریباً چھین لی تھی۔ کچھ دیر تک یونہی خاموشی درمیان رہی تبھی یک دم اس نے بریک لگائی۔

''کیا ہوا؟'' بنا دیکھے اس نے استفسار کیا

''منزل آ گئی ہے جناب۔۔'' اس نے قدرے شوخ پن کو غالب کرنا چاہا تھا مگر وہ بنا مسکرائے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی کار سے باہر نکل آئی۔ شانے اچکاتے ہوئے اس نے کار کو پارک کیا اور خود بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ بظاہر ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر ایک مسافت دونوں کے درمیاں حائل تھی۔ ایک ایسی مسافت جسے اریب جتنا طے کرنے کی کوشش کرتا حاعفہ اتنی ہی دور جاتی محسوس ہوتی۔ کئی بار باتیں کر کے اس کا جی بہلانے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے اسی حال میں خوش تھی۔

''کیا شاپنگ کرو گی تم پھر؟'' اس نے ایک بوتیک کے باہر ٹھہر کر پوچھا تھا

''مجھے تو کچھ بھی نہیں چاہیے تھا بس جبیں کی ضد پر حامی بھر لی کیونکہ ہر بار تمہیں ناں کر کے میرے اوپر ایک بوجھ سا پڑ گیا تھا'' اس نے نیچی نگاہوں سے جواب دیا

''کیا یہی بات ہے؟'' وہ جھکی مژگان کا مطلب اچھے سے سمجھ چکا تھا

''شاید۔۔۔!! مجھے تم سے ایک بات بھی کرنی تھی'' انگلیوں کو مروڑتے ہوئے اس نے پہلی بار اریب کی جانب جھجکتے ہوئے دیکھا تھا۔

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے لیکن پہلے اس طرح کرتے ہیں کچھ شاپنگ کر لیں، پھر کیفے میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔۔'' اس نے ایک مسکراہٹ کو چہرے پر جگہ دی اور بوتیک میں جا کر کچھ ڈریسز حاعفہ کے لئے پسند کیے جسے تقریباً اس نے ریجیکٹ کر دیئے تھے۔ وہ تمام ڈریسز جو اریب نے پسند کئے تھے وہ ماڈرن طرز کے تھے۔ جنہیں وہ اکثر پہنا کرتی تھی۔ مگر اب ان کی اسے ضرورت نہ تھی۔ اس نے ایک سادہ سا ہلکے رنگ کا سوٹ پسند کیا اور ساتھ ہی ایک عدد شال۔ اریب نے شانے اچکا کر حیرت کا اظہار کیا مگر اس نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔ اسے جس چیز کی ضرورت تھی، وہ لے چکی ہے۔

اس کے بعد وہ کئی شاپس پر گئے جہاں سے حاعفہ نے اپنی مرضی کی چند چیزیں خریں، جنہیں دیکھ کر اریب کو کافی حیرت ہوئی۔ وہ کتنی بدل چکی تھی۔ خاص و قیمتی اشیاء تک کو ریجیکٹ کر دینے والی لڑکی آج عام اشیاء کو پسند کر رہی تھی۔

''تمہاری ذات میرے لئے ایک سرپرائز سے کم نہیں ہے۔'' کیفے میں باتوں کے تسلسل کو جاری کرنے کی غرض سے اریب نے کہا تھا

''کیوں کیا ہوا؟'' اس نے بنا کوئی تاثر دیئے پوچھا تھا

''ایک سرپرائز ہو تو بتاؤں۔۔۔ خیر چھوڑو۔۔۔ تم بتاؤ کیا بات کرنا چاہتی تھی تم مجھ سے؟'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنے شانے اچکائے اور پھر ویٹر کو بلا کر دو کافی آرڈر کی۔

''میں کچھ کہنا تو نہیں چاہتی تھی البتہ کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔'' اس نے ایک گہری نگاہ اریب پر ڈالی تو اسے ایسا لگا جیسے وہ ان نگاہوں کے سحر سے برسوں نکل نہ پائے گا۔

''ہاں پوچھو۔۔۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ شاید نگاہوں کا اثر تھا۔ جو انتہائی پرتپاک اور سفاکیت کا مادہ اپنے اندر سینتے ہوئے تھیں۔

''تم مجھ میں اتنی دلچسپی کیوں لیتے ہو؟'' یہ سنتے ہی اس کے جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی۔ جذبات اپنا اثر پیدا کر چکے تھے۔ نگاہوں کی شوخیاں دوسرے دل میں بھی قدم رکھ چکی تھیں مگر لہجے میں جو عنصر شامل تھا وہ شاید ابھی تک بدلا بدلا سا تھا۔

''مطلب؟'' اس نے نگاہیں پھیرتے ہوئے انجان بننے کی ناکام کوشش کی تھی

''مطلب مجھ سے بہتر تم اچھے سے جانتے ہو اریب'' لہجے میں جانے کیسا خمار تھا وہ اپنی توجہ کسی اور ڈگر بانٹ ہی نہ پایا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو نگاہوں کو اس کے جام حسن کا پیاسا پایا۔

''بس ویسے ہی۔۔۔'' اس نے خیالات کو جھٹک کر ابھرتے جذبات کو ضبط کیا مگر پیشانی کی شکن تو کچھ اور ہی کہہ رہی تھیں

''لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا۔۔'' اس نے عمیق نگاہ سے اس کے پورے وجود کو ٹٹولتے ہوئے کہا تھا

''لیکن سچائی تو یہی ہے ناں۔۔۔'' اس نے ہنستے ہوئے بات کو ٹالا۔ ویٹر کافی سرو کر رہا تھا مگر وہ تو جیسے اپنے اندر سے لڑ رہا تھا۔ جب سب کچھ عیاں ہو ہی چکا تھا تو کیوں اس نے جھٹلایا؟ کیوں اپنا حالِ دل سامنے نہ رکھ دیا؟ وہ ٹیبل کی جانب دیکھے جانے کس کس شے کو گھور رہا تھا

''کیا ہوا؟'' اریب کو یوں کھویا دیکھ کر اس نے پوچھا تھا

''کک کچھ نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی۔'' ایک بار پھر خاموشی کا نیا تسلسل شروع ہو گیا۔

''ویسے آج تم نے اپنی نئی دوست کے پاس نہیں جانا کیا؟'' کیفے سے جاتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔ موسم کافی سہانا ہو چکا تھا۔ پارکنگ ایریا کی طرف بڑھتے ہوئے ان کے بال شوخ ہواؤں سے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔

''نہیں۔۔۔''اس نے مختصر کہا۔

''ویسے برا نہ مناؤں تو ایک بات پوچھوں؟''فرنٹ ڈور اوپن کرتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔شاپنگ بیگز اس نے پچھلی سیٹ پر رکھ دیے۔حاعفہ نے اثبات میں گردن ہلانے پر ہی اکتفا کیا

''آخر اس دوست میں کیا بات ہے جو تم اس کی گرویدہ ہوگئی؟''اریب کا سوال سن کر وہ کار میں جا بیٹھی۔تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اس نے بھی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔کار سٹارٹ کرنے کے بعد وہ اب مین سڑک پر تھے مگر حاعفہ بدستور خاموش تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا۔''اریب نے کہا تھا

''ان کا اخلاق۔۔۔''اس نے مختصر کہا

''اخلاق؟؟''حیرت سے کندھے اچکائے اور اچھنبے لہجے میں اس کی طرف دیکھا

''ہاں۔۔ان کے بات کرنے کا انداز،ان کی باتوں میں چھپی شفقت مجھے ان کی طرف کھینچتا رہتا ہے۔''یہ کہہ کر اس نے چپ سادھ لی۔اریب بھی اب خاموشی سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

☆......☆......☆

؎ تو میری سانسوں میں تحلیل ہے خوشبو کی طرح

دوسرے سمیسٹر کا آغاز ہو چکا تھا۔پہلے سمیسٹر کا رزلٹ بھی نوٹس بورڈ پر آج آویزاں کر دیا جانا تھا۔کلاسوں میں طلبا کی تعداد معمول سے کچھ کم ہی تھی۔شاید موسم کے بدلتے تیور اور پھر سمیسٹر کے ابتدائی دن اس کا سبب تھے۔

''ویسے آج کا دن تو بے کار ہی گیا ناں؟''کامیش نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تھا

''ہاں۔۔یا شاید نہیں۔۔''اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا تھا

''ہاں یا شاید نہیں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟''اس نے اچھنبے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا

''مطلب یہ کہ آج رزلٹ تو آجائے گا''لہجے میں ہمیشہ کی سی تازگی نہ تھی۔انداز کچھ کھویا کھویا سا تھا

''کیا ہوا اریب؟تم کچھ اداس ہو۔خیریت ہے ناں؟''اس نے اپنا ہاتھ اریب کے شانوں پر رکھ کر استفسار کیا تھا

''ہاں!سب خیریت ہے۔بس ویسے ہی۔۔''اس نے بناوٹی مسکراہٹ کا سہارا لیا تھا

''اگر رزلٹ کی وجہ سے پریشان ہے تو اس کی فکر نہ کر میرے یار!مجھ سے پوچھ لے اپنا رزلٹ۔۔فور بائے فور GPA ہوگی تیری''اس نے پریشانی کا سبب کچھ اور ہی سمجھا تھا

''اچھا۔۔!!اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے تُو؟''اس نے اپنے خیالات کو جھٹکا اور طنزیہ پوچھا

"بس ہے ناں یقین مجھے اپنے دوست پر۔۔۔ ویسے ہو سکتا ہے، اس بار یہ پوزیشن تیرے ساتھ کوئی اور بھی شیئر کرے۔۔" اس نے بات کو طول دیتے ہوئے کہا تھا۔ پیشانی پر شکن اس بات کا واضح اشارے تھے کہ وہ کس کی بات کر رہا تھا

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔۔ یہ بات تُو بھی جانتا ہے" اس نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا تھا

"ہاں۔۔۔!! میں جانتا ہوں تو ہوں۔۔ لیکن۔۔" کامیش کے جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی اریب نے مداخلت کی تھی

"اچھا، ان باتوں کو چھوڑ مجھے یہ بتا پہلے کہ کیا ہماری دوستی بس اتنی تھی کہ تُو میرے بلانے سے بھی حسام بھائی کی منگنی میں نہیں آیا۔۔" اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا

"اوہ یار۔۔ بتایا تو تھا ناں۔۔" اس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"بتایا تھا لیکن میں نے دوستی کی حد پوچھی ہے، کل کی آئی لڑکی تیرے لئے اتنی عزیز ہو گئی" اس نے دونوں ہاتھ سینے کے گرد لپیٹ لئے

"اچھا سوری۔۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے شانے پکڑ کر جھنجوڑے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور گردن جھٹک کر آگے بڑھ دیا۔

"اریب میری بات تو سن۔۔!!" وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"اچھا یار، آئندہ جب بھی تو بلائے گا، میں ضرور آؤں گا وعدہ رہا۔۔" اس نے معصومانہ انداز میں کہا تو اس نے بھی کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا

"ویسے مجھے ایک بات سمجھ نہیں آرہی کہ تجھ جیسا شوخ مزاج حسن پرست لڑکا ایک معمولی سی صورت والی لڑکی کے پیچھے پاگل ہوا جاتا ہے" اس نے ابرو اچکاتے ہوئے جواز جاننا چاہا تھا

"بس دیکھ لو یار۔۔! سچ کہوں تو میں خود بھی نہیں جانتا۔۔۔ بس اس کی باتیں مجھے آب استادہ کی مانند ساکت کر دیتی ہیں۔ اس کا انداز گفتگو میرے حواس پر ایسا ترنم بکھیرتا ہے کہ میرے دل کے تار خود بخود متحرک ہو جاتے ہیں اور خیالات کا جہاں آب پیکاں کی مانند اس ذات کی جانب گامزن ہو جاتا ہے اور میں اپنے جسد خاکی کو مجبور و لاغر محسوس کرتا ہوں۔" کامیش کی بات سن کر اریب ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ اریب کو یوں قہقہ لگاتا دیکھ کر وہ چونکا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا

"اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" وہ تجسس بھرے انداز میں گویا ہوا تھا

"تم نے اتنی گہری باتیں کیں اور مجھ سے پوچھتے ہو کہ اس میں ہنسنے والی کیا بات ہے؟" اس نے اپنے قہقے کو بمشکل ضبط کیا تھا

"تو پھر؟" وہ ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا

"کچھ نہیں۔۔ یار۔۔" وہ ہنستا ہوا اس کی بات کو ٹالنے لگا۔ جو اس پر ناگوار گزرا

''اس کا مطلب تم میرا تمسخر اڑا رہے تھے؟'' کچا چبا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا

''تمہیں اب پتا چلا؟'' معصومانہ انداز میں کہا تو اس پر کامیش نے آتش بار لہجے میں اس کا نام پکارا تھا۔

''اچھا اچھا۔۔ یار۔۔ سوری۔۔'' اس نے قہقہے کو ہاتھوں کی پشت سے ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔

''بیٹا جی! جب یہ دل کسی کو اپنے اندر داخل ہونے کی جازت دیتا ہے ناں۔۔!! تو کیا خاص کیا عام؟ سب کی شناخت بھول جاتا ہے۔ محفل و ہجر میں بس محبوب ہی یاد آتا ہے۔ اس کے خصائل ہی آنکھوں کو بھاتے ہیں'' طنزیہ کہتے ہوئے وہ آگے کو چل دیا۔ اریب نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کا تعاقب کیا۔

''اچھا میری بات تو سنو۔۔۔'' دو قدم چلنے کے بعد وہ رکا اور جھنجلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا

''ہاں کہو۔۔۔''

''پہلے اپنا موڈ ٹھیک کرو۔۔ کیونکہ مجھے ایسا منہ بسوڑا کامیش نہیں پسند۔۔۔'' اس نے پیار سے اس کے رخسار کو نوچا تھا

''چھوڑ یار۔۔ میرا موڈ ٹھیک ہے۔ تم پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو۔۔'' اریب کی حرکتوں نے اس کے آتش افسردہ سے چہرے پر بھی کسک کو ابھرنے پر مجبور کر دیا تھا

''اچھا یہ بتا۔۔۔ کیا واقعی دل میں اترنے کے لئے زبان سے اچھا بولنا ضروری ہے کیا؟'' یک دم اس کے لہجے میں سنجیدگی کا عنصر نمایاں ہو گیا۔

''ہاں بالکل۔۔۔ دل کسی اور عادت کو اتنی جلدی قبول نہیں کرتا جتنی جلدی خوش اخلاقی کو کرتا ہے اور سچ کہوں تو ہانیہ کی باتیں ہی میرے دل میں دھیرے دھیرے اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ اس کی خوش اسلوبی میرا دھیان اب کسی اور طرف بھٹکنے ہی نہیں دیتی۔۔'' ہانیہ کی تعریفیں اس کو نگاہیں پھیرنے پر مجبور کر رہی تھیں مگر وہ اپنے آپ کو بمشکل وہاں کھڑے کیا رہا۔

''اچھا۔۔ یار مجھے گھر ایک کام ہے باقی باتیں پھر کبھی۔۔'' اس سے پہلے کہ وہ ہانیہ کی تعریفوں کے پل باندھتا اریب نے وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت جانی۔ جانے کیوں وہ اس کا نام سنتے ہی بے آب ماہی کی طرح ہو جاتا تھا۔ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا مگر آج یہ جذبات اپنی نوعیت تبدیل کر چکے تھے۔ آج وہاں سے جانے کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔

☆......☆......☆

نہ پوچھ خواب زلیخا نے کیا خیال کیا

کہ کاروان کا کنعاں کے جی نکال لیا

سٹڈی ٹیبل پر لیپ ٹاپ آن تھا۔ ساتھ ہی کچھ ورق بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ ورقوں کو لیپ ٹاپ کے نیچے ترتیب کے ساتھ رکھا

ہوا تھا جبکہ چند پر ایک ڈیکوریشن پیس۔ کمرے کی تمام لائٹیں آف تھیں سوائے ٹیبل لیمپ کے۔ جہاں سے روشنی چھنتی ہوئی پورے کمرے کو نیم روشن کر رہی تھی۔ باہر کا دروازہ مقفل تھا جبکہ بالکونی کے ساتھ واش روم کا دروازہ نیم مقفل تھا۔ جہاں سے روشنی کی ایک لکیر کمرے میں اپنا عکس چھوڑ رہی تھی۔ موسم کی شدت بھی اب قدرے کم تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بالکونی کے پردوں کو اپنے سنگ جھومنے پر اکسا رہی تھیں۔

''دس بج چکے ہیں اور ابھی صرف دو پیج لکھے ہیں۔۔'' آستینوں کو فولڈ کرتے ہوئے حسام واش روم سے باہر آیا۔ پانی کی بوندیں چہرے سے فرش پر گر رہی تھیں۔

''اب بس جلدی سے آج کا کام مکمل کروں۔۔۔'' اس نے کرسی کو کھسکا کر پیچھے کیا اور سٹڈی ٹیبل کے سامنے براجمان ہو گیا۔ ٹچ پیڈ پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے سکرول بار اوپر نیچے کی اور مطلوبہ لائن ڈھونڈ کر اسے ہائی لائیٹ کیا۔

''تو یہاں سے لکھنا ہے اب۔۔'' اس نے کاغذ اور بال پوئنٹ سنبھالی اور مبہوت اپنی رپورٹ بنانے میں محو ہو گیا۔ بالکونی سے آنے والی ہوائیں اگرچہ کاغذ میں گداز کا احساس اجاگر کر رہی تھی مگر انہیں اچھے سے وہ ترتیب دیئے ہوئے تھا۔

تقریباً دس منٹ بعد دائیں ہاتھ کے بائیں جانب رکھے موبائل فون کی سکرین جگمگا اٹھی۔ وائبریشن پر لگے ہونے کی وجہ سے آواز تو خاموش ماحول میں داخل نہ ہوئی مگر روشنی بار بار ماحول میں مخل ہو رہی تھی۔ اس نے بالوں کو آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے موبائل پر سرسری نگاہ دوڑائی تو سکرین پر جگمگاتا نام دیکھ کر اس کے لبوں پر ایک کسک ابھر آئی۔ ہاتھ میں موجود بال پوائنٹ کو وہیں رکھ چھوڑا اور موبائل کو اٹھا کر مبہوت اس نام کو دیکھنے لگا۔

''صبا۔۔!!'' دھیرے سے لب گویا ہوئے تھے۔ وائبریشن کی تھرتھراہٹ ختم ہو گئی اور کچھ لمحوں بعد یہ تسلسل دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس نے گلا کھنکھارتے ہوئے فون ریسیو کیا۔

''ہیلو۔۔ حسام عالمگیر سپیکنگ۔۔۔!!'' اس نے آواز میں تناؤ پیدا کرتے ہوئے کہا

''جی بالکل۔۔ بھلا مجھے کہاں کوئی کام ہو سکتا ہے؟ بس آپ کے فون کا انتظار ہی تو میرے شب و روز کا مقصد رہ گیا ہے اب۔۔'' اس نے تا حد درجہ خوش آمد کا لہجہ اپنایا تھا۔ کرسی کے ساتھ پشت لگا کر اس نے لیپ ٹاپ کو دوبارہ آن چھوڑ دیا اور کاغذوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نیم دراز ہوا۔

''لیجیے۔۔ اس میں طنز کہاں پنہاں ہے؟ سچ ہی تو کہہ رہا ہے بندہ نامدار۔ بھلا اپنی ہونے والی زوجہ محترمہ کے بارے میں سوچنے کا بھی حق نہیں رکھتے ہم؟'' ذو معنی مسکراہٹ اس کی نگاہوں کی تشنگی ظاہر کر رہی تھیں۔

''اچھا۔۔ تو پھر آپ بھی رات کے اس پہر بالکونی میں کھڑی چاند کو تکتے ہوئے ہمارا چہرہ تراش رہی ہیں۔'' یکدم سے وہ کھڑا ہوا تو اس کا ہاتھ انجانے میں ٹیبل پر رکھی کتاب سے ٹکرایا اور اس کے نیچے دبائے ورقے پورے کمرے میں بکھر گئے۔ ہوا کا رخ اس کی اور

بڑھتا جا رہا تھا مگر وہ ان کاغذوں کو سمیٹنے کی بجائے بالکونی کی طرف بڑھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر چاند کو تکنے لگا۔

''اب تو ہم بھی چاند سے باتیں کرنے لگے ہیں'' نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ مسکرایا تھا اور اپنے محبوب سے باتوں کرتے ہوئے رات کے پہر کب آپس میں تبدیل ہوتے گئے۔ اسے علم ہی نہ ہوا۔

☆......☆......☆

کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم ہلکان ہو چکا تھا۔ پیشانی پر شکن، اس کی اضطرابی کیفیت کو ظاہر کر رہے تھے۔ آنکھیں موندیں وہ جانے کب سے سونے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیند تو جیسے اس سے خفا ہو چکی تھی۔ بند آنکھوں کے پیچھے فقط ایک ہی نمبر گردش کر رہا تھا۔ 01۔ ایک بار پھر وہی فلیش دل و دماغ پر لہرایا تو وہ جھٹ اٹھ بیٹھا۔ پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی جا رہی تھیں۔ اس نے بائیں ہاتھ سے پسینہ پونچھا اور گہری سانس لیتے ہوئے بالکونی کی طرف دیکھا تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کمرے میں بنا اجازت طلب کئے داخل ہو رہے تھے۔

''اُفف۔۔ وہ نمبر تو جیسے خوابوں میں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہا۔۔'' گہری سانس لیتے ہوئے وہ دوبارہ دھڑام سے گرا اور آنکھیں موندنے کی کوشش کی مگر اس بلیک اینڈ وائٹ دنیا میں صرف دو نمبر حکمرانی کر رہے تھے

''01....01....01'' کچھ ہی لمحوں بعد وہ دوبارہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا پورا وجود مکمل طور شرابور ہو چکا تھا۔ پسینے کی ایک قطار سر کے بالوں سے ٹھوڑی کے نیچے تک بہتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ سے آنکھوں کا پسینہ پونچھا اور دائیں جانب سے اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ڈائل کیا۔

''ہیلو کامیش۔۔ مجھے بالکل نیند نہیں آ رہی۔ جب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو وہی نمبر میرے دل و دماغ پر دستک دینے لگتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں اپنی مشکل کا حل ڈھونڈ رہا تھا۔

''یار ریب۔۔۔ اتنی رات کو تجھے نمبر کی کیسے سوجھی؟'' غنودگی سے بھرپور آواز سپیکر کو چیرتے ہوئے کمرے میں گونجی تھی

''میری یہاں نیندیں اڑی ہوئی ہیں اور تُو آرام سے سو رہا ہے۔'' اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔ اسی دوران وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے گئے لیمپ کو بھی آن کر چکا تھا۔

''تو تجھے کس نے کہا ہے تو اپنی نیندوں کو اڑنے دے، انہیں کسی پنچھی کی طرح پکڑ کر قفس میں قید کر اور میری طرح آرام سے سو جا۔'' خماری سے بھرپور دھیمہ لہجہ کہہ رہا تھا

''کامیش۔۔۔'' وہ تقریباً چیخا تھا جس نے سپیکر کے ذریعے اس کے پردوں کو تقریباً پھاڑ ہی ڈالا تھا۔ فون کو کان سے پیچھے کرتے ہوئے اس نے تھوڑا سا مسلا اور پھر کروٹ بدل کر نیم آنکھیں وا کیں۔ چہرے پر تاثر ہر لحہ بگڑتے جا رہے تھے۔

"کیا ہے یار اریب؟ بتا کیا ہے؟" وہ جمائی لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا مگر آنکھوں میں نیند ابھی تک بسیرا کئے ہوئے تھی۔

"یار۔۔ وہ نمبر، میرے ذہن میں اٹک کر رہ گیا ہے۔ جب بھی سوتا ہوں وہی نمبر ایک خوفناک ہیولا بن کر مجھے ڈسنے چلا آتا ہے۔ ہر طرف 01...01...01 ہی رقص کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اب تو ہی بتا، میں کیا کروں؟ کیسے پیچھا چھڑاؤں ان نمبرز سے۔۔۔ یقین جان، کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جب تک میں اس نمبر کے ماخذ تک نہیں پہنچ جاتا مجھ پر راتوں کی نیند حرام کردی گئی ہے۔" وہ الجھے ہوئے لہجے میں کہتا جا رہا تھا جبکہ دوسری طرف سے مسلسل جمائیوں کی آواز سماعت کا حصہ بن رہی تھی۔ وہ اکتاہٹ کے ساتھ اس کی بات سننے پر مجبور کیا گیا تھا۔

"تو اس اب میں کیا کرسکتا ہوں؟" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ انگڑائی لیتے ہوئے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ وقت دیکھنے کی ناکام کوشش کی۔

"کوئی حل بتا کہ کیسے میں اس بلینک کال کرنے والے تک پہنچ سکتا ہوں؟"

"اس کا تو صرف ایک حل ہے۔ بیڈ سے اٹھ، کپڑے چینج کر اور سیدھا ائیر پورٹ جا۔۔" وہ اس کی باتوں کو مبہوت سنتا جا رہا تھا اور جان چھڑانے کا ایک ہی حل ملا۔

"ائیر پورٹ۔۔۔ کس لئے؟" حیرانی سے سوال داغا گیا تھا

"بھئی وہاں جا کر انڈونیشیا کی ٹکٹ لے اور پھر وہاں جا کر ڈھونڈ اپنے بلیک میلر کو۔۔۔" یہ کہتے ہی وہ دوبارہ دھڑام سے لیٹا تھا جبکہ وہ ایک بار پھر جھنجلا کر گویا ہوا

"یار میں مذاق نہیں کر رہا۔۔۔"

"تو میں کونسا مذاق کر رہا ہوں۔۔" بات کو ختم کرنے کی نیت سے کہا تھا۔ جمائی لیتے ہوئے اس نے آنکھیں بند کی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔۔ تجھے نیند پیاری ہے ناں۔۔۔ تو سو آرام سے۔۔۔ جب میں یہ سوچ سوچ کر مر جاؤں گا تب بھی اپنے بیڈ سے اٹھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے۔۔" وہ طیش میں آچکا تھا جس کا اندازہ کامیش کو فوراً ہوگیا اور فی الفور اٹھ بیٹھا اور بائیں ہاتھ کو سائیڈ ٹیبل پر مارتے ہوئے ٹیبل لیمپ آن کیا۔

"یار۔۔۔ اچھا سن۔۔۔" چبھنے والی روشنی نے اس کی نیندوں کو بھی اڑنچھو کردیا مگر غنودگی اب بھی اپنی جگہ بنائے ہوئے تھی۔

"ابھی تو اپنے ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈال۔ اسے آرام کی ضرورت ہے اور پھر بقول تیرے اس unknown نمبر سے تیرے موبائل پر فون آیا تھا تو میرا خیال ہے کہ اگر وہ ایک ہی انسان ہے جو تجھے بار بار تنگ کرتا ہے تو اس کا دوبارہ فون لازمی آنا چاہئے۔" کامیش کی باتوں کو وہ بھی بے نیازی سے سن رہا تھا۔ سر کو بیڈ کی پشت سے ٹکائے آنکھیں موندنے کی کوشش کی مگر ایک بار پھر وہی نمبر اس کا تعاقب کرنے لگے۔

''اگر دوبارہ کال تجھے اسی نمبر سے آتی ہے تو ہمارے پاس ایک ٹھوس ثبوت آجائے گا اور ہم اپنی کاروائی آگے بڑھا سکتے ہیں۔''
اس کا لہجہ اب قدرے شفیق تھا۔اریب نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا

''اچھا۔۔'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا

''اچھا نہیں۔۔۔ بالکل۔۔۔اب تو اس طرح کر، موبائل ایک طرف رکھ اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کر اور نمبر کو اپنے ذہن سے نکال ہی دے بلکہ بھول ہی جا کہ کوئی تجھے تنگ کرتا ہے'' غنودگی ایک بار پھر اس کی طرف بڑھنے لگی تھی

''صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ خود بھی سو اور مجھے بھی سونے دے۔۔'' طنزیہ کہا

''سمجھدار کے لئے اشارہ ہی کافی ہے'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا اور ایک بار پھر دھڑام سے بستر پر گرنے کی آواز سنائی دی تھی۔

''کامیش۔۔۔!!'' اس نے جبڑے بھینچتے ہوئے کہا تھا، لبوں پر خود بخود ایک ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔آج بھی یہ دوستی ہمیشہ کی طرح بجھے چہرے پر مسکراہٹ لانے میں کامیاب رہی تھی۔

''یہ ہوئی نا بات۔۔اب سو جا۔۔گڈ نائیٹ'' یہ کہتے ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا جبکہ وہ موبائل کو ہاتھ میں لئے کئی ثانیے خیالوں کی دنیا میں ایک انجان مسافر کی طرح بھٹکتا رہا۔کبھی اس نمبر کے بارے میں سوچتا تو کبھی کامیش کے کہے گئے الفاظ کو زیرِ غور لاتا۔کافی تنگ و دو کے بعد وہ ایک نتیجہ پر پہنچ چکا تھا۔

''شاید کامیش ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں خود سے کہا تھا۔نیم روشن کمرے میں اس کے چہرے کے تاثر کسی چٹان کی طرح مضبوط دکھائی دے رہے تھے۔آنکھوں کی چمک آنے والے حالات سے لڑنے کے لئے پوری تیار تھیں۔

''میرے لئے اس unknown نمبر کی شناسائی حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔۔آخر برسوں کے اس راز کو اب فاش ہونا ہی ہوگا۔۔اور میں اس راز کو فاش کر کے ہی دم لوں گا'' اس نے مصمم لہجے میں کہا تھا۔

آبِ استادہ

آرزو ہے کہ میرا قصہ شوق
آج میرے سوا کہے کوئی

جنوری کا اختتام بھی بارش کے ساتھ ہو رہا تھا۔ رات گیارہ بجے کے قریب وہ کمرے میں داخل ہوا تو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہے تھے۔ دھیمے قدم پل بھر کے لئے رکے اور نظریں کھڑکی سے باہر کچھ دیکھنے لگیں جہاں چاروں اور اندھیرے کا راج تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا کے سنگ کھڑکی کے راستے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے جسم میں ایک احساس سرایت کر گیا۔ غموں کو ایک پل کے لئے پسِ پشت ڈال کر پرفسوں ماحول کو یادداشت میں نقش کرنے کی غرض سے وہ بالکونی کی طرف بڑھا اور کھڑکی کے داہنی طرف دیوار سے ٹیک لگا کر برستی بوندوں کو دیکھنے لگا۔ سیاہ بادلوں میں رات کی مسافت طے کرتی بوندیں تازگی کا احساس بخش رہی تھیں۔

''اسلام آباد میں تو بارش بن بلائے مہمان کی طرح جب دل چاہتا ہے چلی آتی ہے۔'' کامیش آج جب وہ نئی شرٹ پہن کر آیا تھا تو یک دم موسم کی خرابی کے سبب وہ مکمل طور پر بھیگ چکی تھی۔ جس پر اس نے منہ بگاڑ کر کہا تھا۔

''تو تم اپنی کار میں ایک عدد چھتری نہیں رکھ سکتے؟ آخر اتنے برس ہو گئے تمہیں اسلام آباد میں سکونت اختیار کئے ہوئے مگر مجال ہے جو تم نے یہاں کے ماحول کا کبھی کوئی اثر بھی قبول کیا ہو۔'' اپنے الفاظ پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ امڈ آئی تھی۔ پلکیں جھپکتے ہوئے اس نے ایک بار پھر بارش کی بوندوں پر اپنا دھیان جمایا

''کامیش بھی ناں۔۔۔ کبھی سدھرے گا نہیں'' اس نے زیرِ لب کہا تھا

''کون نہیں سدھرے گا جناب؟'' اپنے عقب سے آواز سنی تو وہ برجستہ پلٹا۔ وہاں سحر فاطمہ تھیں۔ جو ہاٹ کافی لے کر آئی تھیں

''ماما جان آپ؟ ابھی تک سوئی نہیں؟'' آگے بڑھ کر اس نے سحر فاطمہ کے ہاتھ سے کافی کا کپ لیا تو انہوں نے پیار سے اس کے رخسار کو تھپتھپایا

''تم شاید بھول رہے ہو، تمہارے اس سوال کا میرے پاس ہمیشہ سے ایک ہی جواب ہوتا ہے'' یہ کہہ کر وہ بیڈ کی طرف بڑھیں اور

بیڈشیٹ سیٹ کی۔اریب نے ذرا دماغ پر زور ڈالا تو ہلکا سا مسکرا دیا

''یہ تو صحیح کہا آپ نے۔۔ماما جان۔۔۔'' کافی کا ایک سپ لیا اور آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔سامنے ٹیبل پر اسائنمنٹ کے ورقے بکھرے پڑے تھے۔لیپ ٹاپ بھی sleep پر تھا۔

''تو پھر پوچھتے کیوں ہو، ہر بار؟'' وہ اب تکیہ صحیح پوزیشن پر رکھ رہی تھیں۔جواب میں وہ مسکرا دیا اور کافی پر نظریں جما کر اٹھتی بھاپوں کا بغور جائزہ لیا

''ماما جان آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' برجستہ اس نے سوال کیا تھا

''ہاں۔۔'' وہ اب وارڈروب کی طرف بڑھ کر صبح کے لئے اریب کی پینٹ شرٹ نکال رہی تھیں

''دیپا سار میں ہمارے کوئی رشتے دار رہتے ہیں؟'' اریب کے اس سوال پر وہ بری طرح چونکی تھیں۔آنکھوں میں بے یقینی کی کیفیت نمودار ہوئی۔سرد رات میں بھی ایک حدت ان کے جسم میں سرایت کر گئی۔اریب سحر فاطمہ کی اس کیفیت کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ترچھی نگاہیں مسلسل سحر فاطمہ کو ہی اپنا مرکز بنائے ہوئے تھیں۔

''یہ کیسا سوال ہے؟'' انہوں نے متحمل سوال کو ٹالا تھا

''بس ویسے ہی۔۔آپ بتائیں ناں۔۔دیپا سار یا پھر انڈونیشیا میں کہیں بھی ہمارے رشتے دار رہتے ہیں؟'' وہ کافی کا کپ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے تھامے صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا جبکہ سحر فاطمہ اپنی جگہ پر استادہ تھیں۔

''رشتے داروں کا تو پتا نہیں مگر تمہارے بابا جان کا بزنس تو ہے ناں وہاں۔۔'' اس سے پہلے کہ وہ ان کی جانب بڑھتا سحر فاطمہ نے وارڈروب کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کیا اور واش روم کی طرف بڑھ دی تا کہ پینٹ شرٹ وہاں رکھ سکے۔

''اوہ۔۔یہ تو صحیح کہا آپ نے۔بابا جان کا بزنس ہے۔'' اس نے اچنبھے لہجے میں کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔سحر فاطمہ باہر آئیں اور اس کے ہاتھوں سے خالی کپ لیا۔

''اور یہ بیٹھے بیٹھے تم انڈونیشیا میں رشتے داریاں کیوں نکالنے لگ گئے؟ اپنی پڑھائی پر دھیان دو۔۔کون کہاں رہتا ہے؟ اس کو چھوڑو۔۔سمجھے تم۔۔'' ہلکا سا تھپڑ اس کے سر پر مارا تو وہ مسکرا دیا

''ماما جان۔۔میں نے تو بس ویسے ہی سوال کیا تھا'' اس نے بچگانہ انداز میں کہا تھا

''تم اور تمہارے سوال۔۔اتنے بڑے ہو گئے مگر مجال ہے تمہارے سوالوں میں کمی آئی ہو؟'' انہوں نے خوشگوار انداز میں کہا تھا۔وہ واپس جانے کے لئے پلٹیں

''ماما جان۔۔میرے سوال کبھی ختم نہیں ہونگے۔'' ایک عمیق سوچ میں وہ ڈوبتا چلا گیا

''ایسے تمہیں لگتا ہے۔۔ چلو اب اچھے بچوں کی طرح سو جاؤ۔ گیارہ سے بھی اوپر وقت ہو چکا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئیں جبکہ وہ اپنی سوچوں میں غرق تھا اور سحر فاطمہ کے یک دم چونک جانے رویے کو یادداشت کا حصہ بنا رہا تھا۔

☆......☆......☆

کوئی حالت تو اعتبار میں ہے

خوش ہوا ہوں، ملال پر اپنے

کلاس اٹینڈ کرنے کے بعد وہ دونوں خاموشی کے ساتھ چلے جا رہے تھے۔ موسم آج قدرے بدلا بدلا سا تھا۔ مدہم سی دھوپ بادلوں کے سینے کو چاک کرتے ہوئے خنکی کو گھٹانے کی اپنی تئیں سعی کر رہی تھی۔ کامیش کی نظریں تو بدلتے موسم کی بدلتی رتوں کے سنگ تھیں مگر دل تو کسی اور کے سحر میں جکڑا ہوا۔ جس کی کڑیوں کو وہ چاہ کر بھی توڑ نہیں پا رہا تھا۔ اریب دونوں ہاتھوں کو جینز میں لئے نگاہوں کو زمین پر مرکوز کئے ایک گہری سوچ میں غرق تھا۔ جو یقیناً بلینک کالز پر اٹکا ہوا تھا۔

دونوں ایک دوسرے سے بے نیاز ساتھ ساتھ تھے۔ گہری خاموشی کو توڑنے والا کوئی اور نہیں ہانیہ تھی۔ جسے دیکھتے ہی کامیش کے چہرے پر جیسے بن موسم کے بہار امڈ آئی تھی۔

''ہانیہ۔۔۔ تم کہاں چلی گئی تھی؟ کلاس کے بعد میں ایک وقت تک وہاں تمہارا انتظار کرتا رہا تھا'' کامیش اسے دیکھتے ہی بول اٹھا تھا

''بس کچھ نوٹس تیار کرنے تھے۔۔۔ اس لئے لائبریری چلی گئی'' اس نے جواز بتایا اور اریب پر نگاہ دوڑائی جو اب بھی قدموں کی طرف دیکھتے ہوئے کسی سوچ میں غرق تھا

''تمہیں کیا ہوا اریب؟ کوئی مسئلہ پیش ہے تمہیں؟'' ہانیہ کے سوال پر اس نے نگاہیں اٹھا کر گھورا۔ بلاشبہ ان نگاہوں میں آج بھی وہی حقارت تھی جو پہلے دن سے چلتی آ رہی تھی مگر ہانیہ کو تو جیسے اب اس کی عادت ہو چکی تھی۔ اُس نے گردن جھٹک دی۔

''ہاں۔۔ پریشان تو ہے اریب۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ اسے کچھ عرصے سے۔۔۔'' کامیش کے بات مکمل کرنے سے پہلے ہی اریب نے اسے ٹوکا۔

''کامیش۔۔۔'' اس نے دھیرے سے جبڑے بھینچے تھے۔ ہانیہ اب بچی تو نہ تھی فوراً سمجھ گئی۔ اسے پہلی بار دونوں کے درمیان اجنبیت محسوس ہوئی۔ نگاہیں چراتے ہوئے اس نے بناوٹی مسکراہٹ کو چہرے پر سجانے کی کوشش کی تھی۔

''مجھے کینٹین سے کچھ اسائنمنٹ پیپر لینے ہیں۔ میں لے کر آتی ہوں۔۔'' وہ جبراً مسکرائی اور وہاں سے کھسک گئی۔ کامیش نے گھور کر اریب کی جانب دیکھا تو وہ بھی کچھ نادم دیکھائی دیا تھا۔ اپنے گریبان کی طرف جھانکا تو غلطی خود کی ہی نظر آئی۔

''اریب تمہیں آخر مسئلہ کیا ہے؟ کیوں ہاتھ دھو کر بے چاری ہانیہ کے پیچھے پڑے رہتے ہو؟ وہ تو بس تم سے بات کرنا چاہتی ہے

اور تم ہو کہ اس کو ہمیشہ بے عزت کرتے رہو گے۔" کامیش نے سخت لہجے میں مذمت کی تھی۔اریب بھی کچھ پشیماں دیکھائی دیا تھا۔کامیش نے مٹھیاں بھینچ کر اپنا غصہ اتارنا چاہا

"میں نہیں جانتا کہ تم اس سے کیوں اتنا چڑتے ہو لیکن اریب۔۔۔کسی کے خلاف خود سے کوئی گمان کر لینا اچھی بات نہیں۔"اس کے شانوں کو دھیرے سے چھوا تھا

"لیکن جو میں نے پڑھا ہے اس کی لکیروں میں وہ؟" وہ اب بھی سچائی سے بھاگنے کی کوشش میں تھا

"مجھے اس کی پرواہ نہیں۔۔۔" بے نیازی کے ساتھ اس نے اپنی نگاہیں پھیر لیں تو اریب بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔استفہامیہ آنکھیں کامیش کو تکتی رہیں مگر وہ دکھے دل کے ساتھ نگاہوں کو کہیں اور ہی مرکوز کیے رہا۔

"کامیش۔۔۔" ایک بار پھر اس نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن وہ پہلے ہی وہاں سے چل دیا اور اس کا ہوا میں معلق ہاتھ بنا منزل کو پہنچے ہی واپس پلٹ آیا۔کامیش سیدھا ڈپارٹمنٹ کی طرف بڑھ رہا تھا جبکہ وہ وہیں کھڑا اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔خالی اور پہلے سے الجھے ہوئے ذہن میں اب ہانیہ اپنے معصوم چہرے کے ساتھ جلوہ فروز تھی۔جانے کیوں آج پہلی بار وہ حق پر محسوس ہوئی تھی۔دھیرے سے نگاہیں اس نے کینٹین کی طرف بڑھائیں تو ہانیہ کی نگاہوں کو الجھا ہوا پایا۔کھلی زلفیں ہوا کے سنگ لہرا رہی تھیں۔شفون کا دوپٹہ کندھے سے پھسلا جا رہا تھا مگر وہ اسے سنبھالے ہوئے تھی۔ہاتھوں میں ایک فائل تھی۔جسے کھولے وہ کچھ نوٹس ڈھونڈ رہی تھی۔

"کسی کے خلاف خود سے کوئی گمان کر لینا اچھی بات نہیں۔" کامیش کے الفاظ ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔اس نے جھرجھری لی اور کچھ سوچتے ہوئے اپنے قدم اُس طرف بڑھائے

"یہ لیجیے۔۔۔"اس نے شاپ بوائے کو سو روپے دیئے اور واپس پلٹی تو اریب سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔نگاہیں الجھیں مگر اس نے نظریں چرا لیں۔بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کیا اور نوٹس کو سینے سے لگاتے ہوئے وہ سائیڈ سے کھسک گئی۔پہلی بار ایک عام سی صورت نے جسے پہلی بار دیکھتے ہی اس کے دل میں نفرت کا احساس جنم لیا تھا،اسے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا تھا۔اس کی جھکی پلکیں، شرم و حیا کا پیکر لگ رہی تھیں۔اگرچہ پہلی بار دیکھتے ہی گھٹیا اور ذلیل جیسے الفاظ سے اریب نے اس کا خیر مقدم کیا تھا مگر آج وہ الفاظ معدوم ہو کر رہ گئے۔

"ہانیہ۔۔" اس نے دھیرے سے پکارا تو اس کے قدم رک گئے۔دونوں ایک دوسرے کی جانب پشت کیے کئی لمحے کھڑے رہے۔ہانیہ سوچتی رہی اور وہ الفاظ ڈھونڈتا رہا مگر شروعات تو اسے ہی کرنی تھی۔اسی لئے پلٹا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔اس کی پلکیں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"وہ۔۔۔میں۔۔۔" وہ ہچکچا رہا تھا یا پھر الفاظ مل نہیں رہے تھے

”دیکھو اگر تم معافی مانگنے آئے ہو تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے کچھ غلط نہیں کیا بلکہ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں ہی تم سے بے تکلف ہو رہی تھی۔ سمجھ رہی تھی شاید تم سے بات کر کے تمہاری دوستی کی حق دار ٹھہر سکوں مگر شاید میں یہ بھول چکی تھی جس دل میں پہلے ہی غلط فہمیاں موجود ہوں، وہاں نئے رشتے کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ مجھے معاف کر دیجیے گا مسٹر اریب عالمگیر، جو میں نے آپ سے دوستی کی امید رکھی۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔۔ بھول چکی تھی کہ آپ کے اور میرے سٹیٹس میں بہت فرق ہے۔ آپ جیسے رف مخمل پر چلنے والے ہم جیسی غریب لڑکیوں کو دیکھنا تک پسند نہیں کرتے تو دوستی تو بہت دور کی بات ہے۔“ متحمل انداز میں اس نے اریب کے وجود پر ایک زبردست ضرب لگائی تھی۔ وہ ہکا بکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آنکھیں یک ٹک انکار کرنے کی سعی کر رہی تھیں مگر وہ تو اسے باتوں کی پیوند سے مورت بنا چکی تھی۔ سانس لیتی مورت۔۔ جو ہو بہو کسی زندہ وجود کے مشابہہ تھی۔

”آئندہ میں کبھی تمہارے راستے میں نہیں آؤں گی۔۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دی۔ چال میں انتہا کا سکوت اور وقار تھا۔ وہ اسے بری طرح پچھاڑ کر جا رہی تھی۔

”نن نہیں ہانیہ۔۔“ اس کے الفاظ اتنے دھیمے تھے کہ شاید وہ خود بھی سن نہیں پایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ بہت دور جا چکی تھی۔

”میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا تو نہیں تھا۔۔“ وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ ایک بوجھ اس کے دل پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ ہانیہ گردن کو ہمیشہ کی طرح اکڑا کر چلی جا رہی تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا بھی اس نے اپنی شان کے خلاف سمجھا تھا یا شاید اب وہ پلٹ کر کبھی دیکھے گی بھی نہیں۔ ایسا اریب نے گمان کیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کافی گلٹی محسوس کر رہا تھا۔ سہانا موسم اسے اب خزاں کے مترادف لگ رہا تھا جو اس کے جذبات کا قاتل نکلا تھا۔ اس کی پیشانی پڑھ لینے والی خصلت آج پہلی بار اس کے لئے پشیمانی کا باعث بنی تھی۔

☆......☆......☆

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی

ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

الماری میں کپڑے رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ ایک سفید لباس سے مس ہوئے تو جسم میں ایک جھرجھری پیدا ہوئی۔ آنکھیں یک ٹک اس سفید قمیض کو تکنے لگیں۔ وقت کی دھاڑیں جیسے پل بھر کے لئے آگے بڑھنے سے اجتناب کرنے لگی تھیں۔ نیم روشن کمرے میں اگرچہ اس وقت وہ تنِ تنہا تھی مگر اس سفید قمیض کا وجود مبہم سا آنکھوں میں لہرانے لگا۔ آنکھوں میں شبنم مجتمع ہوئی جو آنسو کی شکل اختیار کرنے جا رہی تھی۔

”امی۔۔ امی۔۔“ باہر سے عاطی بھاگتا ہوا آیا تھا۔ عاطی کی آواز سنتے ہی اس نے ہتھیلی سے چمکتی پلکوں کو پونچھا۔ عاطی نے پلو

کو پکڑ کر جھنجوڑا تھا

"امی مجھے بیس روپے چاہیے۔۔" وہ الفاظ دہراتا جاتا اور پلو کو کھینچتا جاتا مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ انہیں پونچھتے پونچھتے بھی ایک قطرہ عاطی کی ہتھیلی پر جا گرا

"امی۔۔۔" اس نے حسرت کے ساتھ خدیجہ کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو آج مرجھایا ہوا نظر آیا۔ چھوٹی سی جان اپنی ماں کے بجھے ہوئے چہرے کو تو پہنچان ہی سکتی تھی۔

"بیس روپے کس لئے چاہیے امی کی جان کو؟" گلوگیر آواز میں جوش پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر کوشش ناکام رہی۔

"امی آپ رو رہی تھیں؟" سادہ سے الفاظ نے خدیجہ کے جسم میں جھرجھری پیدا کر دی۔ آنسوؤں کو پیتے ہوئے گلے کو ذرا سا کھنکارا اور دونوں ہاتھوں میں عاطی کے چہرے کو سموتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

"نہیں میری جان۔۔۔ ہم کیوں روئیں گے بھلا؟" آواز میں کرب جانے کیوں بڑھتا جا رہا تھا۔ خدیجہ نے اسے اپنے سینے سے لگایا تو آنسوؤں کی جیسی جھڑی لگ گئی۔ یادیں اور جذبات سب مل کر بہنے لگے۔ پلکیں جھپکیں مگر کوئی کنارہ نہ ملا۔ ننھا عاطی ماں کے ان جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ حیران و پریشاں علیحدہ ہوا۔

"امی جان۔۔ آپ کو کہیں pain ہو رہا ہے؟" ننھی جان کا چہرہ بھی اب مرجھایا ہوا محسوس ہوا تھا

"نہیں۔۔۔" لبوں کو بھینچتے ہوئے خدیجہ نے کہا تھا

"پھر آپ رو کیوں رہی ہیں؟ امی جان۔۔ اگر کوئی بات ہے تو آپ مجھے بتائیں۔۔ میں بڑا ہو گیا ہوں ناں۔۔ آپ کی سارے دکھ دور کر دوں گا۔۔۔" وہ کہتا جا رہا تھا جبکہ وہ آنکھوں میں نمی لئے کسی مبہم سے وجود کو تراش رہی تھی۔ جواب اوجھل ہو چکا تھا۔

"آپ کو کسی کی یاد آ رہی ہیں۔۔؟" اس بار خدیجہ کے جسم میں جھرجھری ہوئی۔ نہ وہ نفی میں گردن ہلا سکی اور نہ سچ بتا سکی۔ بس عاطی کو ایک بار پھر سینے سے لگا کر یادوں کے سمندر کو مات دینا چاہی تھی۔

☆......☆......☆

دل مضطرب سے گزر گئے، شب وصل اپنی ہی فکر میں

نہ دماغ تھا نہ فراغ تھا، نہ شکیب تھا نہ قرار تھا

خاموشی نے آج اس کے دل کی راہ لی تھی۔ سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا وہ بار بار لیمپ آن آف کئے جا رہا تھا۔ تلملاتی روشنی میں اس کا چہرہ پل بھر کے لئے روشن ہوتا اور پھر دوبارہ اندھیرے میں ڈوب جاتا۔ فائل کے پیپرز ٹیبل پر بکھرے پڑے تھے۔ بال پوائنٹ اس کے بائیں ہاتھ میں تھی جو کہ ٹیبل پر ہی اس نے بچھایا ہوا تھا۔

''کیا میں نے واقعی ہانیہ کے ساتھ غلط کیا ہے؟ کیا اس کے ساتھ ناروا سلوک رکھنا غلط تھا؟'' ضمیر کی آواز اس کے وجود کو جھنجوڑ رہی تھی۔ اپنا سر کرسی کے ساتھ ٹکایا تو آنکھوں میں ہانیہ کا چہرہ لہرایا۔ برجستہ آنکھیں کھول لیں۔

''نہیں۔۔۔ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔۔'' اپنے خیالات کو جھٹکتا ہوا سٹڈی ٹیبل سے کھڑا ہوا اور دھیمے قدموں کے ساتھ بالکونی کی طرف بڑھا۔ ہاف بازو سرمئی رنگ کی ٹی شرٹ میں ملبوس اس کا وجود اپنے اندر ایک طوفان سمیٹے ہوئے تھا۔

''میں ہانیہ کے بارے سوچ بھی کیسے سکتا ہوں؟'' دوسری بار اس نے اپنے آپ کو ملامت کیا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو ہر شے کو اسی طرح بکھرے ہوئے پایا۔ گردن دوبارہ سامنے آسمان کی طرف کی جہاں ہر طرف اندھیرا تھا۔ ہلال بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ تاروں کی روشنی بھی کسی مسیحا کی تلاش میں تھی۔

''ایک ایسا وجود جس سے میرا کوئی تعلق نہیں، جس کا چہرہ دیکھنا میں پسند نہیں کرتا۔ آج میرے حواس پر اتنی گرفت حاصل کر چکا ہے کہ میرا دھیان اپنے خیالات سے ہٹنے نہیں دے رہا۔ ایسا کیوں؟'' اندر سے ایک آواز آئی تھی۔ چہرے پر عجب پریشانی کا عالم تھا۔ پیشانی کی سلوٹیں اضطرابی کیفیت کو اجاگر کر رہی تھیں۔ وہ بے مقصد آسمان کو گھورتا جا رہا تھا۔

''یہ ملال میرے اندر اتنا طوفان برپا کیوں کر رہا ہے؟ فقط دو جملے۔۔۔ کہہ دینے سے اتنی اضطراب کی سی کیفیت؟'' اس نے اپنے اندر جھانکنا چاہا تھا تو الفاظ کے نشتر خود اس کے وجود کی طرف بڑھتے دیکھائی دیئے۔ کبھی حقارت آمیز نگاہیں تو کبھی زہر آلود الفاظ۔۔ کیا یہ اسی کا وجود تھا؟ حیران و پریشاں وہ کئی ساعتیں کھڑا ہوا میں اپنا عکس دیکھتا جا رہا تھا۔

''بہت غلط کیا میں نے۔۔۔'' آخر میں ہانیہ کی پرنم آنکھیں اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر گئی تھیں۔ وہ ہار چکا تھا۔ ضمیر کی ضرب بڑی گہری تھی تبھی تو اس کے پور پور کو ہلا کر رکھ دیا۔

''بات چاہے جو بھی ہو، مجھے اس انداز میں ہانیہ سے بات کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔'' وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا

''مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے۔۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے اس سے معافی مانگنی چاہیے'' وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

''کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا۔ ہر انسان میں اچھائی کے ساتھ برائی چھپی ہوتی ہے۔ کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے کے لئے برائی کو پسند کرے۔ اگر اُس میں کوئی خامی ہے تو اس خامی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی اچھائیوں پر نظر ڈالنی چاہیے۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف ہوا کہ ایک خامی کے بدلے ہزار اچھائیوں کو نظر انداز کر دیا جائے؟ بعض باتیں تو سچ بھی نہیں ہوتیں بس انسان اپنے سے گمان کر لیتا ہے اور گمان کے پیچھے چلنے والے کبھی فلاح نہیں پاتے۔'' حاعفہ کی باتیں اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھیں۔ جس سے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوتا محسوس ہوا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی۔

''شکریہ حاعفہ۔۔۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔۔۔'' لبوں کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ وہ دوبارہ سٹڈی ٹیبل پر آ بیٹھا

"تمہاری باتوں نے مجھے اپنی غلطی کا احساس دلایا ہے" اس نے بال پوائنٹ کو اٹھایا اور بے دھیانی میں پلین کاغذ پر حاعفہ کا نام لکھا۔ جسے وہ ایک وقت تک دیکھتا رہا۔

☆......☆......☆

اشک تر، قطرہ خون، لخت جگر، پارہ دل

ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہہ نکلا

زلیخا بی بی چولہے کے پاس بیٹھی گاجریں کاٹ رہی تھیں۔ ابان ابھی کچھ دیر پہلے ہی کام سے آیا تھا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ہانیہ اپنے کمرے سے نکلی اور چولہے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی

"امی۔۔ دیکھاؤ میں گاجریں کاٹ دوں، آپ دوسرا کام کر لو۔۔" زلیخا بی بی نے بنا کچھ کہے ہاتھ میں پکڑی چھری اسے دی تو وہ پرانت سمیت گاجریں اٹھا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ چہرے پر قدرے سنجیدگی تھی۔

"ہانیہ۔۔ میرے کپڑے استری کر دیئے؟" ابان کی آواز آئی تھی تو اس نے نچلے دانتوں سے اوپر کا ہونٹ کاٹا

"سوری بھائی۔۔۔ میں ابھی کرتی ہوں" اس نے وہیں چھری رکھی اور چارپائی سے کھڑی ہو گئی

"اور یہ گاجریں؟" زلیخا بی بی نے چمچا چارپائی کی طرف گھماتے ہوئے کہا تھا

"یہ۔۔۔ یہ میں آ کر کرتی ہوں۔۔ بھائی نے صبح جاتے ہوئے کہا تھا۔ مگر میں بھول گئی" اس نے گردن پھیر کر دیکھا اور پھر ابان کے کمرے میں چلی گئی۔

"توبہ ہے۔ یہ لڑکی جو کوئی کام وقت پر کرلے۔ جب تک پاکیزہ تھی۔ کتنا سکون تھا اس گھر میں۔۔۔ ہر کام وقت پر ہو جایا کرتا تھا۔۔" ماں کا دل بھر آیا تھا۔ بیٹی کی جدائی دل پر قہر برسا رہی تھی۔

"امی۔۔۔!!" آواز پر نظر خود بخود دروازے کی جانب اٹھی۔ وہاں پاکیزہ تھی۔ ہمیشہ کی طرح سادہ سے لباس میں، چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑی مگر جلد ہی وہ خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی۔ نگاہیں ذرا ہاتھوں کی جانب سمٹیں تو افسردگی اور خفگی نے ڈیرہ جما لیا۔ ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ زلیخا بی بی تقریباً دوڑتی ہوئی دروازے کی جانب لپکیں

"پاکیزہ۔۔۔ میری بیٹی؟ یوں اچانک؟ خیریت تو ہے ناں؟ اور یہ بیگ؟ رہنے کے لئے آئی ہو؟ اور اسلم؟ وہ کہاں ہے؟ وہ بھی ساتھ آیا ہے ناں؟" ماں کا دل ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بیٹھتا جا رہا تھا۔ گردن پھیر کر باہر کی جانب دیکھا مگر وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ پاکیزہ کی جانب دیکھا تو خاموشی کے تسلسل کو پایا۔ طوالت پکڑتی یہ خاموشی زلیخا بی بی کے دل کی دھڑکنوں پر زبردست ضرب لگا رہی تھیں۔ دوسری طرف خاموش نگاہیں اپنے اندر ایک طوفان کو سینتے ہوئے تھیں۔ پانی جانے کہاں سے ان میں بھرتا جا رہا تھا۔

''امی۔۔!!'' گندھی ہوئی آواز میں وہ زلیخا بی بی کے سینے سے جا لگی تھیں۔آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔زلیخا بی بی ہراساں سب کچھ سمجھ جانے کے باوجود انجان بنی پاکیزہ سے سوال وجواب کر رہی تھی۔

''پاکیزہ۔۔۔بتا تو سہی ہوا کیا ہے؟'' دونوں شانوں سے پکڑ کر خود سے اسے علیحدہ کیا

''امی۔۔۔وہ۔۔۔اسلم۔۔۔'' وہ روتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو سینتے کی کوشش کر رہی تھی مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے

''وہ۔۔اسلم کیا؟ دیکھ جلدی بتا۔۔ہوا کیا ہے؟ میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔۔'' پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔آنکھوں میں بے یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔

''اسلم نے مجھے طلاق دے دی۔۔۔'' آسمان سے جیسے بجلی آگری تھی۔ایسا جھٹکا لگا کہ زلیخا بی بی گرتے گرتے بچی تھی۔اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔جسم سے جیسے روح نکل کی چکی تھیں۔بے جان مورت، یک ٹک پاکیزہ کے اجڑے وجود کو تک رہی تھیں۔جو بچوں کی طرح سسکیاں بھر رہی تھی۔

''آپی۔۔۔'' باریک سی آواز عقب سے آئی تھا۔وہاں ابان اور ہانیہ تھے۔دونوں کے وجود بھی بے حس وحرکت اپنی جگہ پر جامد تھے۔پل بھر میں کیسی قیامت آن ٹوٹی تھی۔

''طط۔۔طلاق؟ یہ کیا بکواس کر رہی ہے تُو؟'' ہڑبڑاتے ہوئے زلیخا بی بی نے کہا تھا اور ساتھ ہی اس کے وجود کو بری طرح جھنجوڑا تھا۔

''ضرور تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔وہ ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔سمجھی تُو۔۔۔'' ماں کا دل تھا کہ یقین کرنے کو تیار ہی نہیں تھا۔اس کے شانوں کو بری طرح نوچتے ہوئے جھنجوڑ رہی تھی جبکہ پاکیزہ کی گردن نفی میں ہلتی جا رہی تھی۔ہانیہ آگے بڑھی اور پاکیزہ کو چھڑوانے کی کوشش کی۔ابان ابھی تک صحن میں بچھی چارپائی کے ساتھ کھڑا پاکیزہ کو تکتا جا رہا تھا۔آنکھوں میں ایک بار پھر ماضی کا منظر لہرانے لگا۔طلاق۔۔۔اجڑتا گھر۔۔اجڑی زندگی۔۔۔سمجھوتہ۔۔۔ماتم۔۔۔ادھورا پن۔۔۔سناٹا۔۔۔

''دیکھ اگر اسلم اور تیری لڑائی ہوئی ہے تو میں سمجھاؤں گی اسلم کو۔۔چل میرے ساتھ۔۔'' دائیں کندھے کو باہر کی جانب جھٹکا دیا۔پاکیزہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔ہانیہ نے آگے بڑھ کر اسے حوصلہ دیا۔

''امی۔۔'' ہانیہ کی پر اشتعال نگاہیں زلیخا بی بی کی جانب تھیں۔

''اسلم نے آپی کو طلاق دے دی ہے۔۔۔'' اس بار ہانیہ تقریباً چلائی تھی

''چپ۔۔۔ایک دم چپ۔۔۔کوئی طلاق نہیں ہوئی۔۔ایسے کوئی طلاق ہوتی ہے۔شادی کو ابھی ایک مہینہ نہیں ہوا اور اُس

نے طلاق دے دی۔۔ کیوں؟'' حقیقت سے بھاگنے کی کوشش ناکام گئی تھی۔ ایک بار پھر دونوں شانوں کو بری طرح جھنجوڑا گیا تھا

''بول۔۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ بول۔۔۔'' تھپڑوں کی بارش کرتے ہوئے زلیخا بی بی بار بار استفسار کر رہی تھی

''امی۔۔۔ چھوڑو آپی کو۔۔۔'' ہانیہ پاکیزہ کی ڈھال بننے کی کوشش میں تھی جبکہ اُس کی آنکھوں سے فقط آنسو جاری تھے۔

''بولتی کیوں نہیں اب؟ بتا۔۔۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں؟'' اس بار نگاہیں ابان کی جانب اٹھی تھیں۔ زلیخا بی بی نے ان نگاہوں کا تعاقب کیا تو حقیقت خود بخود سامنے آگئی۔ ابان پر جیسے دوسری بار بجلی آن گری تھی۔ اس کی وجہ سے اس کی بہن کا گھر اجڑ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں سامنے دیکھ رہی تھیں مگر سب کچھ مبہم سا تھا۔ ہر شے دھندلی دیکھائی دے رہی تھی۔

''بھائی۔۔۔'' ہانیہ نے بلانا چاہا مگر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اور زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند کر دیا۔ ماضی نے حال کو تہس نہس کر دیا۔ خوشیاں پانے کی تمنا ایک بار پھر لا حاصل رہی۔ پرانی دراڑ نئے رشتے کو اپنے اندر نگل گئی۔

ہانیہ پاکیزہ کو اپنے ساتھ اندر لے گئی جبکہ زلیخا بی بی وہیں کھڑی اپنے پھوٹی قسمت کا ماتم مناتی رہی۔ بڑے بیٹے کی بیوی طلاق لے کر چلی گئی۔ چھوٹی بیٹی طلاق لے کر واپس گھر آگئی اور اب تیسری۔۔۔ ہانیہ۔۔۔؟؟؟ جانے اُس کی قسمت میں کیا لکھا تھا؟

☆......☆......☆

آج دیپا سارا اور پاکستان میں واقع عالمگیر انڈسٹریز کی کمبائن ویڈیو کانفرنس تھی۔ مسٹر جہانزیب نے پاکستان کا چارج سنبھال لیا جبکہ ان کے سیکرٹری نے دیپا سارا کا۔ پاکستان کی طرح یہاں بھی تمام سیکرٹری اور جنرل سیکرٹری جمع تھے۔ باہر کے کسی بھی آدمی کو اندر آنے کی اجازت نہ تھی تاکہ کمپنی کے کسی راز کو باہر نکلنے سے روکا جا سکے۔ اسی وجہ سے باقی سٹاف کو چھٹی پر بھیج دیا گیا۔ سیکیورٹی کا بھی اچھا انتظام تھا۔ سورج کی ٹھنڈی کرنیں کھڑکیوں سے چھنتے ہوئے کیبن میں داخل ہو رہی تھیں۔

''جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، پچھلے چند ماہ سے عالمگیر انڈسٹریز کو جتنا benefit ہو رہا ہے وہ سب نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو آئندہ چند ماہ میں کمپنی اپنی سیلز اور پروڈکشن کو Balance کرنے کے برابر بھی نہیں رہے گی اور ایسا کیوں ہے؟ یہ سب شاید آپ سب اچھی طرح سے جانتے ہیں۔۔'' سیکرٹری نے فرنٹ پر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ باقی سب باتوں کو دھیان سے سن رہے تھے۔ ملٹی میڈیا پر پاکستان کی ٹیم نظر آ رہی تھی۔ جس کی سربراہی خود جہانزیب کر رہے تھے۔

''بس اسی مسئلے کے حل کے لئے آج کی میٹنگ arrange کی گئی ہے تاکہ آپ سب سے مشاورت کی جا سکے'' یہ کہتے ہی اس نے ملٹی میڈیا کی طرف اشارہ کیا جس کا مطلب تھا کہ وہ سب جہانزیب کی تقریر کے منتظر تھے۔ ایک سیکرٹری نے جہانزیب کے سامنے مائیک سیٹ کیا۔ ماحول میں قدرے خاموشی چھائی رہی مگر یہ خاموشی کمرہ کانفرنس تک محدود تھی۔ ذرا کھڑکی کے راستے باہر کی جانب لان کے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا جاتا تو وہاں کاروں کا ایک ہجوم تھا۔ مصروف زندگی اپنی ڈگر پر گامزن تھی مگر انہی میں ایک شخص سرتاپا

اپنے وجود کو ڈھانپے چلا آرہا تھا۔اس کا سایہ درختوں کے جھنڈ میں ڈھکا چھپا تھا۔لمبا سا اوور کوٹ پہنے وہ یا تو کوئی جاسوس گمان ہو رہا تھا یا پھر کوئی چور۔مگر کسی کے پاس اتنا وقت کہاں تھا؟

اس نے ایک لمحے کے لئے رک کر بائیں جانب دیکھا تو کئی ایشیائی لوگ نظر آئے۔جو سڑک کے دوسری جانب بڑی سی دکان پر ضروریات زندگی کی اشیاء خریدنے میں مصروف تھے۔اس نے نگاہوں کو اوپر کی جانب اٹھایا

Lima Puluh Persen Tabungan (پچاس فیصد بچت) لکھا ہوا پایا۔چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور پھر گردن جھٹک کر اپنی راہ لی۔ابھی وہ بمشکل دو قدم ہی چلا ہوگا کہ کسی نے اس کا دائیں بازو مضبوطی سے پکڑ لیا جس پر اُس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر نے جنم لیا مگر اس نے بڑی ہی مہارت سے انہیں ضبط کیا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔راہ گیر اس شخص کو سن گلاسز پہنے دیکھ کر ذرا سا جھجکا۔

”کون ہو تم؟“اس نے ڈچ زبان میں پوچھا

”مجھے اسپتال کا پتا چاہیے۔میں پاکستانی ہوں اور میرا بیٹا سخت بیمار ہے۔“اس راہ گیر نے حلیہ کو پس پشت ڈال کر اردو میں اپنا معاملہ پیش کیا تو اس نے ایک عمیق نگاہ سے اس اجنبی کے وجود کو ٹٹولا اور پھر آگے چلتا بنا۔

”خدا کے لئے۔۔مجھے اسپتال کا پتا بتا دو۔۔“اس نے پیچھے سے بازو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنا اصرار جاری رکھا۔ایک بار پھر اس نقاب پوش شخص نے اسے جھٹک کر آگے بڑھنا چاہا تو اُس نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی۔

”سیدھے طریقے سے جو کچھ ہے مجھے دے دو۔۔“اس نے متجل اپنا ہاتھ اس کے کوٹ میں گھسا دیا اور بندوق کی نال اس کی کمر کے پیچھے کرتے ہوئے جبڑے بھینچے

”ورنہ۔۔۔“وہ اب معصوم نظر آنے والا اجنبی یک دم وحشی پن پر اتر آیا تھا

”مجھے پہلے ہی علم ہو چکا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔“

”اچھا۔۔تو پھر نکال دو، جو کچھ تمہارے پاس ہے“اس نے ایک بار پھر سرگوشی والے لہجے میں کہا تھا جس پر یہ طنزیہ مسکرایا۔

”اور اگر نہ کردوں تو؟“ابرو اچکاتے ہوئے کہا

”تو اگلی سانس قبر میں جا کر لینا۔۔۔“اس نے پستول کی نال اس کی کمر میں چبھائی ہی تھی کہ اس نے ایک جست لگا کر دن دھاڑے لوگوں کو ہراساں کر کے لوٹنے والے شخص پر ایک لات دے ماری۔یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ اسے سنبھلنے تک کا موقع نہ ملا۔پاس سے گزرتی پولیس موبائل بھی وہاں آرکی تو غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے جرم میں اس شخص کو گرفتار کر لیا گیا۔لوگوں کے ہجوم میں اس شخص کو پکڑنے والے کے بابت پوچھا گیا تو دھول کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

"حیرت ہے۔۔!!اتنی جلدی وہ شخص کہاں جا سکتا ہے؟" ایک پولیس آفیسر نے زیر لب کہا اور پھر اس مجرم کو موبائل میں بٹھا کر چل پڑے۔ جب موبائل کی آواز ذرا مدہم ہوئی تو وہ شخص ایک جھاڑی کے پیچھے سے آوارد ہوا۔ ہاتھوں سے مٹی جھاڑی۔

"دو نمبر لوگ کبھی دو نمبری نہیں چھوڑتے۔۔۔" اس نے سوچا اور پھر استہزائیہ انداز میں گردن جھٹک کر آگے بڑھ دیا۔

لوگوں کا ہجوم دھیرے دھیرے گھٹتا گیا اور وہ سیدھا کمپنی کے صدر دروازے کے باہر آ پہنچا۔ سر اٹھا کر دیکھا عالمگیر گروپ آف انڈسٹریز کا بورڈ نمایاں نظر آیا۔ کچھ لمحے یونہی ضائع کرنے کے بعد وہ آگے بڑھا۔ اندرونی دروازے سے ذرا کچھ فاصلے پر دو گارڈز کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک فون پر باتوں میں مصروف تھا جبکہ دوسرا سگریٹ کے دھویں فضا کے سپرد کر رہا تھا۔ وہ ان دونوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھا تو سگریٹ پیتا ہوا گارڈ اس طرف متوجہ ہوا۔ اپنے چہرے کو اوور کوٹ کی ٹوپی سے ڈھانپے وہ سیدھا اندر کی جانب جا رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر۔۔۔ آپ نہیں جانتے کہ آج کسی بھی اجنبی کا داخلہ ممنوع ہے؟" وہ گارڈ اس کی طرف بڑھا مگر اس نے کچھ نہ کہا

"آج پورا اسٹاف چھٹی پر ہے۔ آپ کل آیئے گا" اس بار بھی وہ بدستور خاموش رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ زور زبردستی کرتا، اس نقاب پوش نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک کارڈ نکالا اور گارڈ کو تھما دیا۔ گارڈ نے سرسری طور پر کارڈ کو دیکھا تو جیسے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھوں میں کپکپی طاری ہو گئی۔ اس نقاب پوش نے متجل اپنا کارڈ لیا اور اس سے پہلے کہ گارڈ مزید کچھ کہتا وہ اندر چلا گیا۔ گارڈ یونہی کھڑا اس کو جاتا دیکھ رہا تھا۔

میٹنگ اپنے شیڈل کے مطابق جاری تھی۔ تمام باتیں رازدارانہ ہو رہی تھی مگر ایک اجنبی تھا جو ان سب پر نظر جمائے ہوئے تھا۔ وہ شخص سیدھا کنٹرول روم کی طرف گیا۔ کنٹرول روم کا سٹاف بھی چھٹی پر تھا۔ فقط ایک کنٹرولر تھا۔ جو فی الحال وہاں موجود نہ تھا۔ وہ شخص کنٹرول روم میں داخل ہوا اور سی سی ٹی وی کیمرے کے ذریعے بند کمرے میں ہونے والی تمام باتوں کو جان کر الٹے پاؤں لوٹ گیا۔

☆......☆......☆

آیایاں سے جانا ہے تو جی کا چھپانا کیا حاصل

آج گیا یا کل جاوے گا صبح گیا یا شام گیا

بدلتے موسم کی پہلی رُت دل میں اترتی جا رہی تھی۔ پھولوں کی بھینی خوشبو معطر ہوا میں تحلیل ہو کر تازگی کا نیا احساس جسم میں اجاگر کر رہی تھی۔ پچھلے ایک گھنٹے سے کلاس جاری تھی مگر اس کا ذہن لمحہ بھر کے لئے لیکچر کی طرف نہ گیا۔ دوسری رو میں کامیش کے ساتھ بیٹھے اس کی نگاہیں پہلی رو کی تیسری نشست پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جہاں ہانیہ اپنے گردونواح سے بے نیاز لیکچر میں اس قدر محو تھی کہ اس کے وجود کا حصار کرتی نگاہوں سے وہ لاعلم تھی۔ سیاہ دوپٹے کو شانوں پر بکھیرے، پونی کو ایک انداز سے باندھے ہوئی تھی۔ پہلی بار وہ اس کے وجود کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟ میں اسے ایسے کیوں دیکھ رہا ہوں؟'' برجستہ وہ چونکا تھا۔ خود اپنے اندر جھانکا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ اس کا پورا جسم جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''میں نے صرف اپنے کیے کی معافی مانگنی ہے اور بس۔۔۔ یوں اس کے بارے میں سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے مجھے۔۔'' وہ خود اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا۔ خیالات کے لشکر کو نئے ڈگر پر گامزن کرنے کی خاطر اس نے برق رفتاری کے ساتھ اپنے سامنے رکھے خالی پیپر پر لکھنا شروع کر دیا اور لکھتا ہی چلا گیا بغیر دیکھے کے وہ کیا لکھ رہا ہے؟ سوچ کا مرکز تو ہانیہ سے دور جانا تھا۔ اتنا دور کے اس کا مبہم عکس بھی وہ بھول جائے مگر ایسا کہاں ممکن تھا؟ ذہن کا لاشعور حصہ ابھی تک اس عکس کو اپنا تعاقب کرنے پر اکسا رہا تھا۔

''چاہے کچھ بھی ہو جائے۔۔ مجھے اس کے بارے میں نہیں سوچنا۔۔'' اس نے خود سے کہا اور صفحہ پلٹ کر آغاز سے دوبارہ لکھنا شروع کر دیا

''پھر کس بارے میں سوچوں؟'' ذہن نے دریافت کیا، جسے اپنے اندر سمانے کے لئے کچھ نہ کچھ چاہیے تھا

''حاعفہ کے بارے میں۔۔۔'' دل نے بنا سوچے سمجھے کہا

''نہیں۔۔۔ حاعفہ تمہاری چاہت ہے، اور چاہت کا یہ درجہ نہیں کہ اسے محض اس وقت اہمیت دی جائے جب آوارہ خیالات سے پناہ مقصود ہو'' ذہن نے دلیل دی

''صحیح۔۔۔ کہا'' دل نے تائید کی

''پھر۔۔ کس بارے میں سوچوں؟'' وہ دوسرا صفحہ بھی آدھا لکھ چکا تھا۔ ہاتھ اتنی تیزی سے لکھ رہے تھے کہ اس کی نگاہیں بھی پڑھنے سے قاصر تھیں۔

''انڈونیشیا۔۔۔ ہاں۔۔ تمہیں انڈونیشیا میں موجود بلیک میلر کے بارے میں سوچنا چاہیے۔۔ وہ کون ہے؟ کیوں بلینک کالز کرتا ہے تمہیں؟ کیا چاہتا ہے تم سے؟ اس بارے میں سوچو۔۔۔'' اس نے ایک بار پھر کچے دھاگوں کو جوڑنا شروع کیا

''لیکن کامیش نے تو تمہیں منع کیا تھا۔۔۔ کہ اُس وقت تک اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو جب تک وہ دوبارہ فون نہیں کرتا۔۔ تاکہ کنفرم ہو جائے کہ اس کا تعلق دیپا سارسے ہی ہے'' ایک بار پھر اسے تنقید کا سامنا ہوا۔ وہ اب تیسرے صفحے پر تھا۔

''اریب۔۔ یہ کیا لکھ رہے ہو؟'' کامیش کے دفعتہً سوال پر وہ بری طرح چونکا تھا۔ ذہن اور دل کی لڑائی یک دم تھم گئی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کلاس میں بھی ایک شور وغل کا سماں تھا۔ شاید لیکچر ختم ہو چکا تھا۔

''لیکچر لکھ رہا ہوں؟'' اس کی زبان سے برجستہ جاری ہوا تھا۔ جس پر کامیش چونکا اور ان صفحات کو اٹھایا اور انہیں پلٹ کر حیرت بھری شکنیں پیشانی پر ابھاریں

''اسے تم لیکچر کہتے ہو؟ انگلش لٹریچر کا لیکچر تھا اور تم نے کیا اول فول لکھا ہے۔۔سمجھ بھی نہیں آ رہا۔۔'' کامیش نے بے اعتنائی برتتے ہوئے وہ صفحات اریب کے ہاتھوں میں تھما دیے اور گردن جھٹک کر اپنی فائل کو سیٹ کرنے لگا۔اریب کی نگاہیں لاشعوری طور پر ان لکھے گئے لفظوں پر گئیں تو وہ بری طرح چونکا۔کیا یہ سب کچھ اس نے لکھا تھا؟ مگر کیسے؟ کیوں؟اور کس طرح؟''

''امپاسیبل۔۔۔!!'' وہ حیرت کا شکار تھا۔صفحات کو پلٹ کر وہ بغور لفظوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر حیرت کی بات تھی کہ وہ اب اپنے لکھے گئے لفظوں کو پڑھنے سے بھی قاصر تھا

''مجھے تو لگتا ہے تُو پاگل ہو چکا ہے اُن بلینک کالز کو لے کر۔۔'' کامیش نے جملہ کسا تھا

''لیکن اُن بلینک کالز کا ان لکھے گئے لفظوں سے کیا لینا دینا؟'' اس نے اس قدر دھیرے سے کہا تھا کہ شاید وہ خود بھی نہ سن سکا تھا۔کامیش اٹھا اور باہر کی طرف چل دیا۔

''یہ کون سی زبان ہے؟'' وہ ابھی تک ان صفحات کو ہاتھ میں لئے نئی سوچ میں غرق تھا۔ایک کے بعد ایک نئے حادثے اس کی زندگی میں پیش آ رہے تھے اور وہ ان سب سے انجان تھا۔

''ایسا لگ رہا ہے کہ اس طرح سے لکھے گئے الفاظ میں نے پہلے بھی کہیں دیکھے ہیں'' وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا جب کامیش پلٹا تھا

''اب یہیں بیٹھنے کا ارادہ ہے کیا؟'' اس نے بیزاریت کا لبادہ اوڑھے کہا تھا۔کامیش کی بات سن کر وہ برجستہ پلٹا اور سوچ کی ڈوری کو کچھ دیر کے لئے الجھا ہی رہنے دیا۔

''آ رہا ہوں'' اس نے تمام صفحات کو فائل میں رکھا اور کامیش کے ساتھ چل دیا۔اب دونوں ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہے تھے۔

''مجھے کافی کی طلب ہے۔۔'' اریب نے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانے کی بجائے کینٹین کا رخ کیا

''مگر مجھے تو نہیں ہے'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا

''کیا کہا؟ تجھے کچھ کھانا نہیں'' وہ حیرت کا شکار ہوا۔پچھلی باتوں کو بھول کر مزاح کے موڈ میں آ گیا

''ہاں۔۔۔'' اس نے ایک بار پھر کہا

''واؤ۔اٹس امیزنگ۔۔۔مسٹر کامیش مہتا نے کھانے پینے سے منع کر دیا۔آج کی بریکنگ نیوز ہے یہ تو'' وہ اسے چڑانے کی غرض سے بولا تھا

''تجھے جو سمجھنا ہے سمجھ،کافی پی کر ڈیپارٹمنٹ آ جانا،میں وہاں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔۔'' اس نے رخ بدلا

''اچھا کافی نہ پی مگر میرے ساتھ تو چل لے۔۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ گرتے گرتے بچا۔

"اریب۔۔۔" اس نے جبڑے بھینچے مگر زیادہ کچھ نہ کہا اور کینٹین کی طرف چل دیا۔ وہاں ہانیہ پہلے سے موجود تھی۔

"چل وہاں جا کر بیٹھتے ہیں۔۔۔" ہانیہ کو دیکھتے ہی کامیش کے چہرے پر بہار امڈ آئی تھی۔ جسے اریب نے آڑے ہاتھوں لیا۔

"پہلے تو موصوف آنے کے لئے ہی تیار نہیں تھے اور اب بات بیٹھنے تک جا پہنچی۔۔۔ بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔۔" اس نے سرگوشی والے لہجے میں کہا تھا

"تجھے جو سمجھنا ہے سمجھ۔۔۔ میں تو وہاں بیٹھ رہا ہوں۔۔" وہ سیدھا ہانیہ کے پاس جا بیٹھا اور اریب نے کافی کا آرڈر دیا اور ان دونوں کی کمپنی کو جوائن کیا۔

کامیش اور ہانیہ آپس میں محو گفتگو رہے جبکہ اریب موقع کی تلاش میں تھا کہ وہ ہانیہ سے اپنے رویے کی معافی مانگے مگر وہ تو اسے مسلسل اگنار کر رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی سی تبسم بکھیرے اس کا انداز کچھ بدلا بدلا سا تھا۔ کامیش کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

"شاید ناراض ہے۔ اسی وجہ سے میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی۔۔" اس نے خود ہی گمان کیا۔ اس نے نگاہیں نیچے کیں تو ویٹر ایک کپ کافی لے کر آ حاضر ہوا۔

"یہ کیا تم نے فقط اپنے لئے کافی آرڈر کی؟ کامیش کے لئے نہیں؟" اتنی دیر میں اس نے پہلی بار اریب کو مخاطب کیا تھا

"کامیش نے منع کر دیا تھا۔ بس اس لئے۔۔۔" اریب نے وضاحت کی اور ہاتھ کپ کی طرف بڑھایا

"مگر کیوں؟" اس بار وہ کامیش سے مخاطب تھی

"بس ویسے ہی۔۔ دل نہیں چاہ رہا۔۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے بات کو معمولی جانا اور اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"ویسے ہی کیوں؟" پیشانی پر چند ایک شکنیں ابھریں پھر برجستہ وہ جوش سے بولی جیسے کچھ یاد آ گیا ہو

"اچھا اچھا۔۔ مجھے پتا چل گیا تم کیوں نہیں کھا پی رہے آج۔۔۔" اس کی آنکھوں میں شرارت کا عنصر نمایاں تھا

"کیوں؟" اس نے اچنبھے لہجے میں دریافت کیا۔ خود اریب کی نگاہیں بھی ہانیہ پر تھیں

"آج مہا شیوراتی ہے ناں۔۔ اس لئے۔۔" اس نے کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ بھرا۔ مگر اریب کے ساتھ ساتھ کامیش بھی حیران تھا

"تمہیں کیسے معلوم؟" محو حیرت سے کامیش نے پوچھا

"بس دیکھ لو۔ تم نے تو بتایا نہیں۔۔۔ مجھے پتا چل ہی گیا۔۔" اس نے ایسے ظاہر کیا جیسے کوئی محاذ سر کر لیا ہو

"یس یُو آر رائیٹ۔۔۔" کامیش نے تصدیق کی

"اب مجھے تو نہیں پتا کہ تمہارے ہاں مہا شیوراتی کو وِش کیسے کرتے ہیں۔ اس لئے میرے انداز میں ہی تمہیں مہا شیوراتی

مبارک ہو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا جس پر وہ بھی ہنس دیا مگر ایک وجود تھا جس کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ اریب کا چہرہ یک دم سرخ ہو چکا تھا۔

"تھینک یُو۔۔۔ تمہیں بھی مبارک۔۔۔" اس نے ہاتھ بڑھایا

"موسٹ ویلکم۔۔۔" ہانیہ کا گرمجوشی کے ساتھ کامیش کا ہاتھ تھامنا اور پھر یوں جواب دینا اریب سے قطعاً برداشت نہ ہوا۔ وہ ہڑبڑاتے ہوئے اٹھا تو اس کا ہاتھ کافی سے جا ٹکرایا اور ساری کافی کامیش پر جا گری

"اوہ۔۔ یہ کیا کیا؟" کامیش کی بجائے ہانیہ نے کہا تھا۔ خود اپنا ٹشو نکال کر کامیش کو دیا

"کوئی بات نہیں ہانیہ۔۔۔ میں ابھی بس واش کر کے آتا ہوں۔۔" وہ اسے جھاڑتا ہوا واش روم کی طرف چل دیا۔ جبکہ اریب کی آگ بگولہ نگاہیں ہانیہ پر براجمان تھیں۔

وہ اپنی مٹھی کو بھینچے، مسلسل ٹیبل کر طرف گھور رہا تھا۔ کامیش کے جانے کے بعد وہ اریب کو کسی خاطر میں نہ لائی۔

"تم نے کامیش کو اُس کا تہوار وش کیوں کیا؟" اس نے جبڑے بھینچے دھیمے لہجے میں کہا تھا

"بھئی، اس کے مذہب کا اتنا اہم تہوار تھا، اور پھر وہ اس شہر میں ہے بھی اکیلا، کوئی رشتے دار بھی تو نہیں ہے یہاں اس کا۔۔ اس لئے میں نے سوچا کہ اسے اس کا تہوار وش کر کے اس کی خوشی میں شریک ہو جاؤں۔۔"

"اس کا کوئی رشتے دار یہاں اس کے پاس ہے یا نہیں۔۔ تمہیں اس کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن تمہیں مہاشیوراتی وِش نہیں کرنی چاہیے تھی۔" اس نے گہری نگاہ ہانیہ کے وجود پر ڈالی تھی۔ اس بار وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور اس کی نگاہوں کی حدت کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے بے نیازی سے اس کی طرف دیکھا

"پوچھ سکتی ہوں؟ کیوں؟" اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تھے

"کیوں کہ وہ ایک ہندو ہے اور تم مسلمان۔۔۔ اور ایک مسلمان کے لئے یہ قطعاً جائز نہیں کہ وہ ایک ہندو کے مذہبی تہوار میں شریک ہو" یہ سن کر وہ ایک لمحے کے لئے اریب کو تکتی رہی۔

"تمہاری سوچ اتنی کنزرویٹو ہے اریب۔۔ یہ میں نے سوچا نہیں تھا" وہ الٹا اسی کو موجب الزام ٹھہرانے لگی تھی

"میری سوچ کو چھوڑو۔ تم اپنی فکر کرو۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔۔ پچھلے کچھ عرصے سے تم کامیش میں کچھ زیادہ ہی انٹرسٹ لے رہی ہو۔ تمہارے لئے بہتر ہے کہ تم کامیش سے دور رہو۔۔۔" اس نے انگلی کے اشارے سے اسے تنبیہ کی تھی

"جسٹ شیٹ اپ مسٹر اریب عالمگیر۔۔۔" جواباً اس نے بھی انگلی اٹھا کر جواب دیا تھا

"تم ہوتے کون میری زندگی میں انٹرفیئر کرنے والے؟" اس بار کچا چبا جانے والی نگاہیں ہانیہ کی تھیں۔ اریب نظریں چرا کر رہ گیا۔

''یہ میری زندگی ہے۔۔ ہانیہ عمردار کی زندگی ۔۔اور ہانیہ عمردراز اپنی زندگی میں کسی کا عمل دخل برداشت نہیں کر سکتی''

''صحیح کہا تم نے۔۔۔ یہ تمہاری زندگی ہے۔ تمہیں اسے اپنے مطابق جینے کا حق ہے مگر یہ مت بھولو تم ایک مسلمان لڑکی ہو اور کامیش ایک ہندو لڑکا'' اس بار اریب کا لہجہ کچھ ٹھنڈا پڑ چکا تھا

''مجھے معلوم ہے۔۔۔'' اس نے گردن پھیر کر جواب دیا

''اچھی بات ہے۔۔ تو میں یقین رکھوں کہ آئندہ تو لمٹس کا خیال رکھوگی؟'' وہ اب جواب کا منتظر تھا۔ جس پر وہ تپ اٹھی تھی

''تمہیں آخر پرابلم کیا ہے اریب؟ جب میں تمہارے آگے پیچھے پھرتی تھی، تب تم سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور اب جب میں نے تمہیں اگنار کر کے کامیش کو دوست بنانا چاہا تو تم مجھے کامیش کے ساتھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔۔۔'' اس نے جھلا کر جواب دیا تھا

''اس کا جواب تم اچھے سے جانتی ہو'' برجستہ اس نے جواب دیا تھا

''نہیں معلوم مجھے۔۔۔ سمجھے تم۔۔۔ اور ایک بات یاد رکھو۔۔۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔۔ تم مجھے کامیش کے پاس جانے سے نہیں روک سکتے۔۔۔'' وہ اریب کو چیلنج کرتے ہوئے وہاں سے چل دی۔ جبکہ وہ اس کو جاتا دیکھتا رہا تھا۔ آنکھوں میں نفرت اور یاسیت دونوں کے ملے جلے تاثر تھے۔ کہاں وہ اس سے معافی مانگنے آیا تھا، اور کہاں ایک نئے جھگڑے کی بنیا رکھ چکا تھا۔

☆......☆......☆

بس اے میرؔ مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو

تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

موسموں کے پیمانے لبریز تھے۔ آج پھر بادلوں نے شہر اقتدار کا رخ کیا تھا۔ کوئل کی کوک اور چڑیوں کے گیت جا بجا سنائی دے رہے تھے مگر اس کی سماعت تو ابھی تک پاکیزہ کے لفظوں میں بری طرح الجھی ہوئی تھی۔ اس کی ویران آنکھیں اور ان میں ایک لمحے کے لئے سجنے والے سپنے اس کے سبب کانچ کی کرچیوں کی مانند بکھر چکے تھے۔ چمکتی آنکھیں پل بھر کے لئے کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھیں۔ گھر جاتے جاتے اس کے قدم راہ میں ہی رک گئے اور وہ پارک کے باہر بنے بینچ پر ہی بیٹھ گیا۔

''غریبوں کی تقدیریں بھی کس قدر آپس میں ملی ہوتی ہیں۔ ایک کا گھر برباد ہوتا ہے تو دوسرا اُس کا اثر کس قدر جلدی قبول کرتا ہے'' اپنی ذات کا شکوہ وہ اپنے آپ سے کر رہا تھا

''کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میری وجہ سے پاکیزہ بھی اپنے گھر سے رخصت ہو جائے گی۔ میری زندگی کا زہر، اس کی خوشیوں کا قاتل بن جائے گا'' وہ اپنے آپ کو جتنا ملامت کر سکتا تھا، کر رہا تھا

''اسلم۔۔۔ تم نے تو میری بہن سے ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر کیوں اس وعدے کو محض ماضی کے حادثے کی بھینٹ

چڑھا دیا۔ اگر تمہارے دل میں وہ خلش آج بھی باقی تھی تو تم نے پاکیزہ سے نکاح ہی کیوں کیا؟ کیوں؟'' وہ فضاؤں سے مخاطب تھا یا پھر اپنے آپ سے؟ زمانے سے ہارے ہوئے شخص سے تو شاید اس کا اپنا وجود بھی منہ موڑ لیا کرتا ہے تو یہ تو پھر زمانہ تھا۔ کیوں اس کی طرف پلٹ کر دیکھتا؟ برق رفتار زندگی اپنے ڈگر پر گامزن تھی۔ کسی کے پاس اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کا بھی وقت نہ تھا۔

''ابان۔۔!! تم یہاں؟'' جانا پہچانا سا وجود ایک بار پھر اس کے سامنے آٹھہرا مگر اس بار دل کے نہ تار ہلے اور نہ ہی کسی جذبے کو سینے میں پیدا کرنے کی جسارت کی۔ بے خواب آنکھوں نے پلکیں اٹھائیں تو ماضی کا چہرہ، ہر بار کی طرح اس کی راہ میں رکاوٹ بن گیا

''تم ایسے کیوں بیٹھے ہو یہاں؟'' وہ شکیلہ تھی۔ اس کی محبت مگر آج محبت مٹی کی تہوں میں آلودہ ہو چکی تھی۔ رشتوں کی چادر نے ایک غلاف چڑھا دیا تھا۔ اس نے ابان کے بائیں بازو کو چھوا تو وہ برق رفتاری کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور بنا کچھ کہے بائیں جانب چل دیا۔

''ابان۔۔ کیا ہوا تمہیں؟'' وہ اس کے تعاقب میں تھی۔ شاید کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھی

''مجھے کیا ہونا ہے۔ کچھ بھی تو نہیں۔۔ ایک بہن کے شوہر نے اسے محض اس وجہ سے طلاق دے کر رخصت کر دیا کہ اس کے بھائی نے اُس کے شوہر کی بہن کو طلاق دے دی تھی۔۔ اور تم مجھ سے پوچھ رہی ہو کہ مجھے کیا ہوا ہے؟'' لہجے کی تشنگی میں انتہا کی ترشی اور اجنبیت تھی۔

''اوہ۔۔ تو تم پاکیزہ کی وجہ سے پریشان ہو'' اس بار اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔ راہ گیر گزرتے جا رہے تھے اور وہ فٹ پاتھ پر کھڑے ایک دوسرے سے ہزاروں کوس کی مسافت پر تھے۔

''میں پاکیزہ کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں بلکہ اپنے آپ کو ملامت کر رہا ہوں کہ کیوں ہر بار اپنی فیملی کے لئے دکھ کا باعث بنتا ہوں؟ پہلے اپنی فیملی کے خلاف جا کر تم سے شادی کرنا اور پھر ان کی مرضی کے خلاف جا کر تمہیں طلاق دینا۔۔۔ اور اب اس طلاق کی سزا، بہن کی طلاق کی صورت میں ملنا۔۔۔'' وہ بری طرح الجھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے کی شکن اپنے اندر عجیب سی کیفیت سموئے ہوئے تھے۔

''میں تم سے پوچھتا ہوں، کیوں اسلم نے میری بہن کی زندگی خراب کی؟ کیوں؟ اگر میری بہن کو اپنے ساتھ رکھنا ہی نہیں تھا تو نکاح ہی کیوں کیا؟'' اس نے شکیلہ کو بازوؤں سے بری طرح جھنجوڑا تھا

''ابان۔۔۔ میں نہیں جانتی تھی۔۔ میرا یقین مانو۔۔۔''

''یقین اور تمہارا۔۔۔!!'' ایک جھٹکے سے اُس نے شکیلہ کو پیچھے دھکیل دیا

''مجھے تو اب خود اپنی ذات پر بھی یقین نہیں رہا۔۔'' نگاہیں پھیرتے ہوئے اس نے پارک کی جانب رخ کیا۔ جہاں تازہ ہوا جسم میں اترتے ہوئے نیا احساس جنم دے رہی تھی مگر وہ اس سے عاری تھا۔ بادلوں کا سایہ گھنا ہوتا چلا گیا اور سائے دھیرے دھیرے غائب ہوتے گئے۔

''ایسا مت کہو ابان۔۔۔ میرا یقین کرنے کی کوشش کرو۔۔۔ میں اسلم بھائی کی نیت سے بے خبر تھی۔ اگر مجھے ذرا بھی علم ہوتا تو میں انہیں یہ نکاح کبھی نہ کرنے دیتی۔۔۔'' وہ اپنی چاہت کا یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی یا پھر ایک ریت تھی جو وہ نبھا رہی تھی؟

''ایسا تمہیں لگتا ہے شکیلہ۔۔۔ مجھے نہیں۔۔۔ ہونی کو شاید کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔ بدلے کا احساس ایک بار دل میں جگہ بنا لے تو جب تک مخالف کی سسکیاں اور آہیں اس کی سماعت سے نہ ٹکرائیں، اسے چین کا سانس نہیں لینے دیتیں۔'' اس نے دھیرے سے پلکیں جھپکیں تو ایک موتی رخسار پر بہہ نکلا۔ نگاہیں سامنے مرکوز کیں تو دوسرا موتی بھی لبوں سے جا ٹکرایا اور پھر تیسرا اور پھر چوتھا۔۔۔ وہ تذبذب کا شکار ہوا۔ آسمان پر نگاہیں دوڑائیں تو بوندیں ٹپ ٹپ برسنا شروع ہو چکی تھیں

''ابان۔۔۔'' اُس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر وہ ٹوٹا ہوا وجود اب مزید زخم سہنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا

''تمہیں اب چلے جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ بارش میں تیزی آ جائے'' اس نے دونوں بازو سینے پر باندھ لئے تھے۔ وہ کچھ لمحے یونہی اس کی پشت پر دیکھتی رہی۔ اس آس پر کہ وہ پلٹ کر دیکھ لے مگر وہ نہ پلٹا۔ مینہ نے زور پکڑا۔ اس کا پورا وجود بھیگ چکا تھا۔ ماضی اب دیوار بننے لگا تھا۔

''ابان۔۔۔'' وہ دھیرے سے پکاری تھی مگر یہ آواز اس تک نہ پہنچ سکی اور اس کے قدم مخالف سمت اٹھنے لگے۔ بارش کی بوندیں آسماں سے زمین کی مسافت بہت تیزی سے طے کر رہی تھیں۔ وہ یونہی کھڑا اپنے غم کو قدرے کم کرنے کی سعی میں تھا۔

☆......☆......☆

دانستہ ہے تغافل، غم کہنا اس سے حاصل
تم دردِ دل کہو گے وہ سر جھکا رہے گا

حاعفہ کے قدم آج بے مراد لوٹ رہے تھے۔ تذبذب کا شکار یہ وجود اپنی انگلیوں کو پٹختا ہوا نگاہوں کو سڑک پر جمائے دھیمے قدموں کے ساتھ چل رہا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ آپی مجھے بنا بتائے کہاں جا سکتی ہیں؟'' آج جب وہ خدیجہ کے گھر گئی تو وہاں تالہ لگا ہوا پایا۔ آس پڑوس سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ یہ گھر چھوڑ کر جا چکی ہے۔

''وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔۔۔ انہیں معلوم ہے کہ مجھے ان کی ضرورت ہے۔ ان کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ پھر بھی؟'' وہ نہر کے کنارے فٹ پاتھ چلتی جا رہی تھی۔ نارنجی رنگ کے سادہ سے لباس میں ملبوس وہ عام سے سکارف کو چہرے کے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔

''میری ذات کو ان کی ضرورت ہے۔ مجھے آشوبِ زمانہ سے باہر نکالنے کا وعدہ کیا تھا انہوں نے۔ پھر ایسے کیوں وہ بنا کچھ کہے میری زندگی سے چلی گئیں؟ کہیں مجھ سے کوئی خطا تو سرزد نہیں ہو گئی؟ کہیں میری بات تو انہیں بری نہیں لگی؟'' وہ اپنی ذات میں ہی خامیاں

تراش رہی تھی۔خدیجہ کے دور جانے کا سبب اپنے آپ کو ٹھہرا رہی تھی۔

''بس ایک بار آپی۔۔بس ایک بار واپس آجائیں۔۔مجھے آپ کی عادت ہوگئی ہے۔میں آپ کے بغیر اتنا کٹھن سفر طے نہیں کر سکتی۔۔ابھی تو بہت کچھ مجھے سیکھنا ہے آپ سے۔۔۔آپ کی طرح بننے کا سفر بہت کٹھن ہے، میں اکیلے وہ سفر طے نہیں کر سکتی۔۔مجھے آپ کا ساتھ چاہیے آپی۔۔خدا کے لئے آپ واپس آجائیں۔۔۔پلیز۔۔آپی۔۔۔''اس کی چمکتی آنکھیں دل کے حالات کو سامنے رکھ رہی تھیں مگر وہاں کوئی ایسا نہ تھا جو ان چمکتی آنکھوں کا مطلب جان سکتا۔ڈھیلے قدم خود بخود اپنی منزل کی طرف بڑھتے جا رہے تھے۔آنکھیں سڑک پر ٹکی ہوئی، ذہن خیالات میں بری طرح الجھا ہوا تھا جب کسی نے پیچھے سے اس کے شانوں کو چھوا تھا

''آپی۔۔!!''وہ پر جوش انداز سے پلٹی شاید خدیجہ کے لوٹ آنے کی چاہ تھی مگر چہرے کی تازگی اگلے ہی لمحے کسی آفتاب لبِ بام درخت کی مانند خزاں کا شکار ہوگئی۔چہرہ تو شناسا تھا مگر وہ نہیں جو دل پر اپنا عکس چھوڑ چکا تھا۔

''حاعفہ۔۔تم یہاں کیسے؟اور ڈرائیور نہیں ہے تمہارے ساتھ؟تمہیں اتنی دور پیدل آنے کی ضرورت کیا تھی؟''وہ اریب تھا۔ اس کا غم گسار۔جس نے ایک ہی جملے میں کئی سوال کر ڈالے تھی۔وہ نظریں جھکاتی چلی گئی۔

''اچھا۔۔میرے ساتھ چلو۔۔۔موسم پہلے ہی خراب ہے۔تمہیں سردی لگ جائے گی۔۔چلو۔۔''اس نے پچھلی طرف کھڑی کار کی جانب اشارہ کیا۔وہ بنا کچھ کہے اس طرف چل دی۔اریب کا چہرہ ابھی تک الجھن میں مبتلا تھا۔حاعفہ کے چہرے پر چھائی تاریکی وہ نہ صرف دیکھ سکتا تھا بلکہ اس درد کو محسوس بھی کر سکتا تھا۔

''تمہیں کم سے کم ایک عدد چھتری تو اپنے ساتھ رکھنی چاہیے تھی۔پھوار سے تمہارے سارے کپڑے گیلے ہو چکے ہیں۔''وہ خود میں اس قدر الجھی ہوئی تھی کہ آسمان سے گرتی بوندوں تک کو فراموش کر گئی۔اریب کے کہنے پر بھی وہ ٹس سے مس تک نہ ہوئی اور اپنی نگاہوں کو ونڈ سکرین پر جمائے رکھا۔

''کیا ہوا حاعفہ؟تم اتنی خاموش کیوں ہو؟میں جانتا ہوں تمہیں خاموش رہنا پسند ہے اب لیکن آج۔۔آج تمہاری خاموشی دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے''اس کے لہجے میں فکر تھی۔وہ جواب کا منتظر تھا مگر اس کے پاس اتنا بھی وقت نہ تھا کہ اریب کا سوال ہی سن سکے۔

''آپی۔۔آپ کو مجھے بتانا تو چاہیے تھا ناں؟''دل سے صدا نکلتی جا رہی تھی۔ایک بار پھر اسے ایسا لگا جیسے وہ سب کچھ گنوا چکی ہے۔اپنا اصل سرمایہ، جو اس کی بقا کا ذریعہ تھا۔اس کے ہاتھوں سے چھینا جا چکا تھا۔خدیجہ کا اس موڑ پر اس کو ملنا جب وہ تنہا ہونے جا رہی تھی ۔قسمت کا ایک خوبصورت فیصلہ تھا اور آج اُس کا یوں دفعتہً اس کی زندگی سے چلے جانا۔۔۔وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ بھلا خدیجہ کے چلے جانے سے اس کا کیا بھلا ہو سکتا تھا؟

''حاعفہ؟تم ٹھیک تو ہو ناں؟''اریب نے ایک بار پھر پوچھا تھا مگر اس کے الفاظ ظاہری سماعت سے ٹکرا کر رہ گئے۔کچھ لمحے

یونہی تکتے رہنے کے بعد اس نے کار سٹارٹ کی۔ شاید وہ سمجھ چکا تھا کہ حاعفہ اس کا کسی بھی جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔

''میں یہ تو نہیں جانتا کہ تمہاری دوست تمہیں چھوڑ کر کیوں گئی لیکن اتنا ضرور کہوں گا کسی بھی غلط فہمی کو دل میں جگہ دینے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ اس کا تم پر کتنا بڑا احسان ہے۔'' نگاہوں کو سڑک پر جمائے اریب نے کہا تو وہ بری طرح چونکی تھی۔ نگاہوں کو اریب کی طرف اٹھایا تو اسے بے پرواہ پایا۔ ونڈ سکرین کے کھلے حصے سے آتی ہوا کے سنگ جھومتی چھوٹی زلفیں اس کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ چمکتی آنکھیں اس چہرے کو یک ٹک تکتی جا رہی تھیں۔

''ہو سکتا ہے جیسے اس کا آنا تمہارے لئے رحمت تھا، شاید اُس کے جانے میں بھی کوئی بھلائی چھپی ہو۔'' وہ بنا دیکھے کہہ رہا تھا۔ سٹیئرنگ کو دونوں ہاتھوں سے گھماتے ہوئے وہ سرکلر روڈ کراس کر رہا تھا۔ حاعفہ کی تذبذب نگاہیں جانے کیوں آج اس کو دیکھتی جا رہی تھیں۔ پہلی بار ہواؤں کی سرگوشیاں اس کی سماعت میں راگ الاپنے لگیں جیسے وہ اس سے کہہ رہی ہوں

''جنہیں تم آرزوئے خام سمجھ بیٹھی تھی، ان کو آسمان جاہ پر پہنچانے والا تمہارے سنگ بیٹھا ہے اور تم ہو کہ آزردگی کو مہتاب سے چہرے پر سجائے محبت کے اُساوَل سے اِستحقار کا اظہار کر رہی ہو حالانکہ پیار و محبت کا راہی اِستبرق کی اسارت سے آزاد ہو کر تمہاری طرف قدم بڑھانے کی چاہ میں ہے اب اگر تم آشفتہ نگاہوں سے اس وجود کو دیکھو گی تو تمہارا قلب آخورِ سنگیں کی مانند ہو جائے گا جس کی قسمت میں اُسارا بھی نہیں''

''کیا ہوا؟ ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ اپنے ہی خیالوں میں محو تھی جب اریب کی آواز نے مداخلت کی تھی۔ اس کی نگاہیں شاید اس کے حالِ دل کو پڑھ رہی تھیں۔ اسی لئے اس کا انداز معنی خیز تھا

''کک کچھ بھی نہیں'' اس نے تذبذب انداز میں نگاہیں چرائیں۔ خاموشی کا ایک لامتناہی تسلسل بندھنا شروع ہوا۔ تار سے تار ملتے گئے۔ ڈور لمبی ہوتی چلی گئی۔ اس بار اریب نے بھی اس تسلسل کو نہ توڑا۔ شاید وہ اس کی برداشت کا امتحان لے رہا تھا۔ لبوں کو جنبش دیئے بغیر ڈرائیونگ کرتا رہا۔

درختوں کا سلسلہ دیکھ کر جب نگاہیں بوجھل محسوس ہوئیں تو اسے اریب کی خاموشی کا اندازہ ہوا۔ کن انکھیوں سے اریب کا چہرہ دیکھا تو طمانت کا جہاں آباد پایا۔ جہاں فکر مندی کا ایک عنصر بھی نمایاں نہ تھا۔ کشادہ پیشانی چاند کی مانند تھی جس کی نظریں سیاہ زلفیں اتارتی چلی جا رہی تھیں۔

''تم اتنے بھی برے نہیں ہو۔۔'' دل نے کچھ کہا تھا یا پھر کہنا چاہا تھا مگر لب خاموش رہے

''صد شکر۔۔!! تم نے مانا تو سہی کہ میں اتنا بھی برا نہیں۔۔'' اریب نے بنا دیکھے سرد آہ بھری تھی۔ جس پر وہ بری طرح چونکی۔ لمبی لمبی سیاہ پلکیں سکتے میں جھپکنا بھی بھول چکی تھیں

''تمہیں۔۔۔!!اوہ۔۔It is your quality''اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتی،اس نے خود ہی جواب دے دیا۔جس پر دونوں مسکرا دیئے۔

''حسین چہرے ہمیشہ مسکراتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔اداسی یا یاسیت کا مادہ کھلے ہوئے چہروں پر گرہن کی مانند ہوتا ہے جوان کے قدرتی حسن کو کبھی کبھار ماند کر دیا کرتا ہے''اس کی نگاہیں یک ٹک حاعفہ کے دیدار جام سے سیراب ہو رہی تھیں۔لفظوں کی چاشنی پہلی بار اس کی سماعت کا حصہ بن رہی تھیں۔سے بھی ایسے معلوم ہو رہا تھا جیسے تھم چکا ہو یا پھر اس کی رفتار کسی سنیل کی مانند ہو جو ہر لحہ ٹھہر ٹھہر کر چل رہا ہو۔

''اب مجھے لگتا ہے جیسے میں پہلی والی حاعفہ کے ساتھ بیٹھا ہوں، جو ہر لحہ زندگی کو جیتی تھی۔زندگی کو محسوس کرتی تھی۔جس کے قریب اپنی انا ہی عزیز تھی اور تم جانتی ہو؟ مجھے ایسی ہی حاعفہ پسند تھی۔اپنی ذات کو ترجیح دینے والی۔تھوڑی نٹ کھٹ،تھوڑی ضدی اور تھوڑی سی جھگڑالو قسم کی۔۔۔''اس کا لہجہ شریر ہوتا جا رہا تھا جبکہ وہ یک ٹک اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

اس لمحے کو یادوں میں نقش کرنے کی غرض سے اریب نے کار کو سڑک کے کنارے پارک کیا۔باہر موسم بھی اپنے جوبن پر تھا۔پھوار قطروں کی شکل میں اب تیزی سے برس رہی تھی۔

''ایک بات کہوں اگر برا نہ مانو تو۔۔۔''نگاہیں آپس میں مسلسل الجھ رہی تھیں

''کہو۔۔۔''بنا پلکیں جھپکے جواب دیا تھا

''میرے ساتھ۔۔۔!!!''وہ کچھ کہتے کہتے ٹھہر سا گیا تھا یا پھر وقت کا پہیہ سست روی کا شکار ہو گیا جو اگلے لفظوں کو ہی نگل گیا۔سانسوں کی روانی میں تیزی آ گئی۔ایک سرد لہر نے پورے جسم کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ونڈ سکرین کے کھلے حصے سے بوندیں ہوا کے سنگ اندر آنے لگی۔آنکھیں خود بخود جھکتی چلی گئیں۔شاید وہ جانتی کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے اور شاید اسی لئے اس نے توقف کیا تھا تا کہ ذہن اگلی بات کو جلدی سے قبول کر لے۔

''میرے ساتھ۔۔!!''ایک بار پھر جملہ انہی دو لفظوں پر ختم کر دیا اور ایک گہرا سانس لیا۔آنکھیں پل بھر کے لئے برستی بارش کی طرف پھیریں۔

''تمہیں جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔۔۔''انگلیوں کو پٹختے ہوئے حاعفہ نے کہا تھا

''تم میرے ساتھ کافی پیو گی؟''تیزی کے ساتھ اس نے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔نظریں ایک بار پھر ملیں۔دونوں میں حیرت تھی۔خاموشی کا ایک تسلسل شروع ہوا۔نگاہوں کی تپش میں ایک بے یقینی دیکھائی دے رہی تھی۔سوچ کی ڈوریں بھی کچھ الجھی الجھی سی محسوس ہوئیں۔جنہیں سلجھانے کا کام اریب کے قہقہے نے سرانجام دیا۔لبوں کی پر تپاک مسکراہٹ بامعنی تھی۔نگاہوں کو پھیر کر اس نے ونڈ سکرین پر نگاہ دوڑائی۔کچھ فاصلے پر ایک ڈھابہ تھا۔کافی اور چائے مکس شاپ کا لیبل دیکھ کر اس نے کم سن لڑکے کو اپنی طرف بلایا۔کچھ کہا اور

پھر گردن کو دوبارہ حاعفہ کی طرف موڑا۔ وہ ابھی تک سکتے میں تھی۔ یک ٹک اریب کے وجود کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟'' چٹکی بجا کر نگاہوں کے تسلسل کو توڑا۔

''ایسے نہیں دیکھتے کسی لڑکے کو۔۔۔ کوئی الٹا مطلب لے سکتا ہے'' ایک بار پھر شریر لہجہ گویا ہوا تھا۔

وہ نظریں چرا کر رہ گئی۔ انگلیوں کو پٹختے ہوئے سوچ کی دھاڑوں کو یکجا کیا۔

''یہ کیا سوچ رہی تھی میں؟'' وہ خود سے گویا ہوئی تھی

''جو سوچنے کا تمہیں حق ہے۔۔'' ایک بار پھر اریب نے اپنا حصہ ڈالا تھا

''لیکن مجھے ان سوچوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔۔'' ایک ہی جملے میں اس نے اریب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ خواہشوں کا محل جو وہ ریت کے ذروں سے بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لمحہ بھر میں دھجیاں بکھیر دیں مگر ستم مزید لبوں نے مسکرانا نہ چھوڑا۔ دل ضرور بھر آیا تھا مگر ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی۔

''اچھی بات ہے۔۔!!'' آواز میں پہلے کی سی تازگی نہ تھی۔ ایسا وہ محسوس کر چکی تھی مگر نگاہوں کو اٹھا کر نہ دیکھا۔

بارش کی رم جھم کا رخ اب اریب کی شرٹ کی طرف تھا۔ جب وہ لڑکا کافی کے دو کپ لے کر حاضر ہوا تھا۔ والٹ سے پیسے نکال کر اریب نے اسے تھمائے اور ایک کپ حاعفہ کی طرف بڑھایا۔

''سوچنے کا وقت ختم ہوا جاتا ہے۔ اب ذرا موسم کو انجوائے کیا جائے، ایک کپ کافی کے ساتھ؟'' اس بار وہ ہلکا سا مسکرا دی تھی اور پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے فضا میں پہلی بار دیکھا تھا۔ جہاں ہر سو تازگی کا ایک نیا احساس جنم لے رہا تھا۔ پرندے درختوں کی ٹہنیوں میں بیٹھے بارش کے تھمنے کا انتظار کر رہے تھے۔

''تمہیں پتا ہے اریب؟ جب موم ڈیڈ زندہ تھے تو ایسے موسم میں اکثر پاپا مجھے لانگ ڈرائیو پر لے جاتے تھے اور میں اس موسم سے خوب حظ اٹھاتی تھی۔ ایک بار ایسے ہی رم جھم ہو رہی تھی۔ میں اور ڈیڈ لاہور میں تھے۔ ڈیڈ صبح سے اپنے آفس کے کاموں میں مصروف تھے۔ کچھ فارن آفیسرز سے ملاقات کرنی تھی انہیں۔ لیکن میں ہوٹل میں رہ رہ کر بری طرح اکتاہٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ میرے ایک فون پر ڈیڈ اپنی تمام میٹنگز کو کینسل کر کے میرے پاس چلے آئے اور مجھے چڑیا گھر کی سیر پر لے گئے۔ بارش کی بوندیں آسمان سے زمین کی مسافت طے کرتی رہیں اور میں ان سب سے بے نیاز اپنی دنیا میں مگن تھی۔'' ماضی کا ایک خوبصورت بھنور اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا

''کتنے حسین دن تھے وہ۔۔۔'' سرد آہ بھرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے لیکن جلد ہی اسے اپنے رویے کا بھی احساس ہوا تھا۔

''جنہیں میں نے گنوا دیا۔۔۔'' اپنے آپ کو کوستے ہوئے وہ دھیرے سے گویا ہوئی۔

”حسین دن لوٹ کر بھی آسکتے ہیں۔ انسان کو بار بار پلٹ کر دیکھنے کی بجائے اپنے آگے دیکھنے کی بھی جسارت کر لینی چاہیے ہوسکتا ہے کہ ایک نئی زندگی اپنے ہاتھوں میں خوشیوں کا چراغ لئے تمہاری منتظر ہو؟“ اریب کی بات پر وہ برجستہ پلٹی تھی۔ ایک بار پھر اس کی حسین زلفوں کو چہرے کی نظر اتارتے ہوئے پایا۔ دل میں پھر سے کچھ الگ سا محسوس ہوا۔ ہواؤں نے سماعت میں سرگوشیاں کرنا شروع کر دی اور وہ خاموشی سے بیٹھا حسین موسم میں کافی کا مزہ لے رہا تھا۔

☆......☆......☆

آج کی رات نہ سونا یارو

آج ہم ساتواں در کھولیں گے

تاروں بھری رات میں وہ اپنے بیڈ پر بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا اس کی زلفوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہی تھیں مگر وہ ان سے بے خبر کسی حسین وجود کو اپنے خیالوں کا حصہ بنائے ہوئے تھی۔

”حسین دن لوٹ کر بھی آسکتے ہیں۔ انسان کو بار بار پلٹ کر دیکھنے کی بجائے اپنے آگے دیکھنے کی بھی جسارت کر لینی چاہیے ہوسکتا ہے کہ ایک نئی زندگی اپنے ہاتھوں میں خوشیوں کا چراغ لئے تمہاری منتظر ہو؟“ اریب کے الفاظ بار بار اس کی سماعت سے ٹکرا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جادو اثر کر چکا ہو۔ باتیں دل میں بیٹھتی جا رہی ہوں۔ احساس جو پہلے یک طرفہ تھا اب مخالف جنس کو بھی اپنے سحر میں جکڑ رہا ہو۔ سوچوں کے ان سمندر میں بالوں کی ایک لٹ نے چپو کا کام کیا۔ جسے آنکھوں سے ہٹانے کی غرض سے ہاتھ اٹھایا اور کان کے پیچھے اڑیس دیا۔ لبوں کی مسکراہٹ اجاگر ہوگئی۔ گویا چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا ہو۔

”اریب۔۔۔!!“ لب دھیرے سے گویا ہوئے تھے۔ گزرے لمحات آنکھوں سے ٹکرائے۔ بھیگا موسم۔۔۔ بہکی بہکی سی باتیں۔۔۔ تھوڑی سی شرارت۔۔۔ کافی کا گرم کپ۔۔۔ ماضی کے پنے۔۔۔ اور پھر عاشق کی باتیں۔۔۔

”اوں۔۔۔ ہنوں۔۔۔“ وہ برجستہ بیڈ سے کھڑی ہو کر بالکونی کی طرف گئی اور تاروں کے جھرمٹ میں چاند کو تکنے لگی جو ہو بہو اس کے چہرے سے مشابہہ تھا۔

”تم اتنے بھی برے نہیں ہو، جتنا میں سوچتی تھی۔۔۔“ ایک بار پھر وہ گویا ہوئی تھی۔ پھر سے اریب کا جواب سماعت سے ٹکرایا تو وہ مسکرا کر رہ گئی۔ کچھ لمحے یونہی چاند کو تکتے رہی۔ جب تک خدیجہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے نہ لہرایا۔ اس کی باتیں سماعت کا حصہ نہ بن گئیں۔ دفعتہً چہرے پر چھائی شرارت غائب ہوگئی اور سنجیدگی کا عنصر نمایاں ہوتا چلا گیا۔

”نہیں۔۔۔ یہ میں کیا سوچ رہی تھی؟“ اس نے خود کو جھنجوڑا۔

”میری منزل اریب نہیں ہے۔۔۔“ چاند سے نظریں چرالیں مگر چاند کی چاندنی ابھی تک اس کے اندر اپنے احساس اجاگر کر

رہی تھی۔

"میری منزل تو کوئی اور ہے۔" اس نے یکدم جھالروں کو اپنے اور چاند کے درمیان کر دیا۔ ایک نئی اوٹ جنم لے چکی تھی۔

"مجھے اپنا مقصد نہیں بھولنا چاہیے۔۔ میں اپنی زندگی سے تمام تر رنگینیاں نکال چکی ہوں۔۔ مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے۔۔ قطعا نہیں بھولنا چاہیے۔" اس نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی تھی۔

☆......☆......☆

یوں تو ہیرا بھی ہے کنکر

یوں تو مٹی بھی سونا ہے

وہ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس سی ٹی بجاتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف گامزن تھا۔ چہرے پر شادابی کا عنصر نمایاں تھا۔

"اریب آج تم کافی خوش دیکھائی دے رہے ہو۔۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" جبیں نے اپنے کمرے کے پاس سے گزرتے دیکھا تو جھٹ پوچھ ڈالا

"کیوں، خوش ہونے پر پابندی ہے کیا؟" پلٹ کر الٹا اسی سے سوال کر ڈالا

"خیر۔۔ پابندی تو نہیں ہے مگر تمہارے چہرے کے آثار بتا رہے ہیں کہ تمہارے دل میں اس وقت لڈو پھوٹ رہے ہیں۔۔" جبیں نے ہوا میں تیر چلائے تھے جو عین نشانے پر جا لگے

"لڈو تو خیر پھوٹ رہے ہیں مگر افسوس۔۔۔ وہ لڈو تمہاری قسمت میں نہیں ہے کھانے کے لئے۔۔" اس نے طنزیہ افسوس کیا تھا

"مجھے بھی شوق نہیں ہے۔۔ تمہارے گھسے پٹے لڈو کھانے کا۔۔" وہ بھی جبیں تھی، کہاں خاموش رہنے والی تھی

"بس یہی کہنے کے لئے میرا راستہ روکا تھا۔۔۔ ہنوں" گردن جھٹکتا ہوا وہ آگے بڑھ دیا۔ جبیں کو تشویش ہوئی۔

"یہ تو حاعفہ کے کمرے کی طرف جا رہا ہے۔۔۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں، دونوں میں کیا کھچڑی پک رہی ہے آج کل؟" ابرو اچکاتے ہوئے اس نے چٹکی بجائی اور اریب کے نقش پا پر چلتے ہوئے حاعفہ کے کمرے میں جا پہنچی۔

"مجھے معاف کر دینا اریب مگر میں تم سے بات نہیں کر سکتی۔ مجھے نماز پڑھنی ہے" اس کا لہجہ پہلے جیسا روکھا تھا۔ جس پر وہ حیران تھا

"لیکن حاعفہ۔۔۔۔" اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔

"تمہیں ایک بات سمجھ نہیں آتی اریب۔۔ کہا ناں میں نے۔۔ مجھے کوئی بات نہیں کرنی تم سے۔۔" جانے کیوں اس کے لہجے میں یک دم ترشی اُمڈ آئی تھی۔ جبیں جو کمرے کی چوکھٹ پر کھڑی تھی۔ حاعفہ کے لہجے پر ہکا بکا رہ گئی۔ شاداب چہرہ یک دم مرجھا سا گیا تھا۔ خزاں کی ستم ظریفی نے سارا شوخ پن چھین لیا تھا۔ وہ پلٹا تو جبیں اس کی پلکیں پرنم محسوس کر سکتی تھی مگر لب پر وہی مسکراہٹ تھی جو بے جان

تھی۔مٹھیاں بھینچے وہ دھیمے قدموں کے ساتھ واپس پلٹا تھا۔

''اریب۔۔۔'' غم گساری سے بھرپور لہجہ گویا ہوا تھا مگر وہ کہاں سن سکتا تھا؟ اس کے دائیں جانب سے نکل گیا۔وہ پلٹی تو بس دیکھتی رہ گئی۔ٹوٹا ہوا دل ایک بار پھر کرچی کرچی ہو چکا تھا۔

''حاعفہ۔۔۔!!'' وہ دوبارہ پلٹی جہاں حاعفہ وارڈروب سے جائے نماز نکال رہی تھی

''پلیز جبیں۔۔اگر تم اریب کی سفارش کرنے آئی ہو تو مت کرنا۔۔کیونکہ ابھی میں اچھے موڈ میں نہیں ہوں۔۔'' پہلی بار اس نے جبیں سے اس لہجے میں بات کی تھی۔وہ یک ٹک اس کے وجود کو تکتی رہ گئی۔

''اور نہیں چاہتی کہ اس وقت کوئی بھی بات میرے ذوق کے مخالف ہو۔۔'' اس نے بات کو جاری رکھا اور جائے نماز کو بیڈ پر رکھ کر واش روم کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

باغ ترا اباغباں، تو ہے عبث بدگماں

مجھ کو تو اے مہرباں تھوڑی سی جا چاہیے

آج اریب کا چہرہ کسی قدر بجھا بجھا سا تھا۔پہلی کلاس سے ہی وہ خاموش بیٹھا بس لیکچر سن رہا تھا۔مڈٹرم سے پہلے یہ آخری کلاس تھی۔کل سے مڈسٹارٹ ہو جانے تھے۔تبھی پوری کلاس خاموشی سے لیکچرار کی باتوں کو سن رہی تھی۔اس کا جسم اگرچہ کلاس میں ہی تھا مگر ذہن تو کہیں اور ہی آوارہ گردی کر رہا تھا۔وہ بار بار اسے مجتمع کرتا مگر وہ تھا کہ اپنے ڈگر پر آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''کیا ہوا اریب؟ آج تم کچھ اداس دیکھائی دے رہے ہو؟'' کلاس کے بعد کامیش نے پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں۔۔بس ویسے ہی۔۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا

''پہلے تو مجھے محض شک تھا مگر اب تو یقین ہو چلا ہے کہ ضرور کوئی نہ کوئی بات ہے ورنہ شوخ اریب آج اتنا سنجیدہ۔۔۔ایسا ممکن ہی نہیں۔۔چل اب بتا ناں۔۔کیا بات ہے؟'' وہ اسکے ساتھ ہی کرسی پر آ بیٹھا تھا۔جبکہ وہ اپنی فائل کو تھامے اٹھ کھڑا ہوا

''کچھ نہیں یار۔۔'' اس کے لہجے میں اکتاہٹ تھی

''میں مان ہی نہیں سکتا۔۔بچپن سے تیرا دوست ہوں۔ایک ایک رگ سے واقف ہوں تیری۔یہ بات الگ ہے کہ تُو لوگوں کے دل کی باتوں کو شکنوں سے سمجھ لیا کرتا ہے مگر دوستی میں شکنیں پڑھنے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔سچے دوست لہجے بھی پڑھ لیا کرتے ہیں۔'' وہ دونوں بازوؤں کو سینے کے گرد لپیٹے اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔آنکھیں اریب پر مرکوز تھیں۔اب اریب کے پاس بھی سوائے سچ بتانے کے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔وہ شکست خوردہ شخص کی مانند پلٹا اور ایک گہری سانس لی۔

"بتاناں۔۔اب۔۔" اس نے پیچھے سے اریب کے شانوں پر ہاتھ رکھا تھا۔جس پر وہ پلٹا۔

"تمہیں یاد ہے کامیش۔۔تم نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ تمہاری محبت آب استادہ کی مانند ہے۔تم جھوٹ بول رہے تھے۔تمہاری محبت آب استادہ کی طرح نہیں ہے۔تمہارے دل کی چاہت ہر لحہ اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی ہے۔ہر گزرتا لحہ محبوب کو پانے کا نیا ولولہ اپنے اندر سینتے ہوئے ہے۔میں یہ تو نہیں کہتا کہ تمہاری محبت کتنی سچی ہے مگر تمہاری آنکھوں میں میں نے محبت کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ تمہارے دل میں اپنی چاہت کو پانے کی تڑپ موجود ہے۔جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔" یہ کہہ کر اس نے ایک گہری سانس لی جبکہ کامیش ان باتوں کو بے موقع محل سمجھ رہا تھا۔

"تمہاری محبت کا دریا تو رواں دواں ہے۔اگر تمہیں اپنی محبت کو تشبیہہ دینی بھی ہے تو آب استادہ سے نہیں بلکہ آب رواں سے دو۔کیونکہ آب استادہ تو میری محبت ہے۔بالکل پانی کی طرح ساکت۔جس میں اگر ہوا کے سبب جنبش بھی آجائے تو ہوا کے ساکت ہوجانے پر پہلے جیسا ہوجاتی ہے۔بالکل بے جان۔۔۔ساکت۔۔۔ایسے جیسے،اس میں جان ہی نہیں۔۔۔کوئی روح ہی نہیں۔ایسی محبت،جس میں احساس نام کی حس ہی ختم ہو چکی ہو،آب استادہ کہلانے کی حقدار ہے اور وہ میری محبت ہے۔" وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے حاعفہ کی بے رخی تھی۔جو ایک پل کے لئے تو ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی مگر شاید وہ بھول چکا تھا کہ لہجے کم ہی بدلا کرتے ہیں۔انسان کی فطرت تبدیل نہیں ہوا کرتی۔

"اریب۔۔۔میرے دوست۔۔۔اس میں اتنا غمگین ہونے کی کیا بات ہے؟ یہ عمر روگ لگانے کی نہیں ہے بلکہ زندگی کو انجوائے کرنے کی ہے۔یہ محبت،چاہت زندگی کا حصہ ہے۔اگر کوئی آپ کو ٹھکراتا ہے تو اپنے آپ کو ڈسکرج کرنے کی بجائے اپنے آپ کو ابھارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔اگلے کو دیکھا دینا چاہیے کہ اس نے آپ کو ٹھکرا کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔۔"

"چاہت کوئی کھیل نہیں ہے کامیش۔۔۔جس میں مخالف کو زیر کیا جائے" لہجہ اب بھی افسردہ تھا

"تو محبت بھی کوئی روگ نہیں ہے۔۔۔جسے اپنا سب کچھ سمجھ لیا جائے" فی الفور جواب دیا

"ایسا اس لئے کہہ رہے ہو کیونکہ ہانیہ بھی تمہیں چاہتی ہے۔۔۔" اس نے طنزیہ کہا تھا

"ایسا تمہیں لگتا ہے۔۔۔" وہ استہزائیہ مسکرایا جس پر اریب کو زبردست جھٹکا لگا تھا۔وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے کامیش کو دیکھنے لگا۔

"جیسے تم یک طرفہ محبت کی کشتی پر سوار ہو۔میں بھی ایسی ہی ناؤ میں جھول رہا ہوں۔۔ہاں۔۔یہ بات الگ ہے اس ناؤ میں محبوب کا ساتھ تو میسر ہے مگر کب تک؟ یہ معلوم نہیں۔۔۔" وہ کیا چھپا رہا تھا۔شاید وہ خود بھی جانتا تھا۔پیشانی کی شکنیں ایک بار پھر دل کی باتوں کو سامنے رکھ رہی تھیں۔وہ آگے بڑھ دیا۔

"اس کا مطلب ہے دونوں سجنوں کا دکھ یکساں ہے۔۔۔" اریب نے ماحول کو بدلنے کی کوشش کی تھی

''کہہ سکتے ہو۔۔'' وہ بھی مسکرا دیا تھا مگر دونوں جانتے تھے کہ یہ مسکراہٹ بناوٹی ہے۔

☆......☆......☆

کھانے کی میز پر سب جمع تھے۔ جہانزیب صاحب بالمعمول اخبار پڑھ رہے تھے جبکہ ماریہ سحر فاطمہ کے ساتھ ناشتہ ڈائننگ ٹیبل پر لا کر رکھ رہی تھی۔ جبیں اور حاعفہ بھی خاموشی کے ساتھ وہاں براجمان تھیں۔

''تو پھر کب سمٹ ہو رہی ہے رپورٹ؟'' جہانزیب نے برجستہ سوال کیا تھا

''بابا جان بس اسی ویک سمٹ ہو جائے گی۔۔۔'' حسام نے جواب دیا تھا۔

''گڈ۔۔۔ تو پھر کیا ارادہ ہے؟'' انہوں نے نیوز پیپر کو فولڈ کرتے ہوئے حسام پر نگاہیں جمائی تھیں

''ارادہ کیا ہے؟ جاب سرچ کروں گا۔۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تھا

''جاب سرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے بھائی آپ کو؟ انکل کا بزنس ہے تو صحیح، آپ اسے بھی تو جوائن کر سکتے ہیں'' حاعفہ نے پہلی بار کسی بات میں اپنا حصہ ڈالا تھا

''کر تو سکتا ہوں۔۔ لیکن۔۔۔'' حسام کچھ کہتا کہتا رک گیا۔ بقیہ جملہ مکمل کرنا جبیں نے اپنا فرض سمجھا تھا۔ ہاتھ میں تھاما جوس کا گلاس ٹیبل پر رکھا

''بات دراصل یہ ہے حاعفہ، بھائی کو اپنے بل بوتے پر کچھ بننا ہے۔ انگلی پکڑ کر چلنے کے خواہ نہیں ہیں میرے حسام بھائی۔۔۔ ورنہ تو کسی کو پڑھنے سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ ایف ایس سی کے بعد ہی بابا جان کا بزنس جوائن کرنے چلے تھے۔۔'' جبیں کا اشارہ کس طرف تھا۔ یہ بات سب جانتے تھے۔ اریب نے بھی کچا چبا جانے والی نگاہ جبیں پر ڈالی تھی۔

''تو پھر۔۔ آگے بھی تو میں نے ہی بابا جان کا بزنس سنبھالنا ہے۔ حسام بھائی نے تو پہلے ہی منع کر دیا تھا۔ اب سارا کام بابا جان اکیلے تو سنبھالنے سے رہے۔۔۔'' برق رفتاری سے جواب دیا گیا تھا۔

''تو بندے کو پہلے سوجھ بوجھ بھی سیکھ لینی چاہیے۔۔۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں، دنیا میں آئے ہوئے۔۔ نواب زادے چلے بزنس کی باگ دوڑ سنبھالنے۔۔۔۔'' گردن جھٹکتے ہوئے جبیں نے وار کیا تھا

''جبیں۔۔۔!!'' اس سے پہلے کہ وہ جواب دیتا سحر فاطمہ نے اریب کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے ذرا ٹھنڈا کیا۔

''جبیں۔۔ بڑے بھائی سے ایسے بات کرتے ہیں اور اریب تم۔۔ تمہاری چھوٹی بہن ہے یہ۔۔ تم ہی خیال کر لو۔۔۔'' دونوں کو سحر فاطمہ نے جھاڑا تھا۔

''ہنوں۔۔۔'' دونوں نے ایک ساتھ گردن جھٹکی تھی۔ جس پر سب مسکرا دیئے۔

''ان دونوں کا کچھ نہیں ہوسکتا۔۔'' حسام نے گردن جھٹکتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا۔ خاموشی کا ایک تسلسل شروع ہوا۔ سب ناشتے میں مصروف ہوگئے۔ سوائے اریب اور جبیں کے۔ جو آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کھڑی سنا رہے تھے۔

''تمہارے پیپرز کب ہو رہے ہیں؟'' جہانزیب نے جبیں سے پوچھا تو جبیں چونکی۔

''بس۔۔ ہونے ہی والے ہیں۔۔۔'' اس نے تذبذب لہجے میں کہا

''یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ کب ہو رہے ہیں۔۔۔''

''بس نیکسٹ منتھ انکل۔۔۔'' حاعفہ نے جبیں کی طرف سے جواب دیا

''گڈ۔۔۔ تیاری کیسی ہے؟'' سحر فاطمہ نے آملیٹ حاعفہ کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا تھا

''تیاری بھی اچھی ہے آنٹی۔۔'' سحر فاطمہ نے نوٹ کیا کہ وہ نگاہیں چرا رہی تھی۔ جیسے کچھ کہنا چاہ رہی ہو۔

''کوئی بات ہے حاعفہ؟'' وہ ہچکچائی اور پھر کہا

''جی آنٹی۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ قرآن اکیڈمی جوائن کرلوں۔۔ کالج سے آتے ہوئے میں نے ایک پمفلٹ میں پڑھا تھا۔ دو دن بعد آخری تاریخ ہے ایڈمشن کی۔۔۔''

''لیکن پیپرز؟'' جبیں نے جھٹ سوال کیا

''وہ بھی دے دوں گی۔۔ اور ویسے بھی، ایڈمشن ابھی سٹارٹ ہو رہے ہیں وہاں۔۔ کلاسز شاید ایک دو منتھ بعد سٹارٹ ہوں'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے اندازہ لگایا تھا

''لیکن بیٹا! اس طرح تو تمہاری پڑھائی ڈسٹرب ہوجائے گی۔ ایک ساتھ دو دو کورسز کرنا میرے خیال سے آسان نہیں ہے'' جہانزیب نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایف ایس سی کے بعد جبیں کے ساتھ ہی کمپیوٹر کورسز کرے گی

''نہیں انکل۔۔۔ صرف پیپرز ہی تو دینے ہیں۔۔ اس کے بعد کرنا ہی کیا ہے؟'' اس نے شانِ بے نیازی سے کہا تھا۔ افسردگی کا عنصر بھی کسی قدر نمایاں تھا۔ شاید اپنوں کی یاد تھی۔

''اور آگے کی پڑھائی؟'' سحر فاطمہ نے اچھنبے لہجے میں دریافت کیا تھا

''آنٹی۔۔ میں اسلامک ایجوکیشن حاصل کرنا چاہتی ہوں۔۔ قرآن اکیڈمی جوائن کرنے کا مقصد بھی یہی ہے۔'' اس نے اپنے دل کی بات رکھی تھی۔ سب اس بات پر حیران تھے۔ اریب بھی یک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ماضی کی حاعفہ کا عکس، حال میں کہیں بھی دیکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کتنی بدل چکی تھی۔

''مطلب؟ تم ایف ایس سی کے بعد سٹڈی چھوڑ دو گی؟'' حسام نے حیران کن لہجے میں کہا تھا

''تعلیم تو تعلیم ہوتی ہے بھائی۔۔۔۔ دنیاوی ہو یا دینی۔۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا

''اس کا مطلب ایک اور اریب آچکا ہے ہمارے گھر میں۔۔۔'' جبیں نے طنزیہ کہا تھا۔ جس پر تیکھی نگاہوں نے ایک بار پھر تعاقب کیا۔

''نہیں جبیں۔۔۔ میں اریب نہیں۔۔۔ حاعفہ سکندر ہوں۔۔۔ مجھے کسی کی پیروی کرنے کا شوق نہیں ہے۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا تھا۔ جس پر اریب کے ساتھ ساتھ جبیں بھی بری طرح چونکی تھی۔

''انکل۔۔۔ آنٹی۔۔۔ پلیز۔۔۔ آپ اجازت دے دیں۔۔'' اس نے التجائیہ انداز میں کہا تھا

''ٹھیک ہے۔۔ بیٹا۔۔۔ اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو ہمیں منظور ہے۔۔'' جہانزیب نے حاعفہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ سحر فاطمہ نے کچھ کہنے کے لئے لب ہلائے تو جہانزیب نے پلکیں جھپکتے ہوئے یقین دلایا تھا۔

''تھینک یو۔۔۔ تھینک یو سو مچ۔۔ انکل۔۔۔'' حاعفہ کے چہرے پر حقیقی مسکراہٹ تھی جبکہ اریب ابھی تک ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔ شاید منزل مزید دور ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

یہ بھی ہے ایک طرح کی محبت

میں تجھ سے تو مجھ سے جدا ہے

نوٹس کو سٹڈی ٹیبل پر بکھیرے وہ اپنی ہی سٹڈی میں محو تھا۔ کل اس کا لاسٹ پیپر تھا۔ تمام تر خیالات کو ایک طرف رکھ کر وہ اس کی تیاری میں مصروف تھا۔ داہنے ہاتھ میں پکڑا سیاہی میں نہایا ہوا پین سفید کاغذ پر نیلی روشنائی بکھیرتا جا رہا تھا۔ وہ تقریباً چار سے پانچ صفحے متواتر لکھ چکا تھا اور چھٹے صفحے کو الٹنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ پیشانی پر ناگواری کا تاثر لئے وہ اٹھا۔

''کون ہے؟'' بے زاری کے ساتھ پوچھتے ہوئے دروازہ کھولا تو وہاں حاعفہ کو کھڑا پایا۔ چہرے کی ناگواری یک دم اڑنچھو ہو گئی۔

''تم۔۔ میرے کمرے میں؟ خیریت؟ کوئی کام تھا کیا؟'' وہ وہیں کھڑے کھڑے سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا

''اندر آنے کا نہیں کہو گے؟'' بنا تاثر ظاہر کئے سپاٹ لہجے میں پوچھا گیا تھا

''ہاں۔۔ ہاں۔۔ آؤ اندر۔۔۔'' اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے جلدی سے صوفے پر بکھری شرٹوں کو اٹھایا اور اسے ساتھ ہی رکھی ٹوکری میں ڈال دیا۔

''دراصل۔۔ پیپرز کی وجہ سے ماریہ کو میں نے اپنے کمرے میں آنے سے منع کیا ہوا ہے۔ کہیں میرے چیزیں سمیٹتے سمیٹتے

میرے نوٹس کو ہی ادھر ادھر نہ کر دے۔۔بس اسی لئے کمرے کا یہ حال ہے۔۔۔" وہ اپنی صفائیاں پیش کر رہا تھا

"ویسے تم بتاؤ۔۔کیا پیو گی؟ کوئی چائے یا کافی؟ آخر پہلی بار میرے کمرے میں آئی ہو۔اتنا تو میزبان کا فرض بنتا ہی ہے ناں کہ مہمان کو کچھ پیش کیا جائے۔۔۔" وہ کہتا جا رہا تھا

"مجھے کسی شے کی طلب نہیں ہے، میں بس ایک کام سے آئی تھی تمہارے پاس۔۔۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا

"کام اور مجھ سے؟" اس نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھی تھی

"ہاں۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا بریسلٹ اریب کے سامنے کیا۔چہرے پر چھائی شادابی یک دم کسی ویرانی میں تبدیل ہو گئی۔مسکراتے لب دھیرے دھیرے سکونت اختیار کر گئے۔ہوا جو پہلے جانے کون سا راگ الاپ رہی تھی؟ اب کسی ماتم کدہ کی طرح بین کرنے لگی۔

"اسے تمہیں لوٹانا تھا۔۔۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔آنکھیں یک ٹک اریب کے چہرے پر مرتکز تھیں جیسے اسے اپنے کیے پر ذرا بھی پچھتاوا نہ ہو۔

"یہ لو۔۔۔" وہ اپنا ہاتھ ابھی تک ہوا میں معلق کیے ہوئے تھی جبکہ اریب کے ہاتھوں میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ اسے واپس لے سکے۔وہ گفٹ جو خود اس نے بڑی چاہ سے خریدا تھا۔اب واپس لینا کسی کسوٹی سے کم نہ تھا۔

"مم مگر کیوں؟" تذبذب انداز میں اس نے مختصر پوچھا تھا۔آنکھیں بھی الجھن کا شکار تھیں۔جن کے سامنے خوابوں کے سفید موتی کسی ٹوٹی ہوئی مالا کی مانند بکھرنے لگے تھے۔

"جن تحفوں کی میرے نزدیک کوئی وقعت ہی نہیں۔ان کو اپنے پاس رکھنے کا بھلا کیا جواز بنتا ہے؟" ڈر سچ کی صورت اختیار کر چکا تھا۔دل مضطر آنے والے لمحوں کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا۔ہاتھ آگے بڑھایا تو ان میں ارتعاش محسوس کیا جیسے کوئی پنڈولم ہو جو ہر سیکنڈ کے بعد جھوم رہا ہو۔دل میں ایک کسک تھی کہ شاید وہ اس کے حالِ دل کو پڑھ کر اپنا ہاتھ کھینچ لے اور ہنس کر کہے وہ مذاق تھا مگر ستم یہ کہ ایسا کچھ نہ ہوا۔اُس نے لمحہ بھر میں خواہشوں کے محل کو زمین بوس کر دیا اور وہ بریسلٹ اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔

"امید ہے،تم مجھے سمجھو گے۔۔۔" اس نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا تھا۔جس پر اس کے دل نے طنزیہ مسکرانا چاہا تھا لیکن وہ تو مسکرانا ہی بھول چکا تھا۔آنکھوں کی نمی بس بریسلٹ کو ہی تک رہی تھی۔

"اگر نہیں تو دعا کروں گی کہ بہت جلد سمجھ جاؤ۔۔۔" یہ کہتے ہی وہ پلٹی تھی۔

"رکو۔۔۔" اس نے بمشکل کہا تھا۔جس پر اس کے قدم ذرا ٹھہرے گئے مگر پلٹ کر نہ دیکھا

"اگر برا نہ مانو اب میں تم سے ایک سوال پوچھوں؟" گلوگیر لہجے میں اس نے اپنے دل مضطر کو ضبط کرنے کی پوری سعی کی تھی۔

''ہاں۔۔۔'' بنا پلٹے اس نے کہا تھا۔

''کیا میں اتنا برا ہوں کہ تم مجھ سے کوئی ناتا ہی نہیں رکھنا چاہتی؟ نہ دوستی کا اور نہ ہی۔۔۔۔!!!'' وہ کہتا کہتا رک گیا تھا۔شاید الفاظ ہی معدوم ہو چکے تھے یا پھر جذبات کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔جس پر وہ دفعتہً پلٹی اور بھیگی مژگان کو دیکھ کر یقیناً اس کا دل پسیج چکا تھا

''نہیں اریب۔۔ایسی کوئی بات نہیں۔ایسا سوچنا بھی مت۔'' اس نے اریب کے خیالوں کو تردید کی تھی۔ایسی مرہم لگانے کی کوشش کی جس میں کوئی اثر ہی نہ تھا۔

''تو پھر کیا بات ہے کہ کل بھی تم مجھ سے دور جانا چاہتی تھی اور آج بھی۔۔۔کل بھی تمہارے نزدیک میری کوئی حیثیت نہیں تھی اور آج بھی میں تمہارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔۔۔'' اس نے گردن کو ذرا سا خم دیئے کہا تھا۔لہجہ جذبات کے زیر اثر تھا۔

''اگر سچ پوچھو تو اریب۔۔۔کل تک میں تمہیں اپنے قابل نہیں سمجھتی تھی۔تمہیں تو کیا دنیا کی ہر شے میرے نزدیک خاکِ بے نشاں تھی اور خاک بھی ایسی جسے میں اپنے پاؤں تلے دبانا بھی پسند نہ کروں۔۔۔'' اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔الفاظ اگرچہ دھیمے تھے مگر سچائی کا پہلو اپنے اندر سینتے ہوئے تھے۔

''اور آج۔۔۔'' خوابیدہ لہجے نے مزید دریافت کیا تھا

''اور آج میں اپنے آپ کو اس خاکِ بے نشان کی مثل سمجھتی ہوں جو تمہارے قدموں کو مس کرنے کی بھی حق دار نہیں ہے۔'' ایک آنسو جانے کیوں پلکوں پر چمکنے لگا تھا۔جو جہاں بھر کی روشنیوں کو اریب کی نگاہوں میں منعکس کر رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' دوسرا سوال اس نے داغا تھا۔شاید وہ آج تمام بات کلئیر کر دینے کے حق میں تھا۔

''کیونکہ کل تک میں اپنے آپ کو اسپیشل سمجھتی تھی۔دوسروں کی میرے نزدیک کوئی وقعت ہی نہ تھی۔خود اپنی ذات میں محو رہنا، میری طبیعت تھی لیکن آج بہت کچھ بدل چکا ہے۔خود کو اسپیشل سمجھنے والی لڑکی اب ایک عام سی لڑکی بن چکی ہے۔جس کی آنکھوں میں ہزاروں سپنے پروان چڑھتے تھے۔آج ان آنکھوں میں سوائے شرمندگی اور ندامت کے کچھ بھی نہیں ہے۔دنیا کے سٹیٹس و بڑائی کو سب کچھ سمجھنے والی لڑکی، آج بالکل عام سی لڑکی بن چکی ہے۔کل کی حاعفہ سکندر اور آج کی حاعفہ سکندر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔۔۔'' وہ دو قدم چل کر ڈریسنگ کے سامنے گئی اور اپنا عکس آئینے میں دیکھا

''تمہیں پتا ہے اریب، آج جب میں اپنا عکس آئینے میں دیکھتی ہوں تو مجھے اپنے آپ پر ہنسی آتی ہے کہ کیسے قسمت نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا؟ کیسے مجھے آسمان سے زمین پر دے پھینکا اور پھر سوچتی ہوں جو ہوا وہ سب کچھ میرے اعمال کا ہی کیا دھرا تھا۔جس طرح ہر کرو (curve) اپنی انتہا کو پہنچ کر پستی کا سفر طے کرتی ہے بالکل اسی طرح ہر عروج کو ایک ناں ایک دن زوال کا سفر طے کرنا ہی پڑتا ہے۔'' اپنی ذات میں وہ انتہا کی کھو چکی تھی جب اسے احساس ہوا کہ وہ کن باتوں کو لے بیٹھی ہے۔وہ آنسو جو پلکوں پر چمک رہا تھا۔برجستہ

رخسار پر بہہ نکلا۔ آنسو کی حدت نے اسے پلٹنے پر مجبور کیا۔ وہاں اریب ابھی تک اسی کی ذات میں محو، یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

''خیر۔۔۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔۔ تم میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تم بہت اسپیشل ہو اور مجھ جیسی ایک عام سی لڑکی تمہیں Deserve نہیں کرتی۔'' اس نے بات ختم کرنے کی غرض سے کہا تھا۔ جس پر اس کا پور پور تلملا اٹھا۔

''اور اگر یہ اسپیشل تمہارے لئے خود کو عام بنانے کی کوشش کرے تو؟'' ایک بار پھر گردن میں خم تھا۔ لہجہ خوابیدہ تھا۔ سانسیں حدت کا جہاں اپنے اندر سینتے ہوئے تھیں۔

''نہیں اریب۔۔ ایسا ممکن نہیں۔۔ تم ہمیشہ سے اسپیشل تھے اور ہمیشہ رہو گے۔۔۔ تم خود کو چاہ کر بھی عام نہیں کر سکتے۔۔۔'' اس نے پہلی بار آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہا تھا۔ جس پر خاموشی کا ایک دور شروع ہوا۔ اریب خود اپنی ذات میں وہ شے تراشنے لگا جس نے اسے اتنا اسپیشل بنا دیا کہ عام بننے کا سفر انتہائی کٹھن بلکہ ناممکن ہو گیا۔ تبھی دوسروں کا ذہن پڑھنے کی صلاحیت ذہن میں لہرائی۔ واقعی یہ ایک خاص خصوصیت تھی۔

''لیکن۔۔۔'' برجستہ اس نے اپنے لب ہلائے لیکن ایک بار پھر انہیں خاموش کروا دیا گیا

''نہیں اریب۔۔۔ ایک لفظ بھی نہیں۔۔ تم اسپیشل ہو اور تمہیں ایک اسپیشل لڑکی ہی Deserve کرتی ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے باہر کی طرف چہرے کا رخ کیا۔ لب تو جیسے سل چکے تھے۔ آنکھیں بھی دھندلا چکی تھیں۔ چوکھٹ پر جا کر وہ یکدم پلٹی

''اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ تم ان باتوں کا تذکرہ نہیں کرو گے۔۔۔ ماضی یاد کرنے کے لئے ہوتا ہے دہرانے کے لئے نہیں۔۔۔'' اپنے سر کو جھٹک دیا اور پھر محض اس کی خوشبو محسوس ہوئی۔ فضاؤں میں ایک مبہم سا عکس تھا۔ جو کافی دیر تک اس کی نگاہوں کے سامنے رہا تھا۔

''تم اسپیشل ہو اور تمہیں ایک اسپیشل لڑکی ہی Deserve کرتی ہے۔'' الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے

''تم اسپیشل ہو اور تمہیں ایک اسپیشل لڑکی ہی Deserve کرتی ہے۔'' منزل کی طرف جانے والا ہر راستہ بند ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دوبارہ سٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھا تھا۔ بکھرے نوٹس مبہم سے دکھائی دیئے اور وہ بے جان پتے کی طرح کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''ہنوں۔۔۔'' دل مضطر اپنے جذبات کو بیان کرنے سے بھی قاصر تھا۔

''بھول جاؤں۔۔۔!!!'' اس نے پلکیں جھپکیں تو ایک آنسو لڑھک کر صفحے پر آ گرا۔ جو کسی آفتاب کی مانند چمک رہا تھا۔ وہ اسی کو دیکھتا رہا جن میں محبوب کا دھدکارا جانا شامل تھا۔

''بھول جاؤں گا۔۔۔'' جیسے ہی اس کا عکس اس موتی میں لہرایا تو ایک ہی جملہ زبان سے جاری ہوا۔

''شاید۔۔'' مگر دل تھا کہ منافقت اختیار کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

☆......☆......☆

بات چھپتی ہے تو کچھ اور عیاں ہوتی ہے

لیب میں وہ اکیلے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ہانیہ بار بار اپنی زلفوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑیس دیتی جبکہ وہ بار بار آنکھوں کے سامنے لہرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''رہنے دوناں۔۔۔ اچھی لگتی ہیں۔۔'' اس بار جب اس نے زلفوں کی لٹ کو کان کے پیچھے کرنا چاہا تو کامیش نے ہاتھ پکڑ لیا۔ آنکھوں میں جذبات کی انتہا تھی۔ ہانیہ کا چہرہ بھی حیا سے سرخ ہو چکا تھا۔ عین اسی وقت لیب کا دروازہ کھلا اور اریب داخل ہوا تھا

''کامیش۔۔ وہ میں۔۔۔'' وہ کچھ کہنے جا رہا تھا جب اس کی نگاہ ہانیہ کے ہاتھوں کی طرف گئیں، جنہیں کامیش تھامے ہوئے تھا۔ اریب کی موجودگی کے احساس سے دونوں سنبھلے اور کامیش نے بھی اپنا ہاتھ کھینچ لیا

''آئی ایم سوری۔۔۔'' وہ یہ کہتے ہی الٹے پاؤں لوٹ گیا۔

''اب اسے کیا ہو گیا؟'' کامیش نے دھیمے لہجے میں کہا تو ہانیہ نے بے رخی سے شانے اچکا دیئے۔

''تم بیٹھو۔ ذرا میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔۔۔'' کامیش فی الفور اٹھا اور باہر کی جانب چل دیا۔ ایک بار پھر اس نے شانِ بے نیازی سے کندھے اچکائے تھے۔

''اریب۔۔!!'' کامیش کی آواز لیب کے باہر سے مدہم سنائی دی۔ وہ پلٹی اور کامیش کو دیکھ کر مسکرائی۔ چہرہ دوبارہ مڈٹرم کے رزلٹ پیپر پر آٹھہرا۔ مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

''تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔۔۔'' اس نے مارکر اٹھایا اور اریب عالمگیر کے نام کو سرکل کیا اور پھر نیکسٹ بیچ پر اپنے نام کو سرکل کیا۔

''صرف ایک سبجیکٹ میں تمہارے مارکس زیادہ ہیں مسٹر۔۔۔!! فائنل میں دیکھنا تمہیں نہ پچھاڑ دیا تو میرا نام بھی ہانیہ نہیں۔۔۔'' اس نے تمسخرانہ کہا تھا

''تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہارا پیچھا اتنی جلدی چھوڑ دوں گی؟ نہیں۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔ تمہیں پچھاڑنا پہلے تو میرا جنون تھا اور اب میری انا ہے۔ جو بے عزتی تم نے میری کی تھی۔ اس کا بدلہ تم سے لے کر رہوں گی مسٹر اریب۔۔۔ بھولی نہیں ہوں میں وہ سب۔۔۔'' اس نے آنکھیں جھپکیں تو اریب کا بے نیاز چہرہ لہرایا۔ جن میں فقط اشتعال تھا۔

''تم نے کامیش کے سامنے مجھے ذلیل کیا تھا ناں۔۔۔ دیکھنا ایک وقت آئے گا جب وہ وقت تم پر آئے گا۔۔۔ تمہیں اگنار کر کے تمہارے دل میں اپنے لئے جگہ نہ بنائی تو میرا نام بھی ہانیہ نہیں۔۔۔'' اس نے انجانے وجود کو اپنے سامنے گمان کرتے ہوئے چیلنج کیا

تھا۔ آنکھوں میں پختگی واضح تھی۔

☆......☆......☆

سحر فاطمہ شام کے کھانے کے لئے پکوڑے بنا رہی تھی۔ جبیں ڈائنگ ٹیبل پر کیمسٹری کی بک رکھے اسے لگاتار گھور رہی تھی۔ ماریہ ٹی وی لاؤنج میں صاف ستھرائی کا کام بخوبی سرانجام دے رہی تھی۔

''افف۔۔ یہ ایکویشنز۔۔۔میتھین۔۔۔ ایتھین۔۔ پروپین۔۔بینزین۔۔۔ ایلڈی ہائیڈ۔۔۔ افف۔۔'' وہ اوراق پلٹتے ہوئے خود سے گویا ہوئی تھی۔

''ماشاءاللہ اریب کے علاوہ بھی ہمارے گھر میں کوئی اتنا ذہین ہے جو ایک سیکنڈ میں پورا پیج حفظ کر لیتا ہے۔۔'' پیچھے سے حسام نے طنزیہ کہا تھا۔ جبیں نے چونکتے ہوئے پیچھے کی طرف دیکھا تو حسام نے پیار سے اس کے سر کو تھپکا۔ جس پر وہ تلملا اٹھی تھی۔

''بھائی۔۔۔'' اس نے جلے بھنے لہجے کہا۔ حسام نے ایک چھلانگ لگاتے ہوئے جبیں کے سامنے پڑے پھلوں کی پلیٹ سے ایک سرخ سیب اٹھایا اور ٹیبل پر براجمان ہو گیا۔

''ہاں بھائی کی بہن۔۔۔!! اپنی کیمسٹری پر دھیان دو۔۔۔ ویسے بھی یہ خشک ترین سبجیکٹ ہے۔ تمہیں معلوم ہے جبیں، میرے ہمیشہ سے کیمسٹری میں ہی مارکس سب سے کم آئے ہیں'' سیب کی بائیٹ لیتے ہوئے حسام نے کہا تھا

''اور میرے سب سے زیادہ۔۔۔'' پیچھے سے اریب بھی وہاں آدھمکا تھا

''بس تمہاری ہی کمی تھی۔۔۔'' جبیں نے منہ چڑھایا تھا

''اسی کمی کو پورا کرنے میں آیا ہوں۔۔'' پوری ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیا تھا

''بھئی۔۔ خیریت ہے، تینوں بہن بھائی اکٹھے ہیں۔۔'' سحر فاطمہ نے پکوڑوں کی پلیٹ اریب کے سامنے رکھی تو اس نے ذرا بھی دیر نہ لگائی اٹھانے میں۔

''افف۔۔۔'' عجلت میں گرم پکوڑا اس کے ہاتھ آیا۔ جو اگلے ہی لمحے اس کے ہاتھوں سے گر گیا اور وہ انگلیوں کو پھونکے مارتے ہوئے جلن کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بندہ ٹھنڈہ ہونے پر بھی کھا سکتا ہے۔ کہیں بھاگے نہیں جا رہے یہ پکوڑے۔۔۔'' جبیں نشتر برسانے کا یہ موقع کہاں جانے دے سکتی تھی۔

''جسٹ شیٹ اپ۔۔۔'' منہ بسوڑ کر جواب دیا گیا

''پھر شروع ہو گئے تم دونوں۔۔۔'' حسام نے بھی اپنا حصہ ڈالا

”تم بتاؤ۔۔تم اپنے کمرے سے کیسے باہر آ گئے؟ رپورٹ پر کام ختم ہو گیا کیا؟“ سحر فاطمہ نے حسام کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”جی ماما جان۔۔وہ۔۔بس۔۔۔“ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر کہہ نہیں پا رہا تھا

”اچھا اریب۔۔۔ مجھے یہ سمجھاؤ ناں۔۔“ اس نے اِن آرگینک کیمسٹری کا ایک چیپٹر اریب کے سامنے کیا تو اریب نے ایک تیکھی نگاہ جبیں پر ڈالی اور پھر کتاب اپنی طرف کھینچتے ہوئے اسے سمجھانے لگا۔یہی تو ان بہن بھائی کی خوبی تھی۔لڑنا جھگڑنا ایک طرف مگر ایک دوسرے کی مدد کرنا ایک طرف۔حسام نے جب ان دونوں کو اپنے ہی کام میں محو دیکھا تو اپنی بات کو سحر فاطمہ کے سامنے رکھا

”ماما جان۔۔میرے ساتھ مارکیٹ چلیں گی آپ۔۔۔؟“ اس نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا تھا

”مارکیٹ مگر کیوں؟“

”وہ دراصل صبا کے لئے ایک گفٹ خریدنا تھا۔۔“ اس نے تذبذب لہجے میں کہا تھا

”صبا بھابی کے لئے گفٹ؟ مگر کیوں؟“ جبیں کے کان تو جیسے حسام کی طرف ہی تھے۔جھٹ اچھلتے ہوئے پوچھا

”تم اپنے کام سے کام رکھا کرو۔۔۔کیا ہر وقت دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتی پھرو گی۔۔“ فوراً حسام نے اس کی سرزنش کی تھی

”ماما جان۔۔دیکھا بھائی کو۔۔۔شادی ہوئی نہیں اور ابھی سے مجھے غیر بنا دیا۔۔اپنے معاملات کو دوسروں کے معاملات بنا دیا۔۔“ شکوہ کناں لہجے میں جبیں نے کہا

”اُفف۔۔۔کتنی چپے کٹنی ہو تم۔۔۔“ حسام نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا

”حسام۔۔۔!!!“ سحر فاطمہ نے گھورا تو اس نے جبیں کی طرف دیکھتے ہوئے گردن جھٹکی

”تمہیں سمجھنا ہے یا نہیں۔۔۔“ اریب نے جبیں کا دھیان بٹتے ہوئے دیکھا تو اکتاہٹ والے لہجے میں پوچھا تھا

”سوری اریب۔۔مجھے تو ابھی ماما جان کے ساتھ مارکیٹ جانا ہے۔۔“ اس نے معذرت خواں لہجے میں کہا

”اب تمہیں کون لے کر جا رہا ہے مارکیٹ؟“ حسام نے تند لہجے میں کہا

”ماما جان۔۔۔“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے شانِ بے نیازی کے ساتھ جواب دیا تھا

”مگر جانا کیوں ہے؟ مجھے کوئی یہ بتائے گا۔۔۔“ سحر فاطمہ نے ذرا اونچے لہجے میں پوچھا تھا

”وہ ماما جان۔۔۔صبا کا آج برتھ ڈے ہے۔۔“ اس نے انگلیاں پٹختے ہوئے کہا تھا جس پر خوشی سے جبیں اچھل پڑی

”کیا؟؟ صبا بھابی کا آج برتھ ڈے ہے اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں۔۔۔بہت برے ہو آپ۔۔“ اس نے خوشی میں بھی شکوہ کیا تھا۔

''جبیں۔۔۔ذرا آرام سے۔۔'' سحر فاطمہ نے ٹوکا جبکہ اریب خاموشی سے سر پکڑ کر بیٹھا تھا۔اسے ان سب میں جیسے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی۔

''ہم ابھی جا رہے ہیں مارکیٹ۔۔۔اور ماما جان میں نے بھی صبا بھابھی کے لئے گفٹ خریدنا ہے۔ آخر وہ کہاں پیچھے رہنے والی تھی؟

''ٹھیک ہے۔۔چلتے ہیں۔۔۔اور اریب تم؟ کیا تم بھی چلو گے؟'' سحر فاطمہ نے پوچھا تھا

''نہیں ماما جان۔۔۔!! میرے سر میں درد ہے۔میں کچھ دیر آرام کرنا پسند کروں گا۔۔'' اس نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا

''سر میں درد ہے اور تم نے مجھے ابھی بتایا۔۔چلو میں تمہیں ابھی ٹیبلٹ دے دیتی ہوں'' فکرمندی کے ساتھ انہوں نے اریب کی پیشانی کو چھوا تھا۔

''ماما جان۔۔۔آپ فکر نہ کریں۔بس معمولی سا درد ہو رہا ہے اور ویسے بھی ٹیبلٹ میں لے چکا ہوں۔۔آرام کروں گا تو شام تک ٹھیک ہو جائے گا۔'' یہ کہتے ہی وہ زینے کی طرف بڑھ دیا۔

''تو چلیں ماما جان۔۔۔!!'' جبیں کو حسام سے بھی زیادہ جلدی تھی

''چلو۔۔۔'' ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے انہوں نے کہا

''بس ایک منٹ ماما جان۔۔میں حاعفہ سے بھی پوچھ لوں، شاید اسے بھی مارکیٹ سے کچھ خریدنا ہو'' دفعتۃً وہ اپنے کمرے کی طرف لپکی۔

''یہ کتاب تو لیتی جاؤ۔۔۔'' حسام نے پیچھے آواز دی مگر وہ کہاں سننے والی تھی؟

''دیکھا ماما جان۔۔کتنی لاپرواہ ہے اپنی چیزوں کے بارے میں۔۔۔'' حسام نے شکوہ کیا تھا

''اب کیا کیا جا سکتا ہے؟'' یہ کہتے ہی چیزیں سمیٹتے وہ کچن کی طرف بڑھیں جبکہ حسام صبا کے خیالوں میں کھو گیا۔

☆......☆......☆

میں بھٹکتا پھرتا ہوں دیر سے شہر شہر نگر نگر

کہاں کھو گیا مرا قافلہ کہاں رہ گئے مرے ہم سفر

گھر میں کافی سکون تھا۔جبیں اور باقی ابھی تک شاپنگ سے واپس نہ لوٹے تھے۔ جہانزیب بھی آفس کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے۔اپنے کمرے میں آرام کرتے ہوئے جانے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی اور شاید وہ ایسے ہی سویا رہتا اگر ہمیشہ کی طرح موبائل کی رنگ اس کے آرام میں مخل نہ ہوتی تو۔۔!!اس نے پیشانی پر شکن ابھارتے ہوئے کروٹ بدلی تو اس کے سینے پر رکھی شیکسپیئر کی کتاب بیڈ سے نیچے جا گری۔جو وہ شاید سونے سے قبل پڑھ رہا تھا۔

اس نے تکیے سے دونوں کانوں کو بھینچا تا کہ رنگ کی آواز سماعت سے نہ ٹکرائے مگر وہ رنگ مسلسل تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔

''اُفف۔۔۔'' وہ نیندوں میں بڑبڑایا تھا

''کامیش کو بھی ابھی کال کرنی تھی۔۔۔'' اس نے اندازہ لگایا اور ہاتھ مارتے ہوئے اس نے موبائل اٹھایا اور بنا دیکھے فون ریسیو کیا۔

''ہیلو۔۔اریب عالمگیر سپیکنگ'' اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہی بلینک کال ایک بار پھر اس کی زندگی میں قدم رکھ چکی تھی۔

''ہیلو۔۔کون ہے؟ کوئی بول کیوں نہیں رہا؟'' اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ بلینک کالز ایک بار پھر اس کی زندگی میں قدم رکھے گی۔ اس کی نیندیں اب اڑنا شروع ہو گئیں۔ وہ دفعتہً اٹھ بیٹھا اور موبائل کو نگاہوں کے سامنے کرتے ہوئے نمبر دیکھا تو چہرے پر ناگواری کے تاثر ابھر آئے۔

''آئی وِل کِل یُو (میں تمہیں مار ڈالوں گا)'' اس نے انتہائی غصے میں کہا تھا اور فی الفور رابطہ منقطع کر کے موبائل بیڈ پر دے پھینکا۔ اس کا سر پہلے سے زیادہ درد سے پھٹنے لگا۔

''اُفف۔۔۔یہ راز۔۔کب افشاں ہو گا؟'' اس نے دونوں ہاتھوں میں سر کو ٹھونس لیا اور ٹانگوں کو سکیڑ کر ان پر اپنی پیشانی ٹکالی۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔ جب اس نے اپنا سر اٹھایا تو چہرے پر پختگی کے تاثر ابھرنے لگے۔ سر اگرچہ درد سے پھٹنے کے قریب تھا مگر وہ ایک فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ پلٹا اور موبائل کو اٹھایا۔ نمبر نوٹ کیا۔

''ڈائری۔۔۔'' اس نے جھک کر سائیڈ ٹیبل کی دراز سے اپنی ڈائری نکالی اور اس کے صفحات الٹے اور مطلوبہ نمبر کو سامنے کیا۔

''یہ نمبر۔۔۔!! ہاں یہی نمبر تھا وہ۔۔'' اس نے ڈائری پر لکھے نمبر اور ابھی آنے والے نمبر کو میچ کیا۔ دونوں نمبر same تھے۔

''اس کا مطلب۔۔۔!! انڈونیشیا کے شہر دیپا سار سے ہی اس کا تعلق ہے'' وہ ایک نتیجے پر پہنچ چکا تھا۔

''بابا جان کے آفس سے تو نہیں آتا کہیں فون؟'' یہ سوچ آتے ہی وہ کھڑا ہوا اور جہانزیب کے روم کی طرف چل دیا۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اسی وجہ سے ایک سناٹا پورے ماحول کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔

''کہاں ہو سکتی ہے بابا جان کی ڈائری؟'' اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی ڈائری ٹیبل یا صوفے پر رکھی نظر نہ آئی۔

''ہو سکتا ہے دراز میں ہو؟'' اس نے اندازہ لگایا اور سب سے پہلے بیڈ کے ساتھ والے تمام درازوں کی چھان بین کی۔ وہاں ڈائری کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس کے بعد وہ پلٹا اور ڈریسنگ کی طرف بڑھا۔ درد کی ایک لہر جسم میں دوڑی مگر وہ برداشت کر گیا۔ داہنے ہاتھ سے لمحہ بھر سر کو دبایا اور پھر آگے بڑھا۔ وہاں بھی کام کی کوئی شے نظر نہ آئی۔

''وارڈ روب۔۔۔'' برجستہ اس کا دھیان وارڈ روب کی طرف گیا۔ وہ وہاں گیا اور اسے وا کرنے کے بعد کئی فائلیں اسے ایک

خانے میں رکھی نظر آئیں۔اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ انہیں اٹھایا اور بیڈ پر لے آیا۔تقریباً ہر رنگ کی فائل تھی جو مختلف بزنس میٹنگ کی اہم معلومات اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے تھیں۔جن سے اریب کو کوئی لینا دینا نہ تھا اس لئے وہ انہیں سرسری طور پر دیکھتا اور پھر سائیڈ میں رکھ دیتا۔

''نمبر۔۔۔نمبر۔۔۔۔نمبر۔۔۔۔'' وہ ایک ہی گردان الاپتا جا رہا تھا مگر یہاں بھی شعبہ مقدر نہ بنی مگر ایک الجھی ڈور سلجھتی دیکھائی دی یا پھر یہ کہنا بجا تھا کہ مزید الجھ گئی۔آخری فائل جیسے ہی اس نے کھولی تو غیر معروف زبان کے کچھ پیپرز سامنے آئے۔وہ کچھ دیر انہیں دیکھتا رہا۔ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس لکھائی کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہو مگر یاد نہیں آ رہا تھا کہاں دیکھا ہے؟

اس نے فائل کو کلوز کیا تو وہاں Grand Mirrah Hotel کا لیبل تھا۔وہ ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔سر پہلے ہی درد سے پھٹ رہا تھا اور وہ مزید دباؤ ڈال کر سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔تبھی اس کا ذہن ماضی میں گیا۔

''ہاں۔۔وہ۔۔۔پیپرز۔۔۔'' وہ جھماکے سے اٹھا اور ان فائلز کو سمیٹے بغیر اپنے کمرے کی طرف لپکا۔وہاں سے سٹڈی ٹیبل پر رکھی اپنی فائل سے چند پیپرز نکالے اور انہیں لے کر جہانزیب کے کمرے میں واپس آیا۔فائلز ابھی تک ویسے ہی بکھری ہوئی تھیں۔اس نے ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر وہ فائل دوبارہ اوپن کی اور دونوں لینگویج کا موازنہ کیا۔دونوں ایک ہی معلوم ہوتی تھیں۔

''ہاں۔۔یہ دونوں تو ایک ہی زبان ہے۔۔کوئی بھی فرق محسوس نہیں ہو رہا۔۔ایک ہی طرز ہے دونوں کا۔۔۔'' اس کے ہاتھ سے وہ فائل چھوٹ کر نیچے گر گئی اور ہاتھ میں فقط اپنے لکھے گئے الفاظ رہ گئے۔

''مگر کیسے؟ میں یہ سب کیسے لکھ سکتا ہوں؟ اس زبان کے الفاظ جس کی الف ب بھی مجھے معلوم نہیں اور زبان بھی اس ملک کی جہاں میں نے آج تک کبھی قدم بھی نہیں رکھا۔۔'' وہ تانے بانے بنتا ہوا کھڑا ہوا اور کھڑکی کی طرف اپنے چہرے کا رخ کیا۔آنکھیں یک ٹک بس اسی تحریر پر مرکوز تھیں جو اس نے انجانے میں تحریر کی تھی۔

''آخر کیا لکھا تھا میں نے؟ اور کیسے؟'' ہر لمحہ چہرے کے تاثر بدل رہے تھے مگر مطلب سب کا یکساں تھا۔پہیلی اگرچہ مختلف تھی مگر جواب ایک تھا۔کیسے؟ کیوں؟ کس طرح؟

''مجھے اب ان سب کی تہہ تک پہنچنا ہو گا۔۔۔'' اس نے اپنی نگاہوں کو آسمان کی طرف دوڑایا جہاں تا حد نگاہ مسافت ہی مسافت تھی۔

''پہلے بلینک کالز اور اب یہ تحریر۔۔۔!! کیا ہے ان دونوں کا لنک؟'' وہ سوچوں میں غرق تھا۔

''مجھے بابا جان سے بات کرنی چاہیے اس بارے میں۔۔۔'' یہ سوچتے ہوئے وہ دوبارہ پلٹا اور فائلز کو سمیٹ کر وارڈ روب میں رکھ کر اچھے سے بند کیا۔اپنے کمرے میں لوٹنے کے بعد بھی اس کا دھیان اسی تحریر پر مرکوز تھا۔

''مجھے اس تحریر کا مطلب جاننا چاہیے۔۔۔'' بیڈ پر لیٹنے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنی لکھی تحریر کو آنکھوں کے سامنے کیا۔

''یا پھر۔۔۔اس کا میرے ساتھ تعلق۔۔۔!!'' وہ ایک بار پھر الجھ چکا تھا۔سر بیڈ کی ٹیک سے ٹکا کر اس نے کچھ لمحوں کے لئے

آنکھیں بند کیں۔وقت سست روی سے گزر رہا تھا۔دماغ کی شریانیں لحہ لحہ پھیلتی اور سکڑتی جا رہی تھیں۔خوابیدہ نگاہیں سچائی کی کھوج میں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

''ہاں۔۔مجھے دیپا سار جانا ہوگا۔۔۔'' وہ دفعتہً سیدھا بیٹھا۔چہرے کے تاثر بھی اب گہرے ہوتے جا رہے تھے

''سارے سوالوں کا جواب صرف دیپا سار میں ہیں اور مجھے بھی وہیں جانا ہوگا۔۔۔'' اس کے لہجے میں پختگی تھی اور وہ ایسا کرنے بھی جا رہا تھا مگر کیا جہانزیب اور سحر فاطمہ اسے ایسا کرنے دیں گے؟ایک سوال بار بار اس کے ذہن میں اٹک رہا تھا لیکن آج وہ پہلی بار وہ اپنے بابا جان اور ماما جان سے پوچھے بغیر ایک فیصلہ کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

لڑکیوں کا ایک ہجوم کلاس روم میں جمع تھا۔آج انگلش کا پہلا پیپر تھا۔حاعفہ اور جبیں دونوں اکٹھے سینٹر آئے تھے مگر یہاں دونوں کی سیٹنگ مختلف کمروں میں تھی۔حاعفہ روم نمبر ۵ جبکہ جبیں روم نمبر ۷ میں تھی۔دونوں ایک دوسرے کو دعائیں دیتے ہوئے اپنے اپنے روم کی طرف چل دیں۔جبیں ہمیشہ کی طرح جینز اور لانگ فراک میں ملبوس تھی جبکہ حاعفہ معمول کے برعکس ایک سادہ سے سوٹ میں۔کمرہ امتحان میں داخل ہوتے ہی وہاں پر موجود لڑکیوں کی نگاہیں اس پر جم گئیں۔تمام لڑکیاں عام سوٹ میں ملبوس تھیں یا پھر یونیفارم میں۔وہاں محض جبیں ہی تیار شیار ہو کر آئی تھی۔اس نے اپنا رول نمبر چیک کیا تو دوسری رو کی سیکنڈ لاسٹ چیئر پر تھا۔وہ پورے اعتماد کے ساتھ اس طرف گئی اور بے فکر ہو کر بیٹھ گئی۔

''ابھی بھی دس منٹ بقایا ہیں۔۔۔''اس نے رسٹ واچ میں نگاہ دوڑائی۔

''حاعفہ کا بھی اسی روم میں ہو جاتا پیپر تو اس میں کیا برا تھا؟کم سے کم وقت تو آرام سے کٹ جاتا۔۔۔''اس نے بال پوائنٹ سے چیئر پر لکیریں ڈالنا شروع کر دیں۔

''ہائے۔۔آر یو جبیں عالمگیر؟''ایک لڑکی نے پاس آ کر حیرت سے پوچھا تھا

''یس۔۔آئی ایم۔۔۔اینڈ یُو؟''اس نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے کہا

''میں علیشبا۔۔۔جو اُس دن شاپنگ مال میں تمہیں ملی تھی۔۔۔''اس نے اپنا تعارف کروایا۔

''علیشبا۔۔۔شاپنگ مال۔۔۔اچھا۔۔۔وہ علیشبا۔۔۔کیسی ہو تم؟تم بھی سیکنڈ ائیر کے پیپرز دینے آئی ہو''اس نے یک دم پرجوش انداز میں کہا حالانکہ وہ پہلی نظر میں ہی اسے پہچان چکی تھی۔بس وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی مگر یہ بھی اچھے سے جانتی تھی جب تک وہ اپنا تعارف نہ کروا لیتی،اس کی پیچھا نہیں چھوڑنا تھا۔اور پھر اسے بھی تو اپنا وقت گزارنا تھا۔چنانچہ اسی سے ہی سہی۔۔۔دونوں پیپرز کے سٹارٹ ہونے تک ایک دوسرے سے بات چیت میں مصروف رہے۔

پیپر سٹارٹ ہوا تو پورے سینٹر کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کوئی پتا بھی متحرک نہ تھا۔ سب کی نظریں بس اپنے اپنے پیپر پر مرکوز تھی۔ جبیں سے لے کر حاعفہ تک سب اپنے اپنے پیپر میں مصروف تھے۔ حاعفہ کی نگاہیں تو جیسے اپنے پیپر ہی ساکت تھیں۔ اگرچہ اس کی تیاری کچھ خاص نہ تھی اور پورا پیپر بھی اسے یاد نہ تھا مگر چہرے پر ذرہ برابر بھی شکن نمودار نہ ہوئی شاید اس لئے کہ جس راستے کو وہ چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی، اس کے لئے پشیمان ہونا بے معنی تھا۔ سب سے پہلے اس نے My Aim in Life پر ایک جامع مضمون لکھا۔ اپنی گذشتہ زندگی اور آنے والی زندگی پر سب کچھ لکھ ڈالا۔ اس کا قلم جانے کیوں چلتا چلا گیا۔ ہوش تب آیا جب ایک لڑکی نے انو یجیلیٹر سے ٹائم پوچھا۔

"آدھا وقت بقایا ہے" ایک آواز گونجی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا مگر چہرے پر ابھی تک طمانت تھی۔ اس نے مضمون کا اختتام کیا اور بقیہ پیپر کو بھی نظروں سے دوڑایا اور باقی وقت اس میں صرف کیا۔

☆......☆......☆

ہے کون آپ میں جو ملے تجھ سے مستِ ناز

ذوقِ خبر ہی نے تو ہمیں بے خبر کیا

"آج کافی عرصے بعد اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ پیپر کرنے کے بعد بھی وہ ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا حالانکہ سب کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"یار۔۔۔ میم شبنم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جو پڑھایا ہی نہیں۔۔۔ اس کے بارے میں پیپر؟ بھلا کیا تک بنتا ہے؟" کامیش نے شکوہ کیا تھا۔ چہرے پر بھی بارہ بجے ہوئے تھے۔

"تک تو بنتا ہے میرے یار۔۔۔ پیپر تو ہوتا ہی آئی کیو لیول چیک کرنے کے لئے ہے۔ بھلا یہ کیا بات ہوئے جو پڑھایا سیدھا سیدھا وہی اٹھا کر دے دیا جائے۔ اس طرح تو سٹوڈنٹس کا دماغ ماؤف ہو کر رہ جائے گا۔ ایسے ایک طالب علم لکیر کا فقیر تو بن سکتا ہے مگر علم حاصل نہیں کر سکتا۔۔" اریب نے بھی پرجوش انداز میں اس کی نہ صرف سرزنش کی بلکہ اپنا بڑا پن بھی ظاہر کیا تھا۔

"جسٹ شیٹ اپ اریب۔۔۔ اب یہ بات ڈھکی چھپی تو ہے نہیں۔۔۔ آدھے سے زیادہ سٹوڈنٹس کو علم سے لینا دینا نہیں ہوتا ان کا مقصد تو صرف نمبر حاصل کرنا ہوتا ہے۔۔" اس نے ناک منہ چڑھا کر جواب دیا تھا۔ جس پر وہ رکا اور اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے

"For example?" ابرو اچکاتے ہوئے اس نے استفسار کیا تھا

"For example۔۔۔ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔۔۔" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا تھا جس پر اریب کے لبوں پر بے اختیار ہنسی امڈ آئی۔۔۔

''اپنی بات تو تم نہ ہی کرو تو اچھا ہے۔۔۔تمہارے لئے تو اگر سارا پیپر نوٹس سے بھی اٹھا کر دے دیا جائے تو تب بھی تم سے solve ہونے والا نہیں۔۔۔اُس وقت بھی تم نقل کے لئے ادھر ادھر تانک جھانک کرو گے۔۔۔''اس نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے شانِ بے نیازی سے کہا اور آگے کی طرف چل دیا۔اس بات پر کامیش نتھنے پھولا کر رہ گیا

''تم مجھے چیلنج کر رہے ہو۔۔۔''اریب کا تعاقب کیا

''بالکل۔۔۔''اس نے اپنی ہی بات کی تائید کی تھی۔جس پر کامیش نے گردن جھٹکی اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلنے لگا۔

''ویسے پاس جتنے نمبر تو آجائیں گے ناں تمہارے؟''اب جتنا سخت وہ اپنے آپ کو دیکھانا چاہ رہا تھا۔اتنا وہ تھا نہیں۔تبھی اس کے بارے میں دریافت کیا

''اب تم نے سمجھ کیا رکھا ہے کامیش کو۔۔۔اس کے اندر اتنی بھی عقل نہیں ہے کہ وہ ایک آدھا سوال اپنی طرف سے بھی لکھ سکے۔۔''اس نے مصنوعی انداز میں سختی کا لبادہ اوڑھنا چاہا تھا

''اچھا۔۔۔یہ تو بہت ہی اچھا ہو گیا پھر۔۔''ابھی وہ بات ہی کر رہے تھے کہ وہاں ہانیہ آموجود ہوئی۔

''ہیلو کامیش۔۔۔''اس بار پھر اس نے اریب کو اگنار کر دیا اور علیک سلیک کے بعد پیپر کے بارے میں دریافت کیا۔چہرے پر طمانت تھی مگر اریب پڑھ چکا تھا کہ اس کا بھی وہ سوال اتنا اچھا نہیں ہوا تھا جو آوٹ آف کورس تھا۔

''بے فکر رہو۔میم نمبر دے دیں گی سب کو۔۔۔''اریب نے ایک مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا تھا۔کامیش کے ساتھ ساتھ ہانیہ بھی اریب کی طرف دیکھ رہی تھی جو آج بنا کسی جواز کے ہانیہ سے مخاطب تھا۔چہرے پر ایک کشش، شکن نام کی کوئی شے نہیں۔۔نہ ہی کوئی دیکھاوا اور نہ ہی کوئی مجبوری۔۔۔کامیش کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں۔۔۔''کامیش نے اس کی پیشانی کو چھوا تھا۔

''میری طبیعت کو کیا ہونا؟ بالکل ٹھیک ہوں۔۔''اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے تو ہانیہ کو ایک اور جھٹکا لگا کیونکہ اریب کی نگاہیں ابھی تک اسی کو تک رہی تھیں

''پھر تم نے کیسے ہانیہ سے بات کر لی؟ وہ بھی اتنے دھیمے لہجے میں؟''کامیش ابھی تک شاک کے عالم میں تھا

''وہ اس لئے۔۔۔کیونکہ آج کل میں بہت خوش ہوں۔۔۔کچھ پہیلیاں تو سلجھنے لگی ہیں۔۔۔''اس نے ایک ادا سے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو وہ عکس ہانیہ کی نگاہوں میں نقش کر گیا۔کہاں وہ اس کو اپنے جال میں پھانسنے چلی تھی اور کہاں اس کی اداؤں کو دل میں بسا بیٹھی۔نگاہیں اسی کو دیکھتی جا رہی تھیں۔

''مطلب۔۔۔؟؟''کامیش نے پوچھا

''مطلب بھی بتادوں گا۔۔۔لیکن وقت آنے پر۔۔ابھی تم دونوں باتیں کرو۔۔۔پھر بات ہوگی۔۔۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا جبکہ ہانیہ ابھی تک اس کی حدت وہاں محسوس کر سکتی تھی۔اس کی مسکراہٹ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکتی تھی۔یوں تو وہ اس سے دور جاتا دیکھائی دے رہا تھا مگر چھٹی حس کہہ رہی تھی وہ مسافت اسے دور نہیں بلکہ قریب لا رہی ہے۔ ہوا سے بکھرے بالوں کو بار بار وہ داہنے ہاتھ سے سیٹ کرتا وجود جانے کیوں اس کے دل کو بھانے لگا تھا۔چہرے پر تذبذب طمانت میں بدلنے لگی۔

''اب تمہیں کیا ہوا؟'' اریب کے خیالوں میں وہ اس قدر محو تھی کہ کامیش کو ایک لمحے کے لئے بھول ہی چکی تھی۔

''کک کچھ بھی تو نہیں۔۔۔'' زبان نے منافقت اختیار کیا۔آنکھوں نے کامیش کو دیکھنا چاہا مگر ان میں تو کوئی اور ہی سما چکا تھا۔ کسی اور کی مسکراہٹ ان میں اتر چکی تھی۔

''تو پھر چلیں۔۔۔کینٹین۔۔۔گرمی بہت ہے۔۔کچھ ٹھنڈا پی لیا جائے۔۔۔'' کامیش نے کہا تو وہ بس گردن ہی اثبات میں ہلا سکی تھی۔

☆......☆......☆

پھول کو پھول کا نشاں جانو

چاند کو چاند سے ادھر دیکھو

حسام کی بھی ٹینشن ختم ہو چکی تھی۔۔رپورٹ نہ صرف سمٹ ہو گئی بلکہ اپروبھی ہو چکی تھی۔یعنی انجینئر نگ مکمل ہوئی۔یونیورسٹی سے واپسی پر اس نے سکھ کا سانس لیا۔

''اتنے عرصے کی محنت کا صلہ مل گیا۔'' اس نے دل میں سوچا تھا۔

''اب بس خدا کرے جلدی سے من چاہی جاب مل جائے۔۔۔'' اس نے نگاہوں کو آسمان کی طرف کیا جو ونڈ سکرین سے واضح دیکھائی دے رہا تھا۔ایک مسکراہٹ کو لبوں پر پھیلایا تو اس کی نگاہیں لاشعوری طور پر ایک وجود پر جا ٹھہریں

''صبا۔۔۔'' اس نے فی الفور کار کو بریک لگائی اور باہر نکل کر اس وجود کو دیکھا تو وہاں واقعی صبا کھڑی تھی۔وہ اس کے پاس گیا۔

''صبا۔۔تم یہاں؟ خیریت ہے؟'' وہ فٹ پاتھ پر کھڑی تھی۔حسام کی آواز پر وہ چونکی۔پھر اس نے اپنی کار کے بارے میں بتایا جو بیچ راستے میں خراب ہو چکی تھی۔ڈرائیور مکینک کو بلانے قریب کے چوک کی طرف گیا تھا

''آؤ۔۔میں تمہیں گھر ڈراپ کر دوں۔۔'' حسام نے آفر کی

''نہیں حسام۔۔میں چلی جاؤں گی۔۔ڈرائیور بس آتا ہی ہوگا۔۔'' اس نے منع کرنا چاہا تھا مگر گرمی کی وجہ سے اس کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو چکی تھی

"دیکھا۔۔کتنی گرمی ہے یہاں۔۔چلو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں گھر۔۔ڈرائیور کو کال کر دینا بعد میں۔۔" اس نے اصرار کیا تو وہ منع نہ کر سکی اور اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ چل دی۔ کار میں بیٹھتے ہی اس نے ایک گہری سانس لی۔ باہر واقعی گرمی تھی۔ اس نے ٹشو سے اپنا پسینہ صاف کیا تو حسام اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ آسمانی رنگ کا جوڑا، سفید رنگت اور نیلی آنکھوں کو بہت بھا رہا تھا۔ اس کے لبوں کی ذو معنی کشش، دل کی دنیا میں جذبات کا ایک طوفان برپا کیے ہوئے تھیں۔

"...wonderful" بے اختیار اس کے لبوں سے جاری ہوا۔ جس پر وہ چونکی اور حسام کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں کو اپنی طرف ہی مرکوز پایا۔ شرم و حیا کے دامن کا پاس رکھتے ہوئے اس نے خود کو سمیٹا اور دوپٹہ جو کندھے سے سرکتا جا رہا تھا۔ دوبارہ کندھے پر رکھا۔

"آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو تم۔۔۔" اس نے کار سٹارٹ کرتے ہوئے نگاہیں صبا کے وجود سے ہٹائیں۔ جواب میں وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ بس نیچی نگاہوں میں محبت کے ان حسین پلوں کو محفوظ کرنے کے۔۔۔ وہ اب دھیمی رفتار میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ کن انکھیوں سے کبھی کبھار اس کے حسین چہرے کا دیدار کر لیتا۔

"آپ کار آہستہ کیوں چلا رہے ہیں؟" اس نے انگلیوں کو چٹختے ہوئے تذبذب کے ساتھ سوال کیا

"تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت تمہارے ساتھ سپینڈ کر سکوں۔۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ جس پر حیا کے پردے مزید چہرے پر جھلکنے لگے۔

"کیوں تمہیں اچھا نہیں لگ رہا میرا ساتھ؟" کافی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے خود ہی سوال پوچھا تھا

"نہیں۔۔۔ایسی بات نہیں ہے۔۔۔" اس نے فی الفور نفی میں جواب دیا

"اس کا مطلب تمہیں اچھا لگ رہا ہے میرا ساتھ۔۔۔" اس نے شریر لہجہ اپنایا تھا

"اب میں نے ایسا بھی نہیں کہا۔۔۔" اس نے دانتوں سے اوپر کا ہونٹ کاٹتے ہوئے اپنی ہچکچاہٹ کو دبانا چاہا تھا۔ جس پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"ساتھ اچھا بھی نہیں لگ رہا اور برا بھی نہیں۔۔۔اس کا مطلب میں اچھا لگ رہا ہوں۔۔" اس نے دفعتہً بریک لگا کر اس کی طرف چہرہ کیا تھا۔ جس پر وہ حواس باختہ رہ گئی۔ سانسیں بھی جیسے تھم سی گئی تھیں۔

"بتاؤ ناں۔۔میں کیسا لگتا ہوں تمہیں۔۔۔" وہ خوابیدہ لہجے میں اس کی طرف معمولی سا جھکا ہوا تھا۔ جبکہ وہ سیٹ بیلٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ آنکھیں جھکی جھکی سی اپنے اندر بے چینی کے سمندر کو سینتے ہوئے جذبات کو لگام ڈال رہی تھیں۔

"یہ آپ کن باتوں کو لے کر بیٹھ گئے۔۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے ونڈ سکرین پر نظریں جمانا چاہیں تھیں مگر حسام نے اپنی انگلیاں اس کی تھوڑی پر رکھ دیں۔ ایک احساس اس کے جسم میں سرایت کر گیا۔ نرم سا خوشگوار احساس۔۔۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس

نے اس احساس کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔

”بتاؤ ناں؟ کیا تم مجھے پسند کرتی ہو؟“ وہ بنا پلکیں جھپکائے اپنی محبت نچھاور کر رہا تھا اور وہ محبت کی اس بارش میں انتہا کی حد تک بھیگ چکی تھی۔ شرم و حیا کے لباس نے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

”جی۔۔۔“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ جس پر اس کی محبت کو کنارہ مل گیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور ہاتھوں کو سٹیئرنگ پر رکھ کر خود کو کچھ دیر مرر میں دیکھتا رہا۔

”آئس کریم کھانے چلیں؟“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا تو وہ بس اثبات میں سر ہلا سکی تھی۔

☆......☆......☆

یاد، سپنا، خیال، سوچ اور وہ

کب اکیلے ہیں کائنات میں ہم

جہانزیب صاحب بیڈ پر بیٹھے ہمیشہ کی طرح آفس کی فائلیں بکھیرے ہوئے تھے۔ لیپ ٹاپ بائیں جانب آن پڑا تھا۔ جس پر ایکسل کی ایک فائل اوپن تھی۔ جس میں کچھ ٹیبلز نمایاں دیکھائی دے رہے تھے۔ موبائل بھی لیپ ٹاپ کے ساتھ ہی پڑا تھا جس پر تیسری مس کال کا نشان چمک رہا تھا مگر وہ گلاسز لگائے بلیو کلر کی فائل کو پڑھنے میں مصروف تھے۔

”لاسٹ منتھ سے اس منتھ کی پروگریس اچھی ہے۔۔۔“ انہوں نے زیر لب کہا تھا۔

”آپ نے کچھ کہا؟“ دھیمے مگر غیر مبہم الفاظ پر سحر فاطمہ نے استفسار کیا تھا جو اس وقت صوفے پر بیٹھی فیشن میگزین پڑھ رہی تھیں۔

”اوں ہنوں۔۔“ انہوں نے بنا دیکھے نفی میں سر ہلایا اور فائل کو ایک طرف رکھ کر لیپ ٹاپ کو سامنے رکھا، ایکسل کی فائل Minimize کرتے ہوئے Power point کی ایک نئی فائل اوپن کی۔

جہانزیب کے جواب پر انہوں نے اپنا دھیان دوبارہ فیشن میگزین پر جمایا مگر جلد ہی وہ اس سے بے زار ہو گئیں۔ اسے بیزاریت کے ساتھ ٹیبل پر پٹخا اور کچھ سوچنے لگی۔ میگزین کے پٹخنے کی آواز پر انہوں نے گردن اٹھا کر سحر فاطمہ کی طرف دیکھا تو لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر ان کی طرف بڑھے اور ان کے بالکل پاس صوفے پر آ بیٹھے۔

”خیریت ہے؟ آپ کچھ تھکی تھکی سی محسوس ہو رہی ہیں۔۔“ جہانزیب کو اپنے پاس دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لئے ہڑبڑا گئیں مگر جلد ہی اپنے آپ کو نارمل کیا اور دوبارہ صوفے کی بیک پر سر ٹکا لیا

”کچھ نہیں۔۔بس سر میں درد ہو رہا تھا۔“ انہوں نے گہری سانس لی

”میں ابھی آپ کو ٹیبلٹ دے دیتا ہوں۔۔۔کچھ افاقہ ہو جائے گا“ وہ اٹھے اور ڈریسنگ کے دراز سے ایک بکس نکالا اور اسے

لے کر واپس صوفے پر آ بیٹھے۔ سامنے ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور سحر فاطمہ کے ہاتھوں میں تھمایا۔ خود بکس سے ایک ڈسپرین کی ٹیبلٹ نکال کر انہیں دی۔

"یہ لیجیے۔۔۔ کچھ دیر میں آپ بہتر محسوس کریں گی۔۔" ٹیبلٹ کھانے کے بعد وہ گلاس انہوں نے ٹیبل پر رکھ دیا۔ جہانزیب بھی وہ بکس وہیں رکھ چکے تھے۔

"اس طرح کریں۔۔ کچھ دیر آپ بیڈ پر آرام کر لیں۔۔ میں وہاں سے فائلیں سمیٹ کر صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے اور فائلیں اٹھا کر صوفے پر لے آئے۔ سحر فاطمہ اٹھ کر بیڈ پر جا بیٹھیں۔

"ویسے میرے دل میں کافی دنوں سے ایک بات کھٹک رہی ہے اریب کو لے کر۔۔۔" جہانزیب لیپ ٹاپ اٹھانے لگے تو انہوں نے کہا تھا۔ جس پر وہ ایک لمحے کے لئے ویسے ہی جھکے رہے پھر واپس صوفے کی طرف پلٹے

"اریب کو لے کر کون سی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے؟" انہوں نے بات کو ہلکا جانا تھا۔ صوفے پر لیپ ٹاپ رکھ کر وہ دوبارہ بیڈ کی طرف پلٹے تھے۔

"وہ انڈونیشیا کے بارے میں بہت سوال و جواب کر رہا ہے مجھ سے۔۔۔ کبھی پوچھتا ہے کہ کیا ہمارا وہاں کوئی رشتہ دار رہتا ہے؟ تو کبھی پوچھتا ہے کہ کیا کبھی وہ انڈونیشیا گیا ہے؟ کبھی وہاں کی لینگونج کے بارے میں پوچھتا ہے۔ تو کبھی کچھ۔۔۔" وہ الجھے الجھے لہجے میں کہتی جا رہی تھیں۔ آنکھیں بھی تذبذب کا شکار تھیں۔ جہانزیب نے سائیڈ ٹیبل سے ریموٹ اٹھایا اور دروازے کی طرف بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ بچہ ہے۔۔ ایسے سوال تو کرے گا ہی۔۔۔" انہوں مسکرا کر بات کو ایک بار پھر ٹال دیا۔ اور اے سی آن کیا۔

"لیکن جہانزیب صاحب۔۔۔!! اس کے سوالوں کا مطلب کچھ اور ہی تھا۔۔۔" وہ اریب کا چہرہ اپنے سامنے گمان کئے ہوئے تھیں جس کے پیچھے ایک گہرہ راز چھپا تھا۔ جہانزیب نے ایک گہری نگاہ سحر فاطمہ پر ڈالی تو انہیں بھی کچھ ملال سا ہوا۔ وہ آگے بڑھے اور لحاف کو اوڑھنے میں ان کی مدد کی۔

"آپ اپنے دماغ پر کچھ زیادہ ہی بوجھ ڈال رہی ہیں۔ یقین رکھیے جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔ ویسا کچھ بھی نہیں ہے۔۔" انہوں نے یقین دلایا تھا۔ سحر فاطمہ نے بے یقینی کے ساتھ جہانزیب کی طرف دیکھا جو انہیں لحاف اوڑھانے کے لئے قدرے جھکے ہوئے تھے۔ جس پر انہوں نے طمانت کے ساتھ پلکیں جھپکیں اور ان کے ہاتھوں کو ہلکے سے تھپتھپایا۔

"اور اگر ایسا ہوا تو۔۔۔" ڈر تھا کہ ابھی تک اپنا بسیرا کیے ہوئے تھا۔

''تو میں ہوں ناں۔۔ میں ایسا کبھی ہونے نہیں دوں گا۔'' انہوں نے پیار سے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اٹھ کر واپس صوفے کی طرف بڑھنا چاہا مگر سحر فاطمہ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ ایک بار پھر وہیں بیٹھ گئے۔

''مجھ سے وعدہ کریں، آپ اریب کو کبھی مجھ سے جدا نہیں ہونے دیں گے۔۔ کبھی نہیں۔۔'' ممتا کسی آنے والے خطرے کو ابھی سے محسوس کر رہی تھی۔ اس جدائی کے زہر کو جو شاید ان کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں آپ سے۔۔۔ اریب کو کبھی کہیں نہیں جانے دوں گا۔ اب آپ سو جائیں۔۔ یقین رکھیں۔۔۔ اریب کہیں نہیں جائے گا۔۔'' ایک بار پھر انہوں نے یقین کے ساتھ پلکیں جھپکیں تو وہ سیدھا ہو کر لیٹ گئیں مگر آنکھیں تھیں کہ ابھی تک تذبذب کا شکار تھیں۔ آسودگی ابھی تک انہیں میسر نہ ہوئی تھی۔ جہانزیب وہاں سے اٹھے اور صوفے پر آ بیٹھے۔ جہاں لیپ ٹاپ ابھی تک آن پڑا تھا۔ انہوں نے اپنا دھیان لیپ ٹاپ پر مبذول کرنا چاہا مگر سحر فاطمہ کے الفاظ سماعت میں گونجنے لگے۔ انہوں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ آنکھیں بند کئے ہوئے تھیں۔ شاید ٹیبلٹ کا اثر ہو چکا تھا۔

''اریب کہیں نہیں جائے گا۔۔۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔۔'' انہوں نے خود کو یقین دلانا چاہا تھا ایک جدائی کی چنگاری ان کے دل میں بھی بھڑک چکی تھی۔ جسے وہ چاہ کر بھی بجھا نہ پا رہے تھے۔

☆......☆......☆

قرآن اکیڈمی کی بدولت اس کی زندگی میں خدیجہ کی کمی پوری ہو چکی تھی۔ ایک عورت جو ہو بہو خدیجہ کی طرح نرم گوشہ رکھتی تھیں۔ ان میں اسے خدیجہ ہی نظر آتی تھی۔ آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح پہلی رو میں بیٹھی لیکچر کو دھیان سے لکھ رہی تھی۔

''آج ہم وضو کے بارے مزید پڑھیں گے۔۔۔'' مس شہناز نے لیکچر کا آغاز کیا تھا

''لیکن مِس ہم تو وضو کے مسائل تقریباً ڈسکس کر چکے ہیں۔'' لائبہ نے کہا تھا

''جی بالکل لائبہ۔۔۔ ہم وضو کے فرائض، سنتیں اور مستحب چیزوں کے بارے میں ڈسکس کر چکے ہیں۔'' مس شہناز نے تائید کی تھی۔

''اس کے علاوہ ہم ان چیزوں کے بارے میں بھی ڈسکس کر چکے ہیں جو چیزیں وضو توڑ دیتی ہیں اور پھر پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمم کا بھی تو ذکر کر چکے ہیں۔'' اس بار نور نے کہا تھا

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے کہ آپ سب کو میرا پورا لیکچر یاد ہے۔۔'' انہوں کلاس کی تعریف کی تھی۔

''تو پھر مِس۔۔ آج ہم وضو کے بارے میں کس بات کو زیرِ بحث لائیں گے؟'' اس بار حاعفہ نے پوچھا تھا

''آج ہم وضو کے مسائل وغیرہ کو ڈسکس نہیں کریں گے حاعفہ بلکہ بزرگانِ دین نے وضو کرتے ہوئے جو دعائیں مانگی، ان کو

ڈسکس کریں گے۔"

"آپ یقیناً وضو کے آغاز، درمیان اور اختتام کے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں کا ذکر کر رہی ہیں۔" حاعفہ نے دوسرا سوال کیا تھا

"نہیں حاعفہ۔۔۔ یہ تو سنتیں ہیں جن کے بارے میں ہم پچھلے لیکچرز میں ڈسکس کر چکے ہیں۔ آپ کو میرے الفاظ پر غور کرنا چاہیے تھا۔ میں نے کہا بزرگانِ دین نے وضو کرتے ہوئے جو دعائیں مانگی۔۔ ان کے بارے میں۔۔۔" مس شہناز نے پیار سے حاعفہ کی تصیح کرائی تھی۔

"اس کا مطلب وضو کے دوران بھی دعا مانگی جاتی ہے۔۔" عنبر نے حیرانی سے استفسار کیا تھا

"جی بالکل۔۔۔ اور ایک دعا تو بہت زیادہ نقل کی جاتی ہے جو بزرگانِ دین وضو کے دوران مانگتے تھے۔" مس شہناز وائیٹ بورڈ کی طرف بڑھی اور سب سے پہلے ہائیڈنگ دی۔ حاعفہ نے بھی کاغذ پر مارکر سے۔۔۔ وضو کے دوران مانگی جانے والی دعائیں۔۔۔ کی ہائیڈنگ دی اور پھر بال پوائنٹ سے مس شہناز کے الفاظ لکھنا شروع کر دیئے۔

"جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے وضو کے شروع میں بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا کلمہ پڑھنا بھی منقول ہے۔

وضو کا سب سے پہلا حصہ کلی کرنا ہے۔ اس دوران مانگی جانے والی دعا یہ ہے

اَللّٰھُمَّ اَعِنِّی عَلٰی تِلَاوَۃِ الْقُراٰنِ وَذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ

(اے اللہ تو میری مدد کر کہ قرآن کی تلاوت اور تیرا ذکر و شکر کروں اور تیری اچھی عبادت کروں)

پھر ناک میں پانی ڈالتے وقت یہ دعا پڑھنی مانگنی چاہیے

اللھم ارحی رائحتہ الجنتہ ولاترحیر الحتہ النار

(اے اللہ عزوجل تُو مجھ کو جنت کی خوشبو سونگھا اور جہنم کی بُو سے بچا)

اس کے بعد جب چہرے کو پانی سے دھویا جائے تو اس دوران یہ دعا مانگنا منقول ہے

اَللّٰھُمَّ بَیِّضْ وَجْھِی یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ

(اے اللہ عزوجل تو میرے چہرے کو روشن کر جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ)

اس کے بعد داہنا بازو کہنی تک دھوتے ہوئے یہ دعا مانگنی چاہیے

اَللّٰھُمَّ اَعْطِنِی کِتَابِی بِیَمِیْنِی وَحَاسِبْنِی حِسَابًا یَّسِیْرًا

(اے اللہ عزوجل میرا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دے اور مجھ سے آسان حساب کرنا)

اور جب بائیاں ہاتھ کہنی تک دھویا جائے تو اس وقت یہ دعا مانگنی چاہیے

اَللّٰھُمَّ لَا تُعۡطِنِیۡ کِتَابِیۡ بِشِمَالِیۡ وَلَا مِنۡ وَّرَآءِ ظَھۡرِیۡ

(اے اللہ عزوجل میرا نامہ اعمال نہ بائیں ہاتھ میں دے اور نہ ہی پیٹھ کے پیچھے سے)

اس کے بعد جب سر کا مسح کیا جائے تو ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے لبوں سے اس دعا کو جاری کیا جائے

اَللّٰھُمَّ اَظِلَّنِیۡ تَحۡتَ عَرۡشِکَ یَوۡمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلَّ عَرۡشِکَ

(اے اللہ عزوجل تو مجھے اپنے عرش کے سائے میں رکھ جس دن تیرے عرش کے سائے کے سوا کہیں سایہ نہ ہوگا)

اس کے بعد کانوں کا مسح کیا جاتا ہے۔اس دوران یہ دعا رب کریم سے مانگی چاہیے

اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡنِیۡ مِنَ الَّذِیۡنَ یَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَیَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَہٗ

(اے اللہ عزوجل مجھے ان میں کر دے جو بات سنتے اور اچھی بات پر عمل کرتے ہیں۔)

حاعفہ کا قلم خود بخود جیسے چلتا ہی جا رہا تھا۔مس شہناز کے الفاظ کے سوا اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ ہی اپنی تحریر کے سوا کچھ دیکھائی دے رہا تھا۔مس شہناز نے ایک پل کے لئے ٹھہر کر حاعفہ کی جانب دیکھا۔جو بس لکھتی جا رہی تھی اور مس شہناز کے رکنے پر اس کا قلم بھی استادہ دیکھائی دیا۔اس نے گردن اٹھا کر مس کی طرف دیکھا

''مس گردن کا مسح کرتے ہوئے کوئی دعا پڑھنا منقول نہیں ہے کیا؟'' اس کے دل میں علم کی چاہ بڑھتی جا رہی تھی۔جسے دیکھ کر مس شہناز کو انتہائی خوشی ہوئی۔

''کیوں نہیں؟ گردن کا مسح کرتے ہوئے بھی دعا پڑھنا بزرگانِ دین سے منقول ہے۔'' مس شہناز کے لبوں سے الفاظ کا دوبارہ جاری ہونا تھا حاعفہ کا قلم بھی ایک بار پھر رواں دواں تھا۔

''گردن کا مسح کرتے ہوئے یہ دعا مانگنی چاہیے

اَللّٰھُمَّ اَعۡتِقۡ رَقَبَتِیۡ مِنَ النَّارِ

(اے اللہ عزوجل میری گردن آگ سے آزاد کر دے)

اس کے بعد دائیاں پاؤں دھوتے ہوئے یہ دعا مانگنی چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ ثَبِّتۡ قَدَمِیۡ عَلَی الصِّرَاطِ یَوۡمَ تَزِلُّ الۡاَقۡدَامُ

(اے اللہ عزوجل میرا قدم پل صراط پر ثابت قدم رکھ جس دن کہ اس پر قدم لغزش کریں گے)

اور سب سے آخر میں بائیاں پاؤں دھویا جاتا ہے۔اس دوران یہ دعا مانگنی چاہیے

اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡ ذَنۡبِیۡ مَغۡفُوۡرًا وَّسَعۡیِیۡ مَشۡکُوۡرًا وَّتِجَارَتِیۡ لَنۡ تَبُوۡرَ

(اے اللہ عزوجل میرے گناہ بخش دے اور میری کوشش بار آور کر دے اور میری تجارت ہلاک نہ ہو)

یہ کہتے ہی انہوں نے مارکر ٹیبل پر رکھا۔اس کے ساتھ ہی حاعفہ نے صفحے کے آخر پر فل سٹاپ لگایا۔

"اور مس اگر کسی کو یہ تمام دعائیں یاد نہ ہوں تو؟" راحیلہ نے دریافت کیا تھا

"اسے چاہیے کہ ان سب دعاؤں کی جگہ درود شریف پڑھے۔"

"ان سب کی خاص وجہ؟" حاعفہ نے اگلا سوال پوچھا تھا

"ہے ناں۔۔۔ بہت ہی خاص وجہ ہے۔ جب ہم وضو کر رہے ہوتے ہیں تو اپنے گناہوں کو دھوتے ہیں اور پھر وضو کرتے ہوئے ویسے بھی دعا قبول ہوتی ہے۔اب نماز پڑھنے کے لئے جب ہم پانچ بار دن میں وضو کرتے ہوئے یہ دعائیں مانگیں تو ہمیں پانچ بار یہ دعائیں مانگنے کا موقع ملے گا اور جانے کون سی گھڑی قبولیت کی ہو اور ہماری مانگی دعائیں قبول ہو جائیں اور ہماری بخشش کا ذریعہ بن جائیں۔" انہوں نے انتہائی شفیق لہجے میں سمجھایا تھا۔

"میرے خیال سے آج کے لئے اتنا کافی ہے۔۔۔ مجھے امید ہے آپ سب آج کے لیکچر کو اپنی زندگی کا حصہ ضرور بنائیں گے۔۔" سب نے مثبت جواب دیا جبکہ حاعفہ کے چہرے پر یقین کا اثر نمایاں تھا۔اس نے آج سے ہی اس پر عمل کرنے کی ٹھان لی تھی۔مس شہناز اس کے چہرے پر عمل کی جستجو پڑھ لی چکی تھیں

☆......☆......☆

آج عالمگیر فیملی ٹی وی لاؤنج میں جمع تھی۔ٹی وی پر میوزک شو آن ائیر تھا۔جسے جبیں آواز میوٹ کر کے تقریباً دیکھ ہی رہی تھی۔حسام اور اریب دونوں بائیں جانب کے صوفے پر بیٹھے تھے۔حسام موبائل پر چیٹنگ کر رہا تھا جو یقیناً صبا سے ہی تھی جبکہ اریب نظروں کو ٹی وی پر ٹکائے کسی گہری سوچ میں غرق دیکھائی دے رہا تھا۔جہانزیب بھی صوفے پر بیٹھے کبھی فائل پڑھتے تو کبھی ٹی وی دیکھتے دیکھائی دے رہے تھے۔سحر فاطمہ سب کے لئے ملک شیک کی ٹرے لے کر حاضر ہوئی تھیں۔حاعفہ ابھی تک قرآن اکیڈمی سے واپس نہ آئی تھی۔

"یہ لیجیے ملک شیک۔۔۔" جبیں نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ چڑ کر رہ گئی

"یہ کیا ماما جان؟ آج پھر مینگو ملک شیک؟" اس نے ناک منہ چڑھاتے ہوئے اپنا غصہ بے چارے کشن پر اتارا تھا

"آج سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ لاسٹ سنڈے بنایا تھا مینگو ملک شیک" سحر فاطمہ نے برجستہ جواب دیا اور ایک گلاس اس کے سامنے کر دیا مگر وہ اس کو چھونے کی بھی روادار نہ تھی۔

"تو سنڈے کو گزرے ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟" اس نے منہ بسور کر کہا

"بس پانچ دن۔۔!!!" حسام نے فی الفور جواب دیا

''تو پانچ دن کم نہیں ہوتے۔۔ چلو اب شاباش! اسے پیو۔ کل تمہاری پسند کا بنا دوں گی ملک شیک۔۔ اب خوش؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہ ملک شیک کا گلاس لینا پڑا۔

''یہ لو اریب'' سحر فاطمہ اس کے بعد اریب کی طرف گئیں جو ایک گہری سوچ میں غرق تھا۔ سحر فاطمہ ایک ثانیے تک وہ گلاس اس کے سامنے کئے رہیں مگر اسے بھنک تک نہ تھی

''اریب۔۔'' حسام نے پیچھے سے ایک تھپڑ اس کے سر پر دے مارا جس کے لئے وہ قطعاً تیار نہ تھا اور اپنا توازن کھو بیٹھا اور تقریباً منہ کے بل گرتے گرتے بچا۔ جبیں کا قہقہہ ٹی وی لاؤنج میں گونجا۔

''خیال سے اریب۔۔'' سحر فاطمہ کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ جہانزیب بھی اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر رہ گئے۔ حسام کی بھی سانس ایک لمحے کے لئے تھم گئی تھی۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں اریب؟'' موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے اریب کے شانوں کو چھوا۔ سحر فاطمہ بھی اس کے ساتھ آ بیٹھی تھیں۔

''حسام یہ کیا حرکت تھی؟'' جہانزیب نے اس کی سرزنش کی تھی

''آئی ایم سوری بابا جان۔۔!! میرا مقصد اریب کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔ آئی ایم سوری اریب۔۔'' اس نے فوراً اریب سے معافی مانگی تھی۔

''اٹس اوکے بھائی۔۔'' اریب نے مسکراتے ہوئے کہا

''ویسے کن سوچوں میں غرق تھے تم؟ ماما جان کب سے تمہیں بلا رہی تھیں، تمہیں سنا ہی نہیں'' جبیں نے ابرو اچکاتے ہوئے استفسار کیا تھا

''ہاں اریب۔ تمہارا دھیان کہاں تھا؟'' سحر فاطمہ نے بھی الفاظ کے تبدل کے ساتھ وہی سوال پوچھا تھا

''کہیں بھی تو نہیں۔۔'' اس نے جھٹ سب باتوں کی تردید کی اور صحیح سے بیٹھا۔ نگاہیں ٹیبل پر رکھے ملک شیک کی طرف گئیں تو اس نے بات کو ایک نیا موڑ نا دینا چاہا

''مینگو ملک شیک۔۔۔ مائے فیورٹ'' آگے جھک کر اپنا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں آدھا پی گیا۔ سحر فاطمہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جہانزیب کو اشارہ کیا۔ انہوں نے پلک جھپکتے ہوئے یقینی دہانی کا اشارہ دیا۔ اپنی فائل سمیٹتے ہوئے وہ اٹھے اور اریب کے پاس گئے۔

''اریب؟ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' اپنا دائیاں بازو اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے وہ اس کے بائیں جانب آ بیٹھے تھے۔ حسام نے سمٹتے ہوئے انہیں مزید جگہ دی تھی۔

"نہیں تو بابا جان۔۔۔" اس نے بنا سوچے سمجھے جواب دیا تھا پھر دفعتاً اس کے ذہن میں انڈونیشیا کا خیال آیا۔

"یہی موقع ہے بابا جان سے بات کرنے کا۔۔۔" اس نے دل میں سوچا تھا۔

"جی ہاں۔۔" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا

"پہلے فیصلہ کر لو تم نے بات کرنی بھی ہے یا نہیں؟ کیا ہاں ناں لگا رکھی ہے۔" جبیں نے اپنا حصہ ڈالنا فرضِ عین سمجھا تھا

"جبیں۔۔!!" سحر فاطمہ نے جبیں کو گھورا جس پر وہ گردن جھٹک کر دوبارہ ٹی وی دیکھنے لگی مگر کان ابھی تک اریب کے وجود پر ٹکے ہوئے تھے۔

"ہاں! کیا کہنا چاہتے ہو تم؟" جہانزیب نے پوچھا

"دراصل بات یہ ہے بابا جان۔۔" اس سے پہلے کہ وہ مدعا بیان کرتا دروازے پر بیل ہوئی۔ سب کا دھیان باہر کی طرف مبذول ہوا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" سحر فاطمہ نے سوچا

"ماریہ۔۔۔ باہر دیکھو۔ کون ہے باہر؟" سحر فاطمہ نے ذرا اونچے لہجے میں کہا تھا۔ ماریہ کچن سے ٹی وی لاؤنج میں آئی اور پھر دروازے کی طرف بڑھی۔ اریب کی بات ادھوری رہ گئی اور اس نے بھی بات مکمل کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ سب کا دھیان تقریباً باہر کی طرف تھا۔

"کون ہے ماریہ؟" سحر فاطمہ نے دریافت کیا

"مسٹر عکاس شاہ نواز" اس آواز کے سماعت سے ٹکراتے ہی سب کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اپنی اپنی جگہ پر سب کھڑے ہو گئے۔

"السلام علیکم!" ایک بائیس تئیس سالہ نوجوان ہلکی بلیو جینز اور اسی رنگ کی شرٹ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جس کے داہنے ہاتھ میں سوٹ کیس اور چہرے پر بلیک گلاسز تھیں۔ سحر فاطمہ تو اس کو دیکھتے ہی اس کی جانب لپکیں۔

"وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو؟ یوں اچانک؟ پہلے بتا دیتے۔ تمہیں ایئر پورٹ لینے آجاتا حسام" سحر فاطمہ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا

"میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی۔۔ اور اگر پہلے بتا دیتا تو سرپرائز تو نہ رہتا ناں" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ جہانزیب آگے بڑھے اور بغل گیر ہوتے ہوئے اسے پیار کیا۔

"سفر میں کسی قسم کی پریشانی تو نہیں ہوئی؟" جہانزیب نے پوچھا تھا

"نہیں انکل۔۔سفر بہت اچھا گزرا" اس نے اسی ولولے کے ساتھ جواب دیا۔

"کافی بڑے ہو گئے ہیں آپ تو" حسام نے آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا

"اور آپ بالکل بھی نہیں بدلے۔۔۔" عکاس نے بھی ہنستے ہوئے اسے گلے لگایا

"اور مجھے بھول گئے کیا؟" اب اریب کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔آگے بڑھا اور عکاس سے رسمی علیک سلیک کیا۔جبیں تو اسے دیکھتے ہی منہ چڑھا کر رہ گئی۔اٹھنا تک گوارا نہ کیا۔

"اسے ضرور ٹپکنا تھا اور وہ بھی پورے ساز وسامان کے ساتھ۔۔ہنوں" گردن جھٹکتے ہوئے اس نے کچا چبا جانے والی نگاہوں سے اس کے سوٹ کیس کی طرف دیکھا

"تم بیٹھ کر باتیں کرو۔۔میں ابھی تمہارے لئے کچھ ٹھنڈا لاتی ہوں۔" سحر فاطمہ یہ کہتے ہی کچن کی طرف بڑھی۔

"ماریہ عکاس کا سوٹ کیس لے جاؤ اور گیسٹ روم میں رکھ دو۔" کچن میں داخل ہوتے ہی سحر فاطمہ نے حکم جاری کیا تھا۔ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کب تک رہنے کا ارادہ ہے موصوف کا؟" جبیں نے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا تھا

"یہی کوئی تین چار سال۔۔۔" عکاس کا بھی اسے جلانے کا پورا ارادہ تھا۔فی الفور جواب دیا

"جبیں۔۔" اس بار جہانزیب نے گھورا تھا۔وہ جل بھن کر ریموٹ صوفے پر رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔سارے مرد اس وقت ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے۔

"کل ہی شاہ نواز بھائی سے بات ہوئی۔انہوں نے تو تمہارے آنے کی خبر دی نہیں" جہانزیب نے کہا

"دراصل میں نے ہی ڈیڈ کو منع کیا تھا۔سوچا تھا آپ سب کو اچانک آ کر سرپرائز دوں۔۔"

"چلو اچھی بات ہے عکاس۔۔۔" حسام نے کہا

"ویسے بھائی آپ نے تین ماہ پہلے آنے کا کہا تھا اور آج آرہے ہیں۔دِس از ناٹ فیئر" اریب نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا

"تمہارہ شکوہ بھی جائز ہے اریب لیکن کیا کروں۔۔۔جاب لیٹر ہی اس ویک جاری ہوا تھا" عکاس نے دلیل سے بات واضح کرنا چاہی تھی۔

"اس کا مطلب آپ کو ہم سے زیادہ جاب عزیز ہے" اریب نے دوسرا شکوہ کیا تھا

"ابھی عکاس کو آئے دیر ہی کتنی ہوئی ہے اور تمہارے شکوے پہلے ہی شروع ہو گئے۔۔ذرا اسے کچھ کھا پی لینے دو۔بعد میں باتیں کر لینا" سحر فاطمہ نے کولڈ ڈرنک عکاس کو سرو کی۔

"اور ویسے بھی اب یہیں رہے گا عکاس۔۔پھر کرتے رہنا یہ گلے شکوے۔۔" جہانزیب نے بات کو جاری رکھا تھا

"مگر میں تو نہیں۔۔۔" وہ بڑبڑایا تھا۔ جس پر سب چونکے تھے

"مطلب؟" جہانزیب نے فی الفور پوچھا تھا

"کچھ بھی تو نہیں۔۔" اس نے جھرجھری لیتے ہوئے بات کو ٹالا

"آپ باتیں کریں۔ میں ذرا ایک کامیش کو میسج کر کے آتا ہوں" اس نے وہاں سے نکلنے میں ہی فلاح جانی تھی۔ جہانزیب اور سحر فاطمہ کی نگاہیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں۔ جو اندر ہی اندر جانے کون سی کھچڑی بنا رہا تھا؟

☆......☆......☆

کھانے کی میز پر عکاس کی خوب آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ سحر فاطمہ نے ایک سے بڑھ کر ایک کھانے فقط عکاس کے لئے بنائے تھے۔ جنہیں دیکھ کر اس کی بھوک ہی اڑ چکی تھی

"یہ سب میں کیسے کھاؤں گا آنٹی؟" اس نے تھوک نگلتے ہوئے آنکھیں پھیلا کر ہر شے کو دیکھا تھا۔

"اپنے ہاتھوں اور منہ سے۔۔" جبیں نے کھانے کا طریقہ متعارف کروایا تھا

"شکریہ۔۔بتانے کے لئے۔" انتہائی ادب سے عکاس نے اس کے طنز کا جواب دیا تھا۔

"بھائی۔۔ابھی تو شروعات ہے۔ آگے آگے دیکھیے گا، ماما جان کیسے آپ کو کھانا کھلا کھلا کر مارتی ہیں" اریب نے دھیمے لہجے میں سرگوشی کی تھی

"اریب۔۔" سحر فاطمہ کی نگاہوں پر وہ ہنس کر رہ گیا

"سب سے پہلے عکاس آپ یہ کھائیے۔۔۔ ماما جان نے بڑے ہی پیار سے بنائی ہے بریانی آپ کے لئے" حسام نے اپنے سامنے سے بریانی کی پلیٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی

"بریانی کے ساتھ رائتہ تو دو" جہانزیب نے بھی رائتہ بڑھانے میں مدد کی تھی

"اور یہ سب کباب کون کھائے گا؟" اب ایسے میں اریب کہاں پیچھے رہنے والا تھا؟ اپنے آگے سے کباب اٹھا کر عکاس کے سامنے رکھ دیے

"اب آپ سب میرا مذاق اڑا رہے ہیں" سحر فاطمہ شکوہ کرتے ہوئے جبیں کے ساتھ آ بیٹھیں

"نہیں بیگم۔۔ ہم مذاق کہاں اڑا رہے ہیں آپ کا؟ ہم تو آپ کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کر رہے ہیں" جہانزیب نے سنجیدہ لہجے میں بات واضح کرنا چاہی تھی۔

''ویسے ماما جان۔۔ یہ فروٹس آپ سب ان کے کمرے میں ہی ٹرانسفر کروا دیں۔ رات کو اٹھنے کے بعد شاید انہیں بھوک لگ جائے۔'' جبیں کو تو عکاس جیسے ایک نظر بھی نہیں بھا رہا تھا۔ الفاظ کے لبادے میں نشتر برساتی جا رہی تھی۔

''ویسے آئیڈیا برا نہیں ہے آنٹی۔۔ مجھے ویسے بھی رات کے ایک دو بجے بھوک لگتی ہے'' چمچ کو ہوا میں لہراتے ہوئے اس نے ایک ادا سے جواب دیا تھا۔ جس پر وہ ناک سکیڑ کر رہ گئی۔

''باتیں کافی ہو گئیں۔ اب پہلے کھانا کھا لیا جائے۔ ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا'' سحر فاطمہ نے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو سب کھانے میں مصروف ہو گئے مگر اریب تھا کہ دھیمے لہجے میں مسلسل عکاس سے باتیں کرتا جا رہا تھا۔

''اریب۔۔ کھانا تو کھا لو پہلے، کہیں کوئی ٹرین نکلنے والی ہے کیا؟'' حسام نے سرزنش کی تھی

''ٹرین کا تو پتا نہیں بھائی مگر پلین ضرور نکلنے والا ہے۔۔۔'' اس نے آدھی ادھوری بات سب کے سامنے رکھ دی۔ جس پر بچہ پارٹی تو ہنس دی مگر جہانزیب اور سحر فاطمہ کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ منہ کا نوالہ سحر فاطمہ کے حلق میں ہی پھنس گیا۔ کھانسی کا دورہ پڑا تو جبیں نے پانی کا گلاس دیا۔

''آر یو اوکے ماما جان؟'' جبیں نے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کی استفہامیہ نگاہوں نے پہلے اریب کا رخ کیا جو ایک بار پھر عکاس سے باتوں میں مصروف تھا۔

''ار۔۔'' انہوں نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ جہانزیب نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ کی پشت پر رکھ دیا۔ نگاہوں کا مرکز جہانزیب کی ذات کی کو بنایا تو انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں خاموش رہنے کی تلقین کی۔ جس پر ان کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔

''اچھے سے کھانا کھانا سب۔۔'' جہانزیب نے پریشانی کو چھپاتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر عکاس نے نفی میں سر ہلا دیا

''میری تو بس ہو گئی انکل۔۔''

''بس؟ وہ بھی صرف آدھی پلیٹ میں؟'' اریب نے حیرت سے کہا تھا

''جناب صاحب! پلین میں بھی کھانا ملتا ہے اور میں صرف کراچی سے آیا ہوں امریکہ سے نہیں۔ جو اتنی زیادہ بھوک ہو گی مجھے۔ گھر سے نکلنے سے پہلے موم نے اتنا کچھ کھلا دیا اور یہاں آنٹی نے۔۔۔ میرا پیٹ ہے۔ اس میں اتنی جگہ نہیں ہے۔'' اس نے مزاح کا پہلو ڈھونڈتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا۔۔ ویسے مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ پلین میں بھی کھانا ملتا ہے'' اریب نے سنجیدہ لہجے میں کہا تھا اور اپنے دونوں بازو ٹیبل پر پھیلا دیئے۔

''اگر آپ نے کھانا کھا لیا ہے تو کمرے میں جا کر باتیں کریں عکاس؟'' حسام نے پوچھا تو اس نے ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر

اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور کھانا؟'' سحر فاطمہ نے پوچھا

''باقی صبح کو۔۔'' دونوں نے یک زباں کہا تھا۔ جس پر دونوں مسکرا دیے۔ حسام عکاس کو اپنے کمرے میں لے گیا۔ اریب بھی اٹھنے لگا تو جہانزیب نے اسے روکا

''رکو اریب، مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے'' جہانزیب کا لہجہ سنجیدہ تھا جس پر جبیں نے حیرت سے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''جی بابا جان'' وہ اٹھتا اٹھتا دوبارہ بیٹھ گیا

''تمہارے دماغ میں کیا چل رہا ہے؟ صاف صاف بتاؤ ہمیں'' جہانزیب نے صاف گوئی سے کام لیا اور کسی بھی استعارے سے کام لینے کی بجائے اصل مدعا سامنے رکھا

''آپ کا کیا مطلب ہے بابا جان؟'' وہ ابھی تک کچھ سمجھ نہ سکا تھا

''مطلب تم اچھے سے جانتے ہو اریب'' اس بار سحر فاطمہ گویا ہوئی تھیں

''ماما جان سیریسلی ۔۔ میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔ آپ دونوں کس بارے میں دریافت کرنا چاہ رہے ہیں'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ واقعی سچ بول رہا تھا۔

''واہ۔ آج پہلی بار اریب کسی کی بات کو بنا کہے نہیں سمجھ پا رہا۔۔'' جبیں نے مزاح میں بات کا رخ بدلنا چاہا تو سحر فاطمہ کی نگاہوں نے اسے اپنی نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔

''لگتا ہے کوئی سیریس بات ہے'' اس نے دل میں سوچا تھا

''ٹھیک ہے۔ یہ بھی ہم بتا دیتے ہیں۔ تم بار بار پلین اور کہیں جانے کی بات کر رہے ہو۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں تم کہاں جانے کی سوچ رہے ہو؟'' ان کی نگاہوں کا مرکز فقط اریب کی ذات تھی۔ جس پر وہ مسکرا دیا۔

''اچھا وہ۔۔۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''میں تو سمجھا تھا جانے کون سی بات ہے؟ جو آپ اتنا پریشان ہو رہے ہیں'' اس نے بات کو ہلکا جانا تھا مگر سحر فاطمہ اور جہانزیب کے لئے یہ ہلکی بات نہ تھی مگر اریب یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

''دراصل بابا جان! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ سمر ویکیشن سٹارٹ ہو چکی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ ویکیشن میں آپ کے ساتھ دیپالپور میں گزاروں'' اریب کے اس جملے نے جیسے دونوں کے سر پر ایک بم پھوڑا تھا۔ سحر فاطمہ کے ہاتھوں میں موجود گلاس زمین پر

آ گرا۔اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔جبیں نے جب سحر فاطمہ کی یہ حالت دیکھی تو کافی حیران ہوگئی مگر لب خاموش رہے۔

''تم کہیں نہیں جارہے'' جہانزیب نے پہلی بار سختی میں کہا تھا۔جبیں کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔اس نے کبھی جہانزیب کو اتنے اشتعال میں نہیں دیکھا تھا۔

''مگر کیوں؟'' اریب کو انکار کا جواز سمجھ نہ آیا تبھی وہ اپنی نشست پر کھڑا ہوگیا

''کیوں کا جواب جاننا تمہارے لئے ضروری نہیں ہے۔بس اتنا سمجھ لو کہ تم کہیں نہیں جارہے۔۔سمجھے'' انہوں نے گھورتے ہوئے اسے تنبیہہ کی تھی مگر وہ اس تنبیہہ کو سمجھنے کی بجائے اپنے فیصلے پر اٹل تھا۔

''مگر میں یہ فیصلہ کرچکا ہوں کہ میں دیپالپور جارہا ہوں'' اریب کا لہجہ بھی جارحانہ تھا۔جسے دیکھ کر جبیں کو دوسرا جھٹکا لگا۔اریب جیسا خوش مزاج لڑکا بھی اشتعال انگیز ہوسکتا ہے۔اس نے کبھی سوچا تک نہ تھا

''میں بھی دیکھتا ہوں کہ میری مرضی کے خلاف تم کیسے انڈو جاتے ہو''

''آپ مجھے جانے سے کیوں روک رہے ہیں؟ جب حسام بھائی اپنے دوستوں کے ساتھ دبئی گئے تب تو آپ نے انہیں منع نہیں کیا'' اس نے متجلی ماضی سے باتیں کھریدنا شروع کردیں۔سحر فاطمہ اور جہانزیب دونوں خفگی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے

''حسام تم سے بڑا ہے'' نظریں چراتے ہوئے سحر فاطمہ نے کہا تھا

''آج سے تین سال پہلے وہ بھی انیس سال کے ہی تھی'' اس نے دوسری دلیل دی تھی۔

''اور میں انڈو جارہا ہوں تو بس جارہا ہوں۔۔اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے'' یہ کہتے ہی وہ برق رفتاری سے اپنے کمرے کی طرف پلٹا۔سحر فاطمہ اپنا ہاتھ بڑھا کر رہ گئی۔جبیں کے گلے سے تھوک بھی نہ نگلا گیا جبکہ جہانزیب کی آنکھیں اریب کو زینہ چڑھتا دیکھتی جا رہی تھیں۔

آئینہ ایک چہرے دو

دب کے مرنے سے ڈوب مرنا خوب
ہے کنارا یہاں سے کرنا خوب

وہ اشتعال انگیز چال کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی دروازہ ایک آواز کے ساتھ مقفل کیا۔ یقیناً اس آواز کو نیچے ٹی وی لاؤنج تک سنا گیا ہوگا مگر اسے کہاں پرواہ تھی۔ اس کے سر پر تو بس ڈیپا سار جانے کا بھوت سوار تھا۔

دروازہ مقفل کرتے ہی وہ برق رفتاری سے پلٹا اور کمرے میں ایک ایک شے کو بغور دیکھا۔ پہلے پہل تو سب کچھ واضح نظر آیا پھر کچھ مبہم سا دکھائی دیا اور پھر دھیرے دھیرے ہر شے مبہم ہوتی چلی گئی۔ وہ بے جان قدموں کے ساتھ آگے ڈریسنگ کی طرف بڑھا اور اپنا عکس آئینے میں دیکھا تو خود کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک انبار منجمد پایا۔

''آخر بابا جان میرے ڈیپا سار جانے کے اتنے خلاف کیوں ہیں؟'' اس نے خود سے پوچھا تھا۔ سماعت میں جہانزیب کا سخت لہجہ ایک بار پھر گونجا تھا۔ ان کی قہر برساتی آنکھیں جن میں اس نے ہمیشہ سے اپنے لئے نرمی دیکھی تھی کیسے اسے گھور رہی تھیں۔ سحر فاطمہ کا بھی بجھا ہوا چہرہ اپنے اندر کسی راز دفن کئے ہوئے تھا۔

''اس کا مطلب ہے بابا جان اور ماما جان یہ سب کچھ جانتے ہیں'' اس نے رخسار سے بہتا ہوا آنسو کا پہلا قطرہ اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھا تھا۔ آنکھیں بے یقینی کے انداز میں خود کے عکس کو تکتی جا رہی تھیں۔

''لیکن ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر ماما جان کو میرے حالات کی خبر ہوتی تو مجھے تنبیہ ضرور کرتیں یا پھر ان کا ری ایکشن مجھے آگاہ ضرور کر دیتا۔'' وہ خود سے ہی ٹوٹی ہوئی لڑیاں جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ نگاہوں میں وہ منظر ایک پل کے لئے متحرک ہوا جب وہ سحر فاطمہ کو بلینک کالز کے بارے میں بتاتا تھا۔ تب ان کا رویہ بالکل ناشناسا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے کوئی غیر معمولی بات ان کی پیشانی سے نہیں پڑھی تو پھر آج وہ کیوں اتنا خوفزدہ تھیں؟

وہ بیڈ کی طرف بڑھا اور وہیں براجمان ہوگیا۔ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں ٹھونس کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ایک طرف ماما جان اور بابا جان کی چاہت ہے کہ میں ڈیپا سار نہ جاؤں......اور دوسری طرف میری ذات سے جڑے وہ حقائق ہیں جو مجھے اندر ہی اندر سے تحلیل کر رہے ہیں۔ میری سوچ کے زاویوں کو منتشر ہونے ہی نہیں دے رہے۔ لحہ بہ لحہ مجھے اپنی طرف

کھینچتے جا رہے ہیں۔ آخر میں کروں تو کروں کیا؟ دیپا سار کا سفر یا پھر ماما جان اور بابا جان کے کہنے پر کہیں نہ جاؤں۔۔" وہ بری طرح الجھن کا شکار تھا۔ اپنا سر اٹھایا تو اندھیروں کو اپنے اطراف پایا۔ جہاں سے روشنی کی امید کرنا بھی بے کار تھا۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے خود کو تسکین پہنچانے کی ایک معمولی سعی کی تھی۔ آنکھیں بے یقینی کے ساتھ سامنے دیوار پر مرکوز تھیں جہاں اضطرابی کیفیت اپنے عروج پر تھی۔ سحر فاطمہ کی خفگی اور بے چینی، جہانزیب کا اشتعال اور پرواہ ملے جلے تاثر سمیٹے ہوئے تھی۔ ذہن میں بار بار بلینک کالز کی رنگ ٹون سنائی دے رہی تھی جو سوچ کی دھاڑوں کا اپنا مرکز بنانے ہوئے تھی۔ آنکھوں کے آگے کسی لہراتے آنچل کی طرح وہ انجان زبان کی تحریر اٹکھیلیاں کر رہی تھیں اور اس کا وجود ان سب کے درمیان بے بس اور مجبور دکھائی دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

قدرت حق دیکھائی دی آکر

یعنی نکلا درست وہ گوہر

حاعفہ سلام پھیر کر تسبیح میں مصروف ہوگئی جبکہ جبیں ابھی تک اس کے پیچھے صوفے پر دونوں پاؤں سمیٹے اکڑوں بیٹھی تھیں۔ نگاہیں یک ٹک دیوار پر جمی تھیں اور دانت مسلسل داہنے ہاتھ کے ناخن کتر رہے تھے۔

جبیں کے ساتھ رکھے موبائل فون کی رنگ ہوئی مگر وہ اپنے خیالوں میں اس قدر محو تھی کہ رنگ کی آواز اس کی سماعت سے بھی نہ ٹکرائی۔ وہ مسلسل دیوار کو گھورتے ہوئے اپنے ناخن کتر رہی تھی جیسے آج ہی انہیں جڑ سے ختم کر ڈالے گی۔ حاعفہ جو تسبیح کر رہی تھی۔ موبائل کی رنگ کی وجہ سے انہیں جلد مکمل کیا۔ ہاتھوں پر پھونک مار کر انہیں پہلے چہرے اور پھر سارے بدن پر پھیرتے ہوئے جائے نماز اٹھایا۔ لب ابھی تک متحرک تھے۔ جائے نماز اٹھا کر اس نے بیڈ کے پہلو میں رکھا اور گردن کے گرد لپیٹا سکارف کھولنے کی بجائے وہ اسی طرح جبیں کی طرف بڑھی۔

"جبیں تمہارے موبائل میں کب سے رنگ ہو رہی ہے" وہ ابھی تک کسی گھات لگائے بلی کی طرح دیوار کو گھورتی جا رہی تھیں۔ سانسیں ساکت کیئے جیسے وہ ابھی کسی شکار پر جھپٹ پڑے گی۔ حاعفہ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"جبیں۔۔" دھیرے سے اس کے بائیں کندھے کو چھوا تو وہ بری طرح چونکی۔ آنکھیں دیوار سے ہٹا کر حاعفہ کی طرف کیں۔ وہ سفید رنگ کے سکارف میں لپٹا ہوا مہتاب سا چہرہ تھا۔ پہلے پہل تو وہ اکثر نماز کے بعد سکارف اتار لیا کرتی تھی لیکن جب سے قرآن اکیڈمی جوائن کی وہ گھر میں ایسے رہنے لگی تھی۔ لمبی قمیض، جو فیشن کی الف ب پر بھی پورا نہیں اترتی تھیں۔ اس کے وجود پر نظر آتیں۔ سکارف کے ساتھ ساتھ ایک عدد بڑا سا چادر نما دوپٹا بھی اس کے سینے پر پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ جبیں نے پہلے پہل تو حسب عادت اس کا مذاق اڑایا مگر بعد میں اسے بھی جیسے حاعفہ کو ایسے دیکھنے کی عادت سی ہوگئی تھی۔ اب بھی وہ ایسے ہی لباس میں ملبوس تھی۔

''تمہارا موبائل کب سے رنگ کر رہا ہے۔ دیکھو، کس کا فون ہے؟'' جبیں نے موبائل کی طرف دیکھا تو موبائل بے چارہ دم توڑ چکا تھا۔ فون کرنے والا تھک ہار کر آرام سے بیٹھ گیا تھا۔

''جس کا ہوگا وہ بعد میں دوبارہ کر لے گا۔۔'' اس نے بے پرواہی سے کہا اور دوبارہ اپنا بائیں ہاتھ منہ کی طرف بڑھایا یعنی ناخن کترنے کا عمل ایک بار پھر شروع ہونے جا رہا تھا۔

''ناخن کترنے سے بھوک ختم نہیں ہوگی۔ فریج میں کچھ پھل ہونگے، میں ابھی تمہارے لئے لاتی ہوں'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی تھی۔

''مجھے بھوک نہیں ہے حاعفہ۔۔'' اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا

''اور ویسے بھی نواب صاحب نے سارے فروٹس تو اپنے کمرے میں رکھوا لئے ہونگے۔ صدیوں کا بھوکا ہے بے چارہ۔ ہنوں'' اس کا اشارہ عکاس کی طرف تھا۔ خیالوں میں بھی وہ اس پر طنز کے نشتر برسا رہی تھی۔

''تو پھر کیا بات ہے؟ تم اتنی بے چین کیوں ہو؟'' حاعفہ دوبارہ بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے پریشانی کو بانٹنا چاہا تھا۔

''میں اریب کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ اس نے ماما جان اور بابا جان سے آج جس لہجے میں بات کی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی ایسا'' یہ کہتے ہی اس نے حاعفہ کے سامنے ساری حقیقت رکھ دی۔

''مجھے تو سمجھ نہیں آرہی کہ اریب کو بیٹھے بٹھائے یہ دیپالپور جانے کی کیا سوجھی؟ اور اگر جانا بھی تھا تو ماما جان اور بابا جان کو پہلے راضی کرتا، ان کو مناتا مگر نہیں۔۔۔ اس نے تو اپنا فیصلہ سنا دیا'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ کسی گہرے راز کی بُو وہ محسوس کر سکتی تھی۔

''دیکھو جبیں۔ میں زیادہ تو نہیں جانتی مگر ہوسکتا اُس کا دل چاہ رہا ہو اور تمہارے بقول اریب پر بچپن سے ہی اتنی پابندیاں تھی کہ وہ گھر سے باہر کبھی اکیلا ایک رات بھی باہر نہیں رہا۔ ہوسکتا ہے کہ یہی بات اس کے دل میں بیٹھ گئی ہو اور وہ اپنے اندر احساس کمتری محسوس کر رہا ہوں۔'' حاعفہ کا لہجہ ہمدردانہ تھا۔ اس نے سچے دوست کی طرح جبیں کا دکھ بانٹنا چاہا۔ جبیں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ آنکھیں دوبارہ دیوار کی طرف کیں۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ ایسا بھی ہوسکتا لیکن حاعفہ بابا جان سے اس لہجے میں بات کرنے ضرورت ہی کیا تھی؟'' وہ یکدم اچنبھے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''ہوسکتا ہے جبیں جب انکل نے اسے دیپالپور جانے سے منع کیا تو اسے ایسا محسوس ہوا ہو کہ اگر وہ آج اپنے حق کے لئے نہ لڑا تو پھر کبھی نہیں لڑ سکے گا۔ کبھی کبھی انسان جس چیز کی خواہش کر لیتا ہے تو اسے پانے کی خاطر وہ یہ نہیں دیکھتا کہ سامنے کون کھڑا ہے؟ یا پھر اسے وہ چیز لینے سے کیوں منع کیا جا رہا ہے؟ اس کا فوکس تو صرف اس چیز پر ہوتا ہے۔ اس کا ذہن اس چیز کے علاوہ کسی اور شے کو نہ تو قبول کرتا

ہے اور نہ ہی اس کے خلاف سننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے تو بس کسی بھی طرح اسے پانا مقصود ہوتا ہے'' اس نے اپنے تئیں جبیں کو اریب سے بدگمان ہونے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

''ہنوں۔۔ شاید تم ٹھیک ہو۔ اریب کا مقصد بھی بابا جان کو ہرٹ کرنا نہیں ہوگا۔ وہ تو بابا جان کی بہت عزت کرتا ہے۔ ان سے بدتمیزی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی اریب کو غلط سمجھ رہی تھی'' اس نے اپنے اندر جھانکا تو خود کو حد سے زیادہ ہی اس معاملے میں انوالو پایا۔ اتنا تو شاید ماما جان اور بابا جان بھی اس کو سیریس نہیں لے رہے ہونگے۔ ایسا اس نے سوچا تھا۔ جو ایک غلط سوچ تھی۔

''چلو۔۔ اب تم اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ کل میں نے بھی جلدی جانا ہے قرآن اکیڈمی۔'' حاعفہ نے مسکراہٹ کو لبوں پر بکھیرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ تبسم بکھیرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی جانب جانے کے لئے پلٹی۔

''رکو'' حاعفہ کے کہنے پر دوبارہ پلٹی۔

''یہ تمہارا فون۔ شاید تم اسے یہیں بجنے کے لئے چھوڑ کر جانا چاہ رہی تھی تا کہ میں رات بھر سو نہ سکوں'' حاعفہ کے جملے پر وہ دونوں مسکرا دی اور موبائل لیتے ہوئے جبیں نے اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔

☆......☆......☆

تو نے بنجر زمیں کو پھول دیئے

مجھ کو اک زخم دل کشائی دے

کامیش نے اسے فون کیا مگر اس نے فون ریسیو کرنے کی بجائے اسے سائیلنٹ پر لگا دیا۔ جانے کیوں اس کا دل فون ریسیو کرنے کو چاہ ہی نہیں رہا تھا یا پھر وہ اس حالت میں نہ تھا کہ وہ فون پک کر کے کامیش سے بات کر پاتا۔ اس کا دل بری طرح الجھن کا شکار تھا۔ اندر کا ضمیر بار بار اسے بری طرح جھنجوڑ کر اپنے رویے پر نادم کر رہا تھا۔

''مجھے ایسے بابا جان سے بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' وہ دفعتہً اٹھ بیٹھا تھا۔ سیاہ ٹراؤزر اور براؤن رنگ کی سلیولیس ٹی شرٹ میں اس کا وجود مایوس دیکھائی دے رہا تھا۔ بال بھی بے ترتیب پیشانی پر بکھرے تھے۔ آنکھوں میں منزل پانے کی جستجو تھی مگر اپنوں سے بدتمیزی کا احساس اس جستجو کو مغلوب کیے ہوئے تھا۔

''مجھے جا کر بابا جان سے معافی مانگنی چاہیے۔ میں نے ان کا بہت دل دکھایا ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' وہ چہرے پر ہاتھ پھیرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف دو قدم بڑھے۔ خالی الذہن میں اس وقت ندامت کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے گہری سانس لی اور مقفل دروازہ وا کیا۔ راہ داری میں گہرا سناٹا تھا جیسے گھر کے در و دیوار بھی اس سے خفا ہوں۔ وہ دھیمے قدموں کے سے زینے کی طرف بڑھا اور ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے اپنے جسم کے ارتعاش کو کم کرنے کی کوشش کی۔ وہ ماؤف ذہن کے ساتھ نیچے اتر رہا تھا۔ جب اس کی

نگاہ ٹی وی لاؤنج میں گئی۔ جہاں عموماً سحر فاطمہ کوئی نہ کوئی کر رہی ہوتی تھیں مگر آج کوئی موجود نہ تھا۔اس کے رویے نے کیسے اس گھر کی رونق کو ماتم کدہ میں تبدیل کر دیا تھا۔خاموشی اب اسے زہر لگنے لگی۔آنکھیں کچن کی طرف دوڑائیں۔وہاں کے در و دیوار بھی ہنستے دیکھائی دیئے۔اب وہ زینے اتر چکا تھا۔صوفوں کے عقب سے ہوتا ہوا وہ جہانزیب کے کمرے کی طرف گیا۔وہ نیچے زینے کے بعد ٹی وی لاؤنج کے عین پیچھے تھا۔دروازہ ادھ کھلا تھا۔جہاں سے اندر کی روشنی باہر چھلک رہی تھی۔اس کے قدم باہر منجمد ہو گئے۔ہاتھ بڑھانا چاہا مگر ہوا میں کچھ دیر کے لئے معلق رہے۔

''غلطی کی ہے تو اس کو قبول کرنا بھی سیکھو اریب'' ضمیر نے ایک بار پھر جھنجوڑا۔دروازہ آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔وہ ابھی تک کمرے سے باہر کھڑا تھا۔اندر بیڈ پر جہانزیب بیٹھے تھے۔ان کے ساتھ ہی سحر فاطمہ تھیں۔شاید دونوں آپس میں کوئی بات کر رہے تھے مگر اریب کی موجودگی نے لبوں کو خاموش کروا دیا۔سحر فاطمہ اٹھیں اور نظریں چرا کر صوفوں کی طرف بڑھیں۔جہاں کئی فائلیں بکھری ہوئی تھیں۔لیپ ٹاپ بھی آن تھا۔

جہانزیب بھی سیدھے ہو کر بیٹھے اور اپنے پیچھے گاؤ تکیہ ذرا بائیں جانب سرکایا۔

''میں اندر آ سکتا ہوں'' اس نے گلوگیر لہجے میں اجازت مانگی تھی مگر خاموشی کے سوا کوئی آواز سماعت سے نہ ٹکرائی۔ایک زہریلی خاموشی۔جو ہمیشہ سے اس کی دشمن رہی تھی۔بلینک کالز کی خاموشی کم تھی کہ بابا جان اور ماما جان نے بھی خاموشی سے اس کا استقبال کیا۔وہ انہیں کسی قیمت پر ناراض نہیں رہنے دے سکتا تھا۔کچھ دیر یونہی کھڑا رہنے کے بعد وہ آگے بڑھا تو جہانزیب نے نگاہیں چرا لیں۔وہ اس وقت بیڈ کے بائیں کنارے پر بیٹھے تھے۔اریب بھی اس سمت گیا۔انہوں نے اپنی نظریں دائیں طرف پھیر لیں۔یہ ایک گہری ضرب تھی۔اس کا وجود کرچیوں کی مثل بکھر گیا۔کانٹوں کی سی چبھن حلق میں محسوس ہوئی تھی۔

''بیگم آپ نے ریڈ کلر کی فائل دیکھی ہے؟'' آواز میں ایک لرزہ تھا مگر سختی کا لبادہ دیکھاوے کے لئے ضرور شامل تھا۔سحر فاطمہ نے آنسو پونچھتے ہوئے فائل کو ڈھونڈنا چاہا مگر ہر شے مبہم دیکھائی دے رہی تھی۔

اریب کے لئے یہ بے اعتنائی ناقابل برداشت تھی۔وہ دفعتہً گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور جہانزیب کا ہاتھ تھام کر اسے لبوں پر لگاتے ہوئے اپنے کئے کی معافی مانگ رہا تھا۔

''بابا جان مجھے معاف کر دیں۔مجھ سے غلطی ہو گئی۔پلیز مجھے معاف کر دیں۔میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔پلیز بابا جان مجھے معاف کر دیں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔جہانزیب کی خفگی اس نے زندگی میں پہلی بار مول لی تھی۔وہ اسے برداشت نہیں کر سکتا تھا۔سحر فاطمہ کا بھی دل بھر آیا تھا۔

''میں آپ کو ہرٹ کرنا نہیں چاہتا تھا۔۔پلیز بابا جان۔۔اپنے اس نالائق بیٹے کو نادان سمجھ کر معاف کر دیں۔پلیز بابا جان۔۔

معاف کردیں۔ میں آئندہ ایسے بدتمیزی نہیں کروں گا۔" اریب کی آنکھوں کا سیال جہانزیب اپنے ہاتھ کی پشت پر محسوس کر سکتے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر اریب کی طرف دیکھا تو اس کا جھکا ہوا سر پایا۔ اپنا چہرہ ان کے ہاتھ پر مس کیے ہوئے تھا۔ باپ کا دل چاہے کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔ اولاد کے آنسو دیکھ کر پسیج ہی جایا کرتا ہے۔ یہی جہانزیب کے ساتھ ہوا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر پھیرا تو اس نے اپنا سر اٹھایا۔ دوسرا ہاتھ بھی تھام لیا۔

"پلیز بابا جان۔ میری پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر معاف کردیں، آئندہ میں کبھی ایسی غلطی نہیں کرونگا۔" وہ واقعی پشیمان تھا، آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے۔

"تم نے مجھے ہی نہیں اپنی ماما جان کو بھی بہت ہرٹ کیا ہے اریب۔۔" ان کی آواز بھی جذبات سے پر تھی۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا۔ اشکوں کو بچوں کی مثل ہتھیلیوں سے پونچھا۔

"میں ماما جان سے بھی معافی مانگ لوں گا۔" یہ کہتے ہی وہ سحر فاطمہ کی طرف پلٹا۔ جو وارڈ روب کے ساتھ کھڑی تھیں۔ آنکھوں سے بن موسم کے برسات ہو رہی تھی۔

"پلیز ماما جان مجھے معاف کردیں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ میں نے بابا جان سے بہت بدتمیزی سے بات کی۔ پلیز مجھے معاف کردیں" وہ ان کے ہاتھ بھی نرمی سے تھامے آنکھوں سے لگائے معذرت خواں لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ماں کا دل تو اس کے آنے سے ہی پگھل چکا تھا۔ آنسو دیکھ کر تو جیسے ممتا انتہا کو پہنچ گئی۔

"مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے اریب۔۔" انہوں نے پیار سے اس کے رخسار پر ہاتھ پھیرا تھا لیکن اگلا جملہ اریب کے لئے کسی ضرب سے کم نہ تھا۔

"شاید ہماری ہی تربیت میں کہیں کمی رہ گئی ہوگی۔ کیونکہ ایک اولاد ماں باپ کے سامنے تب ہی کھڑی ہوتی ہے جب ان کی پرورش غلط ہو۔" ان کی نگاہیں دیوار کی طرف تھیں۔ اریب نے نفی میں سر ہلایا۔ ہونٹ بچوں کی طرح بلبلا رہے تھے۔

"نہیں ماما جان۔۔ آپ کی تربیت میں کوئی غلطی نہیں رہی۔ آپ نے تو سب والدین سے اچھی تربیت ہمیں دی ہیں۔ آپ نے تو ہمیں محبت بانٹنا سکھائی ہے۔ ایک دوسرے کے غم کو کیسے دور کیا جاتا ہے؟ یہ سکھایا ہے۔ آپ کی پرورش غلط نہیں تھی۔ اگر کوئی غلط تھا تو میں تھا۔ میری ذات غلط تھی۔ میں اپنی خواہش کو آپ کی محبت پر فوقیت دے بیٹھا تھا۔ میں بھول چکا تھا کہ والدین تو اپنے بچوں کا بھلا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو غلط راہ پر چلتا نہیں دیکھ سکتے۔ آپ بھی میرا بھلا چاہ رہے تھے مگر میں سمجھ نہیں پایا۔ پلیز۔۔ مجھے معاف کردیں ماما جان۔۔ پلیز" وہ گردن کو معمولی سا خم دیئے روہانسا کہتا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے پہلی بار اتنے آنسو بہے تھے۔ وہ اب بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

"نہیں اریب۔۔" پیچھے سے اس کے شانوں کو جہانزیب نے چھوا تھا۔

''اتنا نہیں روتے۔۔۔'' وہ اریب کو اب ایسے مرجھایا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

''تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ہمارے لئے یہی کافی ہے'' یہ الفاظ سننے کی دیر تھی کہ وہ جہانزیب کے سینے سے جا لگا، آنسوؤں کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ وہ اس کی پشت کو مسلسل سہلا رہے تھے۔

''بس میرے بیٹے۔۔۔'' سحر فاطمہ کی آنکھیں بھی خوب برس رہی تھیں۔

☆......☆......☆

ابھی دیکھا نہیں جی بھر کے تمہیں

ابھی کچھ دیر مرے پاس رہو

ٹیرس پر ریلنگ کے ساتھ کھڑی وہ آسمان پر تاروں کا نظارہ کر رہی تھی۔ ہاتھ میں کافی کا ایک کپ، اور سرگوشی کرتی ہوائیں دونوں ایک ساتھ اس کے لطف کو بڑھا رہی تھیں۔

''تو اکیلے اکیلے کافی کا مزہ اٹھایا جا رہا ہے'' سفید کرتے میں ملبوس وہ خوبرو یہاں بھی آ حاضر ہوا تھا۔ اس کی آواز سننے کی دیر تھی کہ ناگواری نے اس کے چہرے پر بسیرہ کر لیا۔

''آ گیا یہاں بھی بن بلایا مہمان۔۔۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔

''یہ تو مجھے معلوم ہے کہ آپ نے زیر لب مجھے انتہائی مخصوص الفاظ سے نوازا ہے مگر کون سے خطابات تھے وہ؟ کیا آپ بتانا پسند کریں گی؟'' اس نے جبیں کو زچ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ہوا کے سنگ لہراتی زلفوں میں وہ آنکھوں میں بس جانے والا وجود تھا۔

''مجھے ان لوگوں سے بات کرنا بالکل بھی پسند نہیں۔ جو میرے دل کو نہیں بھاتے'' اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ رخ جگمگ کرتے تاروں سے ہٹا کر چاند کی طرف کیا۔ عکاس نے بھی اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو دل میں نئی شرارت ابھر آئی۔

''تو مس چاند کے ذریعے ہماری صورت دل میں بسانے کی کوشش کر رہی ہیں۔۔'' اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تھے۔

''تم دیکھنے میں ہی اتنے بے وقوف ہو یا پھر مجھے ہی نظر آتے ہو'' اس نے تیکھی نگاہ اس کے وجود پر ڈالی تھی۔ کافی کا کپ ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھا۔ بالمقابل کھڑے دونوں کی بحث و تکرار جاری تھی۔

''یہ خطاب آپ کو ہی مبارک ہو۔ میں وکیل ہوں اور اسی میں خوش ہوں'' اس نے مسکراہٹ کو لبوں پر بکھیرا تھا اور ہوا کے جھونکے سے پیشانی پر پھیلے بالوں کو دائیں ہاتھ سے سیٹ کرنے کی غرض سے سر پر پھیرا۔

''تو پھر موصوف یہاں کس لیے تشریف لائے ہیں۔ یہاں نہ تو کوئی پراپرٹی کا معاملہ زیر بحث ہے اور نہ ہی کسی قسم کا جھگڑا چل رہا ہے۔ جو آپ منصف بن کر آ دھمکے'' اس نے طنز کا نشتر خوب دل جلے لہجے میں چلایا تھا۔

”ویسے ایک معاملہ تو زیر بحث ہے۔ بس اسی بحث کو ختم کرنے یہ وکیل صاحب اس گھر میں تشریف لائے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ بحث جلد ہی ختم ہو جائے اور اُن دونوں میں صلح صفائی بھی۔“ وہ بھی پوری ڈھٹائی کے ساتھ گویا ہوا تھا۔ یہ ذو معنی جملہ کس ذات کی طرف اشارہ کر رہا تھا؟ اب بھلا جبیں سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا؟

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے مسٹر۔۔۔“ وہ چیلنج کرتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

”محبت کا سفر اکثر غلط فہمیوں سے شروع ہوتا ہے“ اس بار بہت گہری ضرب لگائی تھی۔ جس پر جبیں کا پورا وجود تلملا اٹھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا کپ ایک آواز کے ساتھ ریلنگ کے ساتھ بنی جگہ پر رکھا اور کچا چبا جانے والی نگاہ عکاس کے وجود پر ڈالی تھی۔

”آخر تمہاری پرابلم کیا ہے مسٹر؟ میرے معاملات میں دخل اندازی کرنے والے تم ہو کون؟“ تند لہجہ گویا ہوا

”مسٹر عکاس۔۔“ اس نے طنزیہ اپنا تعارف کروایا

”لیکن لگتے ہو مجھے تم صرف بکواس۔۔۔“ وہ جبڑے بھینچتے ہوئے وہ زینے کی طرف بڑھی تھی۔ جب اس نے پیچھے سے اس کی کلائی پکڑلی۔ قدم ایک پل کے لئے منجمد ہو گئے۔ تند اور آزردگی سے بھرپور لہجہ ایک لمحے میں ہی استادہ دیکھائی دیا۔ تاروں بھری رات نے نور کا ایک چشمہ دونوں کے گرد بکھیر دیا۔ جس پر وہ چلتا ہوا فاصلوں کو مٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ نشیلی نگاہیں جبیں کے وجود کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھیں۔ سفید قمیض اور جھالر کا دوپٹہ ہوا کے سنگ لہرا رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں کی طرف بڑھے اور دھیرے سے اس کے وجود کا رخ اپنی طرف کیا تو وہ اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ جیسے ماحول نے اس کے وجود پر بھی ایک سحر طاری کر دیا تھا۔ خوبرو چہرے ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ ہوا کی سرگوشیاں اپنے عروج پر تھیں۔ وہ یہاں رکا نہیں بلکہ اپنے قدم بڑھاتا چلا گیا۔ لمس کے احساس نے اسے اپنی آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تو فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کی سانسیں تھم سی گئیں۔ دل کی دھڑکیں بھی بے ترتیب سی ہو گئیں۔ وہ دھیرے سے آگے بڑھا تو شانوں سے شانے ٹکرائے اور اس کے لب کانوں کے بالکل پاس آ گئے۔ سرد لہر نے پورے وجود کو برف کی مثل منجمد کر دیا۔

”محبوب کی اکثر باتیں بکواس ہی لگا کرتی ہیں۔“ دھیمے لہجے نے ایک طوفان برپا کیا تھا۔ ایک سرگوشی نے ایک احساس اجاگر کیا۔ پھر وہ مسکرایا اور ایک ہنسی کو چہرے پر جگہ دیئے زینے کی طرف بڑھا اور نیچے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ سحر ٹوٹا اور ایک بار پھر وہ سرتاپا آگ بگولہ دیکھائی دی۔ ناک سکیڑ کر اس نے تند نگاہیں زینے کی دوڑائیں۔

”مسٹر عکاس۔۔۔“ وہ جبڑے بھینچتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔ لہجے میں عجب کاٹ تھی۔ جس میں شیریں بھی دیکھی جا سکتی تھی۔ تبھی تو اگلے لمحے وہ مسکرا دی۔

☆......☆......☆

وہ رنگ وہ آواز وہ سج اور وہ صورت

سچ کہتے ہو تم پیار کے قابل تو وہی ہے

ہانیہ کی محبت دل میں اس قدر گہری ہو چکی تھی کہ اس کے علاوہ کسی اور سوچ کو اپنے دل میں بسانا بھی اب تقریباً ناممکن تھا۔ ہاتھ میں موبائل پر ہانیہ کی تصویر جگمگا رہی تھی اور وہ اسے یک ٹک دیکھتا جا رہا تھا۔

''ہانیہ! میں نہیں جانتا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو یا نہیں لیکن میرا دل تم پر پوری طرح مٹ چکا ہے۔ تمہارے وجود کو اس دل نے اپنے اندر ایسے سینت لیا ہے کہ تمہارا نام لیے بغیر اس کا دھڑکنا بھی محال ہے۔ ان سانسوں میں فقط تمہاری ہی خوشبو رچ بس چکی ہے۔ آنکھوں کو تمہارے وجود کے علاوہ کوئی چہرے بھاتا ہی نہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ یہ محبت ہے یا پاگل پن لیکن میں اسے محبت کا نام دیتا ہوں، ایسے جذبات میں نے تمہارے علاوہ کسی اور کے بارے میں کبھی محسوس نہیں کیے۔ تم پہلی لڑکی جس نے پہلی نظر میں ہی مجھے اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ پہلی ملاقات سے ہی یہ دل تمہاری طرف کھنچتا چلا گیا اور آج حال یہ ہے کہ تمہارا نام لئے بغیر اسے ایک پل کے لئے بھی قرار نہیں آتا۔ یہ دل تمہارا بری طرح عادی ہو چکا ہے۔'' اس نے موبائل کو دل کے ساتھ لگایا تو ایک بار پھر اسی کی صورت دل میں لہرانے لگی لیکن یہ خیال پل بھر کا تھا۔ ہمیشہ کی طرح محبت کی کسوٹی سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''لیکن یہ راستے۔۔۔؟؟'' اس بار دل کی بجائے لب متحرک ہوئے تھے۔ اس نے پلٹ کر آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو خود کو اس سے بہت دور کھڑا پایا۔

''یہ فاصلے کیسے مٹیں گے؟'' محبت کے سامنے ایک پہاڑ جیسی اوٹ تھی۔ جسے پار کرنا ضروری تھا اور ایسا وہ بہت جلد کرنے والا تھا۔

''نہیں۔۔۔ محبت میں راستے اور فاصلے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں تمہیں حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔۔۔ کامیش کا اپنی ہانیہ سے وعدہ ہے۔۔'' اس کی آنکھوں میں پختگی تھی۔

☆......☆......☆

گوہر مقصود بھی مل جائے گا

پہلے اپنی راہ سے پتھر اٹھا

حاعفہ کو قرآن اکیڈمی چھوڑ کر وہ واپس آ رہا تھا جب اس کی نگاہ ہانیہ پر گئی۔ وہ غالباً بس کا انتظار کر رہی تھی۔ پیشانی سے پسینے کی بوندیں، دوپٹے کے پلو سے صاف کرتے ہوئے وہ چندھیاتے ہوئے سورج کے عین نیچے کھڑی تھی۔ وہ کار کو روک کر کچھ دیر یونہی اس کو دیکھتا رہا اور پھر کار سے باہر نکل کر اس کی طرف بڑھا۔

''اگر تمہیں کہیں جانا ہے تو آؤ۔ میں تمہیں چھوڑ دوں۔'' اس نے بات کا آغاز ہی مدعا سے کیا تھا۔ نہ سلام نہ دعا۔

''نہیں شکریہ۔ میں خود چلی جاؤں گی۔'' جس لہجے میں ساتھ لے جانے کا کہا گیا تھا، اسی لہجے میں انکار کر دیا گیا۔ ایک بار پھر اس نے دور سے آتی ایک بس کو دیکھا مگر قریب آنے پر معلوم ہوا کہ وہ بھی فل ہے۔

''دیکھو، گرمی بہت ہے۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں'' اس نے بنا کسی تاثر کو چہرے پر بکھیرے اس سے پوچھا تھا۔ ہانیہ نے ایک نگاہ اس کے چہرے پر دوڑائی پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔ شاید وہ خود بھی اس موسم کی سختی کو سہتے ہوئے تھک چکی تھی۔ اریب نے آگے بڑھ کر اپنے ساتھ کا فرنٹ ڈور اوپن کیا۔ ہانیہ کے بیٹھنے پر اس نے ڈور بند کیا اور اپنی پوزیشن سنبھال لی۔

''شکریہ۔۔'' جیسے ہی اس نے کار سٹارٹ کی تو بنا دیکھے ہانیہ نے کہا تھا۔ اریب نے بھی گہری سانس لی۔

''اٹس او کے۔'' وہ اب ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اُباک فضائیں دونوں کے درمیان کسی انجانے مسافر کی طرح ساتھ تھیں۔ سماعت میں ہلکا سا ترنم اریب کا آن کیا گیا ایف ایم گھول رہا تھا۔ جو اس نے ماحول کی بیزاریت کو دور کرنے کی خاطر چند لمحوں پہلے ہی آن کیا تھا۔ ہانیہ ونڈ سکرین سے باہر دیکھتے ہوئے درختوں کو پیچھے چھوڑتا دیکھ رہی تھی۔ باہر کا شور و غل اور سورج کی حدت اندر جیسے معدوم تھی۔ وہ پہلی بار کسی کار میں بیٹھی تھی اور اپنے جذبات کی نوعیت اریب پر آشنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''زندگی میں بہت کچھ پہلی بار ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ پہلا تجربہ کامیاب ہو۔ پہلی بار کوئی کام کرتے ہوئے اکثر گھبراہٹ محسوس ہوتی ہے'' اریب نے آج بھی اس کی پیشانی پڑھ لی تھی۔ وہ سیٹ بیلٹ کو کسی بچے کی طرح مضبوطی سے تھامے ہوئے تھی۔

''نہیں۔۔'' اس نے فی الفور تردید کی۔ وہ کسی بھی طرح اریب سے اپنے آپ کو کمتر نہیں سمجھ سکتی تھی۔

''میں ہانیہ عمر دراز ہوں اور ہانیہ عمر دراز فرسٹ امپریشن اس دی لاسٹ امپریشن کی قائل ہے'' جانے کیوں اس نے یہ جملہ کہا تھا جس پر اریب مسکرا دیا۔ اس کی دبی دبی ہنسی وہ بنا دیکھے سن سکتی تھی۔

''اگر میں بھی اس جملے کا قائل ہوتا تمہیں کبھی لفٹ نہ دیتا، بلکہ تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا'' گردن جھٹکتے ہوئے اس نے مزاح خیز لہجے میں کہا تھا۔ اس نے پلٹ کر حیرانی سے اریب کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں چھوٹی چھوٹی زلفیں پیشانی پر بکھری تھیں۔ آنکھوں میں تمکنت اور لبوں پر ایک عجیب سی کسک۔ جانے کیوں وہ اس پل اس کے دل میں گھر کر گیا۔ مژگاں جھپکنا بھول گئیں اور اس حسین چہرے کو اپنے اندر نقش کرنے لگیں۔

''مطلب؟ تم اپنی رائے میرے بارے میں تبدیل کر چکے ہو؟'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔

''یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا......مگر شاید......'' وہ دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ گیا اور بے پرواہی سے شانے اچکائے۔ آنکھیں ایک بار پھر باہر سڑک پر مرکوز ہو گئیں۔

''برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟'' اس نے پہلی بار کسی بات کے لئے ہانیہ سے اجازت طلب کی تھی۔ اس نے اچھنبے لہجے میں اس

کی طرف دیکھا اور پھر مدہم آواز میں "ہنوں" سے جواب دیا تھا۔

"انسان چاہ کر بھی اپنی قسمت نہیں بدل سکتا۔ جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہ ہر حال میں مل کر رہے گا۔ کوئی شے اپنی محنت کے بل بوتے پر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ سب خدا کی رحمت ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم اپنی منزل کو پانے کی جستجو کو ہی ختم کر دو مگر اس دل سے حرص نکال دو۔ جو تمہارا ہے۔ وہ تمہیں مل کر رہے گا۔ بس اپنے ذہن سے مقابلہ بازی نکال کر اپنی منزل پر دھیان دو۔ دنیا میں کئی منزلیں ایسی ہیں جہاں صرف ایک شخص قدم رکھ سکتا ہے مگر اس منزل کو پانے کی جستجو ہزاروں کرتے ہیں لیکن آخر میں شہہ اسی کا مقدر بنتی ہے جو مقابل کو پچھاڑنے کی بجائے اپنی منزل کو سامنے رکھ کر انتھک محنت کرتا ہے اور خدائے ذوالجلال کے اوپر یقین رکھتا ہے" جانے کیوں اس نے ایسا کہا تھا۔ بس دل میں آیا، سو کہہ ڈالا۔ ہانیہ یک ٹک اس کے چہرے کو تکتی جا رہی تھی۔ کیا یہ وہی اریب تھا، جو اس سے نرم لہجے میں بھی بات کرنے کا روادار نہ تھا؟ اور آج اسے نصیحت کر رہا تھا۔ وہ اسے سمجھنے سے ابھی تک قاصر تھی۔ لبوں پر ایک پرکشش ابتسام وہ محسوس کر سکتی تھی مگر جواب میں مزید کچھ نہ کہہ سکی۔

☆......☆......☆

میں دیکھتا ہوں تو بس دیکھتا ہی رہتا ہوں

وہ آئینے میں بھی اپنے ہی رنگ چھوڑ گیا

رات کا سہانا منظر آنکھوں میں اترنے لگا تھا۔ وہ یک ٹک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے چاند کو دیکھی جا رہی تھی۔ سیاہ لباس میں لہراتی زلفیں ایک الگ ہی منظر پیش کر رہی تھیں۔ سماعت میں اریب کی آواز جانے کون سے جذبات کا پیشِ خیمہ تھی۔

"جو تمہارا ہے۔ وہ تمہیں مل کر رہے گا۔" باقی الفاظ تو جیسے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے تھے۔ فقط یہ جملے اس کی سماعت میں چاشنی گھول رہے تھے۔ مسکراہٹ لبوں پر خود بخود مچل رہی تھی۔ وہ دائیں ہاتھ کی انگلی سے زلفوں کو بل دے رہی تھی۔

"سچ کہا جو اپنا ہو وہ لوٹ کر ضرور آتا ہے لیکن اس کی جستجو، اس کے لئے تڑپ کیا ضروری نہیں؟" اس نے خوابیدہ لہجے میں چاند کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ مژگان کے کنارے کسی گہری جھیل کی مانند اپنے اندر خوابوں کے جہاں کو آباد کئے ہوئے تھے۔

"اس کا مطلب تم بھی۔۔۔" دفعتہً دل میں ایک آوارہ خیال امڈ آیا تھا جس پر اس نے ایک جھرجھری لی۔

"نہیں۔۔۔ یہ کیسی آشفتہ سوچ ہے؟ میں اور اریب؟ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہوں میں؟" اس نے اپنے دل کو کوسا جو مسلسل ایک عکس کی نقش بندی کر رہا تھا۔ ایک ہنستا ہوا، مسکراتا ہوا چہرہ آنکھوں کے آگے لہرا رہا تھا۔ کبھی اپنی کی فرنٹ سیٹ پر براجمان دکھائی دیتا تو کبھی فوٹو شاپ پر نوٹس کے صفحات الٹ پلٹ کرتا نظر آ رہا تھا۔ لیکچرار کے الفاظ کو نوٹس پر تحریر کرنے کی بجائے دماغ کی لامتناہی تہوں میں قید کرتا ایک حسین وجود، ساری دنیا سے لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔

"تم بھی بہت عجیب ہواریب۔۔" ایک مچلتی کسک لبوں سے برجستہ ظاہر ہوئی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو پاکیزہ کے انہی خوابوں کو کانچ کی کرچیوں کی مثل بکھرا ہوا پایا۔ جن پر چل کے اس کے پاؤں بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ وجود گھائل ہو چکا تھا۔ آنکھوں میں حسرت و خفگی کے ملے جلے تاثر ابھرے۔

"مرد ذات صرف فریب ہے۔ محض فریب۔۔۔" یاسیت کے الفاظ اس کے دل سے نکلے تھے۔ پردوں کو رکاوٹ بنا کر چاندنی کو کمرے میں آنے سے روکا اور بیڈ پر آ کر خاموشی سے لیٹ گئی۔

"مجھے اریب سے کوئی لینا دینا نہیں۔۔" وہ خود کو سمجھا رہی تھی مگر اس دل کو جو نئے خواب بننے شروع ہو چکا تھا۔ اُس منزل کی طرف پہلا قدم اٹھا چکا تھا جہاں اگرچہ کانٹے تھے مگر کسی اپنے کا ساتھ انہی کانٹوں کو گلشن میں تبدیل کر سکتا تھا مگر کیا وہ ساتھ نبھائے گا؟ یہ سوال ابھی تک بے معنی تھا۔

☆......☆......☆

منزل جو اپنے دل کی تھی، خود دل میں ہی کہیں

دل بھی پہنچ سکا نہ وہاں، کیا کروں بھلا

جہانزیب وارڈروب کے سامنے کھڑے تھے۔ ہاتھ میں بلیو کلر کی فائل اوپن تھی۔ نگاہیں بظاہر فائل پر مگر سوچیں کہیں اور ہی مرتکز تھیں۔ سحر فاطمہ کمرے میں داخل ہوئیں تو بیڈ شیٹ تبدیل کرنے کی غرض سے آگے بڑھیں۔

"کیا ہوا؟ کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟" سحر فاطمہ کی آواز پر وہ چونکے اور وارڈروب بند کرنے کے بعد صوفے پر آبیٹھے۔

"کچھ خاص نہیں۔۔ سوچ رہا تھا کہ سارا بزنس پاکستان میں ٹرانسفر کر دوں" ان کی نظریں ابھی تک فائل پر ہی مرکوز تھیں۔ بیڈ کو جھاڑتے ہوئے ان کے ہاتھ استادہ دکھائی دیئے۔ پلٹ کر جہانزیب کے چہرے کو بغور دیکھا ایک گہری سوچ میں غرق پایا۔

"مگر کیوں؟" وہ ان کے پاس آبیٹھی تھی۔

"اریب کی وجہ سے۔۔۔ اس بار تو ہم نے اسے ٹال دیا مگر جب تک ہمارا تعلق دیپا سارے سے رہے گا تب تک اس کی سوچیں اس ملک سے جڑی رہیں گی" انہوں نے فائل بند کر کے ٹیبل پر دے پھینکی۔

"یہ تو سچ کہا آپ نے اور پھر کب تک ہم اس سے چھپا سکیں گے کہ وہ۔۔۔" سحر فاطمہ کی زبان غیر دانستہ پھسلنے لگی تھی۔ جس پر جہانزیب کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔

"ٹھہریئے۔۔!! یہ کہنے جا رہی تھیں آپ؟ آئندہ اس بارے میں سوچیے گا بھی مت" انہوں ہڑبڑاتے ہوئے انہیں تنبیہہ کی تھی۔ سحر فاطمہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ آنکھیں نادم جھک سی گئیں۔

''معاف کیجیے گا۔جانے کیوں آج زبان پر وہ بات آنے لگی تھی۔۔۔'' انہوں نے صفائی دینے کی کوشش کی تھی۔

''میں جانتا ہوں وہ بات بھولنا آسان نہیں ہے لیکن اب جو ہمارے سامنے ہے وہی سچ ہے ماضی حال پر اثر انداز نہیں ہوسکتا اور اریب کو ماضی کے پنے الٹنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔بس اسی لئے میں سوچ رہا ہوں کہ سارا بزنس پاکستان ٹرانسفر کرلوں۔۔'' وہ اٹل فیصلہ کر چکے تھے۔

''لیکن اس میں تو کافی ٹائم لگے گا۔۔''

''صحیح کہا۔۔کافی ٹائم لگے گا۔شاید تین سے چار سال لگ جائیں لیکن اب مجھے ایسا کرنا ہی ہوگا کیونکہ میرے پاس اتنا ہی وقت ہے۔ابھی تو وہ پڑھائی میں مصروف ہے اور اس کو بنیاد بنا کر ہم اس پر زور زبردستی بھی کر سکتے ہیں لیکن اپنا بی ایس مکمل کرنے کے بعد؟'' دانستہ انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

''وہ بزنس جوائن کرنے کے حق میں ہے اور ایسے میں وہ اگر دیپا سار چلا گیا تو؟'' سحر فاطمہ نے بھی مستقبل کی جھلک دیکھ لی تھی۔چہرے پر ہجر کے لمحات اپنی جگہ بنانے کو بے تاب تھے۔

''اور وہ ایسا سب سے پہلے کرے گا کیونکہ میں اسے اچھے سے جانتا ہوں۔بس اسی لئے انہی تین سالوں میں مجھے اپنا سارا بزنس دیپا سار سے پاکستان ٹرانسفر کرنا ہوگا۔'' جملہ مکمل کرتے ہی ان کی نظر دروازے پر استادہ دیکھائی دی۔آنکھیں برجستہ اریب کو دیکھ کر ٹھہر گئیں۔سحر فاطمہ نے مشکوک انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

''اریب؟ تم؟ یہاں؟ کوئی کام تھا؟'' سحر فاطمہ متجل اٹھیں اور نظریں چراتے ہوئے صوفے کے کشن ٹھیک کرنے لگیں۔

''نہیں ماما جان۔۔وہ بس بابا جان کو یہ سنڈے میگزین دینے آیا تھا۔'' اس نے بے پرواہی کے ساتھ شانے اچکائے۔انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کچھ نہیں سنا ورنہ اس کاری ایکشن وہ ضرور پہنچان جاتے۔

''اوہ۔۔اچھا۔۔ادھر لاؤ۔۔۔'' وہ زبردستی مسکرائے تھے۔اریب آگے بڑھا اور انہیں میگزین پکڑا کر پلٹا تھا۔

''ویسے بابا جان! آپ مجھے دیکھ کر اتنا چونک کیوں گئے تھے؟'' دفعتہً پلٹ کر اس نے دونوں کی نازک رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔سحر فاطمہ کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔جہانزیب کی آنکھیں بھی بھٹکتی نظر آرہی تھیں۔

''ہم کیوں چونکنے لگے بھلا؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔۔'' سنڈے میگزین کو اٹھا کے لاپرواہی سے صفحے الٹے۔لہجے میں بناوٹی انداز شامل تھا۔سحر فاطمہ نے بھی مضبوطی سے کشن پکڑ لئے۔

''اوکے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے شانے اچکائے اور کمرے سے باہر چلا گیا۔سحر فاطمہ نے استفہامیہ انداز میں جہانزیب کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں یقین کا عنصر تھا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو، اریب نے کچھ نہ سنا ہو'' سحر فاطمہ کے دل سے دعا نکلی تھی مگر شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ الفاظ تو سماعت سے ٹکرا چکے تھے۔ کمرے سے نکلنے کے بعد وہ سست روی کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''یعنی میرے پاس صرف تین سال ہیں انڈونیشیا جانے کا۔۔۔اس کے بعد انڈونیشیا جانے کا ہر راستہ بند ہو جائے گا'' اس کے ذہن میں مسلسل جہانزیب کے الفاظ گونج رہے تھے کہ وہ تین سالوں میں اپنا بزنس پاکستان ٹرانسفر کر لیں گے۔

''مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ بابا جان اور ماما جان مجھے وہاں جانے سے کیوں روک رہے ہیں مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ میرا وہاں جانا بہت ضروری ہے۔'' وہ گہری سوچ میں غرق دھیرے دھیرے زینے چڑھ رہا تھا۔

''وہاں جا کر ہی مجھے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل سکتا ہے'' وہ آخری زینے پر تھا۔ عکاس اور حسام باتیں کرتے ہوئے اس کے بائیں جانب سے گزرے تھے مگر اسے کہاں خبر تھی؟

''اریب تم چلو گے ہمارے ساتھ؟'' یہ عکاس کی آواز تھی۔ مگر وہ اس الفاظ کو نہ سن سکا اور اپنے قدموں کو کمرے کی طرف بڑھا رہا تھا۔

''اسے کیا ہوا؟'' حسام نے کندھے اچکائے اور دونوں یہ اندازہ لگاتے ہوئے چل دیئے کہ اس کے جانے کا موڈ نہیں ہے۔

''لیکن اس بار مجھے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔ کچھ ایسا کرنا ہوگا کہ بابا جان چاہ کر بھی منع نہ کر سکیں'' اس کا ذہن ایک ہی نکتے پر اٹکا ہوا تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ صوفے پر براجمان ہو گیا اور سوچ کی دھاڑوں کو ایک نئے تسلسل کے ساتھ آپس میں جوڑنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

میں رقص میں ہوں مخمل خلوت کے پیش و پس

موجِ شمیم مخمل خلوت گزر میں ہے

''تو پھر کیا سوچا تم نے انڈونیشیا کے بارے میں؟'' وہ دونوں فرائے چکس شاپ میں بیٹھے اس وقت فرائے چپس اور کولڈ ڈرنک کا مزہ لے رہے تھے۔ شام ہونے میں ابھی وقت تھا مگر لوگوں کا ایک ہجوم اس وقت وہاں دیکھا جا سکتا تھا۔

''کچھ خاص تو نہیں سوچا مگر اتنا ضرور معلوم ہوا کہ بابا جان میری سٹڈی کے دوران ہی اپنا بزنس وہاں سے یہاں ٹرانسفر کر رہے ہیں'' اس نے بے نیازی کے ساتھ کولڈ ڈرنک کا ایک سپ لیا اور بے دھیانی سے کھڑکی سے باہر سڑک کی طرف دیکھا۔ جہاں مصروف زندگی رواں دواں تھی۔

''اوہ۔۔یعنی میرا شک ٹھیک تھا'' ایک ہچکی کے ساتھ کامیش نے اپنا جملہ مکمل کیا تھا۔

''شک؟ کون سا شک؟'' اس نے اچنبے لہجے میں کامیش کی طرف دیکھا تھا۔

''دیکھواریب، مجھے غلط مت سمجھنا لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے بابا جان کو یہ سب معلوم ہے اور وہ تمہیں جان بوجھ کر وہاں جانے سے روک رہے ہیں اور پھر بقول تمہارے اپنا سارا بزنس انڈو سے یہاں پاکستان میں ٹرانسفر بھی کرنے کا وہ سوچ رہے ہیں۔اب تم خود ہی سوچو کہ برسوں کا چلتا آیا بزنس ایسے اچانک کسی ملک سے ختم کر دینا، کوئی مشکوک بات نہیں ہے کیا؟'' کامیش کی باتوں کا مطلب وہ اچھے سے سمجھ سکتا تھا لیکن بظاہر اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے کہا

''مجھے ایسا نہیں لگتا۔۔۔''

''لیکن مجھے ایسا ہی لگتا ہے اور اس بزنس والی بات کو سن کر تو شک مزید گہرا ہو چکا ہے۔'' اس نے بات پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔اریب بھی ایک پل کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔گہری نگاہ کامیش پر ڈالی تو اس کے چہرے پر یقین کا عنصر غالب تھا۔ایک شک کا بیج خود بخود دل میں دھنستا چلا گیا۔

''کہیں کامیش صحیح تو نہیں کہہ رہا؟ بابا جان کو سب معلوم ہو اور وہ مجھے جان بوجھ کر وہاں جانے سے روک رہے ہیں؟'' اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے استفسار کیا تھا مگر اپنوں کے خلاف بھلا ضمیر کیسے کچھ سن سکتا تھا؟ فی الفور اسے ملامت کیا۔گردن جھٹکتے ہوئے اس نے فرائی چپس اٹھائی اور کیچپ سے کھاتے ہوئے باہر کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔

☆......☆......☆

میں ہوں ایسے سفر پر جانے والا

کہ جس کی کوئی تیاری نہیں ہے

''میری بات سمجھنے کی کوشش کریں شاہزیب صاحب! میں ابھی پاکستان میں رہ کر اپنی پوزیشن مضبوط بنانا چاہتا ہوں'' عکاس فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔بلیک پینٹ کوٹ اور وائیٹ شرٹ میں اس کی شخصیت مسحور کن تھی۔پیشانی پر چند شکن ابھرے ہوئے، وہ مخالف کو قائل کرنے کی کوشش میں تھا۔وہ بیڈ سے اٹھ کر ڈریسنگ کی طرف گیا۔کوٹ کے بٹن کو بے دھیانی سے چھوا۔نظریں اپنے ہی عکس سے ٹکرائیں تو کمرے کا کچھ حصہ بھی آئینے سے جھلکنے لگا۔صوفے پر ٹی شرٹ بے سدھ پڑی تھی۔ساتھ ہی لیپ ٹاپ چارجنگ پر لگا تھا۔بیڈ پر نظر دوڑائی جاتی تو کچھ فائلز وہاں بکھری ہوئی تھیں۔

''آپ کا کہنا بجا ہے۔یہ بہت اچھا چانس ہے لیکن۔۔۔'' اس کی بات کاٹی جا چکی تھی۔سپاٹ چہرے کے تاثر میں بھی وہ دوسروں کو اپنا اسیر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔دو لمحے کی خاموشی نے پورے کمرے کو اپنی لپیٹ میں لیا تو کمرے کے باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی مگر وہ باتوں میں اس قدر محو تھا کہ وہ چاپ اس کی سماعت سے نہ ٹکرائی۔

''جی بالکل شاہزیب صاحب، میں مانتا ہوں کہ یہ کیس میرے کرئیر کے لئے ٹرننگ پوائنٹ ہوگا لیکن آپ خود ہی سوچیے ایک

کیس جیت جانے پر میں نمبر ون کہلانے کا تو حقدار نہیں بن جاؤں گا ناں......!!! جس مقام پر میں پہنچنا چاہتا ہوں، وہاں قدم رکھنے کے لئے مجھے نت نئے کیسز کا سامنا کرنا ہوگا تا کہ کیس کی نوعیت جان کر ہی مجھے اس کے سچے اور جھوٹے ہونے کا معلوم ہو جائے اور ایسا تب تک نہیں ہوگا جب تک میں سینکڑوں کیسز کو اپنی نظروں سے نہ گزرنے دوں۔'' وہ اپنے دلائل کا سہارا لے رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ دروازے کے قریب آکر رک گئی۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ جہاں سے وہ وجود اندر دیکھ سکتا تھا مگر عکاس اس سے بے خبر فون پر ہی مشغول تھا۔

''لیکن انڈونیشیا جا کر تو ایسا ممکن نہیں'' دروازہ کھلنے جا رہا تھا مگر انڈونیشیا کا نام سنتے ہی وہ وجود ساکت رہ گیا۔

''عکاس بھائی انڈونیشیا جا رہے ہیں؟'' یہ اریب تھا۔ جو فی الوقت اندر جانے کا ارادہ موقوف کر چکا تھا۔ دروازے پر رک کر ہی پوری بات سننے کا ارادہ کیا۔

''وہاں جا کر میں صرف چند کیسز میں ہی الجھ کر رہ جاؤں گا۔ وہاں مجھے سیکھنے کا موقع نہیں ملے گا'' وہ وضاحت پیش کر رہا تھا مگر چہرے کے تاثر بتا رہے تھے کہ ان دلائل کی نفی کی جا رہی تھی۔ آئینے کے سامنے سے پلٹا اور وہ اب بالکونی کی طرف بڑھا۔ جہاں صاف آسمان اپنا کشادہ سینہ پھیلائے ہوئے تھا۔

''چھ ماہ کم نہیں ہوتے شاہزیب صاحب'' وہ مدت سن کر چونکا تھا۔ اچھنبے لہجے میں بیزاریت واضح تھی۔ اریب نے دروازہ مزید کھولا اور ایک قدم اندر داخل ہوا۔ عکاس کی پشت اس سمت تھی۔ اسی لئے وہ اریب کی موجودگی سے بے خبر تھا۔

''لیکن میری بات تو سنیئے شاہزیب صاحب!'' وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف سے شنوائی ہی نہیں ہو رہی تھی۔ چہرے پر خفگی کے تاثر ابھرے۔ اس نے کان سے موبائل ہٹا کر دیکھا تو رابطہ منقطع کیا جا چکا تھا۔ وہ کڑھ کر رہ گیا۔ گہری نگاہ آسمان پر ڈالی اور موبائل کو بیڈ پر پھینکنے کی نیت سے دفعتہً پلٹا تو اریب کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔ ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہ گیا۔

''اریب۔۔تم؟'' اس نے گہری سانس لی اور موبائل بے نیازی کے ساتھ بیڈ پر پھینکا۔ صوفے کی طرف رخ کیا تو وہاں ٹائی کو بے سدھ ٹی شرٹ کے پہلو میں پایا۔

''جی بھائی، بس یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا آپ کا حال چال پوچھتا چلوں'' اس کی نظریں ابھی تک موبائل پر مرتکز تھیں جہاں عکاس کی اپنی تصویر وال پیپر کے طور چمک رہی تھی، کچھ سوشل میڈیا کے icons بھی نمایاں تھے مگر اس کی نگاہیں تو کسی اور شے کی متلاشی تھیں۔ عکاس نے صوفے سے ٹائی اٹھائی اور ڈریسنگ تک چلتے ہوئے اسے باندھنا شروع کیا۔

''اچھا کیا تم آ گئے۔ کافی دن ہو گئے تم سے گپ شپ بھی نہیں ہوئی۔'' شاید وہ موبائل کے بارے میں بھول چکا تھا یا پھر پروفیشنل زندگی کو پرسنل لائف سے الگ تھلگ رکھتا تھا، تبھی چہرے کے تاثر اب نارمل ہو چکے تھے۔

''وہ آپ بزی (مصروف) ہی اتنے رہتے ہیں کہ مجھ بے چارے سستی کے مارے کو ٹائم دینا بھی اچھا نہیں سمجھتے۔'' چمکتی سکرین

یکدم غائب ہوگئی۔اریب پلٹا اور اپنے شوخ انداز میں لوٹ آیا۔جیسے وہ اکثر عکاس سے بات کیا کرتا تھا۔

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔تم انتہا درجے کے سست اور کام چور ہو'' عکاس نے بھی تائید کی اور ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے اس نے آئینے میں اریب کا عکس دیکھا جو اس وقت بیڈ پر ہاتھ پھیلائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

''لیکن شاید آپ یہ نہیں جانتے کہ آپ کا ہونے والا سالا اب کافی حد تک سدھر چکا ہے۔ہر کام وقت پر کرنے کے علاوہ صبح اٹھنے کی روٹین بھی تبدیل کر چکا ہے۔''اس نے اپنی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیئے۔جس پر وہ انبساط کو لبوں پر بکھیرتے ہوئے پلٹا تھا۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے لیکن الفاظ کا چناؤ ذرا دھیان سے کیا کرو اگر تمہارے اس خطاب کو جبیں سن لیتی تو تمہارا حشر نشر کر دیتی'' وارڈ روب کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے اریب کے بالوں کو پیار سے خراب کیا تھا جس پر اس نے گردن جھٹک دی اور دھڑام سے بیڈ پر جا گرا۔

''ہنوں۔اُس سے کون ڈرتا ہے؟اور ویسے بھی وہ آپ کے سامنے ہی نخرے دیکھاتی ہے۔پیچھے سے تو۔۔۔''اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔جس پر عکاس برجستہ پلٹا تھا۔اس کے چہرے پر رعنائیاں اپنا رنگ بکھیرے ہوئے تھی۔متجل وہ بیڈ پر بیٹھا تھا۔اریب بھی اٹھ بیٹھا۔

''پیچھے سے تو۔۔۔کیا؟بتاؤ ناں؟''شوخ لہجہ مچلتا دیکھائی دے رہا تھا۔ابرو خوشی کے سبب حالِ دل بیان کر رہے تھے۔بڑی بڑی سیاہ آنکھیں کسی آفتاب سے کم نہ تھیں۔وہ یک ٹک اریب کی طرف دیکھتے ہوئے جواب کا منتظر تھا۔

''یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟منگیتر وہ آپ کی ہے اور حالِ دل مجھ سے دریافت کر رہے ہیں۔اب ایک بھائی اپنے بہن کے بارے میں ایسی باتیں کرتا اچھا لگے گا کیا؟'' وہ بھی اپنے نام کا اریب تھا۔کہاں آسانی سے بات بتا سکتا تھا؟نخرے دیکھاتا ہوا وہاں سے اٹھنے لگا تو عکاس نے اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس بٹھا دیا۔

''میرا بھائی نہیں؟''مکھن لگانا بھی کوئی عکاس سے سیکھے۔جھٹ اریب کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے۔

''بھائی تو آپ ہیں میرے......وہ بھی دولہا بھائی......لیکن جہاں تک میرا گمان ہے،اس میں ابھی وقت ہے۔اس لئے میں چلتا ہوں'' وہ ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا تھا۔عکاس بھی پہنچان چکا تھا کہ اریب اپنی زبان نہیں کھولنے والا۔اس نے گہری سانس لی۔اریب ڈریسنگ کی طرف گیا اور پرفیوم کو اٹھا کر شرٹ پر سپرے کیا۔تعریفانہ تاثر اس کے چہرے سے چھلک رہے تھے۔

''مرضی ہے سالے صاحب!''اس نے شانے اچکائے اور موبائل اٹھا کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا۔اریب پلٹا۔

''ویسے بھائی،آپ انڈونیشیا کے بارے میں کوئی بات کر رہے تھے فون پر،جب میں آیا تھا۔آپ وہاں جا رہے ہیں؟''وہ ابھی

تک اُس بات کو بھولا نہ تھا۔ بس ماحول دوستانہ بنا کر اصل بات تک رسائی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''ہاں۔۔۔ ڈیڈ کے فرینڈ تھے شاہزیب صاحب۔ اُن کی خواہش تھی کہ میں انڈونیشیا میں ان کے ایک ریلیٹو کا کیس لڑوں۔'' وارڈروب کی طرف بڑھا اور اسے وا کی تو کئی فائلیں وہاں دیکھی جا سکتی تھیں۔ وکیل ہو اور فائلوں کو ڈھیر نہ ہو، بھلا ایسا کہاں ممکن تھا؟ عکاس بھی اسی ریت کو نبھا رہا تھا۔

''اوہ۔۔تو آپ نہیں جا رہے کیا؟'' اس نے ترچھی نگاہوں سے عکاس کے تاثر بھانپنے چاہے تھے۔

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن ان کا اصرار جاری ہے اور اگر وہ ایسے ہی اصرار کرتے رہے تو مجبوراً مجھے وہاں جانا ہوگا'' اس نے شکست خوردہ شخص کی طرح کہا تھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا وہ دل سے بھی جانے کو تیار نہیں لیکن اب بات اریب تک پہنچ چکی تھی۔ وہ اسے کسی بھی قیمت پر بھیجنے کے لئے راضی کر کے ہی دم لینے والا تھا۔

''ویسے اگر مجھ سے پوچھیں تو بھائی، آپ کو جانا چاہیے'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ جس پر عکاس نے ابرو اچکائے اور جواز دریافت کیا۔

''ایک بار آپ اگر باہر سے کسی کیس میں سرخرو ہو کر لوٹے تو یہاں ہر جگہ آپ کی کامیابی کا ڈنکا بجے گا'' اس نے حسین مستقبل کی جھلک عکاس کو دکھانا چاہی تھی۔ جس پر وہ طنزیہ مسکرا دیا۔ چار فائلوں کو وارڈروب سے نکال کر بیڈ پر لایا۔

''لیکن مجھے سستی شہرت نہیں چاہیے اریب۔ عزت وہی بھلی جو انسان اپنی محنت سے حاصل کرے۔ شارٹ کٹس ڈھونڈنے والے اکثر منزل کے قریب پہنچ کر اپنے آپ کو گمنام راستے پر کھڑا پاتے ہیں'' وہ محنت کا عادی تھا اور اسی خو کو اریب کے سامنے رکھ رہا تھا۔

''آپ کا کہنا بالکل بجا ہے بھائی لیکن یہ سستی شہرت نہیں بلکہ ایک برائیٹ چانس ہے، جسے آپ سمجھ نہیں رہے۔'' عکاس نے ترچھی نگاہ اس پر ڈالی تو وہ اسے قائل کرنے کی غرض سے بیڈ پر عکاس کے بالمقابل آ بیٹھا۔

''دیکھیے ذرا، وہاں کوئی آپ نے ہمیشہ کے لئے جانا ہے۔ بس چھ ماہ میں ایک کیس کو فائنل کرنا ہے اور واپس پاکستان میں آ جانا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو وہاں کتنا کچھ سیکھنے کو بھی تو ملے گا ناں؟''

''مثلاً؟'' وہ اریب کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔

''کیس کے دوران آپ کا سامنا وہاں کے پروسیکیوٹر سے ہوگا۔ جس کا انداز، اور کیس لڑنے کا معیار ہر طرح سے پاکستان کے وکیل سے الگ تھلگ ہوگا۔ آپ وہاں کے رہن سہن اور دوسرے سماجی پہلوؤں کو بھی اپنے مشاہدے میں لا سکتے ہیں اور سب سے بڑھ کر کیس کے دوران آپ کو بعض اوقات ایسی جگہ پر جانا ہوگا جو آپ کے لئے بالکل انجان ہوگی۔ وہاں جا کر ثبوت اور گواہوں کو اکٹھا کرنا میرے خیال سے بالکل ایک نیا ٹاسک ہوگا آپ کے لئے۔ کسی انجان جگہ سے ثبوت اکٹھے کرنے میں ایک مزہ بھی آئے گا اور یہ آپ کی

ذہنی صلاحیتوں کو بھی جلا بخشے گا۔اس کے ساتھ ساتھ آپ کو وہاں کے قوانین کے بارے میں بھی پڑھنے کا موقع ملے گا۔وہاں کے اور یہاں کے کرائم سین کس طرح مختلف ہیں، آپ آسانی سے انہیں سمجھ سکیں گے اور پھر یہاں آ کر آپ اپنی انہی صلاحیتوں کو استعمال میں لا کر ہر کیس کو نت نئے انداز میں سولو کر کے اپنی پوزیشن مستحکم بنا سکتے ہیں۔'' اریب نے عکاس کو باتوں کے جال میں ایسا پھانسا تھا کہ وہ بھی ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔سنجیدہ چہرہ اب اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر رہا تھا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو......!!!'' وہ اریب کی باتوں کا اصل بہت جلد قبول کر چکا تھا۔

''واؤ......گریٹ......تو پھر کب جا رہے ہیں ہم انڈو؟'' اس نے پر جوش انداز میں برجستہ جمع کا صیغہ استعمال کیا تو وہ چونکا۔

''ایک منٹ......ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' اس نے اریب کی چوری پکڑ لی تھی۔ابرو اچکاتے ہوئے اس نے تیکھی نگاہیں اس پر ڈالیں تو وہ نظریں چرانے لگا۔اپنی جگہ سے کھڑا ہو کر اریب اب بات کو سنبھال رہا تھا۔

''اب دیکھیے ناں بھائی۔......آپ وہاں اکیلے جانے سے ڈر رہے تھے۔اس لئے وہاں کوئی اپنا تو ہونا چاہیے ناں......!!! اور پھر آپ تو مجھے اپنا بھائی کہتے ہیں۔اب میرا بھی تو فرض بنتا ہے کہ بڑے بھائی کی خاطر اس کے ساتھ جاؤں......'' وہ بات کو توڑ مروڑ کر مکمل کر رہا تھا۔جس پر گردن جھٹکتے ہوئے ہنس دیا۔

''تو یہ بات تھی۔اس لئے مجھے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے موصوف۔'' دوبارہ دھیان فائل کی طرف کیا۔

Shaheeen Murder Case لیبل کی فائل کو ایک لمحہ کے لئے نظروں کے سامنے کیا۔

''اچھا چھوڑو، ان سب کو......یہ بتاؤ ناں...... مجھے بھی لے کر جاؤ گے ناں اپنے ساتھ انڈو؟'' اس نے دفعتہً عکاس کے ہاتھوں کو تھاما تو ہڑبڑاتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے فائل نیچے جا گری۔وہ خود بھی چونکا تھا۔وہ التجائیہ انداز میں فریاد کر رہا تھا۔

''پلیز بھائی...... مجھے انڈو دیکھنے کا بہت شوق ہے......پلیز......'' اس نے کبوتر کی سی معصومیت استعار لی تھی۔

''تم بہت تیز ہو اریب......اچھا ٹھیک ہے'' عکاس کے ہامی بھرتے ہوئے اریب نے اسے گلے لگایا اور اگلے ہی لمحے سرگوشی والے لہجے میں اس بات کو فی الوقت ان دونوں کے درمیان رہنے کو کہا۔

''مگر کیوں؟'' عکاس کچھ الجھا الجھا دکھائی دیا۔

''ماما جان اور بابا جان منع کر دیں گے ناں......وہ نہیں چاہتے کہ میں اپنی پڑھائی مکمل کئے بغیر کہیں جاؤں۔وہ ابھی تک مجھے بچہ سمجھتے ہیں'' اس نے آدھی ادھوری بات عکاس کے سامنے رکھی تھی۔

''وہ تو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔تم ابھی تک بچے ہی ہو اور اگر مجھ سے پوچھا جائے تو تم پچاس کے ہو جانے کے بعد بھی بچے ہی رہو گے۔''

''اس میں کوئی شک ہے؟ آپ بھی تو اس وقت تک ساٹھ ستر کے ہو جاؤ گے۔۔''اس نے بھی منہ بگاڑ کر کہا تھا۔جس پر ایک قہقہہ کمرے میں گونجا۔

''اچھا...... بے فکر رہو...... ابھی نہیں بتاتا انکل آنٹی کو......''اس نے پیار سے اریب کے رخسار کو تھپتھپایا تو بھی مسکرا دیا۔عکاس نے جھک کر فائل اٹھائی اور دوبارہ مطالعہ کرنے لگا۔

''تھینک یو سوچ بھائی۔۔آپ نے میری بہت بڑی مشکل حل کر دی۔اب میرے اور دیپا سار کے بیچ شاید چند دن کی مسافت باقی ہے۔''اس نے عکاس کو دیکھتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

''کچھ کہا تم نے؟''عکاس کے سوال پر وہ چونکا

''نن نہیں تو۔۔آپ اپنا کام کریں۔میں چلتا ہوں۔۔پھر بات ہوتی ہے''عکاس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔وہ باہر کی طرف پلٹا تھا۔چال آج کافی مطمئن تھا۔لہجہ بھی عرصے بعد استادہ دیکھائی دیا تھا۔چہرے پر بھی شبہ کے جھنڈے لہرانے لگے تھے۔کمرے سے باہر نکلنے کے بعد اس نے دوبارہ عکاس کی طرف دیکھا تھا جو فائلوں میں ابھی تک کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔

☆......☆......☆

ہے قسمت زمین وفلک سے غرض نمود

جلوہ وگرنہ سب میں ہے اُس کے جمال کا

''ہر شے چاہے وہ جاندار ہو یا بے جان اللہ تعالٰی کی پاکی بیان کر رہی ہے۔ہماری عبادات میں بھی ان کا ایک عکس پایا جاتا ہے۔اگر ہم اپنی نماز کو ہی دیکھ لیں تو اس میں بھی مختلف مخلوقات کی وہ حالت پائی جاتی ہے جن میں وہ اپنے رب کی تسبیح بیان کر رہی ہے۔ہمارا قیام جو ہماری نماز کا سب سے اہم فرض ہے درختوں کے حالتِ عبادت کی عکاسی کرتا ہے۔جہاں بھر کے شجر پر ایک نظر دوڑائی جائے تو وہ حالتِ قیام میں اپنے رب کی پاکی بیان کرتے نظر آئیں گے۔اسی طرح چوپائے جو بظاہر ہمیں سر جھکائے نظر آتے ہیں اصل میں ہر وقت اپنے رب کے آگے رکوع کی حالت میں ہیں۔صبح سے شام اور شام سے صبح اسی کی تسبیح بیان کرنے میں مصروف ہیں۔بس ہماری عقل ہی ناقص ہے جو ہم ان کی عبادات کو سمجھ نہیں سکتے ورنہ ان کا عبادت میں مصروف رہنا ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔پانی کا ایک گھونٹ پی کر آسمان کی طرف سر اٹھانا اس کے تشکر کی علامت ہے۔اسی طرح حشرات العرض جو بظاہر ہمیں زمین کے ساتھ رینگتے نظر آ رہے ہیں۔کیا ہم نے غور کیا کہ نماز کی کون سی حالت ہے؟اپنی پیشانی سمیت بدن کو زمین کے ساتھ لگا کر وہ کس قدر عاجزی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ہمیں تو دن میں پانچ بار بھی یہ سجدہ محال گزرتا ہے اور یہ بے زبان حشرات اپنی زندگی کا آغاز ہی سجدے سے کرتے ہیں اور پوری زندگی اسی سجدے میں گزار کر شام کر دیتے ہیں۔کاش ہم انہی حشرات سے لمبے لمبے سجدے کرنا سیکھ لیں۔۔!!!جن سجدوں میں ہماری بقا ہے،اُن سجدوں پر

لوٹ آئیں ۔دنیا کے سامنے اپنے غم سنانے کی بجائے انہی سجدوں میں اپنے رب سے رازو نیاز کی باتیں کریں۔اس کے سامنے اپنی حاجتیں رکھیں۔کاش۔۔۔!! ہم ایسا کریں۔۔!!نماز کا ایک اہم رکن تشہد میں بیٹھنا ہے۔التحیات پڑھنا ہے۔اگر ہم اپنے اردگرد نظر دوڑائیں تو اس حالت میں کون سی مخلوق عبادت کرتی نظر آئے گی؟ دور میدانی علاقوں میں رہنے والے تو یہ نہ سمجھ سکیں مگر اسلام آباد کے رہائشی اس مخلوق کی حالت کو دیکھ کر بھی ان سے انجان رہیں تو افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جاسکتا۔شاید میں خود بھی ایک عرصے تک اس میں شامل تھی۔یہ فلک بوس پہاڑ جو خدائے بزرگ کی بڑی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔جن کی مثال زمین کے لئے میخوں کی طرح بیان کی گئی۔وہ اس حالت میں تسبیح بیان کررہے ہیں۔ہم اگر اپنی التحیات کے بیٹھنے حالت اور پھر پہاڑوں کا موازنہ کریں تو یقیناً ہمیں مشابہت نظر آئے گی۔زمین کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا حصہ اور زمین سے اوپر صرف ایک چوٹی۔یہی پہاڑ جو اس وقت طاقتور ومضبوط ترین ہیں قیامت کے نزدیک روئی کے گولوں کی طرح ہوا میں اڑتے پھریں گے۔جو یقیناً انسان کے لئے تفکر کی علامت ہے" مزید لکھنے کے لئے اس نے ورق پلٹنا چاہا مگر رجسٹر ختم ہوچکا تھا۔چہرے پر مایوسی کے تاثر ابھرے۔وہ اپنے کام میں مشغول تھی اور یوں اچانک تسلسل کا ٹوٹنا یقیناً قابل افسوس تھا۔اس نے ہاتھ میں تھاما قلم ٹیبل پر ہی رکھا اور ایک بار پھر نگاہوں سے اپنی تحریر کا مطالعہ کیا۔وہ ایک ایک سطر پڑھتی جاتی اور اپنے اوپر غور کرتی جاتی۔کس قدر اس میں انقلاب برپا ہوچکا تھا؟

"شکریہ آپی۔۔!!" ایک بار پھر اپنے محسن کے لئے دعائیں نکلیں مگر آنکھوں میں چمکتے حسرت کے موتی آج بھی اسی چہرے کے متلاشی تھے۔جانے وہ کہاں چلا گیا؟ خدیجہ کا عکس آنکھوں میں لہرایا۔ہاتھوں میں موجود رجسٹر ٹیبل پر رکھ دیا گیا۔جہاں پہلے سے کئی رجسٹر موجود تھے۔علاوہ ازیں دینی کتب کا حصہ بھی مخصوص تھا۔جن کے اوپر مٹی کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔اس نے اپنی پشت کرسی کی ٹیک سے لگائی۔آنکھیں ستانے کے لئے بند کیں تو جبیں کے آواز نے مخل کیا۔

"حاعفہ۔۔تم نے بازار سے کچھ منگوانا ہے؟ میں اریب کے ساتھ باہر مارکیٹ جارہی تھی۔" اس کے پاس سٹڈی ٹیبل تک آتے ہوئے اس نے اپنا جملہ مکمل کرلیا تھا۔

"نہیں کچھ خاص نہیں۔لاسٹ ٹائم تم سب کچھ لے آئی تھی۔" وہ اپنی نشست سے کھڑی ہوئی تھی۔

"اچھا۔۔تو پھر ٹھیک ہے۔" وہ دوبارہ پلٹی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔حاعفہ نے اپنی نگاہیں دوبارہ سٹڈی ٹیبل کی طرف گھمائیں تو نگاہیں برجستہ رجسٹر پر جاکر ٹھہر گئیں۔اسے رجسٹر ختم ہونے کا خیال آیا۔

"اوہ۔۔شاید جبیں ابھی کمرے میں ہی ہوگی۔۔ مجھے جاکر کہنا چاہیے" وہ فوراً اس کے کمرے کی طرف چل دی۔جبیں کے کمرے کا دروازہ حسب معمول کھلا تھا۔

"جبیں میں رجسٹر کا کہنا بھول گئی تھی" اس نے مخل کہا۔نگاہیں جیسے ہی سامنے گئیں تو جبیں کی بجائے اریب کو پایا۔اریب بھی

دفعتہً پلٹا تھا۔ اریب کے حدت نے اسے اپنے سکارف کی طرف توجہ دلائی جو اس وقت سر پر نہ تھا۔ اپنا سکارف ٹھیک کرنے لگی تو اریب نے بھی نگاہیں چرالیں اور بالکونی کی طرف دیکھنے لگا۔

''سوری۔۔۔'' حاعفہ نے کہا تھا

''اٹس اوکے۔۔'' پلٹ کر وہ مسکرایا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ میں برینڈڈ واچ کو صحیح کیا اور بالوں کو سیٹ کرنے کی غرض سے اپنا عکس آئینے میں دیکھا۔ حاعفہ یک ٹک اس کی حرکتوں کو نوٹ کر رہی تھی۔

''اریب تم تیار ہو ناں؟'' پیچھے سے جبیں آئی تھی۔ وہ اپنے ہینڈ پرس میں کچھ رکھ رہی تھی۔

''میں تو کب سے تیار ہوں۔ تم ہی کبھی وہاں تو کبھی وہاں جا رہی ہو'' شانے اچکاتے ہوئے اریب نے شکوہ کیا تھا۔

''اسے تم پھرنا کہہ رہے ہو؟ ایک تو میں ایک ایک سے پوچھ رہی ہوں کہ اسے کچھ چاہیے تو نہیں۔۔'' اس نے ناک سکیڑ کر جواب دیا تھا۔ حاعفہ پر نگاہیں گئیں۔

''کیا تم بھی ہمارے ساتھ چل رہی ہو؟'' برجستہ سوال کیا گیا

''نہیں۔ میں تمہیں رجسٹر کا کہنے آئی تھی۔ میرا رجسٹر ختم ہو چکا ہے۔ تم مارکیٹ سے دو رجسٹر لے آنا'' جبیں نے اثبات میں گردن ہلائی تو جھماکے سے ایک خیال اس کے ذہن میں امڈ آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ سر پر دے مارا۔

''اُفف۔۔ رجسٹر سے یاد آیا۔ حسام بھائی نے کچھ سٹیشنری کا کہا تھا۔ وہ لسٹ تو میں ان کے روم میں ہی بھول آئی۔ میں ابھی آئی۔۔'' وہ دوبارہ کمرے سے نکل گئی۔ اریب نے اسے پکارنا چاہا مگر وہ وہاں سے جا چکی تھی۔

''اس لڑکی کا کچھ نہیں ہو سکتا۔۔'' اس نے افسوس کے ساتھ گردن جھٹکی تھی۔ حاعفہ ابھی تک اسے دیکھ رہی تھی۔ نگاہوں سے نگاہیں ٹکرائیں تو اسے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی۔ وہ جانے کے لئے پلٹی تو ایک دم پاؤں الجھے اور وہ گرتے گرتے بچی تھی۔

''خیال سے۔۔۔'' اریب نے متفکر لہجے میں کہا تھا۔ حاعفہ نے اریب کی آنکھوں میں دیکھا تو آج بھی اپنے لئے فکر و جذبات کو محسوس کیا مگر وہ ان جذبات کو ضبط کئے ہوئے تھا۔ اپنا ہاتھ واپس کھینچا اور دوبارہ آئینے کی طرف رخ کیا۔

''شکریہ۔۔!!'' حاعفہ کی زبان سے برجستہ جاری ہوا تھا۔ اریب کے بدن میں جیسے ایک لہر سرایت کر گئی۔ وہ کشمکش کے ساتھ اس کی طرف گھوما اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کس لئے؟'' اس نے اچھنبے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''میرے کہنے پر مجھے بھولنے کے لئے۔۔'' حاعفہ کی بات پر وہ مسکرا دیا۔ جس پر اسے تشویش ہوئی تھی۔

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے؟'' اس نے ذومعنی لہجے میں کہا تھا۔ قدموں کو اس ذات کی طرف بڑھایا تو آنکھوں میں چاہت کا

ایک جہاں آباد تھا۔ نگاہوں کی حدت وہ ایک فاصلے سے محسوس کر سکتی تھیں۔ مسحور کن پلکیں یکسوئی سے اپنے محبوب کو حصار میں لئے ہوئے تھیں۔

''تم نے میرے کہے کا پاس رکھا اور کسی کی بات کا مان رکھ لینا ہی بڑی بات ہے'' اس نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر ایک گہری مسکراہٹ اس کے لبوں پر ظاہر ہوئی تھی۔ حاعفہ کے دائیں جانب شانوں کے بالمقابل وہ ذرا دیر کو ٹھہرا تھا۔

''جس کو دل کی گہرائیوں سے چاہا جائے، اس کی بات کا مان رکھنا عاشق کے لئے فرض کی حیثیت رکھتا ہے اور آج میں تمہارا یہ گمان بھی دور کر دیتا ہوں'' اریب کی بات پر اس نے حیرت سے اس چہرے کی طرف دیکھا، جو من وعون حال دل کہتا جا رہا تھا۔

''گمان۔۔۔!! کون سا گمان؟'' تجسس اس میں بڑھتا چلا گیا۔ آنکھوں نے سچائی کا راستہ پانا چاہا تو اس کی حدیں اریب کی ذات کی طرف بڑھتی چلی گئیں۔

''وہی گمان جس نے تمہیں میری سوچ سے لاشعوری اختیار کرنے پر اکسایا ہے۔ وہی گمان جس کو سچ مانتے ہوئے تم نے پیچھے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ وہی گمان جس کی تصدیق کرنا، تمہارا فرض تھا مگر تم نے ایسا نہیں کیا۔ اپنی اندر نہیں جھانکا۔ بس ذہن میں جو خیال آیا۔ سماعت نے جن الفاظ کو سنا، آنکھوں نے جو دیکھا۔ وہی سچ مان لیا'' اریب کی باتیں اسے کسی ابتلا میں مبتلا کئے ہوئے تھیں۔

''یہ پہیلیاں کیا سنا رہے ہو؟ جو کہنا ہے صاف صاف کہو۔'' اُتالی کیفیت کو دور کرتے ہوئے اس نے تذبذب کے ساتھ کہا تھا۔ جس پر وہ طنزیہ مسکرایا۔

''جب اساطیر کا سہارا لئے بغیر اپنے جذبات کی حدت کو تمہارے سامنے رکھا تو تم نے آفتاب لب بام کی مثل آنکھیں موند لیں اور میرے جذبات کی ناقدری کی اور آج جب وہی الفاظ استبرق میں لپیٹ کر پیش کر رہا ہوں تو تمہارے نزدیک وہ بھی آخور سنگیں ہیں۔'' خوابیدہ لہجے نے یک دم سنجیدگی کی چادر اوڑھ لی تھی۔ آنکھیں تغافل کی ایک باریک تہہ کی اوٹ سے ان صادق جذبوں کی حمایتی تھیں۔ اُبا ک فضائیں کسی اُتسو کی طرح انوکھے گیت پر محو رقص تھیں۔ جنہیں آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں مگر ان کی آہٹ سماعت سن سکتی تھی۔

''لیکن تم فکر نہ کرو، یہ جذبات اب میری اسارت میں ہیں۔ میں انہیں کبھی آزاد نہیں ہونے دونگا۔ کیونکہ کبھی کبھار منزل پر خار راستوں پر چلنے کی بجائے اندھیر وادیوں میں بھی ہوتی ہے اور اس منزل کو پانا کانٹوں پر چلنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ پتا ہے کیوں؟'' اس نے ایک پل کے لئے توقف کیا تھا۔ استفہامیہ آنکھیں خود سے استفسار کر رہی تھیں۔

''کیونکہ ان اندھیر وادیوں میں محبوب کا ساتھ نہیں ہوتا۔ محبت کی روشنی نہیں ہوتی۔ کانٹے فقط لہو نکالتے ہیں جبکہ اندھیر وادیاں جسم سے جان بھی نکال دیا کرتی ہیں اور سنگ دل محبوب اپنی ہی انا میں انجان بنے پشت دکھائے پہاڑی کی اوٹ میں اپنا نیا دیس بسائے رہتا ہے۔ اسے کہاں خبر کہ کوئی اس کی تلاش میں اپنی جان سے بھی گزر گیا۔'' اس کے لبوں پر تمکنت تھی مگر اس جملے نے حاعفہ کے جسم میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ نگاہوں میں بھی زلزلے کی سی کیفیت تھی۔

''نہیں۔۔!!'' جانے کیوں اس کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ ابر نیساں آفتابوں سے پُر تھا۔ مژگان کے کنارے انہی موتیوں سے چمکنے لگے۔ جنہیں دیکھ کر اریب کے لبوں پر گہری مسکراہٹ نے جنم لیا تھا۔

''تمہیں اضطراب کا شکار ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گا کیونکہ میری قسمت میں تو منزل لکھی جا چکی ہے'' اس نے پلٹ کر ایک ادا سے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ چہرے سے طمانت چھلک رہی تھی۔ حاعفہ نے ایک بار پھر استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا جو ہمیشہ سے اسے سمجھنے سے قاصر رہی۔ شاید یہی فرق انہیں ایک ہونے سے روکے ہوئے تھا۔

''مطلب؟'' اس بار وہ گردن جھکا کر ہنس دیا۔ دبی دبی ہنسی نے اس کی پیشانی پر شکن ابھارے لیکن دل کو وہ ہنستا چہرہ بہت بھایا تھا۔

''یاد ہے تم نے اُس دن کہا تھا میں اسپیشل ہوں۔ بس اسی غیر معمولی صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہوئے میں نے تمہارے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا ساتھ دیکھا ہے۔'' اس نے پل بھر کے لئے اس کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی کا رخ اس کی نگاہوں کے بالکل سامنے کیا تھا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ جب کے اس کے الفاظ اور اس کا لمس ایک وقت تک وہ محسوس کر سکتی تھی۔ خوابیدہ لہجہ، بے پرواہ وجود کو سامنے گمان کئے ہوئے تھا۔ آنکھیں اٹ سٹ ان لفظوں کا تانا بانا سمجھنے کی کوشش میں سرگراداں تھی۔ ان لفظوں کی مراد کو دل میں سمانے کے لئے بے تاب تھیں۔

''یہ کیا کہہ کر گیا ہے اریب؟'' ہتھیلی کو سونگھا تو اس کے ہاتھوں کو خوشبو اب بھی ان میں سمائی ہوئی تھیں۔ یہ اس کے لمس کی بُو تھی یا پھر محبت کا پہلا احساس؟ شاید وہ ابھی تک ان سب سے انجان تھی۔

☆......☆......☆

میں اپنے آپ سے ہوں غیر کتنا
کسی سے بھی مری یاری نہیں ہے

تنِ تنہا آڈیٹوریم کے عقبی حصے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا وہ سادہ کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں لگا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ ڈھلتا سورج کیا ہی سہانا منظر پیش کر رہا تھا۔ کئی لڑکے لڑکیاں اس کی نگاہوں کے سامنے کپل کی شکل میں بیٹھے چٹ چیٹ میں مصروف تھے۔ کچھ اسائنمنٹ بھی بنا رہے تھے مگر ان میں زیادہ تر تعداد ٹائم پاس کرنے والوں کی تھی۔ وہ بھی ٹائم پاس کر رہا تھا۔ اگلی کلاس شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ ''بس عکاس بھائی کا کیس فائنل ہو جائے پھر میں بھی پاسپورٹ دے دونگا انہیں اور میرا اگلا پراونڈ وہوگا۔'' اس نے خود کلامی کی تھی۔ لبوں پر جیت مقدر بننے کی کسک ابھر آئی۔

''ویسے ایک عرصہ ہو گیا۔ وہ بلینک کال دوبارہ نہیں آئی؟ چلو اچھا ہے۔ کچھ ماہ سکون سے گزر گئے مگر اب شاید یہ راز افشاں ہونے والا ہے اور وہ خود بھی میری اس چال سے بے خبر ہوگا۔'' وہ خود ہی تانا بانا بنتا جا رہا تھا۔ ڈور کے ایک سرے کو خود ہی دوسرے سرے سے جوڑ رہا تھا۔ اپنی اٹکل کے بل بوتے پر ایک نتیجہ پر پہنچ چکا تھا جو بہت جلد ایک بار پھر سٹارٹنگ پوائنٹ کی صورت اختیار کرنے جا رہا تھا۔

''تم یہاں؟ خیریت ہے؟ آج تمہارا دوست کامیش نہیں آیا؟'' یہ ہانیہ کے الفاظ تھے جو اسے اٹ سٹ سوچوں سے باہر لے آئے۔اس نے کاغذ کو فائل میں ڈالا اور بائیں جانب سرک کر ہانیہ کو بیٹھنے کی جگہ دی۔

''بس نیکسٹ پیریڈ کے شروع ہونے کا منتظر تھا اور کامیش اپنے کسی ریلیٹو سے ملنے گیا ہوا ہے آج لاہور'' دھیان ایک بار پھر انڈونیشیا کی طرف ڈھلتا دکھائی دیا۔

''ٹھیک۔۔'' اس نے مختصر کہا اور شانے اچکاتے ہوئے اپنی نگاہوں کو بھی سامنے درخت پر مبذول کیا جس پر کئی پرندے اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ ہلکے سرمئی رنگ کا دوپٹہ شام کی ٹھنڈی ہوا کے سنگ لہراتا ہوا جانے کب اریب کے ہاتھوں سے مس ہونے لگا تھا مگر دونوں اس سے بے خبر اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

''میں اپنے پچھلے سلوک کے عوض تم سے معافی مانگتا ہوں۔شروع میں تمہیں کافی ٹارچر کیا میں نے۔۔'' نگاہوں کو اس کی ذات کا مرکز بنائے بغیر اس نے کہا تھا۔جس پر اس نے اچنبھے انداز میں اریب کی طرف دیکھا۔

''یہ اچانک تمہیں معافی کی کیا سوجھی؟''

''پتا نہیں۔۔بس سوچا۔۔جانے سے پہلے تم سے معافی مانگ لوں؟'' اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے تو اسے ایک جھٹکا لگا۔

''جانے سے پہلے؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟'' الفاظ حیرت کے سمندر میں غوطہ لگا رہے تھے۔

''ہاں۔۔جانے سے پہلے۔۔۔'' یہ کہتے ہی اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو کلاس کا ٹائم ہو چکا تھا۔متجل کھڑا ہوا۔

''کلاس کا وقت شروع ہو چکا ہے۔'' وہ دھیمے قدموں سے بائیں جانب مڑا۔وہ بھی غیر یقینی طور پر اسے دیکھتے ہوئے کھڑی ہوئی مگر قدم تو جیسے ساکت تھے۔آگے بڑھ ہی نہیں رہے تھے۔سماعت میں ابھی تک اریب کے الفاظ گونج رہے تھے۔ہنستا مسکراتا چہرہ، پرسکون دل میں جانے کیسا طوفان برپا ہوا تھا۔یکدم ایسی ہلچل مچی جیسے کس نے استادہ سمندر میں کوئی پتھر پھینک کر اسے بے تاب کر دیا ہو۔ہر لہر پہلے سے زیادہ پرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ ہر لہر میں پہلے سے زیادہ اضطرابی کیفیت سمائے ہوئے تھی۔الجھی نگاہوں نے اریب کو ہی اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔

''جانا نہیں ہے کیا؟'' پرکشش چہرہ اسے بلا رہا تھا۔شہہ کا تاج اپنے سر ہر سجانے کی خواہش کرتا وجود آج بری طرح ہار چکا تھا۔پہلی بار اس نے مات کا ذائقہ چکھا تھا۔درد اور کسک سے لبریز،ایک انوکھا ذائقہ۔۔۔آنکھوں کی نمی ابھرنے لگی۔جنہیں وہ پونچھنا بھی بھول چکی تھی۔

رات کو سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی اسی کا وجود نگاہوں کے سامنے تھا۔اسی کا عکس اس کے شعور کے لاشعوری حصے پر حکمرانی کر رہا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ اس کے جانے کا سن کر میں خود کو اتنا دکھی محسوس کیوں کر رہی ہوں؟ آخر یہی تو چاہتی تھی میں کہ وہ چلا جائے، مجھ سے دور، میرے راستے سے دور، میری کامیابی کی راہ میں سب سے بڑا کانٹا۔۔اریب عالمگیر۔۔۔اسی کو تو میں جڑ سے اکھاڑ

کر پھینک دینا چاہتی تھی اور آج جب وہ خود اپنی راہیں جدا کر رہا ہے تو مجھے اتنا عجیب کیوں لگ رہا ہے؟ کیوں اتنی گلٹی فیل کر رہی ہوں؟“
آخری سیڑھی پر قدم رکھ کر وہ کچھ دیر کو ٹھہری تھی۔ آنکھوں میں یاسیت، دل میں ملال اور ہاتھوں کی اضطرابی وہ کچھ بھی سمجھنے کو قاصر تھی۔

”لیکن وہ جا کہاں رہا ہے؟“ ایک خیال اس کی طرف دوڑا چلا آیا تھا۔

”یہ تو پوچھنا چاہیے تھا مجھے۔۔۔“ شکنیں مندمل ہونا شروع ہوئی تھیں مگر اگلے ہی لمحے مایوسی نے دوبارہ آ گھیرا تھا۔

”لیکن کیا وہ مجھے بتاتا؟ کیا اس کی زندگی کے بابت کچھ بھی پوچھنے کی روادار ہوں میں؟“ ماضی کی بے رخی آج بھی سامنے تھے۔
اپنے آپ پر طنزیہ مسکرائی اور گردن جھٹکتے ہوئے کمرے کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

حالت کی بے ترکیبی نے دل کو کہیں کا بھی نہ رکھا

دل میں ہنسنا، لب پر رونا، اُلجھے اور اُلجھا بیٹھے

اپنے روزمرہ کی پینٹ شرٹ پہنے وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ بائیں کندھے کے سہارے سے فون سنتے ہوئے اس کے دونوں ہاتھ مصروف دیکھائی دے رہے تھے۔ بائیں ہاتھ میں بلیک فائل اوپن تھی۔ دائیں ہاتھ میں بال پوائنٹ جس سے وہ فائل میں کچھ ٹیکسٹ کو سرکل کر رہا تھا۔

”یس۔۔ آئی ڈو اِٹ۔۔۔“ اس نے مختصر کہا اور دوبارہ ہدایات سنتے ہوئے فائل میں کچھ لکھنے لگا۔ جہانزیب صاحب ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے بالمعمول نیوز پیپر پڑھنے میں مصروف تھے جبکہ ماریہ کچن سے ناشتے کی پلیٹیں لا کر رکھ رہی تھی۔ سحر فاطمہ کچن کا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ حاعفہ بھی ان کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ جبکہ جبیں اس سے نالاں تھی۔

”جبیں کو تو جیسے کچن کا نام سنتے ہی غشی آنے لگتی ہے“ سحر فاطمہ نے آنچ ذرا دھیمی کرتے ہوئے کہا تھا۔ حاعفہ مسکرا دی اور الماری سے کپ نکال کر ٹرے میں سیٹ کیے۔

”آنٹی ابھی وہ پڑھائی میں بزی ہے، بس اسی لئے اور پھر بی ایس کرنا بھی تو آسان نہیں ہے۔ کچھ دن بعد پہلے سمیسٹر کا فائنل شروع ہو جائے گا۔“

”یعنی جناب کے نخرے مزید آسمان کو چھونے لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان بیٹیوں کے دل میں کچھ کچن کی محبت بھی ڈال دے“ سرد آہ بھرتے ہوئے ان کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ حاعفہ گردن جھکا کر ہنس دی۔

”میرے عزیز۔۔ صبح ہی کام شروع کر دیا؟“ حسام دفعتہً عکاس کے پاس آ بیٹھا تھا۔ فون تو وہ پہلے ہی بند کر چکا تھا بس فائل میں کچھ لکھ رہا تھا۔

"صبح کہاں ہے؟ آٹھ بجنے والے ہیں۔" عکاس نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا تھا۔ جہانزیب نے بھی نیوز پیپر فولڈ کرتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھا تھا۔

"میرے پیارے بھائی۔ یہ صبح ہی ہے۔ خاص طور پر میرے چھوٹے بھائی کے لئے تو ہے۔اس وقت بھی وہ گھوڑے بیچے خوابوں کی دنیا میں سیر سپاٹے کرر ہے ہونگے" اس نے عکاس کے ہاتھوں سے فائل کھینچی اور ٹیبل پر رکھ دی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔

"صحیح کہا آپ نے لیکن اب آٹھ بج کر ایک منٹ ہو چکے ہیں۔اس لئے میں خوابوں کی دنیا سے باہر آچکا ہوں بھائی صاحب!" عقب سے اریب کی آواز آئی تھی۔ حسام نے حیرت کا اظہار کیا۔عکاس مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا اور اریب کے پاس گیا۔

"موصوف کو آج تو جلدی اٹھنا ہی تھا۔ کیوں مسٹر؟" ابرو اچکاتے ہوئے عکاس نے کہا تھا۔ اریب مسکرا دیا جبکہ حسام کو تشویش ہوئی۔ جست لگا کر وہ صوفے کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ سحر فاطمہ اور حاعفہ بھی ڈائننگ ٹیبل پر تمام اشیاء رکھ چکی تھیں۔

"کیا معاملہ چل رہا ہے؟ مجھے بتانا پسند کریں گے عکاس؟" حسام نے متجسّس استفسار کیا تھا۔

"معاملہ جو بھی ہو، سب کچھ بعد میں۔ پہلے ناشتہ" یہ سحر فاطمہ کی آواز تھی۔ سب اس جانب کو لپکے۔

"میرے بغیر ناشتے کی محفل کیسے جم سکتی ہے؟" زینے اترتے ہوئے جبیں نے پکارا کہا تھا۔ حسام اور اریب نے پل بھر کے لئے ٹھہر کر پیچھے دیکھا اور گردن جھٹک کر آگے بڑھ دیئے جبکہ عکاس وہیں ٹھہرا رہا۔

"آپ کے بغیر تو ہر محفل بے رنگ ہے اپکمنگ مسز عکاس" اس نے دھیرے سے سرگوشی کی تھی۔ لبوں پر محبت کی چاشنی اپنا رنگ بکھیر رہی تھی۔ جس پر اس کا انداز کسی شیرنی سے کم نہ تھا۔ آنکھوں میں لاوا ابلنے لگا۔ مٹھیاں بھینچے، وہ اسے گھور کر رہ گئی۔

"عکاس۔۔ بکواس۔۔۔ ہو تمہارا ستیاناس۔۔" جل بھن کر اس نے جملہ کسا تھا۔ جس پر ہمیشہ کے طرح وہ مسکرا دیا۔ اس کے جلے کٹے جملے بھی اسے رومانوی لگتے تھے۔ شاید محبت کا یہ نیا انداز تھا۔

"کیوں تمہیں شادی سے پہلے بیوہ ہونے کا ارادہ ہے؟" وہ بھی پورا ڈھیٹ تھا اور اس کی حالت سے حظ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک ادا سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پورے بدن میں اس کے جیسے آگ لگ چکی تھی۔ حدت نگاہوں سے پھوٹتی نظر آرہی تھی اور وہ یک ٹک مسکراتا جا رہا تھا۔

"عکاس۔۔۔ جبیں۔۔" جہانزیب کی آواز پر عکاس نے جھرجھری لی اور ڈائننگ ٹیبل کی طرف چل دیا۔ جبکہ وہ پاؤں پٹختی ہوئے آگے بڑھی۔

"بدتمیز۔۔۔ الو۔۔۔ سٹوپڈ۔۔۔ بے شرم۔۔۔" وہ دنیا جہاں کے انوکھے خطابات سے نواز رہی تھی۔

"آپ کو ایسا نہیں لگ رہا یہاں کوئی جل رہا ہے؟" جیسے ہی جبیں بیٹھنے لگی تو عکاس نے ایک بار پھر جملہ کسا تھا۔ وہ کچا چبا جانے

والی نگاہوں سے اس کی تکا بوٹی بنا رہی تھی۔ سب کے قہقہے گونجے۔

"جلنے والوں کو جلنے دیجیے بھائی جان۔۔۔" ایسے میں بھلا اریب کہاں پیچھے رہنے والا تھا؟ جھٹ جبیں کی ٹانگ کھینچی۔

"اریب کے بچے۔۔چپ۔۔۔" اس نے آنکھیں دیکھاتے ہوئے کہا تھا۔

"جبیں مذاق کو سمجھا کرو۔۔۔" حاعفہ نے کہا تھا۔

"مذاق مائے فٹ؟" اس نے جل بھن کر کہا تھا اور فارکس خالی پلیٹ میں پھیرتے ہوئے شور کرنے لگی۔ سحر فاطمہ نے دیکھا تو گردن جھٹکی اور کھانے میں مصروف ہوگئے۔ ناشتے کے دوران سب خاموش تھے مگر نگاہیں آپس میں اس وقت بھی جھگڑا کر رہی تھی۔ ایک طرف محبت کا ستارہ جوبن پر تھا تو دوسری طرف ناز نخرے بھی کسی سے کم نہ تھے۔ ناک منہ چڑھا کر وہ اس کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ چہرے پر کسک ان نخروں کا جواب تھی۔ جو الفت کی طرف پہلا قدم تھا۔

"میرا تو ناشتہ ہوگیا۔اریب تم مجھے اپنا پاسپورٹ لا کردے دو۔" عکاس نے ناشتے کے اختتام پر کہا تھا جس پر سب کو حیرت ہوئی۔

"پاسپورٹ؟ وہ بھی اریب کا؟ تمہیں اس کی کیا ضرورت؟" جہانزیب نے برجستہ سوال کیا تھا۔ سحر فاطمہ کی بھی سانسیں اٹکنے لگی تھیں۔

"شاید اریب نے آپ کو نہیں بتایا۔۔" اریب پاسپورٹ لینے فوراً اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ پیچھے سے عکاس نے جواب دیا تھا۔

"اریب نے تو کچھ نہیں بتایا۔ اب تم ہی بتاؤ، ماجرا کیا ہے؟" تشویش زدہ لہجے میں استفسار کیا گیا تھا۔

"انکل آپ کو بتایا تھا ناں میں اس ماہ جکارتہ جارہا ہوں ایک کیس کے سلسلے میں۔۔" جہانزیب نے اثبات میں سر ہلا دیا مگر معاملے کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ شاید ان کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اریب وہاں جانے کے لئے عکاس کا بھی سہارا لے سکتا ہے؟

"تو اریب نے بھی مجھ سے وہاں جانے کی فرمائش کی تھی۔ بس اس لئے، اپنے پاسپورٹ کے ساتھ ہی اس کا پاسپورٹ بھی۔۔" وہ جملہ بھی مکمل نہ کرسکا تھا۔ سحر فاطمہ نے مداخلت کی تھی۔

"اریب کہیں نہیں جارہا۔۔" ان کا لہجہ تند تھا۔ عکاس بھی بری طرح چونکا تھا۔ جبیں کے دل میں خیال آیا کہ وہی معاملہ ایک بار پھر پیش آنے والا ہے۔ خاموشی کا ایک لمبا تسلسل تھا۔

"یہ لیجیے بھائی۔۔ میرا پاسپورٹ" اریب نے آتے ہی اپنا پاسپورٹ عکاس کی طرف بڑھایا تو جہانزیب نے جھٹ عکاس کے ہاتھوں سے وہ پاسپورٹ چھین لیا۔

"سنا نہیں تم نے۔۔تم کہیں نہیں جارہے" اس بار جہانزیب نے بھی سختی کا لبادہ اوڑھا تھا۔

"لیکن بابا جان۔۔اس بار تو عکاس بھائی میرے ساتھ ہیں اور پھر صرف ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ نیکسٹ سمیسٹر کی فیس سمٹ کروانے سے پہلے واپس بھی آجاؤں گا" اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

''بات ایک ویک کی نہیں ہے۔ اگر عکاس ایک گھنٹے کے لئے بھی جا رہا ہوتا تو ہم پھر بھی تمہیں اجازت نہیں دیتے۔۔'' انہوں نے جیسے بات کی ختم کر دی تھی۔ عکاس بھی حیران تھا۔

''لیکن بابا جان۔۔۔'' وہ اس بار کوئی بدتمیزی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔۔۔'' سپاٹ لہجہ گویا ہوا تھا۔

''بھائی۔۔۔!!'' اس نے افسردہ لہجے میں عکاس کی طرف دیکھا تھا جیسے وہ اسے پہلے ہی حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ تبھی اس نے پلک جھپکتے ہوئے نرم گوشہ اختیار کرنے کو کہا۔

''انکل میں یہ تو نہیں جانتا کہ آپ اریب کو کیوں باہر جانے سے روک رہے ہیں لیکن میری طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ میں اس کا بالکل بچوں کی طرح خیال رکھوں گا۔ یہ کہاں آ جا رہا ہے؟ کب کس سے مل رہا ہے؟ کھانا وقت پر کھایا یا نہیں؟ کب سویا؟ کب جاگا؟ ایک ایک پل کی رپورٹنگ کروں گا۔'' اس نے مزاح کی طرف پہلو موڑنا چاہا تھا۔

''بات یہ نہیں ہے عکاس۔۔!!'' جہانزیب کچھ نرم ہوتے دکھائی دیئے تھے۔

''تو پھر آپ کو مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟'' اس نے دوسرا معنی اخذ کیا۔

''نہیں بیٹا! ایسا سوچنا بھی مت۔ اگر تم پر بھروسہ نہ ہوتا تو جبیں کی تمہارے ساتھ مانگنی کرتے؟'' انہوں نے وضاحت پیش کی تھی۔ سحر فاطمہ نے بھی نفی میں سر ہلایا۔

''پھر تو قطعاً بھروسہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' جبیں بڑبڑائی تھی۔

''تو پھر طے رہا۔ اریب میرے ساتھ جا رہا ہے، ایک ہفتے کے لئے۔'' اس نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا اور جہانزیب کے ہاتھوں سے پاسپورٹ بنا اجازت کے واپس لیا۔

''انکل دیر ہو رہی ہے۔ پاسپورٹ آفس بھی جانا ہے۔ شام کو ملتے ہیں'' اس نے فی البدیہہ بات مکمل کی۔ جہانزیب کچھ نہ کہہ سکے۔ عکاس کو نہ کرنا اس پر شک کرنے کے مترادف تھا اور اسی کا فائدہ اریب نے اٹھایا۔ جس کی انہیں امید نہ تھی۔ سحر فاطمہ کے چہرے پر تفکر آویزاں تھی۔ جبکہ اریب کو شہہ نصیب ہو چکی تھی تبھی اس کا دل باغ باغ تھا۔

''بس ایک ہفتہ۔۔ اس کے بعد میں انڈونیشیا میں'' اس نے دل میں سوچا تھا۔ آنکھیں اٹھا کر دیکھا جہانزیب کی گھورتی آنکھیں اپنی ذات کا احاطہ کئے ہوئے پائی۔ جسم نے ایک جھرجھری لی۔

''مم مجھے اسائنمنٹ بنانی ہے۔۔'' اس نے فوراً وہاں سے کھسکنے کی۔

☆......☆......☆

لذت ترک مدعا ہو نصیب

پر میاں کوئی مدعا تو ہو

"آپ اسے ایسے ہی نہیں جانے دے سکتے" سحر فاطمہ نے کہا متجل کہا تھا۔ ان کے چہرے پر فکر کے ساتھ ساتھ افسردگی و خفگی کے بھی ملے جلے تاثر تھے۔ جہانزیب بالکل خاموش صوفے پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں غوطہ زن تھے۔ آنکھیں یک ٹک دیوار کو گھور رہی تھیں جیسے اپنی نگاہوں کی حدت سے اس دیوار کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔ سحر فاطمہ کے لئے یہ خاموشی قطعاً قابل قبول نہ تھی۔

"پلیز۔ کچھ بولیے تو صحیح۔ آپ اریب کو روکتے کیوں نہیں؟ اگر وہ انڈونیشیا چلا گیا تو۔۔ آپ جانتے بھی ہیں کیا ہو جائے گا؟ آپ ایسا ہونے نہیں دے سکتے۔ عکاس کو ناں نہیں کہہ سکتے تو آپ کو کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا لیکن وہ پاسپورٹ قطعاً عکاس کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ آپ نہیں جانتے صرف ایک ہفتے میں ٹکٹ کنفرم ہو جائے گی اور پھر۔۔" انہوں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ تاسف کے ایک جہاں نے اس کے لبوں سے تازگی چھین لی۔

"اور اریب انڈونیشیا چلا جائے گا" ادھورا جملہ جہانزیب نے مکمل کیا تھا۔ سحر فاطمہ نے کھوئے کھوئے انداز میں ان کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر گہری خاموشی تھی۔ کوئی تاثر نہ تھا۔ نہ افسردگی کا اور نہ ہی خفگی کا۔ بس ایک خاموشی اپنا تسلسل بنائے ہوئے تھی۔

"تو آپ ایسا ہونے دیں گے؟" ایک آس کے ساتھ انہوں نے جہانزیب کی طرف دیکھا تھا۔ یہ جملہ سنتے ہی ان کے جسم میں جنبش ہوئی جیسے کوئی شاخ ہوا کے جھونکے سے متحرک ہوئی ہو۔ دل بھی جکڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"نہیں۔۔ ایسا کبھی ہوگا۔ اریب کہیں بھی نہیں جارہا۔ یہ آپ بھی جانتی ہیں اس کا یہاں رہنا کتنا ضروری ہے" انہوں نے پرسکون نگاہ سحر فاطمہ پر دوڑائی تھی۔ جن کو دیکھ کر وہ چونکی تھیں۔ ایسے حالات میں وہ کیسے پرسکون رہ سکتے تھے؟ انہیں تو چاہئے تھا کہ حالتِ اضطرابی میں ادھر ادھر ٹہلتے مگر وہ مطمئن تھے۔ کیسے؟

"میں سب جانتی ہوں لیکن آپ یہ سب کریں گے کیسے؟" انہوں نے جواب چاہا تھا مگر وہ اٹھے اور دروازے کی طرف مڑے۔

"مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں" سحر فاطمہ کی نگاہیں انہیں جاتا دیکھ رہی تھیں۔ شاید سمجھتی تھیں کہ کال کرنے کے بعد ہی وہ اپنا لائحہ عمل واضح کریں گے۔

☆......☆......☆

میں تم سب کی ایک نہ مانوں، تم سب مجھ کو سمجھاؤ

آؤ پھر آغاز کریں ہم، بحث و جدال شامِ فراق

اریب کی خوشی دیدنی تھی۔ چہرہ کسی کھلے پھول کی طرح تھا۔ جو ہر لمحہ خوشبو بکھیر رہا تھا۔ معطر فضا اپنے اندر کچے خوابوں کی تعبیر میں

ملی چاشنی محسوس کر رہی تھی۔کہاں جبیں؟ کہاں حسام؟ وہ سب سے بے نیاز اپنی ہی تیاریوں میں جتا ہوا تھا۔اس وقت بھی وہ وارڈروب سے کپڑے نکال کر سوٹ کیس میں رکھ رہا تھا۔موبائل کی رِنگ ہوئی۔وہ ایک لمحے کے لئے ٹھہرا۔نگاہیں اپنے سامنے سائیڈ ٹیبل پر گھومیں۔ وہاں فون چمکتا دیکھائی دیا۔آنکھوں میں طمانت گہری ہوتی چلی گئی۔

"بے فکر رہیے۔بہت جلد میں آپ کے پاس ہی ہونگا مسٹر بلینک کالر" اس نے اگنار کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا مگر رنگ تسلسل کے ساتھ ہوتی رہی۔

"لگتا ہے فون سائیلنٹ پر ہی لگانا پڑے گا" یہ سوچتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔فون اٹھایا تو ایک لمحے کے دھچکا لگا۔وہ اس نمبر کو شاید پہنچانتا تھا لیکن فیلڈ نہ ہونے کے سبب یاد نہیں آ رہا تھا۔نمبر پاکستانی تھا اس لئے بلینک کال تو ہی نہیں سکتی تھی۔اس نے غیر یقینی انداز میں فون ریسیو کیا اور رسمی علیک کیا۔لہجہ انتہائی شیریں تھا۔وہ پہنچان چکا تھا۔یہ ہانیہ تھی۔اس نے شانوں سے فون لگایا اور دوبارہ پیکنگ میں مشغول ہو گیا۔

"بس اب بھی پیکنگ ہی کر رہا ہوں۔سوچ ہی رہا تھا کہ جانے سے پہلے تم دونوں سے ایک بار مل لوں لیکن پھر سوچا میں صرف ایک ہفتے کے لئے تو جا رہا ہوں کوئی ہمیشہ کے لئے ......اگر ہمیشہ کے لئے جاتا تو شاید......" اس کا لہجہ غیر جانبدار تھا جبکہ ہانیہ کا لہجہ کچھ بجھا بجھا سا محسوس ہوا۔

"اس کا مطلب تمہارا ہمیشہ کے لئے جانے کا ارادہ ہے؟" یہ الفاظ کہتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔اگر وہ اس وقت اریب کے سامنے ہوتی تو شاید آنکھوں میں آنسو بھی امڈ آتے۔دل میں بکھرے جذبات چہرے کی طرف دوڑتے چلے جاتے مگر خوش قسمتی کہہ لیجیے کہ وہ اس وقت فون پر بات کر رہی تھی مگر سننے والا بھی اریب تھا۔اس کے ہاتھ ہوا میں معلق دیکھائی دیئے۔ہاتھوں میں ایک جینز تھی۔جس کو وہ تہہ لگا رہا تھا۔آنکھیں اچھنبے انداز میں بیڈ پر جم گئیں۔

"تمہارا لہجہ کچھ گندھا گندھا سا لگ رہا ہے؟ آر یو او کے؟ (کیا تم ٹھیک ہو؟)"

"پتا نہیں......" اس نے صاف گوئی سے کام لیا تھا مگر وہ محسوس کر سکتا تھا کہ مژگان کے کنارے چمک رہے ہیں۔وہ بیڈ پر وہیں بیٹھ گیا۔

"تم نے بتایا نہیں کہ تم ہمیشہ کے لئے جانا چاہتے ہو؟" وہی سوال دوبارہ پوچھا گیا تھا جبکہ وہ اس لہجے کے پیچھے چھپی حقیقت جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جانا چاہتا ہوں مگر ممکن نہیں" اس نے بھی صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

"مگر کیوں؟ کیا تم اپنے چاہنے والوں کو یونہی چھوڑ کر جانا چاہتے ہو؟ کیا تمہیں ان کی ذرا پروا نہیں؟" اس بار لہجے میں عجب

چاشنی تھی۔ دھیرے دھیرے دل کی باتیں زبان پر آ رہی تھی۔ وہ تھوڑا سا چونکا تھا۔ ذو معنی باتوں کو سمجھنے لگا تھا۔ آنکھیں بے یقینی کے ساتھ دروازے کو تکنے لگیں۔ خاموشی کا ایک تسلسل شروع ہوا۔ سانسوں کی روانی فون پر سنی جا سکتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کئے دونوں ہاتھوں سے موبائل کو پکڑے ہوئے تھی۔ شاید تنہائی میں بھی اپنے ہاتھوں کی جنبش کسی سے چھپا رہی تھی۔

''ہانیہ...... مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے؟'' اس کے انداز بھی یک دم بدل گیا۔ سوال پر سوال کیا جا رہا تھا۔

''ہاں...... معاملہ بہت سنگین ہے۔'' اسے زبردست جھٹکا لگا۔

''مطلب؟''

''میں تمہیں چاہنے لگی ہوں'' معجل اپنا جملہ مکمل کیا اور رابطہ منطقع کر دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے تو اپنے سانس لینے میں بھی شبہ تھا۔ آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ فون پر اگر گرفت مضبوط نہ ہوتی تو وہ لازماً زمین پر جا گرتا۔ ہوا کی شائیں شائیں بھی خاموشی میں کہیں کھو گئی۔ کئی ثانیے تک وہ خلا میں کھڑا رہا۔ جہاں دور دور تک اندھیرا تھا۔ نہ کوئی آگے اور نہ ہی پیچھے۔ اس کی عقل مفلوج ہو گئی۔ آگے کیا کہے؟ کیا نہ کہے؟ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ دل کی دھڑکنیں جو وہ حاعفہ کے نام کر چکا تھا، کسی اور کی دھڑکنوں کو اپنے لئے دھڑکنے کا سن کر برجستہ تیز ہو گئیں۔

''کک کیا؟'' بمشکل اس نے کہا تھا لیکن رابطہ منطقع ہوئے کافی دیر گزر چکی تھی۔ اس نے موبائل کان سے ہٹایا تو سکرین پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تاریکی کا ایک جہان آباد تھا۔ وہ بے جان کاغذ کی طرح بیڈ پر بیٹھتا چلا گیا۔ پیکنگ کا خیال لمحہ بھر کے لئے نکل چکا تھا۔ خالی الذہن پر فقط ہانیہ حکمرانی کر رہی تھی۔ اس نے کبھی ہانیہ کے بارے ایسا نہ سوچا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی ہانیہ سے اس بات کی توقع کی تھی۔ تکرار کے بعد چند لمحوں کی ملاقات...... کیا اس تعلق کا پیش خیمہ بن سکتی تھی؟ باتیں بھی غیر معمولی نہ تھیں، جو عام دوستوں میں نہ ہوتی ہوں۔ نہ حد تجاوز کرتا کوئی مذاق اور نہ ہی اخلاقیات سے آگے کی باتیں۔ پھر کیسے......؟

''وہ کیسے اسے چاہ سکتی تھی؟ اس سے ایک بار پوچھا تو ہوتا۔ ایک بار باتوں ہی باتوں میں کہا تو ہوتا'' دل نے برجستہ سوال کیا تھا۔ پھر خود اپنا عکس سامنے دیکھائی دیا۔ وہ بھی تو یک طرفہ محبت کا شیدائی تھا۔ حاعفہ بھی اس کے بارے میں ایسا ہی گمان کرتی ہوگی۔ کیوں میں نے محبت کرنے سے پہلے اس سے نہیں پوچھا؟

محبت...... وہ پہلی بار حاعفہ کے بارے میں یہ لفظ استعمال کرنے میں تذبذب کا شکار ہوا تھا۔ آنکھیں اپنے گریبان میں جھانکنے لگیں۔ یہ کیسی محبت ہے؟ جس میں کبھی وہ احساس اجاگر نہیں ہوگا جیسا شاید اب ہو رہا تھا۔ آنکھیں دھیمی روشنی میں چندھیا سی گئی تھیں۔

''اریب...... اریب......'' ایک آواز سماعت میں گونجی مگر وہ اس سے بے گانہ تھا۔ ان لفظوں کی حقیقت ڈھونڈ رہا تھا جن کا کوئی آسمان نہیں تھا۔ زمین بھی بنجر تھی۔ احساس نامی کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ساقی روٹھا تھا تو آب بھی آنکھیں چرا رہا تھا۔ آفتاب کی بے رخی سامنے تھی

اور چاندنی میں بھی عجب وحشت طاری تھی۔ خیالات کا بھنور ریگستان میں بھٹکتا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کوئی منزل تھی اور نہ ہی کوئی ہمنوا۔ بس سامنے ایک گمنام راستہ تھا۔ جس کے اختتام پر دو عکس دکھائی دے رہے تھے۔ دونوں جانے پہچانے تھے۔ ایک عکس اپنے پاس بلا رہا تھا اور دوسرے کے پاس جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کا ذہن سکڑتا چلا گیا۔ بلینک کالز بھی اسے اتنا ڈسٹرب نہیں کرتی تھیں جتنا آج وہ ڈسٹرب ہوا تھا۔ بظاہر سادہ سے الفاظ اپنے اندر ایسی بے تابی سموئے تھے۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ شاید اب وہ حاعفہ کی کیفیت سمجھ سکتا تھا۔ اس کے دل پر کیا گزرتی تھی جب وہ اپنی محبت کا اظہار کرتا تھا۔ اس کے قریب جانا چاہتا تھا۔ اسے اپنانا چاہتا تھا۔ چاہت کے جزیروں پر خواہشوں کے محل کی تعمیر چاہتا تھا جبکہ اس جزیرے کی مٹی اس محل کے بوجھ سے دم توڑ رہی تھی۔ پھر بھی خاموش تھی۔ چپ چاپ اس بوجھ کو سہہ رہی تھی۔

''حاعفہ......'' اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کسی کو چاہنا جبکہ اس کے دل میں آپ کے لئے کوئی جذبات نہ ہوں کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے؟ وہ محسوس کر سکتا تھا۔

''ہانیہ......'' جسے دیکھتے ہی دل میں نفرت کا جذبہ پروان چڑھا تھا۔ جس سے دوستی کرنا بھی دل نے گوارا نہ کیا تھا۔ جس کو اصل نام سے پکارنے کی بجائے گھٹیا...... کم ظرف...... جیسے خطابات سے نوازا گیا تھا۔ اس کے لئے چاہت کا جذبہ ابھارنا کس قدر تکلیف دہ ہے۔ شاید کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

''کامیش......'' ہر خیالات کی نفی ہوتی چلی گئی۔ کامیش کے جذبات آج اس کے سامنے تھے۔ اس کی پیشانی پر آخری بار پڑھی جانے والی لکیر کا مطلب آج وہ سمجھ چکا تھا۔ جس نیکی کو وہ کمانا چاہتا تھا۔ شاید وہ ہانیہ کے حصے میں لکھی تھی۔ ہانیہ کی محبت ہی اسے گمراہی سے سیدھے راستے پر لانے کی جستجو میں تھی۔ عشقِ مجازی کی خاطر وہ انجانے میں عشقِ حقیقی کی طرف گامزن تھا۔ اس کے لبوں پر بظاہر مہر تھی مگر وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

''اریب تمہیں بابا جان کب سے بلا رہے ہیں۔ تمہیں سنائی نہیں دیتا؟ ابھی سے انڈو کے بارے میں سوچنے بیٹھ گئے؟'' یہ جبیں کی آواز تھی۔ اس کے سامنے کھڑے ہوتے اس نے شانوں کو جھنجوڑا تھا۔

''کیا ہے؟ ایسے کیوں کندھا جھنجوڑ رہی ہو۔ کندھا الگ کرنے کا ارادہ ہے کیا؟'' اس نے منہ بسوڑ کر جملہ کسا تھا اور ساتھ ہی اپنے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا مسلا۔

''اُفف......توبہ ہے اریب...... ہاتھ لگانے سے کندھے الگ ہونے لگے تو دنیا تو بس گئی......'' اس نے طنزیہ کہا اور ناک سکیڑ کر اپنا بالوں کو جھٹکا تھا۔

''ویسے بابا جان نے تمہیں اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ اس لئے آئی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ پلٹی۔ اریب بھی اپنے خیالات کو کوزے میں بند کئے کھڑا ہوا۔

''انڈو جا کر اس جبیں کی بچی سے تو جان چھوٹے گی'' وہ بھنبھنایا تھا مگر جبیں کے کان بھی غیر معمولی طور پر تیز تھے۔ جھٹ پلٹی۔

''یہ تو اب خواب بن گیا ہے تمہارا'' اس نے معجّل جملہ مکمل کیا اور استہزائیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ اریب کو ایک جھٹکا لگا۔ یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔

''بابا جان! اتنی جلدی؟ مگر کیسے؟ ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ صرف دو ہفتوں بعد؟ آپ تو جانتے ہیں ابھی تو میری جاب سٹارٹ ہوئی ہے۔'' حسام جہانزیب کے سامنے وضاحت کر رہا تھا جب اریب وہاں آیا تھا۔ سحر فاطمہ حسام کے عقب میں کھڑی تھیں۔ جبیں ڈریسنگ پر بیٹھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ جہانزیب کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ تذبذب کا شکار رہا۔ حسام بچوں کی طرح ضد کر رہا تھا۔ جیسے کوئی من چاہی چیز پانے کی عرضی پیش کر رہا ہو۔

''یہ فیصلہ میرا نہیں ہے حسام...... اس لئے میں کچھ نہیں کر سکتا'' انہوں جیسے اپنے ہاتھ کھڑے کر لئے تھے۔ اریب دو قدم مزید آگے بڑھا۔ استفہامیہ آنکھوں سے حالات کو ٹٹولا مگر جب کچھ سمجھ نہ آیا تو استفسار کیا۔

''یہ بھائی کس بارے میں بات کر رہے ہیں؟'' اس نے جہانزیب کی طرف رخ کیا تھا۔

''اچھا ہوا اریب تم آ گئے۔ اب تم ہی سمجھاؤ بابا جان کو'' اریب کی آواز سنتے ہی حسام پلٹا اور اریب سے مخاطب ہوا۔ پیشانی کی لکیریں اور اضطرابی کیفیت سمجھنے میں اسے ذرا دیر نہ لگی۔

''میں ابھی شادی کے لئے تیار نہیں ہوں۔ مجھے آگے بڑھنا ہے۔ زندگی میں اپنا مقام بنانا ہے۔ اپنے بل بوتے پر کچھ کر کے دیکھانا ہے۔ اگر ایسے میں شادی کر کے ذمہ داریوں کے بوجھ کو اپنے اوپر کیسے برداشت کر سکتا ہوں؟'' وہ تلملائے ہوئے انداز میں کہہ رہا تھا مگر وہ تو جیسے کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ بات حسام کی شادی کی ہو رہی تھی۔ سپنے خود کے ٹوٹتے دیکھائی دے رہے تھے۔ ایک بار پھر باہر جانے کا راستہ دھیرے دھیرے بند ہو رہا تھا۔ وہ مورت کی طرح کھڑا حالات کو سمجھنے کی کوشش میں تھا۔

''اریب...... کچھ تو کہو'' اس نے اریب کے شانوں کو جھنجوڑا تھا۔ جسم میں ایک جھرجھری ہوئی۔ کرچیاں بکھرتی چلی گئیں۔ اس نے استفہامیہ انداز میں جہانزیب کی طرف دیکھا تھا۔ سچ سامنے تھا۔ راستہ واقعی بند ہو چکا تھا۔ دھیرے سے گردن سحر فاطمہ کی طرف گئی تو وہ نگاہیں چرا رہی تھیں۔

''اریب......!!'' جہانزیب کچھ کہنے کے لئے آگے بڑھے وہ نفی میں گردن ہلاتا ہوا پیچھے کی طرف کھسکا۔ جبیں چونکی۔ حسام بھی حیرت کا شکار تھا۔ اریب کی طرف دیکھا تو وہ باہر جاتا دیکھائی دیا۔ اپنا دکھ ابھول کر وہ اسے جاتا تک رہا تھا۔ سحر فاطمہ کے چہرے پر تفکر کے تاثر ابھرے۔

''اریب کو کیا ہوا؟'' جبیں نے حیرت سے کہا تھا۔

"کچھ نہیں ہوا، بس انڈو نہ جانے کی وجہ سے موڈ آف ہوگیا۔ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا" جہانزیب نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ ان کے لہجے میں ذرا بھی ملال نہ تھا۔

"لیکن بابا جان! آپ ایک ساتھ دو دو دل کیسے توڑ سکتے ہیں؟" اس بار حسام نے مزاحمت کی تھی۔ جہانزیب کی گھورتی آنکھیں بنا تسلسل کے اس کے وجود کا حصار کیے ہوئے تھیں۔ سحر فاطمہ بھی خاموش تھی۔ ظاہر ہے وہ راضی تھیں مگر وہ راضی نہ تھا۔ یوں اچانک کمرے میں بیٹھے بیٹھے اسے خبر ملے کہ دو ہفتوں بعد اس کا نکاح ہے۔ حیران ہوتا تو بنتا تھا۔ خاص طور پر حسام کے لئے تو بالخصوص۔ وہ اگرچہ صبا کو چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ کسی لڑکی کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا لیکن ابھی سے اس رشتے میں بندھ جانا، اس کے لئے کسی امتحان سے بھی کم نہ تھا۔ ابھی تو اس نے پچیس بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں۔ اتنی ینگ ایج میں شادی ہو جانا اس کے لئے شاید معیوب تھا۔

دوسری طرف اریب کا حالِ دل بھی کچھ الگ نہ تھا، بنا کہے وہ سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ حسام کی شادی، انڈو جانے کا راستہ بند ہونا، شادی کا بہانہ، سب کیا کہیں گے کہ بڑے بھائی کی شادی ہے اور چھوٹا بھائی انڈو بیٹھا ہے؟ وغیرہ وغیرہ...... وہ کمرے میں آتا ہی غضب ناک دیکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے ایک عرصے تک آنسو بہاتی رہی ہوں۔ نگاہیں بیڈ پر رکھے سوٹ کیس کی طرف گئیں تو جیسے اپنی ارمان کا بہتا دریا یاد آیا۔ عجلت سے وہ سوٹ کیس اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ اس کی حالت کسی مجنوں کی طرح تھی۔ سارے کپڑے فرش پر بکھر گئے۔ بال پیشانی پر بکھرے تھے۔ آنکھیں غم بیان کر رہی تھی۔ وہ دھڑام سے اوندھے منہ بیڈ پر جا گرا اور تکیے کو سر پر رکھ کر اپنا سر ڈھانپ لیا۔ چادر کی شکنیں مسلسل بڑھتی جا رہی تھیں۔ موبائل میں ایک بار پھر رنگ ہوئی مگر اسے کہاں سنائی دینی تھی۔ اس نے تکیہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

ساری رات وہ ایسے ہی پیٹ کے بل لیٹا رہا۔ بلیو جینز اور وائیٹ شرٹ میں وہ دنیا سے بے نیاز دیکھائی دے رہا تھا۔ پاؤں میں بوٹ ابھی تک تھے۔ جب عکاس اس کمرے میں داخل ہوا تو ایک پل کے لئے ٹھٹک سا گیا۔ ہر شے بکھری پڑی تھی۔ سوٹ کیس وارڈروب کے سامنے بے یار و مددگار تھا۔ کپڑوں کا حشر نشر تھا۔ اریب پر نگاہ دوڑائی تو وہ بھی تکیہ کے نیچے منہ اڑسے بے سدھ سویا ہوا تھا۔ اپنی لائیٹ پنک شرٹ کی آستینیں چڑھاتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بیڈ پر آ بیٹھا۔ اریب ابھی تک ان سب سے ناآشنا تھا۔

"اریب...... اریب...... تم ٹھیک تو ہو؟" عکاس کو کچھ فکر لاحق ہوئی تھی۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اریب کو اٹھانا چاہا تھا۔ الارم کلاک کی طرف نگاہ دوڑائی تو صبح کے نو بج چکے تھے۔ سورج کی کرنیں بنا کسی اوٹ کے کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔ اس نے غصے میں کھڑکی بھی بند نہ کی۔ رات بھر سرد ہوائیں اس کے کمرے کا رخ کیے رہیں۔ عکاس کے بار بار پکارنے پر اس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ تکیے پر گرفت کمزور ہوئی تو وہ زمین پر جا گرا۔ گردن گھما کر پیچھے کی طرف دیکھا تو عکاس کو اپنے ساتھ ہی بیٹھا ہوا پایا۔ وہ متجل اٹھ بیٹھا اور اپنی آنکھوں سے لبوں تک جاتے سفید خشک راستوں کو عجلت کے ساتھ پونچھا۔ عکاس اس کی چہرے کو دیکھ کر حیران تھا۔ وہ مسلسل اپنی

آنکھوں کی سرخی چھپانے کی سعی کر رہا تھا۔ کبھی ہاتھ کی پشت رخسار پر پھیرتا تو کبھی آنکھ صاف کرنے کی غرض سے انہیں مسلتا۔ عکاس نے گہری نگاہ ڈالی۔

''تم روتے رہے ہو رات بھر؟'' اس نے ایسے سوال کیا جیسے کوئی بڑا کسی چھوٹے بچے سے پوچھتا ہو جس کو من چاہی شے نہ ملی ہو۔ ٹھوڑی سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔

''نن نہیں تو......'' اس نے ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ سچ بتا کر بھی کیا حاصل ہو سکتا تھا؟ پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ جو دل پر گراں تھی مگر اسے ایسے ہی پیش آنا تھا۔

''پھر یہ سامان ایسے کیوں بکھرا ہوا ہے؟ تم نے پیکنگ نہیں کی کیا؟ آج رات کی فلائیٹ ہے'' عکاس نے وضاحت طلب کی تھی۔

''یہ......سامان......'' وہ ایک لمحے کے رکا۔ شاید کوئی بہانہ تراش رہا تھا۔ تبھی نگاہ کھڑکی کی طرف گیا۔ وہ دفعتہً اٹھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ کر پردے سامنے کیے۔

''میں نے سوٹ کیس کا ڈھکن بند نہیں کیا تھا ناں......بس اس لئے۔ ہوا کے تیز چلنے کے سبب بکھر گئے۔'' اس نے اذیت کے ساتھ مسکرانا چاہا تھا مگر وہ تو کرچیوں کی مثل بکھر چکا تھا۔

''اچھا......تو پھر جلدی سے پیکنگ کر لو'' یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اٹھا۔ جس پر وہ متجل پلٹا۔

''آئی ایم سوری بھائی۔ میں نہیں جا سکوں گا آپ کے ساتھ'' اس نے آگے بڑھ کر معذرت خواں لہجے میں کہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تم نہیں جا سکتے؟ پہلے تو تم اتنے اتاولے ہو رہے تھے اور اب جب ٹکٹ اور ویزہ کنفرم ہو چکا ہے تو عین ٹائم پر نہ جانے کا جواز؟'' عکاس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ شکنیں بھی ابھری تھیں۔

''دراصل فارث نائیٹ بھائی کا نکاح ہے۔'' اس نے دھیمے لہجے میں اپنے برسوں کی پہیلی کے منتشر ہو جانے کا جواب بتایا تھا جبکہ عکاس کا چہرہ کوئی اور ہی تاثر دے رہا تھا۔ غیر یقینی انداز غالب تھا۔

''کیا؟ تم سچ کہہ رہے ہو؟'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھوں کو جھنجوڑا تھا۔ جواب میں اس نے فقط گردن اثبات میں ہلائی تھی۔

''یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ بہت بہت مبارک ہو۔ انکل آنٹی نے تو مجھے بتایا ہی نہیں اور حسام......وہ تو بہت ہی چھپا رستم نکلا۔ ابھی جا کر اس کی خبر لیتا ہوں۔'' وہ واپس پلٹا تھا مگر اریب کا بجھا ہوا چہرہ دیکھ کر رک گیا۔ وہ اس خفگی و یاسیت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''اوہ تو تم اس لئے اداس ہو کہ بھائی کے نکاح کے لئے اتنا کم ٹائم ملا؟'' اس نے اریب کی ناک کو مکھی اڑانے کے انداز سے چھوا تھا۔ جس پر وہ اذیت کے ساتھ مسکرا دیا۔

''یا پھر اس لئے کہ تمہاری ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی اور بڑے بھائی کی شادی ہونے چلی'' عکاس نے مزاح کے انداز میں اس کے شانوں کو جھٹکا دیا جس پر دل سے ہنس دیا۔ یہی تو اریب کی خاصیت تھی۔ پل بھر میں موسم کی طرح انگڑائی لیتا تھا۔ شدید غصے کی حالت میں بھی کوئی معمولی سی بات اس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر دیا کرتی تھی۔

''بھائی......ایسی بات نہیں ہے'' اس نے گردن جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔ افسردگی غائب ہو چکی تھی۔

''ایسی ہی بات ہے۔ میں ذرا کہتا ہوں انکل آنٹی کو جا کر کہ اپنے چھوٹے بیٹے کے بارے میں بھی سوچ لیں ذرا۔ آخر حسام کے بعد اسی کا نمبر ہے''

''میری شادی کے لئے آپ اتنے اتاول کیوں دیکھائی دے رہے ہو؟'' اس نے بھی اپنی بانہیں سینے کے گرد سمیٹ کر پوچھا تھا۔

''وہ اس لئے تا کہ تمہارے بعد میرا بھی نمبر آجائے'' عکاس کی بات پر وہ دل کھول کر ہنس دیا تھا۔ چہرے پر افسردگی کے بچے کچے تاثر بھی غائب ہو گئے۔

''ہنستے رہا کرو...... مسٹر...... کچھ چہرے بجھے ہوئے بالکل بھی اچھے نہیں لگتے'' آخر میں اس نے سنجیدگی سے کہا تھا۔ پلکیں جھپکا کر اس نے یقین دہانی کرائی تھی۔

☆......☆......☆

ہم کشتگانِ عشق ہیں ابرو و چشم یار

سر سے ہمارے تیغ کا سایہ نہ جائے گا

وہ پہلی بار اس بستی کی طرف آیا تھا۔ اسلام آباد میں رہتے ہوئے اس نے کبھی اس علاقے کا رخ نہ کیا تھا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ اسلام آباد کے مضافات میں شمار کیا جاتا تھا۔

''یونیورسٹی سے کتنا دور یہ ہے علاقہ'' اس نے خود سے کہا تھا۔ گلیاں کچی تو نہ تھیں مگر سفید پوش کالونیوں کا مقابلہ کی بھی صلاحیت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ جانے کیوں اس طرف آیا تھا؟ ہاتھ میں ایک شادی کارڈ تھا۔ کار کو وہ سڑک پر ہی پارک کر چکا تھا۔ کئی بچے ادھر ادھر کھیلتے دیکھائی دے رہے تھے۔ لکڑی کے دروازے بھی عجیب و غریب دیکھائی دے رہے تھے۔ اسے اپنے بوٹ بھی میلے ہوتے دیکھائی دے رہے تھے۔ سیاہی تو ماند ہو ہی چکی تھی۔ بس پینٹ کا نچلا حصہ بارش کے پانی میں بھیگ رہا تھا۔ کل کی بارش نے کئی نشیبی علاقوں میں پانی بھر دیا تھا۔

''گلی تو یہی بتائی تھی کامیش نے۔ اب خدا کرے یہی گھر ہو'' وہ ایک پرانے سے گھر کے آگے ٹھہرا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور ذرا سائیڈ میں کھڑا ہوا۔ ارد گرد کا جائزہ لیا تو سامنے کریانہ کی دکان تھی جس کے آگے ایک تخت تھا جس پر کئی بزرگ بیٹھے تھے اور مسلسل اسے گھور رہے تھے۔ شاید انہیں یہ اجنبی لگا تھا۔ اس کا لباس بھی کچھ علاقے سے میل نہ کھاتا تھا۔ برانڈڈ شرٹ کی چمک دمک راہ چلتے نوجوانوں کو بھی

اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور پھر کستوری جسم پر جاذب نظر چہرہ بھی ہر آنکھ کو بھا رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ کئی لڑکیاں اپنے گھروں کی کھڑکیوں میں سے اسے تاک رہی ہیں۔ شاید وہ ان کے لئے کسی مجسم سے کم نہ تھا یا پھر ٹی وی پر آنے والا کوئی کردار؟ اس نے نظریں جھکا کر اسی دروازے کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ دروازہ بدستور بند رہا۔ دوبارہ کھٹکھٹایا گیا۔

''کیا ہیرو ہے؟'' ایک آواز سماعت سے ٹکرائی۔ اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ نظریں جھکا کر کالر کو سیدھا کیا۔ آنکھیں زمین بوس ہوتی جارہی تھی۔ شاید اس نے یہاں آکر غلطی کی تھی۔ دل بھی تذبذب کا شکار تھا۔

''کون ہے؟ صبر نہیں ہوتا۔'' اندر سے کوسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ خوشی کی ایک لہر دوڑی۔ گہری سانس لی گئی۔ دروازہ کھلا تو ہانیہ سامنے کھڑی تھی۔ وہ اسے یہاں قطعاً گمان نہیں کرسکتی تھی۔ ہاتھ دروازے پر ہی اٹکا رہ گیا۔ آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ زندہ مجسم تھی۔

''تھینک گاڈ تم آگئیں...... ورنہ لوگوں کی نظریں تو مجھے مار ہی ڈالتیں۔'' اس نے معجل جملہ مکمل کیا تھا اور بنا اجازت کے اندر چلا گیا۔ ہانیہ ابھی تک شاک میں تھی۔

''اریب اور میرے گھر؟'' ہکلاتے ہوئے اس نے زیر لب کہا۔ اریب کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ شاید اسے پوچھ کر اندر آنا چاہیے تھا مگر وہ لوگوں کی نظروں سے اس قدر گھبرا چکا تھا کہ وہ جلد سے جلد وہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ لوگ اس کو گھور کر مار ہی ڈالیں گے۔

''آئی ایم سوری...... میں نے تم سے اندر آنے کا نہیں پوچھا'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ اریب کے لفظوں نے اس میں جان ڈال دی۔ تکلف برتتے ہوئے اس نے معجل دروازہ بند کیا۔ بالوں کو سیٹ کیا جو چہرے پر بکھرے جارہے تھے۔ لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ کو جگہ دی۔ کمرے سے زلیخا بی بی آئیں تو حیرت سے اریب کے بابت استفسار کیا۔ ہانیہ نے معجل اریب کا تعارف کروایا اور اسے اپنے کمرے کی طرف لے گئی۔ وہ بھی نظریں جھکائے تذبذب بھرے انداز میں چل رہا تھا۔ لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ تھی جو وہ بڑی مشکل سے ابھارے ہوئے تھا۔ پاکیزہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس نے محض اریب کی پشت دیکھی تھی۔ زلیخا بی بی گردن جھٹک کر آگے بڑھ گئیں۔

''بیٹھو۔ تم۔۔ میں تمہارے لئے ابھی کولڈ ڈرنک لاتی ہوں'' وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی۔ معجل انداز میں بیڈ شیٹ کی سلوٹیں نکالیں۔ اریب ہچکچاتے ہوئے وہاں براجمان ہوا۔ کارڈ کو سائیڈ پر رکھا۔ نفی میں گردن ہلانا چاہی مگر وہ کہاں دیکھ سکتی تھی۔ پاکیزہ نے چولہے کے پاس اس کے بارے میں دریافت کیا تو وہ خوشی کے سبب کچھ بول ہی نہ سکی۔ لہراتے آنچل کے ساتھ جلدی سے ایک گلاس اٹھایا۔ فریج سے ایک کوک نکالی جو خوش قسمتی سے اس نے آج ہی اپنے لئے منگوائی تھی۔

''کلاس فیلو کی اتنا آؤ بھگت؟ معاملہ کچھ اور تو نہیں'' پاکیزہ نے ہانیہ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا تھا۔ جواب میں وہ مسکرا دی اور

وہ گلاس اریب کے سامنے پیش کر دیا۔

''اس کی ضرورت نہیں تھی تمہیں۔ وہ تو میں بس......'' اس نے کارڈ کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا تھا مگر اس نے زبردستی وہ کولڈ ڈرنک کا گلاس تھما دیا۔ خاموشی کا تسلسل دونوں کے درمیان کافی دیر تک رہا۔ وہ کن انکھیوں سے کمرے کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔

''کتنا خستہ حال کمرہ ہے۔'' اس نے دل میں سوچا تھا مگر لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ پھیلائے رکھی۔ وہ بھی کھڑکی کے ساتھ پشت لگائے کافی دیر تک کھڑی رہی۔ اپنے آنچل کو انگلیوں میں مڑوڑتے ہوئے یک ٹک اریب کے چہرے کو تک رہی تھی۔ جانے کیوں وہ اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ دل میں اترنے لگا۔ آنکھوں کو بھانے لگا تھا۔ خوابوں کا نشیمن لگا تھا۔ محبت کا پیکر لگا تھا۔ اریب بھی اس حدت کو محسوس کر سکتا تھا۔ آنکھیں اٹھائیں تو نگاہوں کو اپنے اوپر مرکوز پایا۔ زبردستی مسکراتے ہوئے وہ متجل کھڑا ہوا۔ گلا کھنکارا تو وہاں پاکیزہ بھی آموجود ہوئی تھی۔

''آپ تو شاید باہر جانے والے تھے۔ ہانیہ نے بتایا تھا آپ کے بارے میں۔'' پاکیزہ نے بات شروع کرنے کی غرض سے کہا تھا۔

''جی بالکل، بس بھائی کے نکاح کی وجہ سے مجھے اپنا پلان کینسل کرنا پڑا۔ یہاں بھی ہانیہ کو شادی کا کارڈ دینے آیا تھا۔ آیئے گا ضرور'' اس نے ہانیہ کی طرف کارڈ بڑھایا تو انگلیاں آپس میں مس ہوئیں۔ پیار کا پہلا احساس جسم میں سرایت کرنے لگا تھا۔ آنکھیں جھیل آنکھوں میں اترتی چلی گئیں۔

''اچھا اب میں چلتا ہوں'' وہ دوبارہ مسکرایا اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ باہر زلیخا بی بی چولہے کا انتظام سنبھالے ہوئے تھیں۔ آلو زمین پر بکھرے تھے۔ دھنیا اور مرچیں پاؤں کو مس ہو رہی تھیں اور وہ چھری سے پیاز کا چھلکا اتار رہی تھیں۔ اریب کو اس ماحول سے کوفت محسوس ہوئی۔ چہرے پر ناگواری کے تاثر ابھرے اور جبراً مسکراتا ہوا باہر چل دیا۔

''ہانیہ تو سچ میں مجھے چاہنے لگی ہے۔ اس کی آنکھیں...... اس کا انداز...... سب کچھ کتنا بدلا بدلا سا تھا۔'' کار میں بیٹھتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ بھینی بھینی خوشبو اس کے لئے جنت کا سا سماں پیش کر رہی تھیں۔ آنکھیں بند کیں تو ہانیہ کا معصومانہ چہرہ لہرایا۔

''نہیں...... یہ میں کیا سوچ رہا ہوں...... آئی ڈانٹ کیئر ہر لو...... شی از جسٹ مائے فرینڈ...... فرینڈ؟ (مجھے اس کی محبت کی کوئی پرواہ نہیں۔ وہ محض میری دوست ہے۔ دوست؟)'' وہ خود اپنے الفاظ پر حیران تھا۔ دوستی کا لفظ وہ کیسے استعمال کر سکتا تھا؟ کلاس فیلو اور دوست میں بہت فرق ہوتا ہے اور اس نے چند لمحے کیا اس کے ساتھ گزار لئے کہ دوست لفظ کی حق دار بن گئی۔

''میرے یار! دوستی محبت کی پہلی سیڑھی ہے'' کامیش کا رومانوی انداز اس کے سامنے تھا۔ جو وہ لڑکیوں کو دیکھتے ہی استعمال کرتا تھا۔ جسم میں ایک لہر سرایت کر گئی۔ وہ واقعی اب اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

چھوڑ جاتے ہیں دل کو تیرے پاس

یہ ہمارا نشان ہے پیارے

دن تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اریب بھی حالات کے ساتھ سمجھوتا کر چکا تھا۔ جبیں کو بھی عکاس کی غیر موجودگی میں آزادی محسوس ہوئی۔ کم سے کم وہ چھ مہینے تو اپنی شکل اسے نہیں دیکھائے گا۔ سحر فاطمہ اور جہانزیب شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ صرف دو ہفتے میں شادی کی تیاری کرنا ان کے لئے ایک بہت بڑا ٹاسک تھا۔ حسام بھی پہلے پہل تو افسردہ تھا لیکن پھر اسے بھی حالات کے آگے سمجھوتا کرنا پڑا۔ اب زندگی کا اتنا اہم ایونٹ وہ موڈ آف کے تو گزار نہیں سکتا تھا۔ آخر بندے کی شادی بھی تو ایک بار ہی ہوتی ہے۔ ہاں دوسرا موقع بھی مل سکتا ہے مگر وہ خوش قسمت ہی ہوتے ہیں یا پھر۔۔۔!!!

حسام کی شادی کے تین ایونٹ طے پائے گئے۔ پہلا مہندی اور ابٹن کا دوسرا نکاح کا اور تیسرا ولیمے کا۔ اس سلسلے میں پوری فیملی پر جوش دیکھائی دے رہی تھی۔ خواتین تو اپنی تیاریوں میں ہی مصروف تھیں اور ان میں جبیں پیش پیش تھی۔ حاعفہ ان سب سے دور رہنا چاہتی تھی لیکن جبیں ایسا کیسے ہونے دے سکتی تھی؟ جہاں جاتی حاعفہ کو اپنے ساتھ لے لیتی۔ چاہے وہ جانا چاہتی یا نہیں۔ اسے تو ہر وقت حاعفہ کا ساتھ چاہیے تھا۔ چاروناچار اسے قرآن اکیڈمی سے کچھ چھٹیاں لینی پڑیں۔ سب سے پہلے ڈریسز کا معاملہ پیش تھا۔ جبیں تو اپنے بھائی کی شادی کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک لباس چاہیے تھا۔ ایسا لباس جسے پہن کر ہر آنکھ عش عش کرا ٹھے جبکہ حاعفہ کا معاملہ کچھ الٹ تھا۔ وہ عام کپڑوں میں بھی خوش تھی۔

"پاگل ہوگئی ہو کیا؟ میرے بھائی کی پہلی شادی ہے اور تم اتنے سادہ سے سوٹ پہنو گی؟ کبھی نہیں" جبیں فوراً اس کے خیالات کی تردید کر دی۔

"پہلی سے تمہارا کیا مطلب؟ یہ میری پہلی اور آخری شادی ہے۔ سمجھی" حسام نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جس پر وہاں موجود سب ہنس دیئے۔ خود حاعفہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ ابھری تھی۔ جسے دیکھنا کا شوق ہمیشہ اریب کو رہتا تھا لیکن وہ اب اسے مسلسل اگنار کر رہا تھا۔ یہ بات خود حاعفہ کے علاوہ گھر والوں نے بھی محسوس کی۔

"مہندی کے لئے سفید جھالروں والی فراک، ابٹن کے لئے پیلے رنگ کی شرٹ، بارات کے لئے سرخ اور سبز رنگ کا لہنگا اور ولیمے کے لئے پرپل رنگ کا لہنگا" جبیں نے ہر فنکشن کے لئے رنگوں کا انتخاب کر لیا۔ اب بس مارکیٹ سے یہ لباس خریدنے باقی تھے۔

"ایک منٹ...... مہندی اور ابٹن ایک دن ہے۔ یہ دو کلر کے سوٹ کیوں؟ تم نے کیا سوٹ ہی چینج کرتے رہنا ہے؟" اریب نے ہمیشہ کی طرح اپنی ٹانگ اڑانا فرض عین سمجھا تھا۔

"یہ میرا مسئلہ ہے۔ تم اپنی فکر کرو" ناک سکیڑ کر جوابی حملہ کیا گیا تھا۔

''توبہ تم لڑکیوں کے چونچلے۔ بھائی کی شادی ہے تمہاری نہیں۔'' دوسرا جوابی حملہ اریب کی طرف سے تھا۔

''جبیں نے تو اپنی پسند بتادی ہے۔تم کس رنگ کے ڈریسز خریدو گے؟'' جہانزیب نے اریب سے پوچھا تھا۔

''مجھے کسی اور کی طرح مغز خوری کرنے کا کوئی شوق نہیں۔شاپ میں جو پسند آیا۔بس وہی خریدلوں گا'' ضرب عین نشانے پر لگی تھی۔وہ غصے سے لال پیلی ہوگئی۔حاعفہ نے اس کا بازو کھینچا تا کہ بحث مزید نہ بڑھے مگر ناک منہ چڑھا کر وہ جواب تو دے ہی چکی تھی۔

''یہ شادی میری ہے اور کوئی میری پسند کیوں نہیں پوچھ رہا؟'' حسام نے کشن کو کمرے کے پیچھے سے نکال کر گود میں رکھا اور کہنیاں اس پر ٹکادیں۔

''بے فکر رہو جناب...... تمہارے لئے لباس کا انتخاب پہلے ہی ہو چکا ہے'' جہانزیب نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھ سے پوچھے بغیر؟'' اِس نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

''جی ہاں۔ابٹن اور مہندی میں تو تمہارا سفید کرتا پاجامہ ہوگا۔بارات کے لئے شیروانی صبا کے گھر والوں کی طرف سے آئے گی جبکہ ولیمہ کے لئے سحر فاطمہ پہلے ہی شیروانی آرڈر کر چکی ہے۔کل تک وہ بھی آجائے گی'' جہانزیب نے نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا تھا۔ سحر فاطمہ مسکرادیں جبکہ حسام کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''یہ کیا؟ شادی میری...... اور میں اپنی پسند کے ڈریسز بھی نہیں پہن سکتا۔دِس اِز ناٹ فیئر'' اس نے انگلی کے اشارے سے سب کو تنبیہ کی تھی۔

''آپ کی پسند کی بھابھی آرہی ہیں ناں۔یہ کافی ہے'' اریب نے مزاح کی طرف رخ موڑا تو حسام نے آنکھیں دکھائیں۔ پھلجھڑیوں سے ایک دوسرے کا دل بہلاتے رہے۔

جب حاعفہ کی بات آئی تو اس نے حتی امکان لائیٹ کلر کے ڈریسز خریدنے چاہے تھے مگر جبیں نے زبردستی بارات کے لئے شوخ رنگ کا لباس دلوا ہی دیا۔

''امیزنگ...... نائس کلر...... ڈارک براؤن...... لیکن جبیں...... تمہاری لسٹ میں تو یہ کلر شامل ہی نہیں تھا۔'' اریب نے ڈارک براؤن رنگ کا لہنگا دیکھتے ہی کہا تھا۔اس کے وہم وگمان میں بھی حاعفہ نہ تھی۔

''یہ میرا نہیں حاعفہ کا ہے لہنگا۔'' جبیں نے تصیح کروائی تھی۔اریب نے بناوٹی انداز اپنایا اور دوسرے ڈریسز پر نگاہیں دوڑائیں۔حاعفہ نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔

''اداس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔اگر تمہیں پسند نہیں آیا تو ہم کوئی اور لیتے ہیں'' جبیں نے حاعفہ کی خاموشی دیکھ کر کہا تھا جو دراصل اریب کی موجودگی کی وجہ سے تھی۔حاعفہ چونکی اور نفی میں سر ہلادیا۔

"نہیں....... مجھے پسند ہے یہ" اس نے معتجل جواب دیا۔ اریب کی نگاہیں برجستہ پلٹیں تھیں۔ جانے کیا احساس تھا؟ مدہم سا ترنم سماعت کے پردوں سے ٹکراتا ہوا بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ حاعفہ نے پہلی بار اس کی پسند کو اہمیت دیتے ہوئے وہ لباس پسند کیا تھا۔ وہ بھی آنکھیں پھیر کر مسکرا دیا تھا۔

جیولری کی شاپ پر بھی جبیں نے اپنی ڈھاٹ بٹھائی تھی۔ ایک کے بعد ایک جیولری کو چیک کیا۔ اریب اس دوران جینٹس شاپ پر گیا اور اپنے لئے لائیٹ بلیو کلر کا کرتا پسند کیا۔ کامیش بھی اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ وہ بھی اپنی شاپنگ ساتھ ہی کر رہا تھا۔

"ویسے کچھ عجیب نہیں لگے گا مہندی پر لائیٹ بلیو کلر؟ میری مان دونوں یہ پیلے رنگ کے کرتے پسند کرتے ہیں" چونکہ اس نے خود پیلا کرتا پسند کیا تھا۔ اس لئے وہ اسے بھی یہ لینے پر راضی کر رہا تھا۔ مگر وہ رنگ کچھ زیادہ ہی شوخ تھا۔ استہزائیہ انداز میں اس نے پناہ مانگی اور اپنے لئے یہی سوٹ سیلیکٹ کیا۔ کامیش کا چہرہ اتر چکا تھا۔ اس لئے اس نے بارات کے لئے ایک جیسی شیروانی پسند کی۔ گہرے نیلے رنگ کی شیروانی پر سنہری پٹی۔ دونوں کو پہلی آنکھ میں بھائی تھی۔ اب بس ولیمے کے لئے جوڑا سیلیکٹ کرنا باقی تھا مگر اس سے پہلے وہ دونوں جوتوں کی دکان پر گئے۔ ساتھ والی دکان پر حاعفہ اپنے لئے سینڈل پسند کر رہی تھی۔ جبیں نے تو لمبی ہیل ہی پسند کی تھی مگر وہ کترا رہی تھی۔

"اریب؟ یہ بھی میں اپنی پسند کا لے لوں؟" دونوں کا سائز تقریباً ایک جیسا تھا۔ اریب نے اثبات میں گردن ہلا دی اور یکسوئی کے ساتھ حاعفہ کو آئینے کی اوٹ سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بمشکل ایک انچ کی ہیل کو پسند کرنے میں کامیاب ہوئی تھی مگر اریب نے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

"نہیں جبیں، مجھے یہ پسند نہیں آئی" اریب کے پھیکے سے رنگ کو دیکھ کر اس نے فوراً وہ ہیل والی سینڈل پیچھے سرکا دی۔

"اُفف...... اتنی دیر بعد ایک سینڈل پسند آئی تھی۔ وہ بھی ناپسند کر دی۔ پتا نہیں کیا ہو گیا ہے تمہیں" جبیں نے حیرت سے کہا تھا۔ حاعفہ کا چہرہ بجھتا دکھائی دیا۔ اریب کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ انگلی کے اشارے سے اس نے شاپ بوائے کے عین پیچھے شوکیس میں رکھے ایک سینڈل کی طرف اشارہ کیا۔ حاعفہ کے کہنے پر وہ سینڈل سامنے رکھ دیا گیا۔ حاعفہ نے خود جائزہ لینے کی بجائے آئینے کی طرف وہ سینڈل بڑھائی تو اریب نے دھیمے لہجے میں ویلڈن کہا۔

"مجھے یہ پسند ہے بلیو کلر کی سینڈل" اس نے جبیں کی طرف اسے بڑھایا تھا۔

"تمہیں یہ پسند ہے یا پھر اریب کو؟" سحر فاطمہ نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔ تیکھی آنکھوں سے اریب کی طرف دیکھا تو وہ بری طرح ہڑبڑا گیا۔ بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے دھیان ٹالنا چاہا۔ سب مسکرا دیئے۔

"دور سے اشارے کرنے سے بہتر ہے پاس آ کر مشورہ دے دو" جبیں کہاں خاموش رہنے والی تھی؟ اریب نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور کامیش کو پکارتے ہوئے دوسری شاپ میں جا گھسا۔ حاعفہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

''لگتا ہے دوسری بھابھی کی تیاریاں بھی ساتھ ہی کر لیں'' جبیں نے دھیمے لہجے میں سرگوشی کی تھی۔ حاعفہ کے چہرے پر سرخی پھیلتی چلی گئی۔ گردن کو خم دے کر وہ ہلکا سا مسکرا دی۔

''اب جلدی سے سینڈل سلیکٹ کرو، پھر کاسمیٹکس کی شاپ پر بھی جانا ہے'' سحر فاطمہ نے یاددہانی کرائی تھی۔

☆......☆......☆

اب چاند بھی لگا ہے تیرے سے جلوے کرنے

شبہائے ماہ چندے تجھ کو چھپا رکھیں گے

تھکا دینے والے دن کے بعد ایک پرسکون رات کا آغاز ہوا تھا۔ اریب جیسے ہی بیڈ پر لیٹا تو حاعفہ کا مسکراتا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا تھا۔ پہلی بار وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائی تھی۔ جیسے کوئی شرمیلی دلہن اپنے ساجن کو پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ آنکھوں میں حیا کی ایک ڈوری تھی جو جانے انجانے میں اس سے بندھی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو سر کے نیچے رکھے اور گہری سانس لی۔ آنکھیں بند کیں تو تصویر کا دوسرا رخ نظر آیا۔ ہانیہ عمردراز...... چاہت کا اظہار کرتی...... اس کی آؤ بھگت کرتی...... اس کے لئے اپنی پلکیں راہوں میں بچھاتی...... اس کے وجود کو یک ٹک آنکھوں میں بساتی...... وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ پل بھر میں اس کی پیشانی پسینے سے شرابور ہو چکی تھی۔ تھوک نگلا تو پیاس محسوس ہوئی۔ دائیں جانب دیکھا تو جگ میں پانی نہ تھا۔ گہرے تاثر چہرے پر ابھارتے ہوئے اس نے کچن کی راہ لی مگر ہانیہ کا احساس اس کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔ فریج سے پانی نکالنے کے بعد وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھا۔ تمام لائٹیں تقریباً بجھی ہوئی تھیں۔ سٹور روم سے مدھم نیلی روشنی ٹی وی لاؤنج اور پھر ڈائننگ ٹیبل پر آڑی ترچھی کرنیں بکھیر رہی تھیں۔ پانی کا گلاس ہاتھ میں لے کر وہ کافی دیر اسے دیکھتا رہا۔ دماغ پر ہانیہ کا وجود حکمرانی کر رہا تھا۔ اکھڑ مزاج لڑکی، جس کے نزدیک صرف اپنی ہی ذات سب سے بڑھ کر تھی۔ کیسے اس کو چاہ سکتی تھی؟ جو بنا مطلب سے کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرے، ایسے کیسے کسی کو اپنا دل دے بیٹھے؟ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ شکنیں پڑھنے کی کوشش کی گئی تو وہاں بھی چاہت کا گلشن آباد پایا۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟ ہانیہ اور میں؟'' اس نے زیرلب کہا تھا۔ پانی کا گھونٹ پیا تو ہر سو روشنی پھیل گئی۔

''ہانیہ......!!!'' وہ یکدم پلٹا تھا۔ دماغ میں جو چہرہ تھا۔ لبوں پر اس کا نام جاری ہوا۔ حاعفہ یہ سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ خود اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

''وہ...... میں......'' اس نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر حاعفہ بنا کچھ کہے فریج کی طرف بڑھی اور ایک پانی کی بوتل لے کر پلٹ گئی۔

''میں اپنی کلاس فیلو کے بارے میں سوچ رہا تھا'' اس نے آگے بڑھ کر وضاحت پیش کی تھی۔ جس پر حاعفہ برجستہ پلٹی۔ لبوں پر گہری مسکراہٹ تھی۔ چہرہ بھی کھلا کھلا سا تھا۔ جیسے کوئی کنول کا پھول ہو۔

''میں نے وضاحت تو نہیں مانگی۔ ویسے شادی میں تو آرہی ہے ناں وہ۔ وہیں اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی'' سادہ سا جملہ تھا جس نے اریب پر گہری ضرب لگائی تھی۔ حاعفہ تو اپنے کمرے میں چلی گئی اور جاتے جاتے دوبارہ لائٹ آف کر گئی لیکن وہ اسی جگہ کھڑا رہا۔ جیسے کوئی شخص ساحل پر کھڑا کسی لہر کو پکڑنے کی جستجو میں ہو مگر وہ لہر اس کے قدموں کو بوسہ دے کر دوبارہ ان جانی منزل کی طرف پلٹ گئی ہو اور وہ شخص خالی ہاتھ منزل تکتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

وہ مستِ ناز تو مچلا ہے کیا جتایئے حال

جو بے خبر ہو بھلا اس کے تئیں خبر کریے

مہندی کی شب مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ کامیش بھی وہاں موجود تھا۔ ہانیہ کو آنے میں دیر ہو چکی تھی یا شاید اس نے آنا ہی نہیں تھا۔ اریب نے بھی فون کر کے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ جبیں اور حاعفہ کی بھی تمام سہیلیاں بھی عالمگیر ہاؤس میں موجود تھیں۔ حسام اپنے کمرے میں تیار ہو رہا تھا۔ سحر فاطمہ تیاریوں میں لگی تھیں۔ کبھی کسی کو ہدایات جاری کرتیں تو کبھی کسی کو۔ ماریہ کے ذمے ڈیکوریشن کے انتظامات تھے۔ جو اس نے بخوبی نبھائے تھے۔ زینے پر رنگ برنگی پھولوں کی لڑیاں تھیں۔ صوفہ سیٹ جو عموماً ٹی وی لاؤنج کے درمیان میں ہوتا تھا۔ اسے بھی ذرا سائیڈ پر کیا گیا تا کہ نئے سیٹ کی گنجائش بن سکے۔ جہانزیب عالمگیر اپنے بزنس پارٹنرز کے ساتھ ڈسکشن کر رہے تھے۔ ویٹران کے پاس سے کولڈ ڈرنک لے کر گزرا تو سب نے ایک ایک گلاس لیا۔

''تم ذرا فون دینا مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے'' اریب نے کامیش سے فون مانگا تھا۔

''تمہارا کہاں ہے؟'' اپنا فون دیتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

''لمبی کہانی ہے۔ بعد میں بتاؤں گا'' آنکھ کے اشارے سے اس نے کہا اور زینے کی پچھلی طرف چل دیا۔ کامیش کی شکنیں اریب کے اندر پکنے والی کھچڑی کو جاننے کے لئے بے تاب تھیں۔ کال کے بعد وہ دونوں حسام کے کمرے میں گئے اور خوب ہنسی مذاق کیا۔ اریب حسام کی ٹانگ کھینچنے کی کوشش کرتا تو حسام بھی کہاں پیچھے رہنے والا تھا اور پھر حسام کے دوست بھی تو وہاں موجود تھے۔ وہ بھی بڑھ چڑھ کر ہنسی مذاق کر رہے تھے۔

''اب اگر بیچلرز کا ہنسی مذاق ہو گیا ہے تو مہندی کے لئے نیچے تشریف لے جایا جائے؟'' جہانزیب نے کمرے کے دروازے پر ہی کہا تھا۔

''ویسے یہ آئیڈیا ہمیں پہلے کیوں نہ آیا؟'' حسام کے دوست شاہد نے کہا تھا۔ جو اس وقت سفید لباس میں ملبوس تھا۔ باقی بھی تقریباً اسی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھے سوائے کامیش اور اریب کے۔ دونوں کے ڈھنگ ہی نرالے تھے۔

"کیسا آئیڈیا؟" فہیم نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی بیچلر پارٹی کا......!!" شاہد نے پر جوش انداز میں کہا تھا۔ سب کے چہرے پہلے حیرت کا شکار ہوئے اور پھر خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ کامیش کا ووٹ بھی اس حق میں تھا۔ بس اریب اور حسام تھوڑا تذبذب کا شکار تھے۔

"انکل پلیز...... آپ کہیں ناں ان دونوں کو...... یہی تو دن ہوتے ہیں انجوائے کرنے کے۔ اس کے بعد کہاں یہ موقع ملے گا" کامیش نے درخواست کی جو کے قبول کر لی گئی۔ اثبات میں گردن کا ہلنا اس پارٹی کی اجازت کے لئے کافی تھی۔

"تھینک یو...... تھینک یو سو مچ انکل......" کامیش کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ ایسے خوش ہوا جیسے اس کے اپنے بھائی کی شادی ہو۔ اریب اور حسام کے چہرے بھی کھل اٹھے تھے۔ حالانکہ یہ ان کے لئے پہلا تجربہ تھا اس طرح کی کسی پارٹی میں جانے کا۔

"لیکن پہلے مہندی کی رسم...... چلو نیچے۔ مہندی اور ابٹن کے بعد جہاں دل چاہے پارٹی کر لینے لیکن یاد رہے زیادہ دیر نہ ہو" شاہد نے اثبات میں گردن ہلا دی اور یہ لڑکا پارٹی نیچے آ گئی۔ سحر فاطمہ تو اپنے بیٹے پر واری جا رہی تھیں۔ جبیں نے بھی خوب انجوائے کیا۔ حاعفہ نے کسی حصے میں پارٹ تو نہ لیا مگر دور کھڑے خوب انجوائے کیا۔ بس مہندی لگانے وہ سب کے درمیان ضرور آ موجود ہوئی تھی لیکن سکارف اپنے سر سے ہلنے تک نہ دیا۔ اریب بھی حسام کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ حاعفہ کو دیکھ کر مسکرایا اور نگاہیں چرانا چاہیں مگر وہ تو اس کی پیشانی پڑھ چکا تھا۔ دل میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے۔ نگاہیں دفعتہً جھک سی گئی تھیں۔ ایک نیا رشتہ اپنی بنیاد رکھ چکا تھا۔ جس کے لئے لاکھ دعائیں مانگیں۔ جس دل کو اپنے اندر سمانے کی خاطر وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ اُس دل کی دھڑکنیں بھی اب کسی اور کے لئے دھڑکنے لگی تھیں۔ آنکھوں کی شرارت آویزاں تھی۔ لبوں کی چاشنی دل میں اترنے کے لئے بے قرار۔

"اب تم کیوں اتنا شرما رہے ہو؟ تمہاری شادی نہیں ہے" کامیش نے چھیڑا تھا۔ جس پر وہ مسکرا دیا۔ دل کی کیفیت کی بھلا اسے کیا خبر؟ تبھی کچھ لمحوں بعد میوزک آن ائیر ہوا۔ سب حیران تھے کیونکہ ایسا کوئی بندوبست نہیں کیا گیا تھا۔ تمام لائٹیں بجھا دی گئیں سوائے مرکزی فانوس کے۔ جدھر سے مدہم سرخ و نیلی روشنی پورے لاؤنج میں پھیلتی جا رہی تھی۔ سب کی نظریں اس وجود کی طرف گئیں جہاں وہ روشنیاں جمع ہو رہی تھیں۔ وہاں کامیش تھا اور اس کے پیچھے حسام کے فرینڈز اکٹھے ہونا شروع ہو گئے۔ سب اسے حیرت سے تک رہے تھے۔

مہندی کی خوشبو سے، سانسوں پہ چھا جا رے

مہندی کی خوشبو سے، سانسوں پہ چھا جا رے

پورا لاؤنج تالیوں سے گونج اٹھا۔ ڈانس پرفامنس کی سٹارٹنگ ہی زبردست تھی۔ اریب بھی کھلکھلا اٹھا تھا۔ ایسے میں کامیش آگے بڑھا اور اسے ہاتھ سے کھینچ کر لاؤنج کے درمیان میں لے آیا۔ شروع میں تو وہ گھبرایا اور وہاں سے کھسکنے کی کوشش کی مگر کامیش نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جیسے ہی اگلے lyrics سنائی دی تو اس کا بھی جی چاہا کہ وہ بھی ایک دو سٹیپ کرے۔ شاید lyrics ہی دل کو

بھا جانے والے تھے۔

اے جانِ من ہم آئے، تجھ کو لینے
نذرانہ دل کا دینے، ہم تیرے ہو جائیں گے
یہی ہے...... ہے لگن، یہی ہے...... ہے لگن

ہاتھوں کے اشارے سوائے حاعفہ کے کس طرف ہو سکتے تھے؟ نگاہیں بھی اسی وجود کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھیں۔ حاعفہ کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔ بھلا دل کے شرارے تو وہ سمجھ ہی سکتی تھی۔ جبیں نے تو اس پرفانس کو خوب انجوائے کیا۔ ساتھ ساتھ حاعفہ کے کانوں میں سرگوشی بھی کرتی رہی۔

''یہ لفظ نہیں دل کی جذبات ہیں۔ سمجھو میری جان'' جب ایسے جملے کچھ زیادہ ہو گئے تو حاعفہ نے بھی اس کو چھیڑنے کی کسر اٹھا نہ رکھی۔

''تمہیں جلن ہو رہی ہے کہ عکاس بھائی تمہارے لئے ڈانس نہیں کر رہے'' بس ایک جملہ تھا جس نے اس کی ساری خوشی پھیکی کر دی۔ آنکھیں حاعفہ کو گھورنے لگیں تو اریب نے اس جلے بھنے وجود کے بابت دریافت کیا۔

''بس کوئی اپنے منگیتر کو یاد کر رہا ہے'' حاعفہ نے جبیں کو مزید زچ کیا تھا۔ اب بس چنگاری مل چکی تھی باقی کا کام اریب کا تھا۔

''سچی......!!'' کان کے پاس جا کر سرگوشی کی گئی تھی۔ وہ غصے میں پاؤں پٹخنے لگی تھی۔ زبان سے کچھ ادا ہونے جا رہا تھا کہ ایک آواز نے اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کیا۔

''بھئی میرے بغیر شادی کا کیا مزہ؟'' یہ عکاس کی آواز تھی۔ سب خوشی سے لپکے تھے۔ جبیں تو جل بھن کر راکھ ہو چکی تھی۔

''بڑی ہی لمبی عمر ہے'' وہ دل ہی دل میں بڑبڑائی تھی۔

''شوہر کی عمر لمبی ہی ہونی چاہیے'' حاعفہ نے سرگوشی کرتے ہی کھسکنے کی تھی۔ وہ بھی دبی آواز سے ہنس دی تھی۔

''سارے مزے کو کڑکڑا کر دیا اس عکاس بکواس نے آکر'' وہ پاؤں پٹختی وہاں سے چل دی۔

مہندی کے فنکشن کے بعد مہمان تو جا چکے تھے مگر بیچلرز وہیں جمع تھے۔ سحر فاطمہ نے منع کرنا چاہا مگر جہانزیب نے اجازت دے دی اور اب تو عکاس بھی آچکا تھا۔ جو محض شادی اٹینڈ کرنے دو دن کے لئے پاکستان آیا تھا۔

''خیال سے جانا اور جلدی آجانا'' سحر فاطمہ نے حسام اور اریب کو ہدایات دینا شروع کر دی۔ حاعفہ نے کچن سے نکلتے ہوئے یہ سب کچھ سن لیا تھا۔ اس نے گہری نگاہ اریب پر ڈالی جو اس حدت بے خبر عکاس کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوئے تھا۔

پارٹی شہر کے معروف ہاٹل Islamabad marriott کے ایک Executive level گیسٹ روم میں منعقد کی گئی تھی۔ جس کا انتظام حسام کے دوستوں نے پہلے سے ہی کر لیا تھا اور ہاٹل کی انتظامیہ سے اچھے مراسم ہونے کی بدولت انہیں پارٹی کرنے

کی بھی جازت مل چکی تھی۔ وہاں سب بلیک پینٹ کوٹ اور وائیٹ شرٹ میں ملبوس تھے۔ خوب ہلا گلا کیا گیا۔ بیچلرز جوکس اور کچھ گیمز سے دل کو بہلانے کا سامان پیدا کیا گیا۔ شاہد نے کسی سے پوچھے بغیر وائن کا بھی آرڈر دے دیا تھا۔ ویٹر کے آنے پر حسام اور عکاس چونکے تھے۔ اریب اس سے نابلد تھا۔

''شاہد! یہ کیا؟ تم نے وائن کیوں آرڈر کی؟'' حسام نے ذرا سخت لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''جسٹ چل میرے یار......لاسٹ نائیٹ ہے۔ جی بھر کے انجوائے کر'' کندھے تھپتھپائے اور آگے بڑھ دیا۔ عکاس نے استفہامیہ انداز میں دیکھا تھا۔

''ہیلو گائیز......اس پارٹی کی ڈرنک پیش خدمت ہے'' بیڈ کے سامنے ٹیبل پر رکھ کر اس نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ اریب بھی مسکرا دیا۔ اس کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا۔ وہ بھی آگے بڑھا۔ شاہد ایک ایک پیک سب کو دے رہا تھا۔ انجانے میں وہ پیک اریب کے ہاتھوں میں بھی چلا گیا۔ عکاس اور حسام کو یہ دیکھ کر زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اریب نے وہ پیک ہونٹوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ عکاس کے جھٹکے سے وہ پیک زمین پر گرا دیا۔ پورے کمرے میں جیسے خاموشی نے جنم لے لیا۔ اریب بھی سکتے کے عالم میں تھا۔

''تم جانتے بھی ہو کیا پینے جا رہے تھے؟ شراب تھی یہ......'' عکاس نے پہلی بار اریب سے ایسا سخت لہجہ اپنایا تھا۔ اریب کو یہ جان کر ایک جھٹکا لگا تھا۔ عکاس نے بروقت اسے ایک گناہ کرنے سے بچایا تھا۔ اس کے بعد حسام، عکاس اور اریب تو ایک طرف کھڑے رہے جبکہ باقیوں نے اس محفل کو خوب انجوائے کیا۔

''اگر معلوم ہوتا تو شاید اس پارٹی کی اجازت بابا جان کبھی نہ دیتے'' حسام نے دل میں سوچا تھا۔

کامیش بھی کسی قدر اپنے حواس کھو چکا تھا۔ نشہ دھیرے دھیرے اس کے ذہن کو جکڑ رہا تھا۔ اریب کا ہاتھ پکڑ کر وہ بالکونی کی طرف لے گیا اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا تھا۔ اریب مسکراتے ہوئے اس سے بچ رہا تھا۔ ایک سمیل تھی جو مسلسل اس کے منہ سے آرہی تھی۔

''اریب میرے یار......میرے بھائی......تو ناں......ہانیہ سے دور رہا کر۔ تُو نہیں جانتا......ہانیہ میری محبت ہے۔'' وہ نشے میں اپنے دل کا حال سنا رہا تھا۔ بظاہر وہ اپنے پاؤں پر بھی کھڑا ہونے سے قاصر تھا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے مگر اریب کو یہ سن کر ایک شاک ضرور لگا تھا۔ وہ ریلنگ کو مضبوطی سے تھام کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اریب کی آنکھیں یک ٹک کامیش کو دیکھ رہی تھیں۔

''میں اُس سے بہت محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کہ میں خود سے بھی نہیں کرتا۔ تجھ سے بھی نہیں۔ ہماری اس دوستی سے بھی نہیں۔ بس اب میں نے اس کو پرپوز کر کے شادی کر لینی ہے۔ سمجھا تو......میں شادی کرنا چاہتا ہوں ہانیہ سے......لیکن ایک مسئلہ ہے۔ وہ تجھے پسند کرتی ہے۔ اس نے بتایا تھا مجھے۔ تُو اس طرح کر، اس کی زندگی سے چلا جا۔ بہت دور۔ اتنی دور کہ وہ تجھے بھول جائے۔ پھر وہ مجھے چاہنے لگے گی اور مجھ سے شادی کر لے گی۔'' برجستہ اس نے اریب کے گریبان کو پکڑ لیا۔ شرٹ کو نوچتے ہوئے بار بار اس کا چہرہ اس کے سینے سے

ٹکرا رہا تھا۔ ہاتھ میں پکڑے پیک سے کچھ الکوحل بھی اس کی شرٹ پر جا گری تھی۔

"بتا ناں...... چلا جائے گا ناں۔ اس سے دور؟ میرے لئے ہانیہ کو تُو چھوڑ دے گا ناں؟" ہکلاتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ اریب تو جیسے اسی جگہ پر جامد تھا۔ کامیش اگرچہ نشے میں تھا مگر الفاظ سچ تھے اور پھر کامیش نے پہلے ہانیہ کو پسند کیا تھا۔ پہلی پسند نہ ملنے پر کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کی اذیت بھلا وہ کیسے نہیں جان سکتا تھا؟

پارٹی ختم ہوئی اور سب اپنے اپنے گھر کو چل دیئے۔ حسام اور عکاس ایک کار میں گئے تھے جبکہ اریب نے پہلے کامیش کو اس کے فلیٹ تک ڈراپ کرنا مناسب سمجھا تھا۔ کیونکہ کامیش ڈرائیونگ کرنے کی حالت میں نہ تھا۔ راستے میں بھی وہ ہانیہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ کہتا جا رہا تھا۔ اریب نے اس کی طرف دیکھا تو سچی محبت کو اپنے محبوب کا منتظر پایا۔ شاید لکیریں پڑھنا کتنا اذیت دیتا ہے یا پھر نہیں...... وہ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

کامیش کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ واپس آیا تو رات گہری ہو چکی تھی۔ کار کو گیراج میں پارک کرنے کے بعد بھی کافی دیر نیچے نگاہیں کئے کچھ سوچتا رہا۔ پھر قدم آگے بڑھا مگر راستے اندھیروں سے بھرپور تھے۔ نیچی نگاہیں، رات کی سیاہی سامنے موجود ستون کو نہ دیکھ سکیں اور اس کا سر بری طرح اس ستون سے ٹکرایا تھا۔ پورا جسم کسی پنڈولم کی طرح وائبریٹ کرنے لگا۔ سر میں درد کی ایک لہر سرایت کر گئی اور قدم بھی لڑکھڑانے لگے تھے۔ ایسا لگا جیسے وہ ابھی چکرا کر زمین پر جا گرے گا مگر وہ سنبھلا۔ سامنے دیکھا تو ہر شے دوہری دکھائی دی۔ سر کو پکڑے وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اندر گیا اور لاؤنج میں بھی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ جو درد کی شدت ظاہر کر رہے تھے۔ کامیش کو فلیٹ تک لے جاتے ہوئے اس کے گریبان کے دو بٹن بھی ٹوٹ چکے تھے۔ جس بنا پر سینے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ دیکھنے والا کوئی اور مطلب بھی لے سکتا تھا اور ہوا بھی کچھ یونہی۔

وہ جیسے ہی زینے کی طرف بڑھا تو کچن سے حاعفہ برآمد ہوئی تھی۔ ایک وجود کی پشت دیکھ کر اس نے استفسار کیا۔

"کون ہے وہاں؟" وہ قدم زینے پر رکھنے لگا تھا مگر سر چکرانے اور آواز کے سننے کے سبب وہ لڑکھڑاتے ہوئے پلٹا تھا۔ آنکھوں میں پانی مجتمع ہوتا چلا گیا۔ حاعفہ کے ہاتھوں سے پانی کا گلاس گر گیا۔ اریب کی یہ حالت اس کے لئے ناقابل یقین تھی۔ اریب نے آنکھیں مسلتے ہوئے اس وجود کو پہچاننے کی کوشش کی تو حاعفہ کی غیر یقینی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔ آنکھیں شدت درد سے بند ہوتی جا رہی تھیں۔

حاعفہ کی نگاہیں پہلے اس کے بکھرے بالوں پر گئی اور پھر پانی سے بھری آنکھوں کی طرف۔ دھیرے دھیرے وہ نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔ کھلا گریبان، سلوٹ سے بھرپور کوٹ، شرٹ پر الکوحل کے نشان، لڑکھڑاتے قدم۔ شک کا بیج بونے کے لئے کافی تھے۔ آنکھیں لمحہ بھر میں نم ہو گئیں۔ اریب بھی اس شک کا سبب سمجھ چکا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا مگر ہاتھوں میں جانے کیوں لرزش سما گئی۔ وہ دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آنکھیں آنسوؤں سے پُر ہو چکی تھیں اور تنہائی میں ان کا بند بھی ٹوٹ گیا۔ بیڈ کے پہلو میں وہ زمین بوس

ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بحرِ بے کراں کی مانند بہتے چلے گئے۔ دل غم سے بھرپور تھا۔ وہ روتی چلی گئی۔ انتارُوئی کے آنسو بھی کم پڑ جانے تھے مگر آنسو بھی بہتے چلے گئے۔ رونے کا سبب کیا تھا؟ شاید دل کا ٹوٹنا...... جس کو چاہا اس کو اس حالت میں دیکھنا...... وہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آنسو بہنے لگے۔ شاید اس رات سے بھی زیادہ جب اس نے من پسند گفٹ نہ ملنے پر قیمتی فراک کو آگ لگادی تھی۔ شاید اس رات سے بھی زیادہ جس رات اس کے ماں باپ اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ وہ آج انتہا کا رو رہی تھی۔ آنسو بہتے جا رہے تھے۔ گرم سیال مادہ آنکھوں سے نکلتا جا رہا تھا۔ جن ہاتھوں کو انہیں پونچھنے کا حق تھا، آج وہی ان کے بہنے کا سبب تھا۔ اریب کا چہرہ بار بار اس کے سامنے لہراتا اور ہچکیاں مزید بڑھ جاتیں۔ وہ دبی آواز سے روتی چلی گئی۔ دونوں گھٹنوں کے درمیان اپنا چہرہ چھپا کر کہ کہیں ان آنسوؤں کو نہ دیکھ لے، وہ روتی گئی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی وجود کی طلب کی تھی اور پھر سے وہ طلب اس کے رونے کا سبب بن گئی۔ خواہشوں کے محل کی بنیاد رکھنے سے پہلے ہی ایک آندھی نے زبردست دراڑ پیدا کر دی تھی۔ وہ اسی دراڑ کا ماتم منا رہی تھی۔

زندگی میں سب کچھ ملا مگر سب کچھ اس نے اپنے ہاتھوں سے گنوایا تھا مگر آج اس سے کیا غلطی سرزد ہوئی جو وہ اپنی پسند کو بھی کھو چکی تھی۔ کیا گناہ اس سے سرزد ہوا جس کی پاداش میں اریب نے حرام شے کو ہاتھ لگایا۔ وہ سوچتی جاتی اور روتی جاتی۔ کسی بچے کی طرح، جو اپنے والدین سے بچھڑ چکا ہو۔ رات کا پہر جوبن پر ہو اور وحشت سے اس کی جان نکلتی جا رہی ہو۔ اس وقت وہ جتنے درد سے اپنوں کو پکارتا ہے، بالکل اسی درد کو یہ محسوس کر رہی تھی۔ اپنے آپ کو اس دنیا میں بالکل تنہا۔ اسی تنہائی کو اپنا ہم راز بنا کر آنسو کا زیور پہنا رہی تھی۔

☆......☆......☆

وہ جو ہے بیکرانِ دل، وہ جو ہے بیکرانِ جاں

اس کا ہے دھیان کیوں میاں، وہ تو کسی کراں میں ہے

حاعفہ کی آنکھوں میں ہجر کی پہلی شب کا درد اس نے محسوس کیا تھا۔ وصل سے پہلے اس درد کا ملنا، اس کی جان نکال رہا تھا۔ حاعفہ کی آنکھوں کے موتیوں کی چمک اس کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے میں داخل ہوا تھا اور کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی نقاہت نے اسے آ گھیرا۔ حاعفہ کی استفہامیہ نگاہوں میں چھپا درد، اس کی یہ حالت، ایک ایسے شک کو جنم دے چکی تھی۔ جس کا دور ہونا اب شاید ممکن نہ تھا۔ درد اس کے پورے جسم کو مفلوج کر چکا تھا۔ یہ درد چوٹ کا نہیں بلکہ دل کا کرچیوں میں تبدیل ہونے کا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ جان جسم سے نکلتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں گرم سیال مادہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ دل بوجھ سے پُر ہو چکا تھا۔

”یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟“ آنکھوں سے آنسو کا پہلا قطرہ باہر نکلا تھا۔ درد و ہجر کا ذائقہ لئے دھیرے دھیرے ہونٹوں کی طرف بڑھا۔ پہلی بار اس نے اپنے آپ کو اتنا مجبور و بے بس محسوس کیا تھا۔ اتنا درد تو وہ اجنبی بھی اپنی بلیک کالر سے نہیں دیتا تھا جس قدر وہ آج

محسوس کر رہا تھا۔ ایسا درد جو انڈونہ جانے کے غم سے بھی زیادہ تھا۔ اتنا درد تو اس نے اس وقت بھی محسوس نہ کیا تھا جب بچپن میں اس کے دماغ میں شدید چوٹ آئی تھی۔ وہ جھولا جھول رہا تھا اور یکدم وہ جھولا ٹوٹا اور اس کا سر سامنے پتھر سے جا ٹکرایا۔ خون کا فوارا پھوٹ پڑا۔ آج ویسا خون کا فوارا تو نہ پھوٹا تھا مگر درد کا چشمہ ضرور ابل رہا تھا۔ ٹیسیں ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھیں۔

رات کی تاریک چادر گہری ہوتی گئی اور وہ وحشت کے کنویں میں ڈوبتا چلا گیا۔ آنکھیں بوجھل محسوس ہو رہی تھیں۔ آنسو بہنا چاہ رہے تھے مگر درد کی شدت اتنی تھی کہ وہ بھی بہنے میں ناکام دیکھائی دے رہے تھے۔ ٹانگیں پھیلائے اس نے سر دروازے کے ساتھ لگایا تو دوسرے آنسو کا قطرہ درد کی انتہا لئے مژگان پر چمکنے لگا۔

''شاید آج کے بعد وہ کبھی مجھے دیکھنا بھی پسند نہ کرے۔ میرے ساتھ چلنا تو درکنار، میرے نام بھی سننا گوارا نہ کرے'' دل نے گندھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ وصل سے پہلے ہجر کا ذائقہ انتہائی ترش تھا۔ انتہا کی کھٹاس اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اب حاعفہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو چکا ہے۔

زندگی میں پہلی بار اس نے رات بیڈ پر بسر کرنے کی بجائے فرش پر گزاری تھی۔ دو دل ایک سا درد محسوس کر رہے تھے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے خشک راستے صبح آویزاں تھے۔ سورج کی پہلی کرن نے اس کے چہرے کو گدگدایا تو وہ آنکھیں مسلتا ہوا اٹھا۔ سر میں درد کی لہر ابھی تک موجود تھی لیکن پھر بھی وہ اٹھا تھا۔ آئینے کی طرف بڑھ کر اپنا چہرہ دیکھا تو طنزیہ مسکرایا۔ محبت اس پر ہنس رہی تھی۔ اس کا عکس اسے ملامت کر رہا تھا۔ اس کا وجود اس کے مخالف تھا۔ ہر شے اس کو استہزائیہ انداز میں گھور رہی تھی اور وہ خاموش تھا۔ بالکل خاموش۔ جیسے لبوں پر مہر لگا دی گئی ہو۔

''شاید اب میں تم سے نظریں بھی نہ ملا سکوں کبھی......'' وہ صفائی پیش کرنے کی بھی حالت میں نہ تھا۔ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو اس قدر اکیلا محسوس کر رہا تھا؟

☆......☆......☆

اب تُو ہے مدتوں سے شب و روز روبرو
کتنے ہی دن گزر گئے دیدار کو تیرے

بارات والے دن جہاں سب خوش تھے وہیں ان دونوں کے چہرے پر یاسیت نے ڈیرے جمائے ہوئے تھے۔ ہنسی تو جیسے معدوم ہی ہو چکی تھی۔ عکاس اور جبیں کے کہنے پر وہ اذیت کے ساتھ مسکرا تو دیتا مگر بعد میں اپنے آپ کو ملامت کرتا۔

''کسی کو دکھ پہنچا کر تجھے مسکرانے کا کوئی حق حاصل نہیں'' ضمیر کی آواز اس کے دل کو دوبارہ جکڑ لیتی۔ دل رونے لگتا مگر آنکھوں میں ایک چمک ابھرتی۔ دیکھنے والی اسے خوشی کی کمک سمجھتے مگر اندر کی بھلا کسے خبر؟

آنسو تو ایک سے ہوتے ہیں چاہے خوشی کے ہوں یا غم کے، بالکل اسی طرح آنکھوں میں جنم لینے والی چمک بھی ایک سی معلوم ہوتی ہے مگر اس چمک کے ابھرنے کا سبب کوئی دل سے جا کر پوچھے مگر بھلا دل نے بھی کبھی کسی کے آگے اپنا دکھڑا بیان کیا ہے؟ یہ تو ایک زندان ہے جس میں ایک بار کوئی داخل ہو جائے واپسی کے دروازے اکثر بند ہو جایا کرتے ہیں۔ اس بار درد داخل ہوا تھا۔ حسب عادت واپسی کے راستے معدوم تھے۔ تبھی وہ مسکرا رہا تھا مگر اذیت کے ساتھ۔

صبا نکاح کے بعد گھر آ گئی۔ عکاس حسام کو چھیڑنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھ رہا تھا۔ اریب بھی بس پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا جانشین تھا۔ حاعفہ کی نگاہیں تو جیسے اریب کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھیں۔ پورے فنکشن میں سب سے پیچھے ایک طرف کھڑی، بس مسکراتی رہی۔ وہ بھی شاید اذیت کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ آنکھیں رات بھر آنسوؤں کے بہانے کی وجہ سے سوجھ چکی تھیں مگر اس نے کوئی بہانہ کیا۔ میک اپ سے جبیں نے اس ورم کو چھپا دیا۔ غم کے مجسم کو مسکراتی ہوئی لیڈی ڈیانا بنا دیا گیا لیکن اریب نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ رات کو سب اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔ حسام بھی اپنی نئی زندگی کا سفر شروع کرنے جا رہا تھا۔ جبیں نے حسام کو صبا کے کمرے میں جانے سے پہلے خوب زچ کیا۔ ہنسی مذاق کی محفل میں اریب موجود ہوتے ہوئے بھی غیر حاضر تھا۔ پوچھنے پر سر درد کا بہانہ کیا گیا۔ بلا آخر سحر فاطمہ کے کہنے پر جبیں نے حسام کا راستہ چھوڑ دیا۔ حسام نے اندر داخل ہوتے ہی جھٹ سے دروازہ بند کیا۔ جبیں کا قہقہہ دروازے کی اوٹ سے سنائی دے رہا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو صبا کو عروسی جوڑے میں اپنا منتظر پایا۔ خوبصورت سا وجود جس کے گرد گلاب کی پنکھڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ آنکھوں کو دیکھتے ہی راحت ملی تھی۔ دل میں محبت کے غنچے کھل اٹھے۔ صبا نے گھونگٹ کی اوٹ سے دیکھا تو حسام کی نظروں کو اپنا جام دیدار پیتا ہوا پایا۔ وہ حیا کے سمندر میں مکمل ڈوب چکی تھی۔ اپنی انگلیوں کو پٹختے ہوئے بے چینی کو چھپانے کی کوشش کی تو قدموں کی چاپ سنائی دی جو بیڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

میں نے قدموں میں تیرے دامن کش

دامن تار تار ڈالا ہے

''یار ولیمہ تو اعلیٰ رہا...... کیا اٹیلین کھانا تھا۔ زبردست ...... میرا تو پیٹ فل ہو چکا تھا مگر نیت نہ بھری۔'' وہ اس وقت یونیورسٹی کے مین کیفے میں بیٹھے تھے۔ کامیش اپنی سنا رہا تھا مگر اس کی سوچیں تو کہیں اور ہی تھیں۔ ہانیہ بھی اس کمپنی کو جوائن کر چکی تھی۔ اس نے شرکت نہ کرنے پر معافی بھی مانگی۔ اس کے کسی ریلیٹو کی ڈیتھ ہو گئی اور پوری فیملی کو وہاں جانا پڑا تھا مگر وہ تو اس کا ایکسکیوز بھی نہ سن سکا تھا۔ سوچ کی دھاڑیں ایک ڈگر پر نکل چکی تھیں۔

''مسٹر؟ کہاں گم ہو؟ ہم تم سے باتیں کر رہے ہیں اور تم ہو کے اپنی ہی خیالوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے ہو'' کامیش نے چٹکی

بجاتے ہوئے اس کا دھیان اپنی طرف مبذول کروانا چاہا۔اس نے غیر یقینی طور پر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ تجھے پسند کرتی ہے۔اس نے بتایا تھا مجھے۔تُو اس طرح کر، اس کی زندگی سے چلا جا۔ بہت دور۔اتنی دور کہ وہ تجھے بھول جائے۔ پھر میں وہ مجھے چاہنے لگے گی اور مجھ سے شادی کرلے گی۔'' کامیش کے الفاظ سماعت سے ٹکرائے تھے۔ پھر اس نے ہانیہ کی طرف دیکھا تو چاہت کا دوسرا پہلو نظر آیا۔

''میں تمہیں چاہنے لگی ہوں'' چاہت کا اظہار کرتا ایسا وجود سامنے تھا جس کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا لیکن اب وہی معمولی سا وجود اہم ہوتا جا رہا تھا۔اس کی نظر ہانیہ کے ہاتھوں کی طرف گئیں جہاں اس کی ہتھیلی شفاف نظر آرہی تھی۔لکیریں واضح تھیں۔وہ بری طرح چونکا۔ اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا۔کامیش اور ہانیہ کے بعد بھی وہ ان لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔زندگی میں پہلی بار ان لکیروں پر غور کیا تھا۔بالخصوص چاہت کی لکیر کو۔آنکھیں حیرت سے پھیل چکی تھیں مگر وہ یک ٹک ہاتھوں کی لکیروں میں کھویا تھا۔ماحول سے بے خبر، جھومتی ہواؤں سے قطع نظر نگاہیں لکیروں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔وہ پیدل چل رہا تھا ہاتھ کی ہتھیلی کو سامنے کئے۔سرمئی رنگ کے بادلوں نے انگڑائی لی اور رم جھم کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔براؤن رنگ کی شرٹ پر بارش کی بوندیں مزید گہری دیکھائی دے رہی تھیں۔ہوا کے سنگ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور نگاہیں ہتھیلی سے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ ہانیہ اور میری لکیریں آپس میں ملتی کیوں ہیں؟ کیوں دونوں لکیروں کا سنگم ایک جگہ پر ہوتا ہے؟ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں میں اور ہانیہ......؟؟ اگر ایسا ہوا تو حاعفہ؟'' دل نے روہانسا کہا تھا۔ پلک جھپکتے ہی اس رات کا منظر سامنے تھا۔ استفہامیہ نگاہیں، شک کا بیج، ٹوٹتے خواب، کہیں وہ سب نئے رشتے کی طرف پہلا قدم تو نہ تھا؟

وہ بری طرح الجھ چکا تھا۔لکیروں کا لکھا اس کے لئے ایک تلخ حقیقت تھی۔ایک پل کے لئے اس نے اپنی ذات کو آئینے کی مثل محسوس کیا جس کے آر پار دو چہرے دیکھائی دیئے۔ایک حقیقی دوسرا ورچوئل مگر اس میں حقیقی چہرہ کس کا تھا؟ اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔

''ہم دونوں کیسے ایک ہوسکتے ہیں؟ جبکہ میں نے اس کی لکیروں میں خودغرضی، انا، شہہ کی خاطر ہر ایک کو پچھاڑ دینے کی چاہ دیکھی ہے۔ پھر کیسے ہم دونوں ایک ہوسکتے ہیں؟ کیسے؟'' اس نے خود سے سوال کیا تھا۔لکیروں سے بھی، کیسے وہ انہیں ملا سکتی ہے؟ ملن کے لئے ذہنوں کا ایک ہونا انتہائی ضروری ہے اور ان کی تو سوچیں ہی ایک دریا کے دو کنارے ہیں۔جو اگر ساتھ بھی چلیں تو ملن مقدر نہیں ہوسکتا۔ایسا گمان اس نے کیا تھا۔پھر کیسے وہ دونوں ایک ہوسکتے ہیں؟

''نہیں...... مجھے یہ رشتہ قبول نہیں'' اس نے مصمم لہجے میں کہا تھا لیکن آنکھیں برجستہ چاہت کی لکیر پر ٹھہری گئیں۔

''ہانیہ اور محبت...... یہ کیسے ممکن ہے؟ اگر اس کے دل میں میرے لئے چاہت ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ لیکن میرے دل میں اس کے لئے ایسے جذبات کا پیدا ہونا...... ناممکن۔ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔میری چاہت صرف حاعفہ ہے۔ اگر وہ میری قسمت میں نہیں تو کوئی

اور بھی نہیں'' اس نے پر اعتمادی کے ساتھ کہا تھا۔ وہ ایسی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا جس کے دو چہرے ہوں۔ اسے ایک ہی چہرہ چاہیے تھا۔ جو اس کا کا اپنا ہو۔ جس کو یہ چاہتا ہو۔

رم جھم تیز ہو چکی تھی۔ اس کا پورا وجود بھیگ چکا تھا۔ پانی پر قدم چھپک چھپک کی آواز پیدا کر رہے تھے مگر وہ اس سب سے انجان تھا۔ بس چلتا جا رہا تھا۔

''مجھے ان سب سے دور جانا ہوگا۔ صحیح کہا تھا کامیش نے۔ مجھے دور جانا ہوگا۔ ان سب سے دور۔ بہت دور مگر کیسے؟'' اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو گیلے بالوں سے پانی ٹپ ٹپ گرتا چلا گیا۔ اس کا بھیگا وجود اس کے جسم کے خدوخال ظاہر کر رہا تھا۔ کستوری جسم کا مالک ہر آنکھ کو بھا رہا تھا۔ کئی لڑکیوں کی نظریں اس پر رکی جاتی تھیں مگر اس کی نگاہیں تو کسی اور وجود کی متلاشی تھیں۔ اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سامنے دیکھا تو وہ سٹوڈنٹس افیئر بلڈنگ کے عین سامنے تھا۔ سرخ اینٹوں سے مزین بلڈنگ کے فرنٹ پر ایک بینر تھا۔ پہلے تو اس نے اگنار کرنا چاہا مگر بعد میں نظریں تو جیسے ٹھہر سی گئی تھیں۔ اسے اپنی منزل مل گئی۔ صحیح کہتے ہیں بارش برستے ہوئے جو دعا مانگی جائے قبول ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت سامنے تھا۔ یہ دعا بظاہر دل کی ایک تمنا تھی مگر قبول کرنے والے نے اس کی خواہش کو بھی قبولیت کا درجہ بخش دیا۔ آنکھیں خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔

''International Student Exchange Programs'' زیر لب اس نے موٹے موٹے الفاظ میں لکھے گئے یہ الفاظ پڑھے تھے۔ یہ خیال اس کے ذہن میں پہلے کیوں نہ آیا۔ راستہ مل چکا تھا بس اس راستے کو اب اسے خاموشی سے طے کرنا تھا تاکہ اس بار کوئی مشکل یا رکاوٹ نہ آئے۔ اس نے سوچ لیا۔ اس بار وہ کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ گھر میں سے کسی کو بھی نہیں۔ گھر والے اس کی تعلیم کے حق میں تھے اور اب وہ اسی تعلیم کا سہارا لینے جا رہا تھا۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس نے بارش کی بوندوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا۔ ایک ایک بوند تازگی کا احساس بخش رہی تھی۔ غم ڈھل رہے تھے۔ نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ سفر شاید لمبا تھا مگر انتظار کی لذت کا اپنا ہی مزہ تھا۔ تین سمیسٹر تو مکمل ہو ہی چکے تھے۔ چوتھا جاری تھا۔ جس کا مطلب یہ سمیسٹر تو کچھ نہیں ہو سکتا مگر اگلے چار سمیسٹر اس کے لئے اہم تھے۔ کسی بھی سمیسٹر وہ اس ملک کو الوداع کہہ کر پرواز بھر سکتا تھا۔ مستقبل کی لڑیاں وہ خود ہی پرو رہا تھا۔

''بس میں آ رہا ہوں مسٹر بلیک میلر......!!'' اس نے اب اسے ایک نئے خطاب سے نوازا تھا۔

☆......☆......☆

اب تو دل ہی بدل گیا اب تو
ساری دنیا بدل گئی ہوگی

اس نے آن لائن سرچنگ شروع کر دی۔ رات رات بھر بس لیپ ٹاپ ہوتا اور اس کی ذات۔ سب کے سو جانے کے بعد اس کا

کام شروع ہوتا لیپ ٹاپ کو بیڈ پر رکھتا اور گوگل سے انڈو کی تمام یونیورسٹیوں کے بارے میں سرچ کرتا خاص طور پر دیپا سار کے نزدیک کی یونیورسٹیاں اس کا ٹارگٹ تھیں۔ شروع میں ناکامی مقدر بنی مگر ہمت نہ ہاری۔ کلینڈر پر تاریخ بدلتی گئی۔ دن رات میں اور رات دن میں تبدیل ہو رہے تھے مگر اس کی لگن کم نہ ئی۔ ناشتے کی میز پر سب سے دعا سلام ہوتی اور وقت ضائع کیے بغیر اپنے کمرے کی راہ لیتا۔

"اریب ناشتہ تو صحیح سے کرلو......!!" سینڈوچ کا ایک پیس ہاتھ میں لیا اور جوس کا ایک گھونٹ بھرا۔ بس یہی اس کا ناشتہ ہوتا۔ کمرے کی طرف جاتے ہوئے پیچھے سے کوئی نہ کوئی لازمی کہتا تھا۔

"میرے خیال سے ابھی ابھی میں نے ناشتہ ہی کیا ہے" مسکراتے ہوئے شگوفہ چھوڑتا۔

"لگتا ہے بھابھی کے سامنے کھانے سے شرم آ رہی ہے" جبیں کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ ایسے میں صبا مسکرا دیتی اور وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

"یار آج کل تم کچھ زیادہ ہی خوش اور مصروف نظر آتے ہو" کامیش کا بھی یہی سوال رہ گیا تھا۔ لیکچر روم سے کینٹین کا فاصلہ وہ موبائل کو ہاتھ میں تھامے سرچنگ میں گزارتا تھا۔ چہرے پر غیر معمولی کسک جیسے محبوب آنکھوں کے سامنے ہو۔ خواہشوں کا ہنوز سمندر اپنے جوبن پر ہو اور ساری رکاوٹیں ختم ہو چکی ہوں۔ ایسے ہی وہ مہکتا۔ ہانیہ کے لئے اریب کا یہ روپ حیران کن تھا۔ دل میں محبت مزید بڑھ چکی تھی۔

"بس کیا کروں یار۔ ایک اہم کام میں مصروف ہوں" نظروں کو موبائل سے ہٹائے بغیر جواب دیتا۔

"ہم سے شئیر کرنا پسند کریں گے موصوف......!!" وہ جواب کا منتظر رہتا مگر اس کے پاس اتنا ٹائم کہاں تھا؟ اس کے سر پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ اسے کسی بھی قیمت پر انڈونیشیا جانا ہے۔ کسی بھی قیمت پر۔ چاہے اسے اپنی تعلیم کو ہی وسیلہ کیوں نہ بنانا پڑے اور ایسا وہ کر رہا تھا۔

ہر رات ایک نئی یونیورسٹی کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے میں صرف ہوتی۔ کلینڈر پر بلیک ڈاٹس بڑھتے جا رہے تھے۔ کئی اسکالرشپ اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے مگر من چاہی منزل پر نہیں۔ سینٹی پرسنٹ سکالرشپ یورپی ممالک کی طرف سے تھے۔ کچھ ملائیشیا کے بھی اسکالرشپ تھے مگر اسے تو انڈونیشیا کے بارے میں معلومات چاہیے تھی۔

ایک رات وہ یونہی کسی سرچنگ پر ٹائم سپینڈ کر رہا تھا کہ فلی فنڈڈ ایجوکیشن اِن انڈونیشیا کا ایڈ اس کی آنکھوں کے سامنے آیا۔ کئی لمحے وہ اس ایڈ کو دیکھتا رہا۔ ایجوکیشن...... مطلب سٹارٹ سے......اور جو اس کے پچھلے سمیسٹر تھے؟......وہ بے کار؟ وہ سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ کافی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے وہ لنک کلک کیا۔ پیج لوڈ ہونا شروع ہوا تو اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ ایسے جیسے وہ کسی اونچی عمارت کے عین کنارے پر کھڑا اور نیچے دیکھنے سے وحشت کے ہول اٹھ رہے ہوں۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنیں کسی راکٹ انجن کی طرح تیز ہوں۔ ایسا ہی معاملہ آج اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔

"آئی ہوپ...... سم تھنگ اس بیٹر" اس نے دل میں دعا مانگی اور کافی دیر تک اس ویب کا وزٹ کرتا رہا۔ اباؤٹ اُس (ہمارے

بارے میں) میں جا کر نام اور فون نمبر نوٹ کیا۔ پھر کافی دیر تک اس نمبر کو ہی دیکھتا رہا۔ اتنی دیر جب تک نینداس پر مہربان نہ ہوگئی۔

☆......☆......☆

مصلحت اس میں کیا ہے مری

ٹوٹا پھوٹا لگتا ہوں

وہ لوکل یونیورسٹی تھی اور سکالرشپ بھی صرف وہاں کے طلبہ کے لئے میسر تھا۔ جس بنا پر اس کے چہرے پر قدرے یاسیت نمایاں تھی۔ جسے بھانپتے ہوئے ہانیہ نے اس کی پریشانی بانٹنا چاہی۔ پہلے پہل تو وہ اس کو ٹالتا رہا اور اکیلا رہنے کی کوشش کی مگر ہانیہ کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ اسے زبردستی کینٹین لے گئی۔ جہاں بیٹھ کر انہوں نے آپس میں کافی باتیں کی۔ ہنسی مذاق جاری تھی۔ ہنستے ہوئے ہانیہ کے بال چہرے کے آگے لہراتے۔ وہ انہیں ایک ادا سے پیچھے دھکیلتی تو اریب کے دل میں یادداشت نقش ہوتی گئی۔ اس نے لاکھ بھلانا چاہا مگر کچھ یادیں تو چاہ کر بھی بھلائی نہیں جاسکتیں۔ ایسا ہی کچھ اس بار ہو رہا تھا۔ وہ اپنا دھیان اپنے کام پر فوکس کرنا چاہتا تھا مگر ہانیہ کے مبہم سا عکس ہر بار اس کے لاشعوری حصے میں جنبش پیدا کر دیتا۔

”یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ کیوں ہانیہ کے خیالات کو اتنی اہمیت دے رہا ہوں؟“ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا اور پھر خاموشی سے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا رہتا۔ جب کوئی جواب بن نہ پڑتا تو بیڈ پر آکر لیٹ جاتا۔

آج بھی وہ بیڈ پر لیٹنے ہی جا رہا تھا کہ ایک بار پھر موبائل کی رنگ ہوئی۔ نمبر دیکھتے ہی وہ پہچان گیا۔

”نہیں......اس بار نہیں......میری زندگی میں اب بلینک کالز کی کوئی جگہ نہیں ہے“ اس نے موبائل کو مخاطب کیا اور پھر یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ موبائل بھی حسب عادت رنگ کر رہا تھا۔ بند ہوتا اور پھر دوبارہ رنگ کرنا شروع ہو جاتا اور تسلسل جاری رہا۔ بیچ میں آکر اس نے فون ریسیو کیا۔

”ہیلو مسٹر اریب عالمگیر سپیکنگ مسٹر بلیک میلر......!!“ اس نے پہلی بار پرجوش انداز میں اس فون کو پک کیا تھا۔ حسب معمول خاموشی تھی۔

”آئی نو یو آر دیئر۔ (مجھے معلوم ہے آپ وہاں ہیں)“ خاموشی نے تسلسل نہ توڑا۔

”آپ کے پاس صرف دو منٹ ہیں بولنے کے لئے۔ اگر دو منٹ میں نہ بولے آپ تو یاد رکھیے میں آپ کا پتا لگانے دیتا سار آرہا ہوں“ اس نے اپنی طرف سے دھمکی دی تھی مگر مخالف کے سر پر جونک تک نہ رینگی۔

”گو ٹو ہیل......“ اس نے ٹھیک دو منٹ بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلے دن ہی اس نے وہاں کی یونیورسٹی میں سٹوڈنٹ ایکسچینج پروگرام کے تحت اپلائے کیا تھا۔ اضطرابی کیفیت بڑھنے لگی۔ ہر شام

وہ کیسے کاٹتا تھا صرف اسی کی ذات کو علم تھا۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں کامیش کو بھی آگاہ کر دیا۔ وہ پہلے تو چونکا اور پھر خوشی سے داد دی۔
مہینہ بھر کے انتظار کے بعد وہ گھڑی آ گئی جس دن میرٹ لسٹ اپلوڈ ہونی تھی لیکن اس دن کچھ ایسا ہوا جس نے اس کی سوچ کے زاویوں کو منتشر کرنا چاہا تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھا اس یونیورسٹی کی ویب سائیٹ اوپن کیے ہوئے تھا۔ ہاتھوں کو دعاؤں کے لئے اٹھے وہ رب سے التجائیں کیے جا رہا تھا۔ تبھی موبائل کی رنگ ہوئی۔ اس نے بے دھیانی سے فون ریسیور کرتے ہی کان کے لگایا۔

''ہیلو......اریب عالمگیر از سپیکنگ ہیر......'' بظاہر وہ فون پر تھا مگر نگاہیں لیپ ٹاپ کی سکرین پر۔ ایک ہاتھ سے وہ بار بار پیج ریلوڈ کر رہا تھا۔ جانے کب اس کی خواہش پوری ہو جائے۔

کچھ لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ رابطہ جیسے منطقع ہو چکا ہے۔ اس نے موبائل ہٹا کر دیکھا تو ٹائمر چل رہا تھا۔ اس نے حیرانی سے دوبارہ دریافت کیا۔

''ہیلو......کون ہیں آپ؟'' خاموش کا تسلسل نہ ٹوٹا۔ اس کا دھیان لیپ ٹاپ سے ہٹا اور اس کال کی طرف گیا۔ موبائل ہٹا کر دیکھا نمبر دیکھا تو وہ ایک پاکستانی نمبر تھا یعنی بلیک میلر نہیں۔

''سنیے......آپ کی آواز نہیں آ رہی......آپ دوبارہ کال کریں'' یہ کہتے ہی اس نے خود رابطہ منطقع کر دیا۔ ابھی موبائل اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ اسی نمبر سے دوبارہ کال آئی۔ سیکنڈ سے پہلے فون ریسیو کیا مگر خاموشی کا تسلسل ابھی تک نہ ٹوٹا تھا۔ وہ بری طرح چونکا۔ پہیلی مزید الجھ چکی تھی۔ دیپاسار کی خاموشی اب پاکستان کا سفر طے کر چکی تھی۔ اس نے کنفرمیشن کی خاطر نمبر دوبارہ نوٹ کیا۔

''امپاسیبل......'' بے ساختہ اس کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک فون کے کان لگائے بیٹھا رہا مگر خاموشی کے سوائے کوئی آہٹ سماعت سے نہ ٹکرائی۔

''اگر کوئی بات کرنی ہے تو کریں۔ میرا وقت ضائع مت کریں'' اس نے غصے میں کہا تھا مگر مخالف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ پیشانی پر غصے کی شکنیں آویزاں دیکھائی دیں۔

''گو ٹو ہیل......!!'' اسی لقب کے ساتھ اس نے ایک بار پھر رابطہ منقطع کر دیا مگر تیسری بار پھر وہی نمبر کال کر رہا تھا۔ اس کا ذہن بری طرح چکرایا۔ میرٹ لسٹ کا خیال اس کے وہم و گمان سے بھی نکل چکا تھا۔ آنکھوں کے آگے وہی ایک نمبر چمک رہا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ دیپاسار کا بلیک میلر پاکستان میں؟ ابھی کچھ دن پہلے تو وہ انڈو میں تھا اور آج پاکستان میں؟ کہیں ایسا تو نہیں وہ میرا پیچھا کرتے ہوئے یہاں آ گیا؟'' خود سے ہی ہر سوال کا جواب گمان کر لیا۔ کافی دیر تک وہ بیڈ کی ٹیک سے پشت لگائے وہ سوچتا رہا پھر جھماکے سے پلٹا۔ سائیڈ ٹیبل سے ڈائری اٹھا کر نمبر ڈھونڈا اور ڈائل کر کے فون کیا۔ مسلسل رنگ کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر کوئی فون

نہیں اٹھا رہا تھا۔دو تین بار بیل دینے کے بعد اس نے موبائل بیڈ پر دے پھینکا۔

''بیل تو جا رہی تھی دیپا سار کے نمبر پر......'' وہ اپنی سوچوں میں الجھا دکھائی دے رہا تھا۔اس نے فون اٹھایا اور پاکستانی نمبر پر کال بیک کی مگر اس بار نمبر آف جا تا رہا۔اس نے کئی بار ٹرائے کیا مگر بیل نہ گئی۔وہ پہلے سے زیادہ الجھ چکا تھا۔

''ہو نہ ہو وہ دیپا سار والا ہی بلیک میلر تھا۔تبھی مجھے کال کرنے کے بعد وہ نمبر آف کر دیا'' اس کے سر میں درد کی ایک لہر اٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد اسے لسٹ کا خیال آیا۔پیج ریلوڈ کیا۔لسٹ اپلوڈ ہو چکی تھی مگر خواب ایک بار پھر چکنا چور ہو گئے۔اریب نام کا کوئی بھی سٹوڈنٹ اس یونیورسٹی میں سلیکٹ نہ ہوا تھا۔اسے شدید مایوسی ہوئی۔اس نے کئی بار پیج ریلوڈ کر کے دیکھا مگر رزلٹ وہی رہا۔دل اس رزلٹ کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھا۔جھیل سی آنکھیں بھر آئی تھیں۔وہ روہانسا دکھائی دیا۔اس رات وہ سویا نہیں بلکہ پیج کو ریلوڈ کر کے دیکھتا رہا کہ شاید اس کا نام آجائے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔قسمت نے ایک بار پھر اس کا امتحان لیا تھا۔منزل کے اتنے قریب لے جا کر اسے سٹارٹنگ پوائنٹ پر لا کھڑا کیا۔

پہلا قدم

اے فکر کم نشاں مری عظمت کی داد دے
تسلیم کر رہا ہوں میں تیرے وجود کو

کہتے ہیں جن کے ارادے پختہ ہوں منزل ان کو مل ہی جایا کرتی ہے۔ پھر بھلا اس کہاوت کا اثر اریب پر کیوں نہ ہوتا۔ فنشنگ لائن کے قریب پہنچ کر بھی خود کو دوبارہ سٹارٹنگ پوائنٹ پر کھڑا پانا، کتنا تکلف دہ تھا؟ یہ صرف اسے ہی معلوم تھا مگر ہمت مرداں مدد خدا۔

آج اسے محنت کا صلہ مل ہی گیا۔

''بابا جان بابا جان......!!'' سب ڈائنگ ٹیبل پر ڈنر کر رہے تھے۔ وہ خوشی سے اچھلتا ہوا آیا تھا۔ سب کی نظریں استفہامیہ انداز میں اس کی طرف اٹھی تھیں۔

''کیا ہوا اریب؟ ایسے بندروں کی طرح کیوں اچھل رہے ہو؟ لاٹری نکل گئی ہے کیا؟'' جبیں نے طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ حاعفہ گردن جھٹک کر رہ گئی۔ وہ جبیں کے ساتھ والی کرسی کے عقب میں ہی کھڑا تھا مگر مجال ہے اس کے چہرے پر شکن بھی نمودار ہوئی ہو۔

''جو مرضی کہو آج تم...... تمہیں میری طرف سے اجازت ہے۔ آج کے دن تمہارا ہر خطاب منظور ہے مجھے۔'' وہ انتہا کا خوش دیکھائی دے رہا تھا۔ جبیں کے ساتھ ساتھ سب کو حیرت ہوئی تھی۔ کیا یہ وہی اریب تھا جو ایک کے بدلے دو سناتا تھا جبیں کو مگر آج اسے بخوبی بولنے کی اجازت دے رہا تھا۔

''آخر بات کیا ہے جناب؟'' حسام نے اپنا دھیان اب پوری طرح اس کی طرف کیا تھا۔

''بات یہ ہے بھائی کہ سٹوڈنٹس ایکسچینج پروگرام میں میرا نام آیا ہے اور مجھے ایک سمسٹر اب ان کی یونیورسٹی میں جا کر پڑھنا ہوگا اور وہ بھی پرسوں سے۔'' وہ انتہائی پرجوش دیکھائی دے رہا تھا۔

''واؤ...... اٹس امیزنگ۔ بہت بہت مبارک ہو'' حسام فی الفور کھڑا ہوا اور چھوٹے بھائی کی خوشی میں برابر کا شریک تھا۔ جبیں نے بھی حیرت سے شانے اچکائے اور اسے مبارکباد دی۔

''کون سی یونیورسٹی ہے؟'' جہانزیب نے پوچھا تھا۔

''Udayana University Nias Campus'' اس نے فقط یونیورسٹی کا نام بتایا تھا۔ جہانزیب کو یہ نام کچھ سنا

سنا لگا مگر یاد نہیں آرہا تھا کہ کہاں سنا ہے۔سحر فاطمہ نے بھی دعائیں دیں۔
''لیکن پرسوں......ویزہ، یہاں کی یونیورسٹی کی فارمیلیٹیز؟'' جبیں نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔
''وہ سب کچھ ہو چکا ہے۔میں نے سب فارمز پہلے ہی سمٹ کروادیئے تھے۔یہاں تک کہ یہاں کی یونیوسٹی سے میرا نام بھی سٹک آف ہو چکا ہے ایک منتھ کے لئے۔۔۔ہمیشہ کے لئے نہ سمجھ لینا (اس نے چٹکلا چھوڑا تھا) بس کل جا کر سب سے ملنا ہے اور پرسوں اڑان بھرنی ہے۔'' وہ پرجوش انداز میں کہتا جارہا تھا۔اس کے چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔
''لیکن یہ سب کچھ اتنا جلدی؟'' جہانزیب کو تشویش ہوئی تھی۔
''جلدی تو نہیں ہے بابا جان......میرے لئے تو یہ کل کا دن گزارنا بھی محال ہے۔'' اس نے جہانزیب کے دونوں شانوں کو پیار سے پکڑا تھا۔وہ مسکرادیئے اور بیٹے کی خوشی میں خوش ہونا چاہا۔کچھ دیر یونہی باتیں کرنے کے بعد وہ پیکنگ کے لئے واپس زینے کی طرف پلٹا تھا۔
''دیور جی......کس ملک میں ہے یہ یونیورسٹی؟ آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں۔'' صبا نے انتہائی اہم سوال کیا تھا۔سب کے چہرے اریب کی طرف مڑے۔وہ بھی پلٹا تھا۔چمکتا ہوا چہرہ اب مطمئن دیکھائی دے رہا تھا۔سچائی بتانے میں اب کوئی ہرج نہ تھا۔تبھی دھیمے لہجے میں لبوں پر انبساط کو بکھیرے کہا۔
''انڈونیشیا......'' سحر فاطمہ اور جہانزیب کے سر پر جیسے بم پھوڑا گیا تھا۔جبیں اور حسام کو بھی دھچکا لگا۔اریب اپنی ضد پوری کر چکا تھا۔دو دو قدم پھلانگتے ہوئے وہ کمرے میں چلا گیا جبکہ سحر فاطمہ اور جہانزیب کی حالت نا دیدہ تھی۔غصے،فکر کے ملے جلے تاثر ابھرے۔جبیں نے ان کی طرف دیکھا تو ان کے چہرے پر کئی شکن ابھرے ہوئے پائے۔سحر فاطمہ تو تفکر بھرے لہجے میں کرسی پر جا گری تھیں جبکہ جہانزیب ابھی تک حواس باختہ کھڑے اریب کے الفاظ کو سمجھنے کی سعی کررہے تھے۔
''شاید اس بار بھی اریب نہ جاسکے'' جبیں نے سوچا تھا جو شاید صحیح تھا۔

☆ ☆ ☆

میں جلوہ صد رنگ ہوں، یا موج صبا ہوں؟

احساس کی چوکھٹ پہ کھڑا سوچ رہا ہوں

یونیورسٹی میں وہ اپنے تمام کام بڑی تیزی کے ساتھ نمٹا رہا تھا۔کامیش کا چہرہ کچھ اُترا اُترا سا تھا۔شاید اس کا سبب اپنے سب سے اچھے دوست سے دوری تھی۔وہ ڈین آفس سے اب کنٹرول روم کی طرف جارہے تھے۔اریب کا چمکتا دمکتا چہرہ کسی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔
''سچ بتاؤ؟ تم سچ میں جارہے ہو؟'' کامیش نے تصدیق چاہی تھی۔شاید اس کا دل ابھی تک تسلیم کرنے سے قاصر تھا۔
''تو کیا میں مذاق کررہا ہوں؟ حد کرتے ہو یار......'' اس نے بے نیازی کے ساتھ شانے اچکائے تھے۔کنٹرول روم میں اتنا

ہجوم نہ تھا۔اس نے مارکس شیٹ لی اور پھر واپس ڈپارٹمنٹ کی طرف پلٹا۔

''ویسے یار ٹرائے تو میں نے بھی کیا تھا تیرے ساتھ پھر میرا تو ہوا نہیں، تیرا ہو گیا نام سلیکٹ۔'' اس نے بجھے بجھے لہجے میں گردن جھکائے سرگوشی کی تھی۔

''تو تجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میرا نام کیوں سلیکٹ ہوا؟'' اس نے یکدم اچھنبے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''نہیں یار۔بھلا تیرا نام سلیکٹ ہونے پر مجھے کیوں دکھ ہوگا۔میں تو اپنا نام نہ آنے پر کچھ رنجیدہ تھا۔'' اس نے فی الفور اریب کے دل سے بدگمانی دور کی تھی۔جس پر وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

''جانتا ہوں۔مذاق کرر ہا تھا۔'' اس کی نظریں ایک پل کے لئے کامیش کی پیشانی پر گئیں تو آج پھر لکیریں وہی کچھ کہہ گئیں جو ہمیشہ سے کہتی تھیں مگر اس بار لکیروں نے کچھ اور بھی کہا تھا۔کچھ نیا، جو اس نے پہلے نہیں پڑھا تھا۔اس کا چہرہ سنجیدہ سا دکھائی دیا۔قدم بھی رک گئے۔یک ٹک وہ کامیش کو دیکھنے لگا جیسے کوئی سٹوڈنٹ لیکچر کے دوران وائیٹ بورڈ کی طرف دیکھتا ہے۔بالکل ویسے۔پورے دھیان کے ساتھ کہ اگر ذرا بھی توجہ ہٹی تو لیکچر کی سمجھ نہ آئے گی۔وہ بھی ایسے ہی کامیش کی پیشانی دیکھتا ہوا کچھ پڑھنے کی بغور کوشش کر رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟'' کامیش ان نگاہوں کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔

''دیکھ رہا ہوں کہ میرے جانے کے بعد بہت کچھ ہونے والا ہے۔کچھ راستے بدل جائیں گے، کچھ منزلیں مل جائیں گی۔گمراہی سے نیکی کا راستہ طے کیا جائے گا۔پیار عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف لے جائے گا۔جو اعزاز میں پانا چاہتا تھا شاید وہ قسمت نے ہانیہ کو عطا کر دیا۔ہانیہ کی محبت ہی تمہیں دنیا و آخرت کی بھلائی کی طرف لے آئے گی۔بس ایک بات یاد رکھنا کہ نام کی تبدیلی بہت اہم مرحلہ ہوتا ہے۔نام کا انسان کی شخصیت پر بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔اس لئے جو نام بھی رکھنا وہ سوچ سمجھ کر رکھنا اور پھر عبداللہ اور عبدالرحمٰن سب سے زیادہ پسندیدہ نام ہیں۔'' سنجیدہ لہجہ کہتا جا رہا تھا جبکہ کامیش فی الوقت اس گفتگو کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ایک ایک لفظ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

''یہ کیا کہتے جا رہے ہو اریب؟ سچ پوچھو تو مجھے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔'' اس نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے شانے اچکائے تھے۔جس پر وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔اس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے آگے بڑھا۔

''آجائے گا۔جب تم دائرہ اسلام میں داخل ہو نگے۔'' اس کا لہجہ انتہائی دھیمہ تھا۔خود وہ اپنے لفظوں کو سننے سے بھی قاصر تھا۔بس لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔سامنے دیکھتا تو ہانیہ پاس آتے ہوئے معلوم ہوئی۔اپنے ہینڈ پرس میں کچھ پیپرز رکھتی ہوئی وہ چلتی آ رہی تھی۔ہمیشہ کی طرح لہراتی زلفیں جنہیں دیکھ کر جانے کیوں آج نظر ٹھہر سی گئی تھی۔ایک کسک ابھرنے لگی۔دل میں بھی عجب سا احساس بیدار ہوا تھا۔

''پہلا تاثر، آخری تاثر کہلاتا ہے۔شاید میں اس رویے پر قائم رہتا مگر میں نہیں جانتا کیوں میں تمہاری طرف کھنچتا جا رہا ہوں۔جتنا تم سے دور جانے کی کوشش کرتا ہوں اتنا ہی قربتیں بڑھ جاتی ہیں لیکن سچ پوچھو تو اُس دن سے میرے دل میں تمہارے لئے عزت مزید

بڑھ گئی جب میں نے کامیش کی لکیروں میں تمہاری خاطر مذہب کی تبدیلی دیکھی۔ یہ لکیر تو میں برسوں پہلے ہی دیکھ چکا تھا مگر مصلحتاً خاموش رہا۔ میرا دل ہمیشہ سے چاہتا تھا کہ اس کے اسلام میں داخلے کا سبب میں بنوں۔ یہی کامیش کے ساتھ دوستی کا سبب تھا کہ شاید میری دوستی ہی اسے اسلام کی طرف راغب کرے لیکن شاید قدرت نے یہ اہم کام تم سے لینا تھا تبھی برسوں کی دوستی بھی یہ کام نہ کر سکی اور تمہاری چند دن کی محبت نے یہ کام کر دیا۔ تم جانتی ہو ہانیہ؟ وہ بہت جلد اسلام میں داخل ہو رہا ہے۔ میں نے ابھی ابھی پڑھا ہے لیکن شاید اُس وقت میں یہاں موجود نہ ہونگا اس لئے توقع کرتا ہوں کہ تم اس کا ساتھ دوگی۔ اس کے قدم لڑکھڑانے نہیں دوگی کیونکہ پہلا قدم ہی منزل کا تعین کرتا ہے اور مجھے یقین ہے تم اس کے قدم کبھی ڈگمگانے نہیں ہونے دوگی۔ اس کا ساتھ دوگی۔ اب تو میں بھی جا رہا ہوں۔ واپسی کب ہو؟ شاید معلوم نہیں۔ میرے جانے کے بعد شاید میری محبت تمہارے دل سے بھی نکل جائے اور تم کامیش کو اپنا لو۔ اس کی محبت کو امر کر دو۔ دنیا کو بتا دو کہ محبت اگر سچی ہو تو نہ صرف دنیا ملتی ہے بلکہ آخرت بھی اور آخری بات جو شاید میں پہلے کبھی نہ کہہ سکا اور نہ ہی کبھی کہہ سکوں گا۔ میرے دل میں تمہارے لئے ایک احساس جنم لے رہا ہے۔ وہ احساس محبت کا ہے؟ یا پھر دوستی کا؟ میں خود سے شناسائی حاصل کرنے میں ناکام رہا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ احساس دوستی کا قطعاً نہیں ہو سکتا۔ اس کا درجہ دوستی سے کہیں اوپر ہے۔ محبت کے آسمان کو چھوتا یہ احساس شاید محبت ہی ہے۔ ذہن لاکھ جھٹلا رہا ہے اس احساس کو مگر دل تو شاید تسلیم ہی کر چکا ہے۔ میں تمہاری محبت ہوں اور تم؟ شاید میری؟ اس سوال کا جواب شاید مستقبل میں جان سکوں لیکن اتنا ضرور ہے۔ تم مجھے اچھی لگنے لگی ہو۔ جیسی بھی ہو۔ آنکھوں کے راستے دل کے دریچے میں سمانے لگی ہو۔'' خوابیدہ سا لہجہ اپنے آپ سے سرگوشی کر رہا تھا۔ لب بظاہر خاموش تھے مگر دل اپنے جذبات کو سامنے رکھ رہا تھا۔

''ہیلو؟ کہاں گم ہو؟'' کامیش نے چٹکی بجائی تو وہ ایسے چونکا جیسے کوئی کانچ بری طرح ٹوٹا ہو۔ چہرے کی کمک یکدم غائب سی ہو گئی۔ نظریں حقیقت کو دیکھنے کے قابل ہوئیں تو ہانیہ کو عین اپنے سامنے پایا۔

''بتاؤ، کہاں گم ہو گئے تھے؟ کہیں ابھی تو نہیں انڈو پہنچ گئے؟'' کامیش نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔ جس پر وہ مسکرا دیا۔

''ویسے جانا ضروری ہے کیا تمہارا؟'' ہانیہ کے لہجے میں ایک عجب سی تشنگی تھی۔ جیسے دل غم سے چور ہو چکا ہو اور حالات سے سمجھوتا کرنے سے قطعاً انکاری ہو۔

''کیوں؟ تم نہیں چاہتی کہ میں جاؤں؟'' شریر آنکھوں نے پہلی بار ایک ادا سے ہانیہ کی طرف دیکھا تھا۔

''اگر میں ناں کہہ دوں تو سچ میں نہیں جاؤ گے؟'' اپنا مان بڑھتا دیکھ کر محبوب کا چہرہ بھی چھک اٹھا تھا لیکن جدائی کا ایک عنصر ابھی تک درمیان میں موجود تھا۔

''سوری...... میرا جانا اتنا ضروری ہے جتنا کرپٹ نمائندوں کا کرپشن کرنا۔'' اس نے بات کو مزاح کی طرف پلٹ دیا تھا۔ سب مسکرا دیے مگر ہانیہ کا چہرہ ابھی تک مرجھایا ہوا تھا۔ اریب کا دل چاہا کہ وہ کچھ لمحے ہانیہ کے ساتھ گزارے مگر ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی کہ اس سے کچھ کہے۔

"ایکسکیوز می ہانی! کیا تم مجھے گرافکس کے نوٹس دے سکتی ہو؟ شاپ پر ختم ہو گئے۔ میں تمہیں کاپی کروا کر واپس کر دونگی۔" یہ کلاس فیلو اقصیٰ کی آواز تھی۔ ہانیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنا پرس ٹٹولنا شروع کیا۔ بے دھیانی سے ایک ڈائری نیچے گر گئی۔ اریب کی نظر گئی تو اس نے اٹھائی اور ہانیہ کی طرف بڑھائی مگر وہ نوٹس دیکھنے میں مصروف تھی اور اسے ڈائری کے گرنے کا علم بھی نہ تھا۔ کامیش ذرا ایک کال کرنے کے لئے بائیں جانب چل دیا۔ اریب نے کندھے اچکاتے ہوئے ڈائری کو اوپن کیا تو ہانیہ کی ہینڈ رائٹنگ میں کچھ لکھا تھا۔ تاریخ دیکھی تو کچھ دن پہلے کی تاریخ تھی۔ پہلے تو وہ بند کرنے لگا تھا کہ ایسے کسی کی ڈائری پڑھنے کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا مگر نظر اپنے نام پر جا کر ٹھہر سی گئی۔ بے ساختہ وہ پڑھتا چلا گیا۔ آنکھیں ایک جنون کو سینتے دہکتے کوئلے کی مثل دکھائی دے رہی تھیں۔

"تھینک یو ہانی۔ میں بس پانچ منٹ میں واپس کر دونگی۔" اقصیٰ یہ کہہ کر شاپ کی طرف بڑھ دی۔ ہانیہ نے مسکرا کر اریب کی طرف دیکھا تو اس کے ہاتھ میں اپنی ڈائری کو پایا۔ ایک زبردست جھٹکا لگا۔ فی الفور اس کے ہاتھوں سے وہ ڈائری کھینچی۔

"کسی کی ڈائری کو بلا اجازت نہیں پڑھتے۔" اس کے لفظوں میں لرزش نمایاں تھی۔ اریب کے ہاتھ ابھی تک ہوا میں معلق تھے۔ ہانیہ نے اریب کا چہرہ دیکھا تو سرخ پایا۔ جیسے آسمان ناراض ہو چکا ہو اور اپنا قہرہ برسانے کے لئے بے تاب ہو۔ اس نے ڈائری کا وہ صفحہ دیکھا جو اریب کے سامنے تھا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین کھسکتی معلوم ہوئی۔ قسمت نے بہت گہری ضرب لگائی تھی۔ حواس باختہ اس نے اریب کی طرف دیکھا تو اپنے لئے فقط نفرت کے جذبات کو پایا۔ جو چاشنی، جو محبت وہ کچھ دیر پہلے تک دیکھ رہی تھی وہ سب کچھ معدوم ہو گیا۔

"اریب! یہ سب......!" اس نے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ کہ اشارے سے لبوں پر مہر لگا دی۔

"اب ایک لفظ بھی نہیں۔" الفاظ میں انتہا کی بے اعتنائی تھی۔ درد کی شدت آنسوؤں کا سبب بن گئی مگر یہ آنسو حلق میں ہی اٹک کر رہ گئے۔

"تم ایسی ہو۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" درد بڑھا تو حلق بھی ان آنسوؤں پر بند نہ باندھ سکا اور دھیرے دھیرے مژگان کے کنارے بھیگتے چلے گئے۔

"نہیں اریب۔ میری بات تو سنو۔" وہ صفائی دینے کی کوشش کر رہی تھی مگر وقت بہت آگے نکل چکا تھا۔

"مجھے کوئی بات نہیں سننی، سمجھی تم۔ تمہارے لئے میرا پہلا تاثر بالکل ٹھیک تھا۔ تم انتہائی گھٹیا ہو۔" گلوگیر لہجے نے کہا تھا مگر درد کی شدت انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

"نہیں اریب۔ میں محبت کرتی ہوں تم سے۔"

"جسٹ شیٹ اپ۔" اس نے چیخنا چاہا مگر ماحول اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ وہ اس وقت ڈیپارٹمنٹ کے عین سامنے کوریڈور میں کھڑے تھے۔

’’آئی ہیٹ یو۔ تم صرف نفرت کے قابل ہو۔ محبت کے نہیں۔‘‘ ان لفظوں نے ہانیہ کے سر پر جیسے بم پھوڑا تھا۔ مژگان کے کنارے موتی کی طرح چمکنے لگے۔ اس نے اریب کا ہاتھ پکڑنا چاہا جسے اس نے بری طرح جھٹک دیا۔ وہ حواس باختہ اپنے جھٹکے ہوئے ہاتھوں کو دیکھتی رہ گئی۔

’’مجھے چھونے کا کوئی حق نہیں ہے تمہیں۔‘‘ وہ خود بھی بری طرح ٹوٹا تھا۔ قدموں کو واپسی کی طرف پلٹا۔

’’نہیں اریب، تم میری بات سنے بغیر نہیں جاسکتے۔ میری بات ایک بار سنو تو صحیح۔‘‘ اس نے گلوگیر لہجے میں منتیں کی تھیں مگر ڈائری پڑھنے کے بعد بھلا وہ کیسے موقع دے سکتا تھا؟ اسی لئے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

’’تمہیں میری محبت کو قبول کرنا ہوگا۔ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہی سچ ہے‘‘ بلکتے لبوں نے جیسے فریاد کی تھی۔ وہ پلٹا تو ڈائری کے لفظ اس کی سماعت سے گونجے۔

’’میں ہانیہ عمر دراز آج اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ اریب کو اپنی محبت کے جال میں پھانس ہی لیا۔ سچ کہتے ہیں لوگ لڑکوں کی کمزوری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اریب بھی انہی لڑکوں میں سے تھا جس سے کوئی لڑکی ایک بار ہنس کر بات کیا کرلے۔ وہ لٹو ہو جاتے ہیں لیکن اس منزل کو پانا آسان نہیں تھا۔ میرا بار بار اریب کے کاموں میں مداخلت کرنا اس کی نگاہوں میں میری توقیر کو کم کر رہا تھا۔ میں جب بھی اس کے پاس جانے کی کوشش کرتی۔ وہ مجھے دھتکار دیتا اور پھر کامیش کے سامنے میری بے عزتی کرنے کے بعد تو میں اپنے مقصد میں بری طرح ناکام ہوچکی تھی۔ تبھی میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ جب محبت سے بھری باتیں کام نہیں آتیں تو بے رخی بہت کچھ کر جایا کرتی ہے۔ میں نے بھی یہی حربہ استعمال کیا۔ بظاہر ایسا تاثر دیا کہ مجھے اس کے رویے سے بہت ٹھیس پہنچی ہے اور وہ اسی کو سچ سمجھ بیٹھا۔ میرے آگے پیچھے معافی کیلئے پھرتا رہا اور جب میں نے اسے معاف کردیا اور فون پر یہ بتایا کہ میں اسے چاہنے لگی ہوں تو منزل میری آنکھوں کے سامنے دیکھائی دی۔ وہ بری طرح میری جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گیا۔ میری زلفوں کا اسیر بنتا چلا گیا۔ اب بس اسے اسی طرح اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھانس کر مجھے آگے نکلنا ہے۔‘‘

ہانیہ مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

’’اریب جو کچھ تم نے پڑھا، ہاں وہ سچ تھا لیکن اب نہیں۔ جھوٹی محبت سچ بن چکی ہے۔ میں سچ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ پلیز ایک بار میری آنکھوں میں وہ محبت پڑھنے کی کوشش کرو۔‘‘ بے بس لہجہ فریاد کر رہا تھا مگر اریب اس بار اس کے جال میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ بے رخی کے ساتھ گردن جھٹکی اور واپسی کی راہ لی۔

’’نہیں اریب تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے......نہیں جاسکتے۔ نہیں میری محبت کو قبول کرنا ہوگا۔ کرنا ہوگا قبول۔‘‘ اس کا دل چاہا کہ وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر اپنے منہ پر خاک ملے۔ اپنے کیے کی معافی مانگے۔ اپنی محبت کو جانے سے روکے مگر حالات کا تقاضا کچھ اور تھا۔ نہ وہ

روسکتی تھی اور نہ ہی بین کر سکتی تھی۔ محبت کی کسک کو درد کے لبادے میں لپیٹ کر اس نے دل کی تہوں میں مدفون کیا اور دیوار سے جا لگی۔ ایک آنسو رخسار پر بہہ نکلا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھیلے گی بہر طور شفق، نیلی تہوں میں
قطرے کا لہو بھی ہے سمندر کی رگوں میں

جہانزیب فون پر بات کرنے میں مصروف تھے جبکہ سحر فاطمہ کی نگاہیں ان کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ جب سے اریب نے انہیں انڈو جانے کی خبر سنائی ان کا سانس لینا بھی جیسے محال ہو چکا تھا۔ ایک ایک لمحہ کیسے گزرا یہ بس وہی جانتی تھیں۔

''او۔کے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گہرا سانس لیا اور کریڈل پر ریسور رکھ دیا۔

''کیا فیصلہ کیا آپ نے؟ اریب کو جانے دیں گے آپ؟'' انہوں نے فوراً پوچھ ڈالا۔ ممتا اپنے بچے کو اتنی دور بھیجنے کے حق میں نہ تھی۔

''ہاں۔ وہ جا سکتا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔'' انہوں نے سکون بھرے لہجے میں کہا تھا مگر سحر فاطمہ کو ابھی تک راحت نصیب نہ ہوئی تھی۔ وہ جہانزیب کے اس پرسکوں لہجے کے پیچھے پریشانی اور اضطرابی کا ایک جہاں آباد دیکھ سکتی تھیں۔ جو مصلحتاً خاموش تھا۔

''اور پھر منع کرنے سے بھی کیا ہوگا؟ وہ دوبارہ کوشش کرے گا۔ ہم پھر منع کریں گے تو وہ ایک نئی راہ نکالے گا۔ مختصر یہ کہ وہ کسی بھی قیمت پر وہاں جا کر ہی دم لے گا۔ ایک بات اس کے ذہن میں بیٹھ چکی ہے۔ وہ اب اس سے پیچھے ہٹنے والا نہیں اور ایسے میں اگر ہم اس کے راستے میں رکاوٹ بنے تو وہ ہم سے بدظن ہو سکتا ہے۔ اولاد جب جوان ہو جاتی ہے تو والدین کو اپنا ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ والدین کا اٹھایا گیا ایک غلط قدم اولاد کو بغاوت پر اکسا سکتا ہے اور یہ میں قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ صرف چھ ماہ کی دوری برداشت ہو سکتی ہے مگر عمر بھر کی نہیں۔ میرے اندر اتنا حوصلہ نہیں ہے۔ میرا بیٹا ہے وہ۔'' ان کا لہجہ انتہائی غمگین تھا۔ آنکھوں میں آنسو امڈنے لگے تھے۔

''شاید آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ہمیں اریب کو جانے دینا چاہیے۔ شاید قسمت ہمارا امتحان لے رہی ہے کہ ہم اپنی پرورش میں کتنے کامیاب ہوئے؟'' آنکھوں نے برسنا شروع کر دیا تھا۔ آنے والے حالات کی ایک جھلک دکھائی دی۔ اریب کا چہرہ مبہم سا نظر آ رہا تھا۔ قدم مخالف سمت بڑھ رہے تھے۔

''مجھے امید ہے ہم کامیاب ہی ہوئے ہیں۔'' جہانزیب نے ایک ہمت باندھی تھی۔ سحر فاطمہ نے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

لہروں کی خامشی پہ نہ جاائے مزاجِ دل

گہرے سمندروں میں بڑا ارتعاش ہے

شام کی فلائیٹ تھی۔ وہ وہ سہ پہر کو ہی سب کی دعائیں سمیٹ چکا تھا۔

''پہلی بار اتنی دور جا رہا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔'' حسام نے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔

''بہت یاد آؤ گے تم۔ چھے مہینے تک آخر میں کس سے بحث کرونگی؟ جب تک تمہاری شکل نہ دیکھ لوں، دن ہی نہیں گزرتا۔'' جاتے جاتے بھی مزاح کا پہلو ایک جا گر گیا تھا۔ اریب بھی مسکرا دیا۔

''کوئی بات نہیں سکائپ ہے ناں۔ دونوں آن لائن لڑا کریں گے۔''

''واہ چھوٹے۔ میرے ساتھ تو گئے نہیں۔ اب اکیلے سیر ہو رہی ہے۔ چلو اچھی بات ہے۔ دنیا دیکھ لو گے اس بہانے۔'' عکاس نے ہمیشہ کی طرح اس کے بال خراب کیے تھے۔

''بس اپنے کام سے کام رکھنا۔ یونیورسٹی جانا اور سیدھے اپنے روم میں۔ میں نے گرینڈ مراح ہوٹل میں تمہارے لئے ایک روم بک کروا دیا ہے۔ تمہیں وہاں کسی بھی قسم کی پریشانی نہیں ہوگی۔ کسی اجنبی سے کوئی بات نہیں کرنی اگر کوئی روکے تو سیدھا پولیس کے پاس جانا۔ سمجھے؟'' جہانزیب نے نت نئی نصیحتیں کی تھیں۔ جس پر مسکرانے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکا۔

''اپنی خوراک کا خاص خیال رکھنا۔ وقت پر کھانا کھانا اور وقت پر سونا۔ زیادہ ٹینس ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر دل نہ لگے تو فوراً چلے آنا۔ ہمیں نہیں چاہیے ابروڈ کی ڈگری کا ٹیگ۔'' سحر فاطمہ کا دل اپنے بچے کے لئے تڑپ رہا تھا۔ آنکھوں کی تشنگی بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

حاعفہ اور صبا خاموش رہیں۔ اریب نے پلٹ کر حاعفہ کی طرف دیکھا تو آج بھی اپنے لئے بدگمانی کا عنصر دیکھا۔

''میری سچائی کو سمجھنے کی کوشش کرنا۔ تمہارا اریب ایسا نہیں ہے۔'' دل ہی دل میں اس نے کہا تھا۔ حسام نے سامان اٹھا کر کار میں رکھا اور اس کے ساتھ ائیر پورٹ تک گیا۔

جہاز میں بیٹھنے کے بعد بھی وہ ایک الجھن کا شکار رہا تھا۔ کبھی حاعفہ اور کبھی ہانیہ۔ دونوں یکے بعد دیگرے اس کی یادداشت پر حملہ کر رہی تھیں۔ سفر کتنے گھنٹے پر محیط تھا؟ اس کو بھنک بھی نہ ہوئی۔

اس کا پہلا سٹاپ دوحہ تھا۔ جہاں کچھ دیر آرام کیا اور پھر اگلی منزل کی طرف رختِ سفر باندھا۔ دوحہ میں وہ ویٹنگ روم سے باہر ہی نہ نکلا۔ شاید اپنی منزل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''بس اب وینیا سارا اور میں......'' اس نے خیالوں ہی خیالوں میں اپنی من چاہی منزل پر قدم رکھا تھا۔ اٹھارہ گھنٹے کا تھکا دینے والا سفر اب اختتام کی طرف رواں تھا۔ ائیر پورٹ سے پر پہلا قدم رکھنے کا احساس اس کے لئے ناقابلِ بیان تھا۔ ایک احساس جو جانا پہچانا

تھا۔ جو کچھ اپنا اپنا دیکھائی دے رہا تھا۔ وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔ ہواؤں کی خوشبو بھی اپنی تھی۔ ان خوشبو میں بسنے والے بھی اپنے تھے۔ وہ ایک ایک شے کو بغور دیکھ رہا تھا۔ Ngurah Rai International Airport نے اپنا پہلا تاثر سب سے جدا چھوڑا تھا۔ ہر فرد مصروف تھا۔ کسی کو کسی کی پرواہ نہ تھی۔ لوگ بھی ایک سے دیکھائی دے رہے تھے۔ پستہ قد، چھوٹی آنکھیں، دیکھنے سے ایسا معلوم ہوا جیسے سارے ایک دوسرے کے عکس ہوں۔ ایسا اس نے بس فلموں میں دیکھا تھا اور اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ ائیر پورٹ سے باہر آیا تو جہانزیب کی ہدایات کے مطابق دینپا سار سے آئی ٹیکسی کا انتظار کرنے لگا۔

''ہزاروں جزیروں کی سرزمین انڈونیشیا...... اریب یہاں آچکا ہے۔'' اس نے دونوں بانہیں پھیلائے کہا تھا۔ جس پر پاس سے گزرنے والوں نے اعتراض کیا اور انڈونیشین میں اسے کچھ کہا تھا۔ وہ لفظوں کا مطلب تو نہ سمجھ سکا مگر پیشانی کی شکنوں نے اتنا ضرور سمجھایا کہ وہ اس کی حرکت پر ناراض ہیں۔ اسے شرمندگی سی ہوئی مگر جلد ہی اپنے عقب سے ایک آواز سنی۔

''آپ مسٹر اریب عالمگیر ہیں؟'' وہاں ایک پستہ قد نوجوان تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی یونیفارم میں ملبوس تھا۔

''جی، میں ہی اریب عالمگیر ہوں۔'' اردو میں پوچھے گئے سوال کا اردو میں ہی جواب دیا۔ البتہ اُس ڈرائیور کی اردو میں تھوڑا سا تناؤ تھا۔ شاید وہ اردو سیکھ رہا تھا۔

''میں گرینڈ مراج ہاٹل سے ہوں۔'' یہ کہا اور اریب کا سامان اٹھایا اور پارکنگ ایریا کی طرف چل دیا۔ اریب بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اریب کا خیال تھا شاید وہ عام سی ٹیکسی میں اسے ہاٹل لے کر جائے گا۔ جس کے لئے وہ ذہنی طور پر تیار بھی تھا مگر جس کار میں اس نے سامان رکھا۔ اسے دیکھ کر اسے ایک جھٹکا لگا۔ شاندار کار جو پہلی نظر میں ہی آنکھوں میں رچ بس گئی۔

''میں اس میں جاؤں گا؟'' اریب نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔

''جی بالکل۔ سر کے کہنے پر خاص آپ کے لئے بھیجی گئی ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے پچھلا ڈور اوپن کیا۔ اریب نے بیٹھنے پر لفظ سر پر غور کیا۔ شاید جہانزیب کے لئے اس نے سر کا لفظ استعمال کیا تھا۔

''امیزنگ......'' اس نے تعریف کرتے ہوئے کہا اور باہر کی طرف دیکھا۔

''ویسے ہاٹل کتنی دور ہے؟''

''صرف چالیس منٹ کی مسافت پر۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''چالیس منٹ؟ چلو کوئی نہیں۔ جہاں اٹھارہ گھنٹے گزارے، چالیس منٹ اور سہی۔'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا۔ ہر شے اس کے لئے نئی۔ کھلی سڑکیں، جو پاکستانی سڑکوں سے کہیں زیادہ صاف ستھرائی کا نمونہ تھیں اور لوگ بھی قوانین پر عمل کرتے دیکھائی دے رہے تھے۔ فٹ پاتھ پر لوگوں کا ہجوم اپنی اپنی منزل پر گامزن تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" اریب کو اچانک سے یاد آیا کہ اس نے نام تو پوچھا ہی نہیں۔

"میرا نام اِندر ہے۔" اس نے سادہ سے جملے میں جواب دیا تھا۔

"اِندر؟ یعنی ہندو۔" اس نے زیرلب کہا۔ شاید وہ اس کے لبوں کی جنبش سے الفاظ کا اندازہ لگا چکا تھا تبھی تیکھی نگاہوں سے مرر میں دیکھا۔ اریب نے جھرجھری لی۔

"یہاں تو خاموشی ہی بہتر ہے۔" اس نے سوچا اور نگاہیں باہر مرکوز کیں۔ سفر کی تھکان اور پھر اتنا لگژری ماحول اسے خوابوں کی دنیا میں لے گیا۔

"سر! ہاٹل آ گیا ہے۔" ایک آواز سماعت سے ٹکرائی تو اس کی آنکھ کھلی۔ اِندر اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔ وہ دفعتہً کار سے باہر آیا۔

"سوری۔ آنکھ لگ گئی تھی میری۔" اریب نے نوٹ کیا کہ وہ اس کی بات سنے بغیر کار سے سامان نکال کر ہاٹل کے اندر جا چکا تھا۔

"عجیب آدمی ہے۔" بے نیازی سے کندھے اچکائے اور سامنے دیکھا۔

"واؤ۔ کتنا چارمنگ ہاٹل ہے؟" وہ گرینڈ مراج ہاٹل کی خوبصورتی میں کھو چکا تھا۔ آگے بڑھا تو ایک سے بڑھ کر ایک شاندار سرپرائز ملے۔ اس نے ایسا ہاٹل پاکستان میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اب چھ ماہ یہی گزارنے والا تھا۔

"چھ ماہ؟" اس نے اپنے خیال کی مذمت کی۔ استہزائیہ مسکرایا۔ ملال نے جنم لیا کہ اسے یہ دھوکہ نہیں دینا چاہیے تھا سب کو مگر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"یہ سب بعد کا مسئلہ ہے۔ ابھی تو مجھے اپنے روم میں جا کر آرام کرنا چاہیے۔" اس نے خود سے کہا اور ریسیپشن کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ بناوٹ سے پاک، قدرتی حسن سے لبریز۔ پاکستانی ریسپشنسٹ کی طرح نہیں، جیولری اور میک اپ کا لبادہ اوڑھے ہوئے۔ بس سادگی کا عنصر نمایاں تھا۔

"کیز (چابیاں)۔" اس نے ایک ہی لفظ کہا تھا کہ اِندر کی آواز آئی۔

"آپ کا روم پہلے سے بک ہے۔ سیکنڈ فلور پر۔ میرے پیچھے آ جائیے۔" ابھی اس ریسیپشنسٹ نے اس کی طرف دیکھا ہی تھا کہ اس نے نگاہیں پھیر لیں اور اِندر کے پیچھے چل دیا۔

"کون تھا یہ؟" ریسپشنسٹ کے پاس مینیجر نے آ کر پوچھا تھا۔

"نہیں معلوم سر، اِندرا سے سیکنڈ فلور پر لے کر گیا ہے۔" اس نے شیریں لہجے میں جواب دیا تھا۔

"سیکنڈ فلور میں تو کوئی روم خالی نہیں ہے بس ایک روم ہے وہ بھی پہلے سے بک۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

"کہیں یہ اریب عالمگیر تو نہیں مسٹر جہانزیب عالمگیر کا بیٹا؟" یکدم اس کے ذہن میں اس کا خیال آیا تھا۔

"ہاں یہ وہی تھا۔اریب عالمگیر۔" اسے یقین ہو چلا تھا۔فی الفور وہ ریسپشنسٹ کی طرف پلٹا۔

"دیکھو۔جو ابھی ابھی لڑکا یہاں سے گیا ہے وہ اریب عالمگیر ہے۔ہمارے بہت اچھے پارٹنر جہانزیب عالمگیر کے بیٹے۔انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔" اس لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور ہاں!انہیں کہیں بھی جانے کی اجازت نہیں سوائے یونیوسٹی کے۔اگر وہ کہیں بھی جاتے ہیں تو ہاٹل کا کوئی بندہ ان کے ساتھ جائے گا اور ان کے آنے جانے کا ٹائم بالخصوص نوٹ کیا جائے گا۔جس کی انکوائری میں ہر روز شام کو تم سے لوں گا۔سمجھی تم؟" اس بار لہجہ قدرے سخت تھا۔جس پر وہ لڑکی ذرا سی گھبرائی۔پیشانی پر پسینے کی بوندیں بھی نمودار ہوئیں مگر اس نے اپنے اعصاب پر قابو پالیا۔

"ان کی ایک ایک حرکت پر تم نے نظر رکھنی ہے۔" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔

"وللہ......کیسا بندہ ہے یہ اریب جو اتنی سکیورٹی؟" اسے کچھ گڑبڑ محسوس ہوئی تھی مگر ڈیوٹی تو سرانجام دینی تھی۔

"سر یہ ہے آپ کا روم۔اگر کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو آپ ریسپشن پر کال کر سکتے ہیں۔تمام ضروری نمبر ڈائری میں لکھ دیئے گئے ہیں اور ڈائری فون کے ساتھ ہی رکھی ہے۔اچھا اب میں چلتا ہوں؟" وہ متجل کہہ کر پلٹا تھا۔

"رکو۔" اریب کی نگاہیں پہلے تو اس روم کا جائزہ لے رہی تھیں مگر اندر کے پلٹتے ہی وہ بھی اس کی طرف مڑا۔

"جی فرمایئے۔"

"کیا یہ میرا ہی روم ہے؟" اس کا لہجہ غیر یقینی تھا۔

"جی بالکل۔یہ آپ ہی کا روم ہے۔سر نے بالخصوص آپ کے لئے بک کروایا تھا اور کہا گیا تھا کہ آپ کو اسی روم میں رکھا جائے۔" اریب کے لئے یہ قطعاً ناقابل یقین تھا کہ جہانزیب نے اس کے لئے ایک عدد روم بھی بک کروالیا ہے اور وہ بھی ایک لگژری روم۔ڈبل بیڈ،دلکش آوٹ سائیڈ ویو،چھوٹا سا لاؤنج سب کچھ دلکش تھا۔

"اب میں چلتا ہوں۔" ایک بار پھر اس نے اجازت چاہی تھی۔

"اس ملک میں کیا کھانے کا رواج نہیں ہے کیا؟" اریب نے فی الفور کہا۔

"سوری سر۔کھانا آپ کو آرڈر پر دے کر منگوانا ہوگا۔آپ ریسپشن پر کال کر دیں۔پانچ منٹ میں کھانا آپ کے روم میں ہوگا۔میری ڈیوٹی جسٹ گیسٹ کو پک کرنا اور انہیں ان کا روم دیکھانا ہے۔" اس نے پروفیشنل انداز میں کہا اور پھر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

"کتنا بولتا ہے یہ لڑکا......!" روم سے نکلتے ہی اندر بڑبڑایا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔اب میں یہاں رہنے والا ہوں؟" وہ بیڈ پر اچھلا تھا اور دھڑام سے براجمان ہو گیا۔آنکھیں تھکاوٹ سے پہلے ہی بوجھل تھیں۔خوابوں کی دنیا تک مسافت طے کرنے میں زیادہ وقت نہ لگا۔

☆ ☆ ☆

آنسو مرے تو خیر وضاحت طلب نہ تھے
تیری ہنسی کا راز بھی دنیا پہ فاش ہے

قرآن اکیڈمی جاتے ہوئے آج اسے ایک جانا پہنچانا چہرہ نظر آیا تھا۔ اس نے ڈرائیور کو کار روکنے کے لئے کہا۔ کار سے اترنے کے بعد وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس بچے کی طرف گئی۔ جو یتیم خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آسمانی رنگ کی شرٹ پر پسینہ آسمان سے برستی بارش کی مانند تھا۔ شانوں پر سیاہ بستہ جو کتابوں سے لدا ہوا تھا۔ جسے وہ تقریباً گھسیٹتا ہوا بڑھ رہا تھا۔

"رکو......!" پیچھے سے حاعفہ نے آواز دی تو وہ بچہ یتیم خانے کے دروازے کے عین سامنے رکا تھا۔

"تم عاطی ہو؟" اس نے پوچھا تو وہ بچہ پلٹا۔ چہرہ وہی تھا۔ عاطی...... خدیجہ کا عاطی۔ چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ بچہ الجھی الجھی نگاہوں سے اسے یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"عاطی...... کیسے ہو تم؟ آپی کیسی ہیں؟" اس نے جھکتے ہوئے عاطی کو پیار کیا تھا۔ پیشانی چومی، رخسار پر بوسہ دیا مگر وہ خاموش رہا۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔

"کیا ہوا عاطی؟ امی جان کیسی ہیں؟" اس سوال پر اس کی آنکھوں میں آنسو جمع ہو گئے۔

"عاطی؟ کیا ہوا بیٹا؟" حاعفہ پریشان دیکھائی دی۔ اتنے میں وہاں پر کیئر ٹیکر آموجود ہوئی تھی۔

"عاطی، اندر چلو۔" عاطی بنا جواب دیئے اس کے پیچھے چل دیا۔ حاعفہ چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

"یہ عاطی یہاں رہتا ہے؟ مگر کیوں؟" اس کے ذہن میں کئی سوال جنم لینے لگے۔ اس نے بنا سوچے سمجھے آفس کا رخ کیا اور وہاں پر موجود آفیسر سے عاطی کے بارے میں معلومات لیں۔

"میڈم! عاطی ایک سال پہلے ہی یہاں آیا تھا۔ اس کی ماں اسے یہاں چھوڑ کر گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اُس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور عاطی کا اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے وہ انہیں یہاں چھوڑ کر جا رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ محض دو دن بعد اس خاتون کا انتقال بھی ہو گیا۔" یہ سن کر حاعفہ پر جیسے پہاڑ ٹوٹا تھا۔ آنکھیں خود بخود برسنا شروع ہو گئیں۔ اتنا عرصہ اس نے خدیجہ کو ڈھونڈنے میں لگا دیا اور آج اس کے بارے میں معلومات بھی ملی مگر ایسے؟ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کاش وہ اس خبر کو کبھی نہ سنتی۔

"آپی...... نہیں رہیں؟" اس نے زیر لب کہا تھا۔ ہونٹ بچوں کی طرح بلبلا اٹھے تھے۔ ہر شے مبہم دیکھائی دے رہی تھی۔ ایسا لگا جیسے زمین پھٹے گی اور وہ اس میں گڑھتی چلی جائے گی۔

"عاطی کو اس بارے میں معلوم ہے؟" بمشکل اس نے یہ سوال پوچھا تھا۔

"ایسی باتیں کہاں چھپائی جا سکتی ہیں؟" آنکھوں سے ایک جھری بندھ گئی۔ دل کرچی کرچی ہو گیا۔ کچھ دیر یونہی گزر جانے کے

بعد اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آنسو پونچھتے ہوئے وہ پورے اعتماد کے ساتھ گویا ہوئی۔

''میں عاطی کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں۔'' اس پر اس آفیسر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''مگر کیوں؟ کیا آپ اس کی رشتے دار ہیں؟''

''کیونکہ خدیجہ آپی کا میرے اوپر ایک بہت بڑا احسان ہے۔ اب وہ نہیں رہیں مگر ان کے بیٹے عاطی کو میری ضرورت ہے۔ میں عاطی کو اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہوں گی۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔

''لیکن؟'' اس نے مداخلت کرنا چاہی تھی۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ میں عاطی کو اب مزید اس یتیم خانے میں رہتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں اس کی آنٹی ہوں۔ وہ میرے ساتھ رہے گا۔ اگر آپ کو کوئی شک ہے تو یہ لیجیے میرے آئی ڈی کارڈ کی فوٹو کاپی۔ آپ مزید تحقیق کر سکتے ہیں مگر میں ابھی اور اسی وقت عاطی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہوں گی۔'' وہ قطعاً عاطی کو لئے بغیر جانا نہیں چاہتی تھی۔

''لیکن میڈم۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''سمجھنے کی کوشش آپ کریں۔ عاطی میرے پاس رہے گا۔ وہ میری ذمہ داری ہے۔ میرا فرض ہے وہ۔ اس کی والدہ نے میرے اوپر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اب جب احسان چکانے کا موقع آیا تو میں ایسے کیسے پیچھے ہٹ سکتی ہوں؟'' اس کا لہجہ کچھ جارحانہ تھا۔ کچھ دیر آفس میں خاموشی چھائی رہی۔

کچھ دیر میں وہاں پر عاطی کو بلایا گیا۔

''عاطی یہ آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہیں۔ کیا آپ انہیں جانتے ہیں؟'' سب کی نظریں عاطی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ معصوم چہرہ جسے کچھ سمجھ نہ تھی۔ یک ٹک حاعفہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''عاطی آپ میرے ساتھ رہو گے ناں؟'' حاعفہ نے گلوگیر لہجے میں استفسار کیا تھا۔ اُس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ جس پر خوشی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔ فرط جذبات میں اس نے عاطی کو گلے سے لگایا۔

''لیکن آپ ایسے نہیں لے جا سکتیں عاطی کو۔ آپ کو کچھ فارملیٹیز سے گزرنا ہوگا۔''

''آپ جو کہیں گے میں کرنے کو تیار ہوں۔ بس مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ عاطی اب میرے ساتھ رہے گا۔'' معصوم چہرہ خوش ہوا یا پھر ناخوش؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ بس ہلکی سی کسک ابھری۔ حاعفہ نے اپنے دونوں ہاتھوں میں اس پھول کو سمیٹا تو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے خدیجہ کو چھوا ہو۔ آنکھوں میں نمی کی ایک باریک سی تہہ ابھر آئی تھی۔ عاطی کا چہرہ کس قدر خدیجہ سے ملتا تھا۔ جب وہ مسکراتا تو اسی کا عکس لگتا لیکن آنکھیں وہ اس پر نہ تھیں۔ بس نیلی آنکھیں اس نے کسی اور سے مستعار لی تھیں۔

"یہ لیجیے۔" کچھ دیر میں حاعفہ کو ایک فارم دیا گیا جسے اس نے بخوشی لیا اور ٹیبل پر رکھ کر اسے فل کرنے لگی۔ ایک کیئر ٹیکر نے عاطی کا سامان سمیٹ کر وہاں لا کر رکھ دیا۔ ضروری کاروائی مکمل ہوئی تو حاعفہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئی۔ راستے میں اس نے عاطی سے خوب باتیں کیں۔ وہ بھی اس سے گھل مل چکا تھا۔ باتوں کے دوران اکثر اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔

"آپ تو بالکل میری امی جان کی طرح روتی ہیں۔" معصوم عاطی نے کہا تھا۔ حاعفہ نے ایک جھرجھری لی۔ عاطی کے چہرے کی طرف دیکھا تو سب سے بیگانہ پایا۔

"اچھا! کیا آپ کی امی جان بس روتی رہتی تھیں؟"

"جی...... لیکن جب میں ان سے پوچھتا کہ وہ کیوں رو رہی ہیں تو وہ کوئی بہانہ بنا لیتیں۔" وہ ونڈ سکرین پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ شاید پہلی بار کار میں بیٹھا تھا۔ اسی لئے ایک ایک شے کو چھو کر اس کے حقیقی ہونے کا گمان کر رہا تھا۔ حاعفہ کو ایک جھٹکا لگا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں کھو چکی تھی۔

"اس کا مطلب خدیجہ آپی کو کوئی پریشانی تھی۔ اگر ایسا تھا تو انہوں نے مجھ سے اس کو ڈسکس کیوں نہیں کیا؟" دل میں اس نے سوچا تھا مگر جواب ملنا محال تھا۔ کڑی سے کڑی جڑتی مگر پھر ٹوٹ جاتی۔ عاطی کے معصوم چہرے کی طرف دیکھا تو دنیا و مافیہا کے اس فریب سے انجان پایا۔

"جانے اس معصوم پر کون سی قیامت ٹوٹی ہے؟ اور کتنی ٹوٹنی ابھی باقی ہیں؟" اس نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پلٹ کر مسکرا دیا۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دی مگر اس مسکراہٹ میں خوشی کم ہمدردی زیادہ تھی۔

☆ ☆ ☆

مرے دشمنِ جان، تیرے واسطے

کئی دوستوں کو بھلنا پڑا

جزیروں کی سرزمین پر اس کی پہلی صبح تھی۔ اپنے ملک کی طرح مگر کچھ الگ۔ صبح کا آغاز ہمیشہ کی طرح تغافل کی نیند سے ہوا۔ سورج نے جب تک کھڑکی کے شیشے سے اندر نہ جھانکا، اس کی بند پلکوں میں لرزش نہ ہوئی۔ نرم حدت آنکھوں میں گداز کا احساس پیدا کرنے کی اپنی تئیں سعی کر رہی تھی۔ اس نے کروٹ لی تو ہاتھ انجانے میں الارم واچ سے جا لگا اور نیچے گرنے کی آواز آئی۔ وہ دفعتاً اٹھ بیٹھا۔ بائیں جانب دیکھا تو الارم کا کچھ حصہ علیحدہ ہو چکا تھا۔

"اوہ...... پہلا نقصان؟" اس نے سوچا اور پھر دوبارہ دھڑام سے لیٹ گیا۔

"بدھ...... یونیورسٹی...... پہلا دن......" اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔ وہ جھرجھری لیتا ہوا کھڑا ہوا۔ لحاف پیچھے پھینکا اور وارڈ

روب کی طرف بڑھا۔ دروازہ وا کیا تو سوائے خوشگوار خوشبو کے کچھ نہ ملا۔

"یہ لوگ وارڈ روب کو بھی پرفیوم لگاتے ہیں کیا؟" اس نے حیرانی سے استفسار کیا اور گہری سانس لیتے ہوئے اس خوشبو کو اپنے جسم کا حصہ بنایا۔ ایک خوشگوار احساس......گلاب اور چنبیلی کے پھولوں سے بھی زیادہ فرحت بخشتا......ایسا احساس جو سب کچھ بھلا دے۔ ایسی خوشبو جو بار بار محسوس کرنے کو جی چاہے۔ ایسی خوشبو جو اگر ایک بار جسم سے مس کر جائے تو ہزاروں نفوس کے درمیان بھی اس شخص کو ممتاز کر دے۔

"نہیں......میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔" اس نے خود کو اس حسین خواب سے باہر نکالا اور صوفے کے دائیں جانب کھڑکی کے بالکل سامنے رکھے سوٹ کیس کی طرف دیکھا جو اندر نے کل شب رکھا تھا۔

"تھکاوٹ میں اپنا سامان بھی وارڈ روب میں لگانا بھول گیا لیکن ابھی تو میرے پاس وقت نہیں ہے۔" سوٹ کیس کو گھسیٹ کر صوفے کے سامنے لایا اور پھر اس میں سے کئی شرٹس، ٹراوزر، جینز باہر نکال پھینکیں۔

"اس طرح کرتا ہوں ابھی کے لئے بلیو جینز اور براؤن شرٹ سیلیکٹ کرلوں سیٹنگ بعد میں کرلوں گا۔" اس نے باہر نکلی شرٹس، جینز وغیرہ کو ایسے ہی چھوڑا اور اٹھ کر فون کی طرف بڑھا۔ وہاں سے ڈائری اٹھائی اور ریسپشن کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو! السلام علیکم۔ میں اریب عالمگیر ہوں۔ مجھے ارجنٹ اپنے کپڑے آئرن کروانے ہیں اور ساتھ میں بریک فاسٹ بھی پلیز ارجنٹ۔" مختصر کہا اور فون کریڈل پر رکھ دیا۔ ابھی بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے ہونگے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا تو ویٹرس کے کپڑے میں ملبوس ایک بیس بائیس سالہ لڑکی کھڑی تھی۔ نین نقش انڈونیشین تھے۔ اریب اسے دیکھ کر ہچکچایا کہ اس سے کیسے بات کرے؟

"سر یہ آپ کا ناشتہ اور اپنے کپڑے مجھے دے دیجیے۔ میں پانچ منٹ میں آئرن کر کے لاتی ہوں۔" ایک مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنی بات اردو میں اریب تک پہنچائی تھی۔ وہ اس کو دیکھتا رہ گیا۔

"ایکسکیوز می سر؟" اریب کو یک ٹک اپنی طرف دیکھنے پر اس نے اس بار انگلش کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ اریب نے جھرجھری لی اور اپنے پیچھے صوفے کی طرف اشارہ کیا جہاں اس کی جینز اور شرٹ رکھی تھیں۔ وہ ناشتے کی ٹرالی اندر لے آئی اور جینز اور شرٹ اٹھانے کے بعد پلٹی تو اس کی نظر صوفے پر بکھرے سامان پر پڑی۔

"اگر آپ کہیں تو ان کپڑوں کو وارڈ روب میں سیٹ کر دوں؟" اریب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن انہیں آئرن کرنے کے بعد۔" اس کا اشارہ جینز اور شرٹ کی طرف تھا۔ وہ مسکرائی اور جانے کے لئے پلٹی۔

"ٹھہریئے۔ آپ کا نام؟"

"علوی۔" اس نے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

''تھینک یو علوی فار دِس بریک فاسٹ۔''

''یہ تو میری ڈیوٹی ہے سر۔'' یہ کہہ کر وہ باہر کو چل دی۔ اریب نے دروازہ بند کیا۔ بیڈ پر آ کر ناشتہ کیا۔ ناشتے میں صرف ایک کپ دودھ اور دو پیس سینڈوچ کے تھے۔ جسے کھانے میں اسے بمشکل دو منٹ لگے تھے۔

''یہ ناشتہ تھا یا پھر یہ ناشتے کا ٹریلر؟'' اس نے حیرت سے سرگوشی کی تھی۔ دروازے پر دوبارہ دستک ہوا۔ علوی ہینگر لئے کھڑی تھی۔

''یہ لیجیے سر۔'' اریب نے ہینگر لینے کے بعد اسے ناشتے کا سامان لے جانے کے لئے جگہ دی مگر وہ ٹرالی کی طرف بڑھنے کی بجائے صوفے کی طرف گئی۔ شاید اسے یاد تھا کہ اس نے وارڈ روب سیٹ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

''ویسے کیا آپ کے دیس میں ناشتے پر کرفیو نافذ ہے؟ جو چار چیزیں ایک ساتھ نہیں مل سکتیں؟'' ہینگر سے جینز نکالتے ہوئے وہ بیڈ کی طرف بڑھا تھا۔

''ایسا آپ کو کس نے کہا؟'' وہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیونکہ ناشتے میں صرف دو پیس سینڈوچ کے اور ایک گلاس دودھ تھا۔'' اریب کی بات پر وہ نادم دیکھائی دی۔ اس نے گردن کو جھکا کر دھیمے لہجے میں کہا۔

''اگر آپ کو کچھ اور چاہیے تو آپ بتا دیں۔ میں وہ ناشتے کے لئے لے آتی ہوں۔'' اریب اس کی شرمندگی کو محسوس کر چکا تھا۔

''نہیں...... نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ابھی تو شاید میں اس سے زیادہ ناشتہ کر بھی نہ پاتا کیونکہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' یہ کہتے ہی وہ واش روم میں گیا اور شاور لینے کے بعد شرٹ اور جینز پہنے باہر آیا تھا۔ علوی اس وقت تک پوری وارڈ روب سیٹ کر چکی تھی۔

''ماریہ سے کہیں زیادہ سگھڑ ہے علوی تو۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''آپ نے کچھ کہا؟'' وہ اس کے لفظوں کو سن نہ سکی تھی۔ اریب نے نفی میں گردن ہلائی اور پھر ڈریسنگ کی طرف بڑھ کر بالوں کو سیٹ کیا۔ جو گیلے ٹاول سے پہلے ہی خشک کئے جا چکے تھے۔ بس ہلکی سی نمی باقی تھی۔ علوی اپنا کام کر کے جا چکی تھی۔

اریب نے لیپ ٹاپ آن کرنے کے بعد ضروری انفارمیشن ایک پیپر پر لکھیں۔ جس میں کچھ فون نمبر بھی شامل تھے۔ اسے جینز میں ٹھونسا اور پھر باہر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

ریسیپشن کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اپنے عقب سے آواز آئی تھی۔

''ایکسکیوز می سر؟'' یہ ریسیپشنسٹ کی آواز تھی۔ آگے بڑھتا قدم دوبارہ پلٹا۔

''جی۔''

''آپ کی یونیورسٹی تو کل سے سٹارٹ ہو رہی ہے تو آج آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' اس کی پیشانی پر کچھ شکن نمودار ہوئے۔ کچھ

ثانیے بغور ریسپشنسٹ کو دیکھا اور پھر جینز میں ہاتھ ڈال کر شانے اچکائے۔

"اچھا؟ شاید میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔" وہ مسکرا دی۔ اریب نے ایک نظر اس کے سامنے رکھی فائل پر ڈالی۔ جہاں کئی نام لکھے ہوئے تھے۔ شاید کون آرہا ہے اور کون جا رہا ہے؟ اس کی معلومات درج کرنا بھی اس کی ڈیوٹی میں شامل تھا۔ فائل کے ساتھ ہی ایک بکس تھا، جس میں بہت سے وزٹنگ کارڈ ترتیب کے ساتھ رکھے تھے اور اس سے ایک انچ کے فاصلے پر ہی ریسپشنسٹ کا چھوٹا سا ٹائٹل کارڈ بورڈ پر لکھا ہوا پڑا تھا۔ اریب نوے درجے کے زاویے پر گھما تو ویٹنگ ایریا کا بورڈ نظر آیا۔ جہاں دو آدمی بیٹھے نیوز پیپر پڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے نیوز پیپر فولڈ کرتے ہوئے تیکھی نگاہوں سے اریب پر نگاہ ڈالی تو اس نے فوراً نظریں پھیر لیں اور باہر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں سے ابھی اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو گیسٹ تھے۔ جن کا سامان اس نے تھاما ہوا تھا۔

"اچھا پھر میں شہر کا وزٹ کر لوں۔" اس نے ریسپشن ٹیبل پر کہنی رکھ کر بے نیازی سے کہا اور پھر شانے اچکاتے ہوئے شرٹ سیدھی کی۔ ابھی اس نے قدم اٹھانا ہی چاہا تھا کہ اسی آواز نے پلٹنے پر مجبور کیا۔

"آپ اکیلے نہیں جا سکتے۔" اریب نے تیکھے انداز میں اُس کی طرف دیکھا تھا۔

"میرا مطلب ہے، آپ یہاں پہلی بار آئے ہیں، اس شہر کے تمام راستے آپ کے انجان ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ ہمارے ہاٹل کے کسی ورکر کو ساتھ لے جائیں۔" اریب کی استفہامیہ نگاہوں کو وہ بخوبی سمجھ چکی تھی۔

"لیکن میں بچہ نہیں ہوں جو کھو جاؤں گا۔ واپسی کا راستہ مجھے بخوبی یاد رہے گا۔" اس نے طنزیہ کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں لیکن یہاں کے لوگوں کو آپ نہیں جانتے۔ ہو سکتا ہے کوئی انڈر ورلڈ کا آدمی آپ کو انجان سمجھ کر کڈنیپ کر لے۔"

"اوہ...... یہاں ایسا بھی ہوتا ہے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں ابرو اچکائے تھے اور ریسپشن ٹیبل پر کہنیوں کے بل جھکا تھا۔

"جی بالکل۔ ہمارا ہوٹل بالی کی مشہور شہراہ پر واقع ہے اور یہاں اکثر بزنس مین ہی آکر سٹے (ٹھہراؤ) کرتے ہیں۔ اس لئے اس مافیہا کے کئی کارندے ہمارے ہاٹل کے اردگرد منڈلاتے رہتے ہیں تا کہ مشہور شخصیات کو کڈنیپ کر کے بھاری تاوان وصول کیا جا سکے۔" وہ اریب کے انداز کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ تبھی سنجیدہ انداز میں کہتی جا رہی تھی۔

"دیکھیے مس......!" وہ اس کا نام نہیں جانتا تھا اس لئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"پریشے۔" اس نے اپنا نام بتایا تھا۔

"تھینک یو، تو بات یہ ہے مس پریشے میرے سامنے کوئی انڈر ورلڈ کا آدمی ہو یا پھر اَپ ورلڈ کا، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کون میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔ مجھے پہلے ہی خبر ہو جاتی ہے۔ اس لئے آپ کو میرے بارے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے نرم گوشے میں اس کی سرزنش کی تھی۔ وہ بھی کچھ نادم دکھائی دی۔ وہ ایسا نہ کرتی اگر اسے ایسا کرنے کو نہ کہا جاتا۔ اریب نے گردن جھٹکی اور پریشے کی باتوں کو ہوا میں اڑاتے ہوئے باہر دروازے کی طرف پلٹا۔

"مسٹر اریب عالمگیر!" یہ مینیجر کی آواز تھی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثر ابھرے۔

"لگتا ہے بابا جان نے یہاں کی پوری ٹیم کو میرے آنے جانے پر نظر رکھنے کو کہا ہوا ہے۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا تھا۔ لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹا۔

"یس سر۔"

"پاکستان سے آپ کا فون آیا ہے۔ شاید آپ نے ابھی تک اپنی سم موبائل میں نہیں ڈالی تھی اس لئے میرے نمبر پر یہ کال آئی ہے۔" مینیجر نے اپنا موبائل آگے بڑھایا تو اس نے جھرجھری لی۔ وہ واقعی پاکستان فون کرنا ہی بھول چکا تھا۔

"سوری۔" اس نے متجل فون پکڑا اور ویٹنگ ایریا کی طرف بڑھا۔ مینیجر تیکھی نگاہوں سے پریشے کی طرف پلٹا۔

"ایسے ڈیوٹی کرتے ہیں؟ تمہیں صرف ایک کام سونپا گیا تھا کہ اریب کو ہاٹل سے باہر نہیں جانے دینا اور تم سے وہی نہیں ہوا۔ یہ تو اچھا ہوا میں نے تمہاری گفتگو سن لی اور پاکستان فون کر کے معاملے کو سنبھال لیا۔ ورنہ جانتی ہو، کیا ہو جاتا؟" وہ دھیمے مگر سخت لہجے میں اس کی سرزنش کر رہا تھا۔ پریشے کی نگاہیں جھکی تھی۔

"سوری سر۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" آواز میں ندامت کا عنصر نمایاں تھا۔

"اور ہونا بھی نہیں چاہیے ورنہ ایک سیکنڈ نہیں لگے گا تمہیں اس جاب سے فارغ کرنے میں مجھے۔" اس نے تنبیہ کی تھی۔ پریشے کی آنکھیں پرنم دکھائی دیں۔ یہ جاب اس نے کتنے جتن اٹھا کر حاصل کی تھی؟ یہ صرف وہی جانتی تھی اور اب محض ایک غلطی کے سبب وہ اس جاب سے بھی ہاتھ دھونے جا رہی تھی۔

مینیجر کے جانے کے بعد اس نے پرنم آنکھوں سے اریب کی طرف دیکھا جو ہنستے ہوئے فون پر باتیں کر رہا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا اس کا وجود ہر شے سے بے نیاز تھا۔

"نواب زادہ، دوسروں کی آنکھوں میں آنسوؤں کا موجب بن کر قہقہہ لگا رہا ہے!" اس نے تیکھے لہجے میں کہا تھا۔

"کاش، یہ آنسو اس اُس کی آنکھوں میں ہوتے تو پتا چلتا کہ کسی کی آنکھوں میں آنسو لانا تو بہت آسان ہے مگر ان آنسوؤں کو سہنا کتنا مشکل؟" وہ بجھے ہوئے دل سے کہہ رہی تھی۔ ذہن میں پیچھے گھر کا نقشہ کسی فلم کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔

جہاں ایک بوڑھی ماں اپنے علاج کے لئے بیٹھی تھی۔ ایک چھوٹا بھائی جو بہن کے پیسوں پر عیاشی کرتا تھا اور پھر بینک سے لان واپس کرنے کے نوٹس، جو اس نے اپنے باپ کے علاج کی خاطر لیے تھے مگر نہ لان کام آیا اور نہ جان بچی البتہ ایک وبال اس کی جان پر

ضرور بڑھ چکا تھا۔

اریب نے ہنستے ہوئے اس چہرے کی طرف دیکھا تو بائیں ہاتھ کی پشت کو آنسو پونچھتے ہوئے پایا۔ پیشانی کی لکیریں دور سے ہی پڑھی جاسکتی تھیں۔ اس نے فون بند کیا۔ وہ دھیرے قدموں کے ساتھ ریسیپشن کی طرف آیا۔ اسے وہاں دیکھ کر پریشے ایک بار پھر گھبرا گئی۔ اپنی نوکری جاتی دکھائی دی۔

"دیکھیے۔" پریشے نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اریب نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"آئی ایم سوری۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ آپ دو گھنٹے بعد کسی ڈرائیور کا انتظام کر دیجیے گا، میں شہر دیکھنا چاہتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لفٹ کی طرف بڑھا۔ پریشے حیرت سے اس کو جاتا دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں کی نمی بھی استفہامیہ انداز میں چمک رہی تھی۔ اس کا چارمنگ سٹائل اب اس کے لبوں پر مسکراہٹ کا سبب بنا تھا۔

"یہ اتنی جلدی سمجھ گیا؟ مگر کیسے؟" وہ حیرت کا شکار تھی مگر اریب کے لئے یہ نئی بات نہ تھی۔

☆ ☆ ☆

موسم گل کے تقاضوں سے بغاوت ٹھہرا

قفس غنچہ سے خوشبو کا رہا ہو جانا

پردیس کی یونیورسٹی میں پہلا دن جہاں اپنے اندر ایک خوشی سمیٹے ہوئے تھا وہیں اپنی منزل کو بہت قریب آتا دیکھ کر ایک یقینی خوشی غالب تھی۔ آج وہ معمول کے مطابق اٹھا تھا اگر پاکستان ہوتا تو یقیناً وہ لیٹ ہو چکا ہوتا لیکن یہاں اس کی کلاس نو بجے شروع ہوتی تھی۔ ابھی فقط آٹھ بجے تھے۔ وہ جلدی میں تیار ہوا۔ معمول سے ذرا ہٹ کر اس نے اس نے امپورٹنٹ ڈاکیومنٹ بیگ میں رکھے اور بائیں شانے پر ڈوری لٹکا کر والٹ اور موبائل جینز میں اڑیسے اور ناشتہ کئے بغیر اپنے روم سے باہر آگیا۔ ابھی وہ راہداری میں ہی تھا کہ علوی ناشتہ لاتی دکھائی دی۔

"السلام علیکم! سر۔ آپ کہیں جا رہے ہیں؟ ناشتہ نہیں کریں گے؟"

"وعلیکم السلام۔ یونیورسٹی جا رہا ہوں۔ ناشتے کا وقت نہیں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کے سائیڈ سے نکل گیا۔ علوی نے پلٹ کر ناشتے کی ٹرالی کو گھمایا۔

"لیکن سر! کچھ تو کھا لیجیے۔" وہ اس کی بات سننے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ لفٹ آن تھی۔ اس نے گراؤنڈ فلور کا بٹن پریس کیا۔ چند سیکنڈز بعد وہ ریسیپشن کے عین سامنے تھے۔

ریسیپشن پر ہمیشہ کی طرح پریشے اپنے کام میں مصروف تھی۔ ریسیور کو شانے کی مدد سے کان پر لگائے وہ کسی سے بات کر رہی

تھی۔ اریب مسکراتا ہوا اس کے سامنے سے گزرا تو اسے کسی کے گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ چونکی اور بغور دیکھا۔

”ایکسکیوزمی سر!“ فون کو ہولڈ پر لگاتے ہوئے پریشے نے اپنی توجہ اریب کی طرف مبذول کی تو وہ مسکراتا ہوا پلٹا اور دھیمے قدموں کے ساتھ ریسیپشن پر آیا۔

”کیا آج بھی آپ کی جاب کو خطرہ ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں یونیورسٹی جانا بھی رہنے دیتا ہوں۔“ اس نے شوخ لہجے میں ٹیبل پر تقریباً جھکتے ہوئے کہا تھا۔ پریشے کے چہرے پر ندامت اور تبسم کے ملے جلے تاثر تھے۔

”نہیں سر، آج ایسی بات نہیں ہے۔ میں کہنے والی تھی کہ اِندر باہر پارکنگ ایریا میں ویٹ کر رہا ہے۔ آج سے آپ کو وہی یونیورسٹی سے پک اینڈ ڈراپ کرے گا۔“ پریشے کی بات پر اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ریسیپشن ٹیبل پر رکھے وزٹنگ کارڈز میں سے ایک کارڈ اٹھا کر سرسری نگاہ ڈالی۔

”اس کی ضرورت تو نہیں تھی مجھے۔ میں اکیلا بھی جا سکتا تھا۔ محض 2.9 کلومیٹر کے فاصلے پر تو ہے یونیوسٹی۔“ وہ اب پریشے کے پیچھے لگی پینٹنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں گرینڈ مراج ہاٹل کا نقشہ تھا۔

”بالکل اور اِندر آپ کو صرف دس منٹ میں وہاں پہنچا دے گا۔“ پریشے مسکرائی اور ہولڈ پر لگی کال کو دوبارہ پک کیا۔ اریب نے کندھے اچکائے اور باہر کی طرف چل دیا۔ اِندر پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اریب کو آتا دیکھ کر اس نے بیک ڈور اوپن کیا۔ اریب کے بیٹھنے پر اس نے اپنی پوزیشن سنبھالی تھی۔

”آپ کی واپسی کس وقت متوقع ہے؟ تاکہ میں ٹائم پر پہنچ جاؤں۔“ اِندر نے مختصر کہا۔

”اگر میں نے واپسی کا بتا دیا تو اسے وقت کا پتا چل جائے گا اور یوں میرا ادھر ادھر جانا محال ہو جائے گا۔“ اس نے دل میں سوچا اور خاموشی اختیار کیے رہی۔

”سر۔“ اِندر نے دوبارہ پوچھا۔

”پتا نہیں۔ شاید شام تک؟“ اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

”سر یہ پاکستان نہیں ہے جو صبح کی کلاس شام تک جاری رہے۔ میں ایسا کرتا ہوں، ۲ بجے تک آ جاؤں گا۔“ اِندر نے کہا تو اریب نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ دس منٹ بعد وہ یونیورسٹی کے صدر دروازے کے باہر تھے۔

”سر یونیورسٹی آ گئی۔“ اِندر کے کہنے پر وہ چونکا اور بائیں جانب دیکھا تو ایک عظیم گیٹ اپنے سامنے پایا۔ پہلا قدم باہر نکالا تو عظیم انڈونیشیا، عظیم انڈونیشیا، ترانہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ وہ پلٹا تو سامنے ایک سکول سے یہ آواز بلند ہو رہی تھی۔

”اب میں چلتا ہوں سر۔“ اِندر نے دوبارہ کہا تو اس نے جھرجھری لی۔ آس پاس سے گزرتے کئی لوگوں نے اس پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔

"اِندر! تم مجھے سر نہ کہا کرو۔ میرا اتنا اچھا تو نام ہے اریب عالمگیر۔ تم مجھے اریب کہہ سکتے ہو۔" وہ سر کہنے پر عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ دو دن میں اس نے جتنی بار سر سنا تھا شاید ہی اس نے کبھی پوری زندگی میں کسی ٹیچر کو کہا ہو۔

"لیکن سر؟" اِندر نے کچھ کہنا چاہا تو اس نے گھور کر دیکھا۔

"او کے۔" وہ سر جھکا کر پسپا ہو کر چل دیا۔ اریب پلٹا اور پردیس کی یونیورسٹی میں اپنا پہلا قدم رکھا۔ مقامی اور غیر ملکی سٹوڈنٹس وہاں عام دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ سب سے پہلے سٹوڈنٹ افیئر آفس کی طرف بڑھا۔ وہاں سے سٹوڈنٹ کارڈ لینا تھا اور کلاسز کا شیڈول بھی شاید وہیں سے جاری ہونا تھا۔ اس نے ایک سٹوڈنٹ سے راستہ پوچھا تو اس نے خوش اخلاقی سے انڈونیشین زبان میں راستہ سمجھایا۔ اریب تو بس اس کے چہرے کو ہی تکتا رہ گیا۔

"میں نے انگلش میں پوچھا تھا، انڈونیشین میں نہیں۔" اس نے دل میں سوچا۔

"Thank you dude, but can you explain these words in english?" اس نے لحاظ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"سوری۔" یہ کہہ کر وہ سائیڈ سے کھسکتا معلوم ہوا۔ شاید اس کو انگلش نہیں آتی تھی۔

"عجیب لڑکا تھا۔" اس نے بے پرواہی سے شانے اچکائے اور دائیں بائیں دیکھا۔ اسے ایک انگریز آتی دیکھائی دی۔ وہ اس کی طرف لپکا اور مطلوبہ آفس کا راستہ پوچھا۔ اس نے بڑی ہی خوش اخلاقی سے انگلش میں راستہ بتا دیا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد وہ وہاں پہنچا تو سٹوڈنٹس کی ایک قطار کو اپنا منتظر پایا۔

"اُفف...... اب اس لائن میں بھی کھڑا ہونا پڑے گا؟" اس نے سوچا اور اپنی پوزیشن سنبھالی۔ تیس منٹ بعد اس کی باری آ چکی تھی۔ جلد ہی اسے اپنا کارڈ مل گیا اور ساتھ کلاسز کا شیڈول بھی۔

"ہفتے میں سات کلاسز ہیں۔ دو سوموار کو لیکچر روم میں۔ ایک منگل کو تھیٹر میں۔ دو بدھ کو ڈی ایل سی میں۔ ایک سینٹ ہال میں جمعرات کو اور آخری کلاس جمعہ کو لیکچر روم میں۔ ہفتہ اتوار آف۔" اس نے قدرے اونچی آواز میں پڑھا تھا اور نگاہیں اسی شیڈول پر مرکوز تھیں۔

"یہ تم شیڈول پڑھ رہے ہو یا پھر کسی کو سنا رہے ہو؟ اگر پڑھ رہے ہو تو بہت ہی اونچا پڑھ رہے ہو اور کسی کو سنانا مقصود ہے تو مجھے تو ایسا کوئی نظر نہیں آ رہا جو تمہاری اس روٹین کے بارے میں جاننے کا خواہ ہے۔" ایک آواز اس کے عقب سے سنائی دی۔ وہ پلٹا تو سامنے ایک انڈونیشین طرز کی لڑکی تھی۔ وہی نین نقش جو اسے یہاں عام دیکھائی دیئے البتہ اس کے بال قدرے بھورے تھے۔ جو اس کو دوسروں میں ممتاز کیے ہوئے تھے۔ خوبصورت چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کے گول چہرے پر چمک رہی تھیں۔

"جی، میں یہ خود پڑھ رہا تھا۔" اریب نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اوہ۔اس کا مطلب تم جنوبی ایشیا سے ہو۔ایک تو وہاں کے لوگوں کو خود کلامی کا بہت شوق ہے اور خود کلامی بھی ایسے کرتے ہیں جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہوں۔" اس نے پہلی ہی ملاقات میں اریب کو بری طرح پچھاڑ دیا تھا۔اس کا سپاٹ لہجہ اپنے اندر کسی بھی قسم کے غبار کو سمیٹنے کا روادار نہ تھا۔وہ بلیو جینز اور بے بی پنک کلر کی شرٹ میں ملبوس بھوری زلفوں کو شانوں پر بکھیرے ہوئے تھی۔بائیں کندھے سے ایک ڈوری لٹک رہی تھی۔ جو نیچے گھٹنے تک جاتی تھی۔ جو یقیناً ایک بیگ کی ہی تھی۔وہ اپنے دونوں ہاتھ کو سینے پر لپیٹے اریب کو ایسے گھو ر رہی تھی جیسے وہ اس کے لئے کوئی انٹرٹینمنٹ ہو۔

"ایکسکیوزمی، مس۔" اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔

"مس ایشا۔" اس نے اپنا تعارف ایک الگ ہی ڈھنگ میں کروایا تھا۔زلفوں کو ایک ادا سے جھٹکا دیا۔

"مس ایشا ہو یا مس پتیسا، آئی ڈانٹ کیئر۔" اس نے بھی بے نیازی دیکھائی۔ایشا کے چہرے پر زیادہ تاثر نہ ابھرے شاید اسے اردو اتنی اچھی طرح نہیں آتی تھی تبھی وہ اریب کے طنز کو نہ سمجھ سکی مگر بات وہ اردو میں ہی کر رہی تھی۔انداز اگرچہ غیر ملکی ہی تھا۔

"میں پاکستانی ہوں اور پاکستانی لڑکوں سے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔آپ کی اس بات کا بہت اچھا جواب دے سکتا ہوں لیکن مجھے پہلے دن ہی الجھنے کا شوق نہیں ہے۔" وہ وہاں سے جاتا دیکھائی دیا۔

"تم غلط ڈائریکشن میں جا رہے ہو۔لیکچر روم اس طرف نہیں، اِس طرف ہے۔" ہاتھ کے اشارے سے ایشا نے بائیں جانب اشارہ کیا۔اریب نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"میرا شیڈول بھی یہی ہے۔اس لئے معلوم ہے۔" ایشا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔اریب ایک لمحہ کے لئے رکا اور ایشا کو سر تا پا دیکھا۔

"چلو میرے ساتھ۔" ایشا اریب کے ساتھ چل دی۔ پہلا تاثر اگرچہ عجیب تھا لیکن جلد ہی دونوں گھل مل گئے۔اریب نے لیکچر روم تک جاتے ہوئے اپنے بارے میں کافی کچھ ایشا کو بتا دیا۔ایشا نے بھی اپنی ہسٹری سامنے رکھ دی۔

ایشا جکارتہ سے یہاں آئی تھی۔ پیدا تو وہ انڈونیشیا میں ہوئی لیکن والدین کا تعلق انڈیا سے تھا اور گھر میں وہ اکثر ہندی میں بات کرتے تھے۔اسی بنا پر وہ اس زبان کو سمجھتی تھی مگر بارڈنگ سکول میں رہنے کی وجہ سے وہ اس زبان کو زیادہ نہ سیکھ سکی۔آج ہی وہ دیپاسار آئی تھی اور پہلا سٹاپ ہی اس کا یونیورسٹی تھا۔

لیکچر روم میں ان کا سامنا کئی سٹوڈنٹس سے ہوا۔زیادہ تر مقامی تھے۔غیر ملکیوں کی تعداد صرف تین تھی۔ایک اریب، ایک ابرار (بنگلہ دیش سے) اور ایک فاطمہ گل (ملیشیا سے)۔لیکچر چونکہ انگلش لٹریچر کا تھا۔اس لئے اریب کو زیادہ مشکل نہ ہوئی البتہ کئی سٹوڈنٹس کے چہرے پر فکرمندی کے تاثر اریب اچھے سے پڑھ سکتا تھا۔اس کے ساتھ بیٹھی ایشا بھی انگلش سے تقریباً نابلد تھی مگر سمجھنے کی سعی کر رہی تھی۔

کلاس کے بعد اریب نے یونیورسٹی گھومنے کا ارادہ کیا تھا۔ایشا بھی چونکہ نئی تھی۔اس لئے وہ بھی اس کے ساتھ ہو گئی۔سب سے

پہلے انہوں نے کینٹین سے کچھ کھانے کا پروگرام بنایا۔ کینٹین میں کئی مشروبات کے سٹالز اور فاسٹ فوڈز کا آرڈر لینے کے لئے تیار ویٹر پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے کولڈ ڈرنک کو فوقیت دی۔ بل اریب نے پے کیا۔

''میں اپنا بل خود پے کرنا چاہوں گی۔'' ایشا کے کہنے تک وہ بل پے کر چکا تھا۔

''کوئی بات نہیں نیکسٹ ٹائم تم پے کر دینا۔ حساب چکتا ہو جائے گا۔'' اریب نے شانے اچکائے اور لائبریری کی طرف پلٹا۔

''کیا بات ہے؟ نئے شہر میں اب ہمیں کوئی لفٹ ہی نہیں کروا رہا۔'' آواز عین عقب سے سنائی دی تھی۔ ایشا اور اریب دونوں برجستہ پلٹے۔ وہاں مغربی نین نقش لئے ایک خوبرو نوجوان تھا۔ سیاہ بال، سفید رنگت اور سلم سمارٹ جسم کا مالک یہ نوجوان اب دونوں کے قریب آ رہا تھا۔

''کوئی ہم سے اتنا تنگ بھی آ سکتا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے تھے لیکن ہمارا نام بھی کرسن ہے، آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑنے والا۔'' اس کا انداز دلفریب تھا۔ نگاہیں ایشا پر مرکوز تھیں۔ اریب نے گہری نگاہ ایشا پر ڈالی تو وہ اس سے بے زار معلوم ہوئی۔ بے پرواہی سے اپنی بھوری زلفوں کو خم دینے لگی۔

''جی آپ کون؟'' اریب نے پوچھا تھا۔

''یہ سوال آپ ان مس سے ہی پوچھ لیں۔'' اس کا انداز کافی شوخ تھا۔ اریب کی نگاہیں ایشا کی طرف گھومیں۔

''بدقسمتی سے یہ میرا اسکول فیلو ہے۔'' اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اسے کس حد تک ناپسند کرتی تھی۔

''لیکن یہ بدقسمتی صرف ان کی ہے میری تو خوش قسمتی ہے۔'' کرسن نے تصیح کروائی تھی۔ اریب مسکرا دیا اور اپنا تعارف کروایا۔ کرسن کو پاکستانی دوست سے مل کر خوشی ہوئی۔ اریب نے ایک اور کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا تو کرسن نے ذرا بھی تکلف نہ برتا۔ ایشا اس کے ڈھیٹ پن پر بڑبڑا دی۔ اریب کو ان دونوں میں عکاس اور جبیں جھگڑتے دکھائی دیے۔ وہ گردن جھکائے مسکرا رہا تھا۔

''ہیلو مسٹر اریب عالمگیر! تم ایسے کیوں مسکرا رہے ہو؟'' اس کا انداز کافی تلخ تھا۔ اریب سنبھلا اور مسکراہٹ کو ضبط کرتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔

تینوں اب لائبریری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ملکی اور غیر ملکی کتابوں سے مزین یہ کافی بڑی لائبریری تھی۔ ہر سیکشن میں سینکڑوں کی تعداد میں کتابیں علم کی پیاس بجھانے والوں کا سامان تھیں۔ اریب نے تعریفانہ نگاہ ڈالی اور پھر باہر کو چل دیا۔ بیچ میں ایشا اور کرسن کی نوک جھونک جاری رہی تھی۔

''تم کہاں رہتے ہو؟ دیکھو، اگر تمہیں یہاں رہنے میں کسی بھی قسم کی دشواری پیش آئے تو تم بلاجھجک مجھ سے کہہ سکتے ہو۔ میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔'' کرسن پہلی ہی ملاقات میں اریب کا اچھا دوست بن گیا تھا۔ اریب نے نفی میں گردن ہلائی اور دو بجے کے

قریب یونیورسٹی کے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ جہاں اِندر اس کا منتظر تھا۔

”زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا ناں۔“ اریب نے پوچھا تھا۔

”نہیں سر۔ صرف دو منٹ۔“ اس کا انداز طنزیہ تھا۔ جسے اریب اچھے سے سمجھ گیا مگر اس نے اس جملے کی بجائے سر کہنے پر ناگواری کا اظہار کیا۔

”اب اگر تم نے سر کہا ناں تو میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا۔ سمجھے؟ اور اسے میری محض دھمکی مت سمجھنا۔“ اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔ اِندر ایک لمحے میں پسیج سا گیا تھا۔ وہی ڈر اور خوف اس کے چہرے پر بھی آویزاں تھا جو پریشے کے چہرے پر اس نے پڑھا تھا۔

”نہیں سر، میرا مطلب ہے اریب صاحب ایسا مت کیجیے گا۔ آپ کے ساتھ ہر جگہ پر جانا میری ڈیوٹی ہے۔ اگر آپ سے ایک منٹ کے لئے بھی علیحدہ ہوا تو میری جاب چلی جائے گی۔“ ایک بار پھر اسے کچھ عجیب سا لگا۔ اس نے گہری نگاہ اِندر پر ڈالی۔ وہ سچ کہہ رہا تھا۔ اریب نے بنا کچھ کہے اپنی نگاہیں ونڈ سکرین پر جمالیں۔

”بابا جان میری خاطر دوسروں کے ساتھ اتنا سخت رویہ کیسے برت سکتے ہیں؟ مگر کیوں؟ آخر سب میرے بارے میں اتنا فکرمند کیوں ہیں؟ پریشے، وہ بھی میرے آنے جانے پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ علوی بہانے بہانے سے میرے کمرے میں آ کر مجھے چیک کر رہی ہے اور پھر اب اِندر......؟ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟“ وہ اپنی ہی عقل دوڑا رہا تھا مگر بے لگام گھوڑا سنسان راستے پر گامزن تھا۔ جہاں خاک اور دھول کے سوا کچھ نہ تھا۔ خالی الذہن میں یکے بعد دیگرے کئی وسوسے آئے مگر اس نے خود ہی تردید کر دی اور نکتہ جہانزیب کی ذات پر آ کر ٹھہر سا جاتا تھا۔

”بابا جان ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ وہ بری طرح الجھ چکا تھا۔ اگر وہ اب اس کے پاس ہوتے تو یقیناً وہ ان کی پیشانی پڑھ لیتا مگر اتنی دور سے وہ کیسے حقیقت جان سکتا تھا؟

اریب انہی خیالوں میں غرق تھا کہ اِندر نے ہاٹل کے پارکنگ ایریا میں کار پارک کر دی۔ اریب کھوئے کھوئے ذہن کے ساتھ اندر گیا۔

”ویلکم بیک مسٹر اریب عالمگیر۔“ یہ پریشے کی آواز تھی مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ اچھے سے جانتا تھا کہ اسے یہ کہنے پر مجبور کیا جا رہا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ایک اور گیسٹ بھی اندر داخل ہوا تھا۔ اسے تو پریشے نے ویلکم بیک نہیں کہا۔ پھر اسے ہی کیوں؟

وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور اپنا بیگ صوفے پر پھینکا۔ موبائل نکال کر ابھی وہ ڈریسنگ میں رکھنے ہی جا رہا تھا کہ رِنگ ہوئی۔ وہ سوچوں کے گرد باد سے باہر نکلا۔

نمبر مقامی تھا۔ اس نے غور کئے بغیر فون ریسیو کیا۔

”السلام علیکم! اریب عالمگیر از سپیکنگ ہیر۔“ اس کا انداز نارمل تھا جو کہ اگلے ہی لمحے تبدیل ہونے جا رہا تھا۔

''وعلیکم السلام مسٹر اریب عالمگیر! ویلکم ٹو مائے ہوم ٹاؤن، دیپا سار'' ایک پرجوش آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ حیرانی کا شکار ہوا۔ آواز اس کے لئے بالکل اجنبی تھی۔

''جی آپ کون؟'' اس نے سوال داغا تھا۔

''تم مجھے بھول گئے مسٹر اریب؟ بہت ہی حیران کن بات ہے۔ آخر سالوں سے ہمارا رشتہ ہے اور تم اس رشتے کو فراموش کر گئے؟'' یہ سوال معنی خیز تھا۔ اریب کو تشویش ہوئی۔ ذہن پر زور ڈالا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ لب ہلانے چاہے تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

''میں کون ہوں۔ اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ پہلا دن کیسا گزرا دیپا سار میں؟ یہاں کے لوگ پسند آئے؟ یہاں کی عمارتیں، یہاں کی یونیورسٹی، یہاں کی آب وہوا اور سب سے بڑھ کر یہاں کے لوگوں کی آؤ بھگت کیسی لگی؟'' اریب کو جیسے دوسو واٹ کا ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔ اس کے بارے میں ایک ایک بات بتائی جا رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ دروازہ ادھ کھلا تھا۔ دروازے کی طرف بڑھ کر باہر جھانکا مگر راہداری میں کوئی نہ تھا۔ دروازہ بند کر کے بالکونی کی طرف دیکھا۔ وہاں پردے ہوا کے سنگ جھوم رہے تھے۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھا مگر یہاں بھی آدم زاد موجود نہ تھا۔

''بے فکر رہو اریب۔ نہ میں اس وقت تمہارے کمپارٹمنٹ میں ہوں اور نہ ہی اس ہاٹل میں۔'' یہ دوسرا جھٹکا تھا۔ اس کا سر بری طرح چکرایا۔ کمرے کی ہر شے گھومتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ بالکونی سے بمشکل چلتا ہوا بیڈ کے پاس آیا تھا۔

'کون ہو تم؟'' آواز لرز رہی تھی۔

''جس کی تلاش میں تم یہاں آئے ہو'' سرگوشی والا لہجہ گویا ہوا تھا۔ ہوا میں ایک سنسنی تھی جو اریب کے جسم میں اترتی چلی گئی۔ اس کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ سالوں کی خاموشی بالآخر آج ٹوٹ چکی تھی۔ جس خاموشی نے اس کی زندگی کے کئی سالوں کو اندھیرے میں لپیٹے رکھا آج سورج کی پہلی کرن دیکھائی دی مگر اس کرن کی حدت نے اسے پگھلانے کی بجائے مورت بنا دیا۔ وہ استادہ دیکھائی دیا۔ آنکھیں یک ٹک سامنے دیوار پر مرتکز تھیں۔

''میں وہی خاموشی ہوں جسے سن کر تمہاری نیند اڑ جاتی تھی۔'' خوابیدہ اور تغافل سے بھرا لہجہ کہتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے کانوں میں سیسہ پگھلتا ہوا محسوس ہوا۔ ایک باریک آواز، شاید عام حالات میں سرور کا کام دے سکتی تھی مگر اس وقت زہر آتش کی مانند تھی۔

''اور آج سے تمہارے دن کا سکون بھی چھین لوں گا۔'' للکار بھی مدہم سی تھی۔ جیسے کوئی اپنا تنبیہ کر رہا ہو لیکن وہ اپنا نہیں تھا۔ اپنے تو باعث راحت ہوتے ہیں اور یہ..... تو کئی برسوں سے بے چینی کا سبب بنا ہوا تھا۔ وہ مردانہ آواز سننے میں جتنی مدہم تھی، الفاظ اتنے ہی سخت تھے۔

''جسٹ شیٹ اپ۔'' اس کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑنے لگا تھا۔ چہرے پر غصے کے تاثر ابھرے۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ اپنے اعصاب پر قابو پانے کی سعی کر رہا تھا۔ دفعتہً پلٹا اور اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ وہاں ایک عجب ہی اریب تھا۔ پورا وجود مشتعل تھا۔ اپنا ایسا روپ اریب نے پہلے خود بھی نہیں دیکھا تھا۔

جواب میں دوسری طرف سے قہقہہ سنائی دیا۔ اریب مزید الجھ گیا۔ اندر کا جنون پہلے سے زیادہ مشتعل دیکھائی دے رہا تھا۔

''ابھی تم بچے ہو۔ یہ غصہ تم پر جچتا نہیں ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہا تھا یا پھر بھڑکا رہا تھا؟ وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا مگر الفاظ میں حقارت ضرور شامل تھی۔

اریب گہری سانسیں لیتا ہوا اعصاب کو بمشکل ضبط کیے ہوئے تھا۔

''تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ جس راستے سے آئے ہو، لوٹ جاؤ۔ ورنہ مجھ سے برا کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے پہلی بار رعب انداز میں کہا تھا۔ کئی لمحے یہی جملہ ساعت میں گونجتا رہا۔

''یہ خالی دھمکیاں دینا بند کرواپنی۔ میں اچھے سے جانتا ہوں تم جیسے بلیک میلرز کو۔'' اس نے متحمل انداز میں کہا تھا۔ دھڑام سے بیڈ پر بیٹھا اور بائیں ہاتھ سے چادر کو نوچ ڈالا۔

''یہ دھمکیاں نہیں ہیں اریب۔ تم جانتے نہیں ہو مجھے۔'' وہ اب سنجیدہ دیکھائی دیا تھا۔ تبھی آواز میں سنجیدگی کا پہلو نظر آرہا تھا۔

''میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔'' اس نے حقارت کے ساتھ ایسے گردن جھٹکی۔ جیسے وہ اسے دیکھ رہا ہو۔

''تو پھر یہاں اپنے وطن سے دور کیوں آئے ہو؟'' اس سوال نے اسے لاجواب کر دیا۔ وہ واقعی اسے ہی ڈھونڈتے ہوئے یہاں آیا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت اس کے علم میں تھی۔ اریب کب کیا کرتا ہے؟ وہ بخوبی جانتا تھا۔

''نہیں ہے ناں کوئی جواب تمہارے پاس؟ اس لئے کہتا ہوں لوٹ جاؤ۔ رہا سوال یونیورسٹی میں دوبارہ ایڈمشن کا، وہ میں وعدہ کرتا ہوں، تمہارا ایڈمشن اسی یونیورسٹی میں کروادونگا۔'' وہ یکے بعد دیگر ضرب لگا رہا تھا اور اس بار ضرب کافی گہری تھی۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ آنکھیں برجستہ دیوار کی طرف اٹھیں۔ وہ کھڑا ہوا۔ سانسوں کے چلنے میں ایک بار پھر شبہ ہوا۔

''کک......کیا کہا؟'' وہ ہکلایا۔ جواب میں پہلے قہقہہ گونجا جس نے اس کے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑا دی۔

''یہی کہ تم نے اپنے گھر والوں سے جھوٹ بولا کہ تمہارا نام سٹوڈنٹ ایکسچینج پروگرام میں آیا ہے۔ میں اچھے سے جانتا ہوں تمہارا نام Udayana University میں تو کیا، انڈونیشیا کی کسی بھی یونیورسٹی میں نہیں آیا تھا۔'' وہ زندہ لاش کی طرح کھڑا تھا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایسا سچ بتا رہا تھا جسے اس نے اپنے ہمزاد کو بتانا بھی مناسب نہ سمجھا تھا۔

''تم نے خود Udayana University کا انتخاب کیا اور یہاں ایڈمشن لیا۔ تم یہاں ایک سمیسٹر پڑھنے نہیں بلکہ باقی

کے تمام سمیسٹر یہاں پڑھنے آئے ہو۔'' اس اجنبی نے اریب کے پورے وجود کو ہلا کر رکھ دیا۔ ایک زلزلے کا عالم تھا۔ وہ اریب کی زندگی کے ہر پہلو کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے تھا۔ کوئی بھی راز، اس اجنبی کے لئے راز نہ تھا۔ وہ ایک ایک بات سے باخبر تھا۔

''کیا ہوا اریب؟ خاموش کیوں ہو گئے؟ یہی کافی ہے یا پھر ان سب کے نام بتاؤں جن کا تمہاری ذات سے خاص تعلق ہے؟'' وہ اسے جملے کس رہا تھا جبکہ اریب کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔ اس نے بری طرح اریب کو مات دی تھی۔ اریب یہ بازی کھیلنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو آخری صف میں کھڑا محسوس کر رہا تھا۔ اس نے اپنی سانسوں کو اکھڑتا ہوا محسوس کیا۔ ہر طرف سے ظلمت تیزی سے بڑھتی دیکھائی دی اور وہ اس ظلمت میں بری طرح کھو چکا تھا۔

''گو ٹو ہیل......'' وہ جبڑے بھینچتے ہوئے گویا ہوا تھا اور موبائل کو بند کرنے کے لئے کان سے ہٹایا۔ فون بند کرتے ہوئے اسے قہقہہ سنائی دیا تھا۔ وہ قہقہہ اس کے لئے کسی صور سے کم نہ تھا۔

موبائل کو بیڈ پر دے پھینکا اور خود دھیرے دھیرے زمین بوس ہوتا چلا گیا۔

''کون تھا وہ؟ اور میرے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتا ہے؟'' وہ حیرت سے بڑبڑایا تھا۔ ڈوری کے الجھے سروں کو آپس میں جوڑنے کی سعی کر رہا تھا کہ موبائل میں میسج کی رنگ ہوئی۔ اریب نے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھایا۔

چمکتے ہوئے نمبر کے ساتھ ایک میسج تھا۔ جو اس پر ہنس رہا تھا۔

''بہت جلد واپسی کی راہ لے لو مسٹر اریب عالمگیر۔ تمہارا خیر خواہ: ایم ابدال'' وہ چونکا اور کئی لمحے تک وہ میسج پڑھتا رہا۔

''ابدال؟'' اس کی نظریں اسی نام پر مرکوز تھیں۔

''اس کا نام ابدال ہے؟'' موبائل کو دوبارہ بیڈ پر دے پھینکا اور ڈھیلے قدموں کے ساتھ واش روم کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں میں وہ بری طرح ہار چکا تھا۔ سوچنے کی صلاحیت بھی جواب دے چکی تھی۔ بیسن پر نل کھول کر اس نے پانی کو یونہی بہنے دیا اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ لبوں سے ایک ہی نام جاری تھا۔

''ابدال۔'' ہاتھ بڑھا کر پانی کو دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی میں بھرا تو پانی انگلیوں کے پوروں سے چھنتے ہوئے نیچے بہہ رہا تھا مگر وہ تو کہیں اور ہی گم تھا۔

''سالوں بعد اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی مگر ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں اس آواز کو پہچانتا ہوں۔ جیسے اس کا لہجہ شیریں تھا۔ وہ میرے بارے میں برا نہیں سوچ سکتا۔'' وہ حالات سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پانی کا ایک چھپٹا چہرے پر مارا۔ پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی چلی گئیں۔ چہرے کی دھول تو پانی کے سنگ بہہ گئی مگر جو دل کا میل تھا، اس کا غبار ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اس غبار کو ہٹا کر اس اجنبی شخص کی شناخت حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ شخص تو مسلسل دور جاتا دیکھائی دیا۔

''نہیں۔میں اپنی منزل کے اتنے قریب آ کر واپس نہیں پلٹ سکتا۔مجھے اس ابدال نامی شخص کو ڈھونڈنا ہوگا۔اس سے پوچھنا ہوگا کہ آخر وہ کیا چاہتا ہے؟ کیوں میری زندگی کو برسوں سے ایک جلتے بجھتے چراغ کی مانند بنایا ہوا ہے۔جب بھی زندگی اپنے ڈگر پر لوٹنے لگتی تھی تبھی ایک کال مجھے واپس اسی پوائنٹ پر لا کھڑا کرتی۔آخر کیوں کرتا تھا وہ یہ سب؟ کیوں؟ میں جان کر رہوں گا۔اس کے لئے مجھے ابدال سے ملنا ہوگا۔ہر حال میں ملنا ہوگا۔'' وہ پختہ عزم کر چکا تھا۔آنکھوں میں یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔دوسرے پانی کا چھپٹا اس کے دل سے بھی میل اترا تا معلوم ہوا۔

☆ ☆ ☆

کس نے سنگ خامشی پھینکا بھرے بازار پر؟

اِک سکوت مرگ طاری ہے در و دیوار پر!

صرف چند دنوں میں ہی وہ پورے ہائل میں مقبول ہو چکا تھا۔ہر شخص کو اریب کا نام ایسے یاد تھا جیسے وہ ان کا اپنا ہو اور کئی برسوں سے ان کے ساتھ رہ رہا ہو۔

پریشے اور علوی کے ساتھ تو اس کا اکثر ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ تکلف برتتی تھیں مگر وہ خاموش رہا۔باتوں باتوں میں اس نے کئی بار ابدال نامی شخص کے بارے میں جاننا چاہا مگر وہ ہر بار بات کو ٹال دیا کرتی تھیں۔جیسے وہ اس بارے میں بات ہی نہ کرنا چاہتی ہوں۔

''سوری سر! مجھے کام ہے۔دوسرے گیسٹ کو کھانا دینا ہے۔'' علوی اکثر اسی بہانے کو درمیان میں لاتی تھی۔

''مجھے ایک ضروری کال کرنی ہے۔آپ سے بعد میں بات ہوگی۔'' پریشے بھی تکلف برتتی۔

یونیورسٹی میں ایک بار اس نے کرن سے ابدال کے بابت بات چھیڑی تو اس کے رنگ بدلتے دیکھائی دیئے۔

''نن نہیں۔یہ کیسا نام ہے؟ میں نے تو پہلے کبھی نہیں سنا یہ نام۔'' بوکھلاہٹ کے ساتھ ایک جواب آتا مگر وہ اس کی پیشانی پڑھ سکتا تھا۔جھوٹ کا عنصر نمایاں تھا۔دوبارہ سوال کر کے وہ اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔بس اسی لئے اس نے اب اکیلے ہی اس نام کی کھوج لگانی چاہی تھی۔

''مسٹر ابدال! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے روم میں آتے ہی اس نمبر پر میسج کیا تھا اور جواب کا منتظر رہا۔واش روم میں فریش ہونے کے بعد اس نے وقت ضائع کئے بغیر میسج چیک کیا مگر کوئی ریپلائے نہیں آیا تھا۔اسے شدید مایوسی ہوئی۔نمبر ٹرائے کیا تو وہ سوئچ آف تھا۔چہرے پر ہر لمحہ تاثر بدلنے لگے۔دوڈھیلے قدم بالکونی کی طرف بڑھائے جہاں سے مصروف زندگی کا کچھ پہلو دیکھا جا سکتا تھا۔مشہور شہراہ کی مصروف زندگی اپنے ڈگر پر گامزن تھی۔

"اتنی جلدی میں ہار نہیں مان سکتا۔ ابھی تو شروعات ہے۔ آگے کئی مواقع آئیں جب ابدال کو میرے سامنے آنا ہوگا۔ مجھ سے بات کرنی ہوگی اور ایسا میں ممکن بنا کر رہوں گا۔ چاہے وہ اس کے لئے تیار ہو یا نہ ہو مگر مجھے اس سے ہر حال میں ملنا ہے۔" اس نے پختہ لہجے میں کہا تھا۔ آنکھوں میں یقین غالب تھا۔

☆ ☆ ☆

شکر ہے راس آگیا مجھ کو قناعت کا جہاں
شکر ہے میں قصرِ سلطانی کا کارندہ نہیں

دھیمے قدم وقت گزرنے کے ساتھ بار بار سنائی دے رہے تھے۔ اس بار بھی کسی کے گزرنے کے احساس نے ایشا کو ڈسٹرب کیا تھا۔ اس نے کتاب سے نظریں ہٹا کر اپنے سے بائیں جانب دیکھا تو ایک لڑکی پاس سے گزر رہی تھی۔ اس کی ائیر رنگز میں لٹکی ڈوریاں آپس میں ٹکراتی تو مدہم سا ایک ساز گونجتا۔ یہ ساز ایشا کے علاوہ کوئی نہیں سن سکتا تھا۔ اس نے کچا چبا جانے والی نگاہوں سے اس کو اپنی مخالف سمت میں جاتا دیکھا تھا۔

"یہ لائبریری ہے کوئی ریمپ نہیں۔" وہ دل میں ہی بڑبڑائی تھی۔

"یہ ریمپ ہو بھی نہیں سکتا۔ بھلا اتنا سوفٹ قالین ریمپ پر بچھایا جا سکتا ہے؟" اریب جو اس کے سامنے ہی بیٹھا تھا، فی الفور اس کے تاثرات کو پڑھ کر رائے دی۔ وہ چونکی اور حیرت سے اریب کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک اس کی خوبیوں سے نابلد تھی۔ کرسن جو ایشا کے دائیں جانب بیٹھا تھا۔ حیران ہوا۔

"کیا ہوا؟ یوں ہوا میں کس سے باتیں کر رہے ہو؟" کرسن کا سوال اپنی جگہ بجا تھا جبکہ ایشا تو یک ٹک اریب کی جانب ہی دیکھے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں ذرہ برابر بھی جنبش نہ تھی۔ اریب مسکرا دیا۔

"اتنا چونکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس وقت میرے بارے میں کیا سوچ رہی ہو۔ مجھے یہ بھی اچھے سے معلوم ہے اور میجیشین کا تصور تو نکال ہی دو۔ میں عام سا انسان ہوں کوئی جادوگر نہیں۔ ہاں بس کچھ ایکسٹرا آرڈنری ہوں مگر عام ہوں۔" ایشا کی تو جیسے آنکھیں ہی باہر نکل آئی تھیں۔ وہ واقعی اسے جادوگر گمان کر رہی تھی۔

"کیا کہتے جا رہے ہو تم؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" کرسن نے سر پکڑتے ہوئے کہا تھا۔ کتابوں کا ایک ڈھیر اس کے سامنے پڑا تھا۔ جسے پڑھنا اس کے لئے محال تھا۔ کرسن کے روپ میں اریب کو کامیش ملا تھا۔ پڑھائی سے ہر پل بھاگنے کا بہانہ ڈھونڈتا اور لڑکیوں کے پیچھے ایسے بھاگتا جیسے ان میں اس کی جان بسی ہو۔ بس ایشا تھی جو ابھی تک اس کی چالوں سے بچی ہوئی تھی مگر کرسن کا تو اسے بھی زیر کرنے کا پروگرام تھا اور اس کا وہ برملا اعتراف بھی کر چکا تھا۔ کل ہی کی تو بات تھی جب ایشا سے اس کا جھگڑا ہوا تھا اور ایشا کو اس نے چیلنج کیا تھا۔

"تم مجھے دل پھینک سمجھتی ہو ناں۔ تو سمجھو۔ میں بھی وعدہ کرتا ہوں یہ دل پھینک تمہیں بھی اپنے جال میں پھانس کر رہے گا۔" یہ جھگڑا تھا یا شاید نہیں۔ اریب تھوڑا سا الجھا تھا کیونکہ ایشا جہاں سخت لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ وہیں کرن کے لہجے میں شرارت تھی۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی یک طرف چاہت تھی۔ جسے وہ کئی پردوں میں لپیٹے ہوئے تھا مگر اریب نے بنا اجازت ان پردوں کی اوٹ سے اندر جھانکا تھا۔

"اچھا، ان سب کو چھوڑو یہ بتاؤ، اسائنمنٹ کے بارے میں تم نے کیا سوچا؟ کر تو لو گے ناں تم دونوں؟" اریب نے بات کو ایک نیا رخ دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں میں موجود انڈونیشین فیشن میگزین کو ٹیبل پر رکھا اور دونوں بازو پھیلاتے ہوئے آگے کی جانب جھکا تھا۔

"اوہ۔ میں تو بھول ہی گیا۔" کرن نے چونکتے ہوئے کہا۔ اس کے حواس بکھرے ہوئے تھے۔ وہ واقعی بھول چکا تھا۔ اریب نے گہری سانس لیتے ہوئے گردن جھٹکی تھی۔ وہ واقعی کامیش جیسا ہی تھا۔

"تم دونوں سے کیا مطلب ہے تمہارا؟ تم کیا اس اسائنمنٹ سے بری الذمہ ہو؟" ابرو اچکاتے ہوئے ایشا نے پوچھا تھا۔

"یہ کس نے کہا؟ میں بالکل بھی بری الذمہ نہیں ہوں بلکہ میرے لئے تو یہ اسائنمنٹ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" اس نے خوشگوار لہجے میں کہا تھا اور ساتھ ہی آنکھوں پر آتے بالوں کو دائیں ہاتھ سے پیچھے کیا۔ ایشا کو اریب کی یہ ادا بھاتی تھی۔ ہلکی سی کسک ابھری مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کرن نے حیرانی سے استفسار کیا۔

"دیکھو اریب۔ یہ پاکستان نہیں ہے جہاں اسائنمنٹ نیٹ سے کاپی کر کے سمٹ کروا دی جائے۔ یہاں اگر انہیں ایک لفظ بھی کاپی پیسٹ لگا تو پوری اسائنمنٹ ریجیکٹ اور فائنل میں اسائنمنٹ کا زیرو اور اسائنمنٹ میں زیرو کا مطلب ہے سمیسٹر فیل۔" ایشا نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اریب مسکرا دیا۔ کہنیوں کو کھڑا کیا اور ہتھیلی پر اپنی ٹھوڑی جمائی۔ ایک بار پھر اس کا ایسا کرنا ایشا کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب سا کر گیا تھا۔

"مجھے معلوم ہے یہ سب۔" اس نے پلک جھپکتے ہوئے تمکنت کے ساتھ کہا تھا۔

"تو پھر تمہارے چہرے پر ٹینشن کیوں نہیں ہے؟ اسائنمنٹ کی کل لاسٹ ڈیٹ ہے۔" اس بار کرن گویا ہوا تھا۔

"وہ اس لئے کہ میرے بابا جان کی انڈسٹری ہے یہاں۔ یہ recruitment process کیا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ سب کچھ وہاں سے مجھے با آسانی سے پتا چل جائے گا۔" اس نے وضاحت کی تھی۔

"کیا کہا؟ تمہارے بابا کی انڈسٹری ہے یہاں؟ واؤ۔ امیزنگ۔" کرن پہلے تو حیران ہوا پھر داد دی۔ اریب نے پلک جھپکتے ہوئے داد وصول کی تھی۔

"یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا؟ جکارتہ میں میری فرینڈ کے فادر بھی تو ملٹی نیشنل بینک میں کام کرتے ہیں۔ میں ان سے یہ سب

پوچھ سکتی ہوں۔" ایشا کو بھی اپنی اسائنمنٹ کا سلوشن مل گیا تھا۔ جس پر کرسن کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

"لو! اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں میں اکیلا ہی ہوں جس کا کوئی ریلیٹو انڈسٹری میں کام نہیں کرتا۔" اس نے بے دلی کے ساتھ ایک کتاب کھینچی اور اسے پڑھنے کی کوشش کی۔

"تو کیوں فکر کرتا ہے میرے یار؟ میری اسائنمنٹ سے کاپی کر لینا تم۔" کامیش ہوتا تو وہ ضرور خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتا مگر وہ کامیش نہیں تھا۔ شکریہ کے ساتھ اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔

"اریب تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔ یہاں اسائنمنٹ کاپی کرنا غیر قانونی ہے۔ اگر مرضی کے بغیر کی جائے تو آپ اس کے خلاف کیس سٹوڈنٹ افیئر آفس میں کر سکتے ہو اور اگر جان بوجھ کر کروائی جائے تو آپ دونوں اسائنمنٹ میں فیل ہو جائیں گے۔" ایشا نے نکتے کی بات کی تھی۔ کرسن کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ اریب بھی رول کو فی الوقت بھول چکا تھا۔

"ویسے میری ایک اور فادر کے ڈیڈ بینک میں کام کرتے ہیں مگر وہ نیشنل بینک ہے۔ اگر تم کہو تو میں ان سے معلومات شیئر کر کے تمہیں دے سکتی ہوں۔" ایشا کے کہنے پر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ ایشا کی جانب مڑا۔

"سچ تم ایسا کرو گی؟ مجھے بہت خوشی ہوگی۔" اس نے انجانے میں ایشا کے ہاتھ پکڑ لئے تھے۔ ایشا نے ابرو اچکاتے ہوئے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کروایا تو اس نے چھوڑ دیئے۔ ایشا نے گردن جھٹکی تو اریب مسکرا دیا۔

☆ ☆ ☆

یوں تو پتھر ہزار تھے لیکن
چند گوہر ہی بے بہا نکلے

ہاٹل واپس آنے کے بعد اس نے سب سے پہلے پاکستان فون کیا تھا۔ فون جہانزیب نے ہی ریسیو کیا۔ کافی دنوں بعد اریب کی آواز سن کر انہیں انتہائی خوشی ہوئی۔ اریب کو بھی بات کر کے کافی اچھا لگا۔ اپنوں کی کمی تو اسے ہر پل محسوس ہوتی تھی۔ آتے جاتے سحر فاطمہ کا پیار سے اس کے چہرے کو چھونا، پیشانی پر بوسہ دینا۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ حسام کا بال خراب کرنا اور جبیں کے ساتھ نوک جھونک تو جیسے اس کی زندگی کا حصہ تھا مگر انڈونیشیا میں یہ سب کچھ معدوم تھا۔ وہ اتنی دور آ کر واقعی سب سے بہت دور ہو چکا تھا۔

"بابا جان مجھے آپ سے عالمگیر انڈسٹریز کا ایڈریس معلوم کرنا تھا۔" حال چال پوچھنے کے بعد وہ سیدھا نکتے پر آیا تھا۔

"مگر کیوں؟" وہ چونکے۔

"اسائنمنٹ ملی ہے مجھے کہ ریئل ٹائم Recruitment process کیسے ہوتا ہے؟ کسی کمپنی کا مکمل recruitment process لکھنا ہے۔" اریب نے وضاحت کی تھی۔

"تو اس میں انڈسٹری جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں فون پر ہی تمہیں بتا دیتا ہوں" انہوں نے خوش دلی سے کہا تھا۔

"یہ آپ کے لئے چائے۔" سحر فاطمہ ابھی ابھی کمرے میں آئی تھیں۔

"ابھی نہیں۔ ابھی ہم اپنے بیٹے سے بات کر رہے ہیں۔" ان کے لہجے میں مان تھا۔ وہ مسکرا دیں اور چائے لے کر پلٹ گئیں۔

"جی تو بیٹا ہماری کمپنی میں ریکروٹمنٹ پروسس سٹارٹ کرنے سے پہلے بھی تین مراحل ہوتے ہیں۔" جہانزیب نے کہنا شروع کیا۔

"ایک منٹ بابا جان۔ میں ذرا کال کو ریکارڈنگ پر لگا دوں تا کہ اسائمنٹ کرتے ہوئے پریشانی نہ ہو۔" جہانزیب مسکرائے اور بیڈ پر آبیٹھے۔

"جی بابا جان۔ اب بتائیے۔ کون سے تین مراحل؟" اریب نے پوچھا تھا۔

"پہلا مرحلہ، پوسٹ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا اس پوسٹ پر ورکر ہائیر کیے بغیر بھی کمپنی کا کام اپنے ڈگر پر گامزن رہے گا؟ اگر ہاں تو وہ فی الوقت ریکروٹمنٹ کا پروسس روک دیا جاتا ہے اور اگر نہیں تو ہم انٹرنل سرچنگ کرتے ہیں۔ اگر کوئی بندہ جو سالوں سے ہماری فیکٹری میں کام کر رہا ہے۔ کیا اس پوسٹ کے قابل ہے؟ کیونکہ ترقی کے مواقع ہمیشہ اپنوں کو دیئے جاتے ہیں اور یہی ان کا حق ہے۔ جنہوں نے ہماری کمپنی کا سالوں سے ساتھ دیا، اگر ہم ان کو چھوڑ کر کسی اور کو نئی پوسٹ پر پرفیر کریں گے تو ان کی حوصلہ شکنی ہوگی جو کہ کسی بھی کمپنی کے لئے خوش آئین نہیں۔

تھرڈ سٹیپ اگر پوسٹ کو ارجنٹ کسی بندے کی ضرورت ہو اور کمپنی میں ایسا بندہ بھی نہ ہو جو اس قابل ہو تو ہم ریفرنس استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ریفرنس پر بھی بات نہ بنے تو ریکروٹمنٹ پروسس سٹارٹ ہو جاتا ہے یعنی نیوز پیپر اور ڈیجیٹل میڈیا میں ایڈ وغیرہ۔" جہانزیب بچوں کی طرح اریب کو باریکیاں سمجھا رہے تھے۔ اریب بھی پورے دھیان کے ساتھ ان کی باتوں کو سن رہا تھا۔ کال اگرچہ ریکارڈنگ پر تھی لیکن پھر بھی اس نے کچھ پوائنٹس کو نوٹ کر لیا تھا۔ وہ سٹڈی ٹیبل پر ہی بیٹھا تھا۔ ہاتھ میں پین اور قرطاس سامنے تھا۔

جہانزیب نے بھی کچھ پوائنٹس کو سمجھانے کے لئے اپنی کمپنی کی فائل اوپن کی۔ کیونکہ ریکروٹمنٹ کا پروسس ایچ آر ڈپارٹمنٹ کرتا تھا اور ایچ آر ڈپارٹمنٹ میں ان کا آنا جانا کم تھا۔ وہ مارکیٹنگ میں زیادہ توجہ دیا کرتے تھے۔ کچھ ٹرمز پر وہ تھوڑے سے کنفیوز بھی ہوئے جس پر اریب ہنسا تھا۔ اس کے قہقہوں نے جہانزیب کو دلی سکون بخشا۔ شاید انہوں نے جان بوجھ کر بھولنے کی ایکٹنگ کی تھی۔ اپنے بچے کے ساتھ کچھ دیر وہ مزید بتانا چاہتے تھے۔ دیکھ تو سکتے نہیں تھے۔ باتوں کے ذریعے ہی دل بہلا لیا۔ سحر فاطمہ بھی کمرے میں آموجود ہوئی تھیں اور ان کے سامنے بیڈ پر بیٹھ کر انہیں دیکھتی رہیں۔ جہانزیب کبھی وارڈروب سے فائل نکالتے اور اسے اوپن کر کے اریب کو سمجھانے کی کوشش کرتے تو کبھی یونہی صوفے پر بیٹھ کر ستا لیتے اور کبھی بالکونی کی طرف چہل قدمی کرتے ہوئے اپنی بات اریب تک پہنچاتے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک باپ اپنے بیٹے کو بزنس کے لئے تیار کر رہا ہو۔ وہ ابھی ایسے ہی سمجھ رہا تھا۔

"تو یہ ہوتا ہے بیٹا ریکروٹمنٹ پروسس۔" گہری سانس لیتے ہوئے جہانزیب نے صوفے کے ساتھ ٹیک لگائی تھی۔

"تھینک یو بابا جان۔آپ نے جیسے مجھے سمجھایا ہے۔اس سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھے ریکارڈنگ سننے کی ضرورت ہی نہیں۔میں خود سے بھی اسائنمنٹ بنا سکتا ہوں۔" اریب نے بھی چیئر کے ساتھ پشت ٹکائی تھی۔

"اچھا! مجھے خوشی ہوئی کہ تمہیں سب کچھ سمجھ آ گیا اور تم وہاں جا کر اپنی پڑھائی پر ہی دھیان دے رہے ہو۔"

"تھینک یو بابا جان۔ماما جان کو سلام کہنا۔میں اب فون رکھتا ہوں کیونکہ ابھی اسائنمنٹ بھی بنانی ہے۔"

"او کے۔اپنا خیال رکھنا۔خدا حافظ۔" جہانزیب نے کال ڈسکنیکٹ کی۔سحر فاطمہ پر نظریں دوڑائیں تو ان کا مسکراتا ہوا چہرہ سامنے تھا۔

"سمجھا دیا اپنے بیٹے کو بزنس؟" جواب میں وہ بس مسکرا دیئے تھے۔

☆ ☆ ☆

طے کر نہ سکا زیست کے زخموں کا سفر بھی

حالانکہ میرا دل تھا شگوفہ بھی شرر بھی

اس رات اس نے خوب محنت کی۔پہلی بار کسی اسائنمنٹ کو اس نے اتنے دل سے لکھا تھا۔رات کے تہائی حصے تک وہ سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا اسائنمنٹ میں مشغول رہا۔کھلی کھڑکی سے آتی سرد ہوا کے جھونکے اس کی زلفوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔اس کی ٹیبل کھڑکی کے عین سامنے تھی۔خوشگوار موسم اس کے موڈ کو بھی خوشگور کیئے ہوئے تھا۔ایک کے بعد دوسرا پیپر اور پھر تیسرا۔اس نے بیس صفحات پر ایک جامع رپورٹ بنائی دی۔اسائنمنٹ ہینڈ رٹن سمٹ ہونا تھی۔اس لئے وہ لکھتا جا رہا تھا لیکن اگر اپروو ہو جاتی تو اس کی سوفٹ کاپی بھی سمٹ کروانا تھی۔درمیان میں اس نے ایک بار ریکارڈنگ بھی سنی تھی تا کہ کسی بھی غلطی کا ابہام نہ رہے۔

"تھینک گاڈ......اسائنمنٹ کمپلیٹ۔" اس نے بال پوائنٹ ٹیبل پر رکھ کر تمکنت کے ساتھ اسائنمنٹ کی طرف دیکھا تھا۔رات کے دو بج چکے تھے مگر آنکھوں میں ذرا بھی نیند کا بسیرا نہ تھا۔چاندنی رات میں آسمان پر موتیوں کی طرح چمکتے تارے اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا اور پھر نظریں ہٹا کر دوبارہ اسائنمنٹ پر دوڑائیں۔انہیں کور میں اچھے سے محفوظ کیا اور اپنا نام اور انفارمیشن لکھ کر ٹیبل پر ہی رہنے دیا۔دروازے کی طرف نظر دوڑائی تو وہ مقفل تھا۔کھڑکی کی طرف دیکھا تو وہاں سے خوشگوار جھونکے اندر آ رہے تھے۔اس نے کرسی کو پیچھے کھسکایا اور کھڑا ہوا۔

"اب سو جانا چاہیے مجھے۔کہیں ایسا نہ ہو۔صبح آنکھ نہ کھلے اور اسائنمنٹ وقت پر سمٹ ہی نہ ہو۔" اس نے سوچا اور واش روم کی طرف چل دیا۔پانچ منٹ میں وہ شاور لے کر اپنے کمرے میں واپس موجود تھا۔بلیک ٹراؤزر اور ہاف بازو براؤن ٹی شرٹ میں وہ کافی اچھا

لگ رہا تھا۔ گیلے بال اگرچہ اس نے تولیے سے خشک کر لئے تھے مگر پانی کی بوندیں اب بھی کہیں کہیں موجود تھیں۔

بیڈ پر آ کر وہ لیٹا اور جلد ہی خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ مسحور کن فضا ساری رات اس کے نیند میں مخل ہوتی رہی اور وہ سب سے بے نیاز ایک وقت تک ان سب سے غافل رہا۔

آنکھ تب کھلی جب دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ آنکھیں مسلتا ہوا کھڑا ہوا۔

''کیا ہے؟ اتنی صبح صبح کون آ گیا؟'' وہ بڑبڑایا اور بند آنکھوں سے ہی ٹانگیں لٹکائیں اور اندازے سے سلیپر پہنے۔ ایک لمبی انگڑائی لی تو دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

''آ رہا ہوں۔'' منہ بسوڑ کر کہا تھا۔ وہ بمشکل آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ اسے عام روٹین سے بھی پہلے اٹھا دیا گیا ہے۔

دروازہ کھولا تو سامنے علوی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے ناگواری کا ثبوت دیا۔

''علوی تم؟ کوئی کام تھا؟'' اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کہا تھا۔ علوی اسے نائیٹ سوٹ میں دیکھ کر حیران ہوئی۔

''سر آپ نے یونیورسٹی نہیں جانا کیا؟ میں ایک گھنٹہ پہلے بھی ناشتہ لے کر آئی تھی۔ آپ نے تب بھی دروازہ نہیں کھولا اور اب بھی تین بار دستک دے چکی تھی۔'' علوی کے اس انکشاف پر وہ بری طرح چونکا۔ اس کی نیند سیکنڈوں میں اڑ گئی۔ پلٹ کر الارم کی طرف دیکھا تو دس بجنے کے قریب تھے۔ وہ رات الارم لگانا بھول چکا تھا۔

''کیا؟ دس بجنے میں صرف دس منٹ؟ اوہ مائے گاڈ! دس بجے تو کلاس ہے۔'' وہ حواس باختہ رہ گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ وہ اتنا غافل کیسے ہو سکتا تھا؟ رات کیسے دن میں ضم ہو گئی اور اسے خبر تک نہ ہوئی۔ یہ تو علوی کا بھلا ہو جو اس نے دروازے پر دستک دے دی ورنہ تو آج پکا یہ لیٹ ہو چکا تھا۔

''علوی، جلدی سے اِندر کو کہو کہ کار سٹارٹ کر کے رکھے بلکہ ایسا کرے کار کو پارکنگ ایریا سے نکال کر باہر گیٹ پر لے جائے۔ میں وہیں اسے آ کر جوائن کرتا ہوں۔'' اس نے متعلقہ بیگ میں کچھ ڈاکومنٹس رکھے اور وارڈ روب سے جو ہاتھ میں آیا نکال ڈالا۔

''اور ناشتہ؟'' علوی نے اپنی ڈیوٹی کو اہمیت دی تھی۔

''میں اس پوزیشن میں ہوں کہ ناشتہ کروں؟'' اریب لمحہ بھر لے لئے ٹھہرا اور ذرا سخت لہجے میں کہا۔ علوی کا چہرہ اتر سا گیا تھا۔ اس نے گردن ہلائی اور باہر کو چل دی۔

''اے خدایا! بس وقت پر پہنچ جاؤں یونیورسٹی۔'' واش روم میں گھسنے سے پہلے اس نے دل میں دعا مانگی تھی۔ چینج کرتے ہی اس نے جلدی میں موبائل اور بیگ اٹھایا اور باہر آ کر روم لاک کیا۔

اِندر مین گیٹ پر اس کا پہلے سے ہی منتظر تھا۔ اریب جلدی سے بیٹھا اور کار سٹارٹ کرنے کو کہا۔ پورا راستہ اریب بار بار رسٹ واچ میں ٹائم ہی دیکھتا رہا۔ صرف دو منٹ بقایا تھا۔

''دو منٹ میں نو منٹ کا فاصلہ کیسے طے ہوگا؟'' وہ بڑبڑایا۔

''آپ فکر نہ کریں اریب صاحب! سب بہتر ہوگا۔'' اِندر نے سمجھایا تھا۔

''تم بس جلدی سے یونیورسٹی پہنچنے کی کوشش کرو۔'' اس نے عاجزی سے کہا تھا۔ چہرے پر تفکر کے تاثر ابھر رہے تھے۔ بے چینی کی کیفیت تھی۔ اِندر بھی جلد سے جلد اریب کو یونیورسٹی پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

دس بج کر نو منٹ پر وہ یونیورسٹی کے مین گیٹ کے سامنے تھے۔ اریب عجلت سے باہر نکلا اور اندر کی طرف بھاگا۔ اِندر نے کچھ لمحے اسے جاتا دیکھا اور پھر کار ریورس کی۔ وہ دوبارہ ہاٹل کی طرف چل دیا۔

وہ بھاگتا ہوا ڈی ایل سی پہنچا تھا۔ کلاس شروع ہو چکی تھی۔ وہ بیک ڈور سے کلاس میں انٹر ہوا۔ قسمت اچھی تھی اس کی کہ سر جارج نے اسے دیکھا نہیں۔ ورنہ انٹری تو ناممکن تھی۔ کرن اور ایشا سیکنڈ لاسٹ رو میں تھے۔ اریب کو دیکھتے ہی سرگوشی کی۔

''اتنی لیٹ؟ خیریت تھی ناں؟'' کرن گویا ہوا تھا۔ اس نے جواب دینے کی کوشش کی مگر نہ دے سکا کیونکہ سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

''میں تو سمجھی تھی کہ آج آنے کا ارادہ ہی نہیں ہے۔'' ایشا نے کہا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''چلو خیر ہے۔ اسائنمنٹ تو سمٹ ہو جائے گی ناں۔ یہی کافی ہے۔'' کرن کے جملے نے اس کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑا دی۔

''اچھا مجھے تو دیکھاؤ۔ کیسی بنائی اسائنمنٹ؟'' ایشا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے اپنا بیگ کھولا اور فائل نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا۔ اس کے چہرے پر جو خوشی کی لہر تھی پل بھر میں غائب ہو گئی۔ اریب کو دو سو واٹ کا جھٹکا لگا تھا۔ حواس باختہ اس نے بیگ میں موجود ایک ایک شے کو باہر نکال دیا۔

''کیا ہوا؟'' ایشا نے حیرانی سے استفسار کیا۔

اریب نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس چیزیں نکالتا چلا گیا۔ ہر شے اس کے بیگ سے باہر آ چکی تھی سوائے اسائنمنٹ کے۔ دونوں حیران تھے۔

''کہیں تم اسائنمنٹ تو نہیں بھول گئے؟'' کرن نے جیسے اس کے سر پر بم پھوڑا تھا۔ ایشا بھی بری طرح چونکی تھی۔

''ایسے کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ بمشکل بولا تھا۔ آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

''میں نے خود اسائنمنٹ بنا کر رات خود سٹڈی ٹیبل پر رکھی تھی۔'' اس نے افسردگی سے کہا تھا۔

''اور سٹڈی ٹیبل سے بیگ میں ڈالی تھی؟'' ایشا کے جملے پر اس کے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی۔اس نے اپنا سر ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں ٹھونس لیا۔وہ کیسے بھول سکتا تھا؟

''مطلب،تم نے بیگ میں اسائنمنٹ ہی نہیں رکھی؟'' کرن بھی اریب کی بے وقوفی پر حیران تھا۔

''یہ کیا ہوگیا مجھ سے؟اتنی محنت سے اسائنمنٹ بنائی تھی اور اسے ہی رکھنا بھول گیا؟'' وہ تاسف بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''پریشان مت ہو اریب۔ایسا کرو تم ہاٹل میں فون کرو۔ڈرائیو پہنچا دے گا۔اسائنمنٹ۔ویسے بھی سر کو یہاں آتے بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔'' ایشا نے مشورہ دیا تھا۔اریب نے سامنے دیکھا تو سر جارج ایک ایک سٹوڈنٹ کی اسائنمنٹ پڑھ کر چیک کر رہے تھے۔ایشا کی بات میں دم تھا۔اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔اس نے چیزیں دوبارہ ڈالیں اور باہر کی طرف چل دیا۔ڈی ایل سی سے دس قدم کے فاصلے پر اس نے موبائل آن کیا اور ریسپشن کا نمبر ڈائل کیا۔

''پریشے؟'' کال ریسیو ہوئی تو اریب جھٹ بولا۔

''جی میں پریشے ہی ہوں۔'' حیران کن لہجے میں مثبت جواب دیا تھا۔

''میں اریب عالمگیر ہوں۔'' اس نے پہلے اپنا تعارف کروایا۔

''سر آپ۔سوری آپ کو پہنچانا نہیں......'' وہ بات کو طول دے رہی تھی مگر اریب کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔اس نے فی الفور اس کی بات کاٹ دی۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔تم بذات خود یا علوی کو بھیج کر میرے روم سے ایک اسائنمنٹ لا کر اِندر کو دو اور اسے کہو کہ ارجنٹ مجھے یونیورسٹی تک پہنچائے۔اسائنمنٹ سٹڈی ٹیبل پر رکھی ہے۔'' اس نے معجّل لہجے میں کہا تھا۔

''میں ویٹ کر رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کر دیا اور بے چینی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے اِندر کا انتظار کرنے لگا۔

''یوں ٹہلنے سے کچھ نہیں ہوگا۔مجھے مین گیٹ تک چلے جانا چاہیے۔تاکہ اِندر کے پہنچتے ہی اسائنمنٹ لے لوں۔'' اس نے سوچا اور مین گیٹ کی طرف چل دیا۔

وہ ابھی اس طرف جا ہی رہا تھا کہ ہاٹل سے کال آئی۔سیکنڈ سے بھی پہلے اس نے کال ریسیو کی۔

''ہاں؟ کیا بنا؟اِندر اسائنمنٹ لے کر چل دیا؟'' اس نے خود سوال کیا۔

''سوری سر!اِندر تو ابھی یہیں ہے۔'' اس نے معذرت خواں لہجے میں کہا تھا۔

''تو پھر مجھے فون کیوں کیا؟ جلدی سے جا کر اسے فائل دو۔'' اس نے اشتعال انگیز لہجے میں کہا تھا۔

''کون سی فائل سر؟ سٹڈی ٹیبل پر تو کوئی فائل تھی ہی نہیں۔سٹڈی ٹیبل پر تو کیا؟ روم میں کہیں بھی کوئی فائل نہیں تھی۔'' پریشے نے

جیسے اس کے سر پر گہری ضرب لگائی تھی۔اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔سانسیں بھی بری طرح اتھل پتھل ہونے لگیں۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ وہیں تو تھی فائل۔میں نے کل رات ہی تو سٹڈی ٹیبل پر رکھی تھی۔تم نے اچھے سے دیکھا تھا؟'' وہ ہکلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔اس کے حواس جیسے دھیرے دھیرے کھوتے جا رہے تھے۔پیشانی پر پسینے کی بوندیں ابھر آئیں۔

''سر علوی نے پورا کمرہ چھان مارا مگر ایسی کوئی فائل اسے نہیں ملی۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''علوی سے ضرور کوئی غلطی ہوئی ہے۔تم خود جا کر دیکھو۔ہری اپ۔'' اس نے حکم دیا تھا۔پریشے نے ہاں کر دی اور خود جا کر اریب کا روم دیکھا مگر علوی کی بات سچ تھی۔سٹڈی ٹیبل پر کوئی فائل نہ تھی۔واپس آ کر کال بیک کی۔

''ملی فائل؟'' اریب کی جان جیسے ہتھیلی پر تھی۔

''سوری سر!'' پریشے نے جیسے پھونک سے اس کی جان کو بری طرح مسل کر رکھ دیا۔رات بھر کی محنت منٹوں میں غائب ہو چکی تھی۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ فائل وہیں ہے۔تم نے اچھے سے نہیں دیکھا ہوگا۔''

''سر ہم دونوں نے اچھے سے دیکھا لیکن وہاں ہمیں نہ فائل نظر آئی اور نہ ہی کسی اسائنمنٹ کے پیپر۔اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو آپ خود آ کر دیکھ لیں۔'' پریشے نے بے بسی کے ساتھ کہا تھا۔اریب نے کچھ کہنے کی بجائے فون ڈسکنیکٹ کر دیا۔چہرے پر اشتعال خوفناک حد تک بڑھ چکا تھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ فائل میں نے خود سٹڈل ٹیبل پر رکھی تھی۔ایسے کیسے جا سکتی ہے وہ کہیں بھی؟'' اس کا سر بری طرح چکرایا تھا۔دوبارہ اپنے بیگ کی تلاشی لی مگر پہلے والی چیزوں کے علاوہ کوئی نئی چیز نظر نہ آئی۔اس کا سر بری طرح گھومنے لگا تھا۔

''اب کیا کروں؟'' اس نے پلٹ کر دیکھا تو ڈی ایل سی کی طرف راستہ پایا اور سامنے دیکھا تو باہر سڑک پر کاروں کی آمد و رفت۔اس مصروف زندگی میں کوئی بھی اس کا ہمدرد نہ تھا۔

''اب کیا کروں میں؟'' اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔تبھی پریشے کی آواز دوبارہ گونجی۔

''اگر آپ کو یقین نہیں آ رہا تو آپ خود آ کر دیکھ لیں۔'' اس نے گہری سانس لی۔

''مجھے خود جا کر دیکھنا چاہیے۔ویسے بھی بنا اسائنمنٹ کے بنا میں کلاس میں جا نہیں سکتا۔'' اس نے سوچا اور یونیورسٹی کے باہر قدم رکھا۔آج پہلی بار وہاں اِندر موجود نہ تھا۔آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا جب اس نے یونیورسٹی سے باہر قدم رکھا ہو اور اِندر اس کا منتظر نہ ہو۔اس میں اِندر کا بھی کوئی قصور نہ تھا۔وہ یونیورسٹی ٹائم سے پہلے ہی ہاٹل جا رہا تھا۔

''راستہ؟'' وہ کچھ الجھا کیونکہ انجان شہر میں اس نے پہلے کبھی باہر قدم نہیں رکھا تھا۔یہاں کے لوگ اس کے لئے بالکل نئے تھے۔ہاٹل اور یونیورسٹی کی لائف الگ تھی مگر باہر کا ماحول اس کے لئے بالکل نیا تھا۔وہ ادھر ادھر نظر دوڑاتے ہوئے فٹ پاتھ پر گامزن تھا۔

ہلکے سرمئی رنگ کے بادلوں نے سورج کی کرنوں کو اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔ ون وے روڈ پر ٹریفک ایک لمحے کے لئے بھی جمود میں نہ تھیں۔ متحرک رہنا تو جیسے ان کی زندگی تھی۔

راہگزر بھی تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ اس نے اپنے بیگ کی تنی کو مضبوطی سے پکڑا اور آگے بڑھنے لگا۔ وہ تقریبا اندازے سے ہاٹل کی طرف جا رہا تھا۔ کچھ قدم سیدھ میں چلنے کے بعد اسے دو راستے نظر آئے۔ وہ رکا۔

''کس طرف جاؤں؟'' وہ الجھا۔ ادھر ادھر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا جس سے راستہ پوچھا جا سکے۔ وہ بائیں جانب مڑا تو کچھ فاصلے پر ایک ڈسٹ بین پر ایک لڑکا بیٹھا نظر آیا۔ پھٹی جینز اور سلیولیس شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس کے بازو پر ایک بچھو کا ٹیٹو تھا اور کلائیوں میں موٹی زنجیر۔ وہ ایک تلی سے دانت کو صاف کرتا ہوا راہ گیروں کو گھور رہا تھا۔ اریب نے اس لڑکے سے کوفت محسوس کی اور پاس سے گزرتے ہوئے اس سے بچنا چاہا اور فٹ کے بالکل کنارے پر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ اس اجنبی نے اریب کو سرتاپا دیکھا۔ اریب کے آگے جاتے ہی وہ اس کے پیچھے چل دیا۔

''سنو! تم اس شہر میں نئے ہو کیا؟'' اس نے انڈونیشین زبان میں پوچھا تھا۔ وہ ان لفظوں کا مطلب سمجھ چکا تھا کیونکہ یہاں رہتے ہوئے اس نے کچھ انڈونیشین سیکھ ہی لی تھی۔

جواب دینے کی بجائے وہ اپنی رفتار میں تیزی لے آیا اور بنا پلٹے آگے بڑھتا رہا۔

''سن تو، سنتا نہیں ہے کیا؟'' وہ مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔ اریب کو اس کا ارادہ ٹھیک نہ لگا۔ وہ ایک اوباش لڑکا دکھائی دے رہا تھا اور یہاں ایسے لڑکوں کا ملنا عام تھا۔ وہ اس کا موبائل چھین کر بھاگ سکتا تھا اور اگر مزاحمت کرتا تو شاید اس پر جانی حملہ بھی کر سکتا تھا۔ ایسا اس نے سوچا تھا۔

''سنتا نہیں ہے کیا؟'' اس کا گمان صحیح ثابت ہوا۔ اُس لڑکے نے پیچھے اریب کا گریبان پکڑ کر کھینچا۔ وہ لڑھکتا ہوا پیچھے کی طرف گرنے سے بچا تھا۔ اریب کی نظر اس کی پیشانی پر گئی تو اس کے تو جیسے ہوش ہی اڑ گئے۔ وہ انتہائی رزیل قسم کا لڑکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا اریب نے ایک جھٹکا دیا۔ وہ اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھا اور پیچھے سلاخ کے ساتھ جا لگا۔ جو کہ ایک انڈسٹری کی بیرونی دیوار کے ساتھ حفاظت کے لئے لگائی گئی تھی۔

اسے دھکیلنے کے بعد اریب نے پیچھے پلٹ کر نہ دیکھا اور ناک کی سیدھ میں دوڑ لگا دی۔

وہ لڑکا کھڑا ہوا اور انتہائی گھٹیا الفاظ میں اریب کی طرف دیکھا۔ ساتھ ہی کئی گالیوں سے اپنے لبوں کو آلودہ کیا۔

''چھوڑوں گا نہیں تجھے تو۔'' وہ بھی اریب کی طرف بھاگا۔ اریب کی تو جیسے جان پر بن آئی تھی۔ پریشے کی باتیں جو پہلے فقط اسے فقط مزاح لگتی تھیں اب سچ ہوتی معلوم ہو رہی تھیں۔ یہ شہر اجنبیوں کے لئے ٹھیک نہیں ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔

سانس بھی بری طرح پھول چکا تھا۔اسے اپنے پیچھے اس لڑکے کے قدموں کی آہٹ برابر سنائی دے رہی تھی۔وہ مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔بھاگتا ہواوہ بائیں جانب گلی میں مڑا۔کچھ فاصلے پر جاتے اسے ایک بار پھر پیچھے سے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

”یہ تو میرا پیچھا ہی کر رہا ہے مسلسل۔“اس نے دل میں سوچا تھا۔

”کیسے جان چھڑاؤں اس سے؟“وہ بھاگتا ہوا سوچ رہا تھا۔بھاگتے ہوئے اس کی پسلیوں میں بھی درد ہونا شروع ہو گیا۔آج سے پہلے وہ کبھی اتنا نہیں بھاگا تھا۔قریب تھا کہ وہ چکرا کر گر جائے وہ وہ لڑکا اس پر گرفت حاصل کر لے۔

”اوئے۔بھاگتا کہاں ہے؟“دور سے ایک آواز آئی۔اس کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑ گیا۔وہ دائیں جانب مڑا تو سامنے دو راستے تھے۔سوچنے کا وقت نہیں تھا۔اس نے دائیں جانب کے راستے کا تعین کیا جو انتہائی غلط قدم تھا۔گلی بند تھی۔اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔واپس پلٹنے کا وقت نہیں تھا مگر یہ رسک لینا تھا اسے۔کیونکہ نکلنے کا کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔وہ ابھی پلٹا ہی تھا کہ وہی لڑکا سامنے کھڑا تھا۔اس کا سانس بھی پھولا ہوا تھا مگر اتنا نہیں جتنا اریب کا تھا۔شاید وہ اس کا عادی تھی۔

ایک گالی کے ساتھ اس نے مخاطب کیا اور مزید کہا۔

”بہت بھگایا تو نے۔اب بتاؤں گا تجھے کہ مجھے دوڑانے کا انجام کیا ہوتا ہے؟“اس نے گردن کو جھٹکا دے کر پٹاخا نکالا تھا۔انگلیوں کو بھی مڑوڑتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔اس کی نگاہوں میں شیطانیت واضح تھی۔

”دیکھو۔دور رہو۔میں آخری بار کہہ رہا ہوں۔“وہ انگلش میں کہہ رہا تھا مگر وہ اس زبان سے نابلد تھا۔خوف کے سبب وہ اٹڈونشین بھی بھول چکا تھا۔اس نے دائیں بائیں گردن گھمائی تو ڈسٹ بین نظر آئی۔وہ بائیں جانب کھسکا اور ایک ڈسٹ بین کا ڈھکن اٹھا کر اس کے منہ پر دے مارا۔وہ چیخا۔خون کی ایک لکیر اس کی پیشانی سے بہنے لگی۔اریب نے موقع غنیمت جانا اور اس کے بائیں طرف سے نکل کر بھاگنا چاہا مگر اس نے اس کی کلائی پکڑ لی تھی۔

”اس بار نہیں لڑکے۔“وہ اپنی انگلیوں کو اس کی کلائی میں دھنساتا جا رہا تھا۔اس کے گندھے ناخن انتہا کے بڑھے ہوئے تھے جن میں سیاہ گندگی واضح طور پر دیکھی جا سکتی تھی۔

”تجھے تو بتاتو ہوں میں۔“اس نے اریب کو ایک جھٹکا دے کر دیوار میں پٹخ دیا۔وہ درد سے کراہا۔پلٹا تو ایک مسیحا کو اپنے سامنے پایا۔

”اس لڑکے سے پیچھے ہٹو۔ورنہ اچھا نہیں ہوگا تمہارے لئے۔“ایک شفیق لہجے کو سماعت میں رس گھولتا ہوا پایا تھا۔

”تم پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہوگا۔“اس نے تنبیہہ کی تھی۔اریب نے سامنے دیکھا تو ایک آدمی جس کی پشت اریب کی طرف تھی،اس کا محافظ تھا۔ایک لمبا سا اوور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔گھنے سیاہ بال تھے۔

”تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ورنہ تمہارے لئے بہتر نہیں ہوگا۔“شفیق لہجہ دوبارہ گویا ہوا تھا۔

''تم ٹھیک تو ہو۔'' اس مسیحا نے پیچھے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اریب نے اپنا ہاتھ اس شفیق ہاتھوں میں تھمایا اور اپنا پاؤں جو ایک سوراخ میں بری طرح الجھ چکا تھا، نکالا۔

''تم یہاں سے چلے جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں اس کو۔'' وہ ایک لمحے کے پلٹا تو اس کا چہرہ سامنے تھا۔ آنکھوں پر بڑی بڑی سن گلاسز تھی جو آدھے چہرے کو ڈھانپے ہوئے تھے۔ جس بنا پر چہرے کے خدوخال کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ بس ایک گہری مسکراہٹ تھی۔ جس میں اپنائیت کا ایک احساس پنہاں تھا۔ ہمدردی کا ایک پہلو تھا۔

''اوئے۔'' وہ لڑکا آگے بڑھا اور مارنا چاہا۔ اس مسیحا نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ اریب کا دل وہاں سے جانے کو نہیں چاہا۔ ایک بار رک کر شکریہ ادا کرنا چاہا مگر وہ اسے مسلسل وہاں سے جانے کو کہہ رہا تھا۔ اریب نے گردن گھمائی اور دل پر پتھر رکھ کر راہ لی۔

ہاسٹل کے دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔ اسے اپنے مسیحا کا خیال آیا۔

''کون تھا وہ؟'' اس نے سوچا مگر دل سے دعا نکلی۔

''اللہ تمہیں اجرِ عظیم عطا کرے اے اجنبی!'' لب دھیرے سے متحرک ہوئے تھے۔ وہ واپس پلٹا اور ذہن میں سب کچھ فلم کی ریل کی طرح چلنے لگا۔

''اسائنمنٹ۔'' چہرے پر دوبارہ تفکر کے جذبات ابھرے۔ وہ برق رفتاری سے آگے بڑھا۔

''سر!'' ریسیپشن سے گزرتے ہوئے پریشے نے کہا تھا مگر وہ پلٹا نہیں۔ سیدھا اپنے روم کی طرف گیا۔ کمرہ لاک تھا۔ اس نے معجل دروازہ وا کیا اور سیدھا سٹڈی ٹیبل کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہاں واقعی کوئی شے نہ تھی۔

''ناممکن......!'' وہ معجل آگے بڑھا اور بیگ کو بیڈ پر دے پھینکا اور سٹڈی ٹیبل پر چیزوں کو اتھل پتھل کیا مگر کوئی شے نظر نہ آئی۔

''کہاں گئی اسائنمنٹ؟'' وہ پریشانی کے عالم میں تھا۔ اس نے سٹڈی ٹیبل کے نیچے بھی دیکھا مگر وہاں بھی کوئی شے نہ تھی۔ بیڈ پر نگاہ دوڑائی مگر اسائنمنٹ وہاں بھی موجود نہ تھی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ یہیں تو رکھی تھی اسائنمنٹ؟ کہاں چلی گئی؟'' وہ سخت پریشان تھا۔ شکست خوردہ شخص کی طرح وہ بیڈ پر بیٹھا تو موبائل کی رنگ ہوئی۔ اس نے پہلے تو اگنور کیا مگر رنگ مسلسل ہوتی رہی۔ روکھے انداز میں اس نے فون ریسیو کیا۔

''تو کیسا رہا مسٹر اریب، میرا سرپرائز؟'' استہزائیہ انداز گویا ہوا تھا۔ اریب چونکا اور کان سے ہٹا کر نمبر دیکھا۔ یہ ابدال کا نمبر تھا۔

''سرپرائز؟'' وہ چونکا۔

''ہاں، اسائنمنٹ کا سرپرائز۔'' اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔

''مطلب؟ تم نے چرائی میری اسائنمنٹ؟'' وہ ہکلاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا وہ اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتا ہے؟

''چرائی؟ اسے چرانا نہیں بلکہ مخالف کو پچھاڑنا کہتے ہیں۔'' اس نے اریب کی تصحیح کرائی تھی۔

''بدتمیز۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟'' اریب کی عقل مفلوج ہو چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کس خطاب سے وہ ابدال کو مخاطب کرے؟

''تم جو مرضی کہو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تمہیں پہلے ہی تنبیہ کی تھی مگر تم نے میری تنبیہ کو اہمیت نہیں دی۔ اب اس کا انجام تم دیکھ چکے ہو۔'' وہ اس کے وجود پر یکے بعد دیگرے ضرب لگا رہا تھا۔ اریب کا چہرہ ہر لمحہ نئے تاثر دے رہا تھا۔ بس نہیں چلا ورنہ وہ مخالف کو کچا چبا جاتا۔ اس نے انگلیوں سے چادر کو بری طرح نوچا تھا۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟ تم جانتے بھی ہو کہ وہ اسائنمنٹ میرے لئے کتنی اہم تھی؟'' اس بار اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔

''جانتا ہوں۔ اس اسائنمنٹ کے بغیر تمہارے مارکس زیرو ہونگے اور سمیسٹر فیل۔'' اسے تو جیسے کوئی فرق ہی نہیں پڑا تھا۔ وہ مسلسل ہنس رہا تھا۔ آواز میں ایک سحر تھا۔ جو اس وقت اریب کے لئے زہر کے مترادف تھا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔'' اس کا انداز گلوگیر تھا۔ وہ شکست خوردہ شخص کی طرح حوصلے ہار چکا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اسے ایسی مات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سب کچھ کرنے کے باوجود وہ خالی ہاتھ تھا۔

''اس کے ذمے دار تو تم خود ہو۔ ابھی بھی وقت ہے چلے جاؤ۔ ورنہ آگے اس سے بھی برا ہو سکتا ہے۔'' آواز میں ایک بار پھر سختی آگئی۔ اریب کا ذہن چکرایا۔ نمی کو پونچھا اور گلا کھنکارا۔

''اتنی جلدی نہیں مسٹر ابدال۔ تم ان نیچ حرکتوں کے ذریعے مجھے میرے عزائم سے نہیں ہٹا سکتے۔ میں جو مقصد لے کر یہاں آیا ہوں۔ وہ مکمل کر کے ہی رہوں گا۔ تم سے جڑے ہر سوال کا جواب پا کر ہی رہوں گا۔'' وہ بارعب انداز میں گویا ہوا تھا۔

''یہ بھول ہے تمہاری۔'' مخالف سمت سے اسے بری طرح پچھاڑ دیا گیا تھا۔

''چلو بھول ہی مگر یہ مت بھولنا کہ کمزور ہی بعض اوقات مغرور لوگوں کو پچھاڑا کرتے ہیں۔'' اس نے چیلنج کیا تھا۔ تبھی اس کے ذہن میں اس رزیل لڑکے کا خیال آیا۔ ابدال کا فون، اس کا دھمکانا، لڑی سے لڑی جڑنے لگی۔

''اوہ۔ تو وہ لڑکا بھی تم نے بھیجا تھا مسٹر ابدال۔'' جواب میں اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک قہقہہ سنائی دیا۔

''تم اتنی نیچ اور گھناؤنی سوچ کے مالک ہو یہ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ تم جانتے ہو، پہلے میں نے سوچا تھا کہ شاید میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق ہے مگر یہ حرکت کر کے تم نے میرے اس گمان کو بھی دور کر دیا۔ تمہارا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ تم جیسے رزیل لوگوں سے ہم شریف زادوں کا کوئی تعلق نہیں۔'' وہ کڑیل لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"زبان سنبھال کر۔" وہ اریب کی بات سن کر غصے میں آگیا تھا۔تبھی سخت لہجے میں گویا ہوا۔

"سچ سننا کڑوا لگا؟ ویسے سچ کڑوا ہی ہوتا ہے مسٹر رزیل۔" اریب کے الفاظ انتہائی سخت تھے۔رابطہ منقطع کر دیا گیا۔اس کی چمکتی آنکھیں، اپنے اندر ایک لاوا سینتے ہوئے تھیں۔

اس ملک میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو ایسی سوچ رکھتے ہیں؟ محض اپنے فائدے کی خاطر، اپنی زبان کو سچا بنانے کے لئے دوسروں کی عزت کو داغ دار کرنا، کہاں کی شرافت ہے؟

اریب نے اس لڑکے کی پیشانی پر ہم جنس پرستی کی غلاظت دیکھی تھی۔وہ اکیلا نہیں تھا۔اس کے ساتھی قریب تھے۔وہ بس اس کو کسی بھی طریقے سے بے ہوش کر کے اپنے مقام تک لے جانا چاہتا تھا۔تبھی اریب حواس باختہ رہ گیا۔سوجھ بوجھ پل بھر کے لئے مفلوج ہوگئی۔وہ تو بھلا ہو اس مسیحا کا جس نے اسے بچا لیا ورنہ شاید وہ اب تک اس کے ناپاک ارادوں کی بھینٹ چڑھ چکا ہوتا۔

اپنے ملک میں بنا کسی ضرورت کے گھر سے باہر نہ نکلنے والا آج پرائے دیس میں واقعی درندوں میں پھنسنے جا رہا تھا۔

"شاید بابا جان اسی لئے مجھے یہاں آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔" اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔اسے جہانزیب کا چہرہ آنکھوں کے سامنے دکھائی دیا۔

"وہ تو مجھے اس معاشرے کی گندگی سے بچائے ہوئے تھے۔وہ پابندیاں میرے بھلے کے لئے ہی تھیں اور میں تھا کہ ان سب سے بیزاریت محسوس کر رہا تھا۔" اس نے سوچا اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔

"اتنی گھٹیا سوچ، وہ لڑکا میرے بارے میں کیسے گمان کر سکتا تھا؟ ضرور اس کے لئے اسے کسی نے اکسایا ہوگا؟ اور وہ ابدال ہی تھا۔کیونکہ محض وہی میرا دشمن ہے۔" اس نے خود ہی گمان کیا۔جو ایک حد تک صحیح تھا۔اب تک سب چیزوں کے پیچھے اسی کا تو ہاتھ تھا۔

"تم بہت گھٹیا ہو ابدال۔ بہت ہی گھٹیا۔ پہلے صرف میں تمہیں ناپسند کرتا تھا کیونکہ میری اضطرابی کا سبب بنے ہوئے تھے لیکن اب مجھے تم سے نفرت ہے کیونکہ تمہاری سوچ اتنی گھٹیا ہے۔تم تو انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو ابدال۔" اس نے انتہائی حقارت کے ساتھ کہا تھا۔

"یہ دیس بہت برا ہے۔یہاں کے رہنے والے بھی۔" وہ بڑبڑایا مگر اگلے ہی لمحے کئی چہرے اس کے ذہن سے ٹکرائے۔پریشے، اِندر، علوی جو بنا جان پہچان کے اس کا خیال رکھ رہے تھے۔وہ تو ایسے نہ تھے۔پھر وہ کیسے اس دیس کے رہنے والوں کو برا کہہ سکتا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر وہ مسیحا جس نے آج اس کو نئی زندگی بخشی تھی۔وہ بھی اسی دیس کا شہری تھا۔وہ کیسے اسے ان رزیل لوگوں میں شامل کر سکتا تھا؟ رزیل لوگ تو ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔چاہے وہ پاکستان ہو یا انڈونیشیا۔معاشرہ تو بنتا ہی اچھے برے لوگوں سے مل کر ہے۔منحصر ہم پر ہے کہ ہم کس شے کی طرف جھکتے ہیں۔

یہ دیس بھی برا نہیں ۔ یہاں کے رہنے والے بھی برے نہیں ۔ بس کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے نزدیک دیس کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ کسی دیس سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کا دیس ان کا نفس ہے۔ محض ان لوگوں کو اساس بنا کر کسی دیس پر انگلی اٹھانا بے بنیاد ہے۔

''شکریہ تمہارا۔'' اس نے دل میں اس مسیحا کا چہرہ گمان کیا۔ بڑی بڑی سن گلاسز سے چہرے کو چھپائے ہوئے وہ فرشتہ بن کر نازل ہوا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ مٹی سے بنا تھا۔

''میری جان پر تمہارا قرض ہمیشہ رہے گا'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نمی ابھری۔ جس میں کئی احساسات شامل تھے۔ ابدال کے ہاتھوں زندگی میں پہلی بار اسے ایجوکیشن میں شکست ہوئی تھی۔ رزیل لڑکے کی ہوس نے پہلی بار اس کے جسم میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی اور پھر وہ اجنبی مسیحا جس نے بنا جان پہنچان کے اس کی مدد کی۔ جس کے لئے وہ صرف دعا ہی کر سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

چہرے بدل بدل کے مجھے مل رہے ہیں لوگ

اِتنا بُرا سلوک مری سادگی کے ساتھ؟

ایشا اور کرن کو اریب کی اسائنمنٹ سمٹ نہ ہونے پر کافی دکھ تھا۔ خود اریب بھی افسردہ دیکھائی دیا لیکن وہ زندگی میں آگے بڑھنے کا عادی تھا۔ اس لئے زیادہ اثر قبول نہ کیا۔ زندگی ایک بار پھر معمول پر آنے لگی تھی مگر اس واقعے سے اس نے دو باتیں سیکھی تھیں۔

پہلی بات، اپنی چیزوں کی خود حفاظت کرنا۔ کام کے بعد ہر شے کو اپنی مقررہ جگہ پر رکھ کر جانے سے پہلے تمام چیزیں چیک کر لینا۔

دوسری بات، اس اجنبی ماحول میں کبھی اکیلے نہ جانا۔

اس واقعے کے بعد وہ ہمیشہ اِندر کا منتظر رہتا اور کبھی اکیلے جانے کا نہ سوچا۔ اگر جانا بھی ہوتا تو ایسی جگہ سے گزرتا جہاں لوگوں کا ایک ہجوم ہو۔ اس دن اس نے سنسان فٹ پاتھ کا رخ کیا تھا اور اس کا خمیازہ سامنے تھا۔

آج لیکچر روم سے وہ تینوں گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ انڈونیشین طلبا گراؤنڈ میں فٹ بال کھیل رہے تھے۔

''ویسے انہیں کیسے پتا چلتا ہوگا کہ فلاں کھلاڑی دوسری ٹیم کا ہے۔'' اریب نے حیرت سے پوچھا تھا۔ جس پر دونوں چونکے۔

''مطلب؟'' کرن نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ سب کے چہرے تو ایک جیسے ہیں۔ وہی ناک، وہی آنکھیں، وہی ہونٹ۔ اگر میں ان میں سے کسی بھی ٹیم میں ہوتا تو لازمی مخالف سمت کے کھلاڑی کو اپنی ٹیم کا سمجھتے ہوئے فٹ بال پاس کر دیتا۔'' اریب کی اس بات پر دونوں ہنس دیئے تھے۔

''اریب تم بھی ناں بالکل بچگانہ باتیں کرتے ہو کبھی کبھی۔ بھلا ایسے بھی کبھی ہوتا ہے؟'' ایشا نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں ناں۔ ہوتا ہے۔ مجھے تو سب ایک سے لگتے ہیں۔ اگر تمہارے بال بھی بھورے نہ ہوتے تو مجھے تم عام لڑکیوں کی طرح

لگتی۔" اریب نے ایشا کی طرف دیکھا تھا۔ جس پر وہ مسکرا دی۔

"اس کا مطلب، میں اب عام نہیں ہوں۔" اس نے ذو معنی بات کہی تھی مگر اریب کا دھیان وہاں نہ تھا۔ وہ اب کرن کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور تمہیں تو دور سے دیکھ کر ہی پہنچان سکتا ہوں۔ تمہارا چہرہ ہر لحاظ سے مجھے الگ دکھائی دیتا ہے یہاں کے لوگوں سے۔" کرن نے فرضی کالر کھڑے کئے۔

"اچھا یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ کیوں نا آج باہر پیزا کھانے چلیں؟" ایشا نے یک دم بات کا رخ بدلا۔ کرن نے تو فوراً ہاں بھر دی مگر اریب جھجکا۔

"ارے یار، بس پانچ منٹ کی تو دوری پر ہے، پیزا شاپ۔ یقین جان بڑے مزے کے پیزا ہوتے ہیں وہاں۔ بندہ انگلیاں ہی چاٹتا رہ جاتا ہے۔" کرن کے منہ پر جیسے پانی آ چکا تھا۔

"تبھی تو دیکھو اس کی انگلیاں کتنی چھوٹی ہو گئیں ہیں۔" ایشا نے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اریب ہنس دیا اور جانے کے لئے ہاں بھر دی۔ اِندر انہیں گیٹ پر ملا تھا۔ وہ تینوں اِندر کے ساتھ ہی وہاں گئے تھے۔

"اس طرح کرتی ہوں تین سمال سائز فجیتا آرڈر کر دیتی ہوں۔" ایشا نے کہا اور فی الفور آرڈر کر دیا۔ اریب نے اپنی پسند بتانا مناسب نہ سمجھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ بیس منٹ بعد ویٹر آرڈر لے کر حاضر تھا۔ اس نے دو فجیتا کرن اور ایشا کے سامنے رکھ دیئے اور ایک vegetarian pizza اریب کے سامنے رکھ دیا۔ ایشا کی نظر جب اس کے پیزے پر گئی تو ویٹر پر برس پڑی۔

"میں نے آپ کو تین فجیتا کا آرڈر دیا تھا اور یہ آپ کیا لے آئے؟" ایشا کا اشارہ اریب کے پیزے کی طرف دیکھا۔

"سوری میڈم۔ غلطی ہو گئی۔" اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ اریب نے حالات کا جائزہ لیا۔

"میں ابھی دوسرا لے آتا ہوں پیزا۔" اس نے اٹھانا چاہا تو اریب نے روک دیا۔

"رہنے دو ایشا۔ غلطی ہو گئی تو کیا ہوا؟ میں یہی کھا لیتا ہوں۔ مجھے پسند ہے یہ۔" اس نے نرم لہجے میں کہا تھا۔

"لیکن اریب سمجھوتہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ اس سے غلطی ہوئی تو ہے اسے انجام بھگتنا چاہیے۔" وہ ابھی تک غصے میں تھی۔

"سمجھوتہ نہیں کر رہا میں۔ مجھے واقعی یہ پیزا پسند ہے۔" اس نے یقین دہانی کرائی تھی۔ ویٹر نے تشکر بھری نگاہوں سے اریب کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

"تم نے بس ایسے ہی اسے جانے دیا۔ ایک بار اپنی جیب سے اس کا بل دیتا تو لگ پتا جاتا۔" وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔ اریب

نے مسکرا کر پہلا سلائیس پلیٹ پر رکھا۔موبائل پر میسج کی رنگ ہوئی۔

اریب نے فارکس پلیٹ میں رکھے اور موبائل چیک کیا۔ابدال کے نمبر سے میسج تھا۔اس نے فوراً سے پہلے اسے ریڈ کیا۔

''کھا کر بتانا ضرور، کیسا لگا پیزا؟'' یہ میسج پڑھ کر اسے ایک دھچکا لگا۔وہ یہاں موجود تھا۔اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ادھر ادھر دیکھا تو وہاں کئی آدمیوں کو پایا۔ان میں سے ہر ایک انجان تھا۔کوئی بھی ایسا آدمی نہ تھا جس پر شک کیا جا سکے۔

''کیا ہوا؟تم ادھر ادھر کیا دیکھ رہے ہو؟'' کرن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔''اس نے موبائل ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ دوسرا میسج آیا۔

''آرام سے دوستوں کے ساتھ پیزا انجوائے کرو۔کیا معلوم دوبارہ انجوائے کرنا قسمت میں ہو یا نہیں؟اور ہاں بل میں پے کر چکا ہوں۔آج کی پارٹی میری طرف سے۔''اس کی پیشانی پر پریشانی کا عنصر نمایاں تھا۔

''کس کے میسج آرہے ہیں؟''ایشا نے وجہ دریافت کرنا چاہی تو اس نے ٹال دیا اور موبائل کو ایک آواز کے ساتھ ٹیبل پر رکھا۔نظر پیزے کی طرف گئی تو اسے اپنا فیورٹ پیزا زہر لگنے لگا تھا۔دل چاہا کہ وہ اس کے سامنے آئے اور اس پیزے کر او پر سرخ مرچی چھڑک کر اس کے منہ میں ڈھونس دے۔

''کیا ہوا؟ کھانے کا ارادہ ملتوی ہو چکا ہے؟'' کرن نے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا تھا۔

''نہیں تو۔''اس نے بمشکل فارک اور نائیو کی طرف ہاتھ بڑھائے تھے۔پہلا ٹکڑا کاٹنا اس کے لئے انتہا کا محال تھا۔اس کا بس نہیں چلا ورنہ پیزا اٹھا کر زمین پر دے پھینکتا مگر ایسا کرنا بے وقوفی تھا۔کڑھتے ہوئے اس نے پہلا ٹکڑا منہ کی طرف بڑھایا تھا۔ذائقہ عجیب سا محسوس ہوا۔جس کھانے کا بل کسی دشمن کی طرف سے دیا گیا ہو بھلا اس کھانے میں ذائقہ کیسے آسکتا تھا؟پانچ منٹ وہ ٹکڑا منہ میں گھماتا رہا۔ایشا اور کرن اس کی حرکت کو نوٹ کر رہے تھے مگر خاموش رہے۔

''ہاں یاد آیا۔اِندر بھی تو ہمارے ساتھ ہے۔اس کے لئے تو ہم نے کچھ لیا ہی نہیں۔میں ایسا کرتا ہوں یہ پیزا اس کو دے دیتا ہوں۔''اس سے پہلے کہ دونوں میں سے کوئی کچھ بولتا وہ برق رفتاری سے اٹھا اور یہ جا اور وہ جا۔

باہر جا کر اس نے منہ کا نوالہ بھی ڈسٹ بن کے حوالے کر دیا تھا۔وہ دشمن کے پیسوں کا ایک نوالہ بھی نہیں کھا سکتا تھا۔واپسی پر اس نے خود سے پے کر کے پیزا آرڈر کیا اور پیٹ بھر کر کھایا۔اس بار پھر میسج آیا۔

''ناٹ بیڈ لیکن تم نے میرا دل توڑ دیا۔''ابدال کی طرف سے میسج تھا جس پر اس نے ذرا توجہ نہ دی اور کرن کے ساتھ باتوں میں مصروف رہا۔

☆ ☆ ☆

جاگی ہوئی مخلوق ہے سورج کی عناں گیر

سویا ہوا انسان دعا مانگ رہا ہے

چند ہی دنوں میں عاطی حاعفہ کا عادی ہو چکا تھا۔ حاعفہ نے بھی اسے جی جان سے پیار کیا۔ اسے کبھی کبھی ایسا لگتا جیسے یہ دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لئے ہیں۔ جیسے اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ بالکل اسی طرح عاطی کا بھی کوئی نہیں۔ شاید اسی لئے قسمت نے خدیجہ کی اس سے ملاقات کروائی تھی تا کہ وقت آنے پر عاطی اور یہ مل سکیں۔

عاطی کو اس نے ایک اچھے سے سکول میں داخل کروا دیا اور اس کی تربیت بالکل اسی انداز میں کرنے لگی جیسا کہ خدیجہ چاہتی تھی۔ محض عاطی کی خاطر اس نے قرآن اکیڈمی کی ٹائمنگ بھی تبدیل کر لی۔ پہلے وہ گیارہ سے شام چار بجے تک پڑھاتی تھی لیکن اب اس نے عاطی کے ساتھ ہی صبح آٹھ بجے اکیڈمی جانا شروع کر دیا اور جب عاطی کا سکول سے چھٹی کا وقت ہوتا تو سیدھا اس کے سکول جاتی اور اسے لے کر گھر لوٹتی تھی۔ بعد نماز ظہر وہ دونوں مل کر لنچ کرتے اور پھر عاطی کے کمرے میں جا کر وہ اس کا ہوم ورک خود کرواتی تھی۔ عصر تک یہ سلسلہ چلتا رہتا اور پھر عصر کی نماز کے بعد عاطی کو قرآن کی تعلیم دیتی۔ مغرب سے عشاء تک عاطی کے کھیلنے کا وقت تھا۔ وہ اس کے لئے کئی ویڈیو گیمز خریدتی اور عاطی کے ساتھ مل کر کھیلتی۔ ایسے میں جبیں بھی ان کا ساتھ دیتی۔ تینوں خوب ہنسی مذاق کرتے۔ جبیں کے علاوہ باقی گھر والوں نے بھی عاطی کو خوش دلی سے قبول کیا تھا۔ حاعفہ کے چہرے پر حقیقی مسکراہٹ ہی ان کے لئے کافی تھی۔ صبا کا روز کا معمول تھا وہ عشاء سے پہلے سب کے لئے جوس لاتی مگر عاطی کے لئے دودھ کا ایک گلاس۔ عاطی کبھی کبھار پینے سے منع کرتا تو وہ اسے بڑے پیار سے سمجھاتی کہ چھوٹے بچے دودھ پیتے ہیں تا کہ جلدی سے بڑے ہو جائیں۔ یوں ہر فرد عاطی کا خیال رکھتا تھا۔ حسام بھی آفس سے آتا ہوا، کھانے کی کوئی چیز لاتا تو عاطی کے ہاتھوں میں دیتا۔ جیسے اریب اچھل پڑتا تھا بالکل وہ بھی خوش ہو جاتا۔ سب کو جیسے اریب کی جھلک اس میں نظر آ رہی تھی۔

''اگر تم نے اریب کا بچپن دیکھنا ہو تو عاطی کو دیکھ لو۔ بالکل اریب کی طرح لگتا ہے یہ۔'' سحر فاطمہ کبھی کبھی اس کو کھیلتا ہوا دیکھتی تو کہہ دیتیں۔ جبیں اور حسام محبت سے اسے دیکھتے مگر حاعفہ کے چہرے کا رنگ متغیر دکھائی دیتا۔

''میرا عاطی کبھی اریب کی طرح نہ بنے۔'' وہ دل میں دعا مانگتی۔

پھر عشاء کے بعد جب عاطی کے سونے کا وقت ہوتا تو حاعفہ اسے عظیم لوگوں کی قربانیاں سناتی۔ کبھی انبیاء اکرام کی تو کبھی صحابہ اکرام کی۔ آجکل وہ عاطی کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ سنا رہی تھی۔ جب انہوں نے نمرود کو لاجواب کر دیا تھا۔ جب نمرود نے اپنی بے بسی دیکھی تو اپنی کم عقلی تسلیم کرنے کی بجائے اللہ کے نبی کو آگ میں ڈالنے کا منصوبہ بنایا۔

عاطی اس قصے کو خاص دلچسپی سے سنتا تھا۔ پہلے پہل تو جبیں پاس سے گزرتے ہوئے بیٹھ جاتی لیکن اب کچھ دنوں سے وہ مسلسل

اس وقت عاطی کے کمرے میں آجاتی اور حاعفہ کی زبانی عظیم لوگوں کی عظیم قربانیاں سنتی۔

☆ ☆ ☆

کئی سانپ تھے قیمتی اس قدر

انہیں آستیں میں چھپانا پڑا

رات کا منظر تھا۔آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔کچھ اجنبی تیز قدموں کے ساتھ کچے راستے پر چلتے جا رہے تھے۔پرانے طرز کا لباس پہنے یہ لوگ غیر معروف تھے اور اپنی پہچان چھپانے کی خاطر ایک بڑا سا جبہ پہنے ہوئے تھے۔کچھ کے ہاتھوں میں عصاء تھے اور کچھ بغیر سہارے کے چل رہے تھے۔کچے راستے کے اطراف لہلہاتے کھیت تھے۔جو رات کی سیاہی میں ایک عجب رنگ اوڑھے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی مسحور کن ہوا ان کے اندر جیسے روح کا سبب بنی ہوئی تھی۔

یہ آدمی کچا راستہ طے کرنے کے بعد ایک سنسان میدان میں جا کھڑے ہوئے تھے۔جہاں ایک بزرگ پہلے سے موجود تھا۔اس کی لمبی لمبی مونچھیں اور چہرے پر کچھ سلوٹیں تھیں۔یہاں بھی نقوش غیر واضح تھے۔رات کی سیاہی نے ان کے پہنچان کو اپنے سیاہ پنوں میں لپیٹ لیا تھا۔یہ تمام مسافر جو ایک سیدھا سیاہ راستہ طے کرنے کے بعد اس سنسان میدان میں جمع ہوئے تھے اس بزرگ کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔

''کیا بنا؟'' بزرگ کی بارعب آواز رات کے سینے کو چیرتے ہوئے سماعت سے ٹکرائی تھی۔سب کی گردنیں جھک گئیں۔جس کا جواب نفی تھا۔وہ بزرگ آگے بڑھا اور ہاتھ میں تھاما گیا ایک بڑا سا عصاء زمین کے اندر گاڑھ دیا۔سب پر ایک پراسرار خاموشی کا عالم تھا۔ کسی کے اندر لب ہلانے کی سکت نہ تھی۔نگاہیں شرمندہ، لبوں پر مہر اور گردن جھکی ہوئی، ان کی بے بسی نہیں تھی تو اور کیا تھی؟

''ایک ماہ......ایک ماہ ہو چکا ہے اسے یہاں آئے ہوئے۔'' بارعب آواز ایک بار پھر گونجی۔

''تمہیں صرف ایک کام سونپا تھا اور تم سے وہ بھی نہیں ہوا۔'' اس بار غصے کا عنصر بھی شامل تھا۔

''گرو جی! ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔'' ان میں سے ایک آدمی جو بائیں جانب کھڑا تھا، گویا ہوا۔نگاہیں اس جانب گھومیں۔

''کوشش نہیں، نتیجہ۔ مجھے نتیجہ چاہیے۔'' سپاٹ لہجے نے سب کے جسم میں خوف کی ایک لہر پیدا کر دی۔نگاہیں مزید جھک چکی تھیں۔ٹڈیوں کی آوازوں نے اس میدانی کی خاموشی کو توڑنا چاہا مگر بزرگ کے عصاء نے جیسے انہیں خاموش کروا دیا۔کچھ لمحے یونہی بیت گئے۔

بزرگ نے اب آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی تو چاند کو اپنے جوبن پر پایا۔اس کے بائیں جانب دو ستارے تھے۔دونوں خوب چمک رہے تھے۔ان ستاروں کی حفاظت کئی مدہم ستارے کر رہے تھے۔جو ان چمکتے ستاروں کے اطراف ایک دائرہ بنائے ہوئے تھے۔

''یہ دیکھ رہے ہو چاند۔'' بزرگ نے کہنا شروع کیا تو سب کی نظریں آسمان کی طرف بلند ہوئیں۔

''یہ اس بات کا گواہ ہے کہ اس نے ہمارے دیش کی دھرتی پر اپنے قدموں کو رکھ دیا ہے۔ ان دو تاروں کو جو تم دیکھ رہے ہو۔ یہ اس کی موجودگی کی نشاندہی کر رہے ہیں اور ان دونوں کی علیحدگی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ابھی تک اپنے آپ سے نابلد ہے کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو پہنچان لیتا تو ان تاروں کا سنگم ہو جاتا مگر ان دونوں ستاروں کے ملنے کا ابھی کوئی امکان نہیں۔ دونوں روشن تارے ایک فاصلے پر ہیں اور ابھی کچھ عرصے تک ایک فاصلے پر ہی رہیں گے اور یہ جو مدہم تارے تم سب دیکھ رہے ہو۔ ان سب کا بھی مطلب ہے۔ کچھ انہونیاں اس کی زندگی میں ہو رہی ہیں۔ کچھ طاقتیں اس پر غلبہ حاصل کرنا چاہتی ہیں مگر تمہیں ان طاقتوں کے غالب آنے سے پہلے اسے حاصل کرنا ہوگا۔ کیونکہ اگر ان مدہم تاروں میں روشنی آ گئی تو سب کچھ ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ سمجھے تم سب۔ سب کچھ ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اتنے سالوں کا انتظام جو ہم نے کیا، سب کچھ رائیگاں ہو جائے گا۔ یہ سرسبز کھیت دیکھ رہے ہو، یہ بھی خشک سالی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ تم فاقوں مر جاؤ گے۔ تمہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ اس لئے اگر تم سب ان حالات سے بچنا چاہتے ہو تو اسے یہاں لے آؤ۔ ان طاقتوں کو پچھاڑ کر اس تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ اب جاؤ'' بزرگ لہجے نے ڈھکے چھپے لہجے میں آدھی ادھوری بات سب کے سامنے رکھی تھی۔ اب جب جانے کا حکم ملا تو سب نے اپنی جھکی گردنوں کو مزید جھکایا اور سینوں تک لے آئے اور پھر یونہی اپنے قدم پیچھے کی طرف کھسکانے لگے۔

''اس بار ناکامی مقدر نہیں بننی چاہیے۔'' اس بزرگ نے تنبیہہ کی تھی۔ وہ لوگ جس راستے سے آئے تھے۔ الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ میدان ایک بار پھر خالی ہو گیا۔ خاموشی نے چاروں اطراف سے اس بزرگ کو گھیر لیا۔ اس نے آسمان پر دوبارہ نظر دوڑائی تو چمکتے ستارے ابھی تک اپنی جگہ پر باقی تھے البتہ ایک مدہم ستارہ کسی قدر روشن ہو چکا تھا۔ بزرگ کے چہرے پر ناگواری کے تاثر ابھرے۔

''وہ طاقت زور پکڑ چکی ہے لیکن مجھے امید ہے اس کے پہنچنے سے پہلے وہ ہمارے پاس ہوگا۔'' اس کے لہجے میں یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔

☆ ☆ ☆

شہرِ دل پر مسلط رہیں ظلمتیں

دشتِ ہستی میں سورج اگائے گئے

سٹڈی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے اسے تقریباً بیس منٹ گزر چکے تھے مگر وہ ایک لائن سے زیادہ نہیں لکھ سکا۔ دھیان بار بار ابدال کی طرف جھکا جا رہا تھا۔ اس کی چالیں، اس کے داؤ، سب کچھ پکے کھلاڑی کی طرح تھے۔ شہہ اس کا مقدر بن رہی تھی اور یہ بہت پیچھے دکھائی دے رہا تھا۔

''ابدال...... میری زندگی کا سیاہ باب...... جس باب کے سامنے آتے ہی چہرے پر خوشی کی لہر پیدا ہونے کی بجائے، اضطرابی

کے بادل منڈلانے لگتے ہیں۔ جس کا نام لیتے ہی دل میں نفرت وحقارت کا احساس جنم لیتا ہے۔ جس کے بارے میں سوچنے سے ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں مگر وہ میرے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے کہ شاید میری ذات بھی ان باتوں سے نابلد ہے۔ آخر کون ہے وہ؟ کیا چاہتا ہے؟ کیوں میری زندگی میں اتنا زہر گھولا ہوا ہے اس نے؟ اگر میرا بھلا چاہتا ہے تو یوں مجھے پریشان کرنے سے اسے کیا حاصل ہوگا؟ اور اگر شر پہنچانا اس کا حاصل ہے تو اب تک اس نے اجتناب کیوں برتے رکھا؟ پہلے بس بلینک کالز، پھر کالز کا آنا مگر ہر بار چونکا دینے والا انکشاف کرنا۔ میری پسند، ناپسند کو مجھ سے بھی زیادہ جاننا۔ آخر کیسے؟ میری پسند ناپسند تو میری فیملی کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ باہر میں زیادہ عرصے رہا نہیں ہوں تو باہر سے کوئی ہو، ایسا تو ہرگز ممکن نہیں۔'' وہ خود ہی سوچوں کے تانے بانے بن رہا تھا۔ انکل کے بل بوتے پر نئی راہ تلاش کر رہا تھا۔

''لیکن فیملی میں سے بھی کوئی کیونکر مجھے پریشان کرے گا؟ بابا جان تو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتے ہیں اور ماما جان تو میرے لئے اپنی جان بھی قربان کر دیں گی۔ حسام بھائی وہ تو مجھے ابھی تک بچہ سمجھتے ہیں اور بچوں کی طرح ہی ڈیل کرتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ جبیں؟ اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ مردانہ آواز تھی۔ اگر سافٹ ویئر کے ذریعے آواز بھی تبدیل کر لی ہو تو وہ کیوں ایسا کرے گی؟ نوک جھونک اپنی جگہ مگر وہ میرا کبھی برا نہیں چاہ سکتی۔ بس یہی تو ہے میری فیملی۔ صبا بھابھی تو ابھی فیملی میں آئی ہیں، اس لئے وہ بھی قطعاً نہیں ہوسکتیں۔ ان کو میری پسند ناپسند کا بھی نہیں معلوم۔ اب حاعفہ بچی۔ وہ مجھے ناپسند تو کرتی ہے لیکن ایسا کچھ کرے گی؟ یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ایک غلطی فہمی ضرور پیدا ہوئی مگر اس کے زیر اثر وہ ایسا کچھ نہیں کر سکتی۔'' اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں ٹھونس لیا۔

''تو پھر کون ہے وہ؟'' اس کا ذہن چکرا یا تھا۔

''کیسے پتا کروں اس شخص کا؟'' وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ساعتیں ایک کے بعد ایک گزر رہی تھیں مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تھا۔ دفعتہً اس نے اپنا سر اٹھایا۔ چہرے پر تاثر بدلے۔

''یہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا۔'' ایک جوش، ایک خوشی اس کے چہرے پر دیکھی جا سکتی تھی۔

''دشمن کو پچھاڑنے کے لئے اسی کے انداز میں سوچنا چاہیے۔ جیسے وہ ہر بار مجھے چونکا دیتا ہے۔ اس بار اس کو چونکا دیا جائے۔'' اس کے ذہن میں ایک زبردست منصوبہ آیا تھا۔ جس کو توڑ مروڑ کر وہ ایک سانچے میں ڈھال رہا تھا۔

''بس اب ابدال کو میرے سامنے آنا ہوگا۔ کسی بھی قیمت پر۔'' وہ ایک ادا سے مسکرایا۔ کافی عرصے بعد اس کے ذہن کو سکون ملا تھا۔ دل کو قرار نصیب ہوا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے کوئی محاذ فتح کر لیا ہو۔

اس نے سٹڈی ٹیبل سے موبائل اٹھایا اور ایک میسج ٹائپ کیا اور اسے ابدال کو سینڈ کر دیا۔ کافی دیر وہ موبائل کو دیکھ کر مسکراتا رہا۔ میسج میں لکھا تھا۔

''میں آرہا ہوں مسٹر ابدال۔'' اپنا نام لکھنے کی اسے ضرورت نہ محسوس ہوئی۔ بھلا جو آدمی اس کے ایک ایک عمل پر نظر رکھے ہوئے ہے وہ لازمی اس کے میسج کو بھی سمجھ جائے گا۔

موبائل کو دوبارہ سٹڈی ٹیبل پر رکھا اور اسائنمنٹ کی طرف دیکھا۔ خالی پیپر ایک ادا سے مسکرا رہا تھا۔ وہ بھی مسکرا دیا۔ ساتھ رکھی ایک کتاب کو کھولا اور اسائنمنٹ لکھنے میں مصروف ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

میں سوچتا ہوں شہر کے پتھر سمیٹ کر

وہ کون تھا جو راہ کو پھولوں سے ڈھک گیا

جہانزیب سے بار بار اصرار کرنے پر اس نے عالمگیر انڈسٹریز کا ایڈریس معلوم کر ہی لیا لیکن کچھ دن تک وہ ایڈریس اس کے پاس رہا۔ جہانزیب سے اگرچہ اس نے جلد ہی جانے کو کہا تھا مگر وہ نہ گیا۔ اس کے علاوہ اس نے دو دن لگا تار بینک کے بھی چکر لگائے۔ شاید کچھ پیسوں کی ضرورت تھی۔ اس لئے کیونکہ وہ لگا تار اندر کے ساتھ مارکیٹ جا رہا تھا مگر اس کے علاوہ اس کی روٹین وہی عام سی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔

''خیریت ہے آج کل تم بہت خوش دیکھائی دے رہے ہو؟'' ایشا نے ابرو اچکاتے ہوئے آج پوچھا تھا۔ اس کا لہجہ کچھ شریر سا تھا۔ دونوں اس وقت آڈیٹوریم کے عقبی حصے میں فرش پر بیٹھے تھے۔ سنگ مرمر کی طرح فرش آئینے کی طرح شفاف تھا۔ چاہو تو چہرہ دیکھ کر بال سیٹ کر لو یا میک اپ کیونکہ ایسا کچھ لڑکیاں کر رہی تھی۔ دونوں کے عین پیچھے دو لڑکیاں بیٹھی فرش پر دیکھتے ہوئے اپنی آئی برو سیٹ کر رہی تھیں۔ اریب دیکھ کر مسکرا دیا مگر کوئی جملہ نہ کسا۔

''میرے خوش ہونے کا کوئی وقت متعین نہیں ہے لیکن یہ بات تم نے بجا کہی۔ میں واقعی خوش ہوں۔ شاید کوئی شہہ نصیب ہونے والی ہے۔'' اس نے پوری بات بتانے سے گریز کیا کیونکہ وہ اس بات کا قائل تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور پھر یہاں تو سچ میں دیواروں کے کان تھے جو ایک ایک بات اس ابدال تک پہنچ جاتی تھی۔

''تو مجھے نہیں بتاؤ گے کیا؟'' اس نے کتاب کو گھٹنوں پر رکھ کر کہنیاں اس پر جمالیں اور ٹکٹکی باندھے اریب کی طرف دیکھنے لگی۔

اریب نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''معاف کرنا ایشا، انسان کے کچھ سیکریٹ ہوتے ہیں ناں!'' اس نے ایسے انداز میں منع کیا کہ اس کو برا بھی نہ لگا۔

''سیکریٹ؟ یعنی کوئی لڑکی کا چکر ہے کیا؟'' اس نے لفظ سیکریٹ پر زور دیا تھا۔ وہ گردن جھکا کر مسکرا دیا اور نفی میں سر ہلایا۔

''لڑکی کا چکر؟ بھئی ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ الزام پہلے ہی؟'' کرن ابھی ابھی وہاں آیا تھا۔ آدھی ادھوری بات سن کر اس نے بات کو اپنی طرف منسوب کر لیا۔

''ڈفر، میں تمہاری نہیں بلکہ اریب کی بات کر رہی تھی۔'' ایشا نے منہ بسور کر کہا تھا۔ کرن کو اپنی عجلت پر شرمندگی ہوئی۔ اریب کھسکا اور اپنے درمیان کرن کو جگہ دی۔ ایشا کرن کو اپنے ساتھ بیٹھتا دیکھ کر اٹھنے لگی۔

''بھئی یہ کیا بات ہوئی؟ ہم آئے اور آپ چل دیئے۔'' اس کا لہجہ شریر اور الفت سے بھرپور تھا۔

''اسی لئے تو چل دیئے کیونکہ آپ آئے۔'' گردن جھٹک کر طنزیہ انداز میں کہا تھا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے۔'' کرن نے تاسف بھرے لہجے میں کہا تھا۔ وہ جو دو قدم چل کر آگے جا چکی تھی دفعتہً پلٹی۔

''تو کرتے رہو۔ میں نے روکا۔'' گردن جھٹک کر آگے بڑھ گئی کرن نے اریب کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔

''بھئی عجیب آدمی ہو۔ یہاں دوست کی بات بننے کو نہیں آ رہی اور تم ہو کہ ہنس رہے ہو۔'' اس نے گردن جھٹک کر کہا تھا۔

''تو کس نے کہا ہے کہ ایسی جگہ دال گلانے کی کوشش کرو جہاں پک نہیں سکتی۔'' اریب نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

''لیکن تم چاہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔'' کرن یکدم نکتے پر آیا۔

''مطلب؟'' اریب چونکا۔

''مطلب واضح ہے۔ تم یقین دلاؤ ناں اُس کو۔'' کرن کی بات پر وہ کافی حیران تھا۔ اس کے چہرے کو یک ٹک دیکھتا رہا۔

''میں کیسے یقین دلاؤں؟ بھلا محبت کو بھی یقین دلانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے؟''

''تم کہو گے تو اسے آجائے گا یقین کیونکہ وہ تمہاری بات نہیں ٹالے گی۔'' کرن نے یقین کے ساتھ کہا تھا۔

''اچھا، تمہیں کیسے معلوم کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی؟'' ابرو اچکاتے ہوئے اس پر گہری نگاہ ڈالی گئی۔

''کیونکہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔ اس لئے۔'' یہ سن کر اریب بری طرح چونکا تھا۔ یک ٹک کرن کی طرف دیکھنے لگا جو سچ کہہ رہا تھا۔ پہلے تو اسے گمان لگا تھا مگر اب کرن کے منہ سے یہ بات سن کر اسے یقین ہو چلا تھا۔

''نن نہیں تو۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اس نے گردن پھیر لی اور اٹھ کر وہاں سے جانے کی کوشش کی۔ کرن بھی اٹھا اور اس کے پیچھے چل دیا۔

''یہی تو ایسا کیسے ممکن ہے؟ تم ٹھہرے پردیسی۔ ایک نا ایک دن تو واپس چلے جاؤ گے۔ اب ایشا تو تمہارے ساتھ جانے سے رہی کیونکہ میں نے سنا پاکستان میں لو میرج کرنے پر گھر والوں سے کتنا سننے کو ملتی ہیں۔ بعض اوقات تو گھر والے قبول ہی نہیں کرتے اس رشتے کو۔ اور پھر جیسا تم اپنی فیملی کے بارے میں بتاتے ہو، وہ تو بالکل بھی قبول نہیں کرے گی اور سب سے بڑھ کر تم بھی تو ایشا کو صرف اپنی دوست سمجھتے ہو۔ کیوں یہی بات ہے ناں، تم دوست ہی سمجھتے ہو ناں؟'' اس نے خود ہی جواب دے کر اس سے سوال کیا تھا۔ وہ چونکا اور اس کی طرف دیکھا۔

"ہنوں۔" اس کے علاوہ وہ کیا کہہ سکتا تھا؟ محبت تو وہ کسی اور سے کرتا ہے اور جس سے محبت کرتا ہے اس نے اس کو دھتکار دیا؟
"تو پھر طے رہا تم ایشا کو مناؤ گے کہ وہ تمہیں نہیں مجھے چاہے۔ کیوں مناؤ گے ناں؟" اس نے منتوں بھرے لہجے میں استفسار کیا تھا۔
"کرن......!" اس نے بات پر زور دیا تھا۔
"پلیز!" ایک بار پھر اس نے منت کی تھی۔ اریب مسکرا دیا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

☆ ☆ ☆

وہ اس وقت ایک بس سٹاپ پر تھا۔ جب اریب کا میسج موصول ہوا۔
"پلیز! میری مدد کرو کرن، وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔" یہ میسج وصول ہوتے ہی اس کے چہرے کے رنگ اڑ گئے۔ وہ سکتے کے عالم میں تھا۔ کافی دیر تک اس میسج کو پڑھتا رہا اور پھر دھیرے سے مسکرایا۔
"ابھی تو شروعات ہے اریب۔" اس نے کہا اور ایک بس میں بیٹھ گیا۔ اس کے لہجے میں عجب چاشنی تھی۔ وہاں کے مسافروں نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ شاید وہ یہیں کا رہائشی تھا۔ اس لئے؟

☆ ☆ ☆

کچھ لوگ جو منسوب رہے شیشہ گروں سے
آئینے میں وہ خود کو سکندر نظر آئے

ایک بار پھر اس کا پلان چوپٹ ہو گیا۔ وہ آدھے گھنٹے تک اس کا انتظار کرتا رہا مگر وہاں کوئی نہ آیا۔ مہنگے کیمرے جو اس نے نصب کئے تھے، ضائع گئے۔ میسج بھی جان بوجھ کر اس نے کرن کا نام لکھ بھیجا تھا تا کہ اسے ایسا لگے کہ وہ غلطی سے اس کے پاس چلا گیا مگر وہ ان سب سے بڑی ہی مہارت سے نکل گیا تھا۔
"اس کا مطلب وہ جو کوئی بھی ہے میرا دشمن ہی ہے کیونکہ اگر وہ میرا خیر خواہ ہوتا تو مجھے اکیلا کبھی نہ چھوڑتا۔" وہ اس ڈرامے سے اس نتیجے پر پہنچا تھا۔
پچھلے کئی دن سے وہ ابدال کو اپنے جال میں پھانسنے کے منصوبے پر گامزن تھا۔ اس نے یونیورسٹی سے کچھ فاصلے پر ایک بلڈنگ دیکھی، جسے کچھ وقت کے لئے کرائے پر لی مگر اس کا ذکر نہ جہانزیب سے کیا اور نہ ہی کسی اور سے۔ اس بلڈنگ میں جگہ جگہ اس نے کیمرے نصب کر دیئے اور پھر موقع کی تلاش میں تھا کہ کب موقع ملے اور وہ ابدال کو جھوٹا میسج بھیجے کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے مگر یہ میسج اس انداز میں بھیجنا تھا کہ اگلے کو پتا نہ چلے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اُس دن کی کلاس معمول سے پہلے ختم ہو گئی۔ اس نے برق رفتاری سے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنچانے کے لئے اس بلڈنگ کا رخ کیا۔

مگر میسج کرنے کے بعد بھی وہ اس بلڈنگ میں ایک وقت تک اکیلا رہا۔ وہاں کوئی آدمی تو کیا، کوئی پرندہ بھی داخل نہ ہوا۔ اسے اپنے پلان کے ناکام ہونے پر کافی مایوسی ہوئی تھی۔ اپنی مٹھیاں بھینچے وہ واپس ہاٹل پہنچا تھا۔

ابھی وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ ابدال کی کال آئی۔ اس نے فوراً ریسیو کی۔

"بہت خوشی ہوئی کہ تم نے چال چلنا سیکھ لی ہے مگر تم ابھی بچے ہو اریب۔ ابھی تم نے بہت کچھ سیکھنا ہے، تب جا کر تم میرا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو سکو گے لیکن میں تمہیں اتنا موقع نہیں دونگا۔" وہ تمسخرانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ مگر ان کا سبب غصہ تھا۔

"اتنا مت اتراؤ مسٹر ابدال۔ وقت کبھی کسی کا نہیں ہوتا۔ آج یہ تمہارے ساتھ ہے تو کل یہی وقت میرے ساتھ ہوگا۔ اس وقت تم رونا بھی چاہو گے تو رو نہیں سکو گے۔" اس کے لہجے میں عجب کاٹ تھی۔ دل میں پہلی بار نفرت کا ایسا بیج پروان چڑھ رہا تھا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا اریب۔" اریب کی نفرت کی اسے ذرا پرواہ نہ تھی۔ تبھی ویسے ہی قہقہے بلند ہو رہے تھے۔

"تو انتظار کرو مسٹر۔" اس نے مشتعل فون ڈسکنیکٹ کر دیا اور اسے بیڈ پر دے پھینکا۔ جواب میں وہ بھی مسکرا دیا۔

"تمہیں کیا لگا تھا میں اتنی جلدی تمہارے جال میں آجاؤں گا۔ اتنا کچا کھلاڑی نہیں ہوں میں اریب۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ یہ بچگانہ سا جال بنا کر تم سمجھے تم اس دنیا میں لڑنا سیکھ گئے۔ نہیں یہ تو پہلا قدم تھا تمہارا۔ پہلا قدم اور پہلا قدم ہمیشہ ہی ڈگمگاتا ہے۔ اسی لئے تم بھی ڈگمگائے۔" وہ موبائل کو ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا۔ چہرے پر عجب مسکراہٹ تھی۔ سامنے ایک کھڑکی تھی۔ جہاں سے دور ایک عکس دیکھائی دے رہا تھا۔ وہ جیسے اس عکس کو ہی دیکھ رہا تھا۔ تبھی نگاہیں اس عکس کے ساتھ گھومتیں۔ وہ عکس جیسے ہی آنکھوں سے اوجھل ہوا تو اس نے بھی پردے گرا دیئے۔

"کل ملتے ہیں پھر۔ ایک نئے انداز میں۔" اس نے ذومعنی لہجے میں اس طرف دیکھا تھا۔ وہ جیسے ہی پلٹا تو کمرے میں اندھیرا چھا گیا اور اس کے چہرے کے نقوش اندھیرے میں ناقابل شناخت تھے۔

☆ ☆ ☆

چمک اٹھے تو سمندر، بجھے تو ریت کی لہر

مرے خیال کا دریا سراب جیسا ہے

اس کا موڈ آج صبح سے آف تھا۔ ایک ہلکان جسم پر طاری تھی۔ علوی ناشتہ لے کر آئی تو وہ بجھا بجھا سا دیکھائی دیا۔

"سر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟" اس نے ٹرالی کو بیڈ کے پاس لاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، بس سر میں درد ہو رہا ہے۔" اس نے سر کو دباتے ہوئے کہا تھا۔

''اوہ۔میں ابھی ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔'' وہ تفکر بھرے لہجے میں پلٹی تھی۔اریب حیرت سے اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔

'' عجیب ہے یہ بھی۔'' اس نے شانے اچکائے اور اٹھ کر سامنے ٹرالی پر نگاہ دوڑائی۔ بٹر اور بریڈ سلائسز تھی۔اس کا دل انہیں کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''اب میں کیا کروں؟'' وہ دوبارہ دھڑام سے بیڈ پر لیٹ گیا۔موبائل میں رنگ ہوئی۔

''فار گاڈ سیک، ابدال کا فون نہ ہو۔''اس نے نمبر کی طرف دیکھا تو وہ پاکستان سے تھا۔دعا بہت جلدی قبول ہوگئی۔

''السلام علیکم۔''اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔وہاں جبیں موجود تھی۔

''وعلیکم السلام۔اتنے پھیکے سے لہجے میں سوال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟اب اتنی دور بیٹھ کر بھی تم ناگواری دیکھا رہے ہو۔اگر بات نہیں کرنی تھی تو فون ریسیو ہی نہ کرتے۔''جبیں کی تلخ باتیں سنتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔وہ پلٹا اور پیٹ کے بل لیٹا رہا۔

''تم اتنی دور بیٹھے ہوئے بھی میری جان نہیں چھوڑ رہی۔''اریب دھیرے دھیرے اپنی ڈگر پر آرہا تھا۔

''تو اور کیا نہیں؟اب اتنے دن ہو گئے تم سے لڑے ہوئے۔سوچا تم سے بات کرلوں اور ساتھ میں تھوڑا سا جھگڑ بھی لوں۔''اس نے شریر لہجے میں کہا تھا۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگئی کیونکہ میرا بھی دل کر رہا تھا تم سے جھگڑنے کو۔'' وہ اپنی ڈگر پر آچکا تھا۔

''تو میرا احسان مانو کہ میں نے فون کرلیا ورنہ تمہیں تو زحمت نہیں ہوتی فون کرنے کی۔''اس نے کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا۔وہ مسکرا دیا۔آج اس کو جبیں کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایسے ہی اس سے جھگڑتے رہے اور یہ ہنستا رہے۔ جبیں بولتی جارہی تھی اور وہ ہنس دیتا یا بات کو مزید طول دے دیتا۔

''واہ اریب، خیریت ہے؟ آج تم بڑے ہی الگ موڈ میں ہو۔تم ناک منہ چڑھانے کی بجائے ہر بات کو طول دے رہے ہو۔کچھ تو بات ہے۔بتاؤ ناں، کیا بات ہے؟''جبیں کو تشویش ہوئی تبھی ابرو اچکاتے ہوئے کہا تھا مگر اریب نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کے شک کی تردید کی۔

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''اچھا! چلو تمہارے پاس نہیں ہے تو کیا ہوا؟ میرے پاس تو ہے ناں۔''اس نے بڑے ہی مان سے کہا تھا۔اریب کے کان کھڑے ہوگئے۔

''تمہارے پاس کون سی خاص خبر ہے؟''اس نے دل میں ہی اندازہ لگانا چاہا تھا۔جو یکسر غلط تھا۔

''خبر یہ ہے کہ تم چاچو بننے والے ہو۔''اس نے جوش کے ساتھ اریب کو یہ خبر سنائی تھی۔یہ خبر سننے کی دیر تھی کہ وہ بیڈ پر تقریباً اچھلا

تھا۔خوشی سے اس کے سر کا درد یوں رفو چکر ہوا کہ پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

''تم سچ کہہ رہو؟ میں چاچو اور تم سو کالڈ پھپھو؟''اس بار اس کے لہجے ہمیشہ کی طرح طنز تھا۔جس سے وہ بہت زچ ہوئی۔

''جسٹ شیٹ اپ اریب۔میں سو کالڈ پھپھو نہیں۔صرف پھپھو بنوں گی۔سمجھے۔''اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔

''جو بھی ہو،رہو گی تو پھپھو ہی ناں؟''وہ اب اسے پوری طرح زچ کر رہا تھا۔پہلے والا اریب پل بھر میں لوٹ آیا تھا۔

''اریب۔ایک تو میں نے تمہیں اتنی اچھی خبر سنائی اور تم ہو کہ مجھ سے ہی جھگڑ رہے ہو۔بہت برے ہو تم۔''اس نے منہ بگاڑ کر کہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔تم بہن تو میری ہی ہو۔میں برا تو تم بھی۔''اس نے مزاح میں کہا تھا۔

''اریب...... جاؤ پھر میں بھی بات نہیں کر رہی تم سے۔''اس نے منہ بسور کر ریسور حسام کو دے دیا۔جو پاس ہی بیٹھا تھا۔

''سنو تو۔''اریب نے کہنا چاہا تھا مگر وہ حسام کو ریسیور دے چکی تھی۔

''ایک تو تم دونوں کبھی سدھرو گے نہیں۔''حسام نے ہمیشہ کی طرح سرزنش کرنا اپنا فرض سمجھا تھا۔

''ہم سدھر گئے تو آپ نصیحتیں کس کو کریں گے؟ خیر یہ نوک جھونک تو کبھی ختم ہی نہیں ہو گی۔سب سے پہلے میرے عزیز برادر بہت بہت مبارک ہو۔آپ یقین جانیں مجھے انتہائی خوشی ہوئی ہے یہ خبر سن کر۔بس نہیں چل رہا ابھی اڑ کر آپ کے پاس آ کر مبارک باد دوں۔''اریب کی باتیں سن کر وہ ہنس دیا۔

''تو کس نے روکا ہے۔ابھی بابا جان سے کہہ کر تمہارا ٹکٹ کنفرم کرواتا ہوں۔کل کا ناشتہ ہمارے ساتھ کرنا۔''حسام نے فی الفور پیشکش کی جسے اریب نے مسترد کر دی۔

''نہیں بھائی۔اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے مجھے۔میں تو اپنے بھتیجے سے ملنے ہی آؤں گا بس اب۔''اس نے شوخ لہجے میں کہا تھا۔

''جناب آپ اس سے پہلے ہی آ جائیں گے۔صرف پانچ ماہ باقی ہیں۔پانچ ماہ بعد آپ ہمارے ساتھ ہونگے۔''اس نے تصیح کرائی تو اریب کے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا۔اس نے ابھی تک گھر والوں کو سٹڈی ویزے کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

''مجھے بتا دینا چاہیے بھائی جان کو۔''اس نے دل میں سوچا مگر ان کی خوشی محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے خیال کی تردید کر دی۔وہ انہیں اس خوشی میں یہ خبر سنا کر دکھ نہیں پہنچا سکتا تھا۔اسی لئے خاموش رہا۔

''اب تمہیں کیا ہوا؟ تم خاموش کیوں ہو گئے؟''حسام کے کہنے پر وہ چونکا۔

''کک کچھ نہیں بھائی۔''

''ویسے اریب،تمہاری کمی شدت سے محسوس ہوتی ہیں ہمیں۔پورا گھر سنسان رہتا ہے۔تمہارے جانے سے جیسے اس گھر کی

روح ہی چلی گئی۔'' حسام کے لہجے میں تاسف تھا۔اریب بھی خاموش ہوگیا۔جواب میں کچھ بن ہی نہیں پایا۔

''سر ڈاکٹر آگئے ہیں۔'' علوی کی آواز موبائل کے ذریعے پاکستان تک گئی تھی۔وہ پلٹا، ساتھ ہی حسام کی آواز آئی۔

''اریب، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ ڈاکٹر کیا کرنے آئے ہیں؟'' حسام نے فکرمندی کے ساتھ کہا تھا۔ساتھ ہی سحر فاطمہ بیٹھی تھیں۔ڈاکٹر کا نام سن کر اس کے ہاتھ فون کھینچا۔

''اریب کیا ہوا تمہیں؟ سب خیریت ہیں ناں؟ ڈاکٹر کس لئے؟'' سحر فاطمہ نے یکے بعد دیگرے کئی سوال پوچھ ڈالے تھے۔

''ماما جان...... میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے بمشکل یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

''جھوت مت بولو۔تمہاری آواز بھی مجھے مدہم لگ رہی ہے۔کھانا تو وقت پر کھاتے ہو ناں؟ دیکھو، جھوٹ مت بولو مجھ سے۔''

سحر فاطمہ کی اس تنبیہہ پر وہ ہنس دیا تھا۔

''ماما جان۔میں سچ کہہ رہا ہوں، میں ٹھیک ہوں بس ہلکا سا سر درد......!'' ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی گئی تھی۔

''کیا سر درد؟ کب سے ہو رہا ہے سر درد؟ زیادہ تو نہیں ہے؟ ڈاکٹر آگئے ہیں اب، چلو جلدی سے اب ڈاکٹر کو چیک اپ کرواؤ۔''

اتنے سوال پوچھنے کے بعد انہوں نے حکم صادر کیا تھا۔ایک بار پھر وہ مسکرا دیا۔

''جو حکم میری ماما جان۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''اب زیادہ طنز نہ کرو۔سمجھے، چلو اٹھو اور جا کر چیک اپ کرواؤ۔ورنہ ابھی تمہارے بابا جان سے کہہ کر پوری ڈاکٹر کی ٹیم کو تمہارے روم میں بھیج دونگی۔'' اس بار سحر فاطمہ نے مزاح میں کہا تھا۔اریب چونکا۔سحر فاطمہ نے محض دھمکی ہی نہیں دی تھی۔وہ ایسا کر بھی سکتی تھیں۔اسی لئے برجستہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اوکے ماما جان۔پھر میں جاتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو آپ کے ڈاکٹروں کی ٹیم مجھے یہیں پر چیک کرنے آجائے۔'' اس نے شریر لہجے میں کہا اور فون ڈسکنیکٹ کر دیا۔

☆ ☆ ☆

میں یاد کر رہا تھا مقدر کے حادثے
میری ہتھیلیوں پہ لکیریں سمٹ گئیں

یونیورسٹی سے واپسی پر آج اِندر کا انداز عجیب لگا تھا۔تقریباً روزانہ وہ واپسی پر شارٹ کٹ اختیار کرتا تھا اور اسے ہاٹل جاتے ہوئے تقریباً پندرہ منٹ گزر چکے تھے مگر ابھی تک ہاٹل کا نام و نشان ہی نہیں تھا۔

''اِندر کیا ہوا؟ تم اتنی تیز ڈرائیو کیوں کر رہے ہو؟'' اریب کا سوال بجا تھا۔اِندر نے انتہائی تیزی کے ساتھ موڑ کاٹا تھا۔اریب

پیچھے بیٹھے ہوئے کار کے دروازے کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اندر کی پیشانی پر بھی کچھ پریشانی تھی مگر وہ اسے چھپائے ہوئے تھا۔

''آپ خاموش رہ سکتے ہیں؟'' اس نے انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا تھا۔ اریب کو اِندر کا لہجہ انتہائی کرک محسوس ہوا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا ایک کار نے انہیں بری طرح اوورٹیک کیا۔ اگر اِندر ڈرائیونگ میں مہارت نہ رکھتا تو لازماً آج ان کے ساتھ حادثہ پیش آ جاتا۔

''اِندر؟'' وہ چلایا۔ ساتھ ہی ایک فائر کی آواز گونجی۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ وہ کئی لمحے تک اپنی جگہ سے ہل نہ سکا تھا۔

ہم تیرے نکاح میں ہیں

حد سے بڑھنے لگی بدگمانی مری
آپ نے چھیڑ دی پھر کہانی مری

ہاٹل پہنچنے پر اس کا غصہ ساتویں آسمان پر تھا۔ چہرہ ایسے سرخ تھا جیسے لال رنگ میں نہا چکا ہو۔ اِندر بھی دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ ریسیپشن پر اس نے آتے ہی اپنا بیگ دے مارا۔

''کیا ہوا سر؟'' پریشے کو یہ سوال کافی بھاری پڑا۔ دہکتی آنکھوں نے اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ مینیجر بھی وہاں سے گزر رہا تھا۔ اریب کو اس انداز میں دیکھ کر اِندر کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا۔ اریب مٹھیاں بھینچے، کبھی ادھر تو کبھی ادھر گھوم رہا تھا۔

''سر آر یو اوکے؟'' مینیجر نے شفیق لہجے میں دریافت کیا تھا۔

''جسٹ شیٹ اپ؟ آج کے بعد یہ بندہ میرا ڈرائیور نہیں ہونا چاہیے بلکہ مجھے آپ کے ہاٹل کی ڈرائیونگ سروس استعمال ہی نہیں کرنی۔ سمجھے آپ۔'' اس نے بارعب انداز میں کہا تھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ چکا تھا۔ پریشے اور علوی تو جیسے مورت بن چکی تھیں۔ اِندر بھی بولنے کی حالت میں نہ تھا۔ پورا راستہ وہ بولنا ہی تو چاہ رہا تھا مگر اسے بولنے نہ دیا گیا۔

''لیکن سر ہوا کیا ہے؟'' مینیجر نے ایک بار پھر اسی انداز میں استفسار کیا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟ یہ سب اپنے اس ڈرائیور سے پوچھیں مگر یہ بات ذہن میں بٹھا لیں، آج کے بعد مجھے اپنی سروس استعمال کرنے پر مجبور نہ کیا جائے ورنہ جو انجام ہوگا، اس کا خمیازہ آپ کو ہی بھگتنا پڑے گا۔'' اس نے پہلی بار اشتعال انگیز لہجے میں کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہا تھا۔

یہ کہتے ہی وہ لفٹ کی طرف مڑا مگر کچھ یاد آنے پر برجستہ پلٹا۔

''اور ہاں اس کا ذکر میری فیملی سے نہیں ہونا چاہیے۔'' اس نے تنبیہہ کی تھی۔ اریب لفٹ کی طرف بڑھا اور اپنے روم کی طرف چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد اِندر نے بھی سب کچھ سامنے رکھ دیا۔ سب کے چہرے پر ایک تاسف تھا۔ مینیجر کو بھی اِندر اپنی جگہ ٹھیک لگا تھا۔

اپنے کمرے میں آکر اریب نے دروازہ لاک کیا اور صوفے کی طرف بڑھ کر وہاں بیٹھا اور گہرا سانس لیا۔ دونوں کہنیوں کو رانوں پر رکھ کر ہتھیلیوں پر ٹھوڑی جمائی۔

"آج کے واقعے سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ کوئی راز تو چھپا ہے اس شہر میں۔ جس کی تہہ تک پہنچنے سے مجھے روکا جارہا تھا" اس نے دل میں سوچا تھا۔ آنکھوں میں یقین کا عنصر غالب تھا۔ ذہن میں وہی منظر کسی فلم کی ریل کی چلنے لگا۔

ایک فائر کی آواز...... اِندر کا خود کی بجائے اریب کا چہرہ نیچے کرنا...... کار کا بری طرح ہچکولے کھانا...... پولیس موبائل کی آواز...... کسی کار کا زوں کے ساتھ اوور ٹیک...... ہر طرف خاموشی......۔

"کہیں یہ سب کچھ ابدال نے تو نہیں کروایا کیونکہ اس شہر میں صرف ابدال ہی ہے جو مجھے جانتا ہے اور میرا برا چاہتا ہے۔ اسی نے تو نہیں مجھ پر یہ حملہ کروایا؟" وہ انگل کے بل بوتے پر تکتے پر پہنچنے کی جستجو میں تھا اور پھر اِندر کی آنکھوں میں جو چمک تھی، وہ بھی عام نہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان سب سے پہلے ہی آگاہ ہو۔ تبھی تو کار کو روٹین کے روٹ پر لے جانے کی بجائے انجان راستے کی طرف گامزن کیا تھا۔ اس کی پیشانی بھی ایک انجانے ڈر کی پیشین گوئی کر رہی تھی۔ اس نے پشت صوفے کی بیک سے ٹکائی اور ذرا دیر کو آنکھیں موندیں۔

"شاید مجھے اِندر پر اتنا برسنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ تو میری جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔" اسے اپنی غلطی کا بہت جلدی احساس ہوا تھا مگر کہانی کا ایک رخ چھپت ہو چکا تھا۔ اگر وہ جانتا بھی تھا تو کیسے؟ اس کے جسم میں جیسے کرنٹ دوڑا تھا۔ وہ جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب مجھے اس پہیلی کو جلد سے جلد سلجھانا ہوگا۔ ابدال آخر چاہتا کیا ہے؟ سمجھنا ہوگا۔ کہیں ایسا نہ ہو، بہت دیر ہو جائے۔" اس نے وارڈ روب کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا تھا۔ آنکھوں میں یقینی غالب آچکی تھی۔ وہ اب طے کر چکا تھا کہ کیا کرنا ہے؟ اس سے پہلے کہ وہ فریش ہونے جاتا موبائل کی رنگ ہوئی۔ وہ چونکا۔

"لگتا ہے ابدال کا فون ہے۔" اس نے سوچا تھا مگر نمبر دیکھ کر اسے سکون ملا۔ نمبر پاکستان کا تھا۔ کال ریسیو کی تو جہانزیب موجود تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ان کا موضوع عام تھا۔ واپس لوٹ آؤ مگر اس بار پھر اس نے ٹال دیا تھا لیکن کب تک؟

☆......☆......☆

کس قریہ میں اب اپنی خموشی کو چھپاؤں
ہر موڑ پہ ہنگامہ محشر نظر آئے

یونیورسٹی آف تھی۔ اس نے عالمگیر انڈسٹریز کا وزٹ کرنا چاہا تھا۔ صبح سویرے ہی اپنا رخت سفر باندھا۔ انڈسٹریز صرف پانچ کی مسافت پر تھی۔ اس لئے اِندر کو ساتھ لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اب آنے والے حالات سے خود نمٹنا چاہتا تھا۔ ریسپشن پر سب کی طرف کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے مگر اس نے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ اپنی راہ پر نظریں جمائے رکھا۔ اِندر نے بھی پوزیشن سنبھالی مگر وہ اس کو نظر انداز کرتے ہوئے گزر گیا۔

"سوری سر۔" اِندر کی دھیمی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ پلٹا گہری نگاہ سے اس کے وجود کو ٹٹولا پھر گردن جھٹک کر پاس سے

گزر گیا۔ پریشے بھی حیران تھی۔ علوی نے بھی شانے اچکا دیئے۔ مینیجر نے یہ دیکھ کر اپنی جیب سے فون نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''اب مجھے دائیں جانب جانا چاہیے۔'' اس نے ہاٹل سے باہر نکلتے ہی اپنے موبائل کو باہر نکالا۔ گوگل میپ آن کیا اور اس کو اپنا ساتھی بنایا اور اس کے بتائے ہوئے راستے کی طرف چل دیا۔ براؤن جینز اور لائیٹ براؤن ٹی شرٹ میں اس کی شخصیت کافی پرکشش لگ رہی تھی۔ سن گلاسز بھی براؤن تھے۔ جو اس کے وجود پر چار چاند لگا رہے تھے۔ پاس سے گزرتے ہوئے راہ گیروں نے کئی بار پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں نظریں بھی اتاری تھیں۔

''ایکسکیوزمی؟ یو نیڈ اینی سروس؟'' ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے سامنے اپنی ٹیکسی لا کر رفتار دھیمی کر دی۔ وہ خوش اخلاقی سے پلٹا۔ مسکراہٹ کو اپنے لبوں بکھیرا اور تقریباً جھکتے ہوئے شکریہ کے ساتھ منع کر دیا۔

''میری منزل بس نیکسٹ سٹاپ پر ہی ہے۔ میرا نہیں خیال وہاں جانے کے لئے مجھے کسی سروس کی ضرورت ہے۔'' اس کے لہجے پر وہ ٹیکسی ڈرائیور بھی مسکرا دیا تھا۔

''اٹس او کے تھینک یو۔'' اریب نے ایک بار پھر اپنی منزل کا رخ کیا۔ دائیں جانب مڑا تو ایک دیوہیکل بلڈنگ کچھ فاصلے پر نظر آئی۔

''شاید یہ ہے وہ بزنس جو میرا منتظر ہے۔ جسے بابا جان مجھے سونپنے والے ہیں۔'' اس نے سوچا اور موبائل کو آف کر کے جینز میں ڈالا اور تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ فٹ پاتھ پر اس کے ساتھ اور بھی کئی لوگ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے مگر ان میں سے کسی کو بھی اتنی جلدی نہ تھی جس قدر اریب کو تھی۔ وہ اب تقریباً بھاگتے ہوئے گیٹ کے سامنے جا رہا تھا۔ بلڈنگ کے ساتھ جا کر وہ پل بھر کے لئے ٹھہرا۔ نگاہ اوپر آسمان کی طرف اٹھائی تو اپنے سپنوں کو فلک بوس پایا۔ چہرے پر گہری تمکنت نے جنم لیا۔

''ماشاء اللہ'' بے اختیار لبوں سے جاری ہوا تھا۔ نظریں اب سمٹنے لگیں اور اس کے نقش و نگار کی تعریف کرنے لگیں۔ بلاشبہ جہانزیب نے اس بزنس پر بہت محنت کی تھی اور ایک سال بعد اس کی باگ دوڑ اس کے ہاتھوں میں ہونی تھی۔

جہانزیب سے ایڈریس لینے کا مقصد اس کا یہی تھا کہ وہ سیکنڈ ٹائم اس بزنس کو ٹائم دے۔ یہاں کے نشیب و فراز کو سمجھے تا کہ مستقبل میں کام آسکے۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ اس کی تیاری بھی کر رہا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے دو گھنٹے آن لائن کلاسز لیتا اور بزنس کی نت نئی ٹرمز کو جاننے کی کوشش کرتا۔ ریکروٹمنٹ پروسس تو جہانزیب اسے بتا چکے تھے۔ ڈیزائنگ کے بارے میں وہ بخوبی جانتا تھا۔ مارکیٹنگ، فائنانس، ایچ آر، آئی ٹی اور دیگر شعبوں سے ریلیٹڈ بھی وہ سیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ بزنس کے کسی بھی پہلو میں کمزور پڑے۔ وہ اپنے بزنس کو اچھے سے ہینڈل کرنا کا شوق رکھتا تھا تا کہ وقت آنے پر وہ کسی کا احسان نہ لے۔ بزنس وہی اچھا جس کے زیر و زبر انسان کو پتا ہوں۔ دوسروں پر انحصار کر کے چلنے والا بزنس کبھی نہ کبھی زوال پذیر ہو ہی جایا کرتا ہے۔ یہ اس کی فلاسفی تھی۔

اس نے بائیں جانب دیکھا تو ایک بڑا سا لان تھا جہاں کئی پودے اور ہریالی تھی۔ آنکھوں کو فرحت بخشتے پھول، دل کے لئے

راحت کا سامان پیدا کر رہے تھے۔ گیٹ پر دو گارڈز تھے۔ جس میں سے ایک سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور دوسرا اپنی پوزیشن سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے سگریٹ سلگاتا گارڈ ایک آنکھ نہ بھایا۔ شروع سے ہی سموکنگ اور سموکرز سے اسے نفرت رہی تھی۔ آگے بڑھا اور ذرا سخت لہجہ اپنایا۔

''یہ انڈسٹری ہے اور یہاں کئی لوگ آتے جاتے ہیں تو بہتر یہی ہے کہ کام کے اوقات میں آپ اپنا یہ نشہ بند رکھیں۔'' اریب کے جملے پر اس کے اندر کرنٹ دوڑ گیا۔ وہ گھورتے ہوئے پلٹا۔ وہ ابھی تک اریب سے نابلد تھا۔

''چلتا بن یہاں سے، تُو ہے کون؟'' اس نے بدتمیزی کے ساتھ کہا تھا۔

''میں کون ہوں؟ ابھی بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے جینز سے اپنا والٹ نکالا اور آئی ڈی کارڈ سامنے کیا۔ آئی ڈی کارڈ پر نام دیکھ کر اس کی آنکھیں تو جیسے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور ہاتھ سے سگریٹ بھی ایسے گرا جیسے ہاتھوں میں جان ہی نہ ہو۔ ایک پل کے لئے سانس لینا بھی محال ہو چکا تھا۔

''جج جہانزیب سر کے بیٹے؟'' اس نے ہکلاہٹ کے کہا تھا۔

''جی ہاں۔'' اثبات میں سر ہلایا تو وہ شرمندہ دیکھائی دیا۔ اپنی گردن جھکا لی۔ اریب نے بھی وہ والٹ دوبارہ جینز میں ڈالا اور پیار سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔

''دیکھیے انکل، میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔ بس آپ کو دوسرے لوگوں کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ اگر سگریٹ پینا آپ کا شوق ہے تو وہیں کئی لوگ ایسے ہیں جنہیں سگریٹ کے دھویں سے بھی قے آنا شروع ہو جاتی ہے تو میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ دفتری اوقات میں اس نشے سے پرہیز کریں۔'' اس بار اس کا لہجہ شیریں تھا۔ اس نے گردن کو خم دیئے اثبات میں ہلا دی۔ اریب مسکرایا اور اندر کی جانب بڑھا۔

وہاں ایک بڑا سا ہال تھا۔ جہاں کوئی لوگ مصروف دیکھائی دے رہے تھے۔ ریسیپشن پر کوئی موجود نہ تھا۔ ویٹنگ ایریا کی طرف نگاہ دوڑائی تو کئی ورکرز کو وہاں ستاتے ہوئے پایا۔ اریب کو کافی عجیب سا لگا۔

''کام چور ہر جگہ ہوتے ہیں۔ پاکستان تو بس نام سے ہی بدنام ہے۔'' اس نے دل میں سوچا اور اپنی تیوری چڑھاتے ہوئے ریسیپشن کی طرف بڑھا۔ جہاں کلینڈر گرا پڑا تھا اور کئی فائلز کے ورق بھی اڑ اڑ کر بکھر رہے تھے۔ اس نے کسی سے کچھ نہ کہا اور آگے بڑھ کر کلینڈر اٹھا کر صحیح پوزیشن پر رکھا اور جو ورق بکھر چکے تھے۔ انہیں اٹھایا اور دوبارہ فائل میں لگایا۔ ریسیپشن کے پیچھے جو وارڈ تھی۔ وہاں چیزیں بے ترتیب تھیں۔ اریب نے اسے بھی سیٹ کیا۔ ویٹنگ ایریا میں بیٹھے لوگوں نے اریب کو حیرت سے دیکھا تھا۔ ایک دوسرے سے اس کے بابت دریافت کیا تو سب نے شانے اچکا دیئے۔ کوئی بھی اس کی پہچان نہ رکھتا تھا۔ ریسپشنسٹ جو واش روم میں گئی تھی۔ اریب کو وہاں دیکھ کر غرائی۔

"آپ سے ویٹ نہیں ہوتا کیا؟ اگر کوئی یہاں موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ویٹنگ ایریا میں جا کر ویٹ کریں۔" اس نے اریب کے ہاتھوں سے فائل چھینتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا لہجہ ترش تھا۔

"اگر آپ کو اپنی کمپنی کی اتنی ہی فکر ہے تو ڈیوٹی کے دوران اپنی پوزیشن چھوڑنے کو کس نے کہا تھا؟" اریب نے اسی لہجے میں جواب دیا تھا۔ وہ اریب کا جواب سن کر ہکا بکا رہ گئی۔ ایک نظر سرتاپا دیکھا۔ شاید اسے نیا کسٹمر سمجھی تھی۔

"مینیجر کا دفتر اس طرف سے۔ جو بھی ڈیل کرنی ہے ان سے جا کر بات کیجیے لیکن وہ ابھی ذرا مصروف ہے۔ کچھ دیر تک ہی آپ سے ملیں گے۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"یعنی یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔" اس نے حیرانی سے شانے اچکائے۔ ریسپشنسٹ کو اریب کا یہ انداز ایک آنکھ نہ بھایا۔ تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کسٹمر کو بھی ایسے ہی دیکھتی ہیں؟ اگر ہاں تو یہ بہت ہی برا ریسپانس ہے۔ آپ کو تنخواہ خوش اخلاقی کی دی جاتی ہے۔ گھورنے کی نہیں۔" اریب نے مختصر الفاظ میں اس کی اچھی خاصی سرزنش کی تھی۔ اب وہ ویٹنگ ایریا کی طرف پلٹا۔ جہاں ورکرز ستا رہے تھے۔ ورکرز اس لئے گمان کیا کیونکہ ان کے انڈسٹری کارڈ گلے میں تھے۔ جنہیں وہ اچھے سے پہنچان گیا۔

"میرے خیال سے یہ بریک ٹائم نہیں ہے۔ اس لئے آپ سب کو یہاں بیٹھ کر وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لینی چاہیے۔" اس نے سب کو ایک ساتھ مخاطب کیا تھا۔ سب اس کی بے باکی پر چونکے تھے مگر مجال ہے جو ٹس سے مس ہوئے ہوں۔ شاید وہ اس کو ابھی تک سمجھ ہی نہ سکے تھے۔

"سنا نہیں آپ سب کو؟" اریب نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کہا تھا۔ ان میں سے ایک لڑکا اٹھا۔ سانولا سا رنگ تھا۔ جنوبی ایشیا سے ہی شاید اس کا تعلق تھا تبھی اس کا چہرہ وہاں کے لوگوں سے میل نہیں کھاتا تھا۔

"ہم پر حکم چلانے والے تم ہوتے کون ہو؟" اس نے تیوری چڑھائی تھی۔ اریب مسکرا دیا۔ گہری نگاہ اس پر ڈالی۔ یہاں کا شور سن کر مینیجر بھی وہاں آ چکا تھا۔

"سر دیکھیے۔ یہ لڑکا پتا نہیں کون ہے اور آتے ہی ہم پر حکم چلا رہا ہے۔" ریسپشنسٹ نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔ مینیجر خود پینٹ کوٹ میں ملبوس تھا۔ کافی پرکشش دیکھائی دیتا تھا مگر کام میں بس ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا۔ وہ اریب کی جانب بڑھا تو اریب نے اس کے بولنے سے پہلے ہی کمنٹ پاس کیا۔

"سب سے پہلے تو آپ کو کمپنی سے آؤٹ کرنا چاہیے۔ جو ورکرز کو کام کی بجائے آرام کا مشورہ دے۔ اس کے ہاتھ میں کمپنی کی باگ دوڑ اچھی نہیں لگتی۔" اریب کے اس جملے پر سب بری طرح چونکے تھے۔ برانچ مینیجر بھی ہکا بکا رہ گیا۔ وہ غصے سے غرایا۔

''سکیورٹی۔اس لڑکے کو باہر نکالو۔'' وہ اپنی توہین بھلا کیسے برداشت کر سکتا تھا۔اریب خاموشی سے کھڑا مسکراتا رہا اور اسے وہ کرنے دیا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔وہ گارڈز اندر داخل ہوئے تو اس مینیجر کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔

''تم کیسے کسی بھی راہ چلتے کو اندر آنے کی اجازت دے سکتے ہو؟ یہ عالمگیر انڈسٹریز ہے۔یہاں کسی بھی آدمی کا بغیر اجازت اندر آنا منع ہے۔جانتے نہیں ہو کیا؟ نکالو، اس لڑکے کو۔'' وہ غصے میں غرایا تھا۔سکیورٹی گارڈ ہکا بکا رہ گیا۔اس کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگی تھیں۔

''لل لیکن سر۔'' اس کے لب ہکلائے۔

''لیکن کیا؟ سنتا نہیں ہے کیا؟ نکال باہر کرو اس لڑکے کو۔ پتا نہیں کہاں سے اٹھ کر آ گیا۔'' وہ انتہائی حقارت سے اریب کی طرف دیکھ رہا تھا۔اریب نے بھی اپنا تعارف کروانے کی بجائے تماشا دیکھنا مناسب سمجھا۔وہ ہنسی کو بمشکل ضبط کئے ہوئے تھا۔تمام ورکرز اپنا اپنا کام چھوڑ کر وہاں جمع ہو گئے۔

''سر یہ تو......'' اس نے اریب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہنا چاہا تھا مگر مینیجر نے اس کی ایک نہ سنی۔

''یہ تو کیا؟ باہر نکالو اس کو۔ابھی اور اسی وقت۔'' گارڈ بری طرح بوکھلایا تھا۔جبکہ اریب قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔سب اس کے قہقہے پر حیران تھے جبکہ گارڈ کی تو جیسے جان پر بن آئی تھی۔گردن جھکائے وہ یونہی بت بنے کھڑا رہا۔مینیجر کا اشتعال بڑھتا چلا گیا۔وہ مٹھیاں بھینچے اپنے غصے کو ضبط کرنے کی سعی کر رہا تھا جو اس کے لئے ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

''یہ اریب ہیں۔'' گارڈ نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

''اریب ہو یا غریب۔آئی ڈانٹ کیئر۔باہر نکال کرو۔'' وہ ابھی تک نہ سمجھا تھا۔

''سر جہانزیب کے بیٹے۔اریب۔'' گارڈ نے دھیمے لہجے میں تفصیل بتائی تو وہاں موجود سب کو ایک دھچکا لگا۔آکسیجن تو جیسے اس ہال سے نکالی جا چکی تھی۔سب ہونقوں گارڈ کا منہ تکنے لگے۔

''کیا بکواس کر رہے ہو۔سر نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔میں ابھی فون کر کے پوچھتا ہوں۔'' مینیجر کی جان جیسے ہتھیلی پر تھی۔اس نے ہکلاتے ہوئے جملہ مکمل کیا تھا۔اریب نے بھی دو قدم پیچھے ہٹ کر ریسپشن کی طرف جانے کا راستہ دیا۔مسکراہٹ اب بھی غالب تھی۔اس نے نمبر ملایا۔بیل گئی اور فون اٹھا لیا گیا۔

''السلام علیکم سر......یس سر......او کے سر......'' وہ کہتا جا رہا تھا اور پھر اس کے پسینے چھوٹتے معلوم ہوئے۔اس نے تھوک نگلا تو نگلا نہ گیا۔اریب کی طرف دیکھا تو جیسے اپنی جاب ہاتھ سے نکلتی معلوم ہوئی۔پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی جا رہی تھیں۔

''اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا تو ابر نیساں کی مانند پسینہ برسنے لگا۔اریب مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور ریسپشن ٹیبل

سے ٹشو بکس میں سے ٹشو نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے۔" اس کا انداز شیریں تھا۔ مینیجر نے کپکپے ہاتھوں سے ٹشو لیا تو ندامت کے سبب نگاہیں جھک گئیں۔ سب پر حقیقت عیاں ہو چکی تھی۔ اریب مسکراہٹ کے ساتھ پلٹا تو جیسے سب کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ ایسے رفو چکر ہوئے کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔ گارڈ بھی واپس پلٹ گیا۔

"آئی ایم سوری سر۔" مینیجر نے بمشکل کہا تھا۔ اریب نے اس کا شانہ تھپتھپایا اور آگے بڑھ دیا۔

"آج سے یہاں کی باگ دوڑ میں سنبھالوں گا۔" اریب نے بنا دیکھے کہا تھا۔ یہ آواز سننے کی دیر تھی کہ مینیجر کو ہچکیاں بندھ گئیں۔ ریسپشنسٹ بھی گرتے گرتے بچی تھی۔ اریب دوبارہ مسکرایا۔ اسے شاید ان سب سے یہی توقع تھی۔ اسی لئے کچھ نہ کہا اور آگے بڑھتا رہا۔

اس دن اریب نے پوری کمپنی کا وزٹ کیا تھا۔ کون کس پوسٹ پر ہے؟ کون سا کام کس کے ذمے ہے؟ ہر کام کے متعلق مینیجر سے بریفنگ لی تھی۔ پہلا تاثر سب کے لئے اگرچہ عجیب سا تھا۔ سب نے اریب کو ایک کھڑوس اور سخت باس گمان کیا تھا مگر سارا دن گزارنے کے بعد حقیقت عیاں ہوئی۔ وہ سب کے ساتھ دوستانہ انداز میں مل رہا تھا۔ کسی پر کوئی جبر نہیں تھا بس ایک بات اس نے سب کو سمجھا دی کہ کام کے اوقات میں بس کام کیا جائے کیونکہ کام کے سلسلے میں وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کرے گا۔ ہاں اس کے علاوہ کوئی مجبوری ہو تو وہ ڈائریکٹ اس سے کنٹیکٹ کر سکتا تھا۔

واپسی پر اس کا موڈ کافی بحال ہو چکا تھا۔ چار بجے کے قریب وہ باہر کمپنی سے باہر کھڑا تھا۔ ابھی اس نے ہاٹل کی راہ لینی تھی کہ سامنے اِندر نظر آیا۔ وہ کار کا ڈور اوپن کئے ہوئے تھا۔ اریب نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی تو اس نے گردن جھکا لی۔

اریب کچھ دیر تو یونہی کھڑا دیکھتا رہا پھر اس کے ساتھ جانے کے لئے کار کی طرف بڑھا۔ اِندر مسکرایا تو وہ بھی مسکرا دیا مگر یہ مسکراہٹ وقتی تھی۔ ایک بار پھر اس کی ہنسی کو گرہن لگ گیا۔ اِندر بیٹھا اور کار سٹارٹ کر کے یوٹرن لینے لگا تو اریب کی نگاہیں ونڈ سکرین سے باہر جھانکنے لگیں۔ ایک عظیم الشان بلڈنگ تھی۔ جس کی پیک پر تلملاتی روشنیوں سے لکھا تھا۔

"ابدال گروپ آف انڈسٹریز۔" اس نے زیرِ لب کہا تھا۔ اس کی تو جیسے آنکھیں ساکت رہ گئیں۔ عالمگیر گروپ آف انڈسٹریز کے عین سامنے مخالف سمت میں یہ انڈسٹری۔

"ابدال؟ انڈسٹری؟" وہ بری طرح چونکا تھا۔ اِندر نے موڑ کاٹا اور ہاٹل کی راہ لی جبکہ وہ ہنوز اسی بلڈنگ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کار کی سپیڈ بڑھی تو وہ بلڈنگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

ہاٹل پہنچنے پر پریشے اس کو دیکھ کر مسکرائی تو وہ بھی خفیف سا ہنس دیا۔ گردن جھکائی اور لفٹ کی طرف بڑھا۔ اِندر آیا تو پریشے نے

شانے اچکاتے ہوئے وجہ دریافت کرنا چاہی مگر اس نے لاعلمی کا مظاہرہ کیا۔

''کتنا عجیب ہے اریب؟ کب موڈ آف ہو جائے، پتا ہی نہیں چلتا۔'' اس نے سوچا اور پھر اپنے سامنے رکھی لسٹ میں اریب کے واپس آنے کا وقت درج کیا۔

''ابدال کے نام پر یہاں ایک انڈسٹری ہے؟'' کمرے میں آتے ہی وہ بڑبڑایا تھا۔ لیپ ٹاپ آن کر کے سٹڈی ٹیبل پر رکھا تو فون کی رنگ ہوئی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھریں۔

''ایک تو فون بہت ڈسٹرب کرتا ہے مجھے۔'' اس نے ناگواری کے ساتھ موبائل کی طرف دیکھا۔ نمبر پاکستان سے تھا۔ فی الوقت اس نے ابدال انڈسٹری کے بارے میں سرچ کرنے کا ارادہ ملتوی کیا۔

''السلام علیکم۔'' اس کا لہجہ قدرے بجھا بجھا سا تھا مگر وہ اس ناگواری سامنے نہیں لانا چاہتا تھا۔ دوسری طرف جہانزیب تھے۔ ان کا لہجہ بھی افسردہ تھا۔ جسے اریب نے بہت جلد بھانپ لیا۔

''بابا جان۔ مجھے بتایئے کیا بات ہے؟ دیکھیے، مجھ سے کچھ نہ چھپایئے۔'' ساری تکلیفیں جیسے ایک ساتھ نازل ہوئی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے موبائل کو مضبوطی سے تھامے جواب کا منتظر تھا۔

''دیکھو بیٹا، میرا مقصد تمہیں ڈسٹرب کرنا نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسا چاہتا تھا۔ اگر تمہاری ماما جان نہ کہتیں تو میں کبھی تمہیں فون نہ کرتا۔'' وہ بات کو طول دے رہے تھے۔ اریب کو مزید تشویش ہوئی۔ طرح طرح کے گمان اس کے ذہن میں کھٹکنے لگے۔ وہ سٹڈی ٹیبل سے کھڑا ہوا، دروازے کی طرف بڑھا۔ جہاں علوی کافی کا کپ لئے کھڑی تھی۔ اس نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ کپ لیا۔ علوی چلی گئی اور اس کا چہرہ دوبارہ افسردہ دکھائی دیا۔ ہاتھ میں پکڑا کافی کا کپ ٹیبل پر لا کر رکھ دیا۔

''بتایئے ناں بابا جان۔ آخر کیا بات ہے؟ دیکھیے مجھے فکر ہو رہی ہے۔'' اس نے بجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

''بات یہ ہے اریب کہ تمہاری ماما جان کی طبیعت کافی خراب ہے۔ وہ تم سے ملنا چاہتی ہیں۔ کیا تم ایک دو دن کے لئے پاکستان آ کر ان سے مل سکتے ہو؟'' یہ خبر سن کر وہ بری طرح چونکا تھا۔ اس کی سانسیں بھی اٹکنے لگی تھیں۔

''کک کیا؟ ماما جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟ اور آپ مجھے اب بتا رہے ہیں؟ کیا ہوا ماما جان کو؟'' وہ یکدم بوکھلا گیا تھا۔ تغافل سے بھرا لہجہ تفکر کے زیر سایہ تھا۔

''اریب میری جان۔ سنبھال کر۔ ہم سب یہاں ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لئے۔'' انہیں اریب کی فکر ہوئی۔

''سنبھال کر؟ مگر کیسے؟ آپ نے بہت غلط کیا بابا جان، مجھے نہ بتا کر۔ آپ کو مجھے پہلے ہی بتانا چاہیے تھا۔ میں ابھی واپسی کا ٹکٹ کنفرم کرتا ہوں۔'' اس نے فوراً سے پہلے رابطہ ڈسکنیکٹ کیا اور ائیر پورٹ کال کر کے ٹکٹ کنفرم کیا۔ فلائیٹ چار گھنٹے بعد کی تھی۔ ارجنٹ

ٹکٹ ملا تو مشکل سے مگر وہ لینے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اگرچہ اس کے لئے اسے کافی ریفرنس استعمال کرنے پڑے۔ جہانزیب کے الفاظ اس کے ذہن میں گونجتے جا رہے تھے۔

''اللہ ماما جان بس ٹھیک ہوں۔'' وہ ساتھ ساتھ دعائیں مانگ رہا تھا۔ پورا راستہ ایک گھڑی بھی سکون کی نہیں گزری۔ وہ سحر فاطمہ کے لئے اتنا فکرمند تھا کہ ابدال اور اس کے بارے میں سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔ اس کے لئے سب سے اہم اس کی ماما جان تھیں۔ وہ اپنی ماما جان کو بیمار نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ رات کے وقت پاکستان کے دارلحکومت اسلام آباد کے انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر کھڑا تھا۔ جلدی سے ٹیکسی لی اور گھر کی راہ لی۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنیں، سانسوں کی تیزی نارمل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ جب تک وہ سحر فاطمہ کو ایک آنکھ نہ دیکھ لیتا۔ اسے چین نہ آتا۔

''پلیز جلدی چلیں۔'' وہ بار بار ڈرائیور کو ہدایات دے رہا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ گھر کے عین سامنے تھا۔ پینتالیس دن کے بعد وہ اپنے گھر کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اپنے گھر کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا۔ کتنا مس کیا تھا اس نے اس گھر کو۔ آج تک ایک رات بھی گھر سے باہر نہیں گزاری تھی مگر اب قسمت کے رازوں کو فاش کرنے کی جستجو اسے کس قدر دور لے جا چکی تھی۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر دروازکھولا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ شاید اسے مقفل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ چنبیلی اور گلاب کی خوشبو نے اس کو خوش آمدید کہا۔ اس نے دائیں جانب دیکھا تو ہمیشہ کی طرح پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس گھر کے لان میں اپنی خوشبو کو بکھیر رہے تھے۔ رات کے اندھیرے نے ان کی خوبصورتی کو اگرچہ قدرے ماند کر دیا تھا مگر ایک کشش وہ اس وقت بھی اپنے اندر سموئے ہوئے تھے۔ اریب ڈھیلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا تو اندورونی دروازہ کچھ سٹیپس اوپر تھا۔ ہمیشہ کی طرح خاک کا ایک ذرہ بھی نہیں۔ وہ مسکرایا مگر اس مسکراہٹ میں ہجر کا ایک درد شامل تھا۔ یہ گھر اس کے لئے کیا حیثیت رکھتا تھا شاید اسے اب معلوم ہوا تھا۔ اپنے در و دیوار کی محبت اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ اس نے دروازے کو دھکیلا تو ایک خاص آواز پیدا ہوئی۔ روشنی کی ایک لکیر اندر داخل ہوئی۔ وہ اندر داخل ہوا تو سامنے اندھیرا تھا۔ کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔

''ماما جان...... بابا جان......'' اس نے پکارا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ وہ آگے بڑھا تو سامنے ٹی وی لاؤنج میں بھی اندھیرا تھا۔ اس کے دل میں ایک ڈر نے جنم لیا۔ بائیں جانب مڑ کر اس نے دیوار پر لگے سوئچ کو آن کیا۔ روشنی نے چاروں اطراف سے اسے گھیر لیا۔ وہ دھیرے سے پلٹا تو ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''سرپرائز۔'' وہاں حسام، جبیں، صبا سمیت سب گھر والے موجود تھے۔ وہ بری طرح چونکا۔ سحر فاطمہ بھی وہاں موجود تھیں۔ وہ فوراً آگے بڑھا اور سحر فاطمہ کے پاس گیا۔

''ماما جان، آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ اب طبیعت کیسی ہے؟ بابا جان نے کہا تھا کہ آپ کی طبیعت نہیں ٹھیک۔'' وہ یکے بعد دیگرے

کہتا ہی چلا گیا۔سحر فاطمہ نے بھی اسے سینے سے لگا کر تشنگی بجھائی۔آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔تبھی اریب کو احساس ہوا کہ سب مسکرا رہے ہیں اور سحر فاطمہ بھی ٹھیک تھیں۔وہ گھوما اور سب کے چہروں کی طرف دیکھا۔اس سے جھوٹ بولا گیا تھا۔

''بابا جان......!!''اس نے دھیمے لہجے میں شکوہ کیا تھا۔وہ ناراض دکھائی دیا۔

''بابا کی جان۔اپنے بیٹے کو سرپرائز دینے کے لئے چھوٹا سا جھوٹ بولنا پڑا اور میں پہلے بتا دوں یہ پلان میرا نہیں تمہاری ماما جان کا تھا''جہانزیب نے اپنا معاملہ صاف کیا۔اریب نے شکوہ کناں نگاہوں سے سحر فاطمہ کی طرف دیکھا تو وہ آگے بڑھیں اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے وضاحت کی۔

''اپنے بیٹے سے ملنے کے لئے مجھے سچ میں بیمار ہونا پڑتا تو میں وہ بھی ہو جاتی۔''اریب کو کافی دکھ ہوا۔

''نہیں ماما جان۔یہ کیسی بات کر رہی ہیں آپ؟ آپ ہمیشہ ٹھیک رہیں۔''

''اب ہم سے بھی مل لیا جائے۔چھوٹے نواب۔''حسام نے بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔اریب کے پاس سوائے مسکرانے کے کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔اب آ ہی گیا تو سب سے ملنا لازمی امر تھا۔

''جیتے رہو بیٹا جی اور اگلی اکیس بہاریں بھی ایسے ہی دیکھے ہو۔''حسام کی اس دعا پر وہ چونکا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ارے بھول گئے؟ آج تمہاری برتھ ڈے تھی۔اب بھلا تمہاری برتھ ڈے کا اس سے بڑا سرپرائز کچھ ہو سکتا تھا؟''جبیں نے بھی گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔

''میری برتھ ڈے؟''اس نے حیرت سے سب کے چہروں کو ٹٹولا تھا۔زندگی کے نشیب و فراز اس قدر گہرے تھے کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم دن ہی فراموش کر چکا تھا۔

''جی ہاں،آج تمہارا برتھ ڈے ہے۔اسی لئے تمہیں انڈو سے یہاں بلایا تھا۔''جبیں نے وضاحت کی۔اتنے میں ماریہ کچن سے کیک لے آئی۔سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے مگر اس کے چہرے پر ایک خلش تھی۔نگاہیں کسی کی متلاشی تھیں۔اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔

''عکاس بھائی نظر نہیں آرہے۔''جبیں جو کیک پر کینڈلز لگا رہی تھی۔منہ بسور کر پلٹی۔

''وہ کراچی گئے ہیں۔فیملی سی ملنے۔''حسام نے وضاحت کی۔

''اور حاعفہ؟''دل میں بسنے والا کا نام زبان پر آنے کے لئے مچل رہا تھا۔

''وہ کمرے میں سو رہی ہے۔''سحر فاطمہ نے بتایا تھا۔کسی کے لبوں سے فی الوقت عاطی کا نام نہ نکلا۔وہ ان دنوں سکول کے ٹور پر تھا۔اس لئے کسی نے بتانا مناسب نہ سمجھا۔جواب سن کر اریب کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔دل میں بسنے والے نے آج بھی بے رخی کی چادر اوڑھی

ہوئی تھی۔ایک خلش نے اس کا چہرہ دیکھنے پر بھی پابندی لگادی۔اس نے تغافل سے بھرپوری نگاہیں زینے پر جمائی تھیں۔

''کن سوچوں میں گم ہو گئے تم اتنی جلدی؟ ویسے ایک سرپرائز اور ہے لیکن وہ ابھی نہیں کل دیا جائے گا تمہیں۔تمہاری برتھ ڈے پارٹی میں۔'' جہانزیب نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔وہ سرپرائز کے نام پر چونکا۔جہانزیب کی طرف دیکھ کر لکیریں پڑھنے کی سعی کی مگر وہاں فقط اریب کی خوشی نظر آئی۔وہ اریب کو انتہا کی خوشی دینے جا رہے تھے؟ وہ الجھا۔کچھ سمجھ نہ آیا مگر خاموش رہا۔سحر فاطمہ نے چھری اریب کے ہاتھوں میں دی تو اس نے کیک کاٹا۔سب کے چہرے دمک رہے تھے۔وہ بھی بناوٹی انداز میں مسکرایا تھا۔دل نے مسکرانا چاہا مگر نہ جانے کیوں وہ ہنسی جیسے کھوسی گئی تھی۔کوئی تو تھا جو اس کے دل کے چین کو اپنے ساتھ لے جا چکا تھا۔وہ راحت جو پہلے محسوس ہوا کرتی تھی اب ایک خواب سا بن چکی تھی۔

کمرے میں آنے کے بعد اس گہرا سانس لیا۔عرصے بعد وہ اپنے کمرے کو دیکھ رہا تھا۔دل میں ایک کسک ابھری۔وہ وارڈروب اور دروازے کے درمیان لگے ایک فریم کی طرف بڑھا۔جہاں خود اس کی اپنی تصویر تھی۔ہنستا مسکراتا چہرہ، سب سے بے گانہ تھا۔وہ پلٹا تو سٹڈی ٹیبل پر آج بھی فیملی فوٹو جگمگا رہی تھی۔وہ مسکرایا۔آگے بڑھ کر اس کو چھونا چاہا مگر موبائل کی رنگ ہوئی۔اس نے بنا دیکھے کال ریسیو کی۔

''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ڈیئر اریب۔ہیپی برتھ ڈے۔'' وہی لہجہ ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔وہ چونکا اور جو پل بھر کی مسکراہٹ نے جنم لیا تھا، اگلے ہی لمحے معدوم ہو گئی مگر اس بار وہ طیش میں نہ آیا اور نہ اپنے ذہن پر زیادہ دباؤ ڈالا۔جو اس کے بارے میں پل پل کی خبر رکھتا ہو اس کے لئے برتھ ڈے معلوم کرنا زیادہ مشکل بات نہیں۔

''تھینکس مسٹر بلیک میلر، رزیل، ابدال، جہیل پرسن۔سوری اگر کوئی نام رہ گیا ہو تو۔وہ کیا ہے ناں۔آپ کے کارنامے ہی اتنے ہے کہ ہر کارنامے پر ایک نیا خطاب دینے کو دل چاہتا ہے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔جس پر وہ مسکرا دیا۔اس کی مسکراہٹ کی حدت وہ فون پر بھی محسوس کر سکتا تھا۔

''آج کے دن تمہیں معافی ہے۔آخر برتھ ڈے پر کوئی نہ کوئی گفٹ تو بنتا تھا ناں۔'' اس نے اپنا بڑا پن جھاڑا تھا۔

''نہیں، نہیں۔ایسی غلطی مت کیجیے آپ۔دشمن کو کبھی معاف نہیں کرتے کیونکہ دشمن پلٹ کر وار کر سکتا ہے۔'' اس نے استہزائیہ انداز اپنایا تھا۔

''تم ایسا کچھ نہیں کر سکتے اور نہ ہی مجھے تم سے کوئی خطرہ ہے۔'' وہ پختگی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔اریب کے پاس کوئی جواب نہ بن پایا۔شاید یہی حقیقت تھی۔وہ چاہ کر بھی اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔شاید اس کی تربیت ایسی نہ تھی یا پھر شاید وہ اس تک پہنچ ہی نہ سکا تھا۔

''میرے پاس تمہاری بکواس باتوں کو سننے کا وقت نہیں ہے۔'' کچھ دیر کی خاموشی کے بات اریب نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

وہ چلتا ہوا بالکونی کی طرف آیا۔جہاں سے چنبیلی اور گلاب کی ملی جلی خوشبو نتھنوں میں داخل ہو رہی تھی۔اس نے پردے کی لڑیوں کو صحیح کیا۔

”لیکن میرے پاس تو بہت سا وقت ہے تمہارے ساتھ بتانے کو مگر کیا کروں تم چلے ہی اتنی دور گئے ہو۔ ویسے واپسی کب تک ہے؟“ اس سنجیدہ لہجے میں بھی ایک عجب سا سرور تھا۔ اریب نے گردن جھٹکی۔ آگے بڑھ کر بالکونی کی ریلنگ کو پکڑا۔

”واپسی ...... یہ تو مجھ سے بہتر تمہیں معلوم ہونی چاہیے۔ آخر مجھ سے جڑے ایک ایک پل کی خبر رکھتے ہو تم۔“ اس نے طنز کے نشتر چلائے تھے۔ قہقہہ گونجا۔

”یہ تو تم نے خوب کہا اریب۔ اگر میرا بس چلے تو میں تمہیں کبھی انڈو آنے ہی نہ دوں مگر تم بہت ضدی ہو۔ آکر ہی دم لوگے۔“ اس نے جیسے اپنی ہار تسلیم کرلی تھی۔

”چلو، یہ تو پتا چل گیا کہ میں بہت ضدی ہوں۔ اب یہ بات بھی اپنے ذہن میں بٹھا لو کہ اس بار جب میں واپس آؤں گا تمہارا راز فاش کر کے ہی دم لوں گا کیونکہ اریب نے آج تک مات کا چہرہ نہیں دیکھا۔“ اس نے چیلنج کیا تھا۔

”جھوٹ۔ مات کا چہرہ تو تم دیکھ ہی چکے ہو۔ بس اگلی مات کی تیاری ہے۔“ استہزائیہ انداز گویا ہوا تھا۔ اریب جھرجھری لے کر رہ گیا۔ آنکھیں معمولی سی پھیلیں اور ایک حقارت نے جنم لیا۔ بولنا چاہا مگر الفاظ نہ بن سکے۔

”لگتا ہے غصہ کر گئے۔ چلو اب آرام کرلو۔ کل تمہارے بابا جان نے ایک سرپرائز بھی تیار کیا ہوا ہے۔ ایڈوانس میں مبارک ہو۔“ یہ کہہ کر ابدال نے فون ڈسکنیکٹ کر دیا مگر وہ انتہائی بری طرح چونکا تھا۔ کچھ دیر پہلے کہے گئے الفاظ اس تک کیسے پہنچ گئے۔ وہ نہ صرف اس کی ذات کا احاطہ کیا ہوا تھا بلکہ اس سے کی جانے والی ایک ایک بات سے بھی باخبر تھا۔ وہ کئی ساعتیں حیرت کے سمندر میں غوطے کھاتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنے موبائل کا خیال آیا۔ کہیں اس نے موبائل میں کوئی چپ تو نہیں لگا دی۔ وہ برجستہ بیڈ کی طرف پلٹا۔ موبائل کھولا اور اس کا ایک ایک حصہ الگ کر ڈالا مگر ضروری سامان کے علاوہ کوئی غیر معمولی شے نظر نہیں آئی۔ یعنی چپ کا اندازہ اس کا غلط تھا مگر پھر کیسے؟

اس نے موبائل کو یونہی رہنے دیا اور اٹھ کر بالکونی کی طرف بڑھا۔ آسمان کی طرف نگاہ دوڑائی تو چاند کی روشنی ماند تھی۔ اس کے بائیں جانب دیکھا تو دو ستاروں کو اپنے جوبن پر پایا۔ کچھ ستارے اس کا احاطہ کیے ہوئے تھے جو دھیرے دھیرے اپنے عروج کو پہنچ رہے تھے۔ وہ ان ستاروں سے نابلد انہیں دیکھتا رہا۔

”آخر ابدال کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ کیا اس کا مقصد محض مجھے دینپاسار جانے سے روکنا ہے یا کچھ اور؟“ وہ اپنی ہی الجھی ڈوری کو سلجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سینے پر ہاتھ باندھ کر یک ٹک چاند سے سوال وجواب کر رہا تھا۔

”اگر وہ صرف دینپاسار جانے سے روکنا چاہتا تھا تو میرے دل میں شک کو جنم ہی کیوں دیا؟ کیوں مجھے وہاں سے بلینک کال کر کے پریشان کرتا رہا؟ اگر میرا بھلا چاہتا تو کبھی مجھے ٹھیس نہ پہنچاتا۔ وہ کوئی اپنا نہیں ہوسکتا۔“ الجھی ڈوری کبھی سلجھتی تو کبھی پہلے سے بھی زیادہ الجھ جاتی۔

☆......☆......☆

اے زمانے تری تجدید بجا ہے، لیکن

تُو بھی منجملہ اربابِ روایات تو ہے

وہ آج کافی خوش تھا۔ حسام اور جہانزیب اس کی برتھ ڈے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ عکاس بھی دن میں لوٹ آیا تھا۔ کامیش سے اس نے ایک دو بار رابطہ کرنا چاہا مگر اس کا فون بند رہا۔ شاید وہ لاہور گیا ہوا تھا۔ وہاں اکثر سگنل پرابلم ہوتا تھا۔ ہانیہ کا خیال ایک لمحے کے کھڑ کا مگر اس نے انتہائی بے اعتنائی برتتے ہوئے اس کے خیالوں کو بھی بری طرح جھٹک دیا۔ وہ اس گھٹیا لڑکی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی زندگی میں ہر اجنبی پہلے گھٹیا بن کر ہی داخل ہوتا ہے۔ جیسے ہانیہ اور پھر ابدال۔ اس نے استحقار بھرے انداز میں ان کا خیال دل کی نگری سے نکال دیا۔

شام کو وہ سرمئی رنگ کی شیروانی پہنے زینے سے اتر رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ پورا ہال اچھے سے سجا ہوا تھا۔ وہ کافی حیران ہوا۔ تیاریاں محض برتھ ڈے کی تو نہیں سکتی تھی۔ بات کچھ اور تھی۔ وہ سوچنے لگا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ جبیں اور حسام کافی خوش تھے۔ صبا بھابھی کی طبیعت بھی بظاہر ٹھیک تھی۔ وہ بھی ان تیاریوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھیں۔ سحر فاطمہ کے پاؤں جیسے زمین پر ہی نہ ٹکے۔ خوشی ان کے چہرے پر بدر کے مترادف تھی۔ وہ یہ سب دیکھتا ہوا آخری زینے پر پہنچا تھا۔

”لو مہمان خاص بھی آ گئے۔“ یہ عکاس تھا۔ جو سیاہ رنگ کی شیروانی میں ابتسام کو لبوں پر سجائے پلٹا تھا۔ جبیں بھی پھولوں کی تھال تھامے اس کے بائیں جانب آ کھڑی ہوئی۔ اریب چونکا۔ عکاس نے اچھنبے لہجے میں دیکھا تو اس نے ابرو اچکائے۔ عکاس نے پلٹ کر جبیں کی طرف دیکھا تو وہ دونوں مسکرا دیئے۔ اریب کو ایک بار پھر جھٹکا لگا جب دونوں اکٹھے آگے بڑھے اور اس کے دائیں بائیں آ کر کھڑے ہو گئے۔ عکاس نے اریب کا دائیں بازو پکڑا جبکہ جبیں نے پھولوں کی تھال ایک طرف رکھ کر اس کا بائیاں بازو پکڑا۔ اریب حیران تھا جبکہ وہ دونوں اس کو لاؤنج کے وسط میں لے جا رہے تھے۔

”آخر بات کیا ہے؟ دو جھگڑالو ایک ساتھ؟ اور وہ بھی اتنے خوش؟ مجھے تو دال میں ضرور کچھ کالا لگ رہا ہے۔“ اریب نے حیرانی سے کہا تھا۔

”یہاں دال میں کچھ کالا نہیں بلکہ پوری کی پوری دال ہی کالی ہے سالے صاحب۔“ عکاس نے شریر لہجے میں کہا تھا۔ اس نے پلٹ کر جبیں کی طرف دیکھا تو وہ خاموش رہی۔ اس بار وہ نہ تو وہ اچھلی اور نہ منہ بسور کر گردن جھٹکی۔

”اب تو یقین ہو چلا ہے۔ دال پک کر کالی ہو چکی ہے۔ تبھی تو بندر کی طرح اچھلنے والی لڑکی آج معصوم کبوتری بنی ہوئی ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر جبیں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ آج تم جو مرضی کہو۔ جبیں نے معافی کے دروازے کھولے ہوئے ہیں۔“ اس نے ایک ہاتھ ہوا میں لہراتے

ہوئے کہا تھا۔اریب نے حیرت سے تھوک نگلنا چاہا۔ جہانزیب بھی وہاں آموجود ہوئے۔ دونوں نے اریب کو چھوڑا اور پیچھے کو کھسکے۔ وہ اس وقت لاؤنج کے عین وسط میں کھڑا تھا۔ سب مہمانوں کا رخ اس کی طرف ہوا۔ سب کے چہرے پر خوشی دیدنی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پڑھ پاتا، سحر فاطمہ حاعفہ کو لئے وہاں آحاضر ہوئی۔ وہ آف وائیٹ رنگ کے لہنگے میں ملبوس تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی اور چہرے پر حیا نے اپنا بسیرا کیا ہوا تھا۔ اریب تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ سحر فاطمہ نے اسے اریب کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ وہ کئی ساعتیں اُس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ دل نے چاہا کہ وہ ایک بار نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھے مگر دل کی مراد دل میں ہی دم توڑ گئی۔ وہ کسی کی راہ میں پلکیں بچھائے ہوئے تھی۔ جہانزیب نے پیچھے سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے تو وہ اذیت کے ساتھ مسکرایا۔

''کیسا لگا میرا سرپرائز؟'' خوش دلی سے استفسار کیا گیا تھا مگر اس کا ذہن تو کہیں اور ہی منڈلا رہا تھا تبھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

''مطلب؟'' وہ الجھا۔

''مطلب یہ کہ آج تمہارے برتھ والے دن پر ہم تمہاری نسبت حاعفہ سے طے کر رہے ہیں۔'' اریب حیرت سے چونکا۔ وہ خوش ہویا پھر ناخوش، عقل جواب دے گئی۔ دل کی خواہش نے حقیقت کا روپ دھاڑا مگر یہ سب اس قدر ناقابل یقین تھا کہ اس نے کئی ساعتیں یقین کے سفر میں گزار دیں۔ لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوئی اور سنجیدگی نے ڈیرا جمایا۔ سب کے چہروں کی طرف دیکھا گیا تو وہ مسکراتے نظر آئے۔ سحر فاطمہ بھی انتہا کی خوش تھی۔ آنکھوں میں ایک کسک تھی۔ اپنے بیٹے کی نئی زندگی میں ان کی دعائیں برابر کی شریک تھیں۔ اس نے نگاہوں کا رخ اب حاعفہ کی طرف کیا۔ بالکل خاموش، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو یا پھر یہ سب زبردستی کرنے کو کہا گیا ہو۔ وہ اپنی نگاہیں بس جھکائے ہوئے تھی۔ کوئی لکیر اس کے دل کی ترجمان نہ تھیں۔ اسے واقعی ایک سرپرائز ملا تھا مگر خوشی یا غمی کا فیصلہ ابھی ہونا باقی تھا۔

''اتنی خاموشی؟ خیریت تو ہے ناں اریب؟ میں تو سمجھا تھا کہ تم یہ بات سن کر بندروں کی طرح اچھلنے لگو گے۔'' عکاس نے شریر لہجے میں کہا۔ جبیں ہنس دیا۔ وہ آج جبیں کی زبان بول رہا تھا۔ اس بار اسے حیرت نہ ہوئی۔ شاید وقت بدل چکا تھا۔ کئی رشتے اپنی اہمیت بدل چکے تھے۔ جبیں کے دل میں عکاس نے قدم رکھ لیا تھا۔ جہاں تک حاعفہ کی بات تھی وہ تو جیسے اپنی زبان پر مہر لگائے ہوئے تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اس سے بات کرے مگر ایسا ممکن ہو نہ سکا۔

''میں بندر نہیں ہوں بھائی۔ انسان ہوں۔'' اس نے بناوٹی انداز اپنایا۔ سب مسکرا دیئے۔

''یعنی تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں۔'' جہانزیب کو یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اپنے بیٹے کو گلے لگایا۔ اس کی پیشانی چومی۔ سحر فاطمہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکلے آئے۔

''مگر حاعفہ؟ کیا آپ نے اس کی مرضی جاننے کی کوشش کی؟'' اس نے مدہم لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''اس کی مرضی تم سے پہلے حاصل کی جا چکی ہے۔'' سحر فاطمہ نے مسکراتے ہوئے حاعفہ کا لہنگا ٹھیک کیا تھا۔ اس بار وہ ضرور چونکا

تھا۔وہ حیرت سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔کیا وہ اسے معاف کر چکی ہے؟دل میں ایک احساس نے چپکے سے قدم رکھا۔محبت لے لباس میں ملبوس وہ وجود اس کے دل کی نگری میں گھوم رہا تھا۔لبوں پر مسکراہٹ بکھیرے وہ مشکور نگاہوں سے حاعفہ کا دیدار جام پی رہا تھا۔

''تو پھر منگنی کی رسم میں دیری بھلا کس بات کی؟'' صبا نے انگوٹھی سحر فاطمہ کی طرف بڑھائی تو یہ رسم بھی ادا کر دی گئی۔اریب کی آنکھیں یک ٹک حاعفہ پر مرکوز تھیں۔دل میں تشکر کے جذبات اور آنکھوں سے الفت ٹپک رہی تھی۔وہ آج بہت خوش تھا۔منگنی کے بعد کیک کاٹا گیا۔جس پر سالگیرہ اور نئی زندگی کے کئی پیغامات لکھے ہوئے تھے۔حاعفہ اور اریب نے ملکر کیک کاٹا تھا۔سب سے پہلے وہ ٹکڑا اس نے حاعفہ کو کھلایا۔ایک معمولی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے صرف ذرا سا چکھا تھا۔شاید شرم کی وجہ سے؟

''اس اہم دن پر میں ایک اور اعلان کرنا چاہتا ہوں۔'' جہانزیب نے سب کو مخاطب کیا۔اریب نے بھی مسکراتے ہوئے جہانزیب کی طرف دیکھا۔جہانزیب نے اپنے بائیں جانب اریب کو اور دائیں جانب حاعفہ کو کھڑا کیا۔

''وہ اعلان یہ ہے کہ دو دن بعد ہی میرے اریب کا نکاح حاعفہ سکندر کے ساتھ ہے۔'' یہ ایک زبردست جھٹکا تھا۔شاید اریب کے لئے، کیونکہ باقی کے تاثرات نارمل تھے۔وہ اٹ سٹ جہانزیب کی طرف دیکھ رہا تھا۔اتنا بڑا فیصلہ؟وہ بھی بنا اس کی اجازت لئے اور وہ بھی اتنی جلدی؟وہ کافی ڈسٹرب ہوا تھا مگر مہمانوں کے سامنے خاموش رہا مگر ان کے جاتے ہی اس نے دل کا غبار دور کرنا چاہا اور اس کے بابت دریافت کیا۔

''تو اس میں حرج کیا ہے؟حسام کی بھی شادی اس عمر میں ہو چکی تھی۔اب تم بھی شادی کے قابل ہو چکے ہو۔'' جہانزیب نے دلیل دی تھی۔

''لیکن بابا جان، بھائی نے تو اپنی ڈگری مکمل کر لی تھی مگر میرا تو ابھی آخری سال باقی ہے۔'' اس نے وضاحت کی۔

''تو اس میں کوئی معیوب بات نہیں، تمہیں تعلیم حاصل کرنے سے کوئی نہیں روکے گا۔تم جہاں چاہو، تعلیم حاصل کرلو۔اس سلسلے میں نہ میں، نہ گھر والے اور نہ ہی حاعفہ رکاوٹ بنے گی۔'' جہانزیب نے اس دلیل کو بھی رد کر دیا۔

''مگر اکیس سال...... یہ بھی کوئی عمر ہے شادی کی؟'' اس نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''جی ہاں۔یہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔بچے جب جوان ہو جائیں تو والدین کا فرض بنتا ہے کہ ان کی شادی میں جلدی کی جائے۔آخر ستائیس اٹھائیس سال تک کس بات کا انتظار کیا جاتا ہے؟صرف میچوئر ہونے کا؟لیکن میچوئر تو وہ پندرہ سال تک ہو جاتے ہیں۔اسلام میں جوان ہونے کی عمر پندرہ سال مقرر ہے۔اس کے بعد وہ بچوں کی لسٹ سے نکل جاتے ہیں۔وہ تمام فرائض اسے پورے کرنے ہوتے ہیں جو ایک بالغ انسان کے ذمے ہوں تو اس کے بعد کوئی اور گنجائش باقی ہی نہیں رہتی۔آج ہمارا معاشرہ جس پستی کی طرف گامزن ہے اس کا سب سے بڑا سبب دیر سے شادی کرنا ہے۔بچوں کے جوان ہوتے ہی شادی کا حکم کیوں دیا گیا؟تاکہ انسان اخلاقی برائیوں

سے بچ جائے۔ جن چیزوں کے پردے میں رہنے کا حکم دیا گیا وہ پردے میں ہی رہیں مگر ہم پر تو سو کالڈ میچوئر ہونے کا بھوت سوار ہے۔ لیکن اس میچوئر کی حد ہم نے مقرر کی ہے کیا؟ اگر کی بھی ہے تو ستائیس اٹھائیس سال۔ لیکن کیا گارنٹی ہے کہ تب تک وہ انسان کسی بھی برائی میں اپنے آپ کو غرق نہیں کرے گا؟" یہ کہہ کر انہوں نے توقف کیا۔ اریب لاجواب تھا۔

"دیکھو میرے بیٹے! اکیس سال کی عمر میں شادی ہونا کم عمری کی شادی نہیں کہلاتا۔ اگر بائے لاء بھی دیکھا جائے تو اٹھارہ سال تک وہ قانونی طور پر بالغ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر اس کی جائیداد ہے تو ٹیکس لگ جاتا ہے۔ اگر جاب کرنا چاہے تو آسانی سے جاب مل جاتی ہے۔ اگر جرم کیا جائے تو اس کے ساتھ ستائیس اٹھائیس سال کے مجرموں کی طرح پیش آیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اٹھارہ سال کے بعد کوئی بھی اپنے آپ کو بچہ نہیں کہہ سکتا تو پھر شادی کے معاملے میں ایسا کیوں؟ ہر معاملے میں چھوٹی عمر کو فوقیت دی جائے مگر شادی کی بات آئے تو ستائیس اٹھائیس سال ہونے کا انتظار کیا جائے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے ایسے والدین پر جو محض اپنے بچوں کے کرداروں کو صرف اس بنا پر داغ دار کر دیتے ہیں کہ وہ تو ابھی بچے ہیں، بھلا بیس اکیس سال بھی کوئی شادی کی عمر ہوئی؟

میرا ان والدین سے صرف ایک سوال ہے، اگر وہ اپنے بچوں کی شادی ستائیس اٹھائیس سال کی عمر تک ملتوی کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں مگر کیا وہ اس بات کے ضامن بن سکتے ہیں کہ ان کے بچے کے اندر پیدا ہونے والی تبدیلیاں انہیں غلط راستے پر گامزن نہیں کریں گی؟ انسان کو جب جائز راستے سے حق نہیں ملتا تو وہ چور دروازہ ڈھونڈتا ہے تو کیا وہ ان تمام چور دروازوں کو بند کر سکے گے اتنے سال تک؟ نہیں وہ ایسا کبھی نہیں کر سکیں گے۔ وہ اپنی ضد تو پوری کر سکتے ہیں مگر اپنے بچوں کو گناہوں سے نہیں بچا سکیں گے تو ایسے میں گناہ کا وبال بھلا کس پر ہوا؟ ان بچوں کو جو لحاظ کا دامن پکڑے، والدین کے آگے نہ بول سکے یا پھر ان والدین پر جن پر ستائیس اٹھائیس سال کا سو کالڈ بھوت سوار ہے۔ میرے خیال سے یہ سب شیطان کے ہتھکنڈے ہیں۔ والدین کو اپنی اولاد پر یہ ظلم نہیں کرنا چاہیے۔" جہانزیب کی دلیل پر وہ واقعی لاجواب ہو چکا تھا۔ سب خاموش تھے۔ حاعفہ بھی خاموش تھی۔

"ٹھیک ہے۔ اگر آپ کی مرضی اسی میں ہے تو میں راضی ہوں۔" وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا تھا۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے تھے۔ جہانزیب نے اسے گلے لگایا۔

"تھینک یو میرے بیٹے۔" انہوں نے پیشانی کو چوما تھا۔

☆......☆......☆

وہ ہم سفر کہ مرے طنز پر ہنسا تھا بہت
ستم ظریف مجھے آئینہ دکھا کے ملا

اس کی خوشی دیدنی تھی۔ جھٹ منگنی پٹ شادی، اس کے من میں خوشی کے لڈو پھوٹ رہے تھے مگر ایک کسک ابھی تک باقی تھے، وہ

بذات خود حاعفہ سے بات کر کے اُس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر گھر والوں کے ہوتے ہوئے اسے وقت ہی نہ ملا۔ اس نے کئی بار اس کے کمرے کے چکر لگائے مگر وہ کبھی اکیلی نہ ہوتی کبھی جبیں ہوتی تو کبھی صبا بھابھی۔

''توبہ ہے، کبھی تو حاعفہ کو اکیلا چھوڑ دو۔'' وہ دل میں بڑبڑا کر رہ جاتا۔ الٹے قدم لوٹتا تو حسام کو ہنستا ہوا پاتا۔

''آپ کو ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بس بات کرنے جا رہا تھا۔'' وہ چڑ کر کہتا۔

''مجھے اچھے سے معلوم ہے کہ کون سی باتیں کرنی ہیں جناب صاحب نے۔ لیکن ایک بات ذہن میں بٹھا لو، یہ رومانس وغیرہ شادی سے پہلے نہیں چلے گا۔ شادی کہ بعد تمہیں کوئی روکے گا نہیں۔'' وہ شریر لہجے میں گویا ہوا تھا۔ وہ چڑ کر رہ گیا۔

''بھائی جان۔'' اس نے تیکھا انداز اپنایا۔ وہ قہقہہ لگا کر رہ گیا۔

''صحیح تو کہا ہے۔ میری جان۔ یہ جتنی بھی راز و نیاز کی باتیں ہیں ناں، شادی کے بعد کمرے کو لاک کر کے ہی کرنا۔'' وہ اسے جبیں کی طرح زچ کر رہا تھا۔

''اچھا جی۔ تو پھر آپ منگنی کے بعد بھابھی سے گھنٹوں فون پر باتیں کیوں کرتے تھے؟'' وہ بھی اپنے نام کا اریب تھا۔ دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھ کر ابرو اچکائے۔ وہ چونک کر رہ گیا۔ ہنسی کو ضبط کیا۔

''مجھے بابا جان بلا رہے ہیں۔'' حسام نے کھسکنا چاہا مگر اریب نے اس کی چال کو ناکام بنا دیا۔ اس کا ہاتھ پکڑا۔

''بابا جان ابھی ابھی بنک گئے تھے۔ آپ سیدھے سے میرے سوال کا جواب دیجیے۔'' اریب نے شوخ لہجے میں کہا تھا۔

''تم بہت بے شرم بنتے جا رہے ہو۔ ماما جان سے جا کر شکایت کرتا ہوں۔'' اس نے اپنا ہاتھ چھڑوایا اور عجلت سے کھسکنے میں خیریت جانی۔ اریب مسکرا دیا۔ دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے اور اپنے روم کی طرف بڑھا۔ وہاں فون کی رنگ ہو رہی تھی۔ وہ الجھا اور آگے بڑھا۔ ہمیشہ کی طرح ابدال کال پر تھا۔

''مبارک ہو مائے ڈیئر شادی کی۔'' فون پر کہا گیا تھا۔ وہ سپاٹ انداز میں کھڑا سب کچھ سنتا رہا۔

''کل منگنی ہوئی اور اب کل نکاح ہے برخوردار کا۔ بہت خوب۔ ہزاروں سال جیو تم۔'' اس کے انداز میں عجب تاثر تھا مگر اریب خاموش رہا اور کچھ نہ کہا۔

''خیریت ہے آج بہت خاموش ہو؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا مگر اس بار بھی مہر نہ ہٹی۔

''لگتا ہے غصہ آ رہا ہے جناب کو۔'' وہ اب بھی خاموش رہا۔ ابدال نے کئی سوال کیے مگر وہ خاموشی سے جواب دیتے رہا اور آخر میں فون ڈسکنیکٹ کر دیا۔

''گو ٹو ہیل۔'' اس نے بدد عادی اور گردن جھٹک کر سٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھ دیا۔

☆......☆......☆

نجانے کب مری دنیا میں مسکرائے گا
وہ ایک شخص کہ خوابوں میں بھی خفا سا لگے

حسام کی طرح اریب کی شادی میں زیادہ دھوم دھڑ کا نہیں کیا گیا۔ مہندی میں بس گھر والے ہی شریک تھے اور نکاح پر بھی چیدہ چیدہ لوگ تھے۔ نکاح سے ایک گھنٹے پہلے اریب کو حاعفہ سے ملنے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت شیروانی ہاتھ میں لئے جبیں کے کمرے میں آئے تھا۔ اس کا ٹانکا کچھ خراب تھا۔ جسے دیکھ کر وہ ہائپر ہو گئی۔

''اُفف ٹیلر کو کہا بھی تھا کہ کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے مگر مجال ہے جو اثر بھی قبول کیا ہو۔ دیکھاؤ ادھر میں ماما جان کے پاس لے کر جاتی ہوں۔'' اس نے ٹیلر کو ایسے کھڑی کھڑی سنائی تھی جیسے وہ اس کی باتیں سن کر ندامت کے سبب نگاہیں جھکا لے گا اور غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اسے سدھارے گا مگر ایسا ممکن نہ تھا۔ یہ شیروانی اریب کی غیر موجودگی میں سلائی گئی تھی۔ فٹنگ صحیح رہی، یہی کافی تھا۔ وہ مسکرایا اور آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔

''خواب جب حقیقت بنتا ہے تو کس قدر خوشی ہوتی ہے؟'' اس نے اپنے عکس سے سوال پوچھا تھا۔ تبھی عقب میں کھڑ کا ہوا۔ واش روم کا دروازہ کھلا تھا۔ جہاں سے حاعفہ اندر داخل ہوئی تھی۔ سرخ رنگ کے لہنگے میں وہ آئینہ تماثل کی طرح حاعفہ میں اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ آنکھیں تو جیسے اس کے وجود پر ٹھہر سی گئی تھیں۔ مسکراہٹ نے لبوں کی راہ لی۔ دل میں ایک کسک ابھری۔ حاعفہ اریب کو وہاں دیکھ کر چونکی اور اپنی نگاہیں چرالیں۔ ادھر ادھر دیکھا تو جبیں نظر نہ آئی۔

''جبیں ماما جان کے پاس گئی ہے۔'' اریب نے اس سوال کو پڑھ لیا تھا۔ اس نے بنا دیکھے ڈریسنگ کا رخ کیا۔ اریب پیچھے ہٹا مگر نگاہیں نہ چرا سکا۔ محبوب اور عاشق کے تمام فاصلے مٹ چکے تھے۔ بس چند گھڑیاں باقی تھیں، پھر دو جسم ایک جان ہوتے۔ محبوب، محبت کی بانہوں میں ہوتا۔ نگاہوں کی تشنگی بجھ جاتی۔ بے چین دل کو قرار آجاتا مگر جہاں خواب شیشے کے ہوں وہاں سنگ دل پتھر ان کو کرچیاں ضرور کر دیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ حاعفہ، جو تم نے اُس خلش کو مٹا دیا۔'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ وہ دفعتہً پلٹی، آنکھوں میں سفاکیت انتہا کی تھی۔ آج بھی وہ اپنی انا میں تھی۔ بس فرق صرف اتنا تھا، کھلی زلفیں سکارف کے اوٹ سے جھانک رہی تھیں۔

''جب تک تم اجنبی ہو، تب تک میں اُس خلش کو نہیں مٹا سکتی۔ تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی اور اعتماد کو پہنچی ٹھیس اتنی آسانی سے نہیں بلائی جاسکتی۔'' سخت لہجہ گویا ہوا تھا۔ مژگان کے کنارے چمکنے لگے۔ ہراساں دل پسیج سا گیا تھا۔

''میں نے تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ تم جو چاہو قسم لے لو۔''

''ہر بات پر قسم کھانے والے اکثر جھوٹے ہوا کرتے ہیں۔''

''پھر کیسے مٹاؤں اس خلش کو؟''

''اپنی صفائی نہ دے کر۔''

''ایسا تو کسی عدالت میں بھی نہیں ہوتا حاعفہ۔انسان سے گناہ ہو اور وہ اپنے گناہ کی معافی مانگے، معافی تو اسے بھی مل جایا کرتی ہے لیکن مجھے اس غلطی کی سزا کیوں مل رہی ہے جو میں نے کی ہی نہیں۔اس رات جو کچھ ہوا تھا وہ سب غلط فہمی تھی۔میں مانتا ہوں میں گناہ کرنے جا رہا تھا مگر عکاس بھائی نے مجھے بچالیا تھا اور جو تم نے میری شرٹ پر دیکھا تھا وہ کامیش کو گھر چھوڑتے ہوئے داغ لگے تھے۔میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو مجھے تمہاری یا اپنی نظروں میں گرادے۔ہو سکے تو میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''اس نے گلوگیر لہجے میں ایک پل کے لئے توقف کیا تھا جبکہ محبوب اپنی بے اعتنائی کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔

''میری دامن کو داغدار سمجھنے کی بجائے ایک بار دل سے پوچھو، کیا تمہارا اریب ایسا کر سکتا ہے؟'' وہ یہ کہہ کر پلٹا تو سامنے جبیں کھڑی تھی۔ہاتھ میں مہرون رنگ کی شیروانی تھی۔جو کچھ دیر بعد اس نے زیب تن کرنی تھی۔

''ماما جان نے ٹانکا لگا دیا ہے۔اب پہن کر دیکھ لو اور سارے نقص مجھے ضرور بتانا تاکہ آئندہ اس کو کھری کھری سنا سکوں۔''وہ جیسے ہوا میں باتیں کر رہی تھی۔سننے والے موجود تھے مگر سننے سے قاصر تھے۔جبیں کے ہاتھوں سے اریب نے شیروانی لی اور اپنے روم کی طرف چل دیا۔جبیں نے حیرت سے حاعفہ کی طرف دیکھا تو وہ بناوٹی انداز میں مسکرائی۔مژگان یہاں بھی چمک رہے تھے۔بن کہے وہ سمجھ گئی۔حاعفہ نے نظریں چرائی تو جبیں دھیمے قدموں کے ساتھ آگے بڑھی۔اس کے شانوں پر ہاتھ رکھنا چاہا مگر جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکی۔پلٹنے لگی تو ایک جملہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''حاعفہ، میرا بھائی تم سے بہت محبت کرتا ہے۔اس کی محبت کو آزمانے کی کوشش مت کرنا کیونکہ ہم بہن بھائیوں نے کبھی رشتوں کو آزمایا نہیں ہے۔ماما جان اور بابا جان نے ہماری ہر خواہش کو بن کہے پورا کیا ہے۔اگر تم نے اس کی محبت کو آزمانا چاہا تو وہ بری طرح ناکام ہو جائے گا اور آخر میں لاحاصل تم بھی رہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چل دی مگر ان الفاظ نے اس کے وجود کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔وہ پلٹی تو آنکھوں میں ایک کسک کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔جبیں کے الفاظ اس کی سماعت کے راستے دل تک پہنچے تھے۔اریب کا وجود جو کچھ دیر پہلے تک اس کے سامنے تھا، ایک عکس کی شکل اختیار کر گیا۔الفاظ دوبارہ دہرائے گئے۔آنکھوں میں جھانکا تو بے گناہی نظر آئی۔بے گناہ وجود اپنے ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہا تھا۔وہ ہونقوں اسی عکس میں کھوئے رہی۔یہاں تک کہ لڑکیاں آئیں، جن میں جبیں نہ تھی اور اسے تیار کر کے اپنے ساتھ لے گئیں۔وہ اریب کے سنگ بیٹھی تھی۔اریب کی مہرون شیروانی کا بازو اس کے سامنے تھا۔دل نے چاہا کہ بات کرے اور اس بار اپنی ذات کو اس کے سامنے رکھ دے مگر مہلت نہ ملی۔مہمانوں کا ایک ہجوم تھا۔صبا بھابھی اس کے سنگ بیٹھی تھی۔جبیں اس کے عین عقب میں کھڑی تھی۔حسام کے ہاتھ اریب کے شانوں پر تھے۔جہانزیب اور سحر فاطمہ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھے۔

نکاح کا وقت ہوا تو مولوی صاحب کو بلایا گیا۔

''اریب عالمگیر کیا آپ کو یہ رشتہ قبول ہے۔'' کچھ پل کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ اریب کے لبوں پر جیسے مہر لگی تھی۔ خاموشی نے طول پکڑا تو حاعفہ کا سانس لینا بھی محال ہو گیا۔ مژگان کے کنارے اپنی غلطیوں پر ندامت کے سبب چمک رہے تھے۔ جہانزیب بھی ایک لمحے کو چونکے تھے۔ سحر فاطمہ سمیت سب کی نظریں اریب پر مرتکز تھیں۔

دوسری بار بھی سوال دہرایا گیا۔ خاموشی بدستور قائم رہی۔ حسام نے شانوں پر دباؤ ڈالا مگر وہ تو جیسے ماضی کے پنوں میں بری طرح الجھتا چلا گیا۔ حاعفہ نے دوپٹے کے اندر سے اریب کے ہاتھ کو، جو اس وقت اریب کی اپنی ران پر تھا، تھام لیا۔ اس نے برجستہ حاعفہ کی طرف دیکھا تھا۔ استفہامیہ آنکھیں اپنے اندر ہزاروں سوالوں کو سمیٹے ہوئے تھیں۔

''زیادہ سوچو مت سالے صاحب! کہیں ایسا نہ ہو لڑکی ہاتھ سے نکل جائے۔'' حسام کے ساتھ ہی کھڑے عکاس نے جھک کر سرگوشی کی تھی۔ وہ ہنسے یا قہقہہ لگائے؟ اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ سنجیدگی نے چہرے کا رخ کیا۔

''اریب؟ کیا ہوا؟ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟'' سحر فاطمہ نے آگے بڑھ کر پوچھا تھا۔ سحر فاطمہ کی آواز جیسے اسے حقیقت میں لے آئی تھی۔

''قبول ہے۔'' اس نے دفعتہً کہا تھا مگر ذہن نے لفظوں کا ساتھ نہ دیا۔ وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ بس جو کچھ مولوی صاحب پوچھ رہے تھے، وہ اثبات میں جواب دیتا گیا۔ سب کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ اب حاعفہ کی باری تھی۔ اس نے بنا کسی تردد کے اس رشتے کو قبول کر لیا۔ وہ حیران تھا مگر حیرانی کیسی؟ یہی تو چاہتا تھا وہ حاعفہ کو اپنا جیون ساتھی بنانا مگر اسے وہ خوشی کیوں محسوس نہ ہوئی؟ اسے اپنی چاہت مل چکی تھی مگر اس چاہت کو پانے کے بعد دل کو راحت نہ ملی۔ وہ مزید الجھنوں میں بری طرح الجھ چکا تھا۔

اس نے نگاہیں حاعفہ کی طرف گھمائیں تو جیسے اسے ہانیہ کا عکس نظر آیا۔ عام سی شکل میں بہت خاص لڑکی۔ اس نے برجستہ خیالوں کو جھٹکا۔ پلکیں جھپک کر دوبارہ دیکھا۔ وہاں حاعفہ تھی۔ جو کچھ دیر پہلے تک حاعفہ سکندر تھی اور اب حاعفہ اریب عالمگیر بن چکی تھی۔ دو لفظوں کے اقرار نے نام کے ساتھ ساتھ اس کے وجود کو بھی بدل کر رکھ دیا تھا۔ کل تک جسے وہ کبھی پانا نہیں چاہتی تھی آج وہی اس کا مقدر ٹھہرا تھا۔ جس کے لئے دل میں نفرت کے جذبات تھے، قسمت نے اسی کو اس کا شوہر بنا دیا۔ وہ اپنی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ اریب کی نگاہیں انہی انگلیوں پر تھیں۔

''کیا یہ سب ٹھیک ہوا؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا تھا مگر جواب شاید کسی کے پاس نہ تھا۔ عکاس اور حسام نے اس کو گلے سے لگا کر مبارکباد دی۔ دونوں کے چہرے مسکرا رہے تھے۔ اسے بھی مسکرانا چاہئے تھا مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا، کیوں؟ یہ نہیں جانتا تھا۔ ایک خلش جانے کیوں دل کی گہرائیوں میں اترتی جا رہی تھی۔

اس نے اپنا ذہن بانٹنا چاہا مگر ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ وہ چاہ کر بھی ہانیہ کی سوچوں کو ذہن سے نہ نکال سکا۔ مٹھیاں بھینچ کر وہ پلٹا۔ کچن کی طرف گیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ باہر شور و غل تھا مگر یہاں جیسے سکوت کا عالم تھا۔ وہ بیسن پر ہاتھ رکھے، اپنا پورا وزن اس پر ڈالے کھڑا تھا۔ سامنے آئینہ تھا۔ وہ اسی میں ایک عکس دیکھ رہا تھا۔ جو ہو بہو اس جیسا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے میں نے بہت غلط کیا ہے۔ کسی کا دل توڑا ہے۔ کسی کو اپنے سے جدا کیا ہے۔ مگر کون ہے وہ جس کا دل توڑا گیا؟ کس سے دور گیا ہوں میں؟ سب تو یہاں ہیں۔ پھر کون ہے وہ؟'' اس نے کئی سوال ایک ہی بار پوچھ ڈالے تھے مگر عکس نے جواب دینے سے انکار کر دیا۔ وہ خاموشی کا لبادہ اوڑھے اس کا منہ تکتا رہا۔ آنکھیں دھیرے دھیرے سرخ ہو رہی تھیں۔ لال رنگ کی ڈوریاں جیسے ان پر غالب آ چکی تھیں۔ اس نے نل کھول کر پانی کا ایک جھپکا چہرے پر ڈالا۔ میل کچھ اترنے لگا۔ عکس بھی تغیر کا شکار ہوا۔ ایک مبہم سے چہرے نے جنم لیا۔

''کون ہے وہ؟ کون ہے؟'' اس نے دھیمے مگر گلوگیر لہجے میں استفسار کیا تھا۔

عکس واضح ہوا تو ایک دھچکا لگا۔ عام سی صورت میں بہت خاص لڑکی۔ گھٹیا، خودغرض مگر دل پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت رکھنے والی لڑکی۔ قدم ڈگمگائے مگر وہ گرا نہیں۔ زمین گھوم رہی تھی مگر وہ استادہ تھا۔

''اریب تم یہاں؟ خیریت تو ہے ناں؟'' یہ صبا کی آواز تھی۔ جو کچن میں داخل ہونے جا رہی تھی۔ وہ چونکا اور آنکھوں کی سرخی چھپانا چاہی۔

''جی بھابھی۔ بس آنکھ میں کوئی مچھر چلا گیا تھا۔ وہی نکال رہا ہوں۔'' اس نے ہکلاہٹ کو ضبط کیا۔ پانی کے دو چار چھپٹے ایک بار پھر مارے۔ صبا نے اثبات میں گردن ہلا دی اور فریج سے آئس کریم کا ایک بکس نکال کر باہر لے گئی۔

''وہ لڑکی اس قابل نہیں کہ اُس کے بارے میں سوچا جا سکے۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر فرار ہونے کا چور راستہ نکالا تھا مگر دل میں رہنے والے کبھی نکالے نہیں جا سکتے۔ بھلا اریب سے بڑھ کر کون جان سکتا تھا مگر وہ ایسا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دل کی سرخ دیواروں پر نقش ایک وجود اب بند کتاب کے صفحات کا حصہ بن چکا تھا۔

☆......☆......☆

دیکھا جو چاندنی میں گریبانِ شب کا رنگ
کرنیں پھر آسمان کی جانب پلٹ گئیں

معطر خوشبو گلاب کی پنکھڑیوں سے نکل کر کمرے کی ہر شے میں سماتی رہی۔ وہ سرخ رنگ کے حسین و جمیل جوڑے میں بیڈ کے عین وسط میں بیٹھی اپنے ہمسفر کی منتظر تھی۔

نگاہیں جھکی ہوئی، انگلیوں گود میں دوپٹے کو مضبوطی سے تھامے ہوئے، بے لگام سوچیں ایک سنسان منزل کی طرف گامزن تھیں۔ جس منزل کا راستہ سنگ وخار سے بھرا تھا۔ تند ہوائیں اس کے جسم کو نوچ رہی تھیں۔ آسمان کا قہر، زمین کی بے رخی، اس کے وجود کو پامال کر رہی تھی۔ ایسے میں سفید روشنی میں لپٹے ایک وجود کا ہاتھ آگے بڑھا۔ چہرے پر انتہا کا نور تھا۔ وہ اس چہرے کو تو دیکھنے سے قاصر رہی مگر اس وجود کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ تھما دیا۔ دل میں ایک کسک ابھری۔ دل نے اس کا چہرہ دیکھنا چاہا مگر نور کی برسات کے سبب وہ دیکھ نہ سکی۔ وہ مسیحا اس کا ہاتھ تھام کر اس سنسان راستے سے بہت دور لے گیا۔ اتنی دور کہ ہریالی آنکھوں کو نظر آنے لگی۔ آسمان کا قہر، لطیف ہواؤں میں تبدیل ہو گیا۔ بنجر زمین میں بھی ٹھہراؤ آ گیا۔ وہ چونکی۔ پلٹ کر دیکھا مگر نور کم نہ ہوا تھا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا تھا مگر وہ مسکرا دیا۔ اس کے مسکراتے ہی وہ نور جیسے سورج کی کرنوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ بائیں ہاتھ کی اوٹ سے وہ دیکھنے کی ہر ممکن سعی کرتی رہی مگر ناکام رہی۔ اب وہی وجود جو اسے سنسان راستے سے جنت نظیر وادی میں لایا تھا۔ اپنے قدم پیچھے کھسکانے لگا۔ اس کی آنکھیں مزید چندھیا گئیں۔ دل جیسے بری طرح جکڑنے لگا تھا۔ ہجر کے لمحے آنے سے پہلے ہی اس کی جان جانے لگی تھی۔ آنکھیں بے ساختہ اپنے سے دور جاتے وجود پر جا ٹھہریں۔

''اریب......!'' برجستہ اس کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ آنکھ کھلی، ہاتھ سامنے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ خواب سے حقیقت کا سفر طے ہوا تو اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو اسی کمرے میں پایا۔ وہی عروسی جوڑا اس نے زیب تن کیا ہوا تھا۔

آنکھیں دائیں جانب گھومیں۔ دروازہ بند تھا۔ پہلو میں دیکھا تو اریب وہاں موجود نہ تھا۔ دل میں ایک خلش نے جنم لیا۔ وقت دیکھا تو رات کے دو بج چکے تھے۔ وہ چونکی۔ چہرے پر تفکر کے جذبات ابھرے۔

''اریب......'' اس نے سوچا، نگاہیں برجستہ صوفے کی طرف گھومیں تو حسین وجمیل وجود اپنی تابنا کی سمیٹے صوفے پر سمٹا ہوا لیٹا تھا۔ بائیں ہاتھ کو سرہانا بنائے، وہ خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ آنکھیں پرنم دیکھائی دیں۔ مدہم نیلی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی تو اس کا چہرہ نور سے چمک اٹھتا۔

خواب اور حقیقت ایک دوسرے میں ضم ہوئے۔ تعبیر اس کے سامنے تھی۔

اس نے اٹھ کر پاس جانا چاہا مگر خود کی بے رخی نے پاؤں کو جکڑ لیا۔ بدن دھیرے دھیرے بیڈ کی ٹیک کے ساتھ لگتا چلا گیا۔ اپنے الفاظ سماعت سے ٹکرائے۔ اریب کی طرف نظریں گئیں تو جبیں کا یقین سامنے آ گیا۔

☆......☆......☆

آپ کی آنکھ میں کچھ رنگ سا بھرنا چاہے

دل بھی خوابوں کے جزیروں سے گذرنا چاہے

شبِ عروسی نے ان کے درمیان ایک اوٹ بنادی تھی۔ آنکھیں بیدار ہوئیں تو کروٹ بدلی۔ سامنے ایک وجود نظر آیا۔ اس نے بغور دیکھا، وہ اطلس کے جائے نماز پر خدائے بزرگ کے آگے سجدہ کررہا تھا۔ وہ بن دیکھے اس چہرے کو پہچان گیا۔ ہاتھ سر کے نیچے اڑیسا، تھوڑا سا ترچھا ہوا۔ نظروں کو اس وجود پر مرتکز کیا۔ وہ وجود بدستور سجدے میں تھا۔ رب کا شکر ادا کررہا تھا یا شکوہ؟ وہ جاننے سے قاصر تھا۔

اگر وہ اُس کی جگہ ہوتا تو شاید سجدہ شکر کرتا کیونکہ اُس رب نے اس کی سن لی تھی۔ اس کی محبت کو اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس کے پہلوؤں کو محبوب کے حدت محسوس کرنے کی اجازت دی۔ وہ مسکرایا۔ پھر گزرا پل یاد آیا۔ نگاہیں برجستہ بیڈ پر گھومیں۔ وہ وہاں نہ تھا۔ وہ خود اس وقت صوفے پر لیٹا تھا۔ آنکھوں میں تشنگی نے جنم لیا۔ وہ سیدھا ہوکر لیٹ گیا۔ بازوؤں کو سینے پر باندھتے ہوئے نگاہیں چھت پر جمالیں۔

''وہ ضرور رب سے میرا شکوہ ہی کررہی ہوگی کہ کیوں اس نے مجھے اس کا جیون ساتھی بنادیا؟ کیوں میری ذات کو اس کا ہمسفر بنایا۔ شاید میں اس کے قابل ہی نہیں تھا۔ شاید اس کو مجھ سے زیادہ چاہنے والا مل سکتا تھا۔ شاید میں اسے وہ خوشیاں نہ دے سکوں گا جس کی وہ حقدار ہے کیونکہ میرا مقصد ابھی کچھ اور ہے۔ مجھے تو اپنی ذات کے بابت سوالات جاننے ہیں ایسے میں بھلا اُس کا حق کیسے ادا کرسکوں گا؟''

اس نے سوچا تھا۔ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا وجود اپنے آپ سے بیگانہ تھا۔

دھیمے قدم اٹھاتا وجود، اس کی طرف بڑھا مگر وہ بے نیاز تھا۔ نہایت نفیس، بہت مہین ریشم سا لباس پہنے وہ وجود اس کے پاس آکر ٹھہرا تھا۔ چہرے پر سکارف لپٹا تھا۔ آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ نگاہیں برجستہ اریب کے چہرے پر تھیں مگر وہ انجان تھا۔ اپنی ہی سوچوں میں غرق ان حسین لمحوں سے ناشناسا تھا۔ وہ کمر تک جھکی، آنکھیں بند کیں مگر وہ بے نیاز رہا۔ فاصلہ سمٹا تھا مگر اسے خبر نہ تھی۔ محبوب سامنے تھا مگر عاشق انجان تھا۔

کوئی خواب تھا یا پھر ایک چھل؟ وہ ضرور ایک خواب تھا۔ وہ ننگے پاؤں اطلس نما قالین پر نیم جھکی کھڑی تھی۔ لبوں کو مزید اریب کے چہرے کی طرف بڑھایا۔ آنکھیں برجستہ بند ہوئیں۔ لب متحرک تھے، جیسے کوئی ورد کررہے ہوں۔ وہ انجان تھا اور کروٹ تبدیل کرنے جارہا تھا کہ ایک خوشگوار جھونکا اس کے چہرے کو مس کرتا ہوا گزرا۔ معطر، مخموری ہوا نے اس کے چہرے پر گدگدی کی تھی۔ برجستہ وہ پلٹا۔ آنکھوں سے آنکھیں ٹکرائیں۔ سامنے حاعفہ تھی۔ روشن مہتاب سا چہرہ اس پر جھکا ہوا تھا۔ وہ حیران ہوا۔ سانسیں تھم گئیں۔ نگاہوں نے خوب تشنگی بجھائی۔ اس نے دوبارہ پھونکا، پلکیں بند ہوتی چلی گئیں۔ اس بار اس نے سانس لیا تھا۔ اس مخمور ہوا کو اپنی سانسوں میں تحلیل کرتے ہوئے اپنے جسم کا حصہ بنانا چاہا۔

وہ اب پیچھے ہٹ گئی۔ فاصلہ مزید بڑھ گیا۔ وہ ہوش میں آیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نگاہوں نے بغور حاعفہ کو دیکھا تھا۔ جو ایک تمکنت کے ساتھ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اپنے ہاتھوں کو سکارف کی طرف بڑھا کر اسے کھولنے لگی۔ وہ عجیب سی کشمکش میں تھا۔ جانے زندگی اس کے ساتھ کیسا کھیل رہی تھی؟ وہ نہ اس سے دور جاسکتا تھا اور نہ ہی قریب آسکتا تھا۔

''آپ رات صوفے پر کیوں سو گئے؟'' شیریں لہجہ گویا ہوا تو اسے حیرت ہوئی۔ وہ برجستہ اس چہرے کی طرف دیکھتا چلا گیا، جو سکارف کو کھول رہا تھا۔ کھلی زلفیں آزاد ہوئیں۔ وہ ان زلفوں کے حصار میں تھا۔ ہوا کے خوشگوار جھونکوں کے ساتھ محبوب کی سیاہ زلفیں والہانہ انداز میں اس کے چہرے کے گرد رقص کر رہی تھیں۔ اس کے لمس سے مخمور ہو رہی تھیں۔ پھر ہوا کے سکوت میں آنے کے بعد نرمی اور ملائمت کے ساتھ وہ اس کی کمر سے چپک جاتیں۔ وہ انہی پر نگاہیں جمائے کھڑا ہوا تھا۔ بولنا چاہا تو الفاظ بھول گیا، پھر بھی اس نے مختصر جواب دیا تھا۔

''تم ڈسٹرب نہ ہو، بس اس لئے۔'' کیا اسے یہی کہنا تھا؟ اس نے گریبان میں جھانکا۔ نہیں...... اسے تو سچائی بتانا تھی۔ پھر کیوں؟ وہ اس سے سچائی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے بتانا چاہیے تھا کہ اس کے لہجے نے، اُس کی باتوں نے اِس کو ٹھیس پہنچائی۔ اس کی محبت کی توہین کی۔ اس کی چاہت کو آزمانا چاہا اور وہ ہار گیا۔ محبت کے امتحان میں، اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں، وہ بری طرح ہارا تھا۔ بھلا آج تک کوئی اپنے کردار کو بے داغ ثابت بھی کر پایا ہے۔ سچائی ہمیشہ دوسرے کی زبان سے سنی جاتی ہے مگر یہاں تو کوئی دوسرا تھا ہی نہیں۔

وہ نظریں چرا کر پلٹا مگر حاعفہ نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایک کرنٹ اس کے جسم میں دوڑ گیا۔ ایک سرد لہر نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ محبوب کے لمس کو پہلی بار محسوس کرنا کیسا ہوتا ہے؟ وہ محسوس کر رہا تھا۔

ہوا مدہوش تھی، فضا گنگنا رہی تھیں۔ لباس محو رقص تھا۔ سانسوں میں حدت انتہا کی بڑھ چکی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب سی ہونے لگیں مگر وہ استادہ تھی۔ اس کا وجود ساکت تھا۔ کوئی غیر معمولی احساس اس کے جسم میں نہ دوڑا تھا۔ یہ فقط اریب تھا جو ان احساسات کا شکار تھا۔

''یہ آپ نے کیوں سوچا کہ آپ کے بیڈ پر سونے سے میں ڈسٹرب ہو جاؤں گی؟'' وہ اسے وہ مقام دے رہی تھی جو ایک شوہر کا حق ہے۔ وہ چونکا۔ پلٹا تو لبوں پر غیر معمولی کسک دیکھی۔ وہ مسکرا رہی تھی یا ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے یقینی غالب تھی۔ نگاہیں استفہامیہ اس کے چہرے کی طرف یک ٹک دیکھی جا رہی تھیں۔ پیشانی کی لکیریں بول رہی تھیں۔ وہ سمجھ رہا تھا مگر کیا وہ سچ تھا؟ وہ ایک کشمکش میں مبتلا ہوا۔

''مطلب؟'' لب ہکلائے تھے۔

''میں آپ کی بیوی ہوں، آپ کی شریک حیات۔ میرے پاس آنے کے لئے آپ کو کوئی تردد برتنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ کہہ رہی تھی اور سننے والا سن رہا تھا مگر ذہن انہیں تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ ذہن میں پچھلا منظر کسی فلم کی ریل کی طرح چلتا جا رہا تھا۔ بے رخی ...... بے اعتنائی...... غیر یقینیت آج بھی واضح تھی۔ اعتماد پر لگی ٹھیس آج بھی کہیں نا کہیں موجود تھی۔

''مگر......!'' اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ پچھلے الفاظ کو آج پر غالب کرنا چاہا مگر حاعفہ نے مداخلت کی۔ اپنے دائیں ہاتھ کو اس کے لب پر رکھ دیا۔ اسے دوبارہ حیرت ہوئی۔ وقت بڑی تیزی سے بدلا تھا۔ نگاہیں برجستہ اسے دیکھ رہی تھیں۔ محبوب کا لمس جیسے اس کے جسم کا حصہ بنتا جا رہا تھا۔

''مگر کو اپنے ذہن سے نکال دیجیے۔ پچھلی باتوں کو بھول جائیں۔'' وہ پلٹی، اپنا چہرہ گھمایا۔ اب پشت اریب کے سامنے تھی۔ ریشمی لباس پر زلفیں پھسلتی جا رہی تھیں۔ نگاہیں اس کی گردن پر جا ٹھہریں۔

''میں مانتی ہوں کہ نکاح سے پہلے کئی رنجشیں تھیں۔ میں کئی عداوتوں کو میں اپنے دل میں جگہ دیئے ہوئے تھی لیکن نکاح کے بعد میں ان سب باتوں کو بھول چکی ہوں۔ اس رات کو بھی جہاں سے اُن رنجشوں کی شروعات ہوئی تھی کیونکہ نکاح کے بعد پرانی باتوں کی جگہ باقی نہیں رہتی۔ غلطیاں سب سے ہوتی ہیں۔ مجھ سے بھی ہوئی۔ شاید میری غلطی تو سب سے بڑی تھی۔ وہ غلطی نہیں گناہ تھا۔ اپنے آپ کو اعلی و برتر سمجھنا، تکبر کو اپنے دامن میں سمیٹنا لیکن پھر کیا ہوا؟ مجھے اس کی سزا ملی۔ میرے اپنے مجھ سے چھن گئے۔ میرا گھر مجھ سے چھن گیا۔ پھر خدیجہ آپی میری زندگی میں انقلاب لے کر آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے سنبھالا۔ میرا ساتھ دیا۔ ظلمت سے روشنی کا سفر طے کرنے میں مدد کی اور پھر ایک وقت آیا وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ شاید میری آزمائش ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔'' گلوگیر لہجہ اپنی داستان سنا رہا تھا اور وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔

''پھر محبت نے میرے دل میں قدم رکھا۔ جسے میں جھٹلا رہی تھی مگر سچے جذبات بھلا کہاں دبائے جا سکتے ہیں مگر ایک غلط فہمی نے اسے بھی دبا کر رکھ دیا۔ میں دوبارہ اکیلی رہ گئی۔ اپنے آپ کو کوستی، اپنے گناہوں پر نادم ہوتی۔ رب سے دعائیں مانگتی کہ میرے گناہوں کو بخش دے مگر خدا گواہ ہے کہ میں نے کبھی بددعا نہیں دی۔ بس اپنے گناہوں پر شرمندگی کا اظہار کرتی رہی۔ اپنی زندگی میں ہونے والی محرومیوں کا سبب اپنی ذات کو ٹھہراتی رہی پھر کچھ دن پہلے انکل آنٹی میرے پاس آئے تھے۔'' وہ ماضی کے بھنور میں کھو گئی۔ اریب چپ چاپ سنتا جا رہا تھا۔

''انہوں نے تمہارا پروپوزل میرے سامنے رکھا۔ شروع میں، میں بری طرح چونکی تھی۔ اپنے آپ کو ملامت بھی کیا مگر ان کے اصرار پر کچھ نہ کہہ سکی۔ گردن خود بخود اثبات میں ہل گئی۔ ان کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی مگر ان کے کمرے سے چلے جانے کے بعد میں بہت روئی۔ اتنا روئی کہ آنسو ختم ہو گئے۔ شکوہ اس بات کا نہیں تھا کہ انہوں نے میری مرضی کے خلاف میری شادی طے کر دی بلکہ شکوہ اس بات کا تھا کہ میری سزا ابھی تک ختم کیوں نہ ہوئی؟ کیوں میرے غرور کا نتیجہ اتنا بھیانک تھا کہ اس شخص کو میرا ہمسفر بنایا جا رہا ہے جس کا کردار میری نظروں کے سامنے داغدار ہے۔ شاید میں اسی کی حقدار تھی۔ تبھی خاموش رہی۔ لیکن نکاح سے پہلے جبیں کی باتوں نے میرے ضمیر کو جھنجوڑا۔ قرآن کی آیتوں کی میرے سامنے تشریح واضح ہو گئی جہاں اللہ پاک فرماتا کہ نیک عورتوں کے لئے نیک مرد اور گناہگاروں کے لئے گناہگار ہیں۔ میں نے اپنے گناہ سے توبہ کی تو اللہ پاک نے بھی میرے لئے بھی توبہ کرنے والے کو پسند کیا ہے اور توبہ کرنے والے تو اللہ کے قریب ہوتے ہیں۔ ان کو اللہ پسند کرتا ہے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ میرے رب نے فیصلہ میرے حق میں دیا تھا۔ میرے ہم پلہ کو میرا ہمسفر بنایا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے مگر وہ آنسو شکوے کے نہیں بلکہ تشکر کے تھے۔'' یہ الفاظ مکمل ہوتے ہی وہ پلٹی تھی۔ اریب استادہ

تھا۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر اریب کا ہاتھ تھاما۔ وہ کسی کٹھ پتلی کی طرح کھڑا تھا۔ آنکھیں یک ٹک محبوب پر تھیں۔

"مگر اب مجھے آپ کی ذات سے کوئی شکوہ نہیں اریب۔ اب میری فلاح آپ کے ساتھ ہی منسوب ہے۔ میری ذات پر بس اب آپ کا ہی حق ہے۔ میں پچھلی باتوں کو دل سے نکال چکی ہوں۔ آپ بھی بھول جائیں۔ مجھے معاف کر دیں۔" اس نے دونوں ہاتھ جوڑے تھے۔ دل مچل اٹھا۔ ہاتھ بے ساختہ اس کے ہاتھوں کی طرف بڑھے۔ انہیں نیچے کیا۔

"نہیں اریب۔ مجھے معافی مانگ لینے دیجیے۔ شاید دل کو سکون میسر آ جائے۔ میں ہمیشہ سے سکون کی تلاش میں تھی مگر وہ سکون نہ ملا۔ آج نکاح کے بعد وہ سکون ملا تو اسے بھی میں اپنے ہاتھوں سے کھونے جا رہی تھی۔ ایک لڑکی کے لئے اس کا شوہر ہی اس کا آسمان ہوتا ہے۔ اس آسمان سے بے رخی اختیار کرنے کا مطلب ہے خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرنا۔ شوہر تو خدا کا انعام ہوتا ہے اور اس انعام کی ناقدری اسے تباہی کے دہانے کی طرف لے جاتی ہے۔ اریب مجھ میں اب تباہ ہونے کی سکت باقی نہیں ہے۔ میں تھک چکی ہوں اپنی ذات سے فرار ہوتے ہوتے۔ مجھے تسکین چاہئے۔ پناہ چاہئے۔ ایسی تسکین جس کے بعد بے سکونی نہ ہو۔ ایسی پناہ جہاں سے مجھے جلاوطن نہ کیا جائے۔ ہر لڑکی کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میرا ہمسفر فقط میرے بارے میں سوچے، میری ذات کو اپنی سوچوں کا محور بنائے۔ میرے چہرے پر ایک خوشی دیکھنے کی خاطر ہر حد سے گزر جائے۔ لڑکی امیر ہو یا غریب، ملکہ ہو یا پھر باندی خواہشیں ایک سی رکھتی ہے۔ ان سب کا دل اپنے شوہر کے لئے دھڑکتا ہے۔ میرا بھی دل دھڑکا ہے آپ کے لئے اریب۔ نکاح کے بعد میں نے ہر دھڑکن پر آپ کا نام سنا ہے۔ ہر سانس میں آپ کی حدت کو محسوس کیا ہے۔ آپ نے اگرچہ بے اعتنائی برتی مگر اس بے اعتنائی کے پیچھے میں ہی تھی۔ میں بس آپ سے بات کر کے سب کچھ کلیئر کر دینا چاہتی تھی مگر حالات ہی ایسے تھے کہ میں آپ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ رات بھی کافی دیر تک میں آپ کی منتظر رہی۔ بار بار نگاہیں دروازے پر جا کر ٹھہر جاتیں۔ ہر آہٹ میں مجھے آپ کا گمان ہوتا لیکن میری کم نصیبی سمجھ لیجیے یا بدنصیبی میری خواہش پر نیند غالب آ گئی۔ آپ سے بات کرنے کی چاہ دل میں ہی رہ گئی لیکن اب میں مزید وقت ضائع نہیں کر سکتی۔ اریب آپ میرا یقین کریں یا نہ کریں مگر یہی سچ ہے۔ میں پچھلی باتوں کو بھلا کر نئی زندگی کی شروعات کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی کم نصیبی کا بوجھ اکیلے سہتے ہوئے میری کمر جواب دے چکی ہے۔ مجھے ایک کندھے کی ضرورت ہے جہاں سر رکھ کر میں اپنی مدعا بیان کر سکوں۔ ایک ایسی پناہ گاہ چاہیے جہاں مجھے دنیا جہاں کی کوئی فکر نہ ہو۔ بتایئے اریب آپ میرے اس خواب کو پورا کریں گے ناں؟ میرے ساتھ ہمیشہ نبھائیں گے ناں؟ دوسرے رشتوں کی طرح مجھے بیچ راہ میں چھوڑ کر تو نہیں جائیں گے؟" وہ مورت بنے اریب سے استفسار کر رہی تھی۔ آنکھیں استادہ، اس اطلس کے لباس پہنے وجود پر ٹکی تھیں۔ اس نے سانس لیا مگر آنکھوں میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ حیران تھا یا پریشان؟ حاعفہ اندازہ نہ لگا سکی۔ بس اریب کی آنکھوں میں غوطے لگاتی رہی۔ شاید چاہت کا سمندر تھا وہ...... اور وہ اپنی برسوں کی تشنگی بجھا رہی تھی۔ آنکھوں میں نمی ابھری۔ لب خاموش رہے۔

"بتائیں ناں اریب؟ آپ میرا ساتھ دیں گے ناں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مجھ جیسی بیوی آپ کو نہیں ملے گی۔ شاید مجھ سے اچھی

لڑکی آپ کے مقدر میں تھی لیکن میری قسمت مجھے آپ کی زندگی میں لے آئی۔ میرا ہاتھ آپ کے ہاتھوں میں تھما دیا اور میں یہ بات یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ جیسا شوہر مجھے کبھی نہیں مل سکتا تھا۔'' وہ رکی مگر اریب کی نگاہیں نہ جھکیں۔ آج وہ سننا چاہتا تھا۔ برسوں کی تشنگی آج اس کے لفظوں سے بجھانا چاہتا تھا۔

''میں آپ پر زور زبردستی بھی نہیں کر رہی کہ آپ مجھے وہ مان دیں، جس کی ایک بیوی حقدار ہوتی ہے کیونکہ میں جانتی ہوں دل کے ٹوٹنے پر انسان کرچی کرچی ہو جاتا ہے اور اس سے بدلہ لینے کی ایک چنگاری ہمیشہ دل میں کھٹکتی رہتی ہے۔ میں نے بھی کئی بار جان بوجھ کر آپ کے دل کو توڑا ہے۔ ان خوابوں کو کرچی کیا ہے جو آپ نے دیکھے تھے مگر کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے؟ میرے پاس تو کوئی واسطہ بھی نہیں جس کو درمیان میں لا کر معافی کا مطالبہ کر سکوں بس ایک ہی شے ہی جس کی خاطر آپ سے معافی کی طلب گار ہوں۔'' وہ خاموش ہوئی۔ اریب کے لب ہلے۔

''کیا؟'' وہ اتنی گفتگو میں پہلی بار گویا ہوا تھا۔ جھیل سی آنکھیں چمک رہی تھی۔ وجود ڈھیلا سا تھا۔ ہوائیں دونوں کہ زلفوں سے اٹکھیلیاں کر رہی تھیں۔

''یہ نکاح۔ جس نے مجھے آپ کی ذات کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔ بس یہی نکاح ہے، جس کا واسطہ میں آپ کو دے سکتی ہوں۔ اس نکاح جیسی عظیم نعمت کے علاوہ میں کسی اور شے کا واسطہ نہیں دے سکتی۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار سوچ ضرور لیجیے گا کہ میں آپ کے نکاح میں ہوں۔ میری ذات آج سے، بلکہ ابھی سے آپ سے شروع ہو کر آپ پر ہی ختم ہوتی ہے۔ میری سانسیں آپ کی امانت ہیں۔ میرا وجود آپ کا حق ہے۔ بس اسی نکاح کا واسطہ دے کر اپنا مطالبہ پیش کرتی ہوں۔'' وہ خاموش ہوئی تو جیسے ہوا میں سرور ختم ہو گیا۔ ہواؤں کی سرگوشی تھم چکی تھی۔ زلفیں بھی استادہ دیکھائی دیں۔ نگاہیں نگاہوں سے ٹکراتی رہیں۔ ایک مبہم سی عار تھی جو آج شاید گرنے والی تھی۔ وہ معمولی سا آگے بڑھا۔ حاعفہ نے اپنا سر مزید اٹھایا۔ وہ ہر بات آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کرنا چاہتی تھی تاکہ لب سچ کہتے ہوئے ہکلائیں تو نگاہیں سچ عیاں کر دے۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔ دل آرزو کر رہا تھا کہ وہ بولے مگر اس کی زبان تھی کہ مہر لگا کر اس کے انتظار کو طول دے رہی تھی۔ کئی ساعتیں ایسے ہی بیت گئیں۔ باہر کا موسم بھی بدلا۔ جھٹپٹا روشنی میں نہایا تو ایک کرن نے دونوں کے درمیان اپنے وجود کو اجاگر کیا۔ نئی زندگی کی پہلی صبح میں انتہا کا نور تھا۔ یہ نور اپنے پنکھ پھیلائے انہیں اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے تھا۔

''تمہیں کچھ بھی کہنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تم ایک بار میرے سامنے آ جاتی، میں سمجھ جاتا لیکن مجھے اچھا لگا۔ تم نے خود ہمارے رشتے کو آگے بڑھانے کی اجازت دی۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس رشتے کو زور زبردستی سے آگے بڑھایا جائے۔ میں اپنی محبت کو چاہت کے بل بوتے پر حاصل کرنے کا خواہ ہوں، زور زبردستی سے نہیں۔'' اس بار کہنے کی باری اریب کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا، وہ سن رہی تھی۔ پہلی بار وہ اس کے لفظوں کو سننا چاہتی تھی۔ اپنی سماعت میں اس کے لفظوں کے شہد کو اتارنا چاہتی تھی۔

’’تم نے مجھے معاف کر دیا۔ اپنی محبت کا احساس دلایا۔ تمہیں اندازہ نہیں مجھے کتنی خوشی ملی لیکن حاعفہ میں ابھی اس رشتہ کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مجھے کچھ الجھی پہیلیوں کو سلجھانا ہے۔ ان پہیلیوں کو جنھوں نے میرے ذہن کو جکڑا ہوا ہے۔ جن سے میری ذات انتہا کی پریشان ہے۔ جن کو سلجھائے بغیر میں نہ دن میں مجھے سکون پہنچ سکتا ہے اور نہ ہی رات کو راحت۔ میں ہر وقت انہی سوچوں میں غرق رہتا ہوں۔ مجھے ان پہیلیوں کو سلجھانے تک کی مہلت دو۔ میں ہر کڑی کو سلجھا کر اپنی زندگی کو آئینہ تماثل بنانا چاہتا ہوں تا کہ کوئی گرد، کوئی ذرہ ہماری خوشی کو داغدار نہ کرے۔ میں اُس ہر بے چینی کو ختم کر دینا چاہتا ہوں جس نے میری ذات کو ایک سحر میں جکڑا ہوا۔‘‘ وہ رکا، بالکونی کی طرف پلٹا، سورج کی کرنیں پردوں سے چھنتے ہوئے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اس نے پردے کو سرکایا۔ سورج براہ راست اندر داخل ہوا تھا۔ حسین زندگی کی طرف جاتا یہ راستہ انتہائی خوشگوار دکھائی دیا تھا۔

’’میں ایک ایسے وجود کا متلاشی ہوں حاعفہ، جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ جسے میں آج تک دیکھ نہیں سکا۔ جس سے میں کبھی ملا نہیں لیکن وہ وجود مجھ سے جڑی چھوٹی سی چیز کی بھی معلومات رکھتا ہے۔ میں کون ہوں؟ کہاں رہتا ہوں؟ کیا کرتا ہوں؟ کیا کھاتا ہوں؟ ایک ایک بات کا علم ہے اسے۔ میں بس اس وجود تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہوں تا کہ ان سوالوں کا جواب پا سکوں جو میرے دل کی سرخ دیواروں پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو چکے ہیں۔ اگر میں ان سوالوں کا جواب نہ پا سکا تو یقین مانو وہ لکیریں گہری ہوتی چلی جائیں گی اور میری زندگی آگے بڑھنے کی بجائے جمود کا شکار ہو جائے گی اور یہ بات تم جانتی ہو کہ اگر زندگی ایک بار جمود کا شکار ہو جائے تو کوئی خوشی، خوشی نہیں رہتی۔ کوئی راحت، راحت نہیں رہتی۔ بس اضطرابی کیفیت ہوتی ہے یا پھر بے ربط گمانوں کا ایک سلسلہ۔ انسان کڑی سے کڑی جوڑتا ہے پھر خود ہی ان کو توڑ کر نئے سرے سے کوشش کرتا ہے اور یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو کر لحد تک پہنچ جاتا ہے۔‘‘ اریب کی باتیں ختم ہوئی تو دوبارہ خاموشی نے طول پکڑا۔ وہ باہر آسمان پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ پشت حاعفہ کی طرف تھی۔ وہ کبھی پشت کو دیکھتی تو کبھی اس نئی صبح کو۔ اطلس کے قالین پر ننگے پاؤں سورج کی نرم کرنوں کو محسوس کر رہے تھے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ اسے وجود کے قریب آنے کا احساس ہوا مگر پلٹا نہیں۔ وہ مزید آگے بڑھی۔ اپنا ہاتھ اریب کے بائیں شانے پر رکھا۔ نگاہوں کا رخ آسمان تھا۔

’’آپ جہاں جانا چاہتے ہیں جائیں، میں آپ کو کبھی نہیں روکوں گی۔ انسان کو اپنی ذات کے متعلق سب کچھ جاننے کا حق ہے۔ آپ کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ اگر کچھ سوال آپ کو پریشان کرتے ہیں تو آپ کا حق ہے کہ آپ کو ان کا جواب دیا جائے۔ الجھی ہوئی زندگی کبھی راحت کا پیش خیمہ نہیں بنتی۔ اس سلسلے میں آپ بے فکر رہیں۔ میں کبھی آپ کی شناخت کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔‘‘ حاعفہ کے الفاظ پر وہ پلٹا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے پلکیں جھپکیں۔

’’شکریہ۔‘‘ مشکور لہجہ گویا ہوا تھا۔ اس نے اپنا سر اریب کے سینے پر رکھ دیا۔ اریب کا ہاتھ بے ساختہ اس کی پشت کی طرف بڑھا

تھا۔ حسین زلفیں جنہیں دیکھ کر وہ اکثر کھو جاتا تھا۔ آج اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ ان سے کھیل سکتا تھا۔ ان کو گدگدا سکتا تھا۔

''شکریہ تو مجھے آپ کا کہنا چاہئے کہ آپ جیسے چاہنے والا کا مجھے ساتھ ملا۔'' وہ گویا ہوئی۔ سانسوں کی حدت پہلی بار اریب کے جسم سے ٹکرائی تھی۔ سماعت نے اریب کی دھڑکنوں کو سنا تھا۔ ان پر ایک وجد طاری تھا۔ لبوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔ وقت تو جیسے سمٹ چکا تھا۔ دونوں کئی ساعتیں ایسے ہی کھڑے ایک دوسرے میں کھوئے رہے۔

☆......☆......☆

سلسلہ پیار کا آغوش در آغوش بھی ہے

معجزہ یہ ہے کہ تھوڑا سا مجھے ہوش بھی ہے

ولیمے کے فوراً بعد اریب کی واپسی تھی۔ سحر فاطمہ کو یہ سن کر بہت دکھ ہوا۔ ایک بار پھر اریب ان سے دور جا رہا تھا لیکن اس بار سحر فاطمہ کے علاوہ کوئی اور بھی تھا جس کا دل اریب کی جدائی کا سوچ کر تڑپ اٹھا تھا۔ وہ ذات حاعفہ کی ذات تھی۔ بظاہر لبوں پر خوشی تھی مگر دل میں ہجر کی کڑواہٹ انگڑائی لے رہی تھی۔

ولیمہ ختم ہوتے ہی اریب نے اپنے کمرے سے سامان منگوایا تھا۔ ماریہ کے ساتھ حاعفہ بھی گئی۔ موقع کو غنیمت جانا اور اریب نے بھی وہاں سے کھسکنے کی تھی۔ اس کی چوری حسام نے پکڑی تھی مگر خاموش رہا۔

''چلو اچھا ہوا جو تم بھی کمرے میں آگئی، میں یہی سوچ رہا تھا کہ کیسے اکیلے میں بات کروں۔'' اس کا انداز رومانوی تھا۔ وہ دھیمے قدموں سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ماریہ کو اس نے باہر بھیج دیا۔

''بس جلدی سے ان چار پانچ مہینوں میں اپنا کام نمٹائیں اور واپس آجائیں۔'' اس کا لہجہ گلوگیر سا تھا۔ وہ شاید رو رہی تھی مگر آنسو نظر نہیں آئے۔ اریب کے چہرے کا رنگ پھیکا دکھائی دیا۔ شوخ رنگ اترنے لگا۔

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں لیکن۔'' اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''لیکن کیا اریب؟'' وہ برجستہ پلٹی تھی۔ اریب نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اپنے لئے فکر نظر آئی۔ رشتے کتنی جلدی بدل جاتے ہیں؟ حقیقت اس کے سامنے تھی۔ وہ مسکرایا اور اپنے ہاتھوں میں گلاب سے چہرے کو سمویا۔

''مجھے کچھ سوالوں کے جواب جاننے ہیں۔'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''لیکن ان سوالوں کے جواب میں اتنی دور مت نکل جایئے گا کہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اریب کچھ سوال بے معنی ہوتے ہیں۔ ان کے جواب لاحاصل ہیں۔ ہم چاہ کر بھی ان کے جوابوں کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لئے میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کہیں نا جائیں۔ یہی رہیں پاکستان، ہمارے ساتھ۔'' اس نے ایک پل کے لئے توقف کیا تھا۔

''پتا نہیں کیوں دل میں ایک ڈر کھٹک رہا ہے۔ اس ڈر کی نوعیت کیا ہے؟ میں نہیں جانتی۔ بس ایسا لگتا ہے جیسے ہجر کی طویل راتوں کا ایک تسلسل شروع ہونے جا رہا ہے۔ ہجر بھی ایسا جو مسافتوں کو بڑھا دے گا۔ جو محبتوں کو مٹا دے گا۔ ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ میں نہیں جانتی۔'' وہ تفکر و خفگی کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

اریب مسکرایا اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

''اتنے خطرناک جذبات میری زوجہ محترمہ کے؟ خدا کی پناہ۔'' اس نے مزاح کی طرف بات کا رخ بدلنا چاہا تھا۔

''آپ مزاح میں بات کو تبدیل نہ کریں۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' اس نے وضاحت کی۔

''میں جانتا ہوں، میری جان۔'' اس نے دوسری بار اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا۔ لبوں کی چاشنی اس کی پیشانی پر ثبت ہو چکی تھی۔

حاعفہ نے اریب کے دونوں ہاتھوں کو مضبوطی سے کسی بچے کی طرح تھام لیا۔

''مجھ سے وعدہ کریں، آپ کبھی اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈالیں گے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں کہ میں آپ کے نکاح میں ہوں۔ آپ کے پیچھے آپ کی فکر کرنے والی ایک بیوی ہے۔ جس کی امیدوں کا مرکز صرف اس کا شوہر ہے۔'' مژگان کے کنارے چمکنے لگے تھے۔ اس کے جسم میں ایک جھرجھری ہوئی۔ اس نے انگوٹھوں سے ان موتیوں کو پونچھا۔

''ان موتیوں کو بہا کر ضائع مت کرو۔ یہ موتی آفتاب سے زیادہ قیمتی ہیں۔'' وہ مخمور لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''اور میرے لئے آپ ان آنسوؤں سے بھی زیادہ قیمتی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں بہت کچھ کھو چکی ہوں۔ اب مزید کھونے کا حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔'' گلے میں آنسو اٹک رہے تھے۔ وہ چونکا۔ نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم نے سوچ بھی کیسے لیا کہ کوئی تمہیں مجھ سے جدا کر سکتا ہے؟ حاعفہ اور اریب اب کبھی جدا نہیں ہونگے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں اور ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے۔'' اس نے حاعفہ کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ دل کی دھڑکنیں ایک ساتھ دھڑک رہی تھی۔

''شکریہ، اریب آپ کا بہت بہت شکریہ۔'' وہ تشکر کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ اریب بھی خاموش رہا بس اس لمحے کو یادوں میں نقش کرتا رہا۔

☆......☆......☆

یاروں کی خموشی کا بھرم کھولنا پڑا

اتنا سکوت تھا کہ مجھے بولنا پڑا

ایک بار پھر وہ اسی دیس میں تھا جہاں سے ایک نئی کہانی کا آغاز ہونا تھا۔ لیکچر شروع ہونے میں دو منٹ رہتے تھے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھا موبائل پر حاعفہ کی تصویر دیکھ رہا تھا۔ ہنستا مسکراتا چہرہ آنکھوں میں جیسے اترتا چلا گیا۔

''کیا ہو رہا ہے مسٹر؟'' یہ کرن تھا۔ جو سامنے سے آ رہا تھا۔ اریب نے فی الفور موبائل آف کیا اور مسکراتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''کچھ خاص نہیں۔ فیملی فوٹو دیکھ رہا تھا۔'' اس نے ابھی تک اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ کرن نے حیرت سے شانے اچکائے۔

''ویسے اتنے دن کہاں غائب رہے؟ یونیورسٹی آف تھی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں بندہ اپنی شکل بھی نہ دیکھائے۔ نمبر بھی تمہارا مسلسل آف جا رہا تھا۔ بے چاری ایشا تو تمہارا نمبر ڈائل کر کر کے بری طرح ہلکان ہو گئی تھی۔'' وہ ضرورت سے زیادہ ایفی شنسی مار رہا تھا۔ وہ مسکرایا۔ پلٹا تو ایشا تھی۔ وہ سمجھ گیا۔ وہ ایسا ایشا کو چڑانے کے لئے کہہ رہا تھا۔

''جھوٹ بولنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔'' وہ چڑ کر بولی تھی۔ ایک بار پھر وہی کھیل شروع ہو چکا تھا۔

''میرے خیال سے باقی کا جھگڑا کلاس کے ختم ہونے تک ملتوی کر دیا جائے تو اچھا ہو گا کیونکہ کلاس کا وقت شروع میں ہونے میں صرف پانچ سیکنڈ بقایا ہیں۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا تھا۔ اپنے قدم لیکچر روم کی طرف بڑھائے تو تینوں مسکرا دیئے۔ اریب کلاس میں سیکنڈ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ہی چیئر کھسکا کر ایشا براجمان ہوئی۔ جس پر اس نے توجہ نہ کی۔ بے چارے کرن کو فورتھ رو میں جگہ ملی۔ وہ وہیں براجمان ہو گیا۔

مسٹر سٹیورڈ کا لیکچر اپنے اختتام کو پہنچا تو وہ دونوں باہر کی طرف چل دیئے۔ آج ایشا عام دنوں سے زیادہ خوشگوار موڈ میں تھی۔ لبو ں پر ایک کسک تھی، جو کسی سے بھی ڈھکی چھپی نہ تھی۔ وہ کرن اور اریب اس وقت آڈیٹوریم کے عقبی حصے والے لان میں تھے۔ جہاں دوسرے سٹوڈنٹ آج نہ تھے۔ آسمان ابر آلود تھا۔ نہ بارش کا امکان تھا اور نہ ہی دھوپ کا۔ وہ تینوں ایک بینچ کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میں تم سے ایک بات کرنا چاہتی تھی۔'' ایشا یک دم پلٹی۔ نگاہیں اریب پر مرکوز تھیں۔ اریب سے زیادہ کرن شش و پنج میں مبتلا تھا۔ اریب نے گہری نگاہ اس کے وجود پر ڈالی تو پہلی بار اسے پڑھنے میں ناکام رہا۔ کئی باتیں تھیں مگر ہر بات کا سرا اس کی ذات پر آ کر رک جاتا۔ اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے اور آگے بڑھ دیا۔

''اتنی بے رخی؟ خیریت تو ہے ناں؟ اگر کوئی ہمیں اتنے پیار سے کہتا تو ہم تو لازماً رک جائے۔'' کرن نے شوخ بھرے لہجے میں کہا اور جست لگا کر اریب کے ساتھ آ بیٹھا۔

''بات تو بیٹھ کر بھی ہو سکتی ہے اور ویسے بھی مجھے کچھ پوائنٹس نوٹ کرنے تھے۔ ہاٹل جا کر وقت ملے یا نہ ملے۔'' اس نے سامنے دیکھا مگر ذہن تو کہیں اور ہی منڈلا رہا تھا۔ بے دلی سے وہ مسکرایا۔

''لیکن اریب مجھے بہت ہی اہم بات کرنی ہے تم سے۔ اسے کچھ دیر کے لئے ایک سائیڈ پر نہیں رکھ سکتے کیا؟'' وہ دفعتاً آگے بڑھی تھی اور اس کے ہاتھوں سے رجسٹر کھینچ کر کرن کو پکڑا دیا۔ وہ ہکا بکا ان کو دیکھتے رہا۔ بنا کسی تاثر کے آنکھیں اب اسی کو تک رہی تھیں۔

''بہت ضدی ہو تم۔ بولو کیا بات ہے۔'' اس نے شانے اچکائے اور دونوں ہاتھ بینچ پر رکھ کر کندھوں کو جھٹکا دیا۔ وہ مسکرائی اور اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکالا۔ اریب کی نگاہیں تو آسمان میں اڑتے پرندوں پر تھیں۔ جو پنکھ پھیلائے بغیر کسی ڈر کے اڑتے جا رہے تھے۔ نہ انہیں غم روزگار تھا اور نہ ہی کسی کے حملے کا۔ اپنی ہی مستی میں گم، ہواؤں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے پرندے۔

کاش وہ بھی انہی پرندوں میں سے ایک ہوتا۔ فضاؤں میں اڑتا، دل کھول کر اونچائیوں کو چھوتا اور پستی کی طرف پرواز کرتا۔ پھر فلک کو چھونے آسمان کی راہ لیتا اور پھر زمین کی گہرائیوں کی طرف چلا آتا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ آنکھوں میں ایک کسک ابھری۔

''میں نہیں جانتی کہ مجھے کہنا چاہیے کہ نہیں لیکن پھر بھی میں تمہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تمہیں چاہتی ہوں، کیا تم میرا ساتھ نبھاؤ گے؟'' وہ ہاتھ میں پروپوزل کارڈ لئے گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی۔ وہ یک دم چونکا۔ اس کی طرف دیکھا تو وہ کارڈ اس کی طرف بڑھا ہوا تھا۔ آنکھوں میں دیکھ کر سچائی جانچنا چاہی تو دل نے تصدیق کی۔

سماعت کو یہ الفاظ جانے پہنچانے لگے۔ ماضی کا سفر طے کیا گیا تو اس طرح کے ملتے جلتے الفاظ کچھ عرصہ پہلے ہانیہ نے بھی کہے تھے اور آج ایشا بھی یہی کہہ رہی تھی۔ وہ بنا پلکیں جھپکے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ کوئی تاثر تھا اور نہ ہی کوئی شکن۔ سپاٹ نگاہیں بس دیکھتی جا رہی تھیں۔ کرن بھی حیران تھا مگر لبوں پر مہر تھی۔

''بولو نہ اریب؟ کیا تم مجھے پسند کرتے ہو؟'' اس نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس بار اسے کرنٹ لگا تھا۔ نگاہیں ہاتھوں کی جانب گھومیں تو ایک لمس نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

'' بس ایسا لگتا ہے جیسے ہجر کی طویل راتوں کا ایک تسلسل شروع ہونے جا رہا ہے۔ ہجر بھی ایسا جو مسافتوں کو بڑھا دے گا۔ جو محبتوں کو مٹا دے گا۔ ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ میں نہیں جانتی۔'' حاعفہ کا ڈر سامنے آیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ اپنا ہاتھ ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔

''سوری ایشا۔'' اس نے نظریں چرا کر کہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔

''کیونکہ میں نے تم سے ایک بات چھپائی۔'' اریب کے جملے نے دونوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ کرن بھی کھڑا ہوا۔ حیرانی سے آگے بڑھا مگر دونوں نے وہ بات پوچھنے پر استفسار نہ کیا۔ کچھ پل کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی گویا ہوا تھا۔

''میں پاکستان گیا تھا۔ وہاں میری شادی ہو چکی ہے اور میں اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ یک دم پلٹا تھا۔ آنکھوں میں کسی اپنے کی محبت تھی۔ لبوں پر اس کی چاشنی رس گھول رہی تھی۔ ایشا یہ بات سن کر جتنا حیران ہوئی تھی۔ اس سے کہیں بڑھ کر کرن ہوا تھا۔ دونوں یک ٹک اریب کو ہی دیکھ رہے تھے۔ اریب ایک قدم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود کارڈ پکڑا۔ نگاہیں برجستہ اریب کی حرکت کو نوٹ کر رہی تھیں۔ آنکھوں میں نمی ابھر آئی تھی۔

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں ایشا۔'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا اور وہ کارڈ لینے کے بعد کرن کی طرف بڑھا۔ کرن کی استفہامیہ آنکھیں اسی ذات پر مرکوز تھیں۔

وہ کارڈ اریب نے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اریب نے اثبات میں گردن ہلائی اور دوبارہ ایشا کی طرف پلٹا۔

''لیکن میں تمہاری منزل نہیں ہوں۔ تمہاری منزل کرن ہے۔ وہ بہت محبت کرتا ہے تم سے۔ کرن سے بڑھ کر تمہیں کوئی چاہنے والا نہیں مل سکتا۔'' اس نے پورے یقین کے ساتھ کہا تھا۔ گردن میں ذرا سا خم دیتے ہوئے وہ رندھی ہوئی آواز میں گویا ہوئی۔

''تم بھی نہیں؟'' اس بار وہ نظریں چرانے کے حق میں نہ تھا۔

''ہاں...... میں بھی نہیں۔'' لہجے میں یقین کا عنصر تھا۔ کئی لمحے خاموشی رہی۔ پھر اریب نے کرن کے ہاتھ میں ایشا کا ہاتھ تھما دیا۔

''تم دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہو۔ ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش رہو گے۔'' وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''مگر......؟'' اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ نمی آنسو کی شکل اختیار کر گئی۔ دل روہانسا اسے دیکھ رہا تھا۔

''مگر وگر کچھ نہیں۔ دیکھو ایشا، بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرا نکاح ہو چکا ہے اور میں اپنی بیوی کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ میں اس کے ساتھ اتنی بڑی بے وفائی نہیں کر سکتا۔ جہاں تک تمہاری چاہت کا سوال ہے۔ محبت اتنی جلدی نہیں ہوتی۔ تم اور کرن ایک عرصے تک ایک ساتھ رہے ہو۔ دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہو۔ ایک دوسرے سے جھگڑتے ہو مگر اس جھگڑے میں بھی پیار کا ایک پہلو چھلکتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے، کرن کے دل میں تمہارے لئے محبت کا جذبہ اور تمہارے لہجے میں بھی اس کا عکس نمایاں ہے۔ بس تم اس سے غافل ہو۔ اپنی تمام تر سوچوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کرن کی محبت کو ایک موقع دو۔ مجھے یقین ہے تمہیں کرن میں ایک پیار کرنے والا شوہر نظر آئے گا۔'' وہ کہتا جا رہا تھا۔ آنکھیں آنسو بہاتی جا رہی تھیں۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور برجستہ پلٹ کر وہاں سے چل دی۔

''ایشا۔'' کرن نے ہاتھ بڑھا کر روکنے کی کوشش کی تھی مگر اریب نے اسے جانے سے روک دیا۔

''نہیں کرن۔ اسے اکیلا رہنے دو۔ اسے سوچنے دو۔ دیکھنا جب وہ اس غم سے باہر آئے گی تو اس کے دل میں فقط تمہارے لئے ہی جذبات ہوں گے۔'' اریب کی باتوں میں ایک امید تھی۔ تبھی وہ خاموش رہا مگر بے چین دل کو بھلا اتنی جلدی قرار کہاں ممکن تھا؟

''حاعفہ...... ہانیہ...... اور اب ایشا؟'' اس نے دل میں سوچا تھا۔ آنکھیں اس راستے کی طرف گئیں۔ جس نے کچھ دیر پہلے ایشا کے قدموں کو بوسا دیا تھا۔ ہری ہری گھاس قدموں کے نشانات اپنے اندر پیوست کر چکے تھے۔

''لیکن میرا وجود فقط حاعفہ کا ہے اور کسی کا نہیں۔'' وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں محبت کی سرشاری دیکھی جا سکتی تھی۔

☆......☆......☆

خزاں کی دھوپ میں مدت سے جل رہا ہوں میں

بنا تھا برف کا پیکر، پگھل رہا ہوں میں

آج بھی اس نے عالمگیر انڈسٹریز کا دورہ کیا تھا۔کام اپنے معمول پر تھا مگر سٹاف والے اس کو دیکھ کر ایک بار پھر چونکے ضرور تھے۔

"چونکنے کی بات نہیں ہے۔اب میرا یہاں آنا جانا چلتا رہے گا۔" اس نے ریسپشن پر کہا تھا۔بے چاری کے لئے اگلا سانس لینا بھی محال تھا۔وہ دل میں ہنس دیا۔سب اپنا کام وقت پر تو کر رہے تھے مگر کاہلی نے یہاں بھی بسیرا کیا ہوا تھا۔

"آپ کے لئے ایک کیبن کا بندوبست کریں؟" مینیجر نے ادب کے ساتھ پوچھا تھا۔اس نے ایک نظر چاروں طرف گھمائی۔

"مجھے نہیں لگتا یہاں کسی نئے کیبن کے بننے کی گنجائش ہے۔ہاں البتہ آپ اپنا کیبن دینا چاہیں تو مجھے اعتراض نہیں ہوگا۔" اس نے کھلبلی چھوڑی تھی۔مینیجر کو ایک ہچکی آئی۔وہ مسکرا دیا۔ریسپشنسٹ بھی ہکا بکا رہ گئی۔

"جی؟" وہ گلے کو کھنکارتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

"جی......لیکن تھینکس۔میں یہاں ایک کیبن میں بیٹھ کر ہدایات جاری کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔میرا کام انڈسٹری کو رواں دواں رکھنا ہے اور میں یہ کام چلتے پھرتے ہی کرنے کے حق میں ہوں۔" اس نے بات کی وضاحت کی۔مینیجر کو سکھ کا سانس آیا۔اس کا کیبن تو بچ گیا۔

"لیکن جب تک میں یہاں پر ہوں، نو سستی، نو کام چوری۔ورنہ الٹیمیٹم......" اس نے شانے اچکائے اور باہر کی طرف چل دیا۔

"کیسا لڑکا ہے یہ؟" ریسپشنسٹ دھیمے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔وہ سن چکا تھا تبھی مسکرا دیا مگر پلٹا نہیں۔انڈسٹری سے نکلنے کے بعد سکیورٹی گارڈز نے اسے سلام کیا۔وہ مسکرایا، جواب دیا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھا۔آج بھی وہاں اِندر تھا۔نگاہیں برجستہ سامنے اٹھیں تو وہاں وہی بورڈ تھا۔

"ابدال گروپ آف انڈسٹریز۔" وہ حیرت کا شکار ہوا۔اگرچہ وہ کچھ عرصے تک اس بات سے غافل رہا تھا اور آج پھر وہی بورڈ دیکھتے ہی پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔

اِندر کے ساتھ ہونے کی بنا پر وہ وہاں نہیں جا سکتا تھا۔رات بھر وہ سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے؟ کیسے کسی کو بنا بتائے وہاں جائے۔تبھی اس نے پلان بنایا۔کرسن کو میسج کیا کہ کل وہ یونیورسٹی نہیں آ سکے گا۔کچھ ضروری کام ہے لیکن وہ معمول کے مطابق تیار ہوا۔سب نے ہنستے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا۔علوی ناشتہ لائی جب کہ ہاٹل سے نکلتے ہوئے پریشے کی مسکراہٹ نے الوداع کہا۔اِندر بیک ڈور اوپن کئے کھڑا تھا۔وہ بیٹھا اور چپ چاپ یونیورسٹی کی طرف چل دیا۔

یونیورسٹی پہنچ کر وہ باہر آیا اور ایک قدم یونیورسٹی کے اندر چل دیا۔اِندر نے کار ریورس کی اور جب اسے یقین ہو چلا کہ وہ کار لے کر جا چکا ہے تو اریب باہر آیا۔

"اب راستہ صاف ہے۔ مجھے وہاں جانا ہوگا" وہ اب ایک ٹیکسی کا منتظر تھا۔ کچھ دیر میں ٹیکسی آتی نظر آئی۔ اس نے پتہ بتایا اور وہاں چل دیا۔

"اس طرف تو تمام انڈسٹریز ہیں۔ آپ کو کوئی اسائنمنٹ ملی ہے کیا؟" ڈرائیور نے پوچھا تھا۔

"جی ہاں۔" اس نے سپاٹ انداز میں جھوٹ بولا تھا اور ونڈ سکرین سے باہر جھانکتا رہا۔ کچھ دیر میں وہ اس انڈسٹری کے باہر تھا۔ اریب نے باہر آ کر کرایہ دیا۔

"واپس جانا ہے کیا؟" اس نے خوش اخلاقی سے استفسار کیا تھا۔

"نو تھینک یو۔" یہ کہہ کر وہ پلٹا اور اس فلک بوس انڈسٹری کا جائزہ لیا۔ شیشے کی دیواروں سے بنی یہ انڈسٹری ہر شے کو اپنا عکس دیکھا رہی تھی۔ خود اریب بھی اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ ایک گارڈ جو دور کھڑا تھا۔ اسے روکنے کے لئے آگے نہ بڑھا۔ اس کے قدم دھیمے انداز میں اندرونی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"آج تم میرے سامنے آکر ہی رہو گے ابدال۔ میں تمہارا چہرہ دیکھ کر دم لوں گا۔" اس نے سوچا تھا اور آگے بڑھا۔ چار سٹیپ چڑھنے کے بعد اندرونی دروازہ تھا۔ لیزر بیم کے درمیان سے گزرنے کی وجہ سے دروازہ خود بخود وا ہوا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ عالمگیر انڈسٹریز سے بھی زیادہ پرکشش انڈسٹری کو اپنے سامنے دیکھا۔ بائیں جانب ریسپشنسٹ تھی۔

"جی آپ کو کس سے ملنا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ابدال صاحب سے؟"

"آپ نے اپائنٹمنٹ لی تھی؟"

"نہیں۔"

"سوری پھر آپ ان سے نہیں مل سکتے۔" اس جواب نے اسے مایوس کیا مگر دوسری راہ اس نے فوراً نکال لی۔

"ان سے کہیے گا کہ آپ کے بہت ہی خاص دوست آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ انتظار کیجیے۔ میں کال کر کے پوچھتی ہوں۔" وہ سامنے ویٹنگ ایریا میں بیٹھ گیا۔ یہ انتظار کتنا زیادہ تھا؟ پانچ منٹ ......دس منٹ......بیس منٹ......نہیں یہ تو ایک گھنٹے سے بھی تجاوز کر گیا۔ بعد میں آنے والے اندر چلے گئے مگر اسے اندر جانے کی پرمیشن نہ ملی۔ وہ اشتعال کے ساتھ کھڑا ہوا۔

"دیکھیے۔ میں ایک گھنٹے سے انتظار کر رہا ہوں مگر آپ کے باس نے مجھے ابھی تک نہیں بلایا۔"

"جی، میں نے کال کر دی ہے۔ جب وہ آپ کو آنے کا کہیں گے تو میں آپ کو بتا دونگی۔ آپ برائے مہربانی! وہاں بیٹھ کر انتظار

کیجیے۔" اس نے زرا تلخ لہجے میں کہا تھا۔ شاید پیچھے سے ایسا کرنے کو کہا گیا تھا۔ وہ پلٹا، پیچھے سے ایک کسٹمر نے ابدال کے کمرے کے بابت سوال کیا۔ وہ چونکا مگر بنا پلٹے ان کی گفتگو کو سنتا رہا۔

"جی ان کا کیبن، تھرڈ فلور پر بائیں جانب ہے۔" وہ مسکرایا اور اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پانچ منٹ بعد دوبارہ ریسیپشن پر آیا۔ وہ غصے میں اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"دیکھیے......!" اریب نے بات کاٹ دی۔

"میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ یہاں واش روم کہاں ہے؟" اس سوال پر وہ پرسکون دیکھائی دی۔ اریب شاطرانہ مسکرایا تھا۔ اس نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ وہ اس راستے کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ واش روم میں جانے کی بجائے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

"تم چاہے جتنا بھی بچنے کی کوشش کرلو ابدال۔ میں تم تک پہنچ کر ہی دم لوں گا۔" وہ دل میں سوچ رہا تھا اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔

وہ وقت کو ضائع کرنے کے حق میں نہ تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ ابدال کے کیبن کے عین سامنے تھا۔ گلاس ڈور کے آگے نفیس پردے گرے ہوئے تھے۔ تبھی اندر دیکھنے سے وہ قاصر تھا۔ کئی لمحے باہر کھڑے وہ اس ڈور کی طرف دیکھتا رہا۔ قدم بڑھایا تو سانسیں سمٹ گئیں۔ راز افشاں ہونے جا رہا تھا۔

"عالمگیر انڈسٹریز کو کسی بھی قیمت پر برباد کردو۔ سمجھے تم۔" اندر سے کرخت آواز سنائی دی۔ لہجہ جانا پہنچانا لگا۔ اس کے جسم میں ایک لہر سرایت کرگئی۔ وہ ہینڈل کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

"اس سال سب سے زیادہ گھاٹے میں جانے والی کمپنی فقط عالمگیر انڈسٹریز ہونی چاہیے۔" اب اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں چھائی سفید روشنی آنکھوں میں چبھنے لگی۔ یک دم خاموشی چھا گئی۔ وہ لہجہ بھی سماعت کی حدود سے باہر ہو گیا۔

اس کا پورا وجود دہک رہا تھا۔ گھورتی آنکھیں سامنے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ جو اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں فون تھا۔ شاید کسی سے بات کر رہا تھا۔ بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ وجود اس کے قدم سے دو انچ بڑا تھا۔ جسامت تقریباً اسی جیسی تھی مگر چہرے کے خدوخال کا اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ قدموں کی آہٹ پر بھی پلٹا نہ تھا۔

"بس، بہت ہو گیا مسٹر ابدال۔ تمہارا کھیل ختم۔ مجھے تمہارا سارا پلان سمجھ آچکا ہے۔ تم میرے ذریعے میرے بابا جان کا بزنس تباہ و برباد کرنا چاہتے ہو ناں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں تمہیں تمہاری چالوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دونگا۔" وہ سخت لہجے میں کہہ رہا تھا جبکہ وہ خاموشی سے پشت دیکھائے کھڑا تھا۔ جیسے انسان نہ ہو کوئی مورت ہو۔ سانس لینے کی بھی جنبش نہ تھی۔

”اتنے سالوں تک تم میری نیند کے دشمن رہے ہو۔آج میں ان سب سوالوں کا جواب تم سے حاصل کر کے ہی دم لوں گا۔“ وہ آگے بڑھ رہا تھا مگر وہ خاموش تھا۔

”اب خاموش کیوں ہو؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ بس فون پر بولنا آتا ہے کیا؟“ وہ اسے دھمکا رہا تھا مگر اس کے لبوں کی مسکراہٹ وہ عقب پر کھڑا محسوس کر سکتا تھا۔وہ اب اس کے عین پیچھے کھڑا تھا۔اپنا ہاتھ اس کے شانوں تک بڑھایا تو وہ برق رفتاری سے پلٹا۔آنکھیں یک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔دل کی دھڑکنیں بھی جیسے سکوت کا شکار ہو چکی تھیں۔

”ویلکم مسٹر اریب اِن مائے کمپنی۔“اس نے خوش اخلاقی سے کہا تھا جبکہ اس بار خاموش رہنے کی باری اریب کی تھی۔نگاہیں اس وجود کے چہرے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔کستوری جسم،بیضوی چہرہ،سیاہ بال،چمکتی آنکھیں،دودھیا رنگت۔اس کا چہرہ دیکھتے ہی اسے کسی کا خیال آیا تھا۔وہ اس چہرے کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔وہ اس کا عکس پہنچانتا تھا مگر کیسے؟یاد نہیں۔

”تو تم نے مجھ تک رسائی حاصل کر ہی لی۔بہت شاطر ہو چکے ہو تم۔“وہ ایک ادا کے ساتھ رولنگ چیئر پر بیٹھا تھا۔آنکھوں میں ایک کسک تھی جسے اریب سمجھنے سے قاصر تھا یا شاید اس کسک کو پہلے دیکھ چکا تھا مگر یادیں مبہم سی تھیں۔

”تو کیسا لگا مجھ سے مل کر تمہیں؟مسٹر ابدال سے ملکر۔جسے تم کئی خطابات سے نواز چکے ہو۔“وہ استفسار کر رہا تھا مگر وہ اس کلین شیو حسین چہرے کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس نے آخر اس خوبرو کا کیا بگاڑا تھا؟

”وہ خطابات تو مجھے اب یاد بھی نہیں۔شاید ان میں سے ایک رزیل بھی تھا۔“وہ کچھ سوچتے ہوئے کہہ رہا تھا جبکہ وہ ابھی تک اس کی ذات سے باہر ہی نہ آیا تھا۔

”رزیل......ہاں وہ رزیل ہی تھا لیکن افسوس میں رزیل سے بھی بڑھ کر ہوں۔“وہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ ہنسا تھا۔اریب کو چبھن محسوس ہوئی۔اس کی طنزیہ نگاہوں کو دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھا۔

”کیا ہوا؟اب تمہارے لبوں پر مہر کیوں لگ گئی؟پہلے تو بہت چپڑ چپڑ کر رہے تھے۔“اس نے استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔اریب چونکا۔وہ خود حیران ہوا۔جانے کیوں اس کے لبوں کو مہر لگ چکی تھی۔اس نے بولنا چاہا مگر بولا نہ گیا۔لفظ ہی نہ ملے۔اس نے آسمان سے الفاظ استعار لینا چاہے مگر اس نے دروازے بند کر لئے۔زمین کی گہرائی میں اتر لفظوں کو ڈھونڈا مگر سوائے خاک کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ہواؤں نے بھی بے رخی دیکھائی۔وہ حیران تھا۔اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔جو اسے جانا پہنچانا لگا تھا مگر یاد نہیں آرہا تھا۔

”نہیں یہ کیا میں سوچ رہا ہوں۔سامنے کھڑا میرا دشمن ہے۔جس نے ایک عرصے تک میری راتوں کی نیند کو قتل کیا۔جس نے مجھے غلاظت میں پھینکنا چاہا۔جس نے میرے بابا جان کے بزنس کو تباہ کرنا چاہا۔میں ایسے شخص کے ساتھ کیسے کسی بندھن کی امید کر سکتا ہوں؟“خود ہی اس نے اپنی سوچوں کی تردید کی۔

''یہ فقط میرا دشمن ہے اور مجھے بھی دشمن کی طرح اس کے ساتھ پیش آنا چاہیے۔'' اندر سے ایک آواز آئی تھی۔

''ایک تو تم سوچتے بہت ہو۔ اگر کوئی بات کرنی نہیں تھی تو اپنا اور میرا وقت کیوں ضائع کیا؟ جاؤ جا کر اپنی کلاس جوائن کرو۔ یوں بلا وجہ چھٹی کرنا اچھی بات نہیں ہے۔'' وہ چونکا۔ یعنی اس کو معلوم تھا کہ وہ اس سے ملنے آ رہا ہے اور وہ اس کی کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ اس کی ملاقات بھی طے شدہ تھی۔ وہ سچ میں چکرا کر رہ گیا۔

''تم میرے ساتھ کھیل رہے تھے؟'' وہ حیرت سے گویا ہوا تھا۔ جواب میں ایک قہقہہ گونجا۔

''کیوں کر رہے ہو تم میرے ساتھ؟'' سوال ختم نہ ہوئے تھے مگر وہ جواب دینا نہیں چاہتا تھا۔ ٹیبل کی جانب مڑا۔ وہاں گلدستہ تھا۔ وہ اٹھایا اور اریب کی طرف لایا۔

''شادی کی بہت بہت مبارک ہو۔ سوری میں تمہاری شادی میں نہیں آ سکا۔ یہ میری طرف سے ایک معمولی سا گفٹ۔'' اس بات پر وہ حیران نہ ہوا۔ بلکہ اس گلدستے کو بے دردی کے ساتھ زمین پر پٹخ دیا۔

''میں زہر لینا پسند کروں گا مگر تمہارے ہاتھوں سے خوشبو نہیں۔'' جبڑے بھینچتا ہوا وہ گویا ہوا۔

''اس کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ وہ تو میں تمہیں دے رہا ہوں۔ جو دھیرے دھیرے تمہارے وجود کو تہس نہس کر رہا ہے۔'' اس کے استہزائیہ انداز میں عجب کاٹ تھی۔ وہ چکرایا۔ پلکیں جھپکیں اور اسے یک ٹک دیکھنے لگا۔

''میرے زہر نے تو تمہیں واپس یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا اور اریب خاموشی سے سن رہا تھا۔

''اب میرا زہر دیکھنا، تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑے گا۔ تم واپس چلے جاؤ۔ ورنہ میرا اگلا وار سہہ نہیں سکو گے۔'' اس نے چیلنج کیا تھا۔ وہ حیران ہوا مگر خاموش رہا۔ وہ ٹیبل کی طرف گیا۔ رنگ بجائی، ایک کلرک اندر آیا۔

''ان موصوف کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔'' اس کے انداز میں کاٹ تھی۔ وہ دیکھتا رہ گیا۔ سوال جو ذہن میں کھٹک رہے تھے، جانے کیوں وہ بھول چکا تھا۔ پیشانی کی لکیریں بھی وضاحت کرنے سے قاصر تھیں۔ اس کلرک نے اس کا بازو پکڑا تو اریب نے اسے جھٹک دیا۔

''دیکھ لوں گا میں تمہیں مسٹر!'' وہ حقارت سے ابدال کو دیکھ رہا تھا مگر اس حقارت کا بھلا اس پر کہاں اثر ہو سکتا تھا؟ بے رخی سے گردن جھٹکی اور موبائل پر ایک نمبر ڈائل کیا۔

''آئندہ یہ لڑکا اس بلڈنگ کے آس پاس بھی نظر آیا تو تمہاری خیر نہیں۔'' اس نے سخت الفاظ میں دھمکی دی تھی۔ اریب ان الفاظ کو سن چکا تھا۔

''رذیل۔'' ایک بار پھر وہی الفاظ دل سے نکلے تھے۔

☆......☆......☆

ہم پرکھتے کیا مزاج زندگی

تھا مزاج رنگِ آب و گل بہت

حاعفہ کا انداز اب کافی حد تک بدل چکا تھا۔ پہلے وہ الگ تھلگ رہتی تھی مگر نکاح کے بعد اس نے سب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا۔ سحر فاطمہ کا ہر کام میں ہاتھ بٹاتی۔ صبا کا خیال رکھتی۔ اسے کوئی کام کرتا دیکھ لیتی تو وہیں ٹوک دیتی۔

''بھابھی آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو مجھے کہاں کریں ناں۔ ایسے کوئی اس حالت میں کام کرتا ہے؟'' انداز میں محبت کا عنصر شامل ہوتا۔

''ٹھیک ہوں میں حاعفہ۔ اب کیا چھوٹے موٹے کام بھی نہیں کر سکتی۔''

''نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ آپ آرام سے لاؤنج میں جا کر بیٹھیں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتایئے۔'' اس نے جیسے حکم جاری کیا تھا۔ وہ مسکرا دی۔ عاطی دوڑتا ہوا اپنے کمرے سے آیا۔

''آنٹی۔ مجھے ڈرائنگ بنانے میں مدد کریں ناں۔'' وہ پیار سے جھکی۔

''بیٹا ابھی مجھے کام ہے، تھوڑی دیر بعد۔'' عاطی کا چہرہ مرجھا گیا۔

''ادھر آؤ۔ میں تمہاری مدد کرتی ہوں عاطی۔'' صبا نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ عاطی دوڑ کر اس کے پاس گیا۔

''اب یہ کام تو کر سکتی ہوں ناں میں؟'' اس نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ جواب میں وہ مسکرا دی اور ڈائننگ ٹیبل سے برتن سمیٹنے لگی۔

''صبا اور حاعفہ ایک دوسرے کا کتنا خیال رکھتی ہیں ناں۔ کوئی دیکھ کر نہیں کہہ سکتا کہ یہ دونوں اس گھر کی بہو ہیں۔'' سحر فاطمہ اس وقت اریب کے کمرے سے باہر آئی تھیں۔ جہانزیب بھی ان کے ساتھ تھے۔

''یہ تو ٹھیک کہا آپ نے۔ آخر ہمارے بیٹے بھی تو ایک دوسرے پر اپنی جان چھڑکتے ہیں تو بھلا ان کو بیویاں کیوں ناں ایسی ملتیں؟'' انہوں نے مان کے ساتھ کہا تھا۔

''بس ہمارے اس گھر کو کسی کی نظر نہ لگے۔'' انہوں نے بلائیں سمیٹتے ہوئے دعا کی تھی۔

''انشاء اللہ ہمارے اس گھر کو کسی نظر نہیں لگے گی۔ یہ خوشیاں اس گھر کا خاصہ ہیں اور ہمیشہ یہیں بسیرا رکھیں گی۔'' جہانزیب کی آنکھوں میں چمک تھی۔ آنکھیں نیچے لاؤنج میں صبا کو دیکھ رہی تھیں جو مبہوت عاطی کو ڈرائنگ بنانے میں مدد کر رہی تھی۔ انہیں عاطی میں ایک بار پھر اریب کا عکس نظر آیا تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں، جیسے وہ ان آنکھوں میں کسی گہرے راز کو پنہاں کئے ہوئے ہو۔ انہوں نے جھرجھری لی اور خیالات کو بری طرح جھٹک دیا۔

☆......☆......☆

یہ اندھیرا، یہ روشنی کیا ہے

آؤ سوچیں کہ زندگی کیا ہے

وارڈ روب میں وہ کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ ہر شے اپنی جگہ پر تھی مگر وہ فائل آنکھوں سے اوجھل تھی۔ شاید علوی نے اسے کہیں رکھ دیا تھا۔ اس نے ہینگرز کو آگے پیچھے کر کے دیکھا اور پھر نچلا حصہ بھی چھان مارا مگر وہ فائل نہ ملی۔ وارڈ روب کے اوپر دیکھا تو کئی فائلیں رکھی تھیں۔

''شاید علوی نے وہاں نہ رکھ دی ہو۔'' اس نے سوچا اور سٹول کھینچ کر اس پر چڑھا۔ مطلوبہ فائل سب سے نیچے تھی۔ اس نے عجلت سے کام لیتے ہوئے وہ فائل نکالنا چاہی تو یک دم اوپر پڑی فائلیں بھی زمین پر آ گریں۔ وہ جتنی جلدی دکھا رہا تھا، کام اتنا ہی بڑھ گیا۔ اس نے دھیرے سے گردن جھٹکی۔ سٹول سے اترا اور فائلوں کو اٹھایا۔ کئی کاغذ باہر نکل چکے تھے۔ وہ انہیں سمیٹ رہا تھا۔ تبھی اس کے ہاتھ وہ کاغذ لگا جسے وہ بھول چکا تھا۔

اپنی لکھائی پر اس کی نگاہیں برجستہ ٹھہری گئیں۔ باقی فائلیں رکھیں اور اس کاغذ کو نگاہوں کے عین سامنے کیا۔

''یہ کاغذ؟'' وہ ذہن پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ اس کا خیال تھا، وہ کاغذ یہ پھینک چکا ہے مگر آج وہی کاغذ اس کے سامنے تھا۔ وہ اٹھا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔

''میری زندگی ایک پہیلی ہے اور اس کا جواب قسمت نے شب و روز کی تہوں میں کہیں مدفون کیا ہوا ہے۔ ابھی تو میں اس پہیلی سے بھی انجان ہوں لیکن ایک وقت آئے گا جب زندگی کا ہر راز مجھ پر عیاں ہو جائے گا۔ میری پیدائش سے جوانی تک اور جوانی سے اب تک جو بھی انہونیاں ہوئیں، ایک ناں ایک دن عیاں ہو کر رہیں گی۔ ابھی تو میں ان کے بارے میں سوچ کر ہلکان ہو چکا ہوں لیکن وقت آئے گا جب زندگی کا ہر راز میرے سامنے آئینے کی طرح ہوگا۔ کوئی دھول نہ ہوگی، کوئی غبار نہ ہوگا۔ بس پل گزرنے کی دیر ہے۔ اپنے پرائے سامنے آ جائیں گے۔'' یہ الفاظ اس نے انڈونیشین میں لکھے تھے، لیکن اُس وقت جب وہ اس زبان سے نابلد تھا۔ آج وہ ان لفظوں کو سمجھ سکتا تھا مگر مفہوم ابھی تک اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ حیرت سے اس تحریر کی طرف دیکھتے ہوئے لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس وقت یہ الفاظ نہ شناسا تھے مگر آج ایک ایک لفظ بول رہا تھا مگر ان کا مفہوم کیا تھا؟ اس کی عقل ناقص سمجھنے سے قاصر تھی۔ کئی ساعتیں اسے اس کاغذ کو گھورتے نکل گئیں۔

فون کی رِنگ ہوئی، حصار ٹوٹا۔ پلٹ کر موبائل اٹھایا مگر ذہن تو ابھی تک کھویا کھویا تھا۔

''ہیلو، اریب میں کرن۔ اس لانگ ویک اینڈ کو ہم نے 'توراجا' جانے کا ارادہ کیا ہے۔'' وہ پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ اس نئی جگہ کا نام سن کر چونکا۔ ہاتھ سے کاغذ پھسلا اور نیچے جا گرا۔

''توراجا؟'' وہ حیرت سے گویا ہوا تھا۔

''ہاں تو راجا۔ بڑے ہی مزے کی جگہ ہے۔ کب سے دیکھنے کا اشتیاق تھا مگر وہاں جا ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس ویک اینڈ پر میں تم اور ایشا جا رہے ہیں وہاں۔'' اس نے خود سے ہی اریب کو بھی اس پروگرام میں شامل کر لیا تھا۔

''ایک منٹ۔ یہ تم سے کس نے کہا کہ میں تمہارے ساتھ سیر سپاٹے پر جا رہا ہوں؟'' اس نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔ وہ تو اپنے مقصد کو سرانجام دینا چاہتا تھا مگر کرسن کے اس نئے پلان نے جیسے انہیں نامکمل چھوڑ دینے کی قسم کھائی تھی۔

''میں نے...... بھلا میں اور ایشا جا رہے ہوں اور تم نہ جاؤ؟ ایسا کہاں ممکن ہے؟ بس میں نے کہہ دیا ہے کہ تم جا رہے ہو تو بس جا رہے ہو۔ میں کل صبح کو تم سے ملنے آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی۔ اریب نے بولنا چاہا مگر شنوائی نہ ہوئی۔

''عجیب لڑکا ہے۔ اپنی کہی اور میری سنی بھی نہیں۔ بھلا یہ کیا بات ہوئی؟'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے موبائل بیڈ پر پھینکا تھا۔ اس کا ذہن اس کاغذ سے ہٹ کر اب کرسن کی طرف مبذول تھا۔ اس ویک اینڈ پر اس نے ابدال کے خلاف ثبوت ڈھونڈنے تھے مگر کرسن نے اسے نئی مشکل میں ڈال دیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق بالکونی کی طرف بڑھا۔ نگاہیں نیچے مصروف زندگی کو دیکھ رہی تھیں۔ شاہراہ ٹریفک سے بھرپور تھی۔ جمود کے کوئی آثار نہ تھے۔ ہاٹل کے حصار میں لان کے ذرا سائیڈ پر اسے دو عکس نظر آئے۔ وہ انہیں نظرانداز کرتا ہوا آگے کی طرف دیکھنے لگا۔ ان کی حرکتیں اگرچہ مشکوک تھیں مگر وہ انہیں کسی خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔

''سر آپ کے لئے جوس۔'' پیچھے سے آواز آئی۔ وہاں علوی تھی۔ وہ برجستہ پلٹا تو نگاہیں یکدم اس عکس سے ٹکرائیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریسلٹ تھا۔ جو شاید وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔

''بریسلٹ؟'' وہ چونکا۔ دوبارہ باہر کی طرف جھانکا مگر وہ عکس غائب تھا۔ اس نے دو قدم آگے بڑھائے۔ گردن کو دائیں بائیں گھمایا مگر وہ عکس دوبارہ نظر نہ آیا۔

''سر آپ کسی کو ڈھونڈ رہے ہیں؟'' علوی نے استفسار کیا تھا۔ وہ ہراساں پلٹا اور نفی میں سر ہلایا۔ حواس منتشر تھے۔ بار بار وہ عکس اس کے ذہن کی دیواروں پر دستک دے رہا تھا۔

علوی کے ہاتھوں سے جوس لے کر وہ دوبارہ بالکونی کی طرف بڑھا۔ نگاہیں اسی جگہ مبذول کیں مگر وہ عکس بس پل بھر کا تھا۔ جو وقت کے سمندر میں کہیں کھو چکا تھا۔

☆......☆......☆

آ مجھے اپنے شہر میں لے چل

اے مری موت سوچتی کیا ہے

کرسن اپنی زبان کا پکا تھا۔ اگلی صبح کو وہ ہاٹل کے ویٹنگ ایریا میں اس کا منتظر تھا۔ اگرچہ اس نے پریشے کے ذریعے اپنے کمرے

میں آنے کا کہا تھا مگر وہ وہیں اس کا منتظر رہا۔

”بڑے ہی ڈھیٹ ہو تم؟ مجھے ساتھ لے کر ہی جاؤ گے۔“ اریب نے ویٹنگ ایریا میں پہنچتے ہی کہا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا کھڑا ہوا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔

”دوستی میں جب تک ڈھیٹ پن نہ دکھایا جائے تو لگتا ہی نہیں کہ دوستی ہے۔“ اس نے فخریہ انداز میں کالر کھڑے کیے۔ دونوں باہر کی طرف چل دیئے۔ پریشے نے اس بار اریب سے کوئی سوال نہ کیا۔ خود اس کا ذہن بھی اس بات کی طرف مبذول نہ ہوا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر کی طرف جا رہے تھے۔

”یار اگر آج ستمبر کا مہینہ ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ خود اپنی آنکھوں سے مردوں کو باہر نکالتے ہوئے دیکھ لیتے۔ چلو۔ مردے نہ سہی، مردوں کو نکالنے والوں کو ہی دیکھ لیں گے۔“ وہ پرجوش انداز میں کہتا جا رہا تھا۔ اریب نے استہزائیہ انداز میں گردن جھٹکی تھی۔

توراجا انڈونیشیا کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں ہر سال مردوں کو قبر سے نکال کر گھر لایا جاتا ہے۔ یہ رسم ماماسانامی قبیلے میں ایک عرصے سے چلی آ رہی تھی۔ اسی قبیلے کو دیکھنے کے لئے ایشا اور کرن نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

مقامی زبان میں اس رسم کو مائی نین کہا جاتا ہے اور اس رسم کو نبھانے والوں کا تعلق عیسائیت سے ہے۔ اس رسم کو نبھانے والوں کا کہنا ہے کہ مرنے کے بعد بھی مردے کا تعلق اپنے گھر والوں کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ اس لئے مرنے کے بعد اس جگہ کی زیارت کروانا اُس مردے کو ضروری ہے جہاں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔

یہ سب کچھ اریب پہلے سے جانتا تھا کیونکہ اس نے ان کے بارے میں ایک آرٹیکل پڑھا تھا۔ اس کے لئے یہ کافی مضحکہ خیز بات تھی۔ بھلا مردوں کو قبروں سے نکال گھروں میں لانا، ان کو نہلانا دھلانا، میک کروانا اور پھر حنوط کر کے دفن کر دینا بھلا کہاں کی عقل مندی ہے؟ ایک بار انسان کو سپرد خاک کر دیا جائے تو واپسی کا تو کوئی جواز ہی نہیں بنتا لیکن کم فہموں کو کون سمجھائے اور پھر ایسے میں ایسی جگہ کی دیکھنے کی خواہش کرنا سب سے بڑی کم عقلی ہے۔ وہ خود بھی انہی میں سے تھا تبھی کرن کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کی مگر دل کسی طور پر جانے کے حق میں نہ تھا۔

ڈرائیونگ کی ذمہ داری کرن کی تھی۔ ایشا اس کے ساتھ بیٹھی انٹرنیٹ پر اس قبیلے کے بارے میں معلومات اکٹھی کر رہی تھی جبکہ اریب پچھلی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے باہر وادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ خیالات منتشر تھے مگر محور فقط ابدال کی ذات تھی۔

”یہ چھٹیاں تو ضائع ہو جائیں گی۔ پھر پتا نہیں وقت ملے گا بھی نہیں۔“ اسے افسوس ہوا۔ کاش وہ کرن کے ساتھ آنے کی ہاں نہ بھرتا۔ وہ ناراض ہوتا، پھر مان جاتا مگر اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس نے گردن جھٹکی۔

”لومائی نین کو مردوں کی عید کہا جاتا ہے۔“ ایشا نے ہنستے ہوئے کہا مگر وہ اس ہنسی کو دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ کرن نے بھی قہقہہ

لگایا تو کار نے ہچکولہ کھایا۔ اریب چونکا۔

''دھیان سے یار۔'' اسے لگا جیسے کرسن کی غلطی تھی مگر اس نے غصے میں ساتھ والی کار کی طرف دیکھا جو انہیں بری طرح اوورٹیک کرتے ہوئے گزری تھی۔

''اندھا کہیں کا۔ نظر نہیں آتا۔ اپنی لین میں نہیں جاسکتا؟'' اس نے کئی برے خطابات سے اس ڈرائیور کو نوازا تھا۔ ایشا بھی بڑبڑائی۔ اسے بھی دوسرا ڈرائیور غلطی پر لگا تھا۔

''جو ہوا سو ہوا۔ اب تم تو اچھے سے ڈرائیو کرو۔'' اریب نے کہا۔ ایک بار پھر کار میں خاموشی چھا گئی۔ باہر بھی خاموشی تھی۔ ہوائیں جو پہلے جھوم رہی تھیں۔ نجانے کیوں خاموشی کا لبادہ پہن کر اپنے اپنے ہجروں میں داخل ہو گئیں۔ اریب اس خاموشی کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ کار جو انہیں اوورٹیک کرتے ہوئے گزرے تھی۔ پل بھر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

اریب نے نگاہیں سڑک کے ساتھ لہلہاتی کھیتیوں کی طرف دوڑائیں تو اپنے دیس کا عکس نظر آیا۔ وہی ہریالی، وہی خوشبو۔ وہ مسکرایا۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرا تو ایک جھٹکے سے کار کے دروازے سے ٹکرایا۔

''اب کیا ہوا؟'' وہ جھلا کر گویا ہوا تھا۔ اسے لگا جیسے کرسن کو ڈرائیونگ ہی نہیں آتی۔

''لگتا ہے ٹائر پنکچر ہو گیا۔'' دونوں کو ایک شاک لگا۔

''ٹائر پنکچر؟'' دونوں کا حیران ہونا بجا تھا کیونکہ ان کے پاس کوئی اور ٹائر بھی نہ تھا۔ اریب نے ہزار بار کہا کہ اضافی ٹائر رکھ لے مگر کرسن کو تو اپنی کار پر بھروسہ تھا مگر اس بھروسے کا انجام کافی خوفناک ظاہر ہونے والا تھا۔

تینوں کار سے باہر آئے تو ایک مدہم سا ترنم اریب کی سماعت سے ٹکرایا۔ گہری سانس لی۔ معطر فضاؤں کو اپنی سانسوں میں تحلیل کیا۔ پکی سڑک کے اردگرد اگرچہ کھیتیاں تھیں مگر گردنام کی کوئی شے نہ تھی۔ ایشا کرسن کو گھورتی رہی جبکہ اس نے اچھے سے ٹائر کا جائزہ لیا۔ وہ کافی پشیمان تھا۔

''اب کیا کریں؟'' ایشا روکھے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

''مجھے کیا معلوم؟ دیکھتے ہیں کوئی یہاں سے گزرے اور ہماری مدد کر سکے۔'' اس نے بے پرواہی سے کہا تھا۔ نظریں گھما کر طویل سڑک کی طرف دیکھا تو سوائے آسمان کے کسی شے کا اس سڑک پر سنگم نہ ہو رہا تھا۔

''میرا نہیں خیال اس طرف سے کوئی آئے گا کل تک۔'' ایشا کی آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''دوسری طرف سے بھی آنے کا کوئی امکان نہیں۔ کیونکہ یہ ون وے سڑک ہے۔'' کرسن کی آواز پر اس نے پہلی بار ٹائر کی طرف دیکھا تھا۔ اسے کچھ عجیب لگا۔ وہ آگے بڑھا۔ جھک کر سڑک کو چھوا۔

''تم کیا جائزہ لے رہے ہو اب؟'' ایشا حیرت سے گویا ہوئی تھی۔
''یہ پن؟'' وہ اچھنبے انداز میں اس کو گھور رہا تھا۔ اس کی موٹائی سوئی سے بھی کم تھی۔ ایشا نے اسے خاص نہ جانا۔ اریب بھی زیادہ تانے بانے نہ بن سکا اور اسے وہیں پھینک دیا۔
''ایسا کرتے ہیں۔ آگے چلتے ہیں شاید کوئی ورکشاپ نظر آجائے۔'' یہ کرن کا آئیڈیا تھا۔ اس کی حمایت کی گئی کیونکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے سے تو اچھا تھا۔ تینوں کار کو لاک کر کے چل دیے۔
ایشا کرن کو سنا رہی تھی۔ کرن بھی ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا مگر اریب خاموش تھا۔ شاید ماحول کو انجوائے کر رہا تھا یا پھر اس آنے والے خطرے کو بھانپ چکا تھا جو اس کے سر پر موت کی طرح منڈلا رہا تھا۔
تقریباً چالیس منٹ پیدل چلنے کے بعد انہیں ایک پمپ نظر آیا تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا ڈھابا تھا۔ کرن کی تو جان میں جان آئی۔ وہ بھاگتا ہوا آگے بڑھا۔ ایشا بھی اس کے پیچھے چل دی۔ اریب نے گردن جھٹکی اور آگے بڑھا۔
''تھینک گاڈ۔ کوئی چوتھا انسان تو نظر آیا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ ساری عمر ہم اس سڑک پر ہی بھٹکتے ہوئے گزار دیں گے۔'' وہ ایک سٹول پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا تھا۔
''اگر ایسا ہوتا تو یقین مانو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑتی۔ اتنی سستی؟ توبہ ہے۔'' ایشا نے جھٹ ملامت کی تھی۔
''آپ کو کچھ چاہیے؟'' ڈھابے کا مالک آیا تھا۔
''جی پانی کا ایک گلاس۔ بہت پیاس لگ رہی ہے۔'' وہ ان کے لئے کچھ دیر میں پانی لے آیا۔ اریب نے پمپ کا بخوبی مشاہدہ کیا۔ وہاں پیچھے کئی کمرہ تھے۔ جو شاید مسافر خانے تھے۔ دور ایک ٹرالہ بھی نظر آیا اور کار بھی تھی۔ کچھ آدمی پمپ کے پیچھے سرگوشی کر رہے تھے۔ وہ ان آواز کو مدہم سا سن سکتا تھا مگر مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔
''ویسے کیا خیال ہے؟ شام تک یہاں آرام نہ کر لیا جائے؟'' کرن نے اپنا آئیڈیا پیش کیا تھا۔
''پاگل ہو گیا؟ یہاں سے نکلنا نہیں ہے کیا؟ یہاں کوئی بس آئے گی جو ہمیں تو راجا لے جائے گی۔'' ایشا نے اس کو جھاڑ پلائی تھی۔ وہ آدمی جو اس ڈھابے کا مالک تھا۔ ان کی باتوں کو سن رہا تھا۔
''جی بی بی۔ یہاں روزانہ رات کو آٹھ بجے ایک بس آتی ہے جو سیدھا تو راجا بستی کی طرف جاتی ہے۔'' یہ سن کر دونوں کی جان میں جان آئی تھی۔
''یہ تو اچھا ہوا۔ میں تو آرام کرنا چاہوں گا تب تک۔ یہاں کوئی کمرہ ہے؟'' اس نے پچھلے حصے کی طرف بنے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔ جو مسافر خانے تھے۔ ایشا اور کرن وہاں چل دیئے جبکہ اریب نے وہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔ اپنے موبائل میں اس نے اس ڈھابے کے کئی حصوں کو محفوظ کیا۔

"کیا یہاں پر کوئی آتا جاتا نہیں ہے کیا؟" اریب نے پوچھا تھا۔

"آتے ہیں ناں۔ شام چار بجے اور آٹھ بجے یہاں دو بسیں آتی ہیں، اس وقت یہاں خوب چہل پہل ہوتی ہے۔" اریب نے اثبات میں گردن ہلائی اور ڈھابے کے اردگرد کئی چکر لگائے۔ انڈونیشیا کے ڈھابے پر انتظار کرنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ پاکستان میں بھی کبھی وہ ایسی جگہ نہیں رکا تھا۔ ہمیشہ سے اعلیٰ معیار زندگی کا لطف اٹھایا تھا۔

شام چار بجے کے قریب وہاں ایک بس آئی اور اس ڈھابے کے مالک کے مطابق کافی ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ سارے انڈونیشین ہی تھے۔ اریب ان کی باتوں کو سنتا اور مسکرا دیتا۔ اکثر الفاظ سمجھ آجاتے اور اکثر ایک کان سے ہوتے ہوئے دوسرے سے نکل جاتے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کرسن اور ایشا کو کمرے میں ہی پایا۔

"لگتا ہے کچھ زیادہ ہی تھک چکے ہیں جو اپنے دوست کی پلٹ کر خبر بھی نہ لی۔" اس نے طنزیہ جملہ کسا تھا۔

"ہائے۔ تم اجنبی ہو کیا؟" ایک آواز سے وہ چونکا۔ یہ الفاظ پہلے بھی اس سے کہے گئے تھے مگر اس بار کہنے والا کوئی اور تھا۔ اس نے عجلت میں ہاں کہہ دیا۔

"کہاں جانا ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔

"میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہوں۔ بس وہ اندر ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنی منزل کی طرف سفر کریں گے۔" اس نے بات کو ٹالنے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر وہ تو جیسے اس کے پیچھے ہی پڑ چکا تھا۔ اریب نے بڑی ہی مشکل سے اپنی جان بچائی اور وہاں سے کھسکنے میں کامیاب ہو گیا مگر ایک مشکل سے پھنس کر دوسری میں پڑ گیا۔

دوسرے اجنبی نے بھی اس سے تقریباً اسی سے ملتے جلتے سوال کیے تھے۔ وہ گھبرا گیا۔ عقل مفلوج ہو چکی تھی۔ پیشانی پڑھ کر مقصد جاننا چاہا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ سب کے ذہن صاف تھے مگر دل میں میل تھا۔ اس کو اپنا ذہن بوجھل محسوس ہوا۔

"مجھے ایشا اور کرسن کے ساتھ کمرے میں ہی ہونا چاہیے اس وقت۔" اس نے سوچا اور بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ لوگوں کے ہجوم کو الوداع کہتے ہوئے کمروں کی طرف بڑھا۔ جو بظاہر جھونپڑی نما ہی تھے۔ ابھی وہ کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ ایشا اور کرسن باہر نکلتے نظر آئے۔ اس کی جان میں جان آئی مگر ان کے درمیان کچھ چوڑی جسامت کے آدمی آ کھڑے ہوئے۔ دراز قدم یہ آدمی کسی طور پر بھی انڈونیشین معلوم نہیں ہوتے تھے۔ رنگت سیاہ اور خدوخال بھدے سے۔ وہ گھبرا گیا۔ ان کے عقب میں اسے ایشا اور کرسن دکھائی نہ دیے۔

"ایکسکیوز می۔" تھوک نگلتے ہوئے اریب نے سائیڈ سے نکلنا چاہا مگر ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ اریب شانوں پر رکھ دیا۔ ہاتھ اتنا بھاری تھا کہ اریب تو جیسے زمین میں دھنسنے لگا تھا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے ہتھوڑا اس کے کندھے پر مارا ہو۔ درد کی ایک لہر پورے جسم میں سرائیت کر گئی۔

اس آدمی نے دوسرا ہاتھ بھی بالکل ایسے ہی انداز میں اس کے دوسرے کندھے پر مارا۔ اریب کو دوسرا کندھا بھی ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھیں درد سے بھر آئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی لوگوں نے اس کو اپنے حصار میں لے لیا جیسے وہ ان سب کا مرکز ہو۔

اریب نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو کرن اور ایشا کو ڈھابے کی طرف جاتا دیکھا۔ چیخ کر ان کو پکارنا چاہا مگر آواز تو جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ پیچھے سے ایک آدمی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ دوسرے نے اس کے بازو پکڑ لئے۔

"کرن......" ایک خراش سے ابھری تھی مگر اگلے وار نے جیسے قصہ ہی تمام کر دیا۔ پیچھے سے اس کے سر پر بری طرح وار کیا گیا اور ہر شے مبہم ہوتی دیکھائی دی۔ کرن اور ایشا جو سب سے بے نیاز آگے بڑھ رہے تھے۔ دھیرے دھیرے نگاہوں سے اوجھل ہوتے چلے گئے۔ سر میں درد کی ایک لہر نے زور پکڑا اور وہ زمین پر جیسے گر چکا تھا۔ آخری بار جو اس کی نگاہوں کے سامنے تھا وہ کچھ قدم تھے جو گرد آلود تھے۔ سب کی رنگت سیاہ تھی۔ انہی سیاہ قدموں میں سے ایک قدم اٹھایا گیا اور اس کے چہرے پر رکھ دیا گیا۔

☆......☆......☆

بول اے بدبخت! وہ ساماں کہاں غارت کیا
سوچ دیوانے! کہ وہ دولت کہاں گم ہو گئی

درد کی ٹیس جسم میں بری طرح سرایت کرتی ہوئی دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر رہی تھی۔ ایک ہچکولے سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا پورا جسم کسی پنڈولم کی طرح جنبش کر رہا تھا۔ آنکھیں کھولنے کے لئے اس نے اپنی تمام تر توانائیاں گنوا دیں مگر ظلمت کے سوا کوئی شے مقدر نہ بنی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہر طرف سیاہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنی آنکھیں کھولے ہوئے ہے مگر روشنی کا ایک دانہ بھی اسے نظر نہ آیا۔ اس نے ہاتھ لگا کر آنکھیں کھلے ہونے کا اطمینان کرنا چاہا مگر ہاتھ تو پشت کے پیچھے سے حرکت ہی نہ کر سکے۔ انہیں بیڑیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ وہ بیڑیاں جیسے کانٹوں سے بنی تھی۔ اس کی کلائیاں ان کانٹوں کو محسوس کر سکتی تھیں۔ ہاتھوں کی جنبش نے انہیں جسم میں گاڑھ دیا۔ وہ چیخا تو گلے میں بھی کانٹے دھنستے چلے گئے۔ اس کے گلے کو بھی بیڑوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ بری طرح خوفزدہ تھا۔ پاؤں کو متحرک کرنا چاہا مگر وہ بھی جیسے اپنی جگہ پر استادہ تھے۔

"کوئی ہے۔" وہ بمشکل چیخا تھا مگر آواز ٹکرا کر واپس آ گئی۔ کوئی آواز اس کی سماعت کا حصہ نہ بنی۔ اس کا جسم مسلسل متحرک تھا۔ وہ اپنے آپ کو کسی کلاک ٹاور کے پنڈلم کے ساتھ بندھا ہوا محسوس کو رہا تھا۔ ہر سیکنڈ بعد اسے جنبش دی جاتی۔ اس کے زخموں پر نمک چھڑ دیا جاتا۔ ہر طرف سناٹا چھا چکا تھا۔

پورا جسم درد سے کراہ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے پور پور کو آگ میں جھلسایا ہو یا پھر تیزاب کو قطرہ قطرہ اس کے جسم پر گرایا ہو۔ اگر یہ سب اس کا گمان تھا تو لازماً کسی نے ایک باریک تیز دھاڑ چاقو سے کھال اتارنے کی کوشش کی تھی۔ وہ ان زخموں کو محسوس کر سکتا تھا۔

ذہن نے پلٹا کھایا تو اس وقت کا منظر سامنے آیا جب وہ ڈھابے پر کرسن اور ایشا کو آخری بار دیکھ رہا تھا۔ مبہم سے وجود تھے۔ جو اسے دور لے جا رہے تھے۔

وہ اندھیرے میں پڑا رہا۔ کتنی دیر؟ یاد نہیں۔ شاید ایک گھنٹہ...... دو گھنٹے...... نہیں وہ اس سے بھی کہیں زیادہ وقت تک اسی حالت میں رہا تھا۔ ہر جنبش کے ساتھ وہ کانٹے اس کے جسم میں دھنستے۔ خون ریستا، زخم بنتا اور پھر ان کانٹوں کو اندر جانے کا مزید راستہ بن جاتا۔ وہ کافی دیر تک اس اذیت کو برداشت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک زوردار جھٹکے سے وہ پیچھے دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہ آخری جھٹکا تھا مگر اس جھٹکے نے پورے جسم کو کاٹ کر رکھ دیا۔ کئی کانٹوں نے اس کے گوشت کو باہر نکال دیا۔

سانسیں بھی گلے میں اٹکنے لگی تھیں۔ دفعتہً ایک کراکے دار آواز آئی۔ جیسے کسی دکان کا شیلٹر اٹھایا گیا ہو۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں۔ شاید بینائی لوٹ آئی تھی۔ تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئی۔ اس نے ہانپتے ہوئے گردن اٹھانے کی کوشش کی۔ باہر روشنیوں کے جہاں سے دو آدمی اندر آتے دیکھائی دیے۔ دونوں کا عکس وہ دیکھ سکتا تھا۔ پاس آتے ہی ان میں سے ایک نے اس کے ہاتھوں اور پیروں کو بیڑیوں سے آزاد کیا جبکہ اس کا گلا ابھی تک بیڑی میں جکڑا ہوا تھا۔ بازوؤں سے پکڑ کر کھڑا کیا گیا۔

"چل سیدھے سے کھڑا ہو۔" کرخت لہجہ گویا ہوا تھا۔ وہ زخموں سے چور تھا۔ آنکھیں کھولنا محال ہوتا جا رہا تھا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لائے تھے۔ وہاں فقط روشنی تھی۔ تیز جھلماتی روشنی...... جو اس کے لئے ظلمت کی وادیوں سے کم نہ تھیں۔ وہ گھسیٹا جا رہا تھا۔ مزاحمت کرنا بے کار تھا کیونکہ اس کا جسم مفلوج کیا جا چکا تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ ایک دو قدم چلتا اور پھر زمین پر آگرتا۔ اسے دوبارہ قید کر لیا جاتا۔

"کون ہو تم؟" اریب منمنایا تھا۔ ان میں سے ایک نے زبردست طمانچہ اس کے دائیں رخسار پر مارا۔ وہ بائیں جانب جھک گیا۔

"آرام سے۔ پتا ہے ناں، اس لڑکے کو کچھ نہیں ہونا چاہئے۔" دوسرا آدمی کرخت لہجے میں برسا تھا۔

"معلوم ہے مگر یہ بھی حکم ملا تھا کہ اگر اس نے چوں چراں کرنے کی کوشش کی تو مار کر پھینک دو۔" تھپڑ مارنے والا حقارت سے گویا ہوا۔ وہ بیزار دیکھائی دے رہا تھا۔ دیو ہیکل قد و قدامت کے یہ آدمی سیاہ رنگت کے دیکھائی دے رہے تھے۔ سینے پر برائے نام کپڑے تھے۔ بدبو کے بھبھوکے جسم سے ایسے پھوٹ رہے تھے جیسے برسوں سے وہ سلفر کی کانوں کا رہائشی ہو یا پھر اس گزر بسر ایسے لوگوں کے ساتھ ہو۔ اریب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

"اور پھر ایسا کرنے والے کے ساتھ بھی وہی سلوک برتنے کو کہا گیا تھا۔" وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اریب کا ذہن چکرایا تھا۔ اس کے دشمن اس کے خلاف اتنے سنگدل ہو سکتے تھے؟

"یہ ابدال کا کام ہوگا۔" ابدال کی صورت خالی الذہن سے ٹکرائی۔ ساتھ ہی نفرت و حقارت کے ملے جلے تاثر نے جنم لیا۔ وہ

اسے گھسیٹ کر ایک کوٹھری میں لے گئے۔ وہ جگہ بمشکل ایک کار جتنی ہوگی۔ تینوں اطراف دیوار اور ایک طرف سلاخیں۔ انہوں نے بری طرح اریب کو اس کوٹھری میں دھکیل دیا۔ وہ پچھلی دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ ماتھا دیوار سے ٹکرایا۔ خون کی ایک پھور پھوٹی۔ ایک آدمی آگے بڑھا اور گلے سے بھی بیڑی نکال دی۔ اب وہ جی بھر کے چیخ سکتا تھا مگر ایسا کرنا بے سود تھا۔ اس کے گلے کو اس قدر زخمی کیا جا چکا تھا کہ بولنا بھی محال تھا اور چیخنا اپنی جان پر ظلم کرنے کے مترادف۔

سلاخوں کو تالا لگا دیا گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو انہیں واپس جاتا ہوا دیکھا۔ ذہن دوبارہ چکرایا اور آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔

کافی شور سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ ابھی تک اسی کوٹھری میں بند تھا۔ دھیرے سے اس نے جسم میں حرکت دی۔ وہ زمین پر لیٹا تھا۔ ہاتھ پیشانی کی طرف بڑھائے تو وہاں لیس دار مادہ پایا۔ نگاہوں نے ان کے سرخ ہونے کی گواہی دی۔ وہ بمشکل گھسٹتا ہوا دیوار کی طرف بڑھا تھا۔

''جہاز کب آئے گا؟'' سلاخوں سے باہر ایک بڑا سا ہال تھا۔ جہاں ایک بھٹی کا گمان ہو رہا تھا۔ ایک آدمی اس بھٹی کی طرف بڑھا۔ دوسرے کئی آدمی اس بھٹی میں لکڑیاں پھینک رہے تھے۔

''کل تک۔'' دوسری آواز سماعت سے ٹکرائی۔ وہ سہارا لیتے ہوئے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بمشکل اپنے وجود کو پہنچان سکی تھیں۔ اسے اچھے سے یاد تھا کہ ہاٹل سے نکلتے ہوئے اس نے وائیٹ جینز اور شرٹ پہنی تھی لیکن اب اس کے جسم پر وہ لباس نہ تھا یا شاید وہی تھا مگر ان کی حالت ویسی نہ تھی۔ اس نے آنکھیں پھیلائیں تو اپنے لباس کو پھٹا ہوا پایا۔ شاید کانٹوں نے انہیں بری طرح چھلنی کر دیا تھا۔ جینز میں بھی کئی سوراخ تھے۔ خون اور مٹی کے نشانات آویزاں تھے۔ اس نے گہری سانس لی تو سانس بھی گلے میں اٹکنے لگی۔

''اللہ...... میں کہاں ہوں؟'' وہ نڈھال سامنے دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بنا اجازت کے بہتے رہے۔ سامنے کئی وجود اس کو نظر آئے۔ سب کے سب سیاہ رنگت کے، جن کے سینے برہنہ اور نچلے حصے پر بڑی سی بھدی لنگی تھی۔ اسے قراحت محسوس ہوئی۔ قے کی کیفیت نے اس کے سر کو بھاری کر دیا۔

''اس ماہ کافی مال جمع ہو چکا ہے۔ کافی رقم مل جائے گی۔'' نیم جاں ہچکولا کھا کر رہ گئی۔ وہ کس مال کی بات کر رہے تھے؟ کیسی رقم اکٹھی ہو گئی؟ اس نے پوچھنا چاہا تھا مگر کوئی ہمت ہی نہ بن پائی۔ وہ ان کے سامنے ایک مورت کی طرح تھا۔ جس کی زبان نکال دی گئی تھی یا پھر زبان کو ٹکلوں سے ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ وہ یک ٹک ان بھدے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو اس بار اسے افریقی لگے تھے۔ ہاں وہ افریقی ہی تھے۔ وہ پہنچان گیا۔ دراز قد...... سیاہ رنگت...... چوڑا چکلا سینہ...... بھدے سے خدوخال...... عجب سی بو...... وہ افریقی ہی تھے۔ شاید جنگلوں کے رہنے والے افریقی مگر وہ اسے یہاں کیوں لائے تھے؟ اس نے بمشکل ذہن کو جگانا چاہا جس پر ہر لمحہ غشی طاری ہو رہی تھی۔ کیا وہ انڈونیشیا سے ان کے ملک میں آ چکا تھا؟ مگر کیسے؟ ذہن میں کئی سوال کھٹک رہے تھے مگر جواب ندارد۔

''لیکن ایک بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ باس ہمیشہ لڑکیوں کو اٹھا کر لانے کے لئے بھیجتے تھے مگر اس بار یہ لڑکا؟'' یک دم ایک افریقی نے اریب کی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے برجستہ آنکھیں موند لیں۔ وہ انہیں اپنے ہوش میں ہونے کا بتانا نہیں چاہتا تھا۔ لکڑیوں کا ایک گٹھا بھٹی میں پھینکا گیا۔ ایک شعلہ بھڑکا۔ دھویں کے بادلوں نے ہال میں بسیرا کیا تو دوسرے لوگ دروازے کی طرف بھاگے۔ ہال کا دیوہیکل دروازہ کھولا۔ سب کے کھانسنے کے ساتھ اریب کی کھانسی بھی گونجی۔ دھویں میں سانس لینا دشوار تھا۔

چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا، تازہ ہوا نے اس ہال کا رخ کیا جہاں اریب کو قید کیا ہوا تھا۔ اریب نے بھی آنکھیں کھولیں تو آسمان پر سفید بادلوں کو دیکھا۔ کھلا آسمان، جو اس سے چھینا جا چکا تھا۔

''دیکھ کر کام کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے۔ ساتھ والے جزیرے پر ہماری مانیٹرنگ کی جا رہی ہے۔'' ایک آدمی گویا ہوا۔ اریب کو جھٹکا لگا۔

جزیرہ؟ یعنی وہ ابھی کسی جزیرے پر تھا۔ مگر کون سے؟ اور اتنی جلدی وہ کیسے کسی جزیرے پر پہنچ گیا؟ مگر ایک بات کا جواب مل چکا تھا کہ وہ ابھی تک انڈونیشیا میں ہی تھا۔

اس نے باہر دیکھا تو دن کا وقت تھا مگر اسے تو کڈنیپ رات کے وقت کیا گیا تھا یعنی وہ پوری رات ان کے چنگل میں رہا؟

خالی ذہن ہچکولے کھاتا ہوا بائیں جانب ڈھہہ سا گیا تھا۔

''یہ لڑکا؟ کہیں مر تو نہیں گیا؟'' اریب کا جسم جو بے جان پرندے کی طرح گرتا دیکھ کر ایک آدمی بھاگتا ہوا سلاخوں کی طرف بڑھا۔ دوسرے بھی اس طرف متوجہ ہوئے۔

''اتنا زہریلا نہیں تھا دھواں۔ بس بے ہوش ہوا ہوگا۔'' دوسرے نے اس بات کی تردید کی۔ حقارت سے اس جانب دیکھا۔ اریب ان قدموں کی آہٹ کو سن سکتا تھا۔ ان نگاہوں کی حدت کو اپنی طرف دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر وہ یونہی گھورتے رہنے کے بعد پلٹے۔ اریب نے بھی آنکھیں کھولی۔ ایک پردہ گرا دیا گیا۔ وہ ایک بار پھر اندھیرے میں دھکیل دیا گیا تھا مگر اس پردے میں کچھ سوراخ تھے۔ وہ بمشکل اٹھا۔ دیوار کے ساتھ چلتا ہوا ہوا سلاخوں کے پاس آیا تھا۔

''یہ لڑکا بہت قیمتی ہے۔ منہ مانگی قیمت ملی ہے اس کو اٹھانے کی۔'' اریب کی سماعت میں جیسے کانٹے چبھ رہے تھے۔ اس نے سلاخوں کو پکڑا تو خون کے سبب ہاتھ پھسلتے چلے گئے۔

''مال تو مل گیا مگر یہ لڑکا؟ اس کو ہمیشہ اس کوٹھری میں قید تو نہیں رکھ سکتے ناں۔'' دوسرا آدمی گویا ہوا تھا۔

''مجھے اچھے سے معلوم ہے۔ بس افریقہ پہنچ کر اسے وہاں کسی کو بھی بیچ دیں گے اور ویسے بھی آج کل لڑکوں کا دور ہے۔ لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں سے مزے اٹھائے جاتے ہیں۔'' شیطانی قہقہے نے جیسے اس کی سماعت میں زہر گھولا تھا۔ باریک سوراخوں میں سے وہ ان

درندہ صفت انسانوں کو دیکھ سکتا تھا، جو ہنستے ہوئے شیطانی بھیریے لگ رہے تھے۔ اریب کو تو جیسے سانس لینا بھی محال ہو گیا۔ پیشانی پر لکھی تحریر آویزاں دیکھائی دی۔ اس کے پورے جسم میں زلزلے کا عالم تھا۔

''لڑکیوں سے زیادہ لڑکوں سے مزے اٹھائے جاتے ہیں۔'' الفاظ نہیں بلکہ زہر تھے۔ آنکھیں برجستہ اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئیں۔ درد بڑھا، آنسو نکلے مگر آواز تو حلق میں معدوم ہو چکی تھی۔

''جیسا اس کا رنگ ہے، ہر کوئی ہنس کرے گا اسے۔'' درندگی اور بے شرمی کی انتہا تھی۔ وہ ان کی نیتوں کو بھانپ چکا تھا۔ اپنے آپ کو درندوں کی بستی میں وہ خود کو انتہا کا بے بس محسوس کر رہا تھا۔ اپنے زخموں کو طرف دیکھا تو اسے سمجھ آیا کہ کیوں اس کو ٹارچر کیا گیا؟ تا کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے اور ان کے پلان کے مطابق منزل تک پہنچ جائے۔

''نہیں۔ میں ان درندوں کے ہاتھوں نہیں نیلام ہو سکتا۔ بالکل نہیں۔'' رندھا ہوا لہجہ منت سماجت کر رہا تھا مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر سر سلاخ سے جا ٹکرایا۔ ہر سو سناٹا چھا گیا اور آنکھیں دوبارہ بند ہوتی چلی گئیں۔

''نہیں...... مجھے ان درندوں کے ہاتھوں نیلام نہیں ہونا...... نہیں ہونا مجھے نیلام۔'' نیم بے ہوشی کے عالم میں اس کے لبوں پر ایک ہی مدعا تھی۔

☆......☆......☆

کاسہ گداگری کا ہے، ناف پیالہ یار کا

بھوک ہے وہ بدن تمام، وصل تمام رنج ہے

اس بار آنکھیں کھلیں تو اپنے آپ کو نئی جگہ پر پایا۔ وہ جگہ اس کوٹھری سے بڑی تھی مگر وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔ کئی لڑکیاں اسی حالت میں اس کے ساتھ تھیں۔ جسم پر برائے نام کپڑے، زخموں سے بدن چور، آنکھوں میں آنسوؤں کا ڈھیر۔ اس نے غشی کو دغا دینے کی کوشش کی، کھڑا ہوا۔

''بیٹھ جاؤ۔ ورنہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔'' ایک مجبور و بے بس آواز سنائی دی۔ وہ پلٹا تو ایک سیاہ لڑکی روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ مسیحا تھی یا پھر بننا چاہتی تھی۔

''وہ ان ڈبوں کے پیچھے ہی کھڑے ہیں۔ کچھ دیر میں جہاز آئیں گے اور ہمیں اس میں بٹھا دیا جائے گا۔'' وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''مگر تم سب ہو کون؟''

''ان کا بکاؤ مال۔'' ایک انڈونیشین لڑکی گویا ہوئی تھی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اب میں گھر کبھی نہیں جا سکوں گی۔'' وہ قسمت سے شکوہ کر رہی تھی۔ آنسو گھٹنوں سے پونچھتی رہی۔

''پہلے میری بہن کو اغواء کیا ان بے غیرتوں نے۔ جب میں نے ایف آئی آر کٹوائی تو انہوں نے مجھے بھی اٹھا لیا۔'' تیسری لڑکی نے اپنی آپ بیتی سنائی تھی۔

ان سب کی باتیں سن کر اریب ٹھٹک کر رہ گیا۔

''مگر اے اجنبی! تم تو لڑکے ہو اور یہ گروہ تو لڑکیوں کی عزت نیلام کرتا ہے۔ تم کیسے ان کے ہتھے چڑھ گئے؟'' سب کی استفہامیہ نگاہیں اس بار اریب پر ٹکی ہوئی تھیں۔ وہ ان نظروں کا کیا جواب دیتا؟ اپنی ہی ذات میں ڈوبتا چلا گیا۔

''جیسے تمہاری عزت داؤ پر ہے ویسے ہی میری بھی۔'' اس نے کہنا چاہا مگر خاموش رہا۔ آنکھیں نم ہوتی چلی گئیں۔

''ہارن سنائی دے رہا ہے۔ بس وہ جہاز آتا ہی ہوگا۔'' ایک آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''نہیں...... مجھے اس گندگی میں نہیں ڈوبنا۔'' وہ یقین کے ساتھ کھڑا ہوا۔ ساری لڑکیاں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ آنکھیں استفہامیہ تھیں، جبکہ اس کی نگاہوں میں یقین غالب تھا۔ ایک کسک تھی، جو ان مخمور نگاہوں میں دیکھی جا سکتی تھی۔ زخم اس صادق جذبے کو قتل نہیں کر سکتے تھے۔

''میرے بغیر وقت کیسے کٹتا ہے تمہارا؟'' حاعفہ کے ساتھ فون پر کی جانے والی آخری گفتگو اس کی سماعت کا حصہ بننے لگی۔ وہ شوخ لہجے میں اس کی محبت کا امتحان لے رہا تھا۔

''جیسے آپ کا کٹتا ہے ہمارے بغیر۔'' جذبات کی تشنگی جیسے بڑھ چکی تھی۔

''ہمیں تو ہر وقت آپ کا خیال ہی کھائے جاتا ہے۔ ہر پل آپ کی باتیں گونجتی ہیں سماعت سے، جیسے آپ کہہ رہی ہوں کہ اپنا خیال رکھیے گا ہم آپ کے نکاح میں ہیں۔'' وہ اسی کے انداز میں گویا ہوا تھا۔ لبوں کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔

''میرا مذاق نہ اڑائیے آپ۔'' وہ ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔

''مذاق اور ہم؟ وہ بھی آپ کا؟ بخدا یہ کیا کہہ دیا آپ نے؟'' وہ مصنوعی انداز میں چونکا تھا۔

''آپ مجھے تم ہی کہا کریں۔ مجھے اچھا لگتا ہے۔'' پہلی بار اس نے اپنی پسند ظاہر کی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

آنکھوں میں آنسو آئے۔ وہ پل اب جیسے کھو چکے تھے۔ وہ شوخ پن اب درد بن چکا تھا۔ وہ مزاح اب ایک حسین یاد تھی اور حقیقت انتہائی کڑوی۔

جہاز کا شور تیز ہوتا چلا گیا مگر وہ ابھی تک حاعفہ کے لفظوں میں کھویا ہوا تھا۔

''میری تو دعا ہے کہ آپ پر کبھی کوئی مشکل ہی نہ آئے۔ آپ ہمیشہ مسکراتے رہیں۔ ہمیشہ خدا کی ذات آپ کی حفاظت کرے۔ ہمارے اس نکاح کا پاس آپ ہمیشہ رکھیں۔''

’’میں اپنے اس نکاح کو داغدار نہیں ہونے دوں گا حاعفہ۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔‘‘ وہ یقین کے ساتھ گویا ہوا تھا۔ دفعتہً ایک چیخ سنائی دی۔ وہ خیالوں سے باہر آیا۔ سامنے ایک افریقی لڑکی کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹ رہا تھا۔ ہاتھ اس کے بھی بندھے تھے مگر وہ اب مزاحمت کے لئے تیار تھا۔ حاعفہ سے کیا گیا وعدہ اب اس کو وفا کرنا تھا۔

’’نکاح وقتی تسکین کا نام نہیں ہے بلکہ یہ نام ہے محبت کا...... الفت کا...... ایک دوسرے کی خاطر حالات سے مقابلہ کرنے کا۔ نکاح نام ہے اپنے دامن کو پاکیزہ رکھنے کا۔ اپنی آبرو کو سمیٹنے کا۔ نکاح نام ہے نگاہوں کو پست کرنے کا، ستر کو چھپانے کا۔ نکاح نام ہے گندگی سے خود کو بچانے کا۔ آلودہ خیالات سے بری ہونے کا۔ نکاح نام ہے راحت کا، اپنے وجود سے دوسرے کو خوشی پہنچانے کا۔ نکاح نام ہے پردے کا۔ ایک دوسرے کے عیوب کو چھپانے کا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے کا۔‘‘ ایک مترنم آواز سماعت میں گونجی تھی۔ وہ اس آواز کو پہنچانتا تھا۔ اس کی شریک حیات۔ اس کے ہجر و وصل کی ہمراز۔ اس کے وجود کی حقدار۔

’’چل ادھر......‘‘ اسی افریقی نے اب اریب کو گھسیٹنا چاہا تھا مگر وہ ایک سیسہ پلائی دیوار کی طرح اپنی جگہ پر جما رہا۔ نگاہوں میں حقارت تھی۔ افریقی پلٹا اور ایک گھونسا مارا۔

’’سیدھی طرح چل ورنہ......!‘‘ اس نے تنبیہ کی تھی۔

’’میں تمہارے ساتھ کہیں نہیں جا رہا۔ سمجھ گئے تم۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ مجھے چھوڑ دو ورنہ؟‘‘ اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ افریقی نے اسے پیچھے دھکیلا اور طنزیہ قہقہہ لگایا۔ اپنی زبان میں سب کو ادھر جمع کیا۔

’’یہ دیکھو یہ پاکستانی لڑکا ہمیں آنکھیں دیکھا رہا ہے۔‘‘ وہ سب اس پر ہنس رہے تھے کہ جبکہ وہ بری طرح چونکا۔ صرف ابدال کو اس کے پاکستانی ہونے کا معلوم تھا۔ اس کا ذہن ابدال کو برے خطابات سے نواز رہا تھا۔

’’تمہارے بارے میں میرا خیال بالکل درست تھا ابدال۔ تم انتہائی گھٹیا، رزیل انسان ہو۔ شاید انسان کہلانے کے بھی لائق نہیں ہو۔‘‘ وہ نفرت کی انتہا پر تھا مگر یہ وقت برا بھلا کہنے کا نہیں تھا۔ اس کے سامنے افریقی مرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ سب کی ہوس بھری نگاہیں اب اریب کو گھور رہی تھیں۔ لڑکیوں کو جہاز میں شفٹ کیا جا چکا تھا۔ بس اریب باقی بچا تھا۔ کچھ سامان تھا۔ جسے کمتر لوگ رکھ رہے تھے۔

’’لڑکے تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ سیدھی طرح ہمارے ساتھ جہاز میں چلو۔ کہیں ایسا نہ ہو جو سلوک تیرے ساتھ وہاں کرنا ہے، یہی پر کر لیا جائے۔‘‘ نگاہوں میں ہوس کی انتہا تھی۔ اس نے اپنے ہونٹ کاٹے تھے۔ جلا ہوا چہرہ، انتہائی بھدا معلوم ہوتا تھا۔ وہ دھیمے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا تو بدبو نے سانس لینا بھی محال کر دیا۔ جنبیت کی بُو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ پتا نہیں کتنے عرصے سے وہ نہایا بھی نہ تھا۔

اس نے اریب کے بالوں کو پکڑ کر نوچا تو اس نے منہ پر تھوک دیا۔ تھوک سیدھا آنکھوں میں گیا۔ غصہ قہر برسانے لگا۔ ایک زبردست طماچہ بائیں رخسار پر مارا گیا۔ وہ ڈبوں کے ڈھیر پر جا گرا۔ زخموں سے چور جسم ایک بار پھر درد سے کراہنے لگا۔

افریقی نے نازیبا القابات سے اسے گھورا مگر اریب کی قسمت اچھی تھی، وہ جہاں گرا وہاں ایک چاقو تھا۔ ہاتھ اگرچہ بندھے

ہوئے تھے مگر اپنا دفع کے لئے اسے مضبوطی سے تھام لیا۔
''خبردار! اگر آگے بڑھنے کی کوشش کی تو۔'' اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے اور وہ افریقی اس سے خوب حظ اٹھاتے گئے۔ سب نے ایک ساتھ اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔
''لگتا ہے، وہاں جانے سے پہلے ہی مزہ لینا چاہتا ہے۔'' وہ بیہودگی کی انتہا پر تھے۔ اریب کے پاؤں پیچھے کھسکتے گئے۔ چاقو سے ہتھکڑی بھی کاٹی نہ گئی۔ پیچھے ڈبے تھے اور آگے ہوس میں مدہوش درندے۔ آسمان کی طرف دیکھا تو خلا تھی۔ زمین کی طرف دیکھا تو بے بسی۔ ہر طرف سے مایوسی نے اسے جکڑا ہوا تھا۔
''دیکھو، اگر تم نہ ہٹے تو......!'' اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے خیال کو انجام تک پہنچاتا، ایک افریقی نے اس کی کلائی کو دبوچ لیا۔ چاقو ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہوا۔ وہ اس بدبودار سینے سے جا ٹکرایا۔ نتھنوں میں یہ بدبو کانٹوں کی مثل چبھنے لگی۔ وہ اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے اس کے بالوں کو بوسہ دینے کی کوشش کر رہا تھا مگر اریب نے دھکا دیا اور پوری طاقت کے ساتھ ہاتھوں میں موجود ہتھکڑیوں کو اس کے سر میں مارا۔ وہ چکراتا ہوا پیچھے جا گرا۔ اب جو بھی آگے بڑھتا، اریب اس پر ہتھکڑیوں سے وار کرتا۔ سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔
''میں جان دے دوں گا مگر تمہیں اپنے ساتھ کھیلنے نہیں دوں گا۔'' وہ چیختا رہا۔ آنسوؤں سے گال بھیگ چکے تھے۔ گلے کے زخم چلانے سے ہرے ہو گئے۔ خون رسنے لگا مگر اسے کہاں پرواہ تھی؟
سب اس کی طرف لپکے۔ سامنے سمندر تھا، پیچھے افریقی۔ وہ تخت کے عین کنارے پر تھا۔
پلٹ کر دیکھا تو ان افریقی آدمیوں کی آنکھوں میں ہوس کا جہاں آباد تھا۔ سامنے دیکھا تو موت بانہیں پھیلائے کھڑی تھی۔ اس ذلت بھری زندگی سے اس نے موت کو ترجیح دی۔ اگلا قدم اسے دنیا و مافیہا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور لے جاتا۔ آنکھیں موندیں تو حاعفہ کا چہرہ لہرایا۔ دل جذبات سے پر ہو گیا۔ اگلی سانس اس نے کب اور کیسے لی۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی۔ بس اتنا یاد تھا کہ وہ پانی میں تھا، کسی نے اس کو بچایا تھا۔ آنکھیں دیکھنے کے قابل ہوئیں تو وہی افریقی سامنے تھے۔ آنکھوں میں قہر تھا۔
''مرنے کا شوق ہے تجھے؟ ابھی دیتے ہیں تجھے موت۔'' یہ کہہ کر ایک افریقی آگے بڑھا اور ہاتھوں میں چمٹی نما شے تھی۔ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ اس شے کو پہچان نہ سکا۔
ایک نے اس کا پاؤں پکڑ کر آگے کیا اور ایک ناخن کھینچ ڈالا۔ درد بھری چیخ فضا میں گونجی۔ دوسرا آگے بڑھا ایک ہتھوڑا اس کے سر پر مارا، خون کا فوارا پھوٹا۔ سر بری طرح چکرایا۔ آنکھیں پرنم تھیں۔ خون، پسینہ ایک دوسرے میں ضم ہو گئے۔
''نہیں...... نہیں......'' نفی میں سر ہلاتے وجود نے اپنے اوپر ظلم کے خلاف آواز اٹھانا چاہی مگر خاموش کروا دیا گیا۔
''اب بھاگ کر دیکھا......!'' خطاب انتہائی گھٹیا تھا۔ آنکھیں بند ہوتی گئیں۔ خون سے پاؤں رنگ چکے تھے۔ اب وہی آدمی

دوسرے پاؤں کے انگوٹھے سے ناخن کھینچ رہا تھا۔ درد بڑھتا گیا۔ ظلمت نے آنکھوں میں بسیرا کیا تو سامنے فقط شعلے تھے۔ دو دہکتی ہوئی سلاخیں، جو آنکھوں کی طرف بڑھائی جا رہی تھیں۔

''پلیز......نو......لیو......می۔'' درد بھری آہیں فضا نے اپنی آغوش میں لے لیں۔ ہر شے مبہم ہوتی چلی گئی۔ انسانی کھال میں درندے اس کے جسم کو نوچ رہے تھے۔

دھواں......ہتھوڑے......سلاخیں......شعلے......خون......اور بند ہوتی آنکھیں تھیں۔ آگے کیا ہوا شاید اگلے جہان جا کر ہی معلوم ہوتا۔ اس کے حواس نے آخری وقت ہونے کی وعید سنا دی۔ آنکھوں میں نمی لئے وہ اب اپنی آنکھیں موند رہا تھا مگر ہتھوڑے مارنے والا مار رہا تھا۔ ناخن نکالنے والا اپنے فعل سے باز نہ آیا اور وہ دہکتی سلاخیں اس کی آنکھوں کے بالکل قریب آ چکی تھیں۔ جب وہ اس دنیا سے غافل ہو گیا۔

☆......☆......☆

سورج کی شعاعوں نے جسم میں گدگدی کی تو پلکوں میں جنبش پیدا ہوئی۔ دھیرے سے آنکھیں کھولیں تو سفید روشنی نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ خوشگوار خوشبو نتھنوں سے دل کو فرحت بخشنے کا کام سرانجام دے رہی تھی۔ بازو ہلایا تو اپنے اوپر مخمل کا احساس ہوا۔ وہ اس وقت نرم و گداز بستر پر لیٹا تھا۔

سر پر ضرب......دہکتی سلاخیں...... بری طرح نوچے گئے ناخن......ہوس سے بھری آنکھیں......ایک ایک لمحہ کسی فلم کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ اس کا ذہن چکرایا۔ وہ خواب تھا؟ اس نے گہری سانس لی۔ دائیں ہاتھ سے سینے پر موجود کو لحاف ہٹایا۔ تھوڑا سا اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی معمولی سی ٹیس ابھری۔ نگاہیں برجستہ پاؤں کی طرف گئیں۔ انگوٹھوں پر پٹیاں بندھی تھیں۔

وہ سب سچ تھا۔ نہ وہ خواب تھا اور نہ ہی یہ۔ وہ موت کے چنگل سے زندہ بچ آیا تھا۔ چھت پر نگاہ دوڑائی تو ایک خوبصورت و چمکتا دمکتا فانوس آنکھوں کو راحت بخش رہا تھا۔

''میں یہاں کیسے؟'' اس نے ایک ہی نظر میں پورے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ ہر شے نفیس تھی۔ اپنی جگہ پر ایسے براجمان جیسے بڑے ہی احتیاط سے انہیں سمیٹا گیا ہو۔ مٹی کا ایک ذرہ بھی نہ تھا۔ کچھ ڈرپس لگی ہوئی تھیں۔ یہ اسپتال تو ہو نہیں سکتا تھا اور نہ ہی گرینڈ مراج ہائٹل تھا۔ یہ ایک بالکل نئی جگہ تھی۔

''نئی زندگی کی پہلی صبح مبارک ہو اریب۔'' آواز شناسا سی تھی۔ ایک سفید لباس میں ملبوس ایک انجان آدمی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اریب کی نگاہیں دروازے کی طرف گھومیں۔ وہ ناشتے کی ٹرے کمرے میں لا رہا تھا۔ سرخ و سفید رنگت پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی، مونچھیں بھی معمولی سی تھیں مگر چہرے پر غضب ڈھا رہی تھیں۔

وہ کرسن نہیں تھا اور نہ ہی ابدال، یہ تو کوئی تیسرا تھا مگر تیسرا کون؟ اریب کی استفہامیہ نگاہیں یک ٹک اس چہرے پر مرکوز تھیں۔

''کون ہیں آپ؟'' الجھی الجھی نگاہوں نے برجستہ سوال کیا تھا۔

''اتنی جلدی بھول گئے؟ میرا تو خیال تھا کہ تم کچھ دن تو یاد رکھو گے۔'' خوشگوار لہجہ گویا ہوا۔ ماضی کے پنے پلٹے، ایک چہرہ سامنے آیا۔ وہ مسیحا، اریب نے بغور دیکھا تو وہ واقعی مسیحا تھا۔

''آپ؟'' اریب نے بیٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اُس مسیحا نے گاؤ تکیہ کمر کے پیچھے رکھ دیا اور پھر کھڑکی کی طرف بڑھ کر پردے ہٹائے تو سورج نے براہ راست کمرے میں قدم رکھا۔ ہر شے اجلی اجلی دیکھائی دی۔ وہ مسکراہٹ کے ساتھ برجستہ پلٹا۔

''ہاں...... میں عالمگیر۔'' اس نے اپنا تعارف کروایا تو اریب ٹھٹک کر رہ گیا۔ زندگی میں ایک نیا کردار قدم رکھ چکا تھا۔

جال ساز

اب کے وہ رُت ہے کہ ہر تازہ قیامت کا عذاب
اپنے دل میں جاگتے زخموں کی گہرائی کے نام

آج اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی۔ وہ سہارے سے چل پھر سکتا تھا مگر عالمگیر اسے سہارے دینے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اس کا بازو کندھے پر رکھ کر کھڑا کرتا۔ دو قدم اپنے ساتھ چلنے میں مدد کرتا اور پھر اپنا اس کا بازو اپنے کندھے سے ہٹا دیتا۔ وہ لڑکھڑاتا، توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا، درد کی ٹیسیں برداشت کرتا مگر دو قدم لازمی چلتا۔ عالمگیر دور کھڑا یہ سب دیکھتا، پھر دھیرے سے مسکرا دیتا۔

”یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمہیں تکلیف میں دیکھ کر خوشی ہو رہی ہے بلکہ میں اس لئے مسکرا رہا ہوں کہ تم میں جدوجہد کا مادہ ہے۔ تم جمود کے قائل نہیں اگر ایسا ہوتا تو یقین مانو میں تمہیں پہلے دن ہی تمہارے ہاٹل چھوڑ آتا۔ مجھے ایسے لوگوں سے شدید قسم کی چڑ ہے جو اپنے بازوؤں پر بھروسہ نہیں کرتے۔ محنت اور لگن سے زندگی کو آگے بڑھانے کا خیال بھی ان کے ذہنوں میں نہیں بھڑکتا۔ تم ایسے نہیں ہو۔ مجھے بہت خوشی ہوئی۔“ وہ وارڈ روب کے ساتھ پشت لگائے کھڑا تھا۔ اریب نے درد کی شدت کو برداشت کیا اور نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسیحا آج بھی اس کے دل میں اترتا چلا گیا۔ حواس خمسہ نے اِرتباط جوڑنا چاہا مگر ذہن نے تردید کی۔

”ایک بات پوچھوں۔“ اس نے اپنا عکس کافی دنوں بعد آئینے میں دیکھا تھا۔ خوبرو چہرے پر کئی داغ تھے۔ جو دھیرے دھیرے مندمل ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں گزرے وقت کی لہر سرایت کر گئی۔ نمی نے ان میں ڈیرہ جمایا تو عالمگیر کے قدموں کی آہٹ سے اس نے ان خیالات کو بری طرح جھٹک دیا۔

”ہاں، کیوں نہیں۔“ وہ ڈگمگایا تو عالمگیر نے سنبھالا اور صوفے پر بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ انگوٹھے ابھی تک صحیح نہیں ہوئے تھے۔ پورا پاؤں بوجھل تھا۔ درندوں نے اسے تقریباً اپاہج کر ہی دیا تھا۔

”آپ نے مجھے بچایا کیوں؟ اور سب سے بڑھ کر آپ کو میری خبر کیسے ہوئی؟“ کئی دنوں سے جو سوال اس کے دل میں کھٹک رہا تھا، پوچھ ڈالا۔ وہ مسکرایا۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے پاؤں کو اپنی ران پر رکھا۔ پٹی ہلکی ہلکی سرخ دیکھائی دے رہی تھی۔ شاید خون رسنے لگا تھا۔ اس نے بڑے ہی پیار و احتیاط سے پٹی کھولنا شروع کی۔

”جنہیں اللہ بچانا چاہے تو کسی بھی طریقے سے بچا لیتا ہے۔ اگر میں وہاں نہیں پہنچتا تو وہ کسی اور کو تمہیں بچانے بھیج دیتا۔ میرے

لئے تو یہ اعزاز کی بات ہے کہ اُس نے مجھے اس کام کے لئے چنا۔" پرسکون لہجہ گویا ہوا۔ اریب کئی لمحے اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔ وہ پٹی کھول چکا تھا۔ ناخن کھال سے جدا تھا۔ درد کی ایک ٹیس نے جنم لیا مگر وہ اس کو برداشت کر گیا۔

"اس کی صفائی کر کے دوبارہ پٹی کر دیتا ہوں۔" اس نے احتیاط سے اریب کا پاؤں زمین پر رکھا اور اٹھ کر وارڈ روب سے فرسٹ ایڈ بکس نکالا۔ اس میں کئی محلول کی شیشیاں اور دیگر ادویات تھیں۔

"آپ کا میرے ساتھ تعلق کیا ہے؟" اس نے گردن کو خم دے کر سوال کیا۔ وہ چونکا۔ قدم پل بھر کے لئے رک گئے مگر وہ اپنے اعصاب پر جلد ہی قابو پا چکا تھا۔ انبساط کو لبوں پر بکھیر کر وہ دوبارہ اس کے سامنے آبیٹھا اور پٹی کرنے میں مگن ہو گیا۔

"انسانیت کا۔" اس نے بڑے ہی سوچنے کے بعد جواب دیا تھا۔ اریب خاموش رہا۔ بس اس کو دیکھتا رہا جس میں کچھ تو ایسا تھا جسے دیکھ کر اسے سکون ملتا تھا۔ خون کا نہ صحیح مگر روح کا رشتہ ضرور تھا۔ جو اپنائیت کی ایک کسک اس کے وجود سے پھوٹتی دیکھائی دے رہی تھی۔

"آہ۔" عالمگیر کا ہاتھ انجانے میں اس کے ناخن سے ٹکرایا تو وہ کراہ اٹھا۔

"سوری...... غلطی سے لگ گیا۔" وہ خود بھی تڑپ اٹھا تھا۔ اریب نے اپنا کرب اس کے چہرے پر محسوس کیا تھا۔ تبھی ابدال کی شکل نگاہوں میں لہرانے لگی۔

"کیا ہی اچھا ہو دنیا میں سب لوگ آپ جیسے ہوں۔" ایک ملال اس کے لہجے میں تھا۔ عالمگیر نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ اپنی ہی سوچوں میں غرق تھا۔ آنکھوں میں نفرت اور بدلے کی اخگر دیکھائی دی۔

"یہ دنیا خیر و شر سے مل کر بنی ہے اریب۔ یہاں یکسانیت کا مطلب ہے جمود۔ سب میں خیر و شر کا مادہ ہے۔ بس انسان کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔" اس نے مختصر کہا اور پھر اپنا کام خاموشی سے کرنے لگا۔ اریب کی استفہامیہ نگاہیں اس کے چہرے کو ٹٹولتی رہیں۔

"کاش ایسا ہوتا مگر ابدال میں کوئی خیر ہو ہی نہیں سکتی...... قطعاً نہیں ہو سکتی۔" اس کے گمان میں یقین کا عنصر شامل تھا۔ اس کے دل میں اب ابدال کے لئے صرف نفرت تھی۔ اس لئے نہیں کہ اُس نے اسے کڈنیپ کیا، اس کو بیچنا چاہا بلکہ اس لئے کہ اسے بیچ کر گھناؤنی دنیا کا حصہ بنانا چاہا۔ اس کی عزت کو نیلام کرنا چاہا۔ اس کے وجود کی قیمت لگائی وہ بھی ایسے ہاتھوں میں، جہاں برائی پلتی ہے۔

"آئی ہیٹ یو ابدال۔" اس کا لہجہ انتہائی دھیمہ تھا۔ شاید عالمگیر ان لفظوں کو نہ سن سکا تھا تبھی گردن اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

"میرے دل میں تمہارے لئے صرف نفرت ہے۔ تم میرے، میرے بابا جان اور میری فیملی کے دشمن ہو اور میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا، کبھی نہیں۔" دہکتی نگاہوں کے شعلے اب بجھتے دیکھائی دیئے۔ وہ اب آرام کرنا چاہتا تھا اور جلد سے جلد صحت یاب ہو کر ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹنے کے لئے تیار تھا اور اس کے لئے وہ عالمگیر کا احسان مند تھا۔ جس نے اپنی جان پر کھیل کر اسے درندوں سے نہ صرف بچایا بلکہ اسے ایک نئی زندگی دی۔ موت کا قہر برساتے بادلوں کے نیچے خوشگوار زندگی کی چھت دی۔ وہ پوری زندگی عالمگیر کے

اس احسان کو نہیں بھول سکتا تھا۔ اس کے بدلے اگر وہ اس کی جان بھی مانگتا تو اریب وہ بھی بخوشی دے دیتا۔

☆......☆......☆

سکھ کا موسم خیال وخواب ہوا......!

سانس لینا بھی اب محال ہوا......!

زخم تو بھر گئے مگر وہ نشان اس کے جسم پر نقش ہو چکے تھے۔ جنہیں وہ مٹانا نہیں چاہتا تھا مگر عالمگیر کی دن رات کی تیمارداری نے اس کے زخموں کو مندمل کر دیا تھا۔

"آپ اتنی پرواہ کیوں کرتے ہیں میری؟" وہ کھانے کی میز پر آج خود سے چل کر آیا تھا۔ آج کئی دن بعد وہ لڑکھڑایا نہیں تھا۔ ایسا لگا جیسے آج وہ دوبارہ چلنا سیکھا تھا۔ عالمگیر دیکھ کر مسکرایا۔ وہ فارک سے پیز اسلائس منہ کی طرف بڑھا رہا تھا۔ سرونٹ نے آگے بڑھ کر اریب کے لئے کرسی کھسکائی۔ اریب وہاں بیٹھ گیا۔

"انسانیت کے ناتے سے۔" اس نے ہمیشہ کی طرح مبہم سا جواب دیا تھا۔

"لیکن میری طرح کئی اریب ہونگے اس دنیا میں، جنہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔ آپ ان کی مدد کیوں نہیں کرتے؟" ایک سوال جو اس کے دل میں کھٹک رہا تھا۔ آج ہر حال میں اسے جواب چاہئے تھا۔

"لیکن ان سب کے نام کے آگے عالمگیر تو نہیں ہوگا ناں......؟" اس نے بات کا رخ مزاح کی طرف موڑا۔ اریب بھی بجھے لہجے میں مسکرا دیا۔

"اس کا مطلب آپ اپنے ہمنام کی ہی مدد کرتے ہیں؟" اریب نے بے تکی بات پوچھی تھی۔ سرونٹ نے جوس کا گلاس رکھا۔ اریب نے ہاتھ بڑھا کر اسے منہ کی طرف بڑھایا۔

"ہنوں...... کہہ سکتے ہو۔" پیزے کی سلائس منہ میں چباتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ اریب چونکا۔ وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا مگر شاید وہ ان سوالوں کو بھی ٹال دیتا۔

"ویسے مجھے بھی تم سے ایک بات کرنی ہے۔" اس نے فارک کو رکھا اور ڈکار لیتے ہوئے کہا تھا۔

"جی کہیں۔" ہمہ تن اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم کل یہاں سے جا سکتے ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ مجھے آج شب ہی یہاں سے جانا ہے۔ تم رات یہاں بسر کر سکتے ہو۔ صبح ڈرائیور آئے گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔" وہ یہ کہتے ہوئے کھڑا ہوا۔ وہ اریب سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اریب کافی حیران ہوا۔ وہ بے اعتنائی برتتے ہوئے تھا۔

”لیکن۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا تھا۔ عالمگیر پلٹا، وہ اس کی نگاہوں میں ایسا الجھا کہ الفاظ بھول گیا۔ نظریں جھک گئیں۔

”کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”نہیں۔ بس شکریہ کہنا تھا۔“ وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ حالانکہ ذہن اس کی نفی کر رہا تھا مگر لب خاموش تھے۔ وہ آگے بڑھا۔ اس کے پاؤں کی طرف دیکھا۔ وہ اب قدرے بہتر تھے۔ واپس مڑا اور ملازم سے کچھ ڈاکیومنٹس اور بریف کیس لیا۔ وہ دونوں اس وقت لاؤنج کے دوسرے کنارے کھڑے تھے۔ اریب ان کی گفتگو سننے سے قاصر تھا۔ بس لب ہلتے دیکھ سکتا تھا۔ عالمگیر اسے ہدایات دے رہا تھا۔

”کاش، میں آپ کے اس احسان کا بدلہ اتار سکتا!“ ایک حسرت ابھری تھی مگر وہ ایسی دعا نہیں دے سکتا تھا۔ جو اس پر بیتی، وہ دشمن کے بارے میں بھی گمان کرنا مشکل تھا۔

اریب وہاں کھڑا رہا، یہاں تک کے ملازم لوٹ آیا۔ وہ جا چکا تھا۔ پتا نہیں اب وہ اس سے مل بھی سکے گا یا نہیں؟ اس نے سوچا اور پھر پلٹا۔ اس کے چال لڑکھڑانے لگی۔ درد ایک بار پھر بڑھنے لگا تھا۔

”خدا کسی دشمن کو بھی اس دور سے آشنا نہ کرے۔“ اس نے درد برداشت کرتے ہوئے سوچا تھا تبھی ابدال کا عکس لہرایا۔ وہی حقارت اور نفرت کے جذبات ابھرنے لگے۔ اس کا کمرہ زینے کے بائیں جانب تھا۔ وہ اسی طرف بڑھا۔ ایک لمحے کے لئے زینے کا سہارا لے کر گہرا سانس لیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

اب کے اپنے آنسوؤں کے سب شکستہ آئینے
کچھ زمانے کے لئے، کچھ اپنی تنہائی کے نام

اس کی واپسی پر بھی کسی نے استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ خود حیران تھا۔ سب معمول کے مطابق اپنے کاموں میں مشغول تھے۔ پریشے کسٹمر سے ڈیل کر رہی تھی۔ اِندر ایک کلائنٹ کا سامان اٹھائے لفٹ سے باہر آیا تھا۔ علوی لابی کی طرف جا رہی تھی۔ وہ ہر شے کو گھورتا ہوا ریسیپشن کی طرف آیا تھا۔

”السلام علیکم!“ اس نے پریشے سے چونکنے کی امید کی تھی مگر وہ خلاف توقع مسکرائی اور رسمی علیک سلیک کیا۔ اریب چونکا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا جواب دوبارہ کسٹمر کو ڈیل کر رہی تھی۔

”کسی کو میری پرواہ نہیں تھی؟ یا پھر انہیں یہ لگ رہا ہے کہ میں کرن اور ایمشا کے ساتھ تھا۔“ وہ سوچتے ہوئے اپنے روم میں پہنچا تھا۔ آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا تو سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ وہی چہرہ، وہی انداز۔

اس نے بغور دیکھا تو آنکھوں کے نیچے کچھ حلقے نظر آئے۔ وہ انہیں دیکھتا رہا۔ گزرا پل ایک بار پھر ادھورے خواب کی طرح لہرایا

تھا۔ وہ ہونقوں اس میں غرق رہا۔ نگاہیں پاؤں کے انگوٹھوں کی طرف گئیں تو ناخن کھال سے الگ تھے۔ چلنا محال تھا مگر وہ چلنا سیکھ چکا تھا۔ ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ اگر عالمگیر نہ ہوتا تو شاید ایسا ممکن نہ ہوتا۔

وہ بیڈ پر آ کر ستانے لگا۔

''ابدال تم اس قدر گھٹیا ہو سکتے ہو میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ فقط اپنے مفاد کی خاطر کسی کی زندگی سے کھیل سکتے ہو؟ خیر...... تم جیسے درندے کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن ایک بات ذہن میں بٹھا لو۔ میں تم سے کبھی ہار نہیں مانوں گا۔ تم اگر میری آخری سانس بھی مجھ سے چھین لو تب بھی میں تمہارا مقابلہ کروں گا اور ہاں ایک بات یاد رکھنا، میں نے زندگی میں کبھی کسے کے لئے بغض نہیں رکھا اور نہ ہی نفرت کے بیج کو اپنے دل میں پنپنے دیا لیکن تم نے اس رِیت کو بدل دیا ابدال، مجھے نفرت کرنا سکھا دیا ہے۔ آج میرے دل میں تمہارے لئے فقط نفرت ہے۔ مجھے تم پر نہ ہی رحم آتا ہے اور نہ ہی ہمدردی کا کوئی عنصر دل میں پروان چڑھتا ہے۔ پوری دنیا میں آج میں جس وجود سے سب سے زیادہ نفرت کرتا ہوں وہ تمہاری ذات ہے ابدال...... فقط تمہاری ذات۔'' اس نے ایک میسج ٹائپ کر کے اسے سینڈ کیا۔ ایسا اس نے کیوں کیا؟ شاید وہ خود نہیں جانتا تھا۔ آنکھوں میں عجب سی کشمکش تھی۔ نہ ہمدردی، نہ ہی کوئی صلہ رحمی...... پہلی بار نفرت کا دھواں اس کے دلِ ویراں میں بھٹک رہا تھا۔ وہ اس دھویں کو دل کی نگری سے آزاد کرنا چاہتا تھا مگر بے بس رہا۔

اگلے دن وہ جب یونیورسٹی پہنچا تو گمان کیا کہ شاید ایشا اور کرن اس کے یوں اچانک غائب ہونے کا پوچھیں تو اسے یہاں بھی شدید حیرت ہوئی۔ وہ دونوں بالکل نارمل دکھائی دے رہے تھے۔ وہ حیرت کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

''یار اگر تجھے واپس ہاٹل ہی جانا تھا تو کہہ دیتا۔ یوں بنا بتائے واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' کرن کی بات پر وہ خاصا حیران ہوا تھا اور کئی لمحے اس کے چہرے کی طرف بے یقینی کے ساتھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے حقیقت سے آشنا کرے یا اسی دھوکے میں رہنے دے۔ ایشا نے بھی سرسری سی بات کی تھی۔ لیکچر کے دوران وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن خالی کاغذ پر آڑی ترچھی لکیریں ہی کھینچتا رہا۔ اس کا ذہن واقعی بری طرح الجھا ہوا تھا۔

''آج کے لیکچر میں کچھ خاص تو تھا نہیں۔ بس ایک ہی اچھی خبر ملی نیکسٹ ویک مڈ ہیں اور تب تک آرام سے تیاری کرنے کے لئے چھٹیاں۔'' کرن تو یہ سُن کر خاصا پرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بناوٹی انداز میں مسکرایا مگر کسی نے سبب نہ پوچھا۔ ایشا اور کرن آپس میں باتیں کرتے رہے جب کہ اس کا وجود وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہ تھا۔ آسمان کے بدلتے تیور، معمولی سی گھٹا، مدہم سی روشنی اور ہوا کے نرم نرم جھونکے، دل کی نگری کو کسی قفس میں دھکیل چکے تھے۔ وہ مسکراتا مگر اذیت کے ساتھ۔ جواب دیتا مگر مختصر۔

''ویسے کیا پلان ہے؟ تمہارا؟'' کرن نے اریب سے پوچھا تھا۔ وہ چونکا۔ جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

''کچھ خاص نہیں۔'' اس نے مختصر کہا تھا۔ اپنا چہرہ ایک بار پھر پھیر لیا۔

”ویسے میں سوچ رہی ہوں، جکارتہ چلی جاؤں۔ کچھ دنوں کے لئے۔ کافی دن ہو گئے گھر والوں سے بھی نہیں ملی۔“ ایشا نے اپنا پلان بتایا تھا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ اگر تم چلی جاؤ گی تو میرا من کیسے بہلے گا؟“ کرن نے شوخ انداز اپنایا۔ اریب نے دل میں جھانکا تو وہاں ایک زلزلے کی سی کیفیت تھی۔ سب کچھ اتھل پتھل سا تھا۔ ایک پل کے لئے بھی چین میسر نہ تھا اور اسے سکون چاہیئے تھا۔

”شاید مجھے بھی پاکستان جانا چاہیے۔“ اس نے دل میں سوچا تھا۔

رات گئے وہ یہی سوچتا رہا۔ دائیں جانب کروٹ لئے وہ کھلی کھڑکی میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

صاف آسمان، جہاں کہیں روشنی نہ تھی۔ اس کے دل کے مرادف تھا۔ بے داغ مگر اکیلا۔ نہ ہی کوئی ہمنوا، نہ ہی کوئی غم گسار۔ آنکھوں کی پتلیاں یک ٹک آسمان کو تک رہی تھیں۔ جیسے بن لفظوں کے گفتگو کر رہی ہوں۔ کچھ اپنی سنا رہی ہوں اور کچھ اس کی سن رہی ہوں۔ دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے وہ جانے کون سے پہر تک جاگتا رہا تھا۔

خاموشی کا تسلسل جاری تھا تبھی اس کی پشت کے عین پیچھے پڑا موبائل بجنے لگا۔ ماتھے پر حیرت کے شکن نمودار ہوئے۔ اس نے الارم کی طرف نگاہ دوڑائی تو آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہو چکا تھا۔

”اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ اس نے سوچتے ہوئے موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نمبر دیکھنے پر اس کے پورے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ زخم ایک بار پھر ہرے ہو گئے۔ اس نے کڑھتے ہوئے فون ریسیو کیا تھا۔

”تم کتنے گھٹیا اور بے شرم ہو۔ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی تمہیں سکون نہیں ملا؟ جو دیدہ دلیری سے دوبارہ فون کر بیٹھے۔“ وہ دھیمہ لہجہ اپنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا مگر رات کے اس پہر اس کا دھیمہ لہجہ بھی اپنے اندر سختی کے نمایاں پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ گاؤ تکیے کو کمر کے پیچھے سرکاتے ہوئے اٹھ بیٹھا تھا۔

”جناب بہت غصے میں لگ رہے ہیں۔“ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جملہ ادا کیا گیا تھا۔

”مجھے تم پر غصہ نہیں آرہا مسٹر ابدال بلکہ ترس آرہا ہے۔ تم جیسے لوگ آج کو دیکھتے ہو لیکن کل جب وقت تمہیں بری طرح پچھاڑے گا تب کیا حال ہو گا تمہارا؟ تم کہیں کے نہیں رہو گے۔“ ایک پل کے لئے اس نے توقف کیا۔ جواب میں ابدال بھی کچھ نہ بولا۔

”جو حرکت تم نے کی تھی۔ اس میں اگر مجھے کچھ ہو جاتا تو میری فکر کرنے والے میرے گھر والے موجود تھے مگر تم جیسے بدمعاش کے لئے آنسو بہانے والی آنکھیں بھی دنیا میں موجود نہیں ہوتیں۔“ اس کے دل میں انتہا کی کڑواہٹ تھی۔ لفظ اس کی بھرپور عکاسی کر رہے تھے۔

”جو کہنا ہے کہہ لو جناب۔ آخر اتنے بڑے حادثے سے تو بچے ہو۔“ لہجے میں ہمدردی تھی یا پھر طنز؟ اریب کے لئے برابر تھا۔

”حادثہ تو بہت معمولی بات ہے ابدال۔ میرے خدا نے مجھے تمہارے مکر سے بچایا ہے ورنہ تم نے تو کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی

مجھے برباد کرنے کے لئے لیکن کہتے ہیں ناں، جسے خدا رکھے اسے کون چکھے؟ تم نے میرا برا چاہا جبکہ اسی شہر میں ایک انجان آدمی نے تمہارے مکر سے نہ صرف مجھے بچایا بلکہ ان کئی جانوں کو بھی جن کی زندگی تم جہنم بنانا چاہتے تھے۔ پہلے تو میں سوچتا تھا کہ یہاں کے لوگ برے ہیں۔ جس ملک کا صدر اپنے وقت کا کرپٹ ترین آدمی رہا ہو۔ وہاں کے باشندوں سے بھلائی کی امید کرنا قطعاً کم عقلی ہے مگر نہیں۔ یہ میری بھول تھی۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں۔ جہاں جہاں برائی ہوتی ہے وہاں وہاں اچھائی جنم ضرور لیتی ہے۔ اگر تم اس ملک کے بدترین شخص ہو تو عالمگیر اس ملک کا احسن ترین شہری۔ جس قدر میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ عالمگیر کی عزت کرتا ہوں۔'' ہوا بھی اس کے لفظوں کو اپنے اندر ضم کر رہی تھیں تبھی ان کی سرگوشیاں بھی تھم چکی تھیں۔ دوسری طرف بھی خاموشی تھی۔ گہری خاموشی جیسے شور کا خاتمہ کیا جا چکا ہو۔ سانسوں کی روانی رک چکی ہو۔ اریب اس خاموشی کو سنتا رہا۔ اس بار اسے خاموشی بری نہیں لگی تھی اور نہ ہی اس کے سر میں درد ہوا تھا۔ وہ اس کا عادی تھا۔ اس بار یہ خاموشی اپنے اندر کئی سوالوں کو سینتے ہوئے تھی۔ جس کا جواب اریب کے پاس موجود تھا۔

''خاموش رہنے سے کچھ نہیں ہوگا مسٹر ابدال! اگر تم اپنے گریبان میں بھی جھانکو گے ناں تو سوائے ندامت کے کچھ بھی نہیں ملے گا مگر افسوس نادم ہونے کے لئے ضمیر کا زندہ ہونا بہت ضروری ہے مگر تم جیسے درندے تو سب سے پہلے اپنے ضمیر کا ہی خون کرتے ہو۔ میں کہنا تو نہیں چاہتا مگر تمہاری سازشوں نے مجھے یہ کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ خدا کرے تمہارے کسی اپنے کے ساتھ...... جسے تم بے پناہ چاہتے ہو...... یہ سب ہو جو تم میرے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ تب تمہیں معلوم ہوگا کہ اپنوں کا غم کیا ہوتا ہے۔'' گندھا ہوا لہجہ بددعا دینے سے بھی قاصر تھا۔ آواز میں عجیب سا لرزاں طاری تھا۔ ذہن بھی ماؤف سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اٹھ کر بالکونی کے پاس آچکا تھا۔ رات کا اندھیرا مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

''اریب!'' وہ چلایا تھا۔

''کیا ہوا؟ بھڑک کیوں گئے؟'' وہ استہزائیہ مسکرایا مگر اسے احساس ہوا کہ صحیح سے ہنس بھی نہیں پایا تھا۔ شاید پچھلا وقت اب بھی آنکھوں کے سامنے تھا۔

''بے فکر رہو تم اس غم کو کبھی محسوس نہیں کر سکتے کیونکہ یہ غم سہنے کے لئے کسی اپنے کا ہونا لازم ہے اور مجھے یقین ہے تمہارا کوئی اپنا اس وقت تمہارے پاس نہیں ہوگا۔ تم جیسے آدمی تو اپنے سگے بھائی کو نہیں بخشتے تو میں چیز ہی کیا ہوں؟'' خاموشی کا نیا تسلسل شروع ہوا مگر اس بار خاموشی میں عجیب سے درد کی آمیزش تھی۔ کئی چہرے اس کی آنکھوں میں لہرائے تھے۔ آنکھوں کا پانی پلکوں کے کنارے بھگو رہا تھا۔ دل کے بھرے جذبات ساحل کے متلاشی تھے اور وہ بے قرار آنکھوں سے اسی ساحل کو ڈھونڈتا دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں اس کے اپنے تھے۔ اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس کو چاہتے تھے۔

جہانزیب عالمگیر کا اسے پڑھائی کیلئے منانا۔ اس کی من پسند کار سولھویں سالگیرہ پر گفٹ کرنا۔

حسام کا آتے جاتے اس کے بالوں کو خراب کرنا اور اس کا ناک منہ چڑھاتے ہوئے تیوری چڑھانا۔ سب کچھ اس کی آنکھوں میں آئینہ تماثل کی طرح شفاف تھا۔

جبیں کا بات بات پر جھگڑا کرنا مگر اس جھگڑے میں چھپی اپنائیت وہ آج اچھے سے محسوس کر سکتا تھا۔

سحر فاطمہ کا روزانہ رات کو اس کے کمرے میں آ کر دیکھنا کہ وہ سویا یا نہیں۔ اس کی پیشانی پر بوسہ دینا۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے موبائل کو مضبوطی سے پکڑ کر گہری سانس لی تھی۔ پرائے دیس میں آج اسے اپنوں کی شدت سے یاد آئی تھی۔

حاعفہ کا نکاح کے بعد یکسر بدل جانا۔ اتنی محبت دینا جتنی اس نے گمان بھی نہ کی تھی۔

''اپنوں کا پیار قسمت والوں کو ملتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایسی ہی قسمت پائی ہے جس میں محبت کی چادر آسمان کی طرح چاروں اور پھیلی ہوئی ہے۔'' گندھا ہوا لہجہ گویا ہوا تھا۔ دوسری طرف یکسر خاموشی تھی۔ جیسے وہاں کوئی موجود ہی نہ ہو۔ بالکل ویسی خاموشی جیسا وہ دو دہائیوں سے محسوس کرتا آ رہا تھا۔

''آج تمہارے خاموش رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ نہ ہی تمہارے جرم کم ہونگے اور نہ ہی میں کبھی تمہیں معاف کر سکوں گا۔'' اس نے آخری بات کہی اور خود کال ڈسکنیکٹ کر دی۔

''بس کچھ دن کی مہلت دے رہا ہوں میں تمہیں ابدال۔ میرے واپس آنے تک جو منصوبہ بنانا ہے بنا لو تم کیونکہ اس بار میری واپسی تمہارے لئے قہر بن کر نازل ہوگی۔ میں ٹوٹا ضرور ہوں مگر میرے قدم ڈگمگائے نہیں۔ میں کل تک صرف تمہاری شناخت چاہتا تھا اور آج میں تمہیں سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے گناہوں کی سزا تمہیں اگلے جہاں میں تو ملے گی ہی مگر اس جہاں میں بھی تم جیسے لوگوں کی سزا صرف ظلمت ہے اور میں بنوں گا تمہارے اس ظلمت کا سبب۔'' اس نے رندھے ہوئے لہجے میں اپنے آپ سے عہد لیا تھا مگر آنسو تھے کہ بے آب ماہی کی مثل پلکوں پر چمکنے لگے۔

☆......☆......☆

عدل پرور، کبھی حساب تو کر!
ظلم کس کس پہ بے حساب ہوا؟

زندگی خواب تھی یا حقیقت؟ وہ اس گمان سے بے نیاز واپسی کی راہ اختیار کر چکا تھا۔ ذہن الجھنوں میں جکڑا ہوا، جانے کون سے تانے بانے بنتا جا رہا تھا مگر دل تھا کہ ایک نکتے پر اٹکا تھا۔ وہ نکتہ ابدال کی ذات کے سوا کیا ہو سکتا تھا؟ لاکھ اس واقعے کو بھلانا چاہا مگر جذبات پر لگی ایک ضرب بھلا کہاں اتنی جلدی مٹا کرتی ہے؟ اس کے بھی جذبات مجروح کئے گئے تھے۔ تبھی وہ ان کے انتقام کا ارادہ رکھتا تھا مگر ہوش کا دامن تھاما۔ وقت کے سمندر کو ذرا بہنے دیا تا کہ بہاؤ میں کمی آئے اور وہ اپنی چال بہتر انداز میں چل سکے۔

اریب کی اچانک واپسی پر تقریباً سب گھر والے چونکے تھے۔جبیں جولان میں بیٹھی چائے کا مزہ لے رہی تھی۔اریب کو وہاں اپنا گمان سمجھا اور گردن جھٹک دی۔

''لگتا ہے اریب سے لڑے کافی دن گزر گئے ہیں، اس لئے وہ دیکھائی دے رہا ہے۔'' اس نے سوچا تھا۔دھیرے سے مسکرائی اور اپنا رخ چنبیلی کے حسین پھولوں کی طرف کیا۔جو معطر خوشبو ہوا میں بکھرنے کی جستجو میں تھے۔

ہری ہری گھاس پر وہ دھیمے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔لبوں نے مسکرانا چاہا تھا مگر جانے کیوں مسکرا نہ سکا۔کیا وہ مسکرانا بھول چکا تھا؟ دل میں ایک ملال تھا مگر وہ اسے عیاں کرنے کے بھی حق میں نہ تھا۔تبھی بناوٹ کا لبادہ مستعار لے آیا تھا۔جبیں کے سامنے رکھے بسکٹ کی پلیٹ کو جھک کر اٹھایا۔جبیں نے بے دھیانی میں اپنا ہاتھ بڑھایا تو وہ خالی ٹیبل سے ٹکرایا۔

''یہ میرے بسکٹ......؟'' جملہ ادھورا رہ گیا۔وہ اریب کو وہاں دیکھ کر بری طرح چونکی تھی۔آنکھیں حیرانی سے پھیلتی چلی گئی۔ چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا۔

''اریب تم؟'' بے یقینی انداز میں استفسار کیا گیا تھا۔

''نہیں......میرا بھوت۔جو تم سے لڑنے آیا ہے۔'' شریر لہجہ بھی جبراً اپنایا گیا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں چمک وہ نہیں تھی، جو اکثر ہوا کرتی تھی۔وہ مسکراہٹ جو حقیقی ہوتی تھی۔آج کوسوں دور تھی۔

''سچ......مجھے یقین نہیں آ رہا۔تم یہاں پاکستان......وہ بھی اچانک۔'' وہ خوشی کے سبب الفاظ بھول چکی تھی۔

''ماما جان......بابا جان......دیکھیں کون آیا ہے۔'' وہ چلائی تھی۔بس نہیں چلا ورنہ اعلان کر دیتی۔اریب نے گردن جھٹکی اور ایک بسکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گیا۔

''کون آ گیا جو تم اتنا شور مچانے لگ گئی؟'' یہ سحر فاطمہ کی آواز تھی۔جو اندر سے ابھی لان میں آئی تھیں۔ان کے پیچھے حاعفہ بھی تھی۔اریب کی پشت سحر فاطمہ کی طرف تھی۔

''اب تم بچی نہیں ہو جبیں جو ایسے شور مچا رہی ہو۔'' سحر فاطمہ نے بنا دیکھے ہی سرزنش کر ڈالی تھی۔

''ماما جان دیکھیں تو صحیح کون آیا ہے؟ پھر مجھے ڈانٹ بھی لیجیے گا۔'' اس نے اریب کی طرف اشارہ کیا تھا۔جو زیرلب مسکرا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا سحر فاطمہ اسے دیکھ کر خاصا حیران ہونگی۔اسی لئے وہ بنا بتائے چلا آیا تھا۔

''کون آیا ہے؟'' ابرو اچکاتے ہوئے انہوں نے نظریں کرسی پر جمائیں۔حاعفہ بھی اب ادھر ہی دیکھ رہی تھی۔اریب گہرا سانس لیتے ہوئے کھڑا ہوا اور یکدم پلٹا تھا۔اریب کو اپنے سامنے دیکھ کر سحر فاطمہ تو جیسے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔حاعفہ کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔نکاح کے بعد پہلی بار وہ انڈونیشا سے واپس آیا تھا۔

"اریب......تم یوں اچانک؟" سحر فاطمہ نے فی الفور آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ وہ مسکرایا اور سحر فاطمہ کے دونوں شانوں کو اپنے ہاتھوں سے پکڑا۔

"ماں اپنے بیٹے کو یاد کرے اور بیٹا ماں کی پکار پر لبیک نہ کہے، بھلا ایسا ممکن ہے؟" ایک کسک اس کے دل میں ابھری تھی۔ اس نے اپنی ٹھوڑی سحر فاطمہ کے کندھے پر رکھی۔ سحر فاطمہ نے اس کی پشت تھپتھپائی تو جانے کیوں اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ فریبی دنیا کے چنگل سے زندہ بچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ ایسا مسکن جو اسے کبھی نقصان نہیں پہنچائے گا، مل چکا ہو۔ اس نے پلکیں جھپکیں تو ایک قطرہ ہری ہری گھاس کو جو سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی شبنم کو اپنے اندر سمیٹتی ہے۔ آج اس کے ابر نیساں سے فیض یاب ہوئی تھی۔

"اگر اتنی فکر ہوتی اپنی ماما جان کی تو یوں چھوڑ کر ہی کیوں جاتے؟" سحر فاطمہ نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔ اس نے انگوٹھے سے چمکتی پلکوں کو صاف کیا اور ایک مسکراہٹ لئے سحر فاطمہ کے سامنے اپنا چہرہ کیا۔

"جانا ضروری تھا لیکن آنا اس سے بھی زیادہ کیونکہ اب پیاری سی ماما جان کے ساتھ ایک عدد بیوی بھی تو ہے۔" اس نے حاعفہ کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اریب کی اس جملے پر تو جیسے وہ آب آب ہو گئی۔ پلکیں جھکتی چلی گئیں۔ پلو کو اپنی انگلیوں میں نوچتے ہوئے وہاں سے فوراً کھسک گئی۔ سحر فاطمہ سمیت اریب اور جبیں بھی مسکرا دیئے۔

"حاعفہ تو لگتا ہے اپنے شوہر کو دیکھ کر شرما گئیں۔" جبیں نے کہنی اریب کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"شرم کرو تم۔ تمہاری بھابھی ہے۔" اریب نے فوراً ٹوک دیا۔

"بھابھی بعد میں، پہلے میری دوست ہے وہ۔" اس نے تصحیح کرائی۔

"لگتا ہے اریب لوٹ آیا ہے جو کبوتری اپنے ڈربے سے نکل آئی۔" یہ حسام کی آواز تھی۔ جو ابھی باہر سے آیا تھا۔ اریب کو دیکھ کر وہ بھی خاصا حیران ہوا تھا۔

"واؤ اریب۔ وٹس کا پلیزنٹ سرپرائز۔" اریب سے بغل گیر ہونے کے بعد وہ وہاں کھڑے کافی دیر باتیں کرتے رہے۔

"اب یہیں کھڑے کھڑے شام کرنے کا ارادہ ہے کیا؟ یا اندر بھی لے کر چلیں گے اریب کو؟" صبا نے یاد کروایا تھا۔ سب مسکرا دیئے۔ جہانزیب کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس لئے وہ کمرے سے باہر نہیں آئے تھے۔ بقول سحر فاطمہ کے وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی میڈیسن لے کر سوئے تھے۔ اریب نے بھی انہیں جگانا مناسب نہیں سمجھا۔

کھانے کی میز پر کافی گہما گہمی تھی مگر جہانزیب کی کمی ہر کوئی محسوس کر رہا تھا۔ پہلے اریب کی غیر حاضری ہوتی تھی اور آج جب وہ لوٹ کر آیا تو جہانزیب۔

''خیریت ہے حاعفہ؟ آج ضرورت سے زیادہ ہی نہیں کھانے بن رہے؟'' حاعفہ کچن سے نت نئی ڈشیں لا کر اریب کے سامنے رکھ رہی تھی۔ ایسے میں بھلا جبیں کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔ فورک کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے ہوئے اپنی نگاہیں اس پر جمائی تو وہ زیر لب مسکراتے ہوئے کچن کی مڑی۔

''روزانہ تو بس بریانی یا پھر قورمہ شورمہ ہوتا تھا اور آج تو کہاں بریانی؟ کہاں قورمہ؟ شامی کباب، کھیر، کوفتے، آلو گوشت...... لگتا ہے ڈشز کا مقابلہ چل رہا ہے ٹیبل پر۔''

''جبیں......'' سحر فاطمہ نے اسے ٹوکا تو اس نے جھرجھری لی۔

''ماما جان...... میں تو بس ایسے ہی کہہ رہی تھی۔ بھلا اریب یہ سب کیسے کھا سکتا ہے؟'' اپنا معاملہ صاف کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی تھی۔

''اب کیا میں اپنی بیوی کی محنت کو رائیگاں جانے دوں؟'' وہ بھی حاضر جواب تھا۔ حاعفہ اب جوس کا جگ لے کر آ رہی تھی۔ جبیں دیکھ کر مسکرا دی۔

''بے فکر رہو۔ یہ بھی پی لوں گا میں۔ تمہیں پینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اس کے من کی بات پڑھ چکا تھا۔ ناک منہ چڑھا کر کباب کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

''جب تم عکاس بھائی کے لئے بناؤ گی ناں یہ سب کچھ۔ تب بات کرنا۔'' اریب نے بھرپور جواب دیا۔

''توبہ...... میرا دماغ خراب ہے جو میں بلاوجہ اتنا سب کچھ بناؤں گی۔ آج کل ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے میرے بھائی۔ فون کس لئے ہے؟ آرڈر کیا اور تیس منٹ میں کھانا حاضر۔'' اس نے فرضی کالر کھڑے کئے۔

''باہر کے کھانوں سے دل نہیں جیتے جاتے جبیں۔'' حاعفہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ ڈالا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔ وہ تو میں جیت ہی لوں گی۔'' اس نے بے پرواہی سے کندھے اچکائے۔ سحر فاطمہ نے بھی گردن جھٹک دی۔

''ان کا کچھ نہیں ہو سکتا۔'' انہوں نے زیر لب کہا تھا۔ حسام خاموشی سے ان کی گفتگو سے حظ اٹھا رہا تھا۔

''حاعفہ تم تو کھا لو کھانا۔'' اریب نے حاعفہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سحر فاطمہ کو جوس دے رہی تھی۔

''آپ کو بہت فکر ہے......!'' حاعفہ کی بجائے جبیں نے ابرو اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

''کیوں ناں فکر کروں، آخر میری بیوی ہے۔'' معتجل جواب دیا گیا۔ صبا مسکرا دی۔

''یہ دونوں ایسے ہی ہیں؟'' اس نے دھیرے سے حسام سے پوچھا تھا۔

''بالکل۔'' سرگوشی میں جواب دیا گیا تھا۔

دل کے اندر پنپنے والے ان کہے جذبات ماحول کی تبدیلی سے جیسے بدلنے لگے تھے۔ ایک پل کے لئے اریب بھی ان وقت کی زنجیروں سے رہائی پا چکا تھا۔ تبھی دل سے مسکرا دیا۔ حاعفہ کی نگاہیں تو جیسے اریب کا طواف کر رہی تھیں۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ، دل میں محبت کی ایک لہر اور نگاہوں کے سامنے زندگی بھر ساتھ نبھانے والا وجود تھا۔ خواہشیں تو جیسے حقیقت تھیں اور قدرت کا ایک حسین تحفہ۔

☆......☆......☆

یہ سانولی سی فضائیں یہ بے چراغ نگر!

یہیں کہیں وہ ستارہ شناس رہتا ہے

ایک عرصے بعد سکون بھری رات اسے میسر آئی تھی۔ ایسی رات جس کی تہوں میں کوئی خلش نہ تھی۔ جس کے لمحے چالوں کی بو سے پاک تھے۔ جس کی فضا معطر سی معلوم ہوتی تھی۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں مگن بالکونی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ دونوں بازو سینے پر بندھے ہوئے، آنکھیں آسمان کو تک رہی تھیں۔ جانے کس شے کو تلاش کر رہی تھیں۔ اندھیرے نے اگرچہ ہر شے کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا مگر وہ اس ظلمت میں بھی کئی مبہم سے عکس کو دیکھ سکتا تھا۔ ایسے عکس جو بولتے ہوں۔ سنتے ہوں۔ سمجھتے ہوں۔ وہ ان عکس میں حرکت محسوس کر رہا تھا مگر سمجھنے سے قاصر تھا۔ ہواؤں کی اٹکھیلیاں اپنے جوبن پر تھی۔ پیشانی پر جھومتی زلفیں اس کے بدن کو گدگدا رہی تھیں۔

"کیا ہوا اریب؟ کن سوچوں میں گم ہیں آپ؟" ایک شیریں لہجہ گویا ہوا تھا۔ حاعفہ نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر استفسار کیا تھا۔ وہ چونکا اور دھیرے سے پلٹا۔ محبوب کا چہرہ سامنے تھا۔ جس چہرے کو وہ دن رات اپنے سامنے دیکھنا چاہتا تھا۔ جس پر اپنا حق سمجھتا تھا۔ آج پاس ہو کر بھی جانے کیوں مسافت پر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دل سے مسکرانا چاہتا تھا مگر لبوں پر اذیت بھری مسکراہٹ تھی۔ جسے حاعفہ سمجھنے سے قاصر رہی۔

"کچھ نہیں......!" اس نے نگاہیں پھیریں اور وارڈروب کی طرف پلٹا۔ حاعفہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ اریب کے چہرے پر یاسیت کے تاثر اس کے اندر ایک ہلچل مچا چکے تھے۔ وہ آگے بڑھی۔ اریب وارڈروب کا دروازہ وا کر چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سفید کرتا پاجامہ نکال کر اریب کے آگے کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے وہ لباس لیا اور پھر واش روم کی طرف چل دیا۔

"کوئی تو بات ہے جو اریب مجھ سے چھپا رہے ہیں۔" بے لگام سوچیں خود سے تانے بانے بنتی جا رہی تھیں۔ وہ کئی ثانیے مبہوت واش روم کے بند دروازے کو دیکھتی رہی اور پھر صوفے کی طرف پلٹی جہاں جائے نماز رکھا ہوا تھا۔ اس نے وہ جائے نماز اٹھایا اور بیڈ کے بائیں جانب بالکونی کے سامنے جائے نماز بچھا کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوئی۔

تقریباً دس منٹ بعد اریب واش روم سے باہر آیا تھا۔ بالوں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں۔ جنہیں وہ تولیے سے صاف کر رہا

تھا۔ آستینیں کہنیوں تک فولڈ کی ہوئی تھیں۔ وہ حاعفہ کے وجود کو بنا دیکھے ڈریسنگ کی طرف بڑھا اور تو معصوم سا چہرہ اپنے عکس کو دیکھ رہا تھا۔ آئینہ حاعفہ کے عکس کی نقش بندی کر رہا تھا۔ اریب کے ہاتھ ہوا میں معلق ہو گئے۔ نگاہیں حاعفہ کے عکس پر جا ٹھہریں جو طمانت سے اپنے رب کے آگے ہاتھ بلند کیے ہوئے تھی۔ سکارف میں لپٹا پر نور چہرہ چاند سے زیادہ سفید اور سورج سے زیادہ تابنا کی کو سمیٹے ہوئے تھا۔ زلفیں سکارف میں لپٹی تھیں جس بنا پر پیشانی معمول سے زیادہ کشادہ معلوم ہوتی تھی۔ بلند ہاتھ کیے وہ مسلسل اپنے لبوں کو تحریک دیے ہوئے تھی۔ وہ کئی لمحے اسے یونہی دیکھتا رہا۔ اس کا دل جو غبار سے آلودہ تھا۔ جانے کیوں اسے دیکھ کر تسکین حاصل کر رہا تھا۔ جس سکون کی تلاش میں تھا، وہ محض حاعفہ کے چہرے کو دیکھ کر اسے مل رہا تھا۔ ایک انجانی طاقت اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ بظاہر یہ کشش محبت کی تھی مگر ڈور کی منزل کہیں اور ہی جاتی تھی۔ حاعفہ محض ایک راہ تھی۔ منزل پر پہنچنے کا راستہ تھی۔ تسکین کا حاصل کچھ اور تھا۔ حاعفہ نے دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرا تو اریب نے جھر جھری لی۔ ہاتھ میں موجود ٹاول کو صوفے کی طرف پھینکا اور بالوں کو جھٹکا دیا۔ درمیان میں مانگ خود بخود نکلتی چلی گئی۔

حاعفہ جائے نماز اٹھاتی ہوئی پلٹی۔ ٹاول کو دوبارہ واش میں لے جا کر رکھا اور سکارف کو اتار کر دوپٹہ لیا۔ زلفوں کو آزاد ہونے کا موقع ملا۔ اریب پہلے ہی بیڈ پر آ بیٹھا تھا۔

"آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" وہ اب کمرے کا دروازہ بند کرنے جا رہی تھی تب اسے خیال آیا کہ ایک بار اریب سے پوچھ لے۔ اریب کی نگاہیں سامنے دیوار پر مرکوز تھیں۔ بے دھیانی میں لب متحرک ہوئے تھے۔

"سکون کی۔" وہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ حاعفہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ الفاظ اگرچہ مدہم سے تھے مگر وہ ہلتے لبوں سے ہی مفہوم سمجھ چکی تھی۔ پلٹ کر دروازہ لاک کیا۔ اریب کو اپنے الفاظ سمجھ آئے تو نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں۔"

بنا آواز کے قدم آگے بڑھے مگر ان قدموں میں بھی جیسے خزاں کے پتوں کی سی چرچراہٹ تھی۔ ایک آواز جو خاموش کمرے میں مسلسل گونج رہی تھی۔ ہر شے کو اپنے سحر میں بھی جکڑے ہوئے تھی۔

حاعفہ کے بیڈ پر بیٹھنے پر اریب نے گاؤ تکیہ کمر کے نیچے سیدھا کیا۔ حاعفہ کی نگاہیں اریب پر جا ٹھہریں۔ اریب دبی مسکراہٹ کے ساتھ حاعفہ کی طرف دیکھا تھا مگر یہ مسکراہٹ پل بھر کی مہمان ثابت ہوئی۔ حاعفہ کی یک ٹک نگاہیں اس مسکراہٹ کو کرچی کرچی کر گئی۔ جلد ہی وہ اپنی سنجیدگی پر لوٹ آیا تھا۔

"کیا ہوا؟ آپ کچھ اداس لگ رہے ہیں۔" حاعفہ نے ہمت کر کے پوچھا تھا مگر وہ اسے کیا بتاتا؟ نگاہیں پھیرتے ہوئے سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا کر اس پر میسج ریڈ کرنے کا بہانہ کیا۔

"نہیں...... میں بھلا کیوں اداس ہونے لگا؟" اس نے ایک بار پھر دبی مسکراہٹ کا سہارا لینا چاہا مگر خلوص کے اس رشتے نے

جیسے ہر سچائی کو عیاں کر دیا تھا۔اس نے اپنا چہرہ اریب کی طرف کیا۔اس کا ہاتھ جو لحاف پر تھا اٹھا کر تھاما۔اریب کے جسم میں جیسے ایک لہر سرایت کر گئی۔محبت اور نرمی سے بھرا یہ لمس اس کے دل ویراں میں ہلچل مچا رہا تھا۔جذبات کا سمندر سونامی کی شکل اختیار کر چکا تھا مگر وہ انہیں ضبط کئے رہا۔

''ادھر دیکھیں اریب۔''اس نے نرم گوشہ اپنایا تھا۔اریب کی نگاہیں کسی سست رفتار گھونگے کی مثل حاعفہ کے چہرے کی طرف جا رہی تھیں۔منزل اگرچہ وہی تھی مگر راستہ جانے کیوں پر خطر لگ رہا تھا۔

حاعفہ نے اپنا دوسرا ہاتھ اریب کی طرف بڑھایا اور اس کے بائیں رخسار کو ہلکا سا چھو کر اپنی طرف کیا۔لمس کا جام بدن کے ایک ایک حصے نے پیا تھا۔وہ بے ساختہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

پر مطمئن چہرہ اسے اپنے ہونے کا یقین دلا رہا تھا اور وہ تھا کہ اس چہرے سے بھاگنے کی کوشش میں سرگرداں تھا۔اسے وہ وقت یاد آیا جب وہ ان لمحوں کے لئے ترستا تھا اور آج جب قدرت نے وہ لمحے اس کے دامن میں ڈالے تو وہ کیسے ناشکری کر رہا تھا۔قدرت کے اس حسین تحفے کی ناقدری کر رہا تھا۔شاید وقت بدل چکا تھا۔وقت کی ایک ضرب نے ہر خواہش، ہر محبت کو اس کے دل سے نکال کر بے ذائقہ کر دیا تھا۔کوئی لمس، کوئی راحت اس کے لئے سکون کا باعث نہ تھی۔وہ بے یقینی کے عالم میں تھا اور یقین کا متلاشی تھا۔آنکھوں کے کنارے ایسے خشک سالی کا شکار تھے جیسے برسوں سے کوئی قطرہ بارش کا ان کو چھو کر بھی نہ گزرا ہو۔وہ یک ٹک اسے دیکھا جا رہا تھا۔

''میں جانتی ہوں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے جو آپ کو اندر ہی اندر سے کھائے جا رہی ہے۔میں آپ سے یہ بات پوچھ کر آپ کو مزید پریشان نہیں کرونگی مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی بات کو اپنے دل کے قبرستان میں رکھنے سے درد کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔اگر کوئی بات آپ کو پریشان کر رہی ہے تو اس کا تذکرہ اس ذات سے کریں جو اس درد پر مرہم لگانے کی طاقت رکھتا ہے۔جو اس درد کو کم کر سکتا ہے۔''وہ پورے یقین سے کہتی جا رہی تھی اور اریب کی ذات مبہوت حاعفہ پر نظریں گاڑھے ہوئے تھی۔

''مجھے تو ایسی کوئی ذات نظر نہیں آتی۔''تغافل سے لبریز لہجہ دھیرے سے گویا ہوا تھا۔الفاظ کا مفہوم مجازی لیا گیا۔

''وہ اس لئے کہ کیونکہ آپ کے دل پر ایک غبار ہے۔آپ اس غبار کو ہٹائے بنا اس ذات کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔اس ذات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے پہلے دل کو صاف کرنا پڑتا ہے۔''وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مبہوت کہتی جا رہی تھی۔

''کیسے کروں میں اس دل کو غبار سے آزاد؟ یہ غبار تو میرے دل کی تہوں میں جم چکی ہے۔ایسا لگتا ہے جیسے غبار کا یہ جہاں اب کبھی اس دل سے آزاد ہی نہیں ہوگا۔خون کی نالیوں نے ان سے میل کھا لیا ہے۔وہ ان کے بنا نہیں جی سکتیں۔''وہ دھیرے سے اپنا سر اس کی گود میں رکھتا چلا گیا۔بے یقینی کے عالم میں بھی وہ جانتا تھا کہ کوئی پہلو ایسا ضرور ہے جس کے دامن میں اس کو سکون میسر آ سکتا تھا۔حاعفہ نے بھی اپنے ہاتھوں سے اس کے بالوں کو سہلانا شروع کر دیا۔

''اس غبار سے رہائی کا واحد طریقہ نماز ہے اریب۔ آپ باقاعدگی سے نماز پڑھنا شروع کر دیجیے۔ پھر دیکھیے گا کہ کیسے ہر مصیبت سے نکلنے کا راستہ آپ پر آشنا ہو جائے گا۔ آپ جس کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اس کی الجھی ہوئی ڈوریاں خود بخود سلجھتی جائیں گی۔''

''کیا نماز سے یہ سب کچھ ہو گا؟''

''ہاں...... یہ بھی لیکن ان سب کے ساتھ اور بھی بہت کچھ۔ انسان دنیا میں سکون تلاش کرتا ہے مگر اسے نہیں ملتا۔ وہ سامنے دیکھتا ہے تو دل میں بسی خواہشوں کو اپنے سے بہت دور پاتا ہے۔ پلٹ کر پیچھے دیکھتا ہے تو خود کو حوصلہ دینے والے ہر لمحہ ساتھ چھوڑتے نظر آتے ہیں۔ دائیں دیکھتا ہے تو تاحد نگاہ ویرانی نظر آتی ہے۔ بائیں دیکھتا ہے تو مصیبتیں اور رکاوٹیں کسی بپھرے ہوئے دریا کی مانند اس کی طرف امڈتی چلی آتی ہیں۔ ایسے میں اس انسان کے پاس فقط دو راستے باقی رہتے ہیں۔ ایک آسمان کا دوسرا زمین کا۔ زمین پر اپنی پیشانی کو اس رب کے آگے جھکا کر جب وہ آہ وزاری کرتا ہے تو خدا کی رحمت جوش میں آتی ہے اور جب آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر اپنے رب کو پکارتا ہے تو رحمتوں کی برسات ہوتی ہے اریب۔'' وہ کہہ رہی تھی اور اریب سن رہا تھا۔ اس کی پلکیں ذرا سی نم ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ چاروں اطراف سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب فقط دو اطراف باقی تھیں مگر وہ اس قدر تھک چکا تھا کہ ان اطراف پر چلنے کے قابل ہی نہیں رہا مگر آج نہیں تو کل اسے ان راستوں پر بھی چلنا تو تھا ہی۔

''میں تم سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ تمہیں ان دو راستوں سے کبھی مایوسی تو نہیں ہوئی؟'' خوابیدہ لہجے نے استفسار کیا تھا۔ حاعفہ کی انگلیاں ایک پل کے لئے استادہ دکھائی دیں۔ ایک نظر اریب کی طرف دوڑائی۔ جو جانے کس منزل کو اپنا ٹھکانہ بنائے ہوئے تھا؟

''نہیں...... مجھے کبھی میرے رب نے مایوس نہیں کیا۔'' گندھے ہوئے لہجے نے جواب دیا تھا۔ ماضی کی تلخ یاد نے ایک بار پھر گہری ضرب لگائی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں غرق تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ مگر کوسوں دور......

☆......☆......☆

میں لغزشوں سے الٹے راستوں پہ چل نکلا

تجھے گنا کے مجھے پھر کہاں سنبھلنا تھا

دو دن اپنی فیملی کے ساتھ گزارنے پر وہ دوبارہ اپنے ڈگر پر آ چکا تھا۔ چہرے کی شادابی دوبارہ بحال ہو گئی اور جاتے ہوئے وہ دل سے بھی ہنسا تھا۔

''اب تو بس میں اپنا کام سرانجام دے کر ہی لوٹوں گا۔'' اس نے جاتے ہوئے کہا تھا۔ سب نے اس جملے کا ایک پہلو دیکھا تھا اور اسی کو سچ مان لیا مگر حاعفہ اب کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی، اسی لئے اذیت بھری مسکراہٹ چہرے پر لانے کی کوشش کی۔ اریب کی نگاہوں نے بجھے ہوئے گلاب کو دیکھا تو اس کی طرف بڑھا۔

''اس بار میں لوٹ کر آیا تو کبھی واپس نہیں جاؤں گا، یہاں تک کہ تم مجھ سے بیزار ہو جاؤ گی۔'' اس نے شوخ بھرے انداز میں اپنی ناک اس کی ناک کے ساتھ ٹچ کی تھی۔ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرادی تھی۔ تبھی ایک کھنکھار کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔ دونوں سنبھلے تو پیچھے حسام کھڑا تھا۔ حاعفہ تو شرم کے مارے سنبھل ہی نہ سکی تھی۔ پلکیں بچھتی چلی گئیں۔

''یہ ٹی وی لاؤنج ہے۔'' حسام نے لفظوں پر زور دیا تھا۔

''تو میں نے کب کہا یہ میرا بیڈ روم ہے؟'' اریب نے برجستہ جواب دیا تھا۔ جس پر حاعفہ کو بھی شرم آئی تھی۔

''بہت بدتمیز ہو گئے ہو تم۔۔'' ایک مسکراہٹ کو لبوں پر سجائے، آگے بڑھ کر حسام نے اریب کی ناک بھینچی تھی۔

''افف میری ناک۔۔ مارنے کا ارادہ ہے کیا بھائی جان؟'' اس بار حاعفہ بھی مسکرادی تھی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کر اریب کی آنکھوں کو راحت نصیب ہوئی۔

''بھابھی، جلدی سے بتائیں میرے بھتیجے کو کیا چاہیے تاکہ اگلی بار آتے ہوئے میں اس کے لئے وہ وہ گفٹ لے کر آؤں؟'' اس نے کوٹ کو اپنے دونوں بازو کے درمیان کیا اور بازوؤں کو سینے پر لپیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

''آپ کے بھتیجے کی فرمائش ہے کہ اس کے چاچو جان جلدی سے گھر آجائیں بس۔''

''وہ تو آ ہی جائیں گے۔ ایسا کرتا ہوں پھر میں اپنی پسند کے گفٹ لے آؤں گا۔ آخر جو چاچو کو پسند ہو گا وہی تو بھتیجے کی پسند ہو گی، کیوں حاعفہ؟'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''بھتیجے کے تحفے یاد ہیں اور بہن کے نہیں؟'' ایسے میں بھلا جبیں کا کہاں پیچھے رہتی؟ منہ بگاڑ کر گویا ہوئی تھی۔

''جب بھتیجے کے تحفے لے لئے تو پھپھو کا کیا کام؟'' اس نے ابرو اچکاتے ہوئے بے پرواہی سے کہا تھا۔ جبیں یہ سنتے ہی تپ گئی تھی۔

''اریب......!'' سحر فاطمہ نے سرزنش کی تھی۔

''اچھا سوری......!'' اس نے مسکراتے ہوئے جبیں کے رخسار کو تھپتھپایا اور سب کی دعائیں لے کر ایک بار پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''اس بار میری واپسی اس وقت تک ممکن نہیں ہو گی جب تک میں اس پہیلی کو سلجھا نہ دوں۔ ابدال کی اس کڑی کو پایا تو میں ہمیشہ کے لئے توڑ دوں گا یا پھر......!!'' وہ دانستہ اپنے خیال کو ادھورا چھوڑ گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ کو پایا۔ جو اسے الوداع کہہ رہے تھے۔ وہ دل سے مسکرایا تھا۔ ایک کسک ابھری، جو دل میں اترتی چلی گئی۔ پلکیں جھپکیں اور اس گھر کی دہلیز کو ایک بار پھر پار کر گیا۔

☆......☆......☆

ہم سادہ دلوں نے دشمنی سے
مفہوم تو دوستی لیا تھا

قلم کی رفتار عام حالات سے زیادہ بہتر تھی۔ اگرچہ اس کی تیاری باقی سٹوڈنٹس سے کم تھی مگر ایک بار پھر اس کی غیر معمولی صلاحیتوں نے اسے کامیابیوں سے ہمکنار کر دیا۔ پیپر سے ایک گھنٹہ قبل نوٹس کو کھول کر دیکھا اور وہ شور وغل کے منڈلاتے بادلوں کے عین بیچ و بیچ۔ جہاں کسی عام بندے سے ایک لفظ بھی نہ پڑھا جائے، اس نے ایک ایک لفظ کو اپنی نگاہوں کے سامنے سے دوڑایا تھا۔

ایشا اور کرسن اس کے دائیں بائیں کچھ فاصلے پر ہی بیٹھے تھے۔ ایشا ایک ایک سطر کو کئی بار پڑھتی دیکھائی دے رہی تھی جبکہ کرسن کے چہرے پر ہر لمحہ ایک نیا رنگ ابھر رہا تھا۔ کئی بہاریں اپنا رنگ جماتی تو کبھی برسوں کی خزاں اپنے پر پھیلانے لگتی جبکہ اریب کا چہرہ ان سب سے عاری تھا۔ مبہوت اپنے پیپر پر نظریں جمائے برق رفتاری سے اسے حل کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پیپر اسے قبل از وقت ہی مل گیا ہو اور اسے ازبر یاد ہو۔

فقط پانچ منٹ بعد وہ اپنی نشست پر کھڑا تھا۔ انویجیلیٹر اس کے پاس آیا۔

"پیپر پر لکھا ہوا ہے۔ ہر سوال کو خود ہی سمجھنا ہو گا۔ بیٹھ کر سمجھو اور اسے حل کرو۔" انویجیلیٹر نے سخت لہجہ اپنایا تھا۔

"سر میں پوچھنے کے لئے کھڑا نہیں ہوا بلکہ پیپر دینے کے لئے کھڑا ہوا ہوں۔" اس جملے پر ایک لمحے کے لئے ایشا اور کرسن کی گردن اریب کی جانب مڑی۔ دونوں کے چہرے پر افسوس و حیرانی کے ملے جلے تاثر تھے۔

"ماں باپ کا پیسہ فقط ضائع کرنے دوسرے ملک آئے ہو۔ آتا ایک لفظ نہیں اور بڑے آئے ابروڈ کی ڈگری لینے۔" انویجیلیٹر نے جملہ کسا جس پر اریب کو سخت غصہ آیا مگر وہ اسے ضبط کئے رہا۔

"میرے خیال سے انسان کو اپنے لب ہلانے سے پہلے سوچ سمجھ لینا چاہیے۔ آپ کے لئے بھی بہتر ہوتا کہ اگر ایک بار پیپر پر نگاہ دوڑا لیتے تو یہ جملہ کبھی نہ کہتے۔" اریب نے ادب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہا تھا۔ انویجیلیٹر نے گردن جھٹکتے ہوئے پیپر پر نگاہ دوڑائی۔

"جب معلوم ہے کہ ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہو گا تب دیکھنے کا فائدہ؟" وہ بڑبڑایا تھا مگر اگلے ہی لمحے اس کے حواس منتشر دیکھائی دیئے۔ وہ چاروں شانیں چت کھڑا تھا۔

"امپاسیبل۔" اس کی زبان سے جاری ہوا تھا۔

"Nothing is impossible underneath the sky." اس نے دھیرے سے کہا اور باہر جاتا دیکھائی دیا۔ تمام سٹوڈنٹس اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور وہ ان سب سے بے نیاز آگے بڑھتا چلا گیا۔

کوریڈور سے گزرتے ہوئے اسے اپنے الفاظ سماعت میں گونجتے دیکھائی دیئے۔ قدم اپنی جگہ پر استادہ ہوئے۔

''بالکل۔ کچھ بھی ناممکن نہیں۔ کچھ بھی۔'' اس کے لہجے میں طمانت تھی۔ لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھری اور وہ آگے بڑھنے لگا۔

یونیورسٹی سے سیدھا وہ عالمگیر انڈسٹری گیا تھا۔ جہاں پر کام اپنے ڈگر پر گامزن تھا۔ اس بار اسے وہاں جا کر مایوسی نہ ہوئی۔ ہر کوئی اپنا کام سلیقے سے کر رہا تھا۔

''یہ لوگ اتنے بھی برے نہیں ہیں۔'' وہ مسکرایا تھا۔

''سر آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' وہ آگے مینیجر کے کیبن کی طرف بڑھنے لگا تو پیچھے سے ریسپشنسٹ کی آواز آئی تھی۔ وہ فوراً پلٹا۔ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھ سے ملنے مگر کون؟''

''نام تو نہیں بتایا مگر وہ سیکنڈ فلور پر میٹنگ ہال میں آپ کے منتظر ہیں۔'' اس نے مختصر کہا تھا۔ اریب نے اثبات میں سر ہلایا اور لفٹ کی طرف بڑھا۔ اس کا منتشر ذہن اس اجنبی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو جانے کون تھا؟ اس کو کیسے جانتا تھا؟ ہر جاننے والا اس کا پرسنل کنٹیکٹ نمبر رکھتا تھا۔ اس طرح اسے یوں اس کے آفس آنے کی کیا ضرورت؟ وہ انہی سوچوں میں غرق دوسری منزل پر پہنچا تھا۔ لفٹ کا دروازہ کھلا تو ایک بڑا سا ہال نظر آیا۔ وہ ایک لمحے کے لئے استادہ کھڑا سب کچھ دیکھتا رہا۔ کسی وجود کی بو وہ محسوس کر چکا تھا۔ بظاہر کئی لوگ اپنے کام میں مصروف دکھائی دیئے مگر یہ احساس ان میں سے کسی کا نہیں تھا۔ دو سے تین لوگ لفٹ میں داخل ہوئے تو اسے وہاں سے نکلنا پڑا کیونکہ انہوں نے بالائی منزل کی طرف جانا تھا۔ باہر قدم رکھتے ہی وہ پلٹا تو لفٹ بند ہو چکی تھی۔ ایک یاسیت کی کسک ابھری۔ وہ زیرلب مسکرا دیا تھا۔

وہ آگے بڑھتا ہوا سیدھا میٹنگ ہال میں جا پہنچا۔ سامنے ایک بڑا سا ٹیبل تھا۔ دائیں بائیں کئی کرسیاں تھیں۔ جو فی الوقت خالی تھیں۔

''یہاں کون ہو سکتا ہے؟'' بظاہر ہال کے خالی پن کو دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تھا لیکن دل کی تسلی کی خاطر وہ آگے بڑھا۔ قدموں کی چاپ ویران ہال میں گونج رہی تھی۔ خاموش فضا میں جنبش ہوئی تو ایک کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ وہ چونکنا ہوا کیونکہ آواز عین سامنے سے آئی تھی۔ جہاں ایک کرسی تھی۔ جس کا رخ پروجیکٹر کی طرف تھا۔ ابرو اچکاتے ہوئے اس نے حیرت سے اس طرف دیکھا تھا۔

پلٹ کر پیچھے دیکھا تو دروازہ بند تھا۔ باہر کا شور بھی اندر نہ ہونے کے برابر تھا۔ واضح تھا کہ اس کمرے میں کوئی دوسرا وجود تھا۔ وہ اب آگے بڑھنے لگا۔

''کون ہے وہاں؟'' اس نے غیر یقینی لہجے میں دریافت کیا تھا۔ خاموشی جواب کی صورت میں سماعت کا حصہ بنی۔ وہ پہلے سے زیادہ چونکنا ہوا تھا کیونکہ وہ کرسی کے اوپر سے کسی کے بیٹھے ہونے کا یقین حاصل کر چکا تھا۔

"میں نے پوچھا کون ہے وہاں؟" وہ ایک بار پھر گویا ہوا تھا۔ اس بار اس کا لہجہ قدرے سخت تھا۔ شنوائی ہو چکی تھی۔ ایک وجود کرسی کو کھسکاتا ہوا کھڑا ہوا۔ وہی چوڑے سینے کا مالک......ابدال۔

وہ ایک مسکراہٹ کو لبوں پر سجائے پلٹا تھا جسے دیکھ کر اریب کے وجود میں سرد لہر سرایت کر گئی۔ زہریلی یادیں جن سے وہ پیچھا چھڑانا چاہ رہا تھا، ایک بار پھر دماغ پر دستک دینے لگیں۔ وہ لڑکا اور پھر انجان جزیرے پر گزارا ایک ایک پل اس کی یادداشت کا حصہ بننے لگا۔ وہ مٹھیاں بھینچے اس کو کچا چبا جانے والی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیسے ہیں موصوف؟" وہ پوری ڈھٹائی سے گویا ہوا تھا۔

"تمہارے لئے بری خبر ہے۔ زندہ بھی ہوں اور تمہارے سامنے صحیح سالم کھڑا ہوں۔" زہر کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے طنز کا نشتر چلایا تھا مگر وہ تو جیسے پیدائشی ڈھیٹ تھا۔ قہقہہ لگاتے ہوئے آگے بڑھا۔ ایسا کرنا ابدال کو اریب کی نظروں میں مزید گرا گیا۔ جیسے کسی کی عزت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ کسی کی آنکھوں میں بڑھتی ہے ویسے ہی ابدال ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اپنی قدر گراتا جا رہا تھا۔ ہر گزرتا سیکنڈ اریب کے دل میں نفرت کے اس پودے کو مزید سیراب کرتا۔ وہ جس قدر محبت کا پیکر تھا، ابدال نے اتنا ہی اس میں نفرت کا زہر گھول دیا تھا۔

"یہ تو بہت ہی اچھی ہے پھر تو۔ تمہارا ٹھیک ہونا بھی چاہیے۔" اس نے اریب کے دائیں شانے پر تھپکی دی تھی۔ اریب نے بری طرح اپنا کندھا جھٹکایا اور برجستہ پلٹا۔

"اپنے ناپاک ہاتھوں کو مجھ سے دور ہی رکھو......سمجھے تم؟" اس نے تنبیہہ کی تھی۔

"ناپاک تم مجھے کہہ رہے ہو؟ حالانکہ ان لوگوں کے درمیان رہ کر تو تم آئے ہو۔" شرم و حیا کی ہر حد کو پار کرتے ہوئے وہ گویا ہوا تھا۔ جو بے یقینی کا عالم تھوڑا بہت تھا وہ بھی آج چھوٹ چکا تھا۔ ابدال کے منہ سے ان الفاظ کا نکلنا ہی وہ کام اس کی طرف سے سرانجام دینے کی تصدیق کرتا تھا۔ اس بات پر اسے غصہ نہ آیا، نہ کسی کو ملامت کیا بس پلکیں لمحہ بھر کے لئے جھک کر رہ گئیں۔

"میں تمہیں برا نہیں کہوں گا اور نہ ہی تم پر لعن وطعن کروں گا مسٹر ابدال کیونکہ شیطان کو لعن طعن کرنے سے اپنا ہی دامن آلودہ ہوتا ہے۔" وہ کڑوے گھونٹ پیتے ہوئے کہہ رہا تھا جبکہ اس کے لبوں پر وہی شیطانی مسکراہٹ تھی۔ جو اس کے وجود کو چیر رہی تھی۔

"کاش میری چھٹی حس تمہارے ناپاک ارادوں سے مجھے آگاہ کر دیتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا تھا۔ اس پر زوردار قہقہہ وہاں گونجا تھا۔

"ابھی تمہاری طاقتیں اس قابل نہیں ہوئی اریب کہ تم ابدال کے ذہن کو پڑھ سکو۔" اس نے جیسے انکشاف کیا تھا۔ اریب کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بے یقینی کے عالم میں اس کے وجود کو تک رہا تھا جبکہ ابدال کے چہرے پر طمانت تھی۔ وہ چلتے ہوئے اریب کے عقب میں آ کھڑا ہوا تھا۔ اریب دفعتہً پلٹا اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس کا مطلب تم جانتے ہو؟'' وہ ہکلاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔

''کوئی شک؟'' اس نے شاطرانہ مسکراتے ہوئے کہا۔ اریب نے سنبھلنے کی کوشش کی تھی۔

''شک نہیں مگر حیرت ضرور ہوئی۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''ہونی بھی چاہئے۔ ویسے یہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہے جو میں تمہارے بارے میں جانتا ہوں۔'' اس نے دونوں ہاتھوں کو مسلتے ہوئے کہا اور پھر ٹہلتے ہوئے دوبارہ اسی کرسی کی طرف بڑھا جہاں وہ پہلے براجمان تھا۔ اریب کی نگاہیں اس کے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا مگر دل میں ایک طوفان برپا تھا۔

''جیسے تمہارے لنگوٹیے دوست کا میش کا مزاج...... ہانیہ سے تمہاری پہلی ملاقات......اور جہاں تک میرا خیال ہے تم اسے چاہنے بھی لگے تھے۔'' وہ اس پر جیسے بم پھوڑ رہا تھا۔ ایک ایسی حقیقت سے آگاہ کر رہا تھا جس کا علم اس کی ذات کے سوا کسی کو نہ تھا مگر ابدال تو جیسے اس کی تنہائیوں سے بھی واقف تھا۔ اس کی سانسوں کا بھی علم رکھتا تھا۔ وہ ہونقوں اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ اس کا علم ابھی تمہاری بیوی کو نہیں ہے، جسے تم اپنے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتے ہو۔'' وہ مکر نگاہوں سے اریب کی طرف دیکھنے لگا۔

''ویسے کیا ہوگا اگر ہانیہ کے بارے میں حاعفہ کو معلوم ہو جائے تو......؟'' اس نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اریب کے پاؤں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ وہ اس کے سر پر یکے بعد دیگرے ضرب لگا رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ چاہ کر بھی ان ضربوں سے اپنے آپ کو بچا نہیں پا رہا تھا۔ آنکھیں پرنم دیکھائی دیں۔

''تم......!!'' اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔ تبھی ابدال کا قہقہہ گونجا۔

''بے فکر رہو، یہ راز ابھی میرے اور تمہارے درمیان ہے اور اگر تم چاہو تو یہ ہمیشہ راز ہی رہ سکتا ہے۔'' اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھے تمکنت کے ساتھ کہا تھا۔ اریب چونکا۔

''میں چاہوں تو؟'' بے یقینی غالب تھی۔

''ہاں......اگر تم میری بات مان لو تم۔''

''کون سی بات؟'' وہ اپنی کرسی سے اٹھا اور اریب کے قریب آیا۔ اس کی بے چین آنکھیں ابدال پر ہی مرکوز تھیں۔

تمہاری شکست۔'' انتہائی سرگوشی والے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''یہ تمہاری بھول ہے مسٹر ابدال۔'' اریب کا پورا وجود اضطرابی کیفیت میں دیکھائی دیا۔ وہ دو قدم پیچھے کھسکا اور غضب ناک نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

''جس وقت تک تمہیں سلاخوں کے پیچھے نہ بھیج دوں میرے دل کو قرار نہیں آئے گا۔''

''کہیں ایسا نہ ہو اریب کہ اس قرار کو پانے کی خاطر تم اس شے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو جو تمہارے پاس ہے۔'' لگی چھپی باتوں میں ابدال نے اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کیا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اریب نے کھوئے کھوئے لہجے میں استفسار کیا۔ آنکھیں بے یقینی کے عالم میں اس کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ پیشانی کی لکیریں پڑھنے کی کوشش کی گئی تو ناکامی کا سامنا ہوا۔ وہ کس قدر بے بس تھا۔ دنیا جہاں کی باتوں کو بن کہے سمجھ لیتا مگر اپنے ازلی دشمن کے ارادوں سے کبھی شناسائی حاصل نہ کر سکا۔

''یہ تو تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا لیکن میرا مشورہ ہے تمہیں، ایک بار سوچنا ضرور کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر کسی کا خون بہانا پڑے۔'' یہ کہتے ہی وہ دروازے کی طرف پلٹا۔ اریب تو جیسے اپنی جگہ پر استادہ تھا۔ پاؤں تو زمین میں گڑھ چکے تھے۔ کئی ثانیے وہ سانس بھی نہ لے سکا تھا

''میں نہیں چاہتا کہ اپنا مقصد حاصل کرنے کی خاطر کسی کا خون بہانا پڑے۔'' الفاظ دوبارہ گونجے تو اس کے جسم میں جنبش ہوئی۔ وہ برجستہ پلٹا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ فضاؤں سے اس کا عکس بھی غائب ہو چکا تھا۔ آنکھیں ناکام دروازے پر جا ٹھہریں۔

''نہیں......تم ایسا کچھ نہیں کر سکتے۔'' ایک ڈر اس کے دل میں بیٹھ چکا تھا جس کا نکلنا اب تقریباً محال تھا۔

☆......☆......☆

پھر ترے پیرہن کی یاد آئی!

پھر ہوئے ہم بھری بہار میں گم!

آج موسم کے مزاج نرالے تھے۔ صبح سے ہی ہلکی ہلکی پھوار جسم کو فرحت بخش رہی تھی۔ تر و تازہ ہوا میں سانس لینا پرانے غموں کو کسی قبرستان میں دفنانے کے مترادف تھا۔ آسمان کے پرندے بھی اس موسم سے لطف اٹھا رہے تھے۔

وہ کرن اور ایشا مڈ پیپرز کے بعد انجوائے کرنے میوزیم آئے تھے۔ میوزیم کے عقب میں موجود پارک تو جیسے ان کے دلوں میں نقش کر گیا۔ اب بھلا کھلی فضا کو چھوڑ کر بند کمروں میں جانے کا کس کا دل کرتا؟ تینوں نے فی الحال میوزیم کے اندر جانے کا ارادہ ترک کیا اور ماحول سے حظ اٹھانا اپنا فرض عین سمجھا تھا۔

''امتحانات جیسے آسمان کے بوجھ کو سر سے اتارنے کے بعد بندہ اپنے آپ کو کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے ناں؟'' کرن نے اپنی دونوں بانہیں پھیلاتے ہوئے اس پھوار کو اپنے وجود میں جذب کرتے ہوئے کہا تھا۔ ایشا کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری۔ اریب نے اس کی بانہوں کو دونوں ہاتھوں سے نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"اپنے ان جذبات کو قابو میں رکھ، کہیں ایسا نہ ہو ہلکا پھلکا محسوس کرنے کی بجائے چھینکوں کا دورہ پڑ جائے۔" اریب کے اس طنز پر ایشا دبی آواز سے ہنس دی۔ کرسن نے منہ بگاڑ کر اس کی طرف دیکھا جبکہ اریب نے دونوں ہاتھوں کو کوٹ کی جیب میں ٹھونس دیا۔ سردی کی شدت آج واقعی کافی تھی۔ تبھی شانے تقریباً سکڑتے جا رہے تھے۔

وہ تینوں ٹہلتے ہوئے میوزیم کے دائیں جانب آئے تھے۔ جہاں کھانے پینے کے کئی سٹالز تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم فاصلے پر ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ ایشا اور کرسن کھانے کو دیکھتے ہی ان سٹالز کی طرف بڑھے۔ بے چاروں نے صبح سے کچھ کھایا بھی تو نہیں تھا۔ فروٹ چاٹ کے سٹال پر پہنچتے ہی دونوں نے اپنے آرڈر دینا شروع کر دیئے۔ اریب ایک فاصلے پر کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔ اسے فی الحال کسی شے کی طلب نہ تھی۔ وہ سرخ اینٹوں سے بنے فرش پر چلتے ہوئے آگے کی طرف بڑھا۔ جہاں کئی جھولے تھے اور انڈونیشین بچے ان پر جھولا جھول رہے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرایا۔ بچے چاہے کسی نسل سے بھی تعلق رکھتے ہوں، دیکھ کر ان پر پیار ضرور آتا ہے۔ وہ انہیں ہی دیکھ رہا تھا کہ اس کے پاؤں سے ایک فٹ بال ٹکرایا۔ اریب نے جھک کر اسے اٹھایا اور ادھر ادھر دیکھا۔ تبھی پیچھے سے آواز آئی۔

"انکل یہ میرا فٹ بال ہے۔" سات سالہ بچی کھڑی اسے انڈونیشین زبان میں مخاطب تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے جھکا اور اس کے ہاتھوں میں فٹبال دیتے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے واپس اپنی سہیلیوں سے جا ملی۔ وہ کچھ فاصلے پر فٹبال کھیل رہی تھیں۔ موسم کی شدت سے بے نیاز بچے اپنی ہی دنیا میں مگن تھے۔ وہ بھی کبھی ایسا ہی ہوا کرتا تھا مگر ایسے کھلی فضا میں سانس نہیں لیا۔ جہانزیب اور سحرا اسے پارک میں ضرور لے جاتے تھے مگر وہ جبیں اور حسام کی طرح بھاگتا ہوا دور نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی ایسا کھیل سکتا تھا جس میں اسے آنکھوں سے اوجھل ہونا پڑے۔ اس کے برعکس جبیں اور حسام کھیلتے کودتے اکثر دور نکل جایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی وہ دونوں دوڑ بھی لگاتے اور کار میں پہلے جا کر بیٹھ جاتے مگر اس کی انگلی کو ہمیشہ سے پکڑا جاتا تھا۔ ایک گز کے فاصلے پر بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑا جاتا تھا۔ حسام کو ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے کی تلقین کی جاتی اور وہ بھی اس تلقین کو پوری ایمانداری سے نبھاتا تھا۔ یہ پیار تھا، محبت تھی یا پھر پرواہ؟ شاید ان سب کا مکسچر۔ ایک الفت، ایک ہمدردی، ایک چاہت۔ جو سب کے دلوں میں اس کے لئے تھی۔ وہ دن واقعی حسین تھے۔ کوئی غم، کوئی درد، کوئی تکلیف نہ تھی مگر آج سب کچھ بدل چکا تھا۔

اس نے گہری سانس لی اور آگے بڑھا۔ بچپن کی یادیں اگرچہ ہلا بول چکی تھیں مگر یادوں میں جینے سے بھلا کیا ملتا؟ وہ ایک بینچ پر آ بیٹھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس نے سامنے نگاہ دوڑائی۔ آسمان سے گرتی بوندیں اس کی جینز پر گر رہی تھیں۔ اس کے سامنے ہی ایک اور بینچ تھا۔ جہاں ایک نوعمر کپل آ بیٹھا۔ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈالے راز و نیاز میں مصروف تھے۔ اریب مسکرایا۔ پل بھر کے لئے اس کے ذہن میں ہانیہ کا خیال آیا۔ وہ بھی تو اس کے ساتھ ایسا وقت گزارنا چاہتا تھا۔ تبھی اس نے اپنے خیالوں کو جھٹکا۔

"یہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟" حاعفہ کے عکس نے اس سے شکوہ کیا تھا۔ اس کے خیالات کا مرکز اب فقط اس کی بیوی تھی۔ پھر

ہانیہ کیسے یادوں میں حکمرانی کر سکتی تھی؟ اتنے عرصے بعد اس کا خیال آنا، واقعی حیران کن تھا۔

"اگر میں ناں کہہ دوں تو سچ میں نہیں جاؤ گے؟" ایک مبہم سا وجود نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار دستک دے رہا تھا۔

"میں محبت کرتی ہوں تم سے" مسحور کن وجود اس سے مخاطب تھا۔

"تمہیں میری محبت کو قبول کرنا ہوگا۔ میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں۔ یہی سچ ہے" وہ گلوگیر لہجے میں اپنی محبت کی یقین دہانی کروا رہی تھی۔

"وہ بری طرح میری جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گیا۔ میری زلفوں کا اسیر بنتا چلا گیا" ڈائری کے الفاظ نے جیسے ان یادوں کو بھی کرچی کرچی کر دیا۔ پرنم آنکھیں یادوں کے سمندر میں رم جھم کے سنگ ہولیں۔ وہ برجستہ کھڑا ہوا تھا۔

"آئی ہیٹ یو" وہ دھیرے سے گویا ہوا۔ آج بھی اسے اپنے آپ کو یقین دلانا پڑ رہا تھا کہ وہ اس سے فقط نفرت کرتا ہے حالانکہ محبت کرتے ہوئے ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا تھا۔ تب تو محبت ایک روح کی مانند اس کے دل کی دیواروں میں اترتی چلی گئی۔ ایک لمس خود بخود سرایت کر گیا اور آج اس سے نفرت کا اظہار وہ لفظوں سے کر رہا تھا۔

"تمہارے بارے میں سوچنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا مگر ان لفظوں پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ الفاظ ادا ہوتے ہوئے بھی اسے پھوار میں ایک وجود اپنے قریب آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کھلی زلفیں، ایک انا سے کھڑی گردن، سانولی رنگت اور عام مگر بہت ہی خاص صورت۔ اس نے اپنے خیالوں کو بری طرح جھٹکا تھا۔ عکس بھی کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔

"گو ٹو ہیل۔" گردن جھٹکتے ہوئے وہ پلٹا تھا۔ موسم کے تیور بدلے اور رم جھم میں تیزی آ گئی۔ اس کی جیکٹ اب مکمل طور پر بھیگ چکی تھی۔ وہاں کھیلتے بچے اب کسی مسکن کی تلاش میں تھے جو انہیں اس موسم کی سختی سے بچاتا۔ کئی لوگوں کے ہاتھوں میں پہلے سے ہی چھتریاں تھیں۔ اس کے بالوں سے بارش کی بوندیں اس کے رخسار کو بوسہ دے رہی تھیں۔ ایک دو بوندیں لبوں سے بھی ٹکرائی تھیں۔ وہ تیزی کے ساتھ واپس پلٹا جہاں ایشا اور کرسن کھانے پینے میں مصروف تھے۔

☆......☆......☆

جس کو زرد کر ڈالا دھوپ کی سخاوت نے

شاید اس کلی نے بھی خواہش نمو کی ہے!

اس دن وہ دیر سے اٹھا تھا۔ رات بھر سر میں درد رہا۔ فرسٹ ایڈ بکس میں کوئی ٹیبلٹ بھی نہ دی اور باہر جانے کی ہمت نہ تھی۔ سر درد میں سوجھ بوجھ کی صلاحیت بھی مفلوج ہو گئی کہ وہ پریشے کو فون کر کے علوی کے ہاتھوں ٹیبلٹ منگوا لے۔ صبح علوی نے دروازے پر دستک دی تو اس کی آنکھ کھلی تھی۔

سلیپر پہنتے ہوئے وہ آنکھوں کو مسل رہا تھا اور پھر مدہم قدموں سے دروازے کی جانب مڑا۔ دروازے کا ہینڈل پکڑتے ہوئے بھی اس کو نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور دروازہ کھولا۔ سرد لہر نے اس کے جسم میں قدم رکھا تھا۔ خنکی کا احساس جانے کیوں اسے آج بہت ہو رہا تھا۔ نگاہیں اٹھائی تو سامنے علوی اپنے یونیفارم میں ملبوس تھی۔ چہرے پر پروفیشنل مسکراہٹ تھی۔ وہ بھی جواب میں مسکرا دیا اور پلٹا۔ اس کے ہاتھ ہمیشہ کی طرح ٹرالی پر تھے۔ جہاں اس کے لئے ناشتہ تھا۔ وہ واپس اپنے بستر میں آ بیٹھا تھا اور لحاف اوڑھ کر لیٹنے ہی جا رہا تھا کہ علوی کے سوال پر ارادہ ملتوی کیا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟ میں دیکھ رہی ہوں کئی دن سے آپ کے چہرے پر نقاہت واضح ہے۔" اس نے ٹرالی بیڈ اور صوفے کے درمیان لا کھڑی کی تھی۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے زبردستی مسکرانا چاہا تھا۔

"مجھے ایسا نہیں لگتا ہے۔ اگر طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ڈاکٹر سے ایک بار چیک اپ کروالیں۔" وہ پوری طرح اریب کی طرف متوجہ تھی۔

"بس سر میں درد ہے۔ اب ایک سر درد کے لئے بھی ڈاکٹر سے چیک اپ کرواتا رہے بندہ؟" اس نے مزاح کی طرف بات کا رخ موڑنا چاہا تھا۔ لحاف کو سینے سے اتارتے ہوئے اس نے گاؤ تکیہ کمر کے پیچھے کی طرف کھسکایا۔

"لیکن ہر وقت سر میں درد رہنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر سے مشورہ ضرور کر لینا چاہئے۔" وارڈروب کی طرف بڑھ کر اس نے آئرن کئے کپڑے وہاں رکھ دیئے۔ اریب نے اپنے پہلو پر نظر دوڑائی اور ایک سوچ میں کافی دیر تک غرق رہا۔

"ویسے ایک بات بتاؤ گی؟" اس نے الجھے الجھے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"جی پوچھیے۔" وہ خوش اخلاقی سے پلٹی تھی۔

"اگر کسی کا خیال بار بار آپ کے ذہن پر دستک دے اگرچہ آپ اسے یاد کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تو کیا یہ محبت ہے؟" اس کی استفہامیہ آنکھیں اپنے اندر جانے کتنے ایسے سوالوں کو سینتے ہوئے تھیں۔ نگاہیں علوی پر تھیں۔ وہ پہلے تو مسکرائی اور پھر دو قدم آگے بڑھی۔ لب بظاہر خاموش تھے۔ اریب اس خاموشی کو سمجھ نہ پایا۔

"اپنے سوال کا جواب تو آپ خود ہی دے گئے۔" اس نے دھیرے سے کہا تھا۔ اب وہ صوفے پر رکھے کشن کے کور تبدیل کر رہی تھی۔ اریب اس کے جواب پر خاصا حیران دکھائی دیا۔ کئی لمحے وہ بنا پلک جھپکے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اس نے سچ ہی کہا تھا۔

"اور اس خیال کو دل سے نکالنا ہو تو کیا کرنا چاہیے؟" اس نے اگلا سوال داغا تھا۔

"ایسے خیالات کہاں ہماری گرفت میں ہوتے ہیں جو ہم ان کو اپنے دل کی نگری میں داخل ہونے سے روک دیں۔ یہ تو ہوا کی

مانند ہماری سانسوں میں تحلیل ہو کر دل کی تہوں تک پہنچ جاتے ہیں۔'' وہ اپنا کام کرتے ہوئے اریب کی باتوں کا جواب دے رہی تھی۔ اریب نے گہری نگاہ اس کے چہرے پر جمائی تو وہ کسی بھی تاثر سے نالاں تھا۔ دیکھنے سے ایسا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس نے کبھی کوئی ٹھوکر کھائی ہو۔ پھر ایسے جذبات؟ اریب نے جھرجھری لی۔ کافی دیر تک اس کمرے میں خاموشی کا راج رہا۔ علوی کام کر کے پلٹی تو کھانے کی طرف نظر گئی۔

''لگتا ہے آج کھانا ٹھنڈا کر کے کھانے کا ارادہ ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اریب کی نظریں ٹرالی کی طرف گھومیں۔ چائے تھرماس میں تھی مگر لہجے کی خنکی شاید اس کو بھی سرد کر چکی تھی۔ وہ اٹھا اور واش روم کی طرف چل دیا۔ واپس آنے پر علوی وہاں موجود نہ تھی۔ وہ ٹاول سے منہ خشک کرتے ہوئے بیڈ پر آ بیٹھا تھا۔ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک شناسا آواز گونجی۔

''کھانے سے پہلے بسم اللہ لازمی پڑھا کریں آپ۔'' یہ حاعفہ کی آواز تھی۔ لبوں پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ نگاہوں کے سامنے اسی کا آنچل لہرایا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔'' کہتے ہوئے اس نے پہلا نوالہ منہ تک بڑھایا تھا۔

☆......☆......☆

تجھے اداس بھی کرنا تھا خود بھی رونا تھا

یہ حادثہ بھی میری جاں کبھی تو ہونا تھا

آج اس کی رپورٹ آنی تھی۔ وہ کافی اضطرابی کیفیت میں ٹیرس پر ٹہل رہا تھا۔ ایک گھنٹے سے اپنی رپورٹ کا منتظر اس کے جسم میں جیسے سرد لہر تہوں تک اتر چکی تھی۔

''آپ کچھ دیر انتظار کیجیے۔ ڈاکٹر ایک آپریشن میں مصروف ہیں۔ پھر وہ آپ سے بات کرتے ہیں۔'' ریسپشنسٹ نے کہا تو وہ ٹہلتے ٹہلتے اسپتال کی ٹیرس تک آ پہنچا تھا۔ یہاں سے شہر کا ایک حصہ باآسانی نظر آ رہا تھا۔ سورج کی مدہم کرنیں آسمان میں تیرتے بادلوں کے سینے کو چاک کرتے ہوئے ٹھنڈی زمین پر پہنچ رہی تھی۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے ریلنگ کو پکڑا اور ذرا سا جھک کر نیچے دیکھا۔ کئی بچے کھیلتے نظر آئے۔ امید کا ایک جہاں آباد تھا۔ چہروں سے ٹپکتی نقاہت میں بھی زندگی کی ایک امید قائم تھی۔ ایک مریض ایسا تھا جس کے دونوں پاؤں اپاہج ہو چکے تھے مگر زندگی ابھی تک ناامید نہ ہوئی تھی۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا لان تک آیا تھا۔ آنکھیں پرنم تھی مگر ایک کشش غالب تھی۔

''یار اریب تم کہاں ہو؟ کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' موبائل پر کرسن کا میسج آیا تھا۔

''بس ایک ضروری کام ہے۔'' مختصر جواب دیا گیا۔ دل کی دھڑکن جانے کیوں بے ترتیب سی دکھائی دی۔ پورے وجود میں

ایک لرزش تھی۔ جسے کم کرنے کے لئے اس نے مضبوطی سے ریلنگ کا سہارا لیا ہوا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں فکرمندی میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ جانے رپورٹ میں کیا ہوگا؟

''مسٹر اریب! ڈاکٹر صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' وہ پلٹا تو وہاں ایک نرس تھی جو اپنے مخصوص لباس میں ہی ملبوس تھی۔ جواب میں اس نے گردن ہلا دی۔ نرس جا چکی تھی مگر وہ وہیں منجمد تھا۔ سوچوں کا ایک جہاں جانے کیوں اس کی طرف امڈتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ان موجوں کے بھنور میں الجھ کر رہ گیا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ رپورٹ لیے بغیر لوٹ جائے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ آنے والے خطرے کی بو وہ ابھی سے سونگھ سکتا تھا۔ اس کی چھٹی حس ہمیشہ سے ہی خطرے کا برملا اعلان کر دیا کرتی تھی۔ آج بھی اس کی غیر معمولی صلاحیتیں اس کو آنے والے حالات سے آگاہ کر رہی تھی۔

وہ دھیمے قدموں کے ساتھ زینے کی طرف پلٹا جہاں کئی مریض اس کے ساتھ نیچے اتر رہے تھے مگر وہ چاق و چوبند تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا جیسے وہ بیماریوں کے جہان میں آباد ہوں، شاید انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور اسے بھی کچھ دیر بعد یہی کرنا تھا۔

مسلسل سر میں درد رہنے کی وجہ سے اس نے اپنا مکمل ٹریٹمنٹ کروانے کا سوچا تھا۔ ڈاکٹر کے مشورے پر ٹیسٹ بھی کرا لئے۔ آج ان ٹیسٹ کی رپورٹ آنی تھی تاکہ مرض کی تشخیص ہو سکے اور پھر باقاعدہ علاج کیا جا سکے مگر رپورٹ سے پہلے ہی وہ جیسے جان چکا تھا۔ تبھی اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ چہرے کی ویرانی و شادابی ختم ہو چکی تھی۔ زندگی کا چراغ جیسے تیز ہوا کے جھونکوں کے زیر اثر تھا۔

''آیئے مسٹر اریب۔ بیٹھیے۔'' وہ کیبن میں داخل ہوا تو ڈاکٹر اپنی ٹیبل کے دائیں جانب الماری کے ساتھ کھڑا کسی فائل کو پڑھنے میں مصروف تھا۔ آہٹ پر اس نے اپنا چہرہ دروازے کی طرف پھیرا تو وہاں اریب کو کھڑا پایا۔ خوش اخلاقی سے اندر آنے کی اجازت دی گئی اور ساتھ ہی ہاتھ میں موجود فائل کو بند کیا اور اپنی چیئر کی طرف پلٹا۔

''میں ابھی آپ کی رپورٹ ہی دیکھ رہا تھا۔'' یاسیت کا ایک عنصر بھی شامل نہ تھا۔ لہجے میں طمانیت اس قدر تھی جیسے رپورٹ کلیئر ہوں مگر وہ جانتا تھا یہ مسکراہٹ پروفیشنل ہے۔ اس فیلڈ میں آ کر ایسی مسکراہٹ کا لبادہ اوڑھنا ہی پڑھتا ہے اور سب سے بڑھ کر کوئی دوسرا آپ کا درد کیسے محسوس کر سکتا ہے؟ جس تکلیف میں آپ ساری رات تڑپے ہوں، خواب خرگوش کی نیند کے مزے لینے والا صبح اس کرب کو کیسے محسوس کر سکتا ہے؟

وہ ڈھیلے قدموں کے ساتھ ہی آگے بڑھ رہا تھا اور چیئر کو کھسکا کر پیچھے کیا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اس کے بازو کو پکڑتے ہوئے وہاں بیٹھا تھا۔

''کیا لکھا ہے رپورٹ میں؟'' اس نے بات کو طول دیے بنا ہی پوچھا تھا۔ ڈاکٹر جو پہلے مسکراہٹ کا جہان آباد کیے ہوئے تھا۔ پل بھر کے لئے سنجیدہ دیکھائی دیا۔ پیشانی پر ایک شکن سی ابھری تھی۔ بس پھر کیا تھا؟ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہونے

لگیں۔ مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ سانسیں کسی خاردار راستے سے ہو کر اس کے جسم میں اترنے لگیں۔ پھیکا سا لہجہ مسکرانا چاہا، دل کے جذبات کو تغافل کی چادر میں لپیٹنا چاہا مگر کرب نے اس کے وجود کو کرچی کرچی کر دیا۔ وہ اپنی مٹھیاں بھینچے یک ٹک ڈاکٹر کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دیکھیے اریب! زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ گھبرانے والی بات نہیں ہے۔'' تسلیوں کا ایک تسلسل شروع ہونے جا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ملایا اور نگاہوں کو اریب کے وجود پر مرتکز کیا تا کہ یکسوئی سے اس کو سمجھایا جا سکے۔

''مجھے تسلیاں نہیں چاہیے۔ آپ صاف صاف بات کیجیے۔ مجھے سچائی کا سامنا کرنا آتا ہے۔'' تغافل بھری آنکھ پل بھر میں کھل چکی تھی۔ وہ ان زہریلے الفاظ کو اپنی سماعت کے راستے جسم میں اتارنے کے لئے تیار تھا۔ چہرے پر بھی کوئی تاثر نہ تھا۔

''اچھی بات ہے۔ انسان کو ایسے ہی مضبوط کردار کا مالک ہونا چاہئے۔'' اس نے تعریف کی تھی۔ لمحہ بھر خاموشی کا سہارا لیا۔ پھر اس نے اپنی نظریں دوبارہ رپورٹ پر گھمائیں۔ دل کی دھڑکنیں کسی بپھرے ہوئے سمندر کی موجوں کی طرح تھی۔ جہاں قہر کا ایک جہاں آباد تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں کبھی سکڑتی تو کبھی خود بخود پھیل جاتیں۔ وہ خود اپنے جذبات سے لاعلم تھا۔

''دراصل آپ کے دماغ کی کچھ شریانوں میں خون منجمد ہو چکا ہے۔ جس کے باعث دماغ تک خون کی ترسیل میں رکاوٹ ہو رہی ہے۔ اسی بنا پر آئے دن آپ کے سر میں درد ہوتا ہے۔'' اسے یہ سن کر زیادہ حیرت نہ ہوئی تھی لیکن سماعت کو بھی یقین نہ آیا تھا۔

''لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپریشن کے ذریعے دماغ کو خون کی ترسیل بحال کی جا سکتی ہے لیکن......!'' اس نے دانستہ اپنی بات کو ادھوری چھوڑ دیا تھا یا شاید اریب نے سرعت سے کام لیا تھا۔

''لیکن کیا؟'' استفسار کیا گیا۔

''آپریشن میں جلدی کرنا ہوگی۔ میرا مطلب ہے جتنی جلدی ممکن ہو سکے آپ کو اپنا آپریٹ کروانا ہوگا ورنہ......!'' اس بار وہ واقعی دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ گیا تھا۔ اپنی نگاہیں اریب سے گھما کر دوبارہ رپورٹ پر جمائیں۔ اریب تو جیسے ٹھٹک کر رہ گیا۔ آنکھیں بے یقینی کے ساتھ ڈاکٹر پر مرکوز تھیں۔

''بہت شریر ہوتے جا رہے ہو تم اریب۔'' یادوں کا ایک تسلسل اس کی طرف سرعت کے ساتھ سرکتا چلا گیا۔ جہاں حسام اس کی باتوں پر اسے ٹوک رہا تھا۔ اس کے کان کھینچتا وجود اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

''چھوٹا ہوں، شریر تو ہونگا ناں!'' وہ بغل کے نیچے سے حسام کو دھکیلتے ہوئے نکل گیا تھا۔ یادوں میں جس قدر انبساط تھی۔ آنکھوں میں اسی قدر نمی دکھائی دے رہی تھی۔

یادوں نے پلٹا کھایا۔ اس بار سحر فاطمہ اس کی بلائیں لیتی معلوم ہو رہی تھیں۔ اپنی زندگی بھی اسے لگنے کی دعائیں دے رہی

تھیں۔ جہانزیب کا شفقت بھرا ہاتھ وہ ابھی تک اپنے سر پر محسوس کر سکتا تھا۔ جبیں کی معصوم چھیڑ چھاڑ اس کو بری طرح جھنجوڑ رہی تھیں۔ عکاس کا رخسار کو نوچنا اور بالکل چھوٹے بھائیوں کی طرح اسے ٹریٹ کرنا اسے بری طرح دکھی کر رہا تھا۔ کاش وہ اپنا ٹریٹمنٹ کروانے کا نہ سوچتا تو شاید اسے یہ درد محسوس نہ ہوتا۔

"آپریشن کامیاب ہونے کے کتنے چانسز ہیں؟" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی نگاہیں اٹھائیں۔ کچھ دیر سوچا اور پھر ہمدردی کے ساتھ گویا ہوا۔

"دیکھیے میں دھوکے میں نہیں رکھوں گا مگر سچ یہ ہے کہ ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔" ان الفاظ کا ادا ہونا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو زمین و آسمان کے درمیان معلق پایا۔ تاحد نگاہ دھند کا سما تھا۔ عکس دیکھنے کے لئے بھی روشنی میسر نہ تھی۔ آسمان سر سے اوجھل اور زمین پاؤں سے سرکتی ہوئی، جیسے خلا ہو اور وہ کوئی روئی کا گولہ یا پھرائی کا دانہ۔ جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس کی سانسوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ نہ آنکھیں پرنم ہوئیں اور نہ ہی کوئی آنسو پلکوں کو بھگونے کے لئے مضطرب دیکھائی دیا مگر وجود تھا کہ کرچیوں کی مثل ٹوٹ کر بری طرح بکھر چکا تھا۔ ایک ساتھ تھا جواب ہمیشہ کے لئے ٹوٹتا دیکھائی دے رہا تھا۔ حاعفہ کا ہنستا مسکراتا وجود جانے کیوں مبہم ہوتا چلا گیا۔

"اپنا خیال رکھیے گا۔" کسی اپنے کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجے تھے مگر اب یہ الفاظ بے معنی تھے۔ رندھا ہوا لہجہ اپنا غم بانٹنا چاہتا تھا۔ ایک غبار جو دلِ ویران کی تہوں کو آلودہ کر چکا تھا۔ اس غبار کو ہٹانا چاہتا تھا مگر نہ ہی کوئی ہمنوا پاس تھا اور نہ ہی کوئی اپنا۔ بس تنہائی تھی اور اس کی ذات تھی۔

"اور اگر آپ آپریٹ کروانے میں دیر کرتے ہیں تو ففٹی ففٹی سے سیونٹی اور تھرٹی کی ریشو بھی ہو سکتی ہے۔" یہ دوسرا بم اس پر پھوڑا گیا تھا۔ جو ذات پہلے ہی بکھر چکی تھی۔ ایک تند ہوا چلا دی گئی اور مٹی کے ذرے دور دور تک بکھر گئے۔ اس بار واقعی آنکھوں میں ایک نمی ابھری تھی۔ یہ نمی دل میں اترتی چلی گئی۔

"میں تو مشورہ دونگا کہ آپ اسی ہفتے اپنا آپریٹ کروالیں۔" ڈاکٹر اپنی بات مکمل کر چکا تھا۔ تبھی دروازہ کھلا مگر دروازے کی چرچراہٹ نے اس کو خیالوں سے نکلنے میں مدد نہ کی۔ وہاں ایک وارڈ بوائے تھا۔

"سر آپ کی میٹنگ ہے۔" الفاظ گونجے تھے مگر اسے ذرا پرواہ نہ تھی۔ ڈاکٹر اٹھا اور فائلیں بند کیں۔

"تم چلو میں آیا۔" سٹریتھوسکوپ اٹھایا اور باہر کی طرف پلٹا۔ اریب ابھی تک اپنی جگہ پر براجمان تھا۔

"آئی ول ٹاک ٹو یو لیٹر۔" کندھا تھپتھپایا گیا۔ ہمدردی کا ڈھونگ تھا یا پیشہ ورانہ جذبہ جو شاید دردمند ڈاکٹروں کے دل میں ہوا کرتا ہے مگر وہ اس کا غم بانٹ تو نہیں سکتے تھے ناں؟ جو ضرب اس کے دل پر لگی تھی، اس کی شدت کم تو نہ ہو سکتی تھی۔ بے تاثر چہرہ، کسی ادھ کھلے گلاب کی طرح تھا جس کو خزاں نے کھلنے سے پہلے ہی آدبوچا ہو۔ قہر ڈھاتی ہوائیں اسے شاخ سے اچک لے جانے کے لئے بے

تاب ہوں مگر وہ اپنی بقا کی جنگ لڑتا جا رہا ہو مگر آخر میں جیت مقدر کی ہو۔آسمان سے اترتے ایک قضا کے فرشتے نے اس کی زندگی کے دن کو شاخ حیات سے علیحدہ کر دیا ہو۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔آنکھوں میں تیرتے آنسوؤں کا اندھیرا، ہر لمحہ ستاتی یادوں کا اندھیرا جو دل کی نگری میں سماتی جا رہی تھیں اور پھر زندگی اور موت کے غم کا اندھیرا۔دونوں کنارے پر تھے۔ایک سانس تھی جو دونوں کو باندھے ہوئے تھی جو شاید اب بہت جلد ٹوٹنے والی تھی۔

وہ بمشکل کرسی کے بازوؤں کو سہارا بناتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ایک آنسو جو پلکوں پر کافی دیر سے مچل رہا تھا، ہوا کے دوش پر سوار ہو گیا۔اس کے بائیں ہاتھ کی پشت نے اس کی حدت کو محسوس کیا تھا۔

''میں آپ کا انتظار کروں گی۔'' کسی اپنے کے الفاظ گونجے تھے۔وہ اپنا جس کے وجود پر اس کا پورا حق تھا۔وہ اپنا جس کو پانے کے لئے جانے کتنی یادیں ہجر میں کاٹی تھیں۔وہ اپنا جس کے لئے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔آج زندگی نے اس اپنے سے ہی بہت دور کر دیا۔

وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا مگر وجود جس قدر کرچی تھا اس کا اندازہ لگانا محال تھا۔وہ قدموں کو گھسراتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔دروازے کا ہنڈل پکڑا تو ہاتھوں میں جیسے سکت ہی نہ تھی مگر وہ کوشش کر رہا تھا۔آنکھوں کے آگے دھند سی چھائی اور پھر تو ہر شے جیسے غائب ہی ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

آنکھ نم بھی کرو تو بس اتنی

رنگ پھیکے پڑیں نہ منظر کے

گھر میں جانے کیسی خاموشی تھی۔سحر فاطمہ لاؤنج میں ٹہل رہی تھیں۔ہاتھوں میں بار بار موبائل کی طرف نگاہ جاتی اور پھر مایوس پلٹ آتی۔انہیں جیسے کسی کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا مگر انتظار تھا کہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔

وہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی تھیں۔پردے ہوا کے سنگ جھوم رہے تھے۔آسمان بھی قدرے صاف تھا البتہ کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے دیکھے جا سکتے تھے۔ان کی نگاہیں برجستہ انہی بادلوں پر جا ٹھہری تھیں۔

''اے خدا! میرے اریب کا خیال رکھنا۔وہ معصوم ہے، اسے ہمیشہ اپنی امان میں لئے رکھنا۔'' ایک ماں کے دل سے اپنے بچے کے لئے دعائیں نکل رہی تھیں۔آسمان کے دروازے ان دعاؤں کی دستک سے کھلتے جا رہے تھے مگر آنکھوں میں اضطرابی کیفیت تھی کہ ڈھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

قدموں کی چاپ پیچھے سے سنائی دی مگر دعا دینے والا دل ان سے بیگانہ رہا۔وہ چاپ قریب آ کر دم توڑ گئی۔

''ماما جان......آپ پریشان ہیں؟'' یہ حاعفہ تھی۔جو خود بھی اضطرابی کیفیت سے دوچار تھی۔اپنے ساجن پر آنے والی مشکلات

کو میلوں کے فاصلوں پر محسوس کر سکتی تھی۔ سحر فاطمہ اس کے برجستہ استفسار کرنے پر پلٹیں۔

''ہاں...... نہیں۔'' زبان تو جیسے ضبط کھو چکی تھی۔ سچائی اور جھوٹ خلط ملط ہو رہے تھے۔ نگاہیں چرا کر وہ صوفے کی طرف بڑھیں۔ حاعفہ ان کی بے چینی کو سمجھ چکی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے وہیں ٹھہری رہی اور پھر ان کے پیچھے سبک رفتاری سے بڑھی۔ وہ صوفے پر بے جان پتے کی مثل ڈھہ چکی تھیں۔

''آپ اریب کے بارے میں سوچ رہی ہیں ناں؟'' حاعفہ نے دل کی بات کہی تھی۔ اپنے لخت جگر کا نام سن کر تو جیسے ممتا تڑپ اٹھی تھی۔ دل مضطر کے دروازے تند آندھیوں کے زیر اثر کھل چکے تھے۔ غمگین لہجہ گویا ہوا۔

''جانے کیوں دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ایسا لگ رہا جیسے میرا بچہ بہت اکیلا ہو چکا ہے۔ اسے میری...... اپنی ماما جان کی ضرورت ہے لیکن میں اس کے پاس نہیں ہوں۔ کتنی بے بس ہو چکی ہوں میں، اپنے بچے کو اس وقت سینے سے نہیں لگا سکتی جب اسے میری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔'' دل میں مچلتے آنسو دھیرے دھیرے پلکوں کا رخ کرنے لگے جو کسی ابر نیساں کی مانند پہلے ہی ابر کرم برسانے کو تیار تھے۔ گندھا ہوا لہجہ اب جیسے بے بس ہو چکا تھا۔ ہمدردی کے بول سن کر اپنا ضبط کھو بیٹھا۔

''آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں ماما جان؟ ہمارا اریب بالکل ٹھیک ہے۔ کچھ نہیں ہوا اسے۔'' حوصلہ دینے والا لہجہ خود انہی موجوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ان لفظوں کو خود کسی کے سہارے کی ضرورت تھی۔ ان ہاتھوں کو خود کسی کا ساتھ چاہیے تھا جو اس وقت سحر فاطمہ کے آنسو پونچھ رہے تھے۔

''میری بھی یہی دعا ہے کہ اریب ٹھیک ہو مگر دل جانے کیوں کسی انجانے خوف سے جکڑا ہوا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی بہت بڑی مشکل اس کے سر پر آن پڑی ہو اور وہ ہمیں پکار رہا ہو لیکن ہماری بے بسی...... ہم اس کے غم کو ہلکا نہیں کر سکتے۔'' آنسو پلکوں سے چھلکتے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنا سر صوفے کے ساتھ ٹکایا تو حاعفہ کی نگاہیں بھی بے بسی کے ساتھ انہیں دیکھتی رہیں۔ ہاتھوں میں لرزش تھی اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ شاید یہ خدشات وہ بھی محسوس کر رہی تھی مگر زباں سے جاری کرنے میں جھجک تھی۔

سحر فاطمہ کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے اس نے دھیرے سے انہیں تھپتھپایا تھا۔

''آپ ایسا نہ سوچیں ماما جان۔ اریب اب سمجھدار ہے۔ ایسے معاملات کو وہ سلجھانا جانتا ہے۔'' یہ بات اگرچہ حاعفہ کے لئے بہت ہلکی تھی مگر سحر فاطمہ کے لئے گراں قدر ثابت ہوئی۔ اچھنبے انداز میں انہوں نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ آنکھیں استفہامیہ تھیں۔ جیسے ان میں زلزلے کا سا سماں ہو۔ حاعفہ انہیں دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے سہم سی گئی۔

''تم نہیں جانتی حاعفہ...... تم کچھ نہیں جانتی۔'' مدھم سی آواز جن میں سالوں کی خنکی تھی سحر فاطمہ کے لبوں سے جاری ہوئی تھی۔ سماعت کے پردوں میں ان لفظوں سے جیسے بھونچال آ چکا تھا۔ یک ٹک وہ انہیں دیکھتی رہی۔ ہاتھوں میں تھامے گئے ہاتھ دھیرے دھیرے

پھسلتے گئے اور سحر فاطمہ سرعت سے اٹھیں اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں جبکہ اس کی نگاہیں ان کی پشت پر ہی جمی ہوئی تھی۔ پرنم آنکھیں بھی ٹھہری سی گئی تھیں۔

''میں نہیں جانتی؟'' بے یقینی غالب تھی۔ دھڑکنیں بے لگام گھوڑے کی مانند دھڑک رہی تھیں۔ آنسوؤں میں بھی ٹھہراؤ آ چکا تھا مگر نئے سوال ذہن میں کھٹکنے کے لئے تیار تھے۔

''مگر کیا؟'' اگلی ضرب لگی تھی۔ وجود میں بھونچال آ گیا۔ تبھی اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر بری طرح ہلایا گیا۔ وہ بری طرح ڈری تھی۔

''آنٹی، میرے ساتھ چلو اور حسام چاچو میرے لئے نئی گیم لائے ہیں۔'' وہاں عاطی تھا۔ آنکھوں میں ایک کشش لئے۔ پرنم آنکھوں نے آج پہلی باران آنکھوں میں کسی اپنے کی جھلک کو دیکھا۔ وہ چمک، وہی معصومیت، وہی ناز، وہی ادا...... وہ مبہم سے وجود کو تیرتے پانی کے پار دیکھنے کی سعی کر رہی تھی۔

''چلیں ناں آنٹی۔'' وہ اس کا ہاتھ کھینچ رہا تھا جبکہ وہ اس کے چہرے کی طرف تک رہی تھی۔ دو وجود ایک جان لگ رہے تھے یا پھر ایک ایسا رشتہ تھا جو انہیں جوڑے ہوئے تھا۔

''مستعار لی آنکھیں؟'' وہ دھیرے سے گویا ہوئی تھی۔ عاطی نے کھینچا تو ایک آنسو فرش پر جا گرا اور وہ اس کے پیچھے بے جان قدموں کے ساتھ چلتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

ہوا کی سمت نہ دیکھو، اسے تو آنا ہے

چراغ آخر شب سے وصیتیں پوچھو

آج اس کا اپریشن تھا۔ صبح ہی سے اس کا دل بجھا بجھا سا تھا۔ جانے کیوں ہر شے اسے پھیکی لگ رہی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی جہانزیب اور سحر فاطمہ کی یاد اسے ستانے لگی تھی۔

''ماما جان، بابا جان! کاش اس وقت آپ میرے پاس ہوتے......کاش!'' ایک کسک دل میں ابھری تھی مگر اس خواہش کی تکمیل کے تمام دروازے بند تھے۔ وقت کے پنے پلٹ چکے تھے اور وہ اکیلا دریا کے اس کنارے کھڑا اپنوں کو تک رہا تھا۔

سورج بھی آج بادلوں کے پیچھے اپنا رخ چھپائے ہوئے تھے۔ نرم نرم شعاعیں آنکھوں کو جہاں فرحت بخش رہی تھی، وہیں اس کے غم کو بڑھاتی جا رہی تھیں۔ اپنوں کی یاد کے آگے یہ موسم بے معنی تھا۔ اپنے کمرے سے نکلنے سے پہلے اس نے ایک گہری نگاہ جہانزیب اور سحر فاطمہ کی تصویر پر ڈالی تھی۔ خاموش نگاہوں نے جانے کتنے سوال کئے تھے اور کتنے ہی جواب دیئے تھے۔ وہ ان چہروں کو دل کی تہوں میں اتارنا چاہتا تھا مگر تشنگی تھی کہ بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور پلٹا۔ فون کی رنگ ہوئی تو اس کے قدم

دروازے کے پاس جا کر منجمد ہو گئے۔ نمبر وہی تھا مگر آج اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہ ابھرا۔ وہ باہر جانے کی بجائے واپس پلٹ آیا۔

''السلام علیکم!'' اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ آنکھیں بے یقینی سے چھت کو ایسے گھور رہی تھیں جیسے وہ ابھی اس پر آن گرے گی۔

''وعلیکم السلام مائے ڈیئر۔ خیریت ہے جو صاحب زادے تمیز کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور بڑے ہی مودب انداز میں مجھے سلام کیا ہے؟ کہیں تم سے میرا نمبر ڈیلیٹ تو نہیں ہو گیا۔ جو غلطی سے کوئی اور شخص گمان کر لیا ہو۔'' یہ ابدال تھا۔ جواریب کے اس رویے پر خاصا چونکا تھا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔

''تم بتاؤ، کیوں فون کیا ہے مجھے؟'' لہجے میں کوئی سختی نہ تھی اور نہ ہی دھمکی دینے والا کوئی تاثر۔ وہ ٹوٹے ہوئے کسی انسان کی طرح گویا تھا جس کا سب کچھ چھینا جا چکا ہو۔

''مجھے فون کرنے کے لئے کسی عذر کی ضرورت نہیں۔ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں شاید تم یہ بات بھول رہے ہو مسٹر!'' اس نے تصحیح کرائی تھی مگر وہ خاموش رہا۔ آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی رہیں۔ وہ اس کی باتیں سننا نہیں چاہتا تھا مگر جانے کیوں وہ سن رہا تھا۔ وہ پل جس میں اسے کسی اپنے کی سخت ضرورت تھی مگر وہ اس کے ساتھ نہیں تھے۔ ایسے میں ابدال دشمن ہی صحیح مگر اس کے بارے میں سب جانتا تو تھا۔ اس کا اپنا نہ صحیح مگر دشمن تو تھا ہی اور پھر دشمن تو اپنوں سے زیادہ باریک بین ہوا کرتے ہیں۔

''اور کچھ؟'' اس نے مختصر کہا تھا۔ ابدال کو ایک جھٹکا۔

''میرا خیال ہے موصوف کا بات کرنے کا موڈ نہیں ہے۔'' اس نے طنز کیا تھا۔

''تم سے بات کرنے کا میرا ابھی موڈ ہوا بھی نہیں ہے۔'' بے دلی سے جملہ ادا کیا گیا تھا۔

''یہ تو سچ ہے مگر کیا کریں ابدال کو آج تک کوئی نہ کر ہی نہیں پایا۔'' اس نے شیخی بگاڑتے ہوئے کہا تھا۔

''لیکن آج کے بعد شاید ایسا ممکن ہو سکے۔'' وہ اس جملے کے پیچھے مفہوم کو سمجھ نہ سکا۔

''ناممکن۔''

''لیکن بہت جلد ممکن ہونے والا ہے۔'' یہ کہتے ہی اس نے رابطہ ڈسکنیکٹ کر دیا۔ آنکھوں میں پانی کسی جھیل کی تہوں کی طرح تیرنے لگا تھا۔ جن کی گہرائی کا حساب لگانا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا تھا اور سرعت سے اپنے کمرے سے نکلا اور دروازہ یونہی کھلا رہنے دیا۔

لفٹ سے نکلتے ہی علوی نے سلام کیا مگر وہ سن نہ سکا اور ریسیپشن پر پریشے نے بھی کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس کی سماعت تو جیسے کچھ

الفاظ پر اٹک کر رہ چکی تھی۔ چند گھڑیاں اور پھر، زندگی یا موت......!

پارکنگ ایریا سے گزرتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اِندر نے اس کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا اور اس خیال سے کہ اسے کہیں جانا ہے، کار کی طرف بڑھا مگر اسے یہ دیکھ کر ایک جھٹکا لگا کہ وہ اس کے بازو سے ہوتا ہوا چلا گیا۔ جیسے ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا ہو، جو اسے بس چھو کر نکل گیا ہو۔

"اریب سر!" اس نے مدہم سے لہجے میں پکارا تھا مگر سماعت ان لفظوں کو سن نہ سکی تھی۔ وہ تیز قدموں کے ساتھ گرینڈ مراح ہوٹل کے مرکزی دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔

اِندر بے یقینی کے ساتھ کافی دیر وہیں کھڑا باہر کی جانب دیکھتا رہا۔ اسے کچھ گڑ بڑ محسوس ہوئی تھی مگر سمجھ نہ سکا اور معمولی بات سمجھ کر شانوں کو جھٹک دیا۔

"شاید پاس ہی کسی سے ملنے جانا ہو۔" اس نے سوچا اور واپس اپنے کام میں جت گیا۔

وہ فٹ پاتھ پر چلتا جا رہا تھا۔ جھیل سی آنکھوں میں اس وقت کئی عکس تیر رہے تھے۔ کئی چاہتیں اسے پکار رہی تھیں۔ کئی یادیں اس کے دل کو تڑپا رہی تھیں مگر وہ بے بس تھا۔ شاید یہ تڑپ آخری تھی۔ اس کے بعد وہ اس تڑپ کو محسوس ہی نہیں کر سکے گا۔ یہ یادیں آخری بار اس کے دل و دماغ پر دستک دے رہی تھیں۔ اس کے بعد ان یادوں کا ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ جانا تھا۔

"اس بار میں لوٹ کر آیا تو کبھی واپس نہیں جاؤں گا، یہاں تک کہ تم مجھ سے بیزار ہو جاؤ گی۔" اپنے الفاظ پر وہ شرمندہ تھا۔ آنکھوں میں ہجر نے ابر نیساں کی صورت اختیار کر لی۔ حاعفہ کا چہرہ اس کے سامنے تھا۔ قدم ایک پل کے لئے ٹھہر گئے۔ وہ کئی ثانیے کھڑا اس عکس کو دیکھتا رہا۔ دائیں جانب گردن کو ذرا سا خم دیئے، اپنے الفاظ پر معافی مانگ رہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا حاعفہ، میں اپنے الفاظ کا پاس نہیں رکھ سکا۔ تم سے وعدہ کیا تھا ناں کہ میں واپس آؤں گا مگر......!!" وہ الفاظ بھول گیا۔ رندھا ہوا لہجہ الم کی ندیا میں غوطے لگا رہا تھا۔ کسی کا ساتھ پانے کی تمنا دل میں مچل رہی تھی مگر واپسی کے تو شاید تمام دروازے دھیرے دھیرے بند ہو رہے تھے۔

"میں نے ہمیشہ تمہیں ستایا ہے اور دیکھو جانے سے پہلے بھی تمہیں ستاتے ہوئے جا رہا ہوں۔ شاید اسی لئے تمہیں دیکھنے کی چاہ بھی دل میں ہی مدفون ہو کر رہ گئی ہے۔" وہ اس عکس پر نگاہیں جمائے دل سے فریاد کر رہا تھا۔

راہگیر اس کے دل کی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ تبھی اس کے شانوں کو جھٹک کر آگے بڑھ جاتے۔ وہ سنبھلتا اور دوبارہ نگاہیں اسی عکس پر جما لیتا مگر پلکوں کے بھیگنے پر وہ عکس بھی مبہم سا ہو گیا۔ جس پر ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اس نے سرعت سے اپنی آنکھیں صاف کی مگر فضا آئینے کی طرح شفاف تھی۔ ہزار چہروں میں ایک چہرہ بھی شناسا نہ تھا۔ وہ بری طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ لرزیدہ قدم

آگے بڑھے مگر ہمت جواب دے چکی تھی۔ایک بار اپنوں سے بات کرنے کی چاہ ابھری تو اس نے اپنا راستہ پھیر لیا۔قدم آگے بڑھنے کی بجائے دائیں جانب بڑھے۔جہاں ایک بینچ رکھا تھا۔پیچھے کئی درخت تھے۔شاید کوئی باغ تھا۔مہکتی فضائیں گلشن کی خبر دے رہی تھیں مگر وہ خوشبو کو محسوس کرنے سے قاصر تھا۔کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح وہ اس بینچ پر بیٹھا گیا۔دونوں ہاتھوں سے اس بینچ کو ایسے تھاما جیسے کسی بچے کو جب ہوا میں اچھالا جائے تو وہ اچھالنے والے کے ہاتھوں کو پکڑ لے۔اس کے دل میں بھی یہی ڈر تھا کہ کہیں وہ اس بینچ کو چھوڑے اور زندگی کی ڈور ہاتھ سے نکل جائے۔موت کا غم اس کے اندر کی دنیا میں بھونچال لے آیا تھا۔

پلکیں بھیگی تو وقت کی کمی کا احساس ہوا۔اس نے گہری سانس لیتے ہوئے جیکٹ سے موبائل نکالا اور کافی دیر تک اس پر انگلی پھیرتے ہوئے ایک سوچ میں غرق رہا۔

دل اپنوں سے بات کرنے کو چاہ رہا تھا مگر زبان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں رکھ سے۔سماعت میں تشنگی ابھر رہی تھی جبکہ نین پانی سے پر تھے۔اس نے چمکتی ہوئی سکرین پر ایک نمبر نکالا اور کافی سوچ و بچار کے بعد کال ملائی۔اس کے دل کی دھڑکنیں سست روی کا شکار ہو گئیں۔آنکھیں بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔بیل کی آواز وہ سن سکتا تھا مگر فون کو کان کے لگانے کی ہمت نہ ہوئی۔کچھ دیر بعد فون کو ریسیو کر لیا گیا۔ٹائمر شروع ہو گیا۔

”السلام علیکم اریب!“ یہ سحر فاطمہ کی آواز تھی۔مدہم سی، تفکر و محبت کے جذبات سے پر، لطیف سی آواز وہ بنا کان کے لگائے بھی سن سکتا تھا اور لفظوں میں چھپی مٹھاس کو محسوس کر سکتا تھا۔

”اریب! تمہیں میری آواز آ رہی ہے؟“ سوال داغا گیا مگر اس کے لب کپکپانے لگے۔ہاتھوں میں بھی زلزلہ تھا۔اس نے فون کانوں سے لگایا تو آواز پہلے سے زیادہ واضح تھی۔اپنے اسے پکار رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔سانسیں بے ترتیب تھیں مگر وہ ان کی حدت کو بھی سنبھالے ہوئے تھا۔اپنی موجودگی کی خبر بھی انہیں دینا نہیں چاہتا تھا۔

”کیا ہوا اریب؟ تمہیں میری آواز نہیں آ رہی؟“ وہی سوال دوبارہ داغا گیا۔اس کا دل بھر آیا تھا۔آنسوؤں کی روانی میں تیزی آئی۔اس نے مضبوطی سے فون کو گرنے سے روکے ہوئے تھا۔نچلے ہونٹ کو دانتوں کے بیچ لئے وہ جذبات کو ضبط کرنے کی اپنی تئیں معمولی سی سعی کر رہا تھا مگر بپھرا ہوا سمندر بھلا اتنی جلدی کہاں سکوت میں آتا ہے؟

ادھر سحر فاطمہ بھی اریب کی خاموشی کو بھانپ چکی تھیں۔اس کی بے چینی بڑھتی چلی گئی۔جہانزیب ابھی ابھی زینے سے اترے تھے۔سحر فاطمہ کو یوں بے چین دیکھ کر ان کی طرف بڑھے۔

”کیا ہوا؟ کس کا فون ہے؟“

”اچھا ہوا آپ آ گئے۔اریب کا فون آیا ہے مگر اس کی آواز نہیں آ رہی۔مجھے تو فکر ہو رہی ہے۔“ ان کا لہجہ تفکر سے لبریز تھے۔

آنکھوں میں بے چینی دیکھ کر جہانزیب کے چہرے پر بھی سنجیدگی دیکھی جا سکتی تھی۔ انہوں نے ریسیور اپنے ہاتھ میں لیا۔

''ہیلو، اریب بیٹا! تم ٹھیک ہو ناں؟'' جہانزیب کی آواز سن کر تشنگی مزید بڑھ گئی۔ وہ اب اس کرب کو مزید سہہ نہیں سکتا تھا۔ سانسوں کو تھامتے ہوئے اس نے فون کو ایک جھٹکے سے بند کیا تو ایک خاموش آواز دھیرے سے دوسری طرف سرایت کر گئی۔ جہانزیب سکتے کے عالم میں فون کو دیکھتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں غیر یقینیت دیکھ کر سحر فاطمہ کا دل بھی ڈر گیا۔ استفہامیہ آنکھیں ان کے وجود سے ہزاروں سوال پوچھ رہی تھیں مگر جواب تو شاید ان کے پاس بھی نہ تھے۔ ہاتھ خود بخود کریڈل کی طرف کھسکتا چلا گیا۔

''مجھے لگ رہا تھا کہ اریب کسی مصیبت میں ہے۔ پلیز آپ کسی طرح معلوم کریں، کیسا ہے میرا بیٹا؟'' ان کی حالت کسی بے جان پتے کی طرح تھی جو موسم کی سختی کو بھانپ چکا ہو اور کسی بھی لمحے ہوا کے دوش پر سوار ہو کر زمین پر گر سکتا ہو۔ جہانزیب نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ جذبات کو ضبط کیا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ شاید نیٹ ورک خراب ہوگا'' عام سا بہانہ پیش کیا گیا مگر دل جانتا تھا کہ لب سچائی سے کوسوں فاصلے پر ہیں۔

اس کے قدموں میں اب غیر معمولی تیزی تھی۔ وقت پہلے ہی بہت بیت چکا تھا۔ اب ایک ایک لمحہ اس کے کرب میں اضافہ تو کر سکتا تھا مگر مرہم لگانے سے قاصر تھا۔ چند منٹوں کا فاصلہ اس نے دو گھنٹوں میں طے کیا تھا۔ اسپتال کے باہر ایک لمحہ کے لئے ٹھہرا اور گہری نگاہ واپسی کے راستے پر دوڑائی۔

''مجھے معلوم نہیں کہ ان راستوں پر چل کر دوبارہ واپسی ممکن ہوگی بھی یا نہیں مگر اتنا ضرور معلوم ہے کہ میرا جسم اس راستے سے ضرور گزرے گا۔ اپنے پاؤں پر یا پھر کسی کے کندھوں پر۔'' دل میں ایک سرد لہر سرایت کر گئی تھی۔ جسم نے جھرجھری لی اور وہ پلٹ کر اسپتال کے دروازے کو پار کر گیا۔

ماؤف ذہن بس چلتا جا رہا تھا۔ راہ داری میں کئی لوگ نظر آئے مگر کوئی بھی شناسا سا نہ تھا۔ ریسیپشن سے ڈاکٹر کی موجودگی کی خبر لی۔ آپریشن کی تیاری ہو چکی تھی۔

کیبن میں داخل ہونے پر ڈاکٹر کو اپنے سامنے کھڑا پایا۔ وہ ابھی دروازہ کھولنے ہی جا رہا تھا۔

''اریب! تم۔ میں اب تمہیں ہی فون کرنے جا رہا تھا۔ تم ایسا کرو کہ وارڈ نمبر ۲۲ میں آ جاؤ۔ بیس منٹ بعد میں آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چل دیا۔ اریب نے بھی اثبات میں سر ہلایا اور بے یقینی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھا۔ نرس سے وارڈ کا پتا معلوم کیا اور چند لمحوں بعد وہ اس وارڈ میں تھا۔

وہاں اس کو لباس تبدیل کرنے کے لئے کہا گیا۔ اس نے ہدایات پر عمل کیا اور پھر وارڈ بوائے کے کہنے پر بیڈ پر لیٹ گیا۔ آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں۔ سنگ مرمر کی ٹائلز جانے کیوں اسے بوجھ محسوس ہو رہی تھیں۔ آنکھیں اس بوجھ کو اٹھانے سے قاصر دکھائی دے رہی

تھیں۔ دونوں ہاتھوں کو سینے پر رکھے، وہ انہیں بار بار بھینچ رہا تھا۔

”دیکھیے آپ اطمینان رکھیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وارڈ بوائے نے رسمی تسلی دی تھی مگر یہ لفظ نہ کافی تھے۔ وارڈ بوائے نے ایک گہری نگاہ اریب پر ڈالی اور پھر پلٹ کر باہر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کچھ لمحے یونہی بیت گئے پھر دفعتہً وہ پلٹا اور سائیڈ ٹیبل پر رکھے میڈیسن بکس کو اس نے اتھل پتھل کیا۔ شاید کوئی میڈیسن ڈھونڈ رہا تھا۔

”لگتا ہے وہ لایا ہی نہیں۔“ اسے اپنی کاہلی کا افسوس تھا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ یک دم پلٹا۔ ابھی وہ دروازے کے پاس ہی پہنچا تھا کہ اس کی نظر بے دھیانی میں دوسری جانب کی ٹیبل پر گئی۔ جہاں ایک شیشی رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر سکون کی ایک لہر دوڑی۔ وہ دروازہ کھولنے کی بجائے پلٹا اور وہاں سے وہ شیشی اٹھائی۔

”اس دیس میں یہ مقصد لے کر آیا تھا کہ اپنی ذات سے جڑے ہر راز کو فاش کر دوں گا مگر کیا خبر تھی کہ ان رازوں کو افشاں کرنے کی کھوج مجھے زندگی کی ڈگر سے ہی دور لے جائے گی۔ راز تو افشاں ہو نگے مگر وہ نہیں جو مطلوب تھے بلکہ وہ جہاں تک رسائی بھی ممکن نہ تھی۔ جن کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔ وقت بھی بڑی تیزی سے کروٹ لیتا ہے۔ کل تک جو مدعا تھی آج تو لبوں پر آنے سے پہلے ہی کھو چکی ہے۔ سمجھ ہی نہیں آ رہا کہ خدا سے کیا مانگوں؟ زندگی یا پھر موت؟ الجھی ہوئی ڈوری کا سلجھا ہوا سرا یا پھر اس مشکل سے نکلنے کا راستہ؟ ماؤف ذہن کو مطمئن کرنے کا نسخہ یا پھر کرب سے نجات کی دعا؟ اپنوں کو آخری بار دیکھنے کی خواہش یا پھر عمر بھر ان کے ساتھ رہنے کی آرزو؟ دشمنوں کو سلاخوں کے پیچھے کرنے کی جستجو یا پھر اپنوں کی دعاؤں کے حصار میں گھر واپسی؟ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا مانگوں، کیا نہیں؟“ پلکیں پل بھر میں پر نم دیکھائی دیں۔

اسے اپنی رگوں میں کسی محلول کے حل ہونے کا اندازا ہوا مگر پلٹ کر دیکھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ جو ہاتھ کچھ دیر پہلے سینے پر تھا اب بے جان سا بستر پر پڑا ہوا تھا۔ وارڈ بوائے اس کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ اسے کچھ خبر نہ تھی۔ خبر تھی تو یہ کہ اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔ دماغ میں کئی مبہم سے عکس محو رقصاں ہیں۔ سماعت میں کئی آوازوں کا آمیزش گونج رہا ہے۔ دل میں کئی خواہشیں عروج تک پہنچ کر زوال کا شکار ہو رہی ہیں۔

سب سے بڑھ کر آخری دستک...... جب ہر چہرے کے بعد، ہر آواز کے بعد، ایک چہرہ سامنے آیا۔ ایک آواز سنائی دی۔

وہ چہرہ ابدال کا تھا۔ وہ آواز ابدال کی تھی۔ جو اس کا نام پکار رہا تھا۔ اس کے بعد اسے کچھ خبر نہ تھی۔

☆......☆......☆

مسکراتی ہوئی آنکھوں والے

لوٹ لیتے ہیں خزانے دل کے

خاموشی نے اس کی سماعت کے پردوں پر دستک دی تو اس کے چہرے پر چند سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ ہاتھ کی انگلیاں جو پہلے بے جان تھیں۔ دھیرے دھیرے بند ہونے لگیں۔ لب جو آپس میں سلے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے گرہیں کھلنے لگیں۔ سانسیں جن کے چلنے میں کچھ دیر پہلے تک ایک شبہ باقی تھا اب اپنی ڈگر پر گامزن ہو رہی تھیں۔

انجان دنیا سے اسپتال کے اس کمرے تک پہنچنے میں اسے چند گھڑیاں لگی تھیں۔ آنکھیں کھولیں تو ان میں ایک اجنبیت تھی۔ وہ اپنے زندہ ہونے کا یقین کر رہا تھا۔ استفہامیہ آنکھیں بے جان سنگ مرمر سے زندگی کا ثبوت مانگ رہی تھیں۔

"کیا آپریشن کامیاب رہا؟ کیا زندگی موت سے جیت گئی؟ کیا سحر فاطمہ کی ممتا نے اسے موت کے دہانے سے کھینچ لیا؟ کیا حاعفہ کی چاہت نے اسے اکیلے انجان دنیا کا سفر طے نہیں کرنے دیا؟ کیا جہانزیب کی دعا اس کی حفاظت کرنے میں کامیاب رہی؟" کئی سوال تھے اور جواب صرف ایک...... وہ زندہ ہے...... اسی دنیا میں ہے، جہاں کچھ دیر پہلے تھا یا شاید آپریشن ابھی شروع ہی نہیں ہوا اور اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

ہاں...... آپریشن نہیں ہوا کیونکہ اسے اپنے جسم پر کسی جگہ کوئی چبھن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ نہ ہی کوئی زخم یا پھر پٹی تھی۔ اس نے دھیرے سے اپنے سر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ادھر بھی غیر معمولی شے نہ تھی۔ تمام تر خوشیاں ایک لمحے میں واپس لوٹ گئیں۔ جینے کی امید جو بیدار ہوئی تھی، ایک بار پھر منوں مٹی تلے دب گئی۔

"کیسے مزاج ہیں اب مسٹر اریب کے؟" ایک شناسا سا آواز تھی، وہ اس آواز کو پہچانتا تھا۔ پلٹ کر دیکھا تو عالمگیر سامنے تھا۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت کا شکار ہوا۔ اٹھنا چاہا مگر عالمگیر نے اٹھنے نہ دیا۔

"نہیں...... تم آرام کرو۔ ابھی آپریشن ہوا ہے۔ تمہیں آرام کرنا چاہیے۔" عالمگیر کے منہ سے آپریشن کا سن کر اسے خاصا دھچکا لگا۔ اسے کیسے معلوم؟ اور پھر آپریشن ہو گیا؟ مگر کب اور کیسے؟ ایک بار پھر کئی سوالوں کے حصار میں اریب کی ذات تھی۔

"آپ یہاں؟" لبوں نے ان لفظوں سے آغاز گفتگو کیا۔

"یہاں کے ایک ڈاکٹر میرے دوست تھے۔ ان سے ہی ملنے آیا تھا۔ دیکھا تو تمہیں آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا۔ تبھی سوچا کہ تمہارے ہوش میں آنے کے بعد تمہاری تیمارداری کر لی جائے۔" اس کا لہجہ ہمیشہ کی طرح مطمئن اور شیریں تھا۔ اپنائیت کا عنصر آج بھی نمایاں تھا۔

"میرا آپریشن ہو گیا؟" اس کا لہجہ غیر یقینی تھا۔

"تو کیا دوبارہ کروانے کا ارادہ ہے؟" پھلجڑی چھوڑتے ہوئے وہ اس کے سامنے آ بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی چمک آج بھی اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ڈاڑھی مونچھیں بھی اس چمک کو داغ لگانے سے قاصر تھیں۔

''نہیں...... ایسی بات نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ کوئی زخم یا پھر......!'' وہ اپنی بات کو دانستہ ادھوری چھوڑ گیا تھا۔ عالمگیر اس کی بات کو سمجھ گیا۔

''بھئی، اب اگر ایک ہفتہ دنیا سے بے گانہ رہو گے تو زخم کیا خاک رہیں گے؟'' اس نے اپنی طرف سے ہلکی بات کہی تھی مگر اس کے سر پر جیسے بم پھوڑا گیا تھا۔ وہ حواس باختہ چلا اٹھا۔

''ایک ہفتہ؟''

''دھیرے بھئی۔ یہ اسپتال ہے۔ چلانا منع ہوتا ہے۔'' عالمگیر نے یاددہانی کروائی تھی مگر وہ ابھی تک حواس باختہ تھا۔ اس کا ذہن الجھتا چلا گیا۔

''مگر ایک ہفتہ؟''

''ہاں جی جناب! شاید آپریشن کوئی زیادہ سنجیدہ نوعیت کا تھا جس وجہ سے تمہیں ایک ایسا ڈوز دیا گیا کہ تم ایک ہفتے تک ہوش میں نہ آؤ اور زیادہ درد نہ سہنا پڑے۔'' عالمگیر نے خود سے ہی اندازہ لگایا تھا جو شاید عین حقیقت کے قریب تھا۔ وہ دھیرے سے دوبارہ بیڈ پر لیٹتا چلا گیا مگر دباؤ کم نہ ہوا۔ ایک ہفتہ وہ بے ہوش رہا؟ یہ بات ماننے کو ذہن تیار ہی نہیں تھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہ بمشکل ایک گھنٹہ یا پھر ایک دن کا کچھ حصہ سویا ہو گا مگر عالمگیر نے تو نیا انکشاف کیا تھا۔ وہ الجھا ہوا چھت کو دیکھ رہا تھا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ آخری بار جب اس نے سنگ مرمر کی ٹائلوں کو دیکھا تو وہ سفید رنگت کی تھیں مگر اب ان کا رنگ کریمی ہو چکا ہے۔ یعنی ایک روم سے وہ دوسرے روم میں وہ شفٹ کیا جا چکا ہے لیکن یہ کام تو وقت کے کچھ حصے میں بھی سرانجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی نگاہیں سرکتے ہوئے اب بائیں جانب کی دیوار پر گئیں۔ کلینڈر سامنے تھا۔ حقیقت عیاں تھی۔ عالمگیر سچا تھا۔ تاریخ اپنے آپ کو سات دن آگے لے جا چکی تھی۔

دروازے کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی اس نے آگے دیکھا۔ وہاں ڈاکٹر تھا۔ جس کے ہاتھ میں فائل تھی۔ عالمگیر اس طرف بڑھا۔ سرگوشی میں کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر دونوں آگے بڑھے۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' بے یقینی واضح تھی۔

''کوئی بات نہیں۔ آپریشن کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے اندر کی فیلنگز کو سمجھ ہی نہیں پاتا لیکن آپ بے فکر رہیں۔ کچھ ہی دنوں میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے کچھ میڈیسن تجویز کی ہے۔ آپ کو وہ ریگولر لینا ہو گی اور ہاں آپ اب گھر جا سکتے ہیں۔ نرس سے کہہ کر میں آپ کے ڈسچارج کے پیپر تیار کروا دیتا ہوں۔'' اپنی ہی سنا کر وہ ڈاکٹر وہاں سے چلتا دکھائی دیا۔ عالمگیر نے بھی اجازت چاہی مگر اریب کو حیرانی تھی تو ڈاکٹر کی باتوں پر ہوئی کہ وہ آپریشن کے فوراً بعد کیسے اسے جانے کی اجازت دے سکتا ہے؟ مگر یہ

سوال اس کے ذہن میں ہی دم توڑ گیا۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ نقاہت اگر چہ محسوس ہو رہی تھی مگر دل تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے موبائل میں فون ہسٹری دیکھی تو حقیقت پتھر پر لکیر کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس نے ایک ہفتہ پہلے ہی پاکستان فون کیا تھا۔

''اب کیا کرنا چاہیے مجھے؟'' اس نے سوچا تھا۔ پیپر کاروائی مکمل ہو گئی اور وہ اسی راستے پر گامزن تھا جن پر دوبارہ چلنے میں شبہ تھا۔ موت کو شکست دی جا چکی تھی۔ زندگی نے نئی راہیں سامنے لا کھڑی تھیں مگر مقصد اب بھی وہی تھا۔ ابدال کی چالوں کو ناکام بنا کر شہہ کو اپنا مقدر بنانا۔

ہاٹل پہنچ کر آج بھی اس نے وہی گمان کیا تھا کہ سب اس سے سوال و جواب کریں گے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ سب تو جیسے ایک ہفتے کو ایک گھنٹہ گمان کر رہے تھے۔ پریشے نے کیز ایک کلائنٹ کو دیں اور اسے خوش اخلاقی سے استقبالیہ کلمات کہے۔ مینیجر اپنے کیبن میں کسی سے میٹنگ کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک پل کے لئے استقبالیہ پر رکا اور واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

''مجھے اپنا دھیان ان بے تکے سوالوں میں الجھانا نہیں چاہیے۔'' وہ اپنے آپ سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''وقت ریت کی مثل ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ اگر اسے نہ روکا گیا تو بہت کچھ میرے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ ایک کے بعد ایک پریشانی تو جیسے اس دیس میں میرا مقدر بن چکی ہے۔ ایک الجھن ختم ہوتی نہیں، دوسری راہ تک رہی ہوتی ہے۔ ہو نا ہو، یہ دیس میرے لئے فقط پریشانیوں کا سبب ہے۔ مجھے اگر اپنی زندگی میں سکون چاہیے تو جلد سے جلد اس دیس سے دور جانا ہوگا۔ اپنے دیس...... جہاں سکون ہی سکون ہے۔ جہاں آنکھ کھلنے پر یہ سوچنا نہیں پڑتا کہ کون سی پہیلی پہلے سلجھاؤں؟ کس راستے پر گامزن ہو کر منزل ملے گی؟ کس کو پچھاڑ کر شہہ مقدر بنے گی؟ کون اپنا ہے یا کون پرایا؟ مجھے ایسا ہی دیس چاہیے۔ اپنا دیس...... پرائے دیس میں کچھ نہیں رکھا، سوائے ذلت و تنہائی کے۔ پرائے دیس میں ہر روز نت نئی پریشانی تو مقدر بن سکتی ہے مگر راحت نہیں۔ یہاں کی راحت بھی اُس خوشنما پھل کی مانند ہے جو دیکھنے میں شیریں معلوم ہوتا ہے مگر چکھنے پر ذائقہ انتہائی ترش اور کڑوا ہے۔ مجھے اپنی زندگی سے اس ترشی، اس کڑوے پن کو نکالنا ہوگا۔'' الجھا ہوا ذہن پرائے ماحول کی خرابیوں کا تذکرہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر بے دھیانی سے جا بیٹھا۔ دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر گہری سوچ میں غوطہ زن دکھائی دیا۔

''لیکن اس سے پہلے مجھے اپنے کام کو ختم کرنا ہوگا۔ اس باب کو مکمل کرنا ہوگا۔ جو ابھی تک ادھورا ہے۔ جس کے کردار سامنے ہوتے ہوئے بھی مبہم ہیں۔ جن کا مقصد عیاں ہوتے ہوئے بھی اندھیر وادی کے ذروں میں پنہاں ہیں۔ جو بظاہر اخلاقیات کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں مگر اندر سے انتہائی کھوٹے ہیں۔ ان کرداروں کے چہرے پر سجے مکھوٹے کا سبب کیا ہے؟ مجھے جاننا ہوگا۔ ہر سچائی سے پردہ اٹھانا ہوگا۔'' الجھی گرہ مزید پیچیدگیوں میں الجھ چکی تھی۔ وہ کردار جن کے بارے میں یہ سوچ رہا تھا کہیں اور نہیں بلکہ اس کے گرد ہی

موجود تھے۔

عالمگیر جو مسیحا کے روپ میں ہر وقت اس کے پاس ہوتا تھا۔ کیا واقعی مسیحا تھا؟

پریشے جو اس کے آنے جانے پر ہمیشہ ٹوکتی رہتی تھی، کیا واقعی اس کی خیر خواہ تھی؟

علوی جو اس کے کھانے پینے کا دھیان رکھتی تھی؟ کیا اصل میں اسے فکر تھا یا پھر اس تواضع کے پیچھے کوئی اور کہانی تھی؟

ابدال، جو ہمیشہ اس کا برا چاہتا تھا۔ اس کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا؟ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ آخر اس دشمنی کا سبب کیا تھا؟ کون سی زچ تھی، جس کا ہدف یہ اب بنایا جا رہا تھا؟

کرسن اور ایشا جو بظاہر دوست تھے مگر اس کی غیر موجودگی میں اس کی خبر کیوں نہیں لیتے تھے؟ کیا دوست، اپنے دوست کی غیر موجودگی میں فکر مند نہیں ہوتا؟ کیا اس کا فرض نہیں بنتا کہ اس کی غیر موجودگی کے بارے میں دریافت کرے؟ ہو سکتا ہو وہ مصیبت میں ہو اور اسے اِس کی مدد کی ضرورت ہو، تو ایسا کرسن اور ایشا نے کیوں نہ کیا؟ کیوں اریب کو ہمیشہ اکیلا چھوڑا؟

اس نے گہری سانس لی اور پیچھے کی طرف لیٹتا چلا گیا۔ بے جان جسم کافی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ آنکھیں مبہوت چھت پر جا ٹھہریں۔ دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھا گیا۔

آنکھیں بند کیں تو عالمگیر اور ڈاکٹر کی سرگوشی یاد آئی۔ عالمگیر کے چہرے پر ذو معنی تاثر تھے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

"یہ بات میرے ذہن میں پہلے کیوں نہ آئی؟" اسے اپنے آپ پر شرمندگی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو کوسا، کیوں وہ دوست اور دشمن میں شناسائی حاصل نہ کر سکا۔ بچپن کا شعر آج اسے سمجھ آیا تھا۔

دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

دوستی کے روپ میں وہ اس کی کمزوریوں کا اندازہ لگا رہا تھا۔ عالمگیر کی پیشانی کی شکنیں وہ اب اس کی غیر موجودگی میں با آسانی پڑھ سکتا تھا۔ منافقت کا مکھوٹا، جو اس نے اپنے چہرے پر سجایا ہوا تھا۔ غیر موجودگی میں خود بخود اترتا چلا گیا۔

"مطلب ابدال اور عالمگیر آپس میں ملے ہوئے ہیں؟" اس نے بے یقینی سے سامنے دیکھا تو دونوں عکس اس پر ہنستے دیکھائی دیئے۔ وہ اتنا سادہ تھا کہ اپنے دشمن کی چال کو نہ سمجھ سکا۔ ایک دشمن بن کر دشمنی کا حق ادا کر رہا تھا تو دوسرا مسیحا کے روپ میں اس کی بنیاد کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ اپنے آپ کا اتنا عادی بنا رہا تھا کہ اس کے بغیر وہ اس دیس میں اپنی بقا قائم نہ رکھ سکے اور پھر وقت آنے پر ایسا پانسہ پھینکے کے وہ خود سنبھلنے کے قابل نہ رہے۔

"اتنا بڑا دھوکہ!" یاسیت اور ٹوٹنے کے تاثر ملے جلے تھے۔ ذات ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ اعتماد پر زبردست چوٹ لگی تھی اور جب اعتماد ٹوٹتا ہے تو انسان سنبھلنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسا ہی کچھ اریب کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جس شخص کو وہ عرصے تک دعائیں دیتا رہا، اصل میں

وہ اس کی دعاؤں کے قابل ہی نہیں تھا۔

"گھٹیا پن کی بھی ایک حد ہوتی ہے عالمگیر......اور تم نے ان تمام حدوں کو پار کر لیا ہے۔ اپنا مسیحا سمجھا تھا میں نے تمہیں اور تم نے مجھے اپنے ہی ہاتھوں سے مار دیا۔ میرے یقین کو موت دے دی۔ مسیحا بن کر ایسا جال بنتے رہے کہ میرا وجود اس میں بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ اگر ابدال چالباز ہے تو تم جال ساز ہو۔ جو خوشنما مسکن کا جھانسا دے کر اوروں کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کرتا ہے۔" وہ جبڑے بھینچے کہہ رہا تھا مگر سننے والا کوئی نہ تھا۔ اندر کا اشتعال بڑھتا جا رہا تھا۔

"اب بس......بہت موقع دے دیا میں نے دوسروں کو اپنی ذات کے ساتھ کھیل کھیلنے کا......اب اور نہیں۔ اب اریب کے ساتھ کوئی کھیل نہیں سکے گا۔ کوئی نہیں۔" آنکھوں میں پختگی تھی۔ اندر سے ٹوٹا ہوا مجسم دوبارہ جڑنے کی کوشش کر رہا تھا حالانکہ وہ بذات خود جانتا تھا کہ کرچیوں کو دوبارہ جوڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اُس وقت جب توڑنے والا آپ کا محسن ہو۔

☆......☆......☆

تنہا ہوا سفر میں تو مجھ پر کھلا یہ بھید
سائے سے پیار دھوپ سے نفرت اُسے بھی تھی

یونیورسٹی میں اب اس نے ایشا اور کرن سے اجتناب برتنا شروع کر دیا۔ شروع میں انہوں نے اس پر دھیان نہ دیا مگر اب وہ بچے تو نہ تھے جو سمجھ نہ سکتے۔

آج جب اریب کینٹین میں بیٹھا فرائے چپس کھا رہا تھا تو ایشا اور کرن بھی وہاں آ موجود ہوئے۔ وہ لمحہ بھر تو اس نے انجان رہا۔

"واہ بھئی۔ اب تو ہم سے چھپ چھپ کر چپس نوش فرمائی جا رہی ہیں۔" کرن نے ہمیشہ کی طرح دوستانہ انداز میں کہا تھا۔ اس کی آواز سن کر اسے دھچکا تو لگا مگر وہ ایسے رہا جیسے اسے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔

"اب ذرا ہماری طرف بھی بڑھاؤ گے اسے؟" ایشا نے بے تکلفی سے کام لیا۔ اریب نے اپنے سامنے موجود پلیٹ کو ایشا کی طرف کیا۔

"کیوں نہیں......تم کھاؤ، ویسے بھی میرا پیٹ بھر ہی چکا تھا۔" اس کا انداز جارحانہ تھا۔

"خیریت ہے؟ تمہارا انداز کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔" ایشا بھانپ گئی۔

"میرے رویے کو کیا ہونا ہے؟ ویسا ہی تو ہے جیسا ہمیشہ سے ہوتا ہے۔" اس نے شانے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔ کرن کو انداز میں اکتاہٹ کا عنصر محسوس ہوا۔

"اگر تم بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہو تو ہم چلے جاتے ہیں۔" کرن نے ایشا کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

''صحیح کہا تم نے۔ میرا بات کرنے کا بالکل بھی موڈ نہیں ہے۔'' اس نے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''مگر کیوں؟ کیا میری کوئی بات بری لگی تمہیں یا پھر کرن نے کوئی ایسا جملہ کہا جو تمہیں ناگوار لگا۔ اگر ایسا ہے تو بتاؤ مجھے، میں ابھی کرن کی خبر لیتی ہوں۔'' ایشا کھڑے ہوتے ہوتے دوبارہ بیٹھ گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی کرن بھی دوبارہ براجمان ہوا۔

''بہت جلدی معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تم۔'' اس نے روکھے پن میں جواب دیا تھا۔ یہ رویہ واقعی کاٹ دینے والا تھا۔ ایشا اور کرن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں اریب کے اس رویے پر کافی حیران تھے۔ وہ گردن جھٹک کر ہاٹ کافی کا سپ لے رہا تھا۔

''مطلب تم ناراض ہو مگر کس بات پر؟'' ایشا نے نرم لہجے میں پوچھا تھا۔

''اب یہ بھی میں ہی بتاؤں؟ عجیب دستور ہے۔'' اس نے استہزائیہ انداز میں شانے اچکائے اور کافی کا ایک بڑا سپ لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کافی کا کپ آدھا میز پر ہی رکھا تھا۔ چپس کی پلیٹ بھی آدھی تھی مگر اب کسی کو اس کھانے کی پرواہ نہ تھی۔ ایشا اور کرن بھی مبہوت اس کو دیکھتے ہوئے کھڑے ہوئے۔ نگاہیں آپس میں سوال و جواب کرتی رہیں مگر حاصل لاحاصل رہا۔

''اگر تم بتاؤ گے نہیں تو ہمیں کیسے معلوم ہوگا؟'' اس بار بولنے کی باری کرن کی تھی۔ وہ بھی سنجیدہ ہوا تھا۔ اریب ان دونوں کو اگنا رکرتے ہوئے کینٹین سے باہر جانے والے راستے کی طرف مڑا۔ اپنی اپنی کرسیوں کو کھسکاتے ہوئے وہ دونوں بھی پلٹے۔

''رکو اریب! ہماری بات کا جواب تو دو۔'' وہ تیز قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا جبکہ وہ دونوں اس کے پیچھے تھے۔ چہرے پر انتہائی فکر تھی۔ وہ پڑھ سکتا تھا۔

''کیا میرا گمان غلط تھا؟'' وہ آگے بڑھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

''اریب! ایسے کوئی کرتا ہے کیا؟ ہمیں ہماری غلطی تو بتاؤ۔'' کرن نے اس کے بازو کو پکڑ کر کھینچا تھا۔ اس نے آنکھوں میں دیکھنے کی بجائے پیشانی کی شکنیں پڑھی تھیں۔ وہ واقعی اپنی غلطی کا تدراک چاہتا تھا۔

''میں ایک ہفتے تک یونیورسٹی نہیں آیا مگر تم دونوں میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ فون یا کم سے کم ایک میسج کر کے میرا حال دریافت کرسکو! کیا یہ ہوتے ہیں دوست؟'' اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔ کرن کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔

''تم نے اپنا فون چیک کیا؟'' کرن کی بجائے ایشا نے کہا تھا۔

''ہاں...... ایک بار نہیں دس بار۔'' اس کا انداز نہیں بدلا تھا۔

''پھر بھی تم ہم سے یہ پوچھ رہے ہو کہ ہم نے تمہارے ساتھ رابطہ کیوں نہیں کیا؟'' ایشا کے اس سوال پر وہ بوکھلایا۔ پیشانی پر شکن ابھری۔

''مطلب؟'' وہ الجھا مگر وہ ایشا مطمئن تھی۔

"مطلب یہ کہ فون ہسٹری چیک کرو ذرا اپنی۔ کرن نے میرے سامنے تمہیں میسج کیا تھا کہ ہم ایک ہفتے تک یونیورسٹی نہیں آ رہے۔ اس سے پہلے بھی تم نے کرن کو یہ کہا تھا کہ تمہیں ایک کام ہے۔ ہم یہی سمجھے کہ تم اس کام میں مصروف ہو۔ اس لئے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ہم دوست ضرور ہیں اریب مگر اتنی عقل ضرور رکھتے ہیں کہ کچھ کام نجی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم نے بھی یہی سمجھا کہ تم ہم سے وہ بات شیئر نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے تم سے سوال و جواب نہیں کیے۔" ایشا نے ہر بات واضح کر دی۔ اریب ہکا بکا اس کی باتوں کو سن رہا تھا۔ ایک ایک لفظ میں سچائی تھی۔ میسج ہسٹری چیک کی تو واقعی وہاں کرن کا میسج تھا مگر یہ میسج پہلے کیوں نہیں دیکھا اس نے؟ وہ نظریں جھکائے اپنے فعل پر شرمسار تھا۔

"تمہیں نظریں جھکانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اریب بہت دکھ ہوا ہمیں۔" ایشا نے کہا تھا۔ اریب کچھ بھی کہنے کے قابل نہ تھا۔ تبھی وہاں سے چل دیا۔ کرن نے ایشا کی طرف دیکھا تو پلکیں جھپکتے ہوئے یقین دہانی کروائی۔ وہ پلک جھپکنے کا مقصد سمجھ گیا۔ لبوں پر تسکین بھرا ایک تاثر ابھرا تھا۔

☆......☆......☆

کہاں تک کوئی ڈھونڈے مسافروں کا سراغ؟

بچھڑنے والوں کا کیا ہے، ملے ملے نہ ملے!!

فائلیں اریب کے ٹیبل پر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ان کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ مینیجر بھی سامنے براجمان تھا جو اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ کریمی شرٹ اور بلیک جینز میں ملبوس تھا۔

"پرفارمنس نارمل ہے۔" اریب نے چارٹ کا جائزہ لیا جو تقریباً پچھلے ماہ جیسے تھا۔

"جی بالکل دراصل کمپنی کا ایک یونٹ خراب ہو چکا ہے۔ اسے تعمیرِ نو کی ضرورت ہے۔" مینیجر نے کہا تھا جس پر اریب نے فائل سے نظریں ہٹا کر اس کی طرف دیکھا۔ استفہامیہ آنکھیں دیکھ کر اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"ایک یونٹ کام نہیں کر رہا اور آپ ہمیں اب بتا رہے ہیں؟ ایسے کرتے ہیں کام؟" وہ کام کے بارے میں کافی سنجیدہ تھا۔

"سوری سر! دراصل جہانزیب سر بھی ایک یونٹ کی خاطر کمپنی کو بند نہیں کرتے تھے؟"

"ایک منٹ...... یہ کمپنی بند کرنے کو کس نے کہا؟ یہ آپ بھول رہے ہیں یہاں ٹوٹل پانچ یونٹ ہیں۔ اگر ایک خراب ہو جاتا ہے تو باقی چار کیوں بند کیے جائیں؟" اس نے فائل کو ٹیبل پر رکھ کر کہنیاں ٹیبل پر بچھا لیں اور آگے کی جانب جھکتے ہوئے استفسار کیا تھا۔

"کیونکہ کنسٹرکشن کے دوران ورکرز کو دشواری کا سامنا ہوتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر باقی کی پروڈکٹ بھی خراب ہو جاتی ہے۔" مینیجر کی بات سن کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لمحہ بھر کے لئے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ پھر گہرا سانس لیتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا اور پشت کرسی

کے ساتھ جمالی۔

''ایک یونٹ کو ٹھیک ہونے میں کتنا وقت درکار ہے؟''

''جہانزیب سر دو یونٹ سے کم......!'' وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر اریب نے مداخلت کی۔

''جتنا پوچھا ہے اتنا جواب دیں۔ بابا جان کے کام کرنے کا انداز الگ ہے اور میرا الگ۔ سب سے بڑھ کر بابا جان نے اس برانچ کی باگ دوڑ میرے ہاتھوں میں دے دی ہے اور مکمل آزادی بھی دی ہے۔'' اریب نے وضاحت کی۔

''سوری سر......ایک یونٹ کو بیس دن میں ٹھیک کر لیا جائے گا مگر انجینئرز ملٹی نیشنل کمپنی کے ہوں تو......!'' اریب نے اثبات میں گردن ہلائی اور دماغ میں ہی کچھ کیلکولیشن کی۔

''گڈ......جہاں تک میرا خیال ہے اس برانچ میں کوئی پروڈکٹ سٹور روم میں نہیں ہے۔''

''جی سر! کل ہی کلائینٹ کو سپلائے کی گئی ہے پروڈکٹ۔ اب چار یونٹ نئی پروڈکشن پر کام رہے ہیں۔''

''نئی پروڈکٹ......یعنی ایک ہی کمپنی کے لئے؟'' مینیجر نے تائید کی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔ ٹارگٹ کب تک کا ہے؟''

''پندرہ دن کا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اگر کنسٹرکشن کل سے شروع کر دی جائے تو اگلے بیس دنوں میں مکمل ہو جائے گی۔''

''بات تو ٹھیک ہے مگر پروڈکشن؟''

''چاروں یونٹ اپنا کام دن میں کریں گے اور شپمنٹ بھی ڈیلی بیسز پر کی جائے گی۔ کنسٹرکشن کا کام رات کو ہوگا۔ اس طرح ورکرز کو بھی دشواری کا سامنا نہیں ہوگا اور تمام کام بھی وقت پر ہوگا۔'' مینیجر اریب کی منصوبہ بندی پر ہکا بکا رہ گیا۔ وہ اس کی ذہانت کو داد دے یا پھر حیران ہو؟ سمجھ نہ آیا۔

''اب آپ جا سکتے ہیں اور برانچ میں جتنی بھی ایکسٹرا چیزیں ہیں۔ اسے آج ہی کسی سٹور میں شفٹ کروائیں۔ اگر کمپنی کے سٹور میں جگہ کم پڑ جائے تو ایک ماہ کے لئے کوئی سٹور رینٹ پر لے لو۔ مگر تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ ہری اپ۔'' اس نے فائل کلوز کی۔ اس طرح کمپنی کا یہ باب ختم ہوا۔

☆......☆......☆

شکستہ آئینوں کی کرچیاں اچھی نہیں لگتیں

مجھے وعدوں کی خالی سیپیاں اچھی نہیں لگتیں

وہ یونیورسٹی کے لئے لیٹ ہو چکا تھا۔ کمپنی کا کام وقت پر ہو اس لئے اس نے یونیورسٹی جانا دیر سے شروع کر دیا۔ بظاہر وہ ابدال والے معاملے کو پسِ پشت ڈالے ہوئے تھا مگر دماغ کے اندر کیا چل رہا تھا؟ اس کا علم شاید اسے خود بھی نہ تھا۔ اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے وہ کوئی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

''آپ کے لئے پارسل آیا ہے۔'' علوی نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی کہا تھا۔ وہ اپنی شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ فوراً پلٹا۔ آستینیں چڑھائیں، حیرت سے ابرو پھیلائیں اور آگے بڑھا۔

''میرے لئے پارسل؟ مگر کس نے بھیجا؟'' اس نے پارسل وصول کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''بھیجنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا۔'' جواب دیا گیا مگر مطمئن نہ ہوا۔

''اگر کوئی شخص بذاتِ خود نہیں دے کر گیا تو ظاہر ہے کوریئر آیا ہوگا اور کوریئر پر نام اور ایڈریس تو مینشن ہی ہوتا ہے۔ تم اس کا کور لا کر دو مجھے۔'' پارسل کو اپنے پیچھے رکھے ٹیبل پر رکھا اور علوی کی طرف پوری طرح متوجہ ہوا۔

''سوری سر! وہ تو میں نے پھینک دیا۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تھا۔

''پھینک دیا؟ مگر کیوں؟'' اس نے قدرے مشتعل انداز میں کہا تھا۔ پیشانی پر شکن ابھری مگر اب ان شکنوں کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ علوی کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی تھی۔ وہ واقعی پشیمان تھی۔

''اچھا! ٹھیک ہے۔ تم جا سکتی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ وارڈروب کی طرف بڑھا تھا۔ علوی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پھر دبے قدموں سے پلٹ گئی۔

وارڈروب سے ایک کوٹ نکالا اور اسے پہنتے ہوئے وہ ڈریسنگ کی طرف بڑھا۔ وجیہہ چہرہ خود اپنی نظر اتار رہا تھا۔ اس نے شرٹ کا کالر سیٹ کیا اور آستینیں ٹھیک کرتے ہوئے اس کی نگاہ آئینہ پر پڑی جو پارسل کا عکس دیکھا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ بت کی طرح استادہ دیکھائی دیئے۔ سوچ نے دوبارہ ضرب لگائی۔

''کون بھیج سکتا ہے یہ مجھے پارسل؟'' اس نے سوچا اور پلٹ کر پارسل کے سامنے صوفے پر آ بیٹھا۔ کافی دیر تک وہ اس کو گھورتا رہا۔ جیسے اس سے سوال و جواب کر رہا ہو۔ اس کی شناسائی حاصل کر رہا ہو مگر جیت پارسل کی ہوئی۔ وہ اپنے اندر کا راز افشاں کرنے میں ناکام رہا۔ اریب نے خیالات کو جھٹکا اور آگے بڑھ کر اس کو کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ وہ ایک درمیانے سائز کا مستطیل بکس تھا۔ تجسس کے ساتھ وہ اب بکس کھول رہا تھا مگر جیسے ہی اس نے اوپر کا حصہ جدا کیا تو وہ چونکا۔ اندر ایک مزید بکس تھا۔ اریب نے احتیاط کے ساتھ اس بکس کو اندر سے نکال کر ساتھ رکھا اور پہلے سے زیادہ تجسس کے ساتھ اس دوسرے بکس کو کھولا مگر ایک بار پھر اس کے تجسس کو ہوا دی گئی۔ اندر ایک اور بکس تھا۔ اس بار پیشانی پر غصے کے شکن بھی نمودار ہوئے۔

"یہ کیا تماشا ہے؟" وہ بڑبڑایا تھا مگر جواب اس بکس میں ہی تھا۔اس نے سرعت کے ساتھ دوبارہ بکس کھولا مگر ایک اور بکس اس کا منتظر تھا۔اس بار وہ واقعی طیش میں آیا تھا۔اشتعال بھرے انداز میں کھڑا ہوا۔

"گو ٹو ہیل......" یہ کہتے ہی وہ وہاں سے اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھا مگر اندر کا تجسس تھا کہ ختم نہیں ہوا تھا۔پلٹ کر دیکھا تو اس بکس کو اپنی طرف بلاتا ہوا پایا۔دل نے بھی آگے بڑھ کر اس بکس کو کھول کر دیکھنے کی حمایت کی مگر وہ ارادہ کر چکا تھا۔جو کوئی بھی تھا اس نے لازمی اس کے ساتھ کوئی کھیل کھیلا تھا اور وہ اپنے ساتھ کھیلنے کی اجازت قطعاً نہیں دے سکتا تھا۔تبھی گردن جھٹک کر آگے بڑھا۔

☆......☆......☆

یہ کس نے ہم سے لہو کا خراج پھر مانگا؟

ابھی تو سوئے تھے مقتل کو سرخرو کر کے

اِندر نے کار یونیورسٹی کے عین سامنے پارک کی تھی۔معجّل دروازہ کھولا اور اِندر کو جانے کی اجازت دی۔اس نے کار ریورس کی تو اریب بھی مین گیٹ سے یونیورسٹی میں داخل ہوا۔ابھی وہ دس قدم ہی چلا ہوگا کہ اسے کسی نے آواز دی تھی۔آواز انجان تھی۔تبھی وہ چلتا رہا کیونکہ پکارنے والے نے نام نہیں پکارا تھا۔

"انکل سنیں!" اس بار آواز واضح تھی اور پکارنے والے نے اس کے کوٹ کو بھی پکڑ کر کھینچا تھا وہ دفعتہً پلٹا تو وہاں ایک چھوٹی سی بچی تھی۔جو اسی ملک کی رہائشی تھی۔اس بچی کے ہاتھوں میں ایک بکٹ تھا۔

"جی بیٹا!" اسے دیکھ کر وہ مسکرایا تھا۔

"یہ آپ کے لئے۔" وہ بکٹ اس نے اریب کو تھمایا تھا۔اریب نے حیرانی سے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے۔

"میرے لئے مگر کس نے؟" سوال پوچھنے تک بہت دیر ہو چکی تھی۔وہ جا چکی تھی۔بکٹ اس کے ہاتھوں میں تھا۔گلاب کے پودوں سے سجا بکٹ۔پیشانی پر استفہامیہ شکنیں ابھریں، حیرت کا جہاں آباد تھا۔وہ کبھی بکٹ پر نظر دوڑاتا تو کبھی اس راستے کی طرف دیکھتا جہاں سے وہ بچی اس کے لئے بکٹ لے کر آئی تھی۔

"کون تھی وہ بچی؟ اور کس نے بھیجے یہ پھول؟" ذہن ایک بار مزید الجھ گیا۔شاید اس کی زندگی میں پہیلیاں ہی بہت تھی۔جسے سلجھانا اس کا مقصدِ حیات بن چکا تھا۔ہر ابھرتا سورج اسے نئے کرداروں سے روشناس کروا رہا تھا۔اب جانے کس کردار کی آمد تھی؟ جو اسے اپنے ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر! آج دیر ہو گئی کیا؟" یہ کرن تھا۔جس نے پیچھے سے اس کے شانوں کو تھپتھپایا تھا۔اس کی نظر بکٹ پر جا کر ٹھہر گئی۔

"واؤ......امیزنگ۔صبح ہی صبح پھولوں کا نذرانہ......کس کے لئے؟" اس نے ذو معنی لہجے میں استفسار کیا تھا۔اریب نے عمیق

نگاہ کرسن پر ڈالی جس کا مطلب وہ سمجھ کر بھی سمجھنے کو تیار نہ تھا۔

''اگر برا نہ مانوں تو اس کو ایک بار سونگھ سکتا ہوں۔ وہ کیا ہے ناں۔ دیکھنے میں اتنے خوبصورت ہیں تو سونگھے بغیر دل کو سکون نہیں آئے گا'' وہ اپنی کیفیت بیان کر رہا تھا۔ اریب نے وہ بکٹ بے پرواہی سے اسے تھما دیا۔

''چاہو تو خود ہی رکھ لو'' بکٹ دیتے ہی وہ پلٹا تھا مگر جلد ہی اس کے قدم منجمد ہونے والے تھے۔

''تھینک یو۔ اتنا اچھا بکٹ دینے کے لئے'' وہ مسکرایا اور گلاب کو سونگھا تو خوشگوار بو اس کی سانسوں میں تحلیل ہوتی چلی گئی۔ اب اس کا دل ان نرم و نازک پتیوں کو چھونے کا کیا تھا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ پتیوں کی طرف بڑھایا تو اسے عجیب سا چپکاہٹ والا محلول محسوس ہوا۔

''یہ کیا ہے اریب؟'' اس نے اچنبھے انداز میں کہا تھا۔ اریب کی سماعت سے یہ الفاظ ٹکرائے تو وہ پلٹا اور ایک جھٹکا لگا۔ کرسن کا انگوٹھا اور پہلی انگلی سرخ تھی اور جس جگہ پتیوں کو چھوا گیا تھا وہاں سے رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھنے کی بجائے پلٹا اور ایک جھٹکے سے کرسن کے ہاتھوں میں سے وہ پھول لئے۔

''ایسا بھی کوئی مذاق کرتا ہے یار؟ جعلی پھول۔'' وہ ٹشو سے اپنے ہاتھ صاف کر رہا تھا جبکہ اریب مبہوت ان پھولوں کو دیکھ رہا تھا۔ بظاہر خوبرو مگر اندر سے کھوٹے۔

''میں ہاتھ ہی دھو کر آتا ہوں۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے جاتا دکھائی دیا مگر اریب کے لئے یہ پھول اس کے جانے سے زیادہ اہمیت حاصل کر چکے تھے۔ ان پھولوں کو دھیرے سے چھوا تو وہی سیاہ مادہ اس کے ہاتھوں کو بھی تر کر رہا تھا۔ چپکا چپکا مادہ عجیب سی کیفیت کو جنم لے رہا تھا۔

''یہ کیا لگا ہے پھولوں پر؟'' نت نئے سوالوں میں وہ الجھنے لگا تھا۔ اپنے کوٹ سے کچھ ٹشو نکالے اور ایک پھول کی پتی کو صاف کیا تو اندر سے سفید پتیوں کو دن کا اجالا دیکھنا نصیب ہوا۔ وہ چونکا۔ دائیں جانب پلٹ کر دیکھا تو ایک فوارا تھا۔ وہ اسی کے پاس گیا۔ پھولوں کو اس پانی سے صاف کیا تو وہ رنگ اترتا چلا گیا۔ سفیدہ غالب آگئی۔ وہ ہونقوں اس سفیدی کو دیکھتا رہا۔

''سفید پھولوں کو رنگ کرنے کا مقصد؟'' اس نے لب ہلائے تھے۔ اس کے علاوہ اسے پھولوں میں کوئی معیوب اور غیر معمولی شے نظر نہیں آئی۔

''شاید کسی نے مذاق کیا ہے۔'' جب سوال حد سے بڑھ جائیں اور الجھنوں کو سلجھانے کا راستہ نہیں ملتا تو اکثر قیاس آرائیاں کام آجاتی ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ خود سے جواب اخذ کیا اور ان پھولوں کو بے پرواہی کے ساتھ فوارے کے پاس پھینک دیا۔ جو منافقت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہوں، ایسی چیزوں کی اس کی زندگی میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ پھولوں کا یہ بکٹ ہوا کے پروں پر سوار، جھولتا

ہوا درخت کے قدموں سے جا ٹکرایا۔اس نے آخری باران پھولوں کی منزل کو دیکھا تھا۔جواب غیر معمولی دکھائی دے رہے تھے۔اس کے قدم دور جانے کی بجائے پھولوں کی طرف بڑھے۔

انہی پھولوں میں ایک پتی ایسی تھی جو سب سے منفرد تھی۔جو بظاہر اوروں جیسی تھی مگر کچھ تو ایسا تو جو اسے سب سے ممتاز کیے ہوئے تھا۔اریب نے جھک کر اس پتی کو توڑا تو حیران رہ گیا۔اس کو عجیب سے انداز میں کاٹا گیا تھا اور انگلش کا الفابیٹ آر (R) بنتا تھا۔وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔باقی پتیوں کو بھی چھانٹا،شاید مزید کچھ الگ نظر آئے مگر ایسا نہ ہوا۔

''اریب؟'' کرن نے پیچھے سے آواز دی تھی۔جو کچھ فاصلے پر ہی تھا۔وہ پلٹا مگر دھیان تو اسی پتی پر تھا جو اسے کسی کی خبر دے رہی تھی۔

☆......☆......☆

کتنے مغرور پہاڑوں کے بدن چاک ہوئے

تیز کرنوں کی جو بارش ہوئی تیروں جیسی

تمام یونٹ بظاہر اپنا کام صحیح سے کر رہے تھے مگر کنسٹرکشن کی وجہ سے ورکرز کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔اریب ان سب کی تکالیف کو سمجھتا تھا۔ابھی وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''کیا میں اندر آسکتا ہوں سر؟'' یہ مینیجر تھا۔اریب پلٹا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔اس کے ہاتھ میں پے پروفائل تھی۔جس کا مطالعہ وہ بغور کر رہا تھا۔

''اچھا ہوا آپ آگئے۔میں آپ کو ہی بلانے جا رہا تھا۔'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا تھا۔

''جی سر کہیے۔کوئی کام تھا؟'' اس نے مؤدب انداز میں کہا تھا۔اگرچہ وہ عمر میں اس سے بڑا تھا مگر عہدہ شاید عمر کو نہیں دیکھتا۔

''جی......ذرا بتائیے کہ کنسٹرکشن کا کام کہاں تک پہنچا؟''

''سر ابھی تو کام شروع ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟ چار دنوں میں انوائرنمنٹ ہی بنا ہے کام کا۔'' اس نے اکتاہٹ کے ساتھ جواب دیا تھا۔

''لیکن ورکرز تو ڈسٹرب ہو رہے ہیں ناں؟'' اس نے عمیق نگاہ مینیجر پر ڈالی تھی۔جس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔اریب اپنی ٹیبل کی طرف بڑھا اور ہاتھ میں موجود فائل کو رکھ کر دوسری فائل اٹھائی۔

''بالکل سر! لیبر اگرچہ رات کو کام کرتے ہیں مگران کا سامان دن میں تو موجود ہوتا ہے۔جو کافی ڈسٹربنس پیدا کر رہا ہے۔'' اریب نے گردن ہلائی اور پھر اس فائل کا تقابلی جائزہ لیا۔

''پھر ایسا کیجیے اس ماہ ورکرز کو سیلری کے ساتھ ساتھ ایکسٹرا بونس بھی دینے کا انتظام کیجیے۔''اس بات پر وہ چونکا تھا۔حیرت سے اریب کی طرف دیکھا جو دوسری فائل کا تقابلی جائزہ لینے کے بعد تیسری کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

''ایکسٹرا بونس؟ لیکن سر ابھی چار ماہ مکمل نہیں ہوئے۔''

''میرے خیال سے آپ نے الفاظ پر غور نہیں کیا۔میں نے ایکسٹرا بونس کی بات کی ہے،ریگولر بونس کی نہیں۔''اس نے بنا دیکھے کہا اور اپنی رولنگ چیئر پر براجمان ہوا۔

''ایکسٹرا؟ لیکن کیوں؟''وہ حیرت سے اریب کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیوں کا تو کوئی جواز ہی نہیں بنتا جب ہمارے ورکرز اتنی مشکلات کو جھیل کر ہمارا کام کر رہے ہیں تو ہمارا بھی تو فرض بنتا ہے ناں کہ ان کی ضروریات کا خیال رکھیں۔ان کی مجبوری کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔''اس نے وضاحت پیش کی تھی۔

''لیکن سر یہ ان کی ڈیوٹی ہے۔''

''ڈیوٹی ہے مگر پرسکون ماحول میں۔اگر ماحول کام کے قابل نہیں ہے تو اسے پرسکون بنانا ہماری ذمہ داری بنتی ہے اگر ایسا نہیں کر سکتے تو انہیں ان کا جائز حق دینا ہمارا فرض ہے۔''اریب کے جواب پر وہ خاموش ہو گیا۔کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اپنی گردن اثبات میں ہلا دی۔

''اوکے۔''یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دیا۔اریب بھی فائل میں مشغول ہوا تبھی اس نے سامنے مینجر کی طرف دیکھا۔

''سنیں۔''

''یس سر۔''وہ پلٹا۔

''آپ کو کوئی کام تھا؟''

''یس سر،آپ کے لئے ایک لیٹر آیا تھا۔''اس نے سرعت اپنی جیب سے ایک خاکی رنگ کا انویلپ نکال کر اریب کی طرف بڑھایا۔

''میرے لئے مگر کس نے بھیجا؟''وہ حیرت کا شکار تھا۔

''معلوم نہیں سر۔سکیورٹی گارڈ کو ایک بچہ دے کر گیا تھا اور اس پر آپ کا نام لکھا ہے۔''اس نے وضاحت کی۔اریب نے اچھنبے انداز میں اس لیٹر کو ٹٹولا مگر اپنے نام کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔مینیجر ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں۔''اس نے کہا اور دوبارہ توجہ کا مرکز اس لیٹر کو بنایا۔مینیجر بھی وہاں سے چلا گیا۔

''یہ لیٹر کون بھیج سکتا ہے؟ شاید کسی بزنس کے سلسلے میں ہو۔''پچھلے دونوں واقعات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس نے اس لیٹر

کو کنارے سے پھاڑا، اندر ایک سفید کاغذ تھا جس پر ایک حرف (I) پرنٹ کیا گیا تھا۔ اریب نے غیر یقینی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور اوپر سے نیچے تک بغور جائزہ لیا مگر اس حرف کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

"یہ کیا ہے؟" وہ اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر تھا۔

"سنگل لائن؟ اب اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟" وہ ایک بار پھر ان لفظوں کے جال میں الجھ کر رہ گیا۔

☆......☆......☆

بسا ہوا تھا جو سینے میں آرزو کی طرح
رگوں میں گونج رہا ہے وہ اب لہو کی طرح

تھکا دینے والے دن کے بعد ایک پرسکون رات کا آغاز ہونے جا رہا تھا مگر شاید امتحان ابھی باقی تھے۔ تبھی اس کی رات کے سکون کو بھی غارت کرنے کا انتظام کیا جا چکا تھا۔

وہ بلیک ٹراؤزر اور شرٹ پہن کر ابھی واش روم سے نکلا تھا۔ ڈنر وہ پہلے ہی علوی کے ہاتھوں منگوا چکا تھا۔ دروازہ بھی لاک تھا تاکہ کوئی ڈسٹرب نہ کر سکے۔ ہاتھ صاف کرنے کے بعد اس نے ٹی وی آن کیا اور انٹرٹیمنٹ چینل لگا کر ریموٹ سائیڈ پر رکھ دیا۔ ایک کامیڈی ہالی وڈ مووی سکرین پر جگمگا رہی تھی۔ اس نے ٹرالی کو صوفے کی جانب کھینچ کر بریانی کی پلیٹ کو ٹیبل پر رکھا اور مووی انجوائے کرتے ہوئے بریانی نوش کرنے کی تیاری کی۔

"بلا آخر کئی دنوں بعد سکون میسر آیا۔" اس نے گہری سانس لی ہی تھی کہ موبائل پر میسج کی رنگ ٹون کمرے میں گونجی۔ اس نے اکتاہٹ والے انداز میں موبائل کی جانب دیکھا۔ اس کا میسج چیک کرنے کا ذرا بھی موڈ نہیں تھا مگر دیکھنا ضروری تھا۔ اس نے پلیٹ کو سائیڈ میں رکھ کر موبائل دیکھا۔ نمبر انجان تھا۔ میسج بھی مختصر تھا۔ صرف حرف اِی (E) تھا۔ اس نے گردن جھٹک کر اس میسج کو معمولی جانا اور موبائل سائیڈ میں رکھ بریانی اور مووی کا مزہ لیا۔

آدھے گھنٹے تک وہ مکمل ریلیکس ہو چکا تھا۔ مووی دیکھنا اس کا شوق نہیں تھا مگر اکیلے میں دل بہلانے کا کوئی تو انتظام کرنا ہی تھا۔ اب وہ سونا چاہتا تھا۔ تبھی ٹی وی آف کیا اور اٹھ کر پہلے بالکونی کی طرف گیا۔ سیاہ آسمان پر نظر دوڑائی۔ جہاں آج چاند موجود نہ تھا۔ ستارے بھی کسی شے سے خوف کھائے ہوئے تھے تبھی آنکھوں کے سامنے آنے سے شرمائے جاتے تھے۔ ہوا بھی اپنے سرور سے خالی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پوری فضا کسی کا سوگ منا رہی ہو۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور پردے گرانے کے بعد وہ واپس اپنے بیڈ کی طرف بڑھا۔ بیڈ شیٹ انتہائی نفیس انداز میں بچھائی گئی تھی۔ وہ علوی کا کام دیکھ کر مسکرایا۔

"ماریہ علوی جیسی کبھی نہیں بن سکتی۔" لبوں نے تبسم کا ایک جام پیا۔ لیٹنے کے بعد اس نے تمام تر لائٹیں آف کر دیں۔ ماحول میں

تاریکی نے ایسا بسیرا کیا کہ ہر شے تاریک ہوگئی مگر اس تاریکی میں بھی ایک جگہ روشن تھی۔ وہ جگہ اریب کا ذہن تھا۔ وہ سکون کی خاطر لیٹا تھا مگر سکون اس سے منہ پھیر کر ایسے بھاگا کہ پلٹ کر نہ دیکھا۔ وہ کبھی دائیں تو کبھی بائیں جانب کروٹ بدلتا مگر نینداس پر مہربان نہ ہوئی۔ ایک بے چینی تھی جو اسے اندر سے پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ذہن کو تمام تر خیالات سے آزاد کرتے ہوئے نیند کو آنے کی اجازت دی۔ نیند تو اپنی تمام تر راحتوں کے ساتھ نہ آئی البتہ ایک نئی حس نے اس کے حواس کو بکھیر ضرور دیا تھا۔

ذہن جیسے ہی گرد سے پاک ہوا تو دن بھر کے واقعات یکے بعد دیگرے کسی فلم کی ریل کی طرح چلنے لگے۔ ایک کے بعد ایک سین آنکھوں کے سامنے حقیقت کی طرح عیاں تھا۔

پھول دینے والی بچی......اور پھر پھولوں سے رنگ کا اترنا......پھولوں کو پھینکنے سے لفظ R کا سامنے آنا......عالمگیر انڈسٹریز میں لیٹر آنا......سنگل لائن......ڈنر کے دوران انجان نمبر سے میسج آنا......صرف E لکھا ہونا......تمام واقعات ایک دوسرے سے جڑے معلوم ہو رہے تھے مگر کیسے؟ تبھی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''پارسل......وہ پارسل تو میں نے دیکھا نہیں؟'' وہ برق رفتاری سے اٹھا اور اس بکس کو ڈھونڈنے لگا جو صبح ہی ٹیبل پر چھوڑا تھا مگر اب وہاں موجود نہیں تھا۔

''بکس نہیں ہے یہاں؟ کہاں جا سکتا ہے؟'' خود ہی سوال کیا اور پھر خود ہی جواب اخذ کیا۔

''شاید علوی نے صفائی کے دوران کہیں رکھ دیا ہوگا۔'' اٹھ کر اس نے ٹیبل، صوفہ بیڈ غرض ہر شے کے نیچے دیکھ لیا۔ جہاں اس نے گمان کیا تھا کہ علوی اسے رکھ سکتی ہے مگر ہر جگہ اسے ناکامی کا سامنا ہوا۔ وہ اس قدر بے چین ہو چکا تھا کہ نیند اب چاہ کر بھی اس پر مہربان نہیں ہو سکتی تھی۔ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وہ ہر شے کو بغور دیکھ رہا تھا۔

''کہاں جا سکتا ہے بکس؟'' اس نے ایک بار پھر ہر شے کو دیکھنے کا ارادہ کیا۔ اس بار شروعات اس نے صوفے کے پیچھے سے کی۔ جہاں کئی بکس تھے مگر مطلوبہ بکس کہیں نہ ملا۔

''کہیں علوی نے اسے پھینک تو نہیں دیا؟'' ایک ملال نے دل میں جنم لیا جسے سوچ کر ہی جان جانے لگی تھی۔ صبح تک وہ اس بکس سے بیزاریت محسوس کر رہا تھا اور اب اس کے لئے ایسے بے چین ہو رہا تھا جیسے وہ اس کے لئے گوہر نایاب ہو۔ وہ مایوسی کے ساتھ واپس بیڈ کی جانب پلٹا تو اس کی نظر دروازے کے عین ساتھ بنی شوز کی الماری میں گئی جس کو لاک کرنا شاید علوی بھول گئی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور اسے بند کرنا چاہا۔ جیسے ہی اس نے ہاتھ بڑھایا تو اس کی نگاہ الماری میں موجود مطلوبہ بکس پر جا ٹھہری۔ وہ وہیں تھا۔ علوی نے بھی عام سا سمجھ کر اسے نچلے حصے کا نصیب بنا دیا تھا۔ وہ اسے نکال کر صوفے پر آ بیٹھا۔ اسے کھولا تو نئے بکس سے سامنا ہوا۔ اس بار وہ بیزار نہ ہوا بلکہ ایک کے بعد ایک بکس کھولتا چلا گیا۔ ہر بکس کے کھولنے پر ایک نیا تجسس جنم لیتا۔ اس شے کو دیکھنے کا اشتیاق انتہائی بڑھ چکا تھا۔ سب سے

آخر میں ایک انگلی کے برابر بکس تھا۔شاید وہ آخری تھا۔اس نے اپنی سانسوں کو لمحہ بھر کے لئے تھاما۔پلکیں جھپکائیں اور پھر انتہائی دھیمے انداز میں اس بکس کو کھولا تھا۔یہاں بھی ایک نئے ورڈ سے اس کی ملاقات ہوئی۔

''ایف (F)''اس کا سارا تجسس ریت کے ٹیلے کی مانند ثابت ہوا۔جس کو پار کرنے کے بعد منزل کے قریب ہونے کی آس جنم لیتی ہے مگر آنکھیں جیسے ہی سامنے دیکھتی ہیں تو ایک نئے ٹیلے کو اپنا منتظر پاتی ہیں۔اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔تین پہیلیاں پہلے موجود تھی۔اب چوتھی پہیلی، جو دراصل سب سے پہلی پہیلی تھی۔وہ اٹھا اور اس صفحے کو، جہاں سنگل لائن پرنٹ تھی، اٹھالایا۔ساتھ ہی ساتھ اس گلاب کی پنکھڑی کو بھی جس پر لفظ آر (R) کے مشابہ ایک حرف تراشا گیا تھا۔موبائل کو بھی سامنے رکھا، جس پر میسج آیا تھا۔اس طرح چاروں حروف سامنے تھے مگر پہیلی تھی کہ سلجھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

''کیا ہوسکتا ہے ان الفابیٹس کا مطلب؟''وہ سوچتا رہا۔حرفوں کو جوڑ توڑ کر لفظ بنانے کی کوشش کرتا رہا مگر سرا ملنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

''ایسا نہیں ہوسکتا۔ان کا کچھ نہ کچھ تو مطلب ہے اور لازماً ان کو کسی ایک ہی شخص نے بھیجا ہے۔''اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں ٹھونس لیا۔ماؤف ذہن لفظوں کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔تبھی فون کی رنگ ہوئی۔اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو ابدال کا نمبر تھا۔گہری سانس لیتے ہوئے اس نے کال ریسیو کی تھی۔

''ہیلو مائے ڈیئر! کیا حال چال ہے؟''ہمیشہ کی طرح تر و تازہ آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔جو راحت کی بجائے افسردگی کا سبب تھی۔

''میرا حال پوچھنے کی بجائے اپنی آزادی کی آخری گنتی شروع کردو کیونکہ بہت جلد تمہارا کھیل ختم ہونے جارہا ہے۔''اس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے جبڑے بھینچے تھے۔جواباً ہمیشہ کی طرح ایک قہقہہ گونجا۔

''میرے کھیل کی بجائے اپنے سامنے رکھے گیم کی طرف توجہ دو۔وقت کم ہے اور ٹاسک بہت سخت۔''یہ سنتے ہی جیسے اس کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔وہ سنبھلا اور سماعت کے پردوں کا رخ موبائل کی طرف موڑا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''متجّل الفاظ کہے گئے۔

''مطلب تمہیں خود سمجھنا ہے۔چاروں حروف کو ملا کر ایک ورڈ بناؤ اور پھر وقت سے پہلے اسے سلجھاؤ۔''یہ کہتے ہی رابطہ منقطع کر دیا گیا۔اریب نے کئی بار دوبارہ اس نمبر پر ٹرائے کیا مگر جواب ندارد۔

''کیا مصیبت ہے؟''اس نے اکتاہٹ کے ساتھ کہا تھا اور تیکھی نگاہ سامنے پڑی چیزوں پر ڈالی مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔

''شاید......میں زیادہ ہائپر ہو رہا ہوں، اس لئے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔مجھے ٹھنڈے دماغ سے سوچنا ہوگا۔''اس نے گہری سانس لی اور ایک بار پھر چاروں حرفوں کو بغور دیکھا۔لڑی سے لڑی جڑتی چلی گئی۔چاروں حرف خود بخود ایک دوسرے کے آگے پیچھے سماتے چلے

گئے۔ پہلا حرف الیف تھا۔ دوسرا اسنگل لائن جو شاید آئی تھا۔ پھر آر اور آخری حرف کو جوڑنے میں ذرا بھی مشکل نہ ہوئی۔

''FIRE'' اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلتی چلی گئیں۔ ساکت آنکھیں ہوا میں بننے والے عکسی لفظ پر جمی ہوئی تھیں اور حدت وہ اپنے گرد محسوس کر سکتا تھا۔

''آگ یا پھر......؟'' اس کے اوسان بری طرح خطا ہو چکے تھے۔ ابدال کا قہقہہ اور لفظوں کی تپش بڑھتی چلی گئی۔

''اب کیا کرنے والا ہے ابدال؟ کون سا گھناؤنا کام سرانجام دینے جا رہا ہے؟'' وہ سوچتا رہا۔ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے وہ اس کی ذات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ معجّل اپنی جگہ سے اٹھا مگر نگاہیں ٹیبل کی سطح پر ہی تھیں۔

''کہیں اس نے مجھے تو مارنے کا منصوبہ تو نہیں بنایا؟'' ذہن میں پہلا خیال آیا تھا۔

''لیکن وہ ایسا پہلے بھی کر چکا ہے۔ میرا نہیں خیال اسے ایسی چال چلنے سے پہلے مجھے چوکنا کرنے کی ضرورت تھی۔'' خود ہی اپنے خیال کی نفی کر دی۔ چہرے پر تاثر ہر لمحہ بدل رہے تھے۔ بے قراری نے اس کے اندر گھر کر لیا تھا۔

''تو پھر ان سب کا مقصد...... بھلا کیا ہو سکتا ہے؟ آخر کون سا گھناؤنا کام وہ سرانجام دینے جا رہا ہے؟ جو کرنے سے پہلے مجھے چوکنا کر رہا ہے۔'' دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں اور آنکھیں مشکوک انداز میں اپنے اردگرد ہر شے کا بغور احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ اب تو شاید اسے اپنے سائے پر بھی یقین نہیں رہا تھا کہ کہیں وہ بھی اسے دغا نہ دے جائے۔ غفلت سے بھرا دل اب مزید ظلمت میں ڈوب چکا تھا۔

''مجھے ابدال کو کچھ بھی کرنے سے روکنا ہوگا۔ اس بار میں اسے اپنے ذات سے کھیلنے نہیں دوں گا۔ اگر وہ اپنی شیطانیت کی انتہا کو پہنچ سکتا ہے تو مجھے بھی اپنی حدیں پار کرنا آتی ہیں۔ اس بار مات کا رخ میری طرف نہیں ابدال کی طرف ہوگا اور میں ایسا کر کے رہوں گا۔'' اس نے تہیہ کیا تھا۔ تبھی ابدال کو کال ملائی مگر موبائل آف تھا۔ پیشانی پر شکن ابھریں۔ وال کلاک پر نگاہ دوڑائی تو بارہ بجنے کے قریب تھے۔

''آدھی رات کو اب میں ابدال کی سازش کو کیسے ناکام بناؤں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کرنے کیا جا رہا ہے؟'' اس کی تمام سوچیں بے رحم موجوں کی طرح عروج پر تو پہنچتیں مگر جلد ہی زوال کی پستی تک پہنچ جاتی۔ وقت بھی کسی سنیل کی رفتار سے چل رہا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں کبھی ادھر تو کبھی ادھر ٹہلتا جا رہا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ کرب میں اضافہ کر رہا تھا۔

تبھی اس کی تمام سوچوں کو کنارہ مل گیا۔ جس سازش کے بارے میں وہ پچھلے دو گھنٹوں سے سوچ سوچ کر اپنے ذہن کو ہلکان کیے ہوئے تھا۔ اس کی پہلی جھلک دیکھائی دی۔ اس کی سماعت کے پردوں پر شناسا سا آواز نے دستک دی۔ وہ پلٹا۔ رات کے اس پہر کوئی اس کو فون کر رہا تھا۔ اس کی سانسوں میں سرد لہر جانے کیوں خود بخود سرایت کر چکی تھی۔ فقط رنگ کی آواز سے ہی وہ اپنی ہار تسلیم کر چکا تھا۔ دھیمے قدموں کے ساتھ، وہ مشکوک انداز میں موبائل کو دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ موبائل اس وقت بیڈ پر پڑا تھا۔ ترچھی نگاہوں نے کسی نمبر کے ہونے کی نشاندہی کی تھی۔

''ہیلو!'' کال ریسیو کرنے پر اس نے بمشکل کہا تھا۔ سماعت بس دوسری طرف سے آنے والے الفاظ کو اپنے جسم کا حصہ بنا رہی تھی۔ آنکھیں ہر لمحہ پھیلتی جا رہی تھیں۔ حواس بھی منتشر تھے جو ایک لمحہ میں کرچیوں کی مانند بکھر گئے۔ آنکھوں کا پانی بھی سکتے میں تھا۔

''پلیز جلدی آ جائیں۔'' بس یہ الفاظ تھے جو اس کے شعور سے ٹکرائے تھے باقی الفاظ تو جیسے اپنی حقیقت ہی کھو چکے تھے۔ ان کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔ مٹی کا بنا یہ بت اب اپنی پہنچان کھوتا جا رہا تھا۔

''مم میں آ رہا ہوں۔'' وہ بس یہی کہہ سکا تھا۔ جس حال میں تھا، اسی حال میں جانے کے لئے پلٹا۔ نہ وقت کی خبر تھی اور نہ وہ ہوش میں تھا۔ ذہن تو آگ میں جیسے جھلستا جا رہا تھا، ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ کھولا گیا مگر ستم یہ کہ اس آواز کو سوائے اس کے کوئی نہ سن سکا۔ راہ داری میں انتہا کا سکوت تھا۔ تمام دروازے لاک تھے۔ سٹاف بھی وہاں موجود نہ تھا۔ وہ بھاگتا ہوا ریسپشن کی طرف آیا تھا مگر وہاں آج نہ پریشے تھی اور نہ ہی اِندر کسی کلائنٹ کا سامان اٹھائے اندر آ رہا تھا۔ وہ چاروں اطراف گھوما، بھیگی پلکیں مدد کے لئے پکار رہی تھیں۔

''اِندر......!'' وہ چیخا مگر آواز واپس پلٹ آئی۔ انتظار وہ نہیں کر سکتا تھا تبھی دوسری آواز دینے کی بجائے خود ہی ہاٹل کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ رات کی تاریکی نے ہر شے کو اپنی چادر میں لپیٹا ہوا تھا مگر وہ بھاگتا جا رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں جانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس کے پاس کسی کار کی چابی نہ تھی۔ بھاگتا ہوا وہ سڑک کی طرف آیا۔ اکادکا کار نظر آئی مگر کسی نے اس کے پاس رک کر اس کو بٹھانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ کئی بار ٹیکسی کے لئے چلایا مگر وہ سب تو جیسے گونگے تھے۔ اس کی آواز سنی ان سنی کر دی گئی۔

''گونگے ہو گئے ہو سب؟ سنتا نہیں ہے کسی کو؟ مجھے جلدی پہنچنا ہے۔'' وہ پہلی بار ہیجانی کیفیت میں چلا رہا تھا۔ جیسے دنیا جہاں کا سرمایہ اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہو اور وہ اس کو بچانے کی اپنی تئیں سعی کر رہا ہو۔ ڈگمگاتے قدم فٹ پاتھ پر بے یارو مددگار تھے مگر منزل کی طرف گامزن تھے۔ بھیگی پلکوں نے راستوں کو بھی مبہم سا بنا دیا تھا مگر وہ بڑھتا جا رہا تھا۔

چند منٹوں کا فاصلہ اس نے کئی منٹوں میں طے کیا۔ جب منزل پر پہنچا تو ایک فاصلے پر کھڑے ہو کر ستانے لگا۔ اکھڑی ہوئی سانسیں ذرا بحال ہوئیں اور نگاہیں ارد گرد کی شے کو دیکھنے کے قابل ہوئیں تو اس کی سماعت سے فائر فائیٹرز اور ان کی گاڑیوں کے ہارنز کی آوازیں ٹکرائیں۔ اس نے ذرا گردن اٹھا کر دیکھا تو پاؤں تلے سے زمین ہی نکل ہی گئی۔ رات کے اندھیرے میں سورج آگ اگل رہا تھا۔ تمام اشیاء روشن تھیں۔ ہر شے پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ زمین و آسمان یکجا ہوتے معلوم ہو رہے تھے۔

''آگ......!!'' لبوں پر معمولی سی جنبش ہوئی تھی۔ حواس تو پہلے ہی منتشر تھے اب اس کا وجود بھی اپنا آپا کھونے لگے تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ ہیجانی کیفیت میں آگے بڑھا تو لوگوں نے بمشکل اس کو سنبھالا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ نظر نہیں آتا؟ آگ نے پوری فیکٹری کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔'' ایک فائر فائیٹر نے کہا تھا۔

''میں اس فیکٹری کا آنر ہوں۔ مجھے اندر جانا ہے۔ اس آگ کو بجھانا ہے۔ مجھے جانے دو۔ جانے دو مجھے۔'' رندھا ہوا لہجہ منتیں کر

رہا تھا۔آنسو اپنی منزل کی طرف رواں تھے۔وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ دوسرے اس کو روکے ہوئے تھے۔دھکم پیل میں اس کی شرٹ کے کئی بٹن بھی کھل گئے مگر اسے پرواہ نہ تھی۔پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی جا رہی تھیں۔جیسے آسمان سے کسی نے بادلوں کا چشمہ کھول دیا ہو اور مینہ پورے زور و شور سے برس رہا ہو۔

''ہم آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔آپ ذرا اپنے آپ کو کنٹرول کریں۔''تسلی آمیز الفاظ نہ کافی تھے۔اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے سرمائے کو راکھ کا ڈھیر بنتے ہوئے دیکھ کر کوئی کیسے اپنی ذات کو ضبط میں رکھ سکتا ہے؟اس کے حواس کیونکر منتشر نہ ہوں؟آنکھوں سے آنسو کیونکر نہ بہیں؟

آگ کے شعلے بلند سے بلند ہوتے جا رہے تھے اور وہ بے بس تھا۔چاہ کر بھی اس آگ کو بجھانے میں مدد نہیں کر سکتا تھا۔سیاہ دھویں کی ایک تہہ اس کے چہرے پر جم چکی تھی۔چمکتا دمکتا آفتاب اس وقت گرہن شدہ تھا۔آنسوؤں میں بھی اسی دھویں کی آمیزش تھی۔

''میرے بابا جان کی محنت تھی یہ،برسوں کی محنت......آج میں اس کی حفاظت نہ کر سکا۔اپنے بابا کے بھروسے کو میں نے توڑ دیا۔''

وہ روتا ہوا گھٹنوں کے بل آبیٹھا تھا۔لوگوں نے اسے دیکھا مگر کوئی ہمدردی کا ہاتھ آگے نہ بڑھا۔وہ تن تنہا تھا۔ہارنز اور دیگر آوازیں سماعت میں اتر رہی تھیں مگر وہ تو فقط شعلوں کی حدت محسوس کر سکتا تھا۔ان کے جلنے سے گرنے والے پتھروں کی آوازیں سن سکتا تھا۔جو اس کے دل پر گر رہے تھے۔اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر رہے تھے۔

''تم فیکٹری کی باگ دوڑ سنبھالنا چاہتے ہو ناں؟ٹھیک ہے۔آج سے دیپا سار کے پانچوں یونٹ تمہارے انڈر چلیں گے مگر یاد رہے اریب میرا بھروسہ مت توڑنا۔میری برسوں کی محنت کو رائیگاں مت جانے دینا۔''جہانزیب کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ان کا بھروسہ آج کرچیوں میں بدل چکا تھا۔وہ اس وعدے کا پاس نہ رکھ سکا۔گردن کو خم دیئے وہ زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ہاتھ بھی زمین پر خاک چھان رہے تھے۔

''بابا جان...... مجھے معاف کر دیں بابا جان۔معاف کر دیں بابا جان۔''وہ روتے ہوئے گذارش کر رہا تھا۔بھاگتے ہوئے کسی کی ٹھوکر لگی اور وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور بائیں جانب کو گر گیا۔اس کے ہاتھ راکھ میں سیاہ ہو گئے۔شرٹ اور ٹراؤزر بھی گرد سے آلودہ تھے مگر اسے کہاں فکر تھی؟آنسو بہاتے ہوئے اپنے قسمت کو کوس رہا تھا۔

تقریباً تین گھنٹوں بعد آگ پر قابو پا لیا گیا تھا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔اتنی دیر کے سب کچھ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا۔دیواریں بھی سیاہی میں نہائی ہوئی تھیں۔جہاں کل تک چہل پہل ہوتی تھی۔آج ہو کا عالم تھا۔تاریکی ہی تاریکی تھی اور وہ اسی تاریکی میں چلتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔روکا جانا اب بے کار تھا۔آگ بجھ چکی تھی مگر تپش اب بھی موجود تھی۔جوتوں کے تلوں سے وہ جسم میں سرایت کرتی حدت محسوس کر سکتا تھا۔آنکھوں میں آنسو بے قراری کو بڑھا رہے تھے۔بے یقینی کی انتہا تھی۔اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب ایک

بھیانک خواب ہو اور وہ ابھی ہوش میں آئے گا تو سب کچھ پہلے جیسے ہو گا۔ عالمگیر انڈسٹریز پہلے کی طرح پوری شان و شوکت کے ساتھ سینہ پھیلائے کھڑی ہو گی مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ اب یہی حقیقت تھی۔ راکھ، سیاہی، آنسو اور بربادی۔

وہ آگے بڑھا تو ایک ستون دھیرے سے اپنی جگہ چھوڑتا ہوا معلوم ہوا مگر اسے کہاں ہوش تھا۔ وہ ستون سرکتا جا رہا تھا اور اس کے قدم اسی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ یک ٹک اپنی بربادی کی پہلی جھلک دیکھ رہا تھا۔ ماؤف ذہن اس حادثے کو تسلیم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جیسے ہی اس ستون کے قریب پہنچا تو ہوا کے دوش کو ستون برداشت نہ کر سکا اور اس جانب لڑھکتا چلا گیا۔ ماحول میں پیدا ہوتی یہ بے چینی دیکھ کر وہ پلٹا۔ اوپر دیکھا تو آنکھیں ساکت رہ گئیں۔ قدم زمین بوس ہوتے چلے گئے۔ وہ ستون اسی کے وجود پر گرنے والا تھا۔

”سنبھل کر۔“ ایک فائر فائیٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تھا۔ اگر ذرہ برابر بھی دیر ہو جاتی تو اس راکھ میں خون بھی شامل ہو جاتا۔ اس کی سانسیں اکھڑی ہوئی معلوم ہوئیں۔

”آپ کو ابھی اس بلڈنگ کے اندر نہیں آنا چاہئے تھا۔ چلیں باہر۔ اس کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں۔ کبھی بھی یہ عمارت زمین بوس ہو سکتی ہے۔“ یہ الفاظ کمان سے نکالے گئے ایسے نشتر کی مانند تھے جن کی واپسی نہ ممکن تھی۔ اس کا دل بری طرح گھائل ہو چکا تھا۔ بربادی کا ایسا منظر وہ اب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ برجستہ پلٹا اور بھاگتا چلا گیا۔ کہاں جانا تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔ بس قدم تھے کہ آگے بڑھ رہے تھے۔

ماؤف ذہن میں کبھی جہانزیب کی تصویر سماتی تو کبھی ان سے کیا گیا وعدہ، کبھی انڈسٹری کی چہل پہل اس کے دل کو دبوچنے لگتی تو کبھی آگ کا دھواں سانسوں میں دھنکی کی مانند ثابت ہوتا۔ صبح کی روشنی نے کروٹ لی اور پہلی کرن نے دنیا کو منور کرنے کی ٹھانی مگر جس وجود کے اندر ظلمت نے اپنا گھر بنا لیا ہو، بھلا وہاں روشنی کیونکر ممکن ہو سکتی تھی؟

وہ سیدھا کرسن کے گھر کی طرف مڑا تھا۔ جانا تو اسے ہاٹل تھا مگر جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکا۔ قدم اس کے شعور سے باہر تھے۔ شاید کسی اپنے کا ساتھ چاہئے تھا۔ جب دل غم سے لبریز ہو تو اپنوں کو دیکھ کر بھی اس میں کمی ہو جایا کرتی ہے۔ اس پرائے دیس میں اب وہ اپنے کہاں سے لاتا؟ کرسن اور ایشا ہی تو تھے اس کے اپنے۔ اس کے دوست۔ تبھی ان کے پاس جا کر اپنا دکھ کم کرنا چاہتا تھا مگر قسمت کا لکھا کس کو معلوم تھا؟

اسے کیا معلوم تھا؟ جہاں وہ غم بانٹنے جا رہا ہے۔ وہاں سے تو ایک نئے غم کی ابتدا ہو گی۔

کرسن کا گھر بارونق علاقے میں تھا مگر گھر میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ چھوٹا سا گھر باہر سے دیکھنے میں کافی اچھا لگتا تھا مگر وہ کچھ بھی دیکھے بغیر اندر چلا گیا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دستک دینا وہ بھول چکا تھا۔ ڈھیلے قدم اپنی آواز بھی کھو چکے تھے۔ سانسیں کی روانی بھی اب مدہم تھی۔ ٹوٹا پھوٹا وجود اب بس بکھرنے کے لئے رہ گیا تھا۔

”آپ کو یقین ہے وہ یہاں آئے گا؟“ اندر سے جانی پہچانی آواز آئی تھی۔ وہ پہنچانتا تھا مگر لفظوں کو خاطر میں نہ لایا اور آگے

بڑھنے لگا۔ وہ اس وقت راہداری میں تھا۔ جو دس قدموں کی تھی۔ وہ ابھی چار قدم ہی چلا تھا۔ دیوار کے ساتھ پشت لگا کر ستانے لگا۔ شاید اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”لیکن ابھی تک وہ یہاں نہیں آیا۔ اگر آتا تو میں آپ کو انفرام ضرور کرتا۔ ہوسکتا ہے وہ میرے اور ایمیشا کے پاس آنے کی بجائے سیدھا ہاٹل چلا گیا ہو۔“ اس آواز پر وہ بری طرح چونکا تھا۔ وہ اور ایمیشا...... دونوں ایک ساتھ؟ اور وہ کس کے آنے کی بات کر رہا تھا؟ دل مضطر میں نئی بے چینی جنم لے چکی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

”ٹھیک ہے میں خیال رکھوں گا لیکن میرا نہیں خیال کہ اریب یہاں آئے گا کیونکہ مجھے لگتا ہے جیسے اسے ہم پر شک ہو چکا ہے۔ وہ یونیورسٹی میں بھی ہم دونوں سے کھچا کھچا سا رہتا ہے۔“ اس کے سر پر ایک گہری ضرب لگی تھی۔ وہ راہداری کے عین کنارے پر تھا۔ اندر لاؤنج میں وہ دو مبہم سے عکس دیکھ سکتا تھا۔ جو اس کی طرف پشت کئے ہوئے تھے۔

”نہیں...... ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ خود ہی اس نے اپنے ذہن سے گمان کر لیا ہے کہ ہمارا آپ سے کوئی تعلق ہے۔ اب اس نے ایسا کیوں کیا؟ ہمیں نہیں معلوم۔ ہم تو اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کر رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ نے ہم سے کرنے کو کہا تھا۔“ کرسن بات کرتے ہوئے آئینے کے سامنے آیا تھا۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایمیشا تھی، جو کہ نائیٹ ڈریس میں موجود تھی۔ وہ خود بھی نائیٹ ڈریس میں ہی تھا۔ شاید فون کی رنگ سن کر ہی دونوں بیدار ہوئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔

”مطلب کرسن اور ایمیشا بھی......!“ وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو تن تنہا محسوس کر رہا تھا۔ پرائے دیس میں جو دوست تھے وہ بھی اب چھن چکے تھے۔ تمام چہروں پر ایک مکھوٹا تھا۔ سب منافقت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔

”ٹھیک ہے۔ ہم دونوں اس کا انتظار کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور ایمیشا کی جانب دیکھا۔ اریب کے ذہن میں کئی سوال بپھری ہوئی موجوں کی مانند تھے۔ جن کا جواب اسے جاننا تھا تبھی اپنا قدم آگے بڑھایا مگر ایمیشا کے سوال نے اس کے قدموں کو ہوا میں ہی معلق کر دیا۔ وہ خلا میں ایک مجسم تھا۔ جس کے نیچے نہ زمین تھی اور نہ اوپر آسمان۔ آنکھوں کا پانی سرعت سے بہتا جا رہا تھا۔

”کیا کرنے کو کہا اب ابدال سر نے؟“ اس کی نظریں کرسن پر مرتکز تھیں۔ جو شانے اچکاتے ہوئے اس کی جانب پلٹا تھا۔

”جسٹ ویٹ۔“ اس نے شانے اچکائے تھے۔ ابدال کا نام سن کر اس کا سر چکرا کر رہ گیا۔ کرسن اور ایمیشا پر گہری نگاہ ڈالی تو ایک مکھوٹا اترتا چلا گیا۔ دونوں کے چہرے وہ نہیں تھے، جو ہوا کرتے تھے۔ ایک مصنوعی چہرہ، جو اس کے سامنے ہوتا تھا اب اپنی حقیقت کھو چکا تھا۔ حقیقت سامنے تھی۔ دونوں اس کے دشمن کے مہرے تھے۔ وہ ابھی تک ان کی کٹھ پتلی بن کر چلتا آ رہا تھا۔ اس کا دل غصے سے بھر چکا تھا۔ دل چاہا کہ آگے بڑھ کر کرسن کا گریبان پکڑ کر اس کے وجود کو جھنجوڑے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ کیوں اس کے ساتھ ایسا کھیل کھیلا مگر ٹوٹا ہوا وجود ایسا نہ کر سکا۔ جذبات کو ضبط کرتے ہوئے وہ الٹے پاؤں پلٹ گیا مگر ہاتھ ایک سٹول سے لگا اور اس پر رکھا گلدان زمین بوس

ہو گیا۔ سناٹے میں یہ آواز سن کر کرن اور ایشا بری طرح چونکے۔

''کون ہو سکتا ہے؟'' ایشا اور کرن دونوں دروازے کی جانب پلٹے تو ایک وجود کو دروازے سے نکلتا ہوا پایا۔ ان کی سانسیں اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ دروازے سے نکلتے ہوئے اس نے لمحہ بھر کے لئے پلٹ کر دیکھا تھا۔ آنکھوں میں انتہائی غصہ اور نفرت کا بیج اپنے عروج پر تھا۔ دوستی اپنی کایا پلٹ چکی تھی۔ رشتے اپنی نوعیت کھو چکے تھے۔ کرن اور ایشا ٹھٹک کر رہ گئے۔ اریب کے چہرے پر ایسی بے اعتباری انہوں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ وہ واقعی اندر سے ٹوٹا تھا۔ تبھی اس کا چہرہ عکاسی کر رہا تھا۔

''اریب۔'' ایشا نے لب ہلائے مگر اسے اپنا نام زہر لگنے لگا تھا۔ بری طرح گردن جھٹک کر وہ وہاں سے چل دیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو سوائے یاسیت کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ شاید یہ باب اب یہیں ختم ہو چکا تھا۔ چہرے خود بخود جھکتے چلے گئے۔

''وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔'' کرن نے گمان کیا تھا۔ ایشا بھی اس کو آخری بار دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

راکھ کے ڈھیر میں دھواں کیسا؟

آگ پھر سے بھڑک گئی ہوگی

قدم دوبارہ اسی راکھ کے ڈھیر کی طرف بڑھے تھے۔ ٹوٹا، بکھرا سرمایہ شاید سمیٹنا چاہتے تھے۔ خاک میں بھی امید کی کرن دیکھنا چاہتے تھے۔ آسمان کو گھٹاؤں نے آگھیرا تھا۔ صبح کی کرن انہی گھٹاؤں کے زیر اثر تھی۔ سیاہ راکھ چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

''اب کیا سمیٹنے آئے ہو؟ کس شے کو بچانا چاہتے ہو؟'' ایک استہزائیہ انداز عقب سے گویا ہوا تھا۔ وہ آواز کو پہچانتا تھا مگر پلٹنا گوارا نہ کیا۔

''سب کچھ تو تمہارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ کچھ بھی نہیں رہا تمہارے پاس۔ کچھ بھی نہیں۔'' قدموں کی چاپ بڑھتی جا رہی تھی اور وہ بے بسی کے ساتھ ان لفظوں کو سماعت میں اتار رہا تھا۔

''میں نے پہلے ہی تمہیں چوکنا کر دیا تھا مگر تم نے میری بات کو ہلکا جانا۔ اس کا خمیازہ تم بھگت چکے ہو اریب عالمگیر! کہا تھا ناں تم سے، مجھے مات دینا اتنا آسان نہیں ہے۔ اگر شہہ چاہتے ہو تو واپس چلے جاؤ مگر تم نہیں مانے، اب دیکھو تمہاری اسی ضد کی بدولت تم اپنا سرمایہ کھو بیٹھے ہو۔ اپنے پیارے سے بابا جان کا اعتماد بھی۔ اب سوچو کس منہ سے تم ان کا سامنا کرو گے؟'' زخموں پر نمک چھڑکا جا رہا تھا اور وہ بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔ جھکی ہوئی گردن کے ساتھ وہ جواب دینے کی حالت میں نہ تھا۔ جسم پر رقت طاری تھی اور گھٹنے کے بل بیٹھ گیا۔ ہاتھ زمین کے لمس کو محسوس کر رہے تھے۔ جہاں فقط راکھ تھی۔

''تمہاری حالت پر مجھے ترس نہیں آ رہا اریب بلکہ افسوس ہو رہا ہے کہ تم کتنے نا سمجھ ہو اور کم عقل ہو۔ میرے راستے میں آنے کی

غلطی کر کے تم نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ کیا ہے۔ اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔" وہ چلتا ہوا اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ گردن کو ذرا سا اوپر اٹھایا تو وہ اپنی جیت پر مسکرا رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو پینٹ کی جیب میں ٹھونسے ہوئے کھڑا تھا۔ سیاہ جیکٹ اور سیاہ سن گلاسز پہنے ہوئے وہ غیر معمولی شخصیت تھی۔

"اب یوں بیٹھنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" اس نے طنز کیا تھا۔ وہ سنبھلا اور گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔" وہ رندھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ جس پر ایک قہقہہ گونجا۔

"اچھا...... مگر کیسے؟ پولیس کو بتاؤ گے تو جاؤ بتاؤ۔ کوئی ثبوت یا گواہ ہے تمہارے پاس؟ یا پھر اپنے دوستوں سے مدد لو گے۔ ایشا...... کرسن......!" اس نے جان بوجھ کر طنز کیا تھا۔ کرسن اور ایشا کا مکر چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ جبڑے بھینچ کر رہ گیا۔ وہ واقعی اس کی طاقتوں کو چھین چکا تھا۔

"تمہارے پاس فقط دو راستے ہیں۔ یہاں رہ کر اپنی بربادی کا جشن مناؤ یا پھر......!" وہ دانستہ اپنی بات کو ادھوری چھوڑ گیا۔ لبوں پر ایک کسک تھی۔ جس کا مطلب وہ اچھے سے سمجھتا تھا۔ استفہامیہ آنکھیں اس کے مکر چہرے پر تھیں۔ بے بسی سے اپنے سوالوں کے جواب تلاش کر رہی تھیں۔ پیشانی کی لکیریں چیخ چیخ کر اس سے باتیں کر رہی تھیں اور وہ تھا کہ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"یا پھر کیا؟ مارو گے مجھے؟ تو مارو...... مارو مجھے۔ آگ تو لگا ہی چکے ہو۔ میرے وجود کو اس آگ میں جھلسا تو چکے ہو تم۔ اب بے جان جسم کو مارنا باقی ہے...... اسے بھی مار دو۔ مارو۔" وہ ہیجانی کیفیت میں تھا۔ آنسو بہاتا وجود اپنی زندگی سے بیزار محسوس ہو رہا تھا۔ ابدال کی نگاہیں پہلے پہل تو اس کو تکتی رہیں مگر اگلے ہی لمحے اس پر بندوق تان لی۔ اریب کی سانسیں جو پہلے اکھڑ چکی تھیں تھی۔ ایک بار پھر تھمنے لگیں۔

"تم......!!" موت کو اپنے سامنے دیکھ کر اس نے قدم پیچھے کی طرف کھسکائے تھے۔ آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

وہ اپنے لفظوں کو مکمل نہ کر پایا تھا کہ فائر کی آواز گونجی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ہوا میں خموشی نے جنم لیا تھا۔ ابدال کا ہاتھ دھیرے دھیرے نیچے ہوتا گیا۔ مقصد شاید تمام ہو چکا تھا۔

میرا بھائی، میرا بازو

یونہی اداس رہا میں تو دیکھنا اک دن
تمام شہر میں تنہائیاں بچھا دوں گا

شہر اقتدار کی پر فسوں سڑکوں پر اس کے لرزیدہ قدم کسی سہارے کی تلاش میں تھے۔ رنگ برنگی روشنیوں سے نہایا سماروشن دن کا گمان دے رہا تھا مگر آسمان پر چمکتا مہتاب اور اس کی روشنی سے اپنے سینوں کو منور کرتے تارے رات کا پتا دیتے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر ماضی وحال کے بھنور میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ پرنم آنکھیں اور ان میں تیرتے ٹوٹے ہوئے سپنے ہر شے سے بیگانہ کئے ہوئے تھے۔

پرائے دیس میں ملنے والے دھوکے اس کے اعتماد کو منوں مٹی تلے دفن کر چکے تھے۔ جس ذات پر یقین کیا، اسی نے دھوکہ دیا۔ اسی نے منافقانہ رویہ اختیار کیا۔ کرن اور ایشا کے روپ میں دوستی کا سہارا لیا تو وہ بھی چھل کی مانند خوشگوار احساس نکلا۔ جس کی چھاؤں میں وہ راحت تو محسوس کرتا تھا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ جس کو وہ راحت سمجھ رہا ہے دراصل اندر سے ایک ظلمت کی مانند ہے۔ جب راحت کا سما رخصت ہوگا تو اندھیری رات کی شروعات ہوگی اور وہ اندھیری رات اب اس کی زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔

اپنا سب کچھ اپنی آنکھوں کے آگے جلتے دیکھنا اور پھر وہ وقت کیسے بھلایا جا سکتا تھا جب ابدال نے اس پر بندوق تانی تھی؟ پیٹھ کے پیچھے سے کئے گئے ہزار حملوں سے تو وہ بچ گیا مگر جب سامنے سے وار کیا گیا تو اس کی نگاہیں برجستہ دیکھتی رہ گئیں۔ سانسیں بھی ایک لمحہ کو تھم چکی تھی اگر خدا کی رحمت نہ ہوتی تو شاید وہ نہ بچ سکتا تھا۔

ابدال نے تو اس کو مارنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی مگر خدا نے بھی اپنے بندے کو اپنی امان میں رکھنے کا پورا انتظام کیا ہوا تھا۔ جیسے ہی ابدال نے اس پر بندوق تانی تو عین اسی وقت ہوا کا ایک ایسا جھونکا آیا تھا کہ اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ گولی اریب کے لگنے کی بجائے اس کے شانوں کے عین اوپر سے گزر گئی۔ اگرچہ وہ کئی لمحے اپنے حواس میں نہ رہا تھا۔ موت کو کئی بار اتنے قریب سے دیکھنے کے بعد بھی وہ ابھی تک موت کے لئے تیار نہ تھا۔

خاموش مگر استفہامیہ نگاہیں کافی دیر تک ابدال پر مرتکز رہی تھیں۔ پلکوں پر تیرتے آنسو ابھی تک اپنے ہونے کا یقین نہیں کر پائے تھے۔ دل میں مچلتے جذبات اور پھر ان کا لمحہ لمحہ ہوتا خون، وہ ابھی تک سمجھنے سے قاصر تھا۔

ابدال کے پاس اگرچہ دوسرا موقع تھا مگر جیت شاید اس بار اریب کی قسمت میں آئی تھی۔ بندوق میں شاید ایک ہی گولی تھی تبھی دوسرا فائر نہ کیا گیا۔

ابدال تو الٹے پاؤں لوٹ گیا مگر اس کے پاؤں کئی لمحے وہیں جمود کا شکار رہے۔ کچھ دیر بعد پولیس بھی آموجود ہوئی تھی۔ فارمیلیٹی پوری کی گئی مگر اس کا ماؤف ذہن تو کچھ بھی کہنے سننے کے قابل نہ تھا۔ ابدال کے الفاظ ذہن میں گونجتے رہے اور قدم خود بخود اپنی منزل کی طرف چل پڑے اور اس بار منزل تھی پاکستان۔

''آپ کو کہیں جانا ہے؟'' ایک ٹیکسی اس کے پاس آ کر رکی تھی۔ استفسار کیا گیا مگر وہ چلتا رہا پلٹنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

''میں آپ سے کم رینٹ لوں گا۔ اس وقت کوئی بھی ٹیکسی ملنا محال ہے۔'' وہ اس کی چال کے مطابق ٹیکسی چلا رہا تھا مگر اس کی نگاہیں تو دانستہ جھکی ہوئی تھیں۔

''اچھا آپ جو دل چاہے رینٹ دے دیجیے گا۔'' اس ٹیکسی والے نے آخری بار کہا تھا۔ اس بار وہ رکا۔ ٹیکسی والے نے خوشی سے بیک ڈور کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

''سنتا نہیں ہے آپ کو؟ مجھے کہیں نہیں جانا۔'' سخت الفاظ جبڑے بھینچ کر ادا کیے گئے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور ہکا بکا رہ گیا۔ تیرتے آنسوؤں کے ساتھ وہ برجستہ پلٹا تو کئی چمکتے موتی پلکوں سے چھلک پڑے تھے۔

وہ دوبارہ اندھیروں میں ڈوبا ہوا مجسم تھا۔ جس کی منزل کچھ مسافت ہونے کے باوجود کوسوں دور تھی۔

''سب کچھ ختم ہو چکا ہے...... سب کچھ۔'' ٹوٹا ہوا مجسم رندھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''بابا جان کا یقین...... اپنا وقار...... سب کچھ کھو چکا ہوں میں...... سب کچھ۔'' وہ پل بھر کے لئے ٹھہرا تھا۔ نگاہ آسمان کی طرف گئی۔ تاریکی کے سوا کسی نے ان کا استقبال نہ کیا۔ نیچے دیکھا تو فقط زوال منتظر تھا۔ وہ دوبارہ شہر اقتدار کی ویران سڑکوں پر گامزن تھا۔ گھر کا فاصلہ اگرچہ اسے ازبر یاد تھا مگر ہر چوراہے پر اسے کھڑے ہو کر راستے کا تعین کرنا پڑ رہا تھا۔ ان راستوں سے دوبارہ شناسائی حاصل کرنا پڑ رہی تھی جن پر سے گزرتے ہوئے اس کا بچپن گزرا تھا۔ اس کی جوانی کا ایک وقت گزرا تھا مگر آج سب اجنبی تھا۔ سب اس کی طرف استہزائیہ انداز میں دیکھ رہے تھے۔

گھر کے قریب پہنچ کر کئی لمحے سوچتا رہا۔ اپنی اس جنت کو دیکھتا رہا جسے اس نے اپنے ہاتھ سے گنوایا تھا۔ جس سے دوری اس نے خود اپنا مقدر بنائی تھی۔ جن اپنوں کو دیکھے بنا اسے چین نہیں آتا تھا۔ ان سے دوری خود اختیار کی تھی اور اب اسے دوبارہ انہی اپنوں کی ضرورت تھی۔ جن کا پیار بے لوث تھا۔ جن میں دیکھاوے کا کوئی عنصر شامل نہ تھا۔ جن کی فکر لازمی جز تھی۔ جو اس کی حقیقت میں پرواہ کرتے تھے۔ اب وہ دوبارہ انہی کے پاس لوٹنے جا رہا تھا۔

''میں آرہا ہوں ماما جان...... بابا جان...... آپ کا اریب...... آپ کا بیٹا...... آپ کے پاس......'' اس نے مرکزی گیٹ کو تکتے ہوئے کہا تھا۔ آنکھیں برجستہ اپنی پناہ گاہ کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ دھیمے قدموں سے آگے بڑھنے لگا۔ ہر آواز معدوم ہو چکی تھی۔ رات کی سیاہی نے ہر شے کو اگرچہ اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مگر وہ ہر شے کو بغور دیکھ سکتا تھا۔ پرنم جھیل آنکھیں ہر شے کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں۔

وہ گیراج سے ہوتے ہوئے اندرونی دروازے تک پہنچا تھا۔ جہاں دروازہ ادھ کھلا تھا۔ شاید وہ بھی اس کا منتظر تھا۔ تبھی اپنا سینہ چاک کئے ہوئے تھا۔ وہ لرزیدہ قدم کو اٹھاتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا۔

''ایسا نہیں ہو سکتا......!'' ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ قدموں کا رک جانا بہتر تھا مگر وہ نہ رکے۔ آگے بڑھتے رہے بنا سوچے سمجھے۔

''لیکن...... میرا نہیں خیال وہ یہاں آئے گا۔'' یہ جہانزیب کی آواز تھی۔ وہ الفاظ سمجھا مگر مفہوم نہیں۔ خاموش بلکتے لب، دھیمے قدم جو کوئی آواز نہ رکھتے تھے، بس آگے بڑھ رہے تھے۔ یک دم ریسیور کو کریڈل پر رکھنے کی آواز آئی۔ وہ راہداری کو پار کر چکا تھا۔ لاؤنج اور راہداری کے کنارے پر تھا۔ لاؤنج میں سب گھر والے جمع تھے۔ سب کے چہرے دیکھ کر آنکھوں میں ایک کمک نے جنم لیا تھا۔ بچھڑے جذبات اپنوں کو گلے لگانے کے لئے بے تاب تھے۔ جہانزیب اور سحر فاطمہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ حاعفہ سب کے لئے چائے کی ٹرے لے کر آئی تھی۔ جبیں، حسام اور صبا بھی وہاں موجود تھیں۔

''میں آ گیا ہوں ماما جان، بابا جان۔'' دل سے آواز آئی تھی۔ قدموں نے آگے بڑھنا چاہا مگر جانے کیوں اس کے اندر سکت ختم ہو چکی تھی۔ وہ چاہ کر بھی آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ شاید ایک نئی قیامت، ایک نئی کسوٹی اس کی منتظر تھی، اس لئے۔

''اریب واپس آرہا ہے؟'' سحر فاطمہ کی طرف سے استفسار کیا گیا تھا۔

''شاید......!'' جہانزیب نے شانے اچکائے تھے۔

''شاید سے کیا مطلب ہے آپ کا؟ ابھی بات تو ہوئی ہے آپ کی۔ کیا کہا انہوں نے؟''

''اس دیس میں رہنے کا جواز ہی ختم ہو چکا ہے۔ تمام لڑیاں ٹوٹ چکی ہیں۔ اب واپسی کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' کھوئے کھوئے لہجے میں وہ گویا ہوئے تھے۔ اریب یہ سن کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ نگاہیں مبہوت جہانزیب پر جا ٹھہریں۔ استفہامیہ آنکھوں میں ہزار سوال تھے۔

''یہ کیا پہیلیاں سنا رہے ہیں بابا جان؟ صاف صاف بتائیں ناں؟ اریب واپس آرہا ہے کیا؟'' جبیں نے جھلاتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کی سمجھ سے سب کچھ بالاتر تھا۔

''صاف صاف تو میں بھی کچھ نہیں کہہ سکتا مگر اتنا معلوم ہے کہ دیناپا سار میں موجود عالمگیر انڈسٹریز کے پانچوں یونٹ آتش کی نذر

ہو چکے ہیں۔ اب وہاں راکھ کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا اور......" سپاٹ نگاہیں کھوئی کھوئی معلوم ہوتی تھیں۔ آنسو نام کی کوئی شے کا وجود ان آنکھوں میں نہ تھا۔ وہ انہی آنکھوں میں آنسوؤں کا متلاشی تھا۔ جس کے سرمائے کا ایک حصہ آگ کی نذر ہو چکا ہو، وہ بھلا اپنے حواس میں کیسے رہ سکتا ہے؟ دھیمے لہجے میں اپنی بربادی کی نوید کیسے سنا سکتا ہے؟

"کیا؟ سب کچھ جل گیا؟ مگر کیسے؟" اس بار حسام چلایا تھا۔ حاعفہ کی سانسیں بھی گلے میں اٹک کر رہ گئیں۔

"اریب تو ٹھیک ہے ناں؟" لرزیدہ لب گویا ہوئے تھے۔

"ہاں......اریب ٹھیک ہے۔" وہ سب کو دیپا سار کے حالات کے بارے میں آگاہ کر رہے تھے۔

"اور سے کیا مطلب تھا آپ کا؟" سحر فاطمہ نے جملے کے ادھورے چھوڑے جانے پر شکوہ کناں لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"اور......اور اریب کو مارنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔" سب کے سروں پر جیسے ایک بم پھوڑا گیا تھا۔ خود اریب بھی یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ سانسوں سے چلنے کی امید ہی چھنی جا چکی تھی۔ حاعفہ کے پیچھے اگر صوفہ نہ ہوتا تو لازماً زمین پر جا گرتی۔ ٹانگیں جواب دے چکی تھیں۔

"کیا؟ یہ سب کچھ ہو گیا اریب کے ساتھ؟" حسام نے حیرانی و تفکر آمیز لہجے میں کہا تھا۔ لہجے میں ترشی ہو یا پھر ہمدردی؟ وہ کوئی بھی عنصر شامل کرنے سے عاری دیکھائی دے رہا تھا۔

"ہوا تو اور بھی بہت کچھ ہے مگر بتانا مناسب نہیں ہے۔" جہانزیب نے جیسے بات ختم کرنا چاہی تھی۔ سفاک نگاہیں ٹیبل پر رکھے چائے کے کپ کو گھور رہی تھیں۔ یہ سفاکیت ہی تھی یا پھر ہمدردی؟ یا پھر ایک گہرے راز کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش؟ سب گھر والے بے چین دیکھائی دے رہے تھے سوائے سحر فاطمہ کے۔ وہ بن کہے سب کچھ سمجھ سکتی تھیں۔ جیسے وہ ہم راز ہوں۔

"بابا جان کو یہ سب کیسے معلوم؟" اس کے دل میں سوال ابھرا تھا۔

"مجھ پر جو دیپا سار میں گزری، یہاں پاکستان میں کیسے خبر ہوئی؟" وہ اب دھیرے سے پلٹا تھا۔ پشت ٹی وی لاؤنج کی طرف تھی۔ کسی نے ابھی تک اس کی طرف دھیان نہیں کیا تھا۔

"جہاں تک آگ لگنے کی بات ہے تو مینیجر یا پریشے وغیرہ نے فون کر کے بتا دیا ہو گا مگر ابدال کا مجھ پر گولی چلانا......اس کی خبر کیسے ہوئی؟ وہ تو ہم دونوں ہی جانتے تھے۔ کسی تیسرے کا وہاں وجود ہی نہیں تھا تو بابا جان کو کیسے خبر ہوئی؟" ایک نئے شک نے دل میں جنم لیا تھا۔ وہ برجستہ پلٹا، نگاہوں نے جہانزیب کے وجود کو حصار میں لیا۔ پہلی بار وہ ان کی پیشانی پر موجود سلوٹوں کا مطلب سمجھ پایا تھا۔

"راز......راز......راز......" بس یہی لفظ تھا جو وہ سمجھا تھا۔

"نہیں......میں اپنا کام ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں ٹوٹ کر بکھرا ضرور ہوں مگر فنا نہیں ہوا۔ مجھے آخری دم تک اس راز کو فاش کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ بابا جان مجھ سے کیا چھپا رہے ہیں۔ وہ جاننا ہے۔" وہ تہیہ کر چکا تھا۔ جن قدموں سے آیا تھا۔ انہی سے واپس

لوٹ گیا۔دل اگرچہ اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ جہانزیب اس سے کچھ چھپا سکتے ہیں مگر حالات کا تقاضا تھا۔وہ کسی پر بھی یقین کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔دروازہ دوبارہ ادھ کھلا چھوڑا اور وہ موسم خزاں کے خاموش جھونکے کی طرح گزر گیا۔جس کا احساس تک نہ ہوا تھا مگر ایک ہلچل ضرور ہوئی تھی۔

"ابدال......میں واپس آرہا ہوں۔" وہ تیز قدموں سے پلٹا تھا۔وہی شہر اقتدار کی سڑکیں......وہی تنہائی......وہی ظلمت مگر اس بار کچھ تو نیا تھا۔مقصد کو ایک نئی لہر ملی تھی۔ایک نیا وجود ملا تھا۔

"بہت بار تم نے مجھے اپنے راستے سے ہٹانا چاہا مگر اس بار نہیں۔اس بار تم سے مل کر میں ہر بات کلئیر کرنے میں آرہا ہوں۔نہ کوئی بدلے لینے کی تمنا ہے اور نہ ہی تمہیں پچھاڑنے کی۔بس کچھ سوال ہیں جن کا جواب اب تمہیں دینا ہوگا اور تم دو گے۔سمجھے تم۔" آنسوؤں کے بہانے کا وقت بیت چکا تھا۔حقیقت سے لڑنے کا وقت تھا۔تبھی اس نے بھیگی مژگان کے کناروں کو بری طرح پونچھا تھا۔گہری سانسیں لیتا ہوا وہ جلد سے جلد ائیر پورٹ پہنچنا چاہتا تھا مگر زندگی نے ایک نیا موڑ لیا۔نگاہیں جھکی ہونے کے باعث وہ سامنے سے آتے وجود کو نہ دیکھ سکا اور اس کے سینے سے بری طرح ٹکرایا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" اس نے نگاہیں اٹھاتے ہوئے اپنی غلطی کا اعتراف کیا تھا۔سامنے سیاہ لبادے میں ایک لمبا چوڑا آدمی کھڑا تھا۔اریب بمشکل اس کے شانوں تک پہنچتا ہوگا۔

وہ اپنے راستے سے نہ ہٹا تو اریب نے اس کے بائیں جانب سے گزرنا چاہا لیکن اس آدمی نے اریب کی کلائی کو بری طرح نوچتے ہوئے سامنے پٹخ دیا۔وہ گرتے گرتے بچا تھا۔استفہامیہ نگاہیں سامنے کی جانب اٹھیں تو اس بار وہ اکیلا نہ تھا۔اس جیسے کئی آدمی اس کے ساتھ تھے۔سلوٹوں سے بھری پیشانی ان وجود کا مقصد سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کک کون ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟" وہ ابھی تک اپنی کلائی کو سہلا رہا تھا کیونکہ اس نے واقعی بری طرح نوچا تھا تبھی اس کی انگلیوں کے نشانات کلائی میں اندر تک دھنس چکے تھے۔جواب دینے کی بجائے وہ آگے بڑھنے لگے۔اس کے گرد ایک دائرے کی شکل میں کھڑے ہو گئے۔جیسے وہ ان کا مرکز ہو اور وہ سب محیط۔

آخری منظر جو اس نے دیکھا تھا وہ یہ تھا کہ تاریک رات میں سیاہ لبادہ پہنے وجود میں سے ایک نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔اس نے مزاحمت کرنا چاہی تھی مگر بے سود......چیخنا چاہا تو آواز گلے میں ہی دب کر رہ گئی اور وہ زمین پر جا گرا۔اپنے دیس میں بھی اس کے ساتھ پرائے لوگوں جیسا سلوک برتا گیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ درد ہی نہ رہا اور نہ اے متاعِ حیات

مجھے گماں بھی نہ تھا میں تجھے بھلا دوں گا

وہ بیڈ پر بیٹھی اریب کی تصویر کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ آنکھوں میں ایک چمک تھی اور دل میں ایک تڑپ۔

"اللہ آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے بس!" ایک مبہم سا چہرہ اس کی آنکھوں میں لہرایا تھا۔ پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔ جب سے اسے اریب کے حالات کے بارے میں خبر ہوئی اسے نہ دن کی خبر تھی اور نہ رات کی۔ آنکھوں میں بس ہر وقت اریب کا چہرہ سمایا ہوا تھا۔ چہرے پر بھی ویرانی دیکھی جا سکتی تھی۔ یہ فقط اس کا حال نہ تھا بلکہ سحر فاطمہ بھی اسی دوراہے سے گزر رہی تھیں۔ بھلا ایک ماں کے حال دل کو کوئی کیونکر جان سکتا تھا؟

"آپ نہیں جانتے اریب پورے گھر والے کس قدر ڈسٹرب ہیں آپ کو لے کر؟ کاش میں آپ کو پچھلی بار جانے سے روک لیتی۔ کاش!" اس نے دو چشمی انداز میں فریم کو دیکھا تھا۔

اس نے اپنی پشت دیوار سے لگائی اور آنکھیں بند کیں۔ ایک سلیم الطبع چہرہ آنکھوں میں مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کے حواس پر پوری طرح چھا چکا تھا۔ تبھی بند آنکھوں میں بھی اس کے وجود میں اتر چکا تھا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ تذبذب انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔ بالکونی کی طرف دیکھا تو آسمان کو بادلوں میں گھرا ہوا پایا۔

"ایک بات پوچھوں تم سے؟" اریب کے ساتھ گزارا گیا ایک لمحہ اس کی یادداشت سے ٹکرایا تھا۔

"ہاں پوچھیں!" وہ ڈریسنگ کے سامنے اپنے بالوں کو کنگا کر رہی تھی۔

"تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟" وہ یک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں وہ ایک وجیہہ صورت تھی۔ اس کے ہاتھ ساکت رہ گئے۔ وہ دھیرے سے پلٹی تھی۔

"یہ کیسا سوال ہے؟" وہ تھوڑا سا جھجکی تھی۔ وہ اس کے شکن پڑھ چکا تھا تبھی مدہم قدموں سے آگے بڑھا۔ اس کی کھلی زلفیں آدھی کمر پر جبکہ آدھی شانوں پر بکھری ہوئی تھیں۔

"کہیں تم نے مجھے سمجھوتے کے طور پر تو نہیں قبول کیا؟" وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہہ رہا تھا اور وہ انگلیاں چٹختے ہوئے اپنی کیفیت کو چھپانے کی سعی کر رہی تھی۔

"نہیں......ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے شاید حقیقت سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

"آپ اچھے ہیں۔ اسی لئے میں نے اس رشتے کو قبول کیا ہے اور پھر ہر بات واضح تو کر دی تھی ناں؟" وہ کہہ رہی تھی۔ تبھی اریب نے دھیرے سے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں ایسے نازکی سے تھاما جیسے وہ عقیق البحر ہوں اور ہاتھ لگانے سے ہی میلے جائیں

گے یا پھر ان میں کوئی نقص ابھرنے لگے گا۔اس کے پورے بدن میں ایک گدگدی کا احساس اجاگر ہوا تھا۔

''تم جانتی ہو۔میں لفظوں کو پیشانی پر پڑھ لیا کرتا ہوں۔ پھر تم کیسے اپنے دل کی بات چھپا سکتی ہو؟'' وہ دھیمے لہجے میں کہہ رہا تھا۔سماعت ان لفظوں کو اپنے اندر شہد کی مانند گھول رہی تھیں۔

''اپنی اس خوبی پر زیادہ مت غرور کیجیے۔غرور کرنا اچھی بات نہیں ہے۔'' اس نے بات کو ٹال دیا تھا اور مزاح بھرے انداز میں اس کے ناک کو چھوا تھا اور دوبارہ اپنے بالوں میں کنگا کرنے لگی۔اریب کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی۔

''اوہو۔اس کا مطلب ہے ابھی سی عام بیویوں کی طرح نصیحتیں شروع کردی جناب نے؟'' اس نے پیار سے اس کے شانوں کو پکڑ کو گھمایا تھا اور دونوں بازوؤں کو اس کے شانوں پر رکھ کر پیچھے سے اس کی زلفوں میں اپنی انگلیاں پھیرنے لگا۔

''بالکل۔'' اس نے بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اریب کے سینے پر رکھ دیے۔

''ہنستی رہا کرو۔تمہارا اریب تمہیں ہنستے ہوئے ہی دیکھنا چاہتا ہے۔'' اس کی پیشانی کو بوسہ دیتے ہوئے چاشنی کا نقش چھوڑا گیا تھا۔

اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔ ہاتھ خود بخود پیشانی کی طرف بڑھے۔آج بھی ان لبوں کی حدت تھی۔وہ چاشنی آج بھی اپنا نقش چھوڑے ہوئے تھی۔

''اپنے اریب کے بغیر میں کیسے ہنس سکتی ہوں؟'' پہلی بار اس نے اریب کو اپنا کہا تھا لیکن اس وقت جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ فاصلے بڑھ چکے تھے۔عکس ایک دوسرے سے جدا تھے۔سماعت ان لفظوں کو سن نہیں سکتے تھے۔وہ دیوار کے ساتھ جا لگی۔

☆......☆......☆

آج تو یوں خاموش ہے دنیا

جیسے کچھ ہونے والا ہے

کھانے کی میز پر سب کھانے میں مصروف تھے۔حاعفہ اور سحر فاطمہ کھانا لا کر ڈائننگ ٹیبل پر لا کر رکھ رہی تھیں۔جہانزیب حسب معمول نیوز پیپر پڑھتے دیکھائی دے رہے تھے۔

''ماریہ تم ایسا کرو لاؤنج میں جا کر صفائی کرو، وہاں کئی چیزیں بکھری ہوئی ہیں۔'' سحر فاطمہ نے دھیمے لہجے میں کہا تھا۔حاعفہ نے ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی تو ایک ماں کی حالت کو بھانپ گئی۔ہاتھ میں موجود ٹرے کو واپس شیلف پر رکھا اور آگے بڑھ کر ان کے دائیں کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''ماما جان......!'' اس نے پلکیں جھپکی تھیں۔سحر فاطمہ کا دل بھر آیا تھا۔جواباً اس کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا گیا۔

''جس بیٹے کے سر پر آپ جیسی ماں کا سایہ ہو تو کوئی مصیبت اس بیٹے کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔'' اس نے تسلی والے لہجے میں کہا

تھا حالانکہ ایسی ہی تسلی کی خود اسے بھی ضرورت تھی۔ وہ اندر سے ٹوٹی ضرور تھی مگر جانتی تھی کہ سحر فاطمہ کا دکھ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر اس کا سرتاج حالات کے زیر گردش ہے تو ایک ماں کا لخت جگر بھی پر خار راستوں پر اکیلا سفر طے کر رہا ہے۔ منزل بھی ایسی جو مبہم ہے۔ جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اس کے دل میں کئی بار آیا کہ وہ اریب کے الفاظ کو سب کے سامنے عیاں کر دے مگر ہر بار بند کمرے میں ہونے والی گفتگو کو شوہر کی امانت سمجھ کر خاموش ہو جاتی۔

کھوئے کھوئے لہجے میں وہ واپس پلٹی تھی کہ فون کی رنگ ہوئی۔ حاعفہ نے اٹھنا چاہا مگر سحر فاطمہ نے اسے بٹھا دیا۔

''تم بیٹھو...... ماریہ دیکھتی ہے۔ ماریہ فون اٹھانا'' ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا اور فون کا ریسیور اٹھایا۔ سب دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

''ہیلو...... کون ہے؟'' ماریہ نے شکنوں کو پیشانی پر پھیلاتے ہوئے پوچھا تھا مگر کوئی خاطر خواہ جواب موصول نہ ہوا۔ انتظار کرنا اس کی فطرت میں نہ تھا تبھی فون کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ یہ عمل مسلسل جاری رہا۔ کھانے سے فارغ ہونے تک ماریہ نے تقریباً تین بار فون ریسیو کیا تھا مگر ہر بار خاموشی کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔

''کون پاگل فون کیے جا رہا ہے؟ اگر بات نہیں کرنی تو نمبر ملانے کا کوئی جواز بنتا ہے کیا؟'' وہ بڑبڑاتے ہوئے کچن کی جانب بڑھی تھی۔ گھر والے بھی اب وہاں سے اٹھنے لگے کہ ایک بار پھر فون کی رنگ سنائی دی۔ ماریہ اشتعال بھرے انداز میں پلٹی تھی۔

''پتا نہیں کون پاگل ہے؟'' گردن جھٹک کر فون کی جانب بڑھی۔

''کس کا فون آ رہا ہے؟'' سحر فاطمہ نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں کون پاگل ہے؟ بار بار فون کر رہا ہے مگر بات ہی نہیں کرتا۔'' اس نے کڑیل لہجے میں کہا تھا۔

''ایک منٹ...... میں دیکھتا ہوں۔'' جہانزیب آگے بڑھے اور خود فون ریسیو کیا۔ ماریہ گردن جھٹک کر کچن میں چلی گئی۔ حسام صبا کا ہاتھ تھامے دھیمے قدموں سے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

''ہیلو! کون ہے؟'' جہانزیب نے کال ریسیو کرتے ہی پوچھا تھا۔ سحر فاطمہ اور جبیں صوفے پر براجمان ہو گئے جبکہ حاعفہ ماریہ کے ساتھ برتن سمیٹ رہی تھی۔

''کیا......؟ وہ وہاں نہیں ہے؟ اگر وہاں نہیں ہے تو کہاں ہے وہ؟'' وہ لاشعوری انداز میں اونچے لہجے میں بولے تھے۔ سب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ صبا اور حسام نے بھی حیرت و تفکر بھرے انداز میں ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کمرے میں جانے کا ارادہ ملتوی کیا۔ واپس لاؤنج کی طرف پلٹے۔ تفکر بھرے انداز میں حاعفہ بھی آگے بڑھی تھی۔

''یہاں...... یہاں کیسے آ سکتا ہے؟ اگر آتا تو میں فون کر کے بتا تا ناں دیتا؟'' استفہامیہ انداز گویا ہوا تھا۔ سب کے چہرے پر ایک

سوال تھا۔ سحر فاطمہ کا دل بھی جکڑتا جا رہا تھا۔

''میری......!!!'' بات ادھوری رہ گئی۔ سناٹے نے سماعت میں اپنا رس گھولنا شروع کیا تو بے جان مورت کے ہاتھوں سے فون گرتا چلا گیا۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

''کیا ہوا بابا جان؟ کس کا فون تھا؟ کون یہاں نہیں ہے؟ بتایئے۔'' حسام آگے بڑھا اور جہانزیب کو دونوں شانوں سے دھیمے انداز میں پکڑا تھا مگر وہ تو خاموش تھے۔

''بتایئے آپ...... کس کا فون تھا؟ دیکھیں، میرا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ جلدی بتایئے۔'' اس بار سحر فاطمہ نے آگے بڑھ کر پوچھا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہتے جا رہے تھے۔

''اریب انڈو میں نہیں ہے۔'' ٹوٹے ہوئے لہجے نے آدھا انکشاف کیا تھا۔ سب کے سروں پر ایک بم پھوڑا گیا۔ حاعفہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''وٹ؟ اریب انڈو نہیں ہے تو کہاں ہے؟'' حسام حیرت سے گویا ہوا۔

''وہ پاکستان آیا تھا۔'' سحر فاطمہ کی سماعت تو جیسے جا ہی چکی تھیں۔ اگر صبا ان کو نہ سنبھالتی تو قریب تھا کہ وہ گر جاتیں۔

''پاکستان آیا تھا......؟ تو گھر کیوں نہیں آیا؟ اور اگر گھر نہیں آیا تو کہاں گیا وہ؟'' حسام کا دماغ بھی ماؤف ہو چکا تھا۔ پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے بے چین آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

''بتائیں بابا جان؟ کہاں ہے اریب؟'' اس بار جبیں نے آگے بڑھ کر پوچھا تھا۔ اس کے لہجے میں بھی تفکر کا عنصر شامل تھا۔ حاعفہ کے لب تو جیسے سل چکے تھے۔ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھے۔ بس خاموش استفہامیہ آنکھیں ٹکٹکی باندھے سب کے چہروں کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''کچھ تو بتایئے بابا جان! ایسے خاموش مت رہیں۔ کہاں ہے اریب؟ یہاں نہیں...... انڈو میں نہیں ہے تو آخر کہاں ہے وہ؟'' ایک بھائی دوسرے بھائی کے لئے فکر مند تھا۔ بچپن سے جسے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا، یوں اچانک اس کی گمشدگی کا سن کر اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ جس کو ہمیشہ سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھا، آج جیسے اس سے کوسوں دور جا چکا تھا۔

''معلوم نہیں۔'' خوابیدہ لہجے میں جواب دیا گیا تھا۔ اریب کی گمشدگی نے ان کے دل پر گہری ضرب لگائی تھی۔ جس بیٹے کی ہمیشہ حفاظت کی، جسے ہمیشہ دنیا سے چھپا کر رکھا آخر وہ اس گرداب میں جا ہی پھنسا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدم صوفے کی طرف بڑھے مگر کچھ بھی دیکھنے سے قاصر تھے۔ سحر فاطمہ کی آنکھوں سے تو جیسے آنسوؤں کا دریا رواں ہو چکا تھا۔ حاعفہ کا دل بھی بری طرح ٹوٹا تھا۔ اسی دل کی کرچیاں سمیٹتے وہ اپنے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ اب شاید یہی آنسو بہانا اس کی قسمت میں باقی تھا۔

''حاعفہ......!'' جبیں نے پیچھے سے آواز دی مگر شاید وہ سن ہی نہ سکی تھی یا پھر وہاں ٹھہرنے کی سکت ہی نہ بچی تھی۔ صبا اور حسام کی عقل بھی جواب دے چکی تھی۔

☆......☆......☆

چاند نکلا افق کے غاروں سے

آگ سی لگ گئی درختوں میں

آنکھیں کھلی تو اپنے آپ کو ایک انجان جگہ پایا۔ شاید وقت نے اپنے آپ کو دہرایا تھا۔ وہی تاریکی ...... وہی ظلمت ...... وہی درد...... شاید قسمت نے وہی کھیل دوبارہ کھیلا تھا۔ پلکیں جھپکیں تو ماضی کی لہر دوڑی۔

وہ فٹ پاتھ پر تھا اور اندھیر راستوں پر منزل کا خواہ تھا مگر قسمت نے اسے روشنی کے قریب لے جانے کی بجائے اندھیرے میں لاکھڑا کیا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو درد کی ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی۔ اسے حیرت ہوئی کیونکہ اس بار اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہ تھے۔ وہ آزاد تھے۔ تبھی وہ انہیں سر کی جانب بڑھا سکا تھا۔ دوسرا ہاتھ ابھی تک بستر پر تھا۔ یہ اس کے لئے دوسرا دھچکا تھا۔ وہ کسی فوم پر لیٹا تھا۔

''آہ......'' درد کے سبب وہ کراہا تھا مگر ذہن حالات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا وہ واقعی انجان لوگوں میں ہے یا پھر کہیں اور؟ وہ نیم دراز بیٹھا سوچ رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ بس اتنا محسوس کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی بند کمرے میں ہے۔ جس کے ایک طرف دروازہ ہے۔ جو یقیناً بند ہی ہوگا دوسری طرف ایک کھڑکی جو بند تھی۔ اس کے علاوہ کسی شے کا اندازہ لگانا بے کار تھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' اس نے ذہن پر دباؤ ڈالا مگر کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔

یہ اس کا اپنا کمرہ تو ہو نہیں سکتا تھا کیونکہ جہاں وہ بچپن سے رہا ہو، اس کی ایک ایک چیز کو بنا دیکھے پہچاننے کی صلاحیت تو اس میں تھی اور دوسری بات، اگر وہ اپنے گھر ہوتا تو اکیلا نہ ہوتا بلکہ سحر فاطمہ لازماً اس کے سرہانے بیٹھے اس کے بالوں کو سہلا رہی ہوتیں اور اس کے ہوش میں آتے ہی اس کی پیشانی کا بوسہ لیتیں۔

یہ گرینڈ مراج ہاٹل کا کمرہ بھی نہیں تھا۔ ایک انٹرنیشنل ہاٹل میں ایسا کمرہ قطعاً نہیں ہو سکتا جسے دیکھتے ہی قراحت محسوس ہو۔

تیسرا خیال عالمگیر کے گھر کا آیا تھا مگر یہ وہاں بھی موجود نہ تھا۔ اگرچہ اس نے عالمگیر کا پورا گھر نہ دیکھا تھا مگر ایک کمرے سے ہی وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کا ایک ایک کمرہ کتنا آرام دہ ہو سکتا ہے۔ یہ فوم جس پر وہ لیٹا تھا اگرچہ باعث تکلیف نہ تھا مگر اتنا آرام دہ بھی نہیں تھا۔

''یہ کون سی جگہ ہے؟'' وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو چکا تھا۔ تبھی اس کی سماعت میں ایک شور گونجا۔ شور باہر سے سنائی دیا۔ وہ پیشانی پر شکن بکھیرتے ہوئے وہاں سے اٹھا تھا اور سیدھا کھڑکی کی جانب بڑھا۔ وہ بھی چٹخنی چڑھا کر بند کی گئی تھی مگر لکڑی کی بنی ہونے کے باعث اسے یقین تھا کہ وہ اسے کھولنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ تبھی ایک دوبار جھٹکا دیا اور شہہ مقدر بنی۔ عرصے بعد وہ کسی جیت کا حقدار ٹھہرا

تھا مگر وقت خوشیاں منانے کا نہیں تھا۔ اسے تو باہر دیکھ کر جگہ کا تعین کرنا تھا۔ اس نے فی الفور کھڑکی کھولی تو سورج کی نرم نرم کرنوں نے کمرے کی ظلمت پر ہلا بول دیا۔ برجستہ چمک کو دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی چندھیا گئیں اور اس نے اپنے بازو کو آنکھوں کے سامنے کر لیا۔ ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ ظلمت اپنے آپ کو سمیٹ کر رخصت ہو چکی تھی۔ وہ ایک عام سے مگر خاص طریقے سے آراستہ کمرے میں موجود تھا۔ جس میں پرانے زمانے کی چیزیں عام دیکھائی دے رہی تھیں۔ وہ فوم جس پر وہ خود لیٹا تھا، اس کے سوا ہر شے لکڑی کی تھی۔ دو کرسیاں، ایک جھولا، سنگھار، برتنوں کی الماری یہاں تک کے دروازے بھی کھجور کے پتوں سے بنے دیکھائی دیتے تھے۔

"دیوتا کا اقبال بلند ہو...... دیوتا کا اقبال بلند ہو۔" انڈونیشین زبان اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ بے چینی بڑھ گئی۔ اس نے دھیرے سے ہاتھ اٹھایا تو سورج کو سلامی کرتا ہوا اپنے سامنے پایا۔ صاف آسمان جہاں کوئی داغ نہ تھا۔ اس کے عین سامنے تھا۔ آنکھیں نیچے گئی تو لوگوں کا ہجوم دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ وہاں پرانے طرز کے لباس میں کئی لوگ جمع تھے۔ جیسے ہی اس کی نگاہ ان لوگوں پر گئی، ان کے سر مئودب انداز میں جھکتے چلے گئے۔

"دیوتا کا اقبال بلند ہو۔" ایک نعرہ بلند ہوا۔ وہ ایک عرصے تک اس دیس میں رہا، تبھی ان لوگوں کے الفاظ سمجھ سکتا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ جب آخری بار وہ اپنے حواس میں تھا تو اس کے قدم پاکستان کی سرزمین پر تھے تو اب وہ انڈونیشیا کیسے پہنچ سکتا تھا؟ اور پھر ان لوگوں کے درمیان جنہیں وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ سب سے بڑھ کر اس کو جو بات کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ وہ سب اس کو دیوتا کیوں کہہ رہے تھے؟ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی شناسا چہرہ نظر نہ آیا۔

"کون ہیں یہ سب؟ کہاں ہوں میں؟" وہ متجل پلٹا اور دروازے کو پیٹنے لگا۔

"کوئی ہے باہر؟ دروازہ کھولو۔" وہ زوروں سے اسے پیٹ رہا تھا مگر جواب ندارد۔

"مجھے اچھی طرح معلوم ہے باہر سے میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ میں چند لمحوں کی مہلت دے رہا ہوں۔ اگر دروازہ نہیں کھولا گیا تو میں یہ دروازہ توڑ دوں گا۔ سمجھے آپ لوگ۔" وہ کرخت لہجے میں گویا ہوا تھا۔ اس نے مٹھیاں بھینچے ادھر ادھر دیکھا تو سر پر ایک گہری ضرب لگی۔ ایک پنگھوڑا سامنے تھا۔ لکڑی سے بنا پنگھوڑا، جو کسی شیر خوار کے لئے ہوا کرتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی اس کے سر پر دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ کسی بچے کی رونے کی آواز نے سماعت میں رس گھولنا شروع کیا۔

"دیوتا دنیا میں آ چکا ہے۔" کچھ لوگ خوشیاں مناتے دیکھائی دیئے۔

"دیوتا کی جان کو خطرہ ہے۔" ایک بوڑھا عکس تھا، جو کسی کو تنبیہ کر رہا تھا۔

"دیوتا پر ایک آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔" سب نے ایک عہد لیا تھا۔

آوازوں کی بھرمار نے اس کو جیسے پاگل کر دینے کی ٹھانی تھی۔ وہ سر کو پکڑتا ہوا چلایا تھا۔

''بس...... بند کرو یہ آوازیں۔'' وہ ہیجانی کیفیت میں دوبارہ دروازے کی جانب پلٹا۔ پسینے سے جسم شرابور اور ایک کپکپی جسم پر طاری تھی۔

''میں دروازہ توڑ رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے آستینیں چڑھائیں تو ایک آہٹ سنائی دی اور دروازہ کھول دیا گیا۔ اس کا اشتعال پہلے سے مزید بڑھ گیا۔ آگ میں لپٹی سانسیں اپنے دشمن کو سامنے دیکھ کر آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

''تم؟'' حقارت سے اسے مخاطب کیا گیا تھا۔

''بالکل...... میں۔'' ہمیشہ کی طرح ایک تبسم اس کے چہرے پر آویزاں تھی مگر اس بار ایک شے مختلف تھی۔ وہ شے اس کا لباس تھا۔ پہلے اکثر وہ پینٹ شرٹ میں ہوتا تھا مگر اس بار وہ پرانے سے فرسودہ لباس میں تھا۔ جو عموماً پادریوں کا ہوا کرتا ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر اپنی گردن کو ذرا سا جھکایا تھا۔ اس کے پیچھے کھڑے دو دربانوں نے بھی تقلید کی۔ اس کے بعد انہیں باہر جانے کا کہا گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔

''تمہاری ہمت کیسے ہوئی دوبارہ اپنی منحوس صورت میرے سامنے لانے کی؟ اور کہاں ہوں میں؟ کون ہیں یہ سب؟ مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہیں؟'' اس نے کئی سوال یک لخت کر ڈالے تھے مگر تمام سوالوں میں ایک عنصر شامل تھا۔ وہ عنصر نفرت اور حقارت کا تھا۔ اس کے اندر جو لاوا ابل رہا تھا، اس کا اندازہ شاید خود اس کی ذات کو بھی نہ تھا۔

''آرام سے مائے ڈیئر اریب! اب یہاں آ چکے ہو ناں۔ سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ لیکن ان سوالوں کا جواب جاننے کے لئے تمہیں انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے ہمیشہ کی طرح مدہم لہجہ اپنایا تھا، جو اکثر اریب کے لئے پریشان کن ہوا کرتا تھا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔ نہ ہی مجھے تمہارے جواب چاہیے اور نہ ہی مجھے یہاں رکنا ہے۔ جا رہا ہوں میں۔'' ابدال کو پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے وہ دروازے کی طرف پلٹا تھا۔

''جانا چاہتے ہو تو جاؤ مگر جاؤ گے کہاں؟ کوئی نہیں ہے تمہارا اس دنیا میں۔'' ابدال کا یہ جملہ اس پر قہر بن کر نازل ہوا تھا۔ اس کے قدم جہاں تھے وہی منجمد ہو گئے۔ آنکھوں کی پتلیاں غیر یقینی طور پر پھیلتی چلی گئیں اور سانسیں تو جیسے چلنا ہی بھول چکی تھیں۔ وہ برق رفتاری کے ساتھ پلٹا۔

''کک کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ جیسے اپنے حوس بحال کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

''وہی جو تم سمجھ رہے ہو۔'' اس نے گردن کو ہلکا سا خم دیا تھا۔

''کیا کیا تم نے میری فیملی کے ساتھ بولو؟ کیا کیا میری فیملی کے ساتھ؟'' آگے بڑھ کر اس کا گریبان بری طرح نوچا تھا۔ جواب میں اس نے کوئی وار نہ کیا مگر اریب کی آنکھیں خوب آگ برسا رہی تھیں۔ جس کی حدت وہ باآسانی محسوس کر سکتا تھا۔

”کیا تو ابھی کچھ نہیں ہے لیکن یہاں سے باہر جانے کی غلطی بھی کی ناں ......تو بہت کچھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے ذو معنی لہجے میں کہا تھا۔ اریب کے ہاتھ خود بخود نیچے جھکتے چلے گئے۔ اشتعال انگیز نگاہوں کو جیسے پانی کے سمندر سے بجھا دیا گیا مگر تپش تھی کہ ابھی تک وہاں موجود تھی۔

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔“ رندھا ہوا لہجہ گویا ہوا تھا۔ شیر کی طرح دھاڑتا ہوا لہجہ، اپنوں پر آئی مصیبت کا سن کر خاموشی کے لبادے میں جا گھسا۔

”میں ایسا کر سکتا ہوں یا نہیں؟ یہ تم بہتر جانتے ہو۔ فی الحال تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ خاموشی سے جو میں کہتا ہوں وہ کرو تم۔“ اس نے پہلی بار اریب کو گھورتے ہوئے حکم دیا تھا۔ وہ مجبور تھا۔ تبھی اپنے اندر کو مارتے ہوئے اس کی طرف پلٹنا چاہا جو اس وقت کھڑکی کی طرف جا رہا تھا۔

”کہاں ہوں میں؟“ اس نے بمشکل پوچھا تھا۔

”سیٹیاوان۔“ اس نے بنا پلٹے جواب دیا۔

”سیٹیاوان......؟ یہ کون سی جگہ ہے؟“ وہ زیر لب گویا ہوا تھا۔

”بزرگوں کا شہر...... جہاں یقین بستا ہے۔ امن و سکون کی ہوا صبح شام دستک دیتی ہے۔ جہاں کے باسیوں کو برسوں سے اپنے دیوتا کا انتظار تھا۔ وہ دیوتا جس کے آنے سے اس گاؤں کی قسمت ایک بار پھر بدل جائے گی۔ وہی ہریالی، وہی خوشیاں ایک بار پھر اس گاؤں کے رہنے والوں کا مقدر بنے گی، جو پہلے ہوا کرتی تھیں۔“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری تھی۔ اریب اس کی باتوں سے دنگ تھا۔ استفہامیہ آنکھیں اس کی جانب یک ٹک دیکھتی جا رہی تھیں۔

”کیا توہم پرستی کی باتیں کر رہے ہو تم؟ آج کے زمانے میں کوئی دیوتا شیوتا نہیں ہوتا۔“ اس نے جبڑے بھینچتے ہوئے کہا تھا۔ جس پر وہ گہری نگاہ سے پلٹا تھا۔ اریب کو لگا جیسے وہ ابھی اسے اپنے دیوتا کی گستاخی کرنے کی پاداش میں پھانسی پر چڑھا دے گا مگر ایسا کچھ نہ ہوا کیونکہ اصل دھچکا پہنچنا تو ابھی باقی تھا۔

”ابھی اس لئے کہہ رہے ہو کیونکہ اپنی طاقتوں سے تم نابلد ہو۔“

”میں اپنی طاقتوں سے نابلد ہوں؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟“ سوال پر اس نے توقف کیا۔ ابدال یک ٹک اسے دیکھتا رہا۔ پیشانی پڑھنے میں ذرا دیر نہ لگی۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔

”جسٹ شیٹ اپ۔“ وہ اشتعال انگیز لہجے میں گویا ہوا تھا۔ آنکھوں میں فقط نفرت اور غصہ تھا۔ ابدال مسکرا دیا۔

”حقیقت یہی ہے مائے ڈیئر...... تم ہی اس گاؤں کے دیوتا ہو۔“ اس نے بات کی وضاحت کی تھی۔ اریب نے دفعتہً اس کے

چہرے پر ایک طمانچہ دے مارا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی پر ہاتھ اٹھایا تھا وہ بھی اپنے سے بڑے پر۔ ایسا وہ کبھی نہ کرتا اگر وہ اسے مجبور نہ کرتا۔ اسے اپنے کیے پر نہ ہی پچھتاوا تھا اور نہ ہی کوئی ملال۔

"میں اریب ہوں...... اریب عالمگیر۔ جہانزیب عالمگیر کا بیٹا۔ کوئی دیوتا نہیں۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیا تھا۔ جس پر اس کی آنکھیں قہر برساتی معلوم ہو رہی تھیں۔

"یہ بات بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔" اس نے بات کو ہلکا جانا اور اریب کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کے عین سامنے لے آیا۔ وہاں ابھی تک لوگ جمع تھے۔ ادب سے گردن جھکائے ہوئے تھے۔

"اپنا ہاتھ لہراؤ۔" وہ بڑبڑایا تھا مگر اریب ٹس سے مس نہ ہوا تو ابدال نے خود ہی اس کے ہاتھ کو پکڑ کر ہوا میں زبردستی لہرایا تھا۔ اریب کی ساری مزاحمت بے کار گئی۔

"دیوتا کو آرام کی ضرورت ہے۔" ابدال نے اعلان کیا تھا۔ جسے سن کر تمام لوگ منتشر ہو گئے۔ وہ پلٹا اور کھڑکی بند کر دی گئی۔

"یہ سارے ڈرامے بند کرو اور مجھے یہاں سے جانے دو۔ ورنہ تمہارے لئے اچھا نہیں ہو گا ابدال۔" وہ بے بسی کے ساتھ دھمکی دے رہا تھا۔

"میرے لئے کیا اچھا ہے، کیا نہیں؟ تم نہیں جانتے۔ فی الحال تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ تم اس کمرے میں ہی رہو کیونکہ اگر باہر نکلو گے تو اس سے زیادہ کٹھن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اریب اس کی بات پر چونکا تھا۔ اس کے لبوں پر تمکنت اپنی جگہ بنائے ہوئے تھی۔

کچھ دیر خاموشی سے دونوں کھڑے ایک دوسرے کو تکتے رہے پھر ابدال باہر کی جانب چل دیا۔ اریب اپنی جگہ پر مورت تھا۔ باہر نکلنے پر کمرے کا دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

مری بے کسی کا نہ غم کرو مگر اپنا فائدہ سوچ لو

تمہیں جس کی چھاؤں عزیز ہے میں اسی درخت کا ہوں ثمر

وہ رات کا پہر تھا جب قدموں کی چاپ اسے سنائی دی۔ وہ بری طرح چونکا۔ نیند تو پہلے ہی اس سے کوسوں مسافت پر تھی۔ تبھی اکڑوں بیٹھا یہاں سے نکلنے کی نت نئی راہیں تلاش کر رہا تھا۔

قدموں کی چاپ قریب سے قریب تر آتی جا رہی تھی۔ آنے والا اکیلا نہیں تھا بلکہ کئی لوگوں کے قدموں کی چاپ آپس میں گھل مل رہی تھیں۔ وہ ایسے ہی بیٹھا رہا بس نگاہوں کا مرکز دروازے کو بنایا۔ ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا گیا۔ اس بار وہاں سے کوئی اجنبی برآمد

ہوا۔ جو ایک بزرگ تھا۔ کوئی مذہبی پیشوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پیچھے اس کے دو کارندے بھی کھڑے تھے۔ جن کے ہاتھوں میں ایک ایک تھالی تھی۔ جن پر ریشمی کپڑا تھا۔ وہ نفرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

''دیوتا کی خدمت میں سلام۔'' وہ انڈونیشین میں ہی اسے سلام کر رہے تھے۔ اس نے حقارت سے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ جیسے وہ اس کی بے رخی دیکھ کر جانے کی اجازت دے دیں گے۔

''یہ آپ کے لئے۔'' ایک اشارے سے پیچھے کھڑے دربان آگے بڑھے اور انہیں اریب کے سامنے رکھ دیا گیا۔ اریب نے گہری نگاہ ان پر ڈالی اور پھر طیش میں ان پر ایسا ہاتھ مارا کہ ان پر رکھی چیزیں دور جا گریں۔

''کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ لے جاؤ ان سب چیزوں کو۔'' وہ جبڑے بھینچے چلایا تھا۔ دونوں دربان سہم سے گئے تھے۔

''دیوتا طبیعت میں اطمینان رکھیں۔'' اس بزرگ نے پر مطمئن لہجے میں کہا تھا۔

''بند کرو اپنی بکواس...... بند کرو مجھے دیوتا دیوتا کہنا...... میں کوئی دیوتا نہیں ہوں۔'' اس نے کھڑے ہو کر انہیں تنبیہ کی تھی۔ دونوں دربانوں کو ایک جھٹکا لگا تھا۔ بزرگ بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک نظر اریب پر ڈالی گئی۔

''میری نظر کمزور ضرور ہے مگر اپنے دیوتا کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتیں۔ آپ ہی ہمارے دیوتا ہو۔ یہ آپ کو قبول کرنا ہی ہوگا۔'' اس کے لہجے میں وہی طمانت تھی۔ اریب کی سماعت تو جیسے دیوتا دیوتا کے نام سے سُن ہو چکی تھی۔ اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے ڈریسنگ پر ہاتھ مارا اور آئینے کو توڑ ڈالا۔

''چلے جاؤ یہاں سے۔ اکیلا چھوڑ دو مجھے۔'' وہ چلایا تھا۔ دربانوں نے اس بزرگ کی طرف دیکھا جیسے حکم کے منتظر ہوں۔ اس بزرگ کے چہرے پر اگرچہ عمر کا ایک حصہ گزر جانے کے باعث جھریاں تھیں مگر رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ وہ سب اس کی آنکھوں کے اشارے سمجھتے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ انہیں وہاں سے جانے کا حکم دیتا پیچھے سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہاں ابدال تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' اس نے اپنی پیشانی پر آئے شکن کو ضبط کرتے ہوئے ناگواری کے ساتھ کہا تھا۔

''پیشواؤں نے دیوتا کے لئے کچھ پھل بھیجے تھے۔'' اس بزرگ نے وجہ بیان کی تھی۔

''آپ کو منع کیا تھا ناں کہ میری اجازت کے بغیر دیوتا کی آرام گاہ میں قدم مت رکھیے گا۔ پھر آپ نے میرا حکم توڑنے کی جسارت کیوں کی؟'' اس نے بے رخی سے چہرہ پھیر لیا تھا۔ ابدال کا ایسا کرنا جیسے اس بزرگ کے لئے بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ فوراً پشیمان دکھائی دیا اور اپنے کئے پر معافی مانگی۔

''مجھے معاف کر دیں، دیو خاص ایسا نہیں ہوگا۔'' اس خطاب پر اریب چونکا تھا۔ اس نے گہری نگاہ ابدال پر ڈالی۔

''ٹھیک ہے آپ جا سکتے ہیں یہاں سے۔ میں بات کرتا ہوں دیوتا سے۔'' ابدال کے کہنے پر وہ وہاں سے چلے گئے۔ ابدال نے

بھی آگے بڑھ کر دروازہ بند کیا۔

''واہ...... کیا بات ہے تمہاری۔ کبھی ابدال تو کبھی دیو خاص۔ کتنے نام ہیں تمہارے؟'' اریب نے عقب سے ہی طنز کے نشتر برسائے تھے۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح ایک تبسم کے ساتھ پلٹا تھا۔

''سچ کہا جناب نے۔ کیا ہی کہنے ہیں میرے لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ یہاں پر کسی کو اپنا ہمدرد مت سمجھنا کیونکہ یہاں کے لوگ جتنے دوستانہ دیکھائی دیتے ہیں۔ اتنے ہیں نہیں۔'' اس نے مدہم سے لہجے میں اسے آگاہ کیا تھا مگر وہ سمجھنے والے انداز میں کہاں تھا؟ دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے گہری نگاہ ابدال پر ڈالی تھی۔

''جانتا ہوں...... حقیقت تو میرے سامنے ہے۔'' ابدال کا قہقہہ گونجا۔ آگے بڑھ کر اس کے رخسار کو ہلکا سا تھپتھپایا تو اس کا وجود ایک بار پھر اشتعال دیکھائی دیا۔ ایک جھٹکے سے اس نے ابدال کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

''آج تو مجھے چھو لیا مگر آئندہ مجھے چھونے کی کوشش بھی کی تو بھول جاؤں گا کہ میرے والدین نے میری کیا پرورش کی ہے۔'' اس نے انگلی دیکھاتے ہوئے اسے تنبیہ کی تھی مگر وہ بھی جانے کس مٹی کا بنا تھا؟ اریب کو دیکھتے ہوئے مسکراتا جا رہا تھا۔ جیسے اسے ایسا کرنے میں مزہ آ رہا ہو۔ آنکھوں میں ایک تمکنت جو کسی سچی خوشی کے مل جانے پر ہوتی ہے، صاف صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

''یہ منافقانہ مسکراہٹ دیکھا کر مجھے پگھلانے کی کوشش مت کرو اور نہ ہی سمجھنا کہ اریب ڈر گیا۔ میرے بابا جان نے مجھے ڈرنا نہیں سیکھایا۔ میرے بابا جان نے مجھے اور حسام بھائی کو حالات کا مقابلہ کرنا سیکھایا ہے اور دیکھ لینا جب میرے بابا جان کو میری گمشدگی کا علم ہوا تو وہ زمین آسمان ایک کر دیں گے مگر مجھے ڈھونڈ کر ہی دم لیں گے۔'' خاموش فضاؤں میں اریب کے الفاظ تھے یا پھر ابدال کی آنکھوں کی چمک جس کا مطلب وہ چاہ کر بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ پیشانی پر بکھری شکنوں کو پڑھنے کی سعی کی گئی تو وہ ایک بار پھر ناکام ہوا۔ جہاں بھر کی لکیروں کو پڑھنے والا آج پھر دشمن کی چال کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

''بہت مان ہے تمہیں اپنے بابا جان پر؟'' استفہامیہ انداز میں کہا گیا تھا۔

''تمہاری سوچ سے بڑھ کر۔'' اریب نے بھی جبڑے بھینچتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھی بات ہے مگر اس یقین کو اتنا پختہ مت ہونے دو کہ وقت کے ہاتھوں منہ کی کھانی پڑے۔'' یہ کہتے ہی وہ باہر کی جانب چل دیا جبکہ اریب ایک لمحے تک اس کے جملے کا مفہوم سمجھنے کی سعی کرتا رہا۔

☆......☆......☆

کر دیا آج زمانے نے انہیں بھی مجبور

کبھی یہ لوگ مرے دکھ کی دوا کرتے تھے

دن کا ایک حصہ گزر چکا تھا مگر سورج نے ابھی تک اپنی کرنوں سے دنیا کو منور نہ کیا تھا۔ رات بھر تاریکی نے پر پھیلائے رکھے تو صبح صادق سے ہی بادلوں نے اپنے بسیرا گاؤں کی پرفسوں فضا پر کر لیا تھا۔ بنجر زمین جہاں کہیں کہیں کھیتیاں دیکھی جا سکتی تھیں، انگڑائی لیتے موسم کو دیکھ خوشی سے جھوم اٹھی تھیں۔ ہوا کے سنگ اپنے سروں کو ایسے لہراتیں جیسے خوشیوں کی نوید سنا رہی ہو۔ جھومتی، مچلتیں اور برسوں کی تشنگی بجھنے پر اپنے رب کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

سیٹیاوان کے باسی بھی اس موسم کے گرداب میں آچکے تھے تبھی خوشی کے گیت گاتے میدان میں جمع ہو گئے۔ بوڑھوں کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔ ہاتھوں میں عصا لئے، ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ اس خوشی میں شریک ہو رہے تھے۔ آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے تو لبوں پر تشکر کے الفاظ مگر اس تشکر میں کوئی ذات شریک تھی۔ اس بدلے موسم کو وہ کسی کے آنے کا شگون سمجھ رہے تھے۔

''یہ سب دیوتا کی کرامت سے ہوا ہے۔'' کہنے والے نے کہا تھا۔ باقیوں نے پل بھر کے لئے ٹھہر کر اس کی طرف دیکھا تھا جو دونوں ہاتھوں کو فضا میں بکھیرے نرم نرم ہوا کو اپنے جسم کو چھونے کی اجازت دے رہا تھا۔

''کتنے سال یہ گاؤں اس موسم کو ترسا ہے۔ کتنے سال ابر نیساں نے ہم سے بے رخی اختیار کیے رکھی۔ ظلمت کی چادر میں اس گاؤں نے کتنے ہی بچوں کو ترستے مرتا دیکھا ہے مگر اب اور نہیں...... اب ہمارا دیوتا واپس آچکا ہے اور دیکھو دوستو! دیوتا کی پہلی کرامت، موسم بھی ہم پر مہربان ہو گیا۔'' وہ سب کا دیوتا پر یقین مزید پختہ کر رہا تھا۔ تبھی بادل مزید گہرے ہوئے اور آسمان سے پہلی بوند اس بزرگ کے ہی چہرے پر آ کر گری تھی۔ وہ خوشی سے چلا اٹھا۔ پھر اس بوند کی تقلید دوسری بوندوں نے بھی کی اور ہر آدمی کے چہرے نے اس نرم اور ٹھنڈے لمس کو محسوس کیا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... دیوتا کی کرامت ہے یہ۔'' دیکھا دیکھی دوسرے بوڑھے بھی خوشی سے بول اٹھے تھے۔

''ہمارا دیوتا ہمارے ساتھ ہے۔'' آوازیں بلند ہونے لگیں۔ آسمان سے بھی ابر رحمت خوب برسنے لگا۔ ہواؤں نے ہر شے کو متحرک کر دیا تھا۔

''اب یہ موسم کبھی ہم سے خفا نہ ہوگا...... کبھی کھیتیاں لہرانے سے پہلے زمین بوس نہیں ہونگی...... کبھی کوئی بچہ پیاس سے نہیں مرے گا۔ کبھی سورج ہمیں آنکھیں نہیں دیکھائے گا۔ یہ زمین ایک بار پھر سونا اگلے گی۔ جیسے برسوں پہلے اگلتی تھی۔ بدحالی کے دن بدل جائیں گے۔ خوش حالی ایک بار ہمارا مقدر بننے والی ہے۔'' بس یہی الفاظ تھے جو ہر ایک کی زباں سے جاری تھے۔

شور و غل میدان میں تھا مگر اس کا اثر اس زندان تک سنا جا سکتا تھا جہاں اریب موجود تھا۔ یہاں کے باسیوں کے لیے محل، مگر اریب کے لئے یہ زندان ہی تھا۔ ہر وہ شے انسان کو زندان کی مثل ہوتی جہاں اسے زبردستی رہنے پر مجبور کیا جائے۔ وہ بھی تو مجبوراً ہی یہاں رہ رہا تھا۔ اگر اپنوں کی زندگی پیاری نہ ہوتی تو وہ یہاں سے کب کا بھاگ جاتا۔

''موسم انجوائے نہیں کرو گے کیا؟'' وہ پلنگ پر بیٹھا تکیے کو نوچ رہا تھا۔ جیسے اپنا غصہ اس پر اتار کر دل بہلانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''جن کا اندر آگ میں جھلس رہا ہو ناں تو ابرِ نیساں اگر صدیوں برستا رہے تب بھی دل کو قرار نہیں آتا۔ ایک تپش ہمیشہ باقی رہتی ہے جو ہر بوند کے ساتھ بڑھتی تو ضرور ہے مگر گھٹتی نہیں۔'' اس نے پہلی بار ابدال کی طرف معصومیت اور بے بسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ آنکھوں میں یاسیت کا جہاں آباد تھا جیسے وہ اس کے سامنے منت سماجت کر رہی ہوں کہ خدا کے لئے مجھ پر ترس کھاؤ۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔ میری دنیا اور اس دیس کی دنیا یکسر مختلف ہے مجھے اپنی دنیا میں لوٹنے دو۔ لوٹنے دو مجھے۔

ابدال نے ان بے خواب آنکھوں کو پڑھ لیا تھا۔ آگے بڑھ کر کھڑکی کے دونوں پٹوں کو کھولا۔ ہوا کا خوشگوار جھونکا اندر داخل ہوا مگر اریب اپنی جگہ پر ساکت رہا۔

''تم جانتے ہو اریب آج کا دن یہاں کے لوگوں کے لیے عید سے کم نہیں ہے۔ ہو بھی کیوں ناں؟ آخر کیس سالوں بعد بادلوں کو برستا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' اریب اس کی بات پر چونکا تھا اور غیر یقینی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا جو باہر آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر بارش کی بوند کو اپنے ہاتھوں میں جذب ہونے دیا۔

''برسوں پہلے بھی یہ بادل برسا تھا۔ اس دن بھی لوگوں نے خوشیاں منائی تھیں۔ اپنے غم بھول کر ایک خوشی میں خوش ہو گئے۔ میں بھی خوش ہوا تھا مگر کیا خبر تھی کہ وہ خوشی پل بھر کی ہو گی۔'' وہ ماضی کے پنوں میں الجھنے لگا تھا۔ اس کا لہجہ گندھا ہوا محسوس ہوا تھا مگر جلد ہی وہ اپنے حواس کو ضبط کر گیا۔

''وہ خوشی پل بھر کی تھی یا عمر بھر کی...... آئی ڈانٹ کیئر...... مجھے تو بس یہ معلوم ہے کہ تم سب ظالم ہو۔ عقل کے اندھے ہو۔ تو ہم پرست ہو۔'' وہ جبڑے بھینچے کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ابدال نے گہری نگاہ اس پر ڈالی تھی۔ جیسے اس کو معلوم ہے وہ کیا کہنے جا رہا تھا۔ دھیرے سے مسکرا دیا۔ شاید یہ اس کی عادت تھی۔

''بھلا کوئی انسان بھی دیوتا ہوا ہے؟ جو تم سب مجھے دیوتا دیوتا کہہ کر پکار رہے ہو؟ تمام انسان برابر ہیں۔ ان کی اصل صرف ایک ہے۔ مذہب، ذات، قومیت کسی کو دیوتا نہیں بنا دیتی۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ تم جیسے شخص کی عقل بھی کیا گھاس چرنے گئی ہوئی جو ایک انسان کو دیوتا کی منزل پر فائز کر رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں عام ہوں۔ میں کوئی دیوتا نہیں ہوں اور یہ بات تم اچھے سے جانتے ہو۔'' اس نے استفہامیہ انداز میں ابدال کی طرف دیکھا تھا۔ جس نے ہلکے سے گردن کو خم دیا اور پھر اس کی طرف مڑا۔

''جانتا ہوں...... تم عام ہو کر بھی عام نہیں ہو۔'' اس کے لہجے میں کچھ تو خاص تھا کہ اریب کی نگاہیں اس کے وجود کے ساتھ ہی کمرے میں گھومتی رہیں۔ وہ پلنگ کے نیچے پڑا تکیہ اٹھا کر واپس اس کی اصل جگہ پر رکھ رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ زیادہ جلد باز تھا۔

''تم بہتر جانتے ہو۔'' پلٹ کر دھیرے سے مسکرایا۔ پیشانی آج بھی خالی تھی۔ شکنیں کچھ بھی تحریر سامنے لانے سے قاصر نظر آتی تھیں۔ ابدال باہر جانے کے لئے پلٹا تو وہ سرعت سے آگے بڑھا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بے دردی سے اسے نوچ رہی تھیں۔ جیسے وہ کوئی شکاری ہو اور اپنا شکار ملنے پر اس کو اپنی گرفت میں لے چکا ہو۔

''نہیں جانتا میں...... کچھ نہیں جانتا میں لیکن تم جانتے ہو۔ مجھے بتاؤ۔ سچ کیا ہے؟ کون ہیں یہ لوگ؟ کیا تعلق ہے ان لوگوں کا تم سے؟ کیوں کر رہے ہو تم یہ سب؟ بتاؤ مجھے۔'' اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے استفسار کیا تھا مگر وہ خاموش رہا۔ شاید جانتا نہیں تھا یا پھر بتانا نہیں چاہتا تھا۔

''تمہاری یہ خاموشی کسی کام نہیں آئے گی۔ تم جب تک خاموش رہو گے میرے سوال بڑھیں گے، کم نہیں ہونگے۔ بہتر یہی ہے کہ اس سے پہلے میرے سوال لامتناہی منزل کو پار کر جائیں مجھے میرے سوالوں کے جواب دے دو۔ جو میں جاننا چاہتا ہوں، میری ذات کو ان سے آگاہ کر دو۔'' اس بار وہ التجائیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

''میرا نام اریب ہے...... کوئی مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ یہی کہتے ہو ناں تم سب سے؟ تو اب کیا ہوا؟ کہاں گئی تمہاری وہ پاور؟ جس کے ہونے پر تمہیں ناز ہوا کرتا تھا۔ کیوں نہیں اس بات کے بابت تمہیں آگاہ کیا جس کی تہہ تک تم پہنچنا چاہتے ہو؟ کیا یہی ہے تمہاری طاقت؟'' تبسم کو لبوں پر پھیلاتے ہوئے اس نے طنز کیا تھا۔ انگلیوں کی گرفت کمزور ہوئی تو شکار شکاری کے پنجے سے نکل گیا۔ وہ ہونقوں اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ واقعی وہ اس کا چہرہ پڑھنے میں بے بس دکھائی دیتا تھا۔

''تمہیں اپنی طاقت پر گھمنڈ تھا مگر دیکھو تمہاری طاقت نے تمہیں کس موڑ پر لاکھڑا کیا۔ سب کچھ تمہارے سامنے ہو رہا ہے اور تم کچھ بھی سمجھ نہیں سکتے۔'' اس نے دونوں بانہیں پھیلائے اسے چیلنج کیا تھا۔

''یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے۔'' اس بار اس کا لہجہ قدرے ترش تھا۔ کان کے پاس آکر سرگوشی کی گئی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ معجّل پلٹا تو ابدال باہر جاتا دکھائی دیا۔ دل نے چاہا کہ چیخ کر اسے روکے مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔ بس مبہوت اس کی پشت پر نظریں جمائے رکھیں اور جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے اشتعال بھرے انداز میں مٹھیاں بھینچی تھیں۔

''گوڈ ہیل......!'' جبڑے بھینچے اس نے انتہائی حقارت آمیز لہجے میں کہا تھا۔

''اب مجھے کوئی پرواہ نہیں تم کیا سلوک برتتے ہو...... لیکن یہ بات طے رہی کہ میں اب یہاں مزید نہیں رکوں گا۔ سمجھے مسٹر ابدال......!'' اس نے گمنام وجود کو اپنے سامنے تصور کرتے ہوئے چیلنج کیا تھا۔ خیالوں کی دنیا میں بھی وہ کیا سیرت کا مالک تھا؟ عکس بھی اس کا مسکرا رہا تھا۔ جس نے اریب کے غصے کو مزید ہوا دی۔ پانی کے لئے ایک برتن پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ اٹھا کر سامنے پھینکا تو عکس تو ہوا میں تحلیل ہو گیا مگر وہ برتن دیوار کے ساتھ لگے آئینے سے جا ٹکرایا۔ کرچیاں ہر سو بکھر گئیں اور انہی کرچیوں میں خود اس کی ذات بھی شامل ہو گئی۔

☆......☆......☆

جہانوں کے مالک زمانوں سے پردہ اٹھا دے

کہ دل ان دنوں بے نیاز بہار و خزاں ہے

وہ رات کافی گہری ثابت ہونے والی تھی۔ شاید اس رات سے بھی زیادہ گہری جب اریب کی گمشدگی کی خبر ملی تھی۔ جہانزیب ٹی وی لاؤنج میں خاموش بیٹھے تھے۔ آج ان کے ہاتھوں میں نہ ہی کوئی نیوز پیپر تھا اور نہ ہی کوئی آفس کی فائل بلکہ جب سے اریب کی گمشدگی کی خبر ملی تھی انہوں نے آفس کے کام کو ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ ہر وقت گھر میں موجود رہتے۔ حسام کا بھی یہی حال تھا۔ ایک وقت میں دو پریشانیاں تھیں۔ ایک طرف بھائی تھا تو دوسری طرف شریک حیات۔ چھوٹا بھائی پاس نہیں تھا اور جو پاس تھا اس کی حالت دن بدن بگڑ رہی تھی۔ صبا کی ڈیلیوری کے آخری ایام تھے۔ ڈاکٹرز نے پیچیدگیوں کے بارے میں قبل از وقت ہی آگاہ کر دیا تھا۔ حسام نے چاہا کہ وہ اس کو اسپتال ہی ایڈمٹ کروا دے تاکہ اچھے سے خیال رکھا جا سکے مگر وہ خود انکار کرتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ گھر میں اس کی زیادہ ضرورت ہے۔ گھر کا چھوٹا بیٹا گھر سے غائب ہے۔ حاعفہ تو پہلے ہی نڈھال ہے۔ سحر فاطمہ دن رات اس کی یاد میں آنسو بہاتی رہتی ہیں۔ جہانزیب اگرچہ خاموش ہیں مگر اندر سے کتنے ٹوٹے ہوئے ہیں؟ شاید کسی کو علم نہ تھا۔ حسام بھی بظاہر اس کو حوصلہ دیتے ہیں مگر ان کے اندر بھی ایک بھائی کا غم ہے۔

”تم سمجھنے کی کوشش کرو صبا، ڈاکٹر نے انہی دس دنوں کی تاریخ دی ہے۔“ وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

”سمجھنے کی آپ کوشش کریں حسام۔ دس دن...... آپ جانتے ہیں دس دن کتنے زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر میں یہاں آرام کروں گی تو پیچھے ماما جان اور بابا جان کا کون خیال رکھے گا۔ ہاں میں مانتی ہوں کہ میں کوئی کام نہیں کر سکتی لیکن دل کو اتنی تسلی تو ہوگی کہ میں اپنوں کے درمیان ہوں۔ ان کا غم کم نہیں کر سکتی تو کیا...... ان کے غم میں شریک تو ہو سکتی ہوں ناں؟ اگر میں یہاں ایک وارڈ میں پڑی رہوں گی تو مزید بیمار پڑ جاؤں گی۔ دن رات یہی سوچوں گی جانے گھر میں کیا ہو رہا ہوگا؟ ماما جان ٹھیک ہوگی بھی یا نہیں؟ حاعفہ نے کھانا کھایا بھی ہوگا یا نہیں؟ اریب کی کوئی خبر ملی بھی ہوگی یا نہیں؟ مجھے ان سب کی فکر ہے حسام۔ پلیز میری بات مانیں۔ ابھی اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کی بات رہنے دیں۔ وقت ہے۔ جب طبیعت زیادہ خراب ہوگی تو میں خود آپ سے کہہ دوں گی۔ مگر ابھی نہیں۔ پلیز......!“ وہ خاموش رہا مگر اس خاموشی میں بھی اس کی فکر چھپی ہوئی تھی۔

”بس بہت ہو گیا...... مجھ سے اب مزید انتظار نہیں ہوتا۔ اتنے دن گزر چکے ہیں مگر اریب کا کچھ پتا نہیں کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کن لوگوں میں ہے؟ پاکستان میں ہی ہے یا پھر دیناپا سار؟“ برجستہ حسام چلا اٹھا تھا۔ اس کے کرخت مگر فکرمندی والے لہجے سے سب چونکے تھے۔ جہانزیب کی نظریں بھی اس کی طرف گھومیں۔ سحر فاطمہ بھی کھڑی ہو چکی تھیں لیکن صبا بیٹھی رہی۔

”میں ابھی دیناپا سار جا رہا ہوں۔“ اس نے مختصر الفاظ میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ جس پر سب چونکے تھے۔ جہانزیب کو بھی ایک دھچکا

لگا تھا۔ تبھی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''تم کہیں نہیں جا رہے۔'' فی الفور انہوں نے بھی کرخت لہجے میں کہا تھا۔ آنکھوں میں درد تھا مگر لہجے میں سختی۔

''کیوں نہ جاؤں؟ میرا بھائی لاپتا ہے۔ وہ بھائی جو پہلی بار ہم سے اتنی دور گیا تھا۔ جسے اپنے پراؤں کی کچھ خبر نہیں۔ وہ بھائی لاپتا ہے۔ آپ تو بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں مگر میں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھ سے نہیں بیٹھا جاتا۔ مجھے اپنے بھائی کو ڈھونڈنے جانا ہے۔'' اس نے پہلی بار اریب کی خاطر جہانزیب سے اس لہجے میں بات کی تھی مگر ان کی نگاہوں میں رعب و دبدبہ ذرا بھی کم نہ ہوا تھا۔

''میں نے کہا ناں تم کہیں نہیں جا رہے۔ سنتا نہیں ہے تمہیں؟''

''کیوں بابا جان؟ کیوں نہیں جا سکتے حسام بھائی اریب کو ڈھونڈنے؟ آخر کیا غلط ہے اس میں؟ اریب جسے آپ نے اتنے لاڈ پیار میں پالا۔ آج اس کے یوں لاپتا ہو جانے پر آپ اس قدر بے خبر کیسے ہو گئے اس سے؟ کیا آپ کو اس کی ذرا بھی فکر نہیں ہے یا پھر؟'' اس بار جبیں نے حسام کی حمایت کی تھی۔ حاعفہ نے نگاہیں اٹھا کر جبیں کی طرف دیکھا تھا تو ایک بہن کا پیار نظر آیا۔

''جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔'' انہوں نے اپنی نگاہیں پھیر لیں۔ سحر فاطمہ بھی خاموش تھیں۔ پورے گھر کو جیسے ایک ماتم نے آگھیرا تھا۔ ہر شے کسی کے سوگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''اس کا مطلب آپ جانتے ہیں اریب کہاں ہیں؟'' حسام نے مشکوک لہجے میں استفسار کیا تھا۔ اس سوال پر ان کی آنکھیں بے یقینی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

''میں نے ایسا تو نہیں کہا؟'' وہ اب آنکھیں چرا رہے تھے۔ حاعفہ بھی حیرت سے کھڑی ہو چکی تھی۔ خشک آنسو بھی اب تھم چکے تھے۔ نگاہیں یک ٹک جہانزیب کے چہرے پر تھیں جہاں صاف صاف لکھا تھا کہ وہاں ایک راز مدفون ہے۔ وہ راز جو اب تک عیاں نہیں ہوا مگر آج اس کے عیاں ہونے کا وقت آ چکا تھا۔

''ایسا ہی ہے بابا جان۔'' حسام نے آگے بڑھ کر ان کو نرمی سے شانوں سے پکڑا اور دھیرے سے گھما کر چہرہ اپنی طرف کیا۔ نگاہیں ابھی تک چرائی جا رہی تھیں۔

''بتائیے بابا جان اریب کہاں ہے؟ آپ کو علم ہے ناں؟'' حسام نے ادبا گندھے ہوئے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''پلیز بابا جان! بتائیے ناں؟ دیکھیں کچھ مت چھپائیے ہم سب سے۔ ہم بھی تو اریب کے اپنے ہیں۔ ہمیں بھی اس کے بارے میں جاننے کا پورا حق ہے۔ بتائیے کہاں ہے وہ؟ ابھی تک کیوں نہیں لوٹا؟'' جبیں کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔

''تمہیں سنتا نہیں ایک بار......؟ مجھے نہیں معلوم۔'' انہوں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ حسام بھی صبر کا گھونٹ پی گیا۔ گہری سانس لی اور اپنے آپ کو مطمئن کرتے ہوئے قدم پیچھے کی جانب کھسکائے۔

''ٹھیک ہے۔ نہ بتائیں آپ ہمیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ ہم سے کچھ نہ کچھ چھپا ضرور رہے ہیں اور میں یہ معلوم کر کے ہی دم لوں گا اور اس کے لیے میں ابھی اسی وقت دبئی پاسار جارہا ہوں۔'' یہ کہنے کی دیر تھی کہ جہانزیب پلٹے اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کھینچا۔

''سنتا نہیں ہے؟ تم کہیں نہیں جارہے۔'' ان کی آنکھوں میں اس بار ہجر کا غم نمایاں تھا۔

''مگر کیوں؟ آپ کو اریب کی فکر نہیں ہے مگر مجھے تو ہے ناں؟ میں جارہا ہوں اپنے بھائی کو لینے۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔ شاید یہی وقت تھا سچائی کے سامنے آنے کا۔ جب انسان اپنے حواس میں نہ رہے تبھی آدھی سچائی زباں پر آ ہی جاتی ہے۔ جہانزیب کے ساتھ بھی یہی ہونے جارہا تھا۔ حسام کو دور جاتا دیکھ کر زبان خود بخود پھسل گئی۔

''تمہارے جانے سے وہ لوٹ کر نہیں آنے والا۔'' اس بات پر سب چونکے تھے۔ حسام کا چہرہ جو پھیرا جا چکا تھا یک دم پلٹا۔ جہانزیب کو بھی اپنے الفاظ پر افسوس ہوا۔ آنکھیں چراتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سحر فاطمہ کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے جیسے وہ بھی جانتی تھیں کہ سچائی کیا ہے۔ بس زبان سے جاری کرنا نہیں چاہتی تھیں۔

''کیوں نہیں لوٹ کر آئے گا؟'' حسام نے برجستہ سوال کیا مگر وہ خاموش رہے۔ بے چینی حد سے تجاوز کر گئی۔

''بتائیے بابا جان! آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اریب لوٹ کر نہیں آئے گا؟ بتائیے۔'' جبیں نے بھی گردن کو خم دیئے استفہامیہ نگاہیں ان پر مرکوز کی تھیں۔

''کیونکہ کوئی اپنوں کے پاس سے لوٹا نہیں ہے۔'' سب کے پاؤں تلے سے جیسے زمین ہی نکل چکی تھی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حاعفہ کی آنکھوں میں بھی آنسوؤں نے بسیرا کر لیا۔ ہر شے مبہم دیکھائی دے رہی تھی۔ سماعت میں یہی الفاظ کافی دیر تک گونجتے رہے۔

''کک کیا مطلب ہے آپ کا؟'' جبیں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں استفسار کیا تھا مگر وہ خاموش رہے۔ جیسے پوری حقیقت سامنے نہ لانا چاہتے ہوں مگر وہ بھی ان کی ہی اولاد تھی۔ سچائی کو جانے بغیر چین نہیں لے سکتی تھی۔

''بابا جان دیکھیں! ہم سے کچھ مت چھپائیں۔ اپنے بھائی کے بارے میں جاننے کا پورا حق ہے ہمیں۔'' حسام نے ایک بار پھر گندھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''نہیں ہے وہ تمہارا بھائی۔'' آسمان پھٹا نہ زمین پھٹی لیکن وجود کرچی کرچی ہو کر ہوا میں تحلیل ضرور ہوا تھا۔ روئی کے گالوں کی طرح ہر طرف بکھرتا جارہا تھا۔ شناخت ڈھونڈنے نکلو تو صدیاں بیت جائیں مگر روشنی کا ایک جگنو بھی میسر نہ آئے۔ ظلمت نے وجود کو ایسا نوچا کہ اندر تک روح سہم کر رہ گئی۔ آنکھوں کا پانی بھی پلکوں پر ٹھہر سا گیا۔ وہ وجود جو برسوں تک ان کے درمیان رہا۔ جس کے ساتھ صبح ہوتی اور شام گزرتی، آج پل بھر میں پرایا محسوس ہوا تھا۔ سماعت نے الفاظ تو سن لیے مگر دل تصدیق کی مہر لگانے سے قاصر رہا تھا۔ ماریہ جو اس وقت کچن میں کام کر رہی تھی۔ ہاتھوں سے کپوں سے بھری ٹرے زمین پر جا گری مگر وہاں پر موجود کسی شے نے اس گونج کو نہ سنا تھا۔ ذہن تو

جیسے ماؤف ہو چکا تھا۔

''کک کیا کہا آپ نے؟'' حسام ہکلایا تھا۔ جبیں کا وجود بھی لرز کر رہ گیا۔

''جو تم نے سنا...... نہ ہی وہ میرا بیٹا ہے اور نہ ہی تمہارا بھائی اور نہ ہی اس گھر کے کسی فرد سے اس کا کوئی تعلق۔ جن کا تھا وہ، ان کے پاس لوٹ چکا ہے۔'' کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے انہوں نے سچائی کو سب کے سامنے عیاں کیا تھا۔ اب چھپا کر بھی کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ وقت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ الجھی گرہ سلجھا دی جائے۔ ماضی کے بند دروازوں کو وا کرتے ہوئے حقیقت کو سامنے آنے کا موقع دیا جائے مگر اس دل کا کیا؟ جو برسوں تک اسے اپنا سمجھتا رہا...... ایک پل میں کیسے اس سے ناتا توڑ سکتا تھا۔ بھیگی پلکیں سچائی سے فرار ہونے کی کوشش میں سرگرداں دیکھائی دیں۔

''نن نہیں...... آپ یقیناً مذاق کر رہے ہیں ناں بابا جان؟ دیکھیے اگر یہ مذاق تھا تو مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ آئندہ یہ مذاق نہیں کیجیے گا۔'' جبیں نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

''سچائی کو جتنی جلدی قبول کر لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے میرے بچے۔'' انہوں نے پیار سے اس کے رخسار کو چھوا تھا۔ بے دردی سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ اسے اب اپنے آپ سے بھی کوفت ہو رہی تھی۔

''جھوٹ ہے یہ...... ذرا بھی صداقت نہیں ہے آپ کی بات میں۔ اریب میرا بھائی ہے۔ میرا بڑا بھائی۔ آپ مجھ سے میرا بھائی یہ سب کہہ کر نہیں چھین سکتے۔ میں جانتی ہوں، وہ میرا بھائی ہے۔ اگر آپ کو یہ بات بری لگتی ہے کہ میں اس کا نام لیتی ہوں تو وعدہ کرتی ہوں کبھی اس کا نام نہیں لوں گی۔ کبھی اس سے جھگڑا نہیں کرونگی۔ کبھی اس سے بدتمیزی نہیں کروں گی مگر کہہ دیں کہ یہ سب کچھ جو آپ نے ابھی ابھی کہا، جھوٹ تھا۔'' اس کے حواس منتشر ہو چکے تھے۔ وہ تصدیق چاہتے تھے مگر جہانزیب خاموش رہے۔ بے چینی بڑھتی چلی گئی۔ کرب میں مسلسل اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ سحر فاطمہ بھی خاموش تھیں۔ حسام ڈگمگاتے قدموں سے ان کی طرف بڑھا۔ اپنے نرم ہاتھوں سے ان کے شانوں کو پکڑا۔

''آپ ہی کچھ بولیں ماما جان...... بتائیں سب کو جو کچھ بھی بابا جان نے ابھی ابھی کہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اریب ہمارا بھائی ہے۔ آپ کا بیٹا ہے۔ اس گھر کا ایک فرد ہے۔ بتائیں سب کو۔'' سوال ختم نہیں ہو رہے تھے مگر لب خاموش تھے۔ آنکھوں کی بے یقینی اب غالب آ چکی تھی۔

''پلیز کچھ تو بتائیں آپ دونوں...... کیا سچ ہے کیا جھوٹ؟ آج آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اریب کا آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے، کل یہ کہیں گے کہ میرا اور جبیں کا بھی آپ سے کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر......!'' حسام کے اس جملے پر دونوں کی روح تڑپ اٹھی تھی۔ سحر فاطمہ نے نفی میں سر ہلایا تو جہانزیب نے مداخلت کی۔

''ایسا سوچنا بھی مت۔ سمجھے تم۔ تم اور جبیں تو ہماری جان ہو۔'' ان کا لہجہ حقیقت کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھا۔

"اور اریب؟" حسام نے ٹوٹے ہوئے وجود پر گہری ضرب لگائی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ خزاں رسیدہ پتے کی طرح صوفے پر گر چکے تھے۔ حسام آگے بڑھا۔ گہری سانس لی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔ کرب میں شدت ضرور آئی مگر وہ ضبط کر گیا۔ نرم لبوں سے ان ہاتھوں کو بوسا دیا جنہوں نے چلنا سکھایا تھا۔ جنہوں نے ہمیشہ اریب اور حسام کو ایک ہی طرح سہارا دیا تھا۔

"بابا جان...... آپ جانتے ہیں کہ بچپن سے آج تک ہمیشہ اریب کو مجھ پر ترجیح دی گئی۔ مجھ سے زیادہ اریب کا خیال رکھا گیا۔ میری خواہشوں کو پس پشت ڈال کر اس کی چھوٹی سی چھوٹی خواہش کو پورا کیا گیا۔ صرف میری ہی نہیں بلکہ جبیں کی خواہشوں پر بھی اریب کو ترجیح دی تھی آپ نے۔ اگر یہ بات میری ذات تک محدود رہتی تو شاید ٹھیک تھا۔ میں بڑا تھا ناں، شاید اس لئے مگر آپ نے جبیں کو بھی اتنا پیار نہیں دیا جتنا آپ دونوں اریب کو دیتے تھے۔ حالانکہ بیٹیاں پیار کی زیادہ مستحق ہوتی ہیں۔ آپ نے یہ اصول بھی پاش پاش کیا۔ اریب کو ہمیشہ فوقیت دی لیکن نہ ہی میں نے کچھ کہا اور نہ ہی جبیں نے اپنے حق میں آواز اٹھائی۔ آپ جانتے ہیں ایسا کیوں ہوا؟ کیونکہ اریب کو ہم اپنا سمجھتے تھے۔ اگر آپ اپنا پیار اس پر نچھاور کرتے تھے تو وہ بھی اپنی خوشی ہمارے ساتھ بانٹتا تھا۔ کھلونا آپ اس کو لا کر دیتے تھے مگر اس کا رپیر وہ مجھے کھولنے کے لئے دیتا اور معصوم سے لہجے میں کہتا، "بھائی اس کھلونے سے کیسے کھیلتے ہیں؟ مجھے کھیلنا سکھاؤ ناں۔" اور اس طرح اس کے کھیلنے سے پہلے نئے کھلونے سے میں کھیلا کرتا تھا۔ اس بات پر اس نے کبھی ناگواری محسوس نہیں کی۔ جبیں کی ہر وقت اریب سے نوک جھونک جاری رہتی تھی لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اس نے کبھی جبیں کا برا نہیں چاہا۔ دونوں ایک دوسرے کو خوب زچ کرتے تھے لیکن کبھی ایک دوسرے کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ آپ کو یاد ہے وہ دن جب ماما جان نے تنگ آ کر جبیں کو ڈانٹا تھا، جبیں روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی اور ہم سب بھی کمرے میں سونے کے لئے جا چکے تھے مگر اریب نہیں گیا تھا۔ رات بھر اس کے کمرے کے باہر کھڑا اسے مناتا رہا اور جب تک اس کے لبوں پر مسکراہٹ کو نہ لے آیا، اسے چین نہیں آیا تھا۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بابا جان۔ اریب نے ہمیشہ اپنی معصومیت سے ہمارے دلوں میں اپنی جگہ بنائی تھی۔ وہ نہ صرف ایک اچھا بھائی تھا بلکہ ایک اچھا دوست بھی تھا اور آج آپ کہہ رہے ہیں اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا چاہ کر بھی ممکن نہیں ہو سکتا بابا جان۔ اریب کا ہمیشہ سے ہمارے ساتھ ایک تعلق تھا اور ہے اور تا قیامت رہے گا اور یہ بات آپ بھی اچھے سے جانتے ہیں۔ جو رشتے دل سے جڑے ہوتے ہیں وہ کبھی ٹوٹتے نہیں ہیں اور ہمارا رشتہ تو دل کے ساتھ ساتھ خون سے بھی جڑا ہے پھر کیوں آپ ایسا کہہ رہے ہیں؟ بتائیں ناں بابا جان...... آپ نے کیوں اریب کو ہماری صف سے نکال باہر کیا؟ کیا اکیس سال کی رفاقت ایک سیکنڈ میں بھلائی جا سکتی ہے؟ اگر اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے تو میں اسے سمجھاؤں گا۔ دیکھنا وہ میری بات کبھی نہیں ٹالے گا۔ آپ سے خود معافی مانگے گا لیکن ایسے نہ کہیں کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے۔ کچھ تو بولیں بابا جان۔ پلیز، ایک بھائی کو بھائی سے دور مت کریں۔" گلوگیر لہجے نے اپنے من پر گزرنے والے کرب سے آگاہ کیا تھا۔ آنکھیں سب کی پرنم تھیں۔ ابر نیساں

بھی اپنے عروج پر تھا۔ جہانزیب کی آنکھوں کا پانی بھی حسام کے ہاتھوں کو مس کر چکا تھا۔ وہ لاکھ اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے مگر دل سے جڑا ایک دھاگا آج بھی انہیں اریب کے لیے تڑپنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پلکیں جھپکیں تو رخسار مزید تر ہو گئے۔

''پلیز بابا جان...... سچ بتائیں ہمیں۔'' اس نے اپنی پیشانی جہانزیب کے ہاتھوں پر جما دی تھی۔ ہچکیوں کی آواز سے لاؤنج گونج اٹھا تھا۔ سحر فاطمہ کا دل بھی اپنے بیٹے کو یوں تڑپتا نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ مجبور تھیں۔ ہاتھ بڑھا کر رہ گئیں۔

''سچ وہی ہے، جو تم نے سنا۔'' جہانزیب نے اپنے ہاتھ کو دھیرے سے کھسکایا تھا۔

''نہیں بابا جان...... سچ یہ نہیں ہے۔'' اس نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے سر اٹھایا تھا۔

''میں اریب تو نہیں ہوں اور نہ ہی اس جیسا کبھی بن سکتا ہوں لیکن بھائی ہونے کے ناتے اس کی طرح آپ کی پیشانی پڑھ سکتا ہوں۔ جہاں صاف صاف لکھا ہے کہ آپ نے جو کہا وہ آدھا سچ ہے۔ حقیقت کچھ اور ہے۔'' وہ صوفے کا سہارا لیتے ہوئے کھڑا ہوا تھا۔ آواز میں ابھی تک لرزہ طاری تھا۔

''تم کیوں سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ سچ یہی ہے، وہ تمہارا بھائی نہیں ہے۔ کوئی تعلق نہیں ہے اس کا ہمارے ساتھ۔ جن کے ساتھ تعلق تھا، ان کے پاس جا چکا ہے۔ وہاں سے کبھی واپس نہیں آئے گا۔'' وہ بے بسی کے ساتھ چلائے تھے مگر آنکھیں ابھی تک چرا رہے تھے۔

''جھوٹ ہے یہ سب۔ میں نہیں مانتی۔'' جبیں نے بھی جھلاتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک ہے مان لیا آپ نے جو کہا وہ سچ تھا۔ نہیں ہے وہ میرا بھائی۔ نہیں ہے اُس کا کوئی ہمارے ساتھ تعلق لیکن ایک بات کی وضاحت آپ کو بھی دینا ہوگی۔ کیوں آیا وہ اس گھر میں؟ کس تعلق سے ہمارے گھر میں اس نے اپنی زندگی کے اکیس سال گزارے؟ کس حیثیت سے وہ ہمارا پیار سمیٹتا رہا؟ بتائیں، کوئی جواب ہے آپ کے پاس ان سوالوں کا؟ اگر وہ ہمارے لیے اجنبی تھا تو اس اجنبی کا ہمارے ساتھ رہنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا تو کیوں رہتا رہا وہ ہمارے ساتھ؟ آخر کیا سبب تھا اس کا یہاں رہنے کا؟'' گندھا ہوا لہجہ یک دم حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا تبھی تمام تر جذبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔ جبیں کی بھی ایک لمحے کو سانسیں اٹک گئی تھیں۔ حاعفہ تو جیسے وہاں ایک مورت تھی۔ جو سن تو سکتی تھی مگر بول نہیں سکتی تھی۔ جس گھر میں اس کے شوہر کی حیثیت ہی تسلیم نہ کی جا رہی ہو وہاں بھلا اس کا وجود کیا اہمیت رکھ سکتا تھا؟ اگر پلکوں کے کنارے پرنم تھے تو دل بھی کسی سونامی میں بری طرح پھنسا ہوا تھا۔ آنکھیں سامنے دیکھ تو رہی تھیں مگر ہر شے مبہم سی تھی۔ ہر وجود ساکت تھا۔ ہر سانس پرخار راستے کی مانند زہریلے کانٹوں سے لیس تھی۔

''اس کے یہاں رہنے کا سبب تم تھے۔'' جہانزیب نے ایک نیا انکشاف کیا تھا۔ حسام تو اپنے پاؤں پر کھڑا ہی نہ رہ سکا۔ بے یقینی کے ساتھ اپنی ذات کی طرف انگلی کی۔

''میں؟'' آنکھوں میں شک و بے یقینی کا عنصر نمایاں تھا۔

''ہاں تم...... تم اس کے یہاں رہنے کا سبب تھے۔ تمہاری وجہ سے وہ اس گھر میں رہ رہا تھا۔ تمہاری وجہ سے اُس کا ہم سے ایک تعلق بنا تھا۔ تمہاری وجہ سے وہ ہمارے پیار کا مستحق ٹھہرا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید......!'' کرخت لہجہ برجستہ آبدیدہ ہو گیا۔ الفاظ کھو چکے تھے مگر سماعت کو یقین نہ آیا۔ آدھے الفاظ دل کو کاٹے جاتے تھے۔

''تو شاید کیا بابا جان؟'' وہ گردن کو خم دیئے نرم لہجے میں گویا ہوا تھا۔

''تو شاید تم اس وقت اپنے پاؤں پر کھڑے ہم سے سوال و جواب نہ کر رہے ہوتے۔ اگر تم ایسا کر رہے ہو تو اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ تم تو اس خون کا قرض چکا رہے ہو جو اس وقت تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔'' یہ الفاظ واقعی حسام پر بہت بھاری گزرے تھے۔ وہ دھڑام سے صوفے پر جا گرا تھا۔ جبیں کی سانسیں بھی اوپر کی اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ سماعت میں ہو کا عالم تھا۔ ہر شے مزید مبہم ہو گئی۔ سحر فاطمہ کے صبر کا دامن بھی ٹوٹ چکا تھا۔ لرزیدہ قدموں سے آگے بڑھیں اور حسام کے ساتھ آ بیٹھی تھیں۔ اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا مگر وہ اس لمس کو محسوس کرنے سے قاصر رہا تھا۔

''تمہارے بابا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں حسام، اگر آج تمہاری سانسیں رواں ہیں تو وہ اریب کی بدولت ہیں۔ خدا کے بعد تمہیں زندگی کی طرف لانے والا اریب ہے۔'' ان کی سانسیں بھی بری طرح اتھل پتھل ہو رہی تھیں مگر وہ سچائی سے ہمکنار تھیں۔ بے یقینی تو اس ذات میں بھی تھی جو ہاتھوں کو ہاتھوں میں بھینچے، سامنے دیکھ رہا تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ قالین پر گر رہے تھے۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟ میری سانسیں اریب کی بدولت رواں ہیں؟ میں اس کا مقروض ہوں؟'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''ہاں...... یہ سچ ہے۔'' سحر فاطمہ نے گندھے ہوئے تصدیق کی تھی۔

''مگر کیسے؟'' گردن کو خم دیتے ہوئے اس نے حیرانی سے استفسار کیا تھا۔ جبیں بھی مبہوت اسے دیکھتی رہی۔ یقین اسے بھی اپنی سماعت پر نہیں آ رہا تھا۔

''بتاتا ہوں۔'' جہانزیب نے گہرا سانس لیا اور دو قدم آگے بڑھ کر قدرے ٹھہرے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی پشت پر مرتکز تھیں۔

''یہ کہانی اُس وقت شروع ہوئی تھی جب تم چار سال کے تھے۔'' گیا وقت لوٹ آیا تھا۔ آنکھوں میں ماضی نے ایک بار پھر کسی فلم کی ریل کی طرح چلنا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے کئی مبہم عکس سامنے محو رقص ہوں اور سب انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔

☆......☆......☆

آج تو یوں خاموش ہے دنیا

جیسے کچھ ہونے والا ہے

ایک برا خواب اس نے دیکھا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ روشنی کے تمام دیے بجھائے جا چکے تھے اور وہ تن تنہا چلتا جا رہا تھا۔ ایک ایسی منزل سامنے تھی جو انجانی تھی مگر وہ ایک امید پر گامزن تھا کہ شاید جو آرزو اس کے دل میں ہے وہ پوری ہو جائے مگر ابھی وہ چند قدم ہی چل پایا تھا کہ ایک بڑا سا سایہ نمودار ہوا۔ ایسا سایہ جو اکثر اندھیرے میں روشنی کے یک دم ایک راستے پر جنم لینے سے نمودار ہوتا ہے، بالکل ویسا۔ اس کے قدم ٹھہر گئے۔ سایہ اس کا اپنا تھا۔ وہ اپنے قدموں سے اندازہ لگا سکتا تھا مگر روشنی وہ عین پیچھے سے آ رہی تھی۔ وہ حیرت سے پلٹا۔ روشنی کا ماخذ سامنے تھا۔ امیدوں کا گھوارہ کنارے تک لبالب مکمل ہو چکا تھا۔ پرنم آنکھیں اگرچہ تیز روشنی میں چندھیا چکی تھی مگر خوشبو......اسی کی تھی۔ وہ اسے پہچانتا تھا۔ جو روشنی کے عین سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو دروازے تھے۔ جو سیاہی میں نہائے معلوم ہوتے تھے۔ اُس پار کیا تھا؟ اسے کوئی سروکار نہ تھا۔ بس برسوں کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا تو مسافت بڑھتی چلی گئی۔ وہ جتنا اس ذات کے قریب جانے کی کوشش کرتا، فاصلہ اتنا ہی بڑھتا جاتا۔ وہ چل چل کر ہلکان ہو چکا تھا۔ پاؤں کے تلوے اب آرام چاہتے تھے۔ برسوں سے چلتے ہی تو آئے تھے۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ اب وہ تھک چکے تھے۔ آنکھیں پرنم تھیں۔ پسینہ ان پر آفتاب کی مانند چمک رہا تھا مگر وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنے جسم کو مشقت میں ڈال کر بس ایک بار اس ذات تک رسائی چاہتا تھا مگر فاصلے کم نہ ہوئے اور پھر اس نے ستانے کے لئے جیسے ہی گردن جھکائی چرچراہٹ کی آواز اس کے دل کو چیرنے لگی تھی۔ دروازے خود بخود بند ہوتے چلے گئے۔ اس کی سانسیں اٹکنے لگیں۔ وہ وجود جس تک رسائی اس کا حاصل تھا۔ اس سے دور چلا گیا۔ اتنی دور کہ واپسی شاید کبھی ممکن نہیں تھی۔

وہ دفعتہً اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پسینے میں جسم شرابور تھا۔ سانسیں بھی بری طرح اتھل پتھل ہو رہی تھیں جیسے میلوں کی مسافت پیدل چل کر طے کی ہو۔

''خدا کا شکر ہے! یہ سب ایک خواب تھا۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے دائیں جانب دیکھا تھا، رات کا ایک پہر گزر چکا تھا۔ سیاہی نے ہر شے کو اپنی چادر میں لپیٹا ہوا تھا۔

اسے پیاس محسوس ہوئی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر ساتھ ہی رکھے برتن سے پانی کا گلاس اٹھایا۔ پانی کے پہلے گھونٹ سے خشک گلا ابھی تر بھی نہ ہوا تھا کہ باہر سے ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ آواز اگرچہ مدہم تھی مگر رات کے سناٹے میں وہ گونج اٹھی تھی۔

''اس وقت کون ہو سکتا ہے؟'' اس نے منہ تک بڑھایا گیا پانی کا گلاس پیچھے کیا اور اپنے بستر سے اٹھ کر باہر کی طرف بڑھا۔ راہداری میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ دربان اگرچہ اس عمارت کے چاروں اور تھے مگر اندر اس وقت کوئی موجود نہ تھا۔ وہ سیدھا چلتا ہوا مرکزی ہال تک گیا تھا مگر اسے وہاں کوئی نظر نہ آیا۔

''عجیب بات ہے۔ آواز تو ادھر سے ہی آئی تھی۔'' اس نے اچھنبے لہجے میں خود سے استفسار کیا تھا۔

ادھر ادھر دیکھنے کے بعد جب تسلی ہوگئی کہ کوئی نہیں ہے۔ وہ واپس پلٹنے لگا تو آنکھیں برجستہ ہال کے درمیان میں جا ٹھہریں۔ وہاں کوئی شے موجود نہ تھی۔ بس روشنی تھی جس سے وسطی حصہ روشن دکھائی دیتا تھا۔ چاند کی روشنی کی مثل روشنی...... جیسے پریاں اتر آئی ہوں۔ چمکتی روشنی میں اسے کئی عکس نظر آئے تھے۔ ماضی کے بھنور میں پھنسے ہوئے عکس۔ ایک سفید جبے میں ملبوس عکس...... آنکھیں پرنم سی ہونے لگیں۔ ماضی واقعی درد سے بھرا تھا۔ پلکوں سے ایک قطرہ نہ چاہتے ہوئے بھی چھلک ہی چکا تھا۔

''کاش......!'' ایک حسرت اس کے دل میں بیدار ہوئی تھی مگر وہ اتنا کمزور نہ تھا کہ ماضی کو اپنے سامنے رکھ کر حالات سے منہ موڑ لیتا۔ وہ تو مستقبل دیکھتا تھا تبھی اتنی بڑی قربانی دی تھی۔ گردن کو دھیرے سے پھیر کر واپسی کی راہ لی۔ کئی آوازیں اس کی سماعت میں رس گھول رہی تھیں مگر وہ دھیرے دھیرے چلتا رہا۔ ایک خنکی نے اس کے جسم کو جکڑنا چاہا مگر اس نے بھرپور مقابلہ کیا تھا۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے اس نے اریب کے کمرے میں جا کر اسے ایک بار دیکھنا چاہا۔ قدم بھی اس خواہش کو بام عروج تک پہنچانے کی خاطر اس طرف گامزن ہو چکے تھے۔ وہ ابھی کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ اسے اریب کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا پایا۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ برق رفتاری سے آگے بڑھا اور کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے ایک زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اریب وہاں موجود ہی نہ تھا۔ کھڑکی کھلی تھی، رات کی ہوا اسی راستے اندر داخل ہو رہی تھیں۔ وہ فکرمندی کے ساتھ کھڑکی کی طرف بڑھا تھا۔

''اے خدا! یہ اریب کہاں چلا گیا؟'' لب پر خود بخود یہ کلمہ جاری ہوا تھا۔ گردن باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں باہر نکل آئیں۔ ایک عکس عمارت کی چھت پر کنارے کنارے چلتا دکھائی دے رہا تھا۔

''نہیں......'' گردن کو نفی میں ہلایا اور بھاگتا ہوا باہر آیا۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔ برف کی مانند یخ بستہ فرش کی اسے ذرا پرواہ نہ تھی۔ وہ بس بھاگتا جا رہا تھا۔ پرانے زمانے کی بنی سیڑھیاں جو بل کھاتی ہوئی اوپر جاتی تھیں۔ چکنے پتھر لگے ہونے کے باعث تیزی کے سبب پاؤں بار بار پھسل رہے تھے مگر وہ جتنی جلدی ہو سکے اوپر پہنچنا چاہتا تھا۔ کئی بار اس کا گھٹنا دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ درد کی لہر نے بھی جنم لیا تھا مگر وہ برداشت کر گیا۔ نیم مدہم روشنی میں وہ پتھروں کی بجائے بس اُس عکس کو عین کنارے پر چلتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

''نہیں اریب...... تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے چھت پر پہنچا تھا۔ عکس عین سامنے تھا، چھت کے عین کنارے پر جس کے آگے سوائے فضا کے کچھ نہ تھا۔ اوپر سیاہ آسمان جہاں چاند ستارے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور نیچے ایک گہری مسافت۔ بنجر زمین پر ہر سو پتھر ہی پتھر تھے، وہ انہی پتھروں پر چل کر واپسی کی راہ اختیار کرنے کی سوچ رہا تھا مگر واپسی کے لیے زندہ رہنا شرط تھا۔ اس نے زندگی کو داؤ پر لگایا تھا۔ ایک طرف اندھیرے میں ڈوبی ہوئی زندگی تھی تو دوسری طرف امید کی ایک کرن جس کے ایک کنارے پر اپنوں کا ساتھ تھا تو دوسری طرف موت کا کڑوا زہر۔ اسے کسی ایک کو تو چننا ہی تھا۔ اس نے اس کٹھن راہ پر چلنے کی ٹھانی تھی۔

''ارریب......!'' وہ آواز کو دبائے چیخا تھا۔ جانتا تھا رات کے اس پہر اونچی آواز دوسروں کو چوکنا کر سکتی تھی اور ایسا وہ قطعاً نہیں چاہتا تھا لیکن اسے بچانے کی خاطر ہر حد سے گزرنے کے لئے تیار تھا۔ آنکھوں میں پرواہ تھی تبھی پرنم ہو چکی تھیں۔

''بہت دیر ہو چکی ہے۔'' اس نے پلٹ کر دھیرے سے کہا تھا اور اپنا قدم اندھیر وادی سے باہر کی فضا کی طرف بڑھایا۔ ابدال کی تو جیسے جان ہی نکل چکی تھی۔ جتنی تیزی کے ساتھ بھاگ سکتا تھا، بھاگا اور ارریب کو پکڑ کر کھینچا۔ وہ اس کے سینے سے جا ٹکرایا تھا۔ سانسیں بری طرح اتھل پتھل تھیں۔ فکر و شکوہ دونوں ملے جلے تھے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ سموتا ہوا اس نے درد بھری جھاڑ پلائی تھی۔

''پاگل ہو گئے تھے کیا...... جانتے بھی ہو کیا کرنے جا رہے تھے؟ آئندہ ایسا کرنے کا سوچا بھی ناں تو اچھا نہیں ہوگا'' اس کا گندھا ہوا لہجہ فکر مند تھا۔ اسے اپنی بانہوں میں لے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا، جیسے اس کی جان کسی پر خطر راستے سے لوٹی ہو۔ ارریب کی نگاہیں پھٹی پھٹی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''چلو یہاں سے۔'' اس کا ہاتھ کھینچ کر واپس پلٹا مگر وہ تو اپنی جگہ پر جما رہا۔ ابدال حیرت سے پلٹا۔ اس کی استفہامیہ آنکھیں اسی طرف جمی ہوئی تھیں۔

''کیا ہوا؟'' ابدال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کون ہو تم؟'' ایک سوال اس کے لبوں سے جاری ہوا تھا۔ ہاتھوں سے ہاتھ چھوٹتا چلا گیا۔ ابدال نے فوراً نظریں چرا لیں۔ اپنے عمل پر تھوڑا سا پچھتاوا ہوا۔

''کک کیا مطلب؟'' پہلی بار اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔

''میں نے پوچھا کون ہو تم؟'' آنکھیں برجستہ سامنے دیکھ رہی تھیں۔

''تمہارا...... دشمن۔'' اس نے پہلی بار یہ الفاظ اپنی زبان سے جاری کیے تھے۔ آنکھیں ابھی تک ارریب کی مخالف سمت دیکھ رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے، دشمن ہو ناں تو تمہارا کام آسان کر دیتا ہوں۔ دشمن کا کام سامنے والے کو پچھاڑنا ہوتا ہے۔ میں اپنے آپ کو خود ہی پچھاڑے دیتا ہوں۔'' وہ واپس پلٹا اور اپنا قدم دوبارہ کھلی فضا میں رکھ کر موت کو گلے لگانا چاہا۔ ابدال کی تو جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ پلٹ کر اس کو کھینچا اور ایک زوردار طمانچہ مارا۔

''خبردار...... اگر آئندہ مرنے کی کوشش کی تو......!'' آنکھیں گھور رہی تھیں مگر ان میں درد کوئی بھی دیکھ سکتا تھا۔

''کیوں...... تم لگتے کیا ہو میرے؟ تمہاری بلا سے میں جیوں یا مروں۔'' اس نے جبڑے بھینچتے ہوئے کہا تھا۔

''سننا چاہتے ہو ناں میں کیا لگتا ہوں تمہارا؟ تو سنو...... تمہارا بھائی ہوں میں...... تمہارا بڑا بھائی۔ جو تمہیں مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا۔ سنا تمہیں۔'' اس کے کالر کو پکڑ کر جھنجوڑا گیا۔ ارریب کی تو آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ سانسیں بھی

پل بھر کے لیے تھم گئی۔ قدم پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ گردن نفی میں خود بخود متحرک تھی۔

"نہیں...... جھوٹ ہے یہ سب۔" وہ حقیقت سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نہیں اریب، یہ جھوٹ نہیں سچ ہے۔ میں تمہارا بھائی ہوں اور تم میرے بھائی۔ میرے چھوٹے بھائی۔ میرا بازو، میرا اریب۔" اس نے رندھے ہوئے لہجے میں اس کو چھونا چاہا تھا مگر وہ اس کے ہاتھ جھٹک کر پیچھے ہٹتا جا رہا تھا۔

"نہیں...... میرا صرف ایک بھائی ہے۔ وہ بھی حسام...... میرے حسام بھائی۔ میں صرف ان کا بازو ہوں۔ تمہارا نہیں، تم جھوٹے ہو۔ جھوٹے ہو۔ تم میرے بھائی نہیں ہو سکتے۔" وہ ابھی تک اس حقیقت کو سمجھ ہی نہ سکا تھا۔

"نہیں یہ جھوٹ نہیں ہے اریب، میرا یقین کرو۔ تمہارا اس حسام سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ حسام سے تو کیا، وہاں موجود کسی شخص سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تمہارا رشتہ ہے تو صرف مجھ سے۔ ہمارا خون ایک ہے۔ ہماری بنیاد ایک ہے۔" وہ اسے یقین دہانی کرانے کی اپنی تئیں کوشش کر رہا تھا مگر وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی۔" وہ بری طرح چلایا تھا۔

"یہ بکواس نہیں ہے، سمجھے تم...... تمہیں یقین نہیں آ رہا ناں، تو یہ دیکھو" اس نے بوکھلاتے ہوئے اپنی قمیض کو اتار کر پشت اریب کی طرف کی۔ اس کے شانے کے عین نیچے ایک نشان زخم تھا، جو واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ سفید رنگت پر نشان کسی چاند پر داغ کی مثل تھا۔ اریب کی آنکھیں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ کئی مبہم سے عکس لہرائے۔

وہ دوبارہ قمیض کو پہنتے ہوئے پلٹا تھا۔ آنکھوں میں یقین غالب تھا مگر ایک درد واضح تھا۔

"کیا یہ بھی جھوٹ تھا؟ بولو؟ کیا یہ نشان زخم جو تمہارے نام میرے جسم پر پیوست کیا گیا، کیا یہ بھی جھوٹ تھا؟ کیا وہ درد...... جو تمہاری حفاظت کی خاطر میں نے سہا، وہ بھی جھوٹ تھا؟ کیا وہ اکیس سال...... جو تم سے دور رہ کر میں نے گزارے، کیا وہ سب جھوٹ تھے؟ نہیں...... اریب نہیں، وہ جھوٹ نہیں سچ تھا۔" اس نے پہلی بار اریب کو پکڑ کر جھنجھوڑا تھا۔ وہ ہونقوں اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

"ایسے مت دیکھو اریب، حقیقت کو تسلیم کرو اور حقیقت یہی ہے کہ تم میرے بھائی ہو۔ ابدال عالمگیر کے بھائی...... اریب عالمگیر۔" ایک گہری ضرب اس کے سر پر لگی تھی۔ چوٹ بھی بہت گہری تھی مگر سچ یہی تھا۔ وہ عرصے بعد اس کی پیشانی پڑھنے میں کامیاب ہوا تھا۔ سچائی واضح ہو گئی۔

"بھائی......!" اس نے غیر یقینی لہجے میں کہا تھا۔ ابدال کے دل بے قرار کو جیسے قرار آ چکا تھا۔ وہ لفظ جو عرصے سے سننے کے لئے وہ ترستا رہا آج اریب کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ وہ ہکلاتے ہوئے گویا ہوا۔

"کیا کہا؟ پھر سے کہنا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''بھائی......!'' پلکیں پرنم تھیں۔ ہر مبہم چہرہ واضح ہو گیا۔ برسوں پہلے بچائے گئے وجود نے ایک بار پھر اس کو بچا لیا تھا۔

ابدال نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ ایک بھائی کی خوشبو کو جو ایک عرصے تک اس سے خفا رہی۔ اپنا ازلی دشمن سمجھنے والا وجود آج اس کے عین سامنے تھا۔ اس کے پاس تھا۔ اس کا بازو، اس کا بھائی......آج اپنی شناخت حاصل کر چکا تھا۔

اس کو سامنے کر کے اس کی پیشانی اور رخسار کو بوسہ دیا۔ دل بے قرار تھا۔ تبھی دوبارہ گلے سے لگایا تو اریب نے بھی بے یقینی سے اپنے ہاتھ ابدال کی پشت کی طرف بڑھائے تھے۔ یہ سب فریب نہ تھا۔ اتنی تو آشنائی حاصل کر ہی چکا تھا۔ کئی لمحے یونہی بیت گئے۔ جھوٹ کا ہر پردہ ہٹتا چلا گیا۔ سچائی بند قبا سے سامنے آ گئی۔

''اس کا مطلب یہ سب......؟ تو وہ سب کیا تھا؟ اکیس سال میں نے جن لوگوں میں گزارے کیا وہ سب سچ نہیں تھا......اور یہ سب......؟ میرا ذہن بوجھل ہو رہا ہے۔ مجھے پورا سچ جاننا ہے۔'' اس نے بے یقینی لہجے میں کہا تھا۔ ابدال کچھ دیر خاموش رہا۔ گہرا سانس لیتا ہوا پیچھے ہٹا۔

''اب سچائی چھپانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ تمہیں پورا حق ہے، اپنے بارے میں جاننے کا۔ چلو میرے ساتھ۔'' وہ اسے دوبارہ اریب کے کمرے میں لے آیا تھا۔ جہاں سے ماضی کی مسافت طے ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا

ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

وہ صبح عام صبحوں سے یکسر مختلف تھی۔ رات اگرچہ گہری سیاہ تھی۔ جہاں روشنی کی امید کرنا ہوا میں تیر چلانے کے مترادف تھا مگر پھر بھی سیٹیاوان کے سردار ایک گھر کی طرف امڈتے چلے جا رہے تھے۔ وہ گھر دیکھنے میں عام معلوم ہوتا تھا اور ابھی تک عام ہی تھا۔ کچی لکڑی سے بنا جھونپڑا نما گھر، جس کی چھت برسات کے دنوں میں ٹپ ٹپ ٹپکتی تھی۔ گرمیوں میں آگ برساتی تھی اور سردیوں میں دھند کے بادل اندر گھسے چلے جاتے تھے مگر اب وہاں کچھ ایسا خاص ہونے جا رہا تھا جو اس گھر کے رہنے والوں کی قسمت بدل سکتا تھا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ پادریوں کا سردار باہر کھڑا تھا۔ اندر کچھ عورتیں تھیں اور مردوں میں سے ایک مرد جس کی عمر بس پندرہ برس تھی۔ وہ بھی بری طرح سہم گیا۔ ایک عورت جو بستر سے لگی ہوئی تھی، اس کی سانسیں تو حلق کو آن پہنچی تھی۔

''لگتا ہے وہ آ گئے۔'' ایک سرگوشی ہوئی تھی۔ عورت اور لڑکا جن کا یہ گھر تھا، بری طرح سہم گئے۔ بیٹے نے ماں کا ہاتھ پکڑا تو ماں نے بھی اس کو اپنی چھاؤں میں لینا چاہا مگر درد اتنا شدید تھا کہ اُس سے اٹھا نہ گیا۔

''دروازہ کھولو۔'' بھاری بھر کم آواز فضا کو چیرتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''ابھی وہ اس دنیا میں نہیں آیا۔'' پاس بیٹھی ایک عورت میں سے ایک نے کہا تھا۔ آواز میں ایسی بے اعتنائی کے ماں کے کلیجے کو باہر آ جانا چاہیے تھا۔ کیا وہ عورت جو ایسی بے رخی برت رہی تھی، ماں نہیں تھی؟ کیا اس کی ممتا اپنے بچے کو آنکھوں کے سامنے رکھنے کی تڑپ سے انجان تھی؟

''میں تمہیں واسطہ دیتی ہوں...... میرے بچے کو مجھ سے جدا نہ کرو۔'' وہ ہاتھ جوڑے سب عورتوں سے بھیگ مانگ رہی تھی۔ آنسو جاری تھے۔

''ایسا ممکن نہیں ہے...... دیوتا کی ماں۔'' لہجے میں شائستگی برتی گئی تھی۔ وہ تڑپ اٹھی۔

''بند کرو مجھے دیوتا کی ماں کہنا...... میرا بچہ دیوتا نہیں ہے۔ وہ عام سا بچہ ہے۔ ایک عام انسان...... ایسی باتیں کہہ کر اس کی زندگی برباد مت کرو......'' وہ ہاتھ جوڑے ان کے سامنے منت سماجت کر رہی تھی۔ پاس کھڑا یہ بچہ ماں کو ایسے روتا دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے مگر بے بس وہ بھی تھا۔

روتے ہوئے اس عورت کی طبیعت ناساز گار ہوئی تو اس لڑکے کو باہر بھیج دیا گیا۔ وہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر ایک عورت زبردستی اسے باہر لے گئی۔ کچھ ہی دیر میں اندر سے کسی شیر خوار کے رونے کی آواز آئی۔ جس نے پورے گاؤں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ بادلوں نے بھی آسمان پر جھومنا شروع کیا اور مینہ نے ہر شے پر چھائی گرد کو دور کر ڈالا۔

''دیوتا آ چکا ہے۔'' سردار نے خوش ہو کر اعلان کیا تھا۔ لوگوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کی۔ گاؤں کے مرد اپنے دیوتا کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ اپنا کام دھندا چھوڑ کر وہاں جمع ہو گئے۔ بارش برستی رہی مگر کوئی وہاں سے ہلنے کو تیار نہ تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ وہ سب اندر داخل ہوئے۔ ایک ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر ایک عورت درد میں کراہ رہی تھی۔ اس کا پندرہ سالہ لڑکا سامنے کھڑا تھا جبکہ شیر خوار دائی کے ہاتھوں میں اپنے ہونے کا ثبوت دے رہا تھا۔ سردار نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو چوما اور اسے اپنی گود میں لیا۔

''اس گاؤں کے دیوتا کو ہمارا سلام...... جو اس گاؤں کی قسمت کو بدل کر رکھ دے گا۔ یہ دیوتا ہمیں دنیا میں ممتاز کرے گا۔ کوئی شے اس سے ڈھکی چھپی نہ ہو گی۔ زمین پر نگاہ دوڑائے گا تو زمین کے خزانے باہر آ نکلیں گے۔ چلے گا تو پانی کے چشمے ابلنے لگیں گے۔ ٹھہرے گا تو آسمان کے بادل بھی اس پر اپنا سایہ کریں گے۔ نہ آگ اس کے جسم کو جھلسائے گی اور نہ ہی سورج اس پر اپنا قہر نازل کر سکے گا۔ یہ دیوتا، اپنی طاقتوں میں ممتاز ہو گا۔'' وہ اس شیر خوار کو دیکھتے ہوئے کہتا جا رہا تھا۔ ماں نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

''ایسا مت کہیے آپ...... میرے بچے کو عام انسان سمجھیے...... وہ دیوتا نہیں ہے۔ اسے مجھے لٹا دیں۔'' وہ درد کو برداشت کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو بڑھائے ہوئے تھی۔ سردار کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ گھور کر اس کی طرف دیکھا گیا۔

''یہ آج سے تمہارا بیٹا نہیں ہے بلکہ کسی کا بیٹا نہیں ہے۔ یہ صرف دیوتا ہے اور دیوتا کی اصل جگہ عبادت گاہ ہے۔ جہاں صبح شام لوگ اس کی زیارت کریں گے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پلٹا تھا۔ ماں کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اپنے ننھے بچے کو جس کو ابھی جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا، اس سے دور لے جایا جا رہا تھا۔ سب عورتیں بھی کھڑی ہو چکی تھیں۔ جیسے انہیں بھی اس کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سب مطلب سے یہاں جمع تھیں۔

''میرے بچے کو لوٹا دیں...... میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' اس نے اٹھنے کی ناکام کوشش کی تھی کہ درد نے اس پر گہری ضرب لگائی۔ لڑکا اپنی ماں کو اس حالت میں دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

''ماں......!'' وہ اسے سہارا دے رہا تھا۔ لوگوں کی طرف حقارت بھری نگاہ دوڑائی مگر کوئی انہیں کسی خاطر میں نہ لایا اور سب ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے۔ ماں بلک بلک کر اپنا بچہ مانگ رہی تھی۔ تبھی اس کی حالت غیر ہونا شروع ہو گئی۔ لڑکا ماں کی حالت دیکھ کر گھبرا گیا۔

''ماں...... کیا ہو رہا ہے آپ کو؟ آپ ٹھیک ہیں ناں۔'' وہ کبھی اس کے سر پر ہاتھ رکھتا تو کبھی ہاتھوں کو رگڑ کر طبیعت سنبھالنے کی کوشش کرتا مگر سب بے سود تھا۔ آخری وقت قریب آ چکا تھا۔

''بیٹا! مجھ سے وعدہ کرو...... وعدہ کرو کہ اپنے بھائی کا ہمیشہ خیال رکھو گے۔ اسے اس جگہ سے بہت دور لے جاؤ گے۔'' وہ اکھڑتی سانسوں سے نصیحت کر رہی تھی۔ لڑکا سن رہا تھا مگر سمجھنے سے قاصر تھا۔ آنکھوں کے سامنے ماں کا تڑپتا ہوا وجود تھا۔

''تمہارا بھائی کوئی دیوتا نہیں ہے۔ وہ فقط عام انسان ہے اور تمہارا بھائی ہے۔ تمہیں اپنے بھائی کو توہم پرستی کی اس دنیا سے بہت دور لے جانا ہوگا۔ اتنی دور کہ کبھی اس کا سایہ بھی اس گاؤں میں پلٹ کر واپس نہ آئے۔ یہ لوگ برے نہیں ہیں مگر ان کی توہم پرستی انہیں انسانیت سے بھی گرا دے گی۔ وہ عام انسان کو دیوتا سمجھ بیٹھے ہیں اور اگر اُس نے بھی اپنے آپ کو دیوتا سمجھ لیا تو......؟'' ماں کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے۔ لڑکا نفی میں سر ہلاتا جا رہا تھا۔

''نہیں...... ماں...... آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں ابھی حکیم کو بلا کر لاتا ہوں۔'' وہ اٹھنے لگا تو ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی۔ تمہارے آنے تک یہ سانسیں چلیں نہ چلیں۔ میری بات سن لو......'' ماں کی اس بات پر لڑکا تڑپ اٹھا تھا۔ درد انتہا کا تھا مگر بانٹنے والا کوئی وجود نہ تھا۔ برستی بارش میں فقط ماں بیٹے اکیلے ایک دوسرے کے سانجھی تھے۔

''تم...... اُس کے بڑے بھائی ہو۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ بڑا بھائی باپ کی جگہ ہوتا ہے۔ آج سے تم نے ہی ایک باپ کا فرض نبھانا ہے۔ اس کی چھت بننا ہے اور اسے اس دنیا سے بہت دور لے جانا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ عام بچوں سے الگ ہوگا مگر اسے عام لوگوں میں ہی رہنا ہے۔ انسان جب تک انسان بن کر زندگی گزارتا ہے تو عروج پاتا ہے اور جب اپنے آپ کو خاص سمجھ بیٹھتا ہے تو سب

کچھ گنوا دیتا ہے۔ میں نہیں چاہتی میرا بیٹا دنیا میں اپنا سب کچھ گنوائے۔ تم وعدہ کرو۔ اپنے بھائی کو دنیا کے سامنے ذلیل ہونے نہیں دو گے۔ اسے یہاں سے دور...... بہت دور لے جاؤ گے۔" دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر ایک ماں نے اپنے بیٹے سے وعدہ مانگا تھا۔

"بولو بیٹا...... رکھو گے ناں اپنے بھائی کا خیال؟ وعدہ کرو۔" سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں اگلے جہاں کو سامنے دیکھ کر بے قرار ہو رہی تھیں مگر دل تھا کہ اپنے بیٹے کے لئے تڑپتا جا رہا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں ماں...... اپنے بھائی کا ہمیشہ خیال رکھوں گا۔" بس یہ سننا تھا کہ ماں کے دل کو قرار آ گیا۔ اپنے بیٹے کو اپنی بانہوں میں سمیٹے بغیر اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ ایک بھائی کے کندھے پر بھائی کی حفاظت کی ذمہ داری ڈال کر منوں مٹی تلے مدفون ہوگئی۔

"ماں......!" وہ چیخا تھا مگر چیخنا بے کار تھا۔ وہ سنبھلا۔ رونے دھونے کی بجائے اپنے عہد کو پورا کرنے کی ٹھانی۔ منصوبہ بنایا اور ایک رات اپنا حلیہ بدل کر عبادت خانے میں داخل ہوا۔ رات بھر لوگوں سے چھپ چھپا کر ایک جگہ بیٹھا رہا اور پھر رات کے آخری پہر اپنے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

وہ اپنے بھائی کو مرکزی عبادت خانے سے باہر بھی لے آیا اور ان سے دور لے جانے میں بھی کامیاب ہو ہی چلا تھا کہ اس سے بھول ہوگئی اور سب کو اپنے دیوتا کے غائب ہونے کی خبر ہوگئی۔ سب نے اس کا تعاقب کیا اور اس کو ڈھونڈ نکالا مگر وہ ایک جبے میں تھا پشت لوگوں کی طرف، ایسے میں وہ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے تھے۔ آگے کھائی تھی تو پیچھے لوگوں کا ایک ہجوم۔ سماعت میں ایک ماں کا عدہ گونجا تو اس نے موت کو گلے لگانے کی کوشش کی۔ پیچھے سے بھی نشتر برسایا گیا جس نے خواہش کو حقیقت میں بدل دیا۔ تیر عین شانے کے نیچے جا لگا۔ خوش قسمتی سے بچہ تو محفوظ رہا مگر اس کے جسم پر گہرا گھاؤ ثبت تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے اور وہ بچے سمیت کھائی میں جا گرا۔

جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو کنارے پر پایا۔ حواس منتشر تھے۔ وہ خود اپنی شناخت حاصل کرنے میں بھی ناکام تھا مگر سماعت میں ماں کے الفاظ گونجے تھے۔ وعدے نے اس کو اپنے آپ سے شناسائی حاصل کرنے میں مدد کی۔ وہ برق رفتاری سے اٹھا مگر درد نے اسے دوبارہ گرنے پر مجبور کر دیا۔ بغور دیکھا تو اپنے آپ کو دریا کے کنارے پر پایا۔

"میرا بھائی......! کہاں ہے وہ؟" وہ فکرمندی سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا تو ایک شاخ کے ساتھ جھولتے ہوئے اپنے ہی جبے کو پایا۔ جس میں اس کا بھائی تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرایا۔

"تم واقعی قسمت والے ہو میرے بھائی۔" وہ ڈگمگاتے ہوئے آگے بڑھا اور اپنے بھائی کو اس جبے سے نکالا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی لڑکے کو پیار آیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

پشت سے تیر خود بخود نکل چکا تھا مگر زخم بہت گہرا تھا۔ خون وقتاً فوقتاً نکلتا جا رہا تھا مگر اسے تو بہت دور نکل جانا تھا۔ تبھی وہ چلتا رہا۔ اپنے شانے پر کپڑے کو مضبوطی سے باندھا اور چلتا رہا۔ دن رات کی مسافت وہ پیدل طے کر رہا تھا۔

سورج نکلنے سے پہلے وہ ایک نئی دنیا میں تھا۔ بچپن سے آج تک اس نے گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا تھا مگر آج اس نے ایک نئی دنیا دیکھی تھی۔ ایسی دنیا جو اس کی دنیا سے یکسر مختلف تھی۔ چلتی پھرتی گاڑیاں...... شور مچاتے لوگ اور بلند و بالا عمارتیں۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ خون میں وہ کپڑا سرخ ہو چکا تھا۔ تبھی ایک ٹریفک وارڈن نے اس پر نگاہ دوڑائی اور اسے اسپتال پہنچا دیا گیا۔ بچے کا بھی علاج کیا گیا۔ اسے کچھ سردی لگی تھی۔ وہ پٹی کروا کر باہر ستانے کے لئے بیٹھا تھا کہ آواز سماعت سے ٹکرائی۔

"خدا کے لئے میرے بچے کو بچالیں...... میں بہت امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ دیکھیں میرے پاس اب واپسی کا بھی کرایہ نہیں ہے۔ اپنے بچے کی خاطر میں نے اس دیس کا سفر کیا ہے۔ پلیز میرے بچے کی زندگی کو بچالیں۔" ایک باپ ڈاکٹر کے آگے منت سماجت کر رہا تھا۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بے رخی اختیار کیے ہوئے تھا مگر کیا کرتا؟ وہ بھی بے بس تھا۔

"دیکھیں...... آپ سمجھنے کی کوشش کریں...... آپ کے بیٹے کا بچنا ناممکن ہے۔ اسے جس خون کی ضرورت ہے، وہ ہمارے پاس نہیں ہے اور پھر خون کے ساتھ ساتھ اسے پلیٹ لیٹس بھی چاہیے۔ کوئی ایک آدمی یہ دونوں چیزیں کیسے دے سکتا ہے؟ آئی ایم سوری۔ ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے۔ آپ نے آنے میں بہت دیر کر دی۔" یہ کہتے ہوئے وہ ڈاکٹر وہاں سے چل دیا جبکہ باپ تو جیسے زمین میں ہی گڑھ چکا تھا۔ وہ ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھا اور کرسی پر دھڑام سے بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ تب اسے احساس ہوا کہ دنیا میں وہ اکیلا غمگین نہیں ہے بلکہ غم تو ہزاروں ہیں۔ کہیں ایک ماں اپنے بچے کے لئے دم توڑ دیتی ہے تو کہیں ایک باپ اپنے بچے کے لئے دوسروں کے سامنے اپنی عزت نفس کو نیلام کر دیتا ہے۔

"اب کہاں جاؤں میں؟ اے خدا مدد کر!" اس شخص نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا جیسے حقیقت سے بھاگنے کی کوشش کی جا رہی ہو کہ آنکھ کھلے اور سب کچھ حسین ہو مگر افسوس زندگی میں ایسے معجزے نہیں ہوتے۔

"کیا ہوا؟ ایسا کیا ہو گیا آپ کے بیٹے کو؟" اُس لڑکے نے اپنا غم بھلا کر اس شخص سے پوچھا تھا۔

"میرا بیٹا اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ پاکستان سے یہاں انڈونیشیا اس آس پر آیا تھا کہ شاید میرے بچے کو نئی زندگی مل جائے۔ ڈاکٹروں نے بھی یہاں آنے سے پہلے مجھے ہر طرح کی تسلی دی تھی۔ اب جب اپنا سب کچھ بیچ کر یہاں آیا تو کہتے ہیں میرے بیٹے کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ پہلے کہتے تھے صرف خون چاہیے۔ جب خون دیا تو کہتے خون کے ساتھ ساتھ پلیٹ لیٹس بھی چاہیے۔ اب میں کہاں سے لاؤں اس شخص کو جس کی دونوں چیزیں میرے بیٹے سے میچ ہوں اور وہ میرے بچے کو بچالے۔ اگر اگلے چھ گھنٹوں میں اس کا ٹریٹمنٹ نہ کیا گیا تو وہ اس دنیا میں نہیں رہے گا۔" بڑی بڑی باتیں، اس کی سمجھ میں تو نہیں آئیں مگر اتنا ضرور پتا چلا کہ وہ بیمار ہے اور خون کی ضرورت ہے۔ اس نے بنا سوچے سمجھے اپنے خون کی آفر کر دی۔ اس باپ کی آنکھوں میں امید کی کرن نے جنم لیا مگر خود اس کا خون کافی بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا تو اس نے اپنی ضمانت خود لی۔

خون کا معائنہ کیا گیا تو ایک بار پھر مایوسی نے جنم لیا۔ وہ خون میچ نہیں کھاتا تھا لیکن ایک دوسری رپورٹ بھی اس کی رپورٹ کے ساتھ آئی تھی۔

"ڈاکٹر صاحب یہ رپورٹ حسام کی رپورٹ سے میچ کر رہی ہے۔" ڈاکٹر نے حیرت سے اس رپورٹ کو دیکھا تو وہ رپورٹ اس ننھے بچے کی تھی۔ لڑکا حیرت سے دیکھنے لگا۔

"تمہارا کیا تعلق ہے اس بچے سے؟" سوال پوچھا گیا تھا۔

"میرا بھائی ہے وہ۔"

"خدا کے لئے اپنے بھائی کا خون لینے کی اجازت دے دو...... میں ساری زندگی تمہارا ممنون رہوں گا۔" باپ نے فوراً منت سماجت کرنا شروع کر دی۔ ڈاکٹر کو غصہ آیا تھا۔

"مسٹر جہانزیب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ وہ خود بچہ ہے۔ اتنی سی عمر میں خون ڈونیٹ؟ آئی ایم سوری اِٹ از امپاسیبل۔" ڈاکٹر نے امید کی کرن کو بھی بجھا دیا تھا مگر جب خدا اپنے بندے کو بچانا چاہے تو راستے نکل ہی آیا کرتے ہیں۔

"آپ نے ابھی ابھی کہا کہ اگر میرے بھائی کا خون آپ کے بیٹے کو دے دیا جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا اور اس کے بدلے آپ میرے احسان مند رہیں گے۔" اس نے استفہامیہ انداز میں کہا تھا

"ہاں...... میں زندگی بھر اس احسان کو نہیں بھولوں گا۔" باپ نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"اور اگر میں اس احسان کو بدلا مانگوں تو؟"

"میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہارے اس احسان کو چکا سکوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اجازت دیتا ہوں۔" یہ سن کر جہانزیب کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے منع کیا مگر جب دونوں جگہ سے رضا مندی حاصل کر لی گئی تو وہ مجبور تھا۔ پیپر پر سائن کروا لیے گئے اور اس طرح ننھے سے وجود نے اپنی پہلی بہار دیکھنے سے پہلے ہی ایک زندگی کو بچا لیا تھا۔ حسام کی ماں اپنے بچے کو زندگی بخشنے والے پر واری جا رہی تھیں۔ سادہ طرز اپنائے ہوئے یہ چھوٹا سا خاندان اس لڑکے کا احسان مند تھا۔

"میں تمہارے اس احسان کا کیسے بدلہ اتاروں۔" جہانزیب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

"میرے بھائی کو اپنا بیٹا بنا کر۔" اس نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تھا۔ وہ دونوں ٹھٹک کر رہ گئے۔ انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

"کک کیا کہا؟ تمہارا بھائی...... ہمارا بیٹا؟" سحر فاطمہ نے تصدیق چاہی تھی۔

"ہاں...... اگر آپ میرے احسان کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں تو آپ میرے بھائی کو اپنا بیٹا بنا کر یہاں سے بہت دور چلے جائیں۔ جہاں سے آئے ہیں وہیں لوٹ جائیں۔" وہ اس کی بات پر حیران تھے اور فکر مند بھی۔ وہ ایک طرف اس کے مقروض تھے مگر دوسری طرف

ایک ڈر کھٹک رہا تھا۔

''دیکھو بیٹا! میں اس احسان کو چکانے کی پوری کوشش کروں گا مگر تمہارا بھائی...... ہمارا بیٹا...... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکے تھے تو اُس لڑکے نے اپنی آپ بیتی ان دونوں کے سامنے رکھ دی۔ سحر فاطمہ کی آنکھیں نمدیدہ دکھائی دیں۔

''دنیا میں آتے ہی تو ہم پرستی کا شکار بن گیا یہ ننھا بچہ؟'' سحر فاطمہ کی ممتا جیسے یہ سب سن کر آب آب ہو چکی تھی۔

''بس اسی لئے کہہ رہا ہوں بلکہ آپ لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر درخواست کر رہا ہوں۔ میرے بھائی کو اس دنیا سے بہت دور لے جائیں۔ اتنی دور کہ یہاں کے لوگوں کا سایہ بھی میرے بھائی پر نہ پڑے۔'' وہ گھٹنے کے بل بیٹھ کر اپنے بھائی کی زندگی بچانے کی استدعا کر رہا تھا۔

''نہیں بیٹا! ایسے مت کرو۔ ہم تمہاری پوری مدد کریں۔'' دونوں اس کے فیصلے پر رضامند دکھائی دیئے۔

وارڈ میں داخل ہوئے تو وہ ننھا فرشتہ مسکرا رہا تھا۔ بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔ اپنے بازو کو بانہوں میں لے کر آخری بار چوما تھا۔

''معاف کر دینا میرے بھائی، مجھے تجھ سے دور جانا پڑ رہا ہے مگر یہ سب تیری بھلائی کے لئے ہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو ایسے لوگوں میں پرورش پائے جہاں تجھے صبح شام دیوتا دیوتا پکارا جائے۔ تو اپنی زندگی جینے کی بجائے لوگوں کی زندگی جیے۔ ماں سچ کہتی تھی کوئی انسان دیوتا نہیں ہوتا۔ میرا بھائی بھی دیوتا نہیں ہے۔ وہ عام انسان ہے اور میرا بھائی ہے۔'' آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے تھے۔ بھائی کا پیار دیکھ کر سحر فاطمہ بھی پسیج کر رہ گئیں۔

لڑکے نے اپنا سرمایہ...... اپنا بھائی سحر فاطمہ کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس بچے کو ہاتھ میں لیتے ہی ایک عجیب سا احساس سحر فاطمہ کے جسم میں اتر چکا تھا۔ آنکھوں میں اشک ابھر آئے تھے۔ پیشانی کو بوسہ دیا تو دل میں خود بخود محبت امڈ آئی تھی۔ جیسے وہ بچہ خود اپنے آپ سے پیار کرنے پر مجبور کر رہا ہو۔

''اللہ کے خزانے بے شمار ہیں...... کیا خبر تھی کہ ہم اپنے ایک بیٹے کی خاطر اتنی قربانی دے رہے ہیں اور اس قربانی کے بدلے وہ ہمیں ایک اور بیٹے سے نوازے گا۔ آج سے میرے دو بیٹے ہیں۔ ایک حسام اور دوسرا اریب...... اریب جہانزیب۔'' انہوں نے خود ہی نام تجویز کیا تھا۔ جہانزیب کے چہرے پر بھی خوشی دیکھی جا سکتی تھی۔

''نہیں......!'' نام پر اس لڑکے نے احتجاج کیا۔

''اریب نام اچھا ہے مگر اس کا پورا نام اریب عالمگیر رکھے گا۔ میرا بھائی ہے وہ۔ ایک نام کی مماثلت تو ہونی ہی چاہیے ناں...... ہمارے ناموں میں۔ میں ابدال عالمگیر...... میرا بھائی اریب عالمگیر۔'' آنکھوں میں آنسو تھے۔ اثبات میں گردن ہلا دی گئی۔

"آج سے یہی اس کا نام ہوگا، اریب عالمگیر۔" جہانزیب نے بات پر مہر لگائی۔

"لیکن یاد رکھیے گا آپ...... یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ میرے بھائی کو اپنے ساتھ رکھنے میں کافی جتن کا سامنا کرنا پڑے گا آپ کو۔" اس نے آنے والے خطرات سے آگاہ کیا تھا۔

"ہمیں سب منظور ہے۔ اپنے بیٹے پر ایک آنچ بھی نہیں آنے دیں گے۔" جہانزیب نے پورے یقین سے کہا تھا۔

"مجھے خوشی ہے لیکن میں آپ پر اریب کو بوجھ کبھی نہیں بننے دونگا۔ میں یہاں رہ کر آپ لوگوں کی مدد کرتا رہوں گا۔ بس کچھ دن کی مہلت دیجیے مجھے۔"

"بچے کبھی والدین پر بوجھ نہیں ہوتے۔ جیسے حسام ہماری ذمہ داری ہے، ویسے ہی آج سے اریب بھی۔" جہانزیب نے کہا تھا۔

"مجھے خوشی ہوئی مگر یہ میری خواہش ہے۔ اپنے بھائی کے لئے کچھ کر سکوں۔" دونوں اس بات پر بھی رضامند ہو گئے۔ ابدال نے کئی باتوں سے پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا اور مزید ہدایات ائیر پورٹ تک جاتے ہوئے کی تھیں۔

"وہاں جا کر آپ کو سب سے پہلے اپنا نام تبدیل کرنا ہوگا۔ آج سے آپ فقط جہانزیب نہیں ہیں بلکہ جہانزیب عالمگیر ہیں اور یہ بیٹا آپ کا اپنا ہے۔ آپ کو اپنے خاندان میں بھی یہی مشہور کرنا ہوگا۔ اریب کا فقط ایک بھائی ہے وہ ہے حسام...... حسام کے علاوہ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے۔ میرا ذکر کبھی بھولے سے بھی اس کے سامنے نہیں کرنا۔" اس بات پر وہ دونوں بری طرح چونکے تھے۔

"مگر کیوں؟" سحر فاطمہ بول اٹھی تھیں۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اریب کو معلوم ہو کہ آپ لوگ اس کے اصل ماں باپ نہیں ہیں۔ ایسا ہوا تو وہ مجھ سے ملنے کی ضد کرے گا اور اس ضد میں کبھی وہ یہاں آ گیا تو......؟ یہاں آ گیا تو واپسی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ وہ تمام تر قربانیاں رائیگاں ہو جائیں گی جو میں نے اس کے لئے دی۔ بس اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ وہ پوری طرح آپ کا بیٹا بن کر زندگی گزارے۔" دل پر پتھر رکھ کر اس نے اپنے بھائی سے اس کی شناخت چھینی تھی۔

"انڈونیشیا میں آپ کا کوئی رشتے دار نہیں رہتا، اگر رہتا ہے تو آج سے ہی اس سے ملنا جلنا ترک کر دیجیے۔ اریب کو اس ملک کے بارے میں جتنی کم آگاہی ہو، اتنا ہی اچھا ہوگا۔ پاکستان میں بھی وہ آپ کی ذات سے وابستہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ وقت آپ اسے اپنی نظروں کے سامنے رکھیے گا۔ جب بڑا ہو جائے تب بھی اسے چھوٹا سا بچہ ہی سمجھیے گا۔ وہ کہاں جاتا ہے؟ کس سے ملتا ہے؟ ایک ایک بات پر نظر رکھیے گا۔ کبھی گھر سے باہر اکیلے مت جانے دینا کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں سے لوگ آگاہ ہوں۔ ماں نے پہلے کہہ دیا تھا کہ یہ عام انسان ہے مگر عام نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ماں کی بات کا مطلب کیا تھا؟ مگر آپ لوگ خیال رکھیے گا۔ اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔" وہ کہتا جا رہا تھا۔

''یقین رکھو ابدال...... ہم تمہارے اس بھروسے کو نہیں توڑیں گے۔ تم نے اور اریب نے جو احسان ہم پر کیا ہے۔ وہ ساری زندگی نہیں اتارا جا سکتا۔'' جہانزیب گویا ہوئے۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ جدائی کا وقت ہو چکا تھا۔

''الوالداع میرے بھائی......!'' اس نے آخری بار اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ سحر فاطمہ کا دل پگھلنے لگا۔

''کیا تم اپنے بھائی کے بغیر رہ لو گے؟'' ہر شے ساکت ہو گئی۔ فضا میں بھی ماتم تھا۔ وہ نہ ہی اثبات میں گردن ہلا سکا اور نہ ہی نفی میں۔ بس ساکت کھڑا رہا۔ پلکیں جھپکیں تو آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

جہانزیب حسام کا ہاتھ تھامے پلٹے تو سحر فاطمہ نے بھی اریب کو اپنے سینے سے لگا لیا اور آگے کو چل دیں۔ ابدال کا دل بری طرح جکڑنے لگا تھا مگر ایسا کرنا ضروری تھی۔ اپنوں کی خاطر کبھی کبھی خود کو بہت دور لے جانا پڑتا ہے۔ وہ بھی ایسا کر رہا تھا مگر اس بار وہ خود دور نہیں جا رہا تھا بلکہ اریب کو اپنے سے دور بھیج رہا تھا۔ اتنی دور کہ اس کی شکل بھی دیکھنا شاید دوبارہ دیکھنا مقدر نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اسے ڈھونڈا وہ کہیں بھی نہ ملا

وہ کہیں بھی نہیں یا ہے دل میں

''بس یہ تھی سچائی...... جو آج تک ہم دونوں کے سینے میں محفوظ تھی مگر اب تم بھی اس سے آگاہ ہو چکے ہو لیکن میرے بچو سچ یہی ہے اریب تمہارا اپنا نہیں ہے۔ اریب کا اس گھر پر بہت بڑا احسان ہے لیکن سچائی سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ وہ ابابیل تھا۔ جو اندھیر بستی میں پیدا ہوا مگر دل بدر کے متراف روشن تھا۔ اندھیرے میں زندگی بسر کی مگر روشنی کی جستجو اسے دوبارہ اندھیر وادیوں میں لے گئی یا شاید روشنیوں کے دیس میں......! وہ ابابیل اب اڑ چکا ہے۔ اندھیرے سے روشنی کی طرف ہجرت کرنے والے کبھی اندھیرے کی طرف پلٹتے نہیں ہیں۔ یہ سچ ہے ہم نے اسے اندھیرے میں رکھا مگر ہم مجبور تھے۔'' جہانزیب کا گندھا ہوا لہجہ ان کی بے گناہی ثابت کر رہا تھا۔ سب ہونقوں ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حسام اور جبیں کو تو ابھی تک یقین ہی نہیں آیا تھا۔ فضا میں عجب سی سرگوشی تھی۔ حاعفہ کے پاؤں تو جیسے فضا میں ہی معلق تھے۔ سر کے اوپر سے چھت ہی چھینی جا چکی تھی۔ جس شخص سے ساتھ نبھانے کے وعدے کیے تھے۔ اس کی شناخت، اس کی اپنی نہیں، وہ ایک فریب تھا؟ یا پھر یہ سب فریب ہے؟ وہ محبت...... وہ پیار...... وہ نکاح...... وہ پرواہ...... کیا سب کچھ ایک فریب تھا؟ جسے اپنا سب کچھ مانا سب ایک چھل نکلا۔ ایک فریب نکلا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جل تھل جاری تھی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' حسام خزاں رسیدہ پتے کی طرح صوفے پر آ گرا تھا۔ صبا کے جسم میں درد کی ایک لہر سرایت کر گئی مگر وہ لبوں کو بھینچے برداشت کیے ہوئے تھی۔

''اریب میرا بھائی...... میرا بازو...... نہیں ہے۔ جو اتنے برس ہم نے ساتھ گزارے، وہ سب سچ نہیں ہیں؟ کیسے مان لوں میں؟'' وہ بے یقینی سے کہتا جا رہا تھا۔

"آپ نے جو بھی کہا بابا جان...... وہ سچ ہے۔ ہمیں اپنے بابا جان پر پورا یقین ہے لیکن ایک سچ یہ بھی ہے کہ اریب ہمارا بھائی ہے اور اس سچائی کو کوئی نہیں بدل سکتا۔" جبیں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ حسام کی غیر یقینی نگاہ جبیں پر گئی۔ جو بچوں کی طرح اُس سے جھگڑتی تھی مگر اس سے رشتہ ٹوٹتے دیکھ کر کیسے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ واقعی سمجھدار تھی، رشتے نبھانا جانتی تھی اور یہی تو سکھایا تھا سحر فاطمہ نے اپنے بچوں کو۔ رشتے نبھانا، دور رہ کر بھی ایک دوسرے کا درد بانٹنا۔

"ابھی آپ نے کہا تھا حسام بھائی کے جسم میں اریب کا خون دوڑ رہا ہے تو کیسے اس کا ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے؟ خون کا رشتہ تو برسوں پہلے ہی جڑ چکا تھا اس کا ہمارے ساتھ۔ آپ بھول گئے کیا؟ ایک بار میں سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ گھر میں کوئی نہیں تھا فقط اریب تھا۔ وہ مجھے اسپتال لے کر گیا تھا۔ صرف تھوڑا سا خون بہا تھا میرا، لیکن اریب پر نا گوار گزرا۔ اس نے اپنا خون مجھے دیا تھا۔" جبیں نے ایک بار پھر ماضی پر دستک دی تھی۔

"اس دنیا میں آتے ہی اس نے بھائی جان کو خون دیا...... جب مجھے چوٹ لگی تو اپنا خون میری رگوں میں اتار دیا۔ اگر خون کا رشتہ ایسے نہیں جڑتا تو پھر کیسے جڑتا ہے؟ ہم دونوں بہن بھائی اپنے بھائی کے مقروض ہیں۔ وہ ہمارا بھائی ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس اٹل حقیقت کو کوئی جتنا بھی جھٹلائے، میں نہیں مانوں گی۔" وہ ہمیشہ سے ہی بضد واقع ہوئی تھی۔ آج بھی ضد کر رہی تھی۔ سحر فاطمہ کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے تھے۔ سمجھ نہ آیا کہ وہ اسے شاباشی دے یا پھر اس کے جھوٹے بھرم پر اسے سمجھائے کیونکہ حقیقت سامنے آنے پر اکثر پہاڑ بھی ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ جانے جب اریب کے سامنے ماضی کا یہ باب کھلے گا وہ کیسے ری ایکٹ کرے گا؟ کیا وہ تب بھی اپنے آپ کو ان کا بھائی تسلیم کرے گا؟

"آہ......!" بات ابھی جاری تھی کہ صبا کے لئے درد برداشت کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ حسام پلٹا تو اس کو کراہتے ہوئے دیکھا۔ سب اس کی طرف لپکے۔

"صبا...... تم ٹھیک تو ہو۔" اپنا ہاتھ اس کی پشت پر رکھ کر سہارا دیا۔ جبیں بھی جھک کر اس کو تسلیاں دے رہی تھیں۔

"بھابھی...... کیا ہوا آپ کو؟" فکر مند لہجہ گویا ہوا تھا۔

"بہت درد ہو رہا ہے حسام۔" وہ بمشکل بول پائی تھی۔ آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ ایک ساتھ ہی کئی غموں نے حملہ کیا تھا۔ اس کی حالت لمحہ بہ لمحہ غیر ہوتی جا رہی تھی۔

"میں ابھی ایمبولنس منگواتا ہوں۔" جہانزیب نے فوراً کال ملائی تو حسام نے بمشکل اس کو سہارا دیا مگر جب اس سے اٹھا نہ گیا تو اسے اپنی گود میں اٹھا لیا اور خود باہر کی طرف چل دیا۔ آنکھیں نمدیدہ بس دیکھتی رہ گئیں۔

☆......☆......☆

جسے ڈھونڈتا ہوں گلی گلی وہ ہے میرے جیسے ہی آدمی
مگر آدمی کے لباس میں وہ فرشتہ خو کوئی اور ہے

کہانی کا اصل دور تو تمہیں دور بھیجنے پر شروع ہوا تھا۔ میں کچھ دن تو شہر میں ہی رہا۔ وہاں کے حالات کو سمجھا، وقت کے تقاضوں کے ساتھ چلنے کی کوشش کی، تبھی میرا سامنا ایک بار پھر اپنے گاؤں کے سردار سے ہو گیا۔ اس شام میں بلا مقصد گھوم رہا تھا۔ جب وہ میرے سامنے آئے تھے۔ میں انہیں دیکھ کر کافی گھبرا گیا۔ سمجھا آج شاید میری زندگی کا آخری دن ہے۔ وہ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھیں گے اور پھر تم تک رسائی آسان ہو جائے گی مگر میرا وہم غلط ثابت ہوا۔

وہ مجھے وہاں دیکھ کر چونکے ضرور تھے مگر پوچھے گئے سوال میرے ذہن میں کھٹکتے سوالوں سے یکسر مختلف تھے۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں تو گاؤں میں ہونا چاہیے تھا۔'' ایسا سوال شاید انہوں نے اس لیے پوچھا تھا کہ انہوں نے میرا چہرہ تمہیں لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

''میں...... میں اپنے بھائی کو ڈھونڈنے آیا ہوں۔'' میں نے اپنی جان بچانے کی خاطر جھوٹ بولا تھا۔ ان کی بارعب نگاہیں چند لمحے مجھے گھورتی رہیں۔ میری تو سانسیں بری طرح اتھل پتھل ہو رہی تھیں۔ انہوں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے شانے پر رکھا تو میں سمجھا، بس اب گیا۔ جھوٹ پکڑا گیا۔

''صبر رکھو، مل جائے گا۔ ہم بھی اسے ہی ڈھونڈنے آئے ہیں۔'' انہوں نے حوصلہ دیا تھا۔ میں گردن جھکائے کھڑا رہا۔ اپنا غم ان پر آشکار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جانے انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کیا کہا تھا۔

''تمہیں اب واپس جانا چاہیے۔'' مجھے تلقین کی گئی۔ میں مزاحمت نہیں کر سکتا تھا، ایسا کرنا شک کو جنم دے سکتا تھا۔ میں ان کے ساتھ چل دیا مگر اصل حقیقت وہاں جا کر مجھ پر عیاں ہوئی۔

ان توہم پرستوں کو جب اپنا دیوتا نہ ملا تو انہوں نے مجھے اس مرتبے پر فائز کرنا چاہا۔ جب تک وہ تمہیں اس کرسی پر نہ بٹھا دیتے تب تک اس کی ذمہ داریاں تمہارا بھائی ہونے کے ناتے مجھے سونپ دی گئیں۔ میرے لیے یہ ایک بہت بڑا دھچکا تھا۔

''یہ میں...... میں کیسے؟'' میرے لب ہکلائے تھے مگر ان میں سے جو سب کا سردار تھا، جس کا حکم سب کے لئے ماننا فرض تھا۔ وہ آگے بڑھا۔

''ابدال...... آج سے تم اس گاؤں کے دیو خاص ہو۔ تم دیوتا کے بھائی ہو اور دیوتا کا بھائی دیوتا سمان ہوتا ہے۔ اس لیے جب تک دیوتا کی واپسی ممکن نہیں ہوتی، تم دیوتا کی جگہ رہو گے۔'' یہ الفاظ تو میرے لیے کسی پہاڑ سے کم نہ تھے۔ کہاں تمہیں اس دلدل سے باہر نکالنے کی تگ و دو کر رہا تھا اور کہاں اس دلدل میں خود ہی دھنس گیا مگر ایک خوشی تھی کہ تم بچ گئے کیونکہ اس دلدل کی تباہ کاریاں میرے سامنے

عیاں تھی۔ اسی لیے خود کو سنبھالنا آسان تھا مگر تم...... تم تو آنکھیں ہی اس دلدل میں کھولتے، ایسے میں تم ان سب فریب سے نہ بچ پاتے۔

دن گزرتے گئے، رات دن کے پیچھے اور دن رات کے پیچھے ایسے آ جا رہے تھے جیسے ایک دوسرے کے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہے ہوں۔ سب میرا کہا مانتے تھے مگر پھر بھی ایک ڈر تھا کہ کہیں ان پر یہ ظاہر نہ ہو جائے کہ اپنے بھائی کو ان سب سے دور لے جانے والا میں ہی ہوں۔ بس یہی ڈر مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کرتا رہا، جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔

انہوں نے ایک بار پھر ماہر نجوم کا سہارا لیا، جس نے تمہاری اس دنیا میں آنے کی پیش گوئی کی تھی۔ وہ دربار میں آ حاضر ہوا۔ میری تو سانسیں اتھل پتھل ہو رہی تھیں کہ کہیں اس نے میرے بارے میں سب کو آگاہ کر دیا تو؟ یہ سب تو مجھے یہیں زندہ جلا دیں گے، یا پھر زندہ درگور کر دیں گے۔ اپنی انگلیاں بھینچتے ہوئے لبوں پر بناوٹی مسکراہٹ کو جنم دیا۔

''چاہے جو بھی ہو جائے، میں اپنے بھائی تک کسی کو نہیں پہنچنے دونگا'' یہ میں عزم کر چکا تھا اور اس کے لیے پوری طرح تیار بھی تھا۔ اب یہ مجھے زندہ درگور کریں یا پھر زندہ جلائیں، مجھے پرواہ نہ تھی۔

''دیوتا یہاں سے بہت دور جا چکا ہے۔'' ماہر نجوم نے ضرب ایک نشانے پر لگائی تھی۔ میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کا پہلا جملہ ہی ٹھوس اور سچائی سے بھرپور تھا۔

''مطلب؟'' پادری نے پوچھا تھا۔

''دیوتا زندہ ہے...... مگر اس تک رسائی فی الحال ممکن نہیں۔ تم اس وقت دیوتا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ چھپانے والے نے اسے پردوں کی اوٹ میں چھپا دیا ہے۔'' یہ سنتے ہی سب کے چہرے پر سرخ دھاریاں نمودار ہوئی تھیں۔

''ناممکن...... ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اگر دیوتا کو زمین کی تہوں میں بھی چھپا کر رکھا ہو تو ہم اپنے دیوتا کو وہاں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے، تم جانتے ہو کہ دیوتا کا یہاں ہونا کتنا ضروری ہے۔'' جبڑے بھینچتے ہوئے اس کی سرزنش کی تھی۔

''میں جانتا ہوں لیکن گردش زمانہ نے اس تک پہنچنے والے تمام دروازے بند کر دیئے ہیں۔ شاید قسمت نے کچھ اور لکھا ہے۔'' اس نے بے بسی کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''تو تمہیں کس لئے بلایا گیا ہے؟ پڑھ کر بتاؤ، کب آئے گا دیوتا یہاں؟ کیسے ہم اسے واپس لا سکتے ہیں؟'' بارعب آواز نے پورے دربار کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں...... وہ خود یہاں چل کر آئے گا۔ اس وقت وہ دنیا کے چاہے جس کونے میں بھی ہو۔ اپنے پاؤں سے چل کر اسے یہاں آنا ہوگا۔ قسمت نے اس کی تقدیر میں یہاں آنا لکھ دیا ہے مگر......!'' اس کے پہلے جملے پر باقی جتنے خوش ہوئے تھے جملے کے آخر پر سب اتنی بری طرح چونکے تھے۔

''مگر کیا؟''

''وہ یہاں تو آئے گا مگر اپنی طاقتوں سے انجان ہوگا۔ وہ کیوں بھیجا گیا؟ اسے کچھ معلوم نہ ہوگا۔ طاقتیں تو ہونگی اس کے پاس مگر انہیں استعمال کرنا اسے نہیں آتا ہوگا۔''

''اس سے ہمیں فرق نہیں پڑتا...... بس ایک بار دیوتا واپس آجائے، ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس کے قدم ہی ہمارے لئے مبارک ثابت ہونگے دیکھنا تم۔'' پادری کا یقین میرے وجود کو کرچی کرچی کر گیا تھا۔ نجومی کی پیش گوئی نے تو میری نیندیں ہی برباد کر دی تھیں۔ تمہیں دور بھیج کر بھی میرا کام ختم نہیں ہوا تھا۔ اب تمہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دیس سے دور رکھنا بھی میرا فرض بن چکا تھا۔ ماں سے کیا گیا وعدہ ابھی تک ادھورا تھا اور اس وعدے کی تکمیل کا میرے پاس واحد طریقہ تھا۔ جو اگرچہ کٹھن تھا مگر اس پر چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

مجھے تمہارے لیے دیو خاص بن کر ان کے گاؤں کو چلانا پڑا۔ دیو خاص بن کر وہ اپنی ہر بات مجھے بتاتے تھے اس طرح یہ بات طے ہو چکی تھی کہ اگر تمہارے بارے میں کوئی خبر بھی ملے تو مجھ سے پوچھے بغیر وہ کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے اور ایسا ہوا بھی۔

ایک بار جہانزیب کسی کام سے انڈونیشیا آئے تو ماہر نجوم نے انہیں آگاہ کر دیا کہ جس کے پاس تم یعنی ان کا دیوتا ہے۔ وہ اس وقت شہر میں ہے۔ یہ سن کر سب کسی بے آب ماہی کی طرح تمہیں ڈھونڈنے نکل پڑے۔ وہ کسی بھی طرح جہانزیب تک پہنچ کر تم تک رسائی چاہتے تھے۔ میں یہیں گاؤں میں تھا اور شہر میں جہانزیب اپنے سر پر منڈلاتی مصیبت سے بے خبر تھے۔ مجھے جلد سے جلد انہیں آگاہ کرنا تھا میرے پاس رات کی تاریکی جتنا وقت تھا کیونکہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی مجھے سب اپنے حجرے سے نکل کر سب کے سامنے آنا تھا۔ چنانچہ رات کے پہر کا سہارا لیتے ہوئے شہر کی طرف چل دیا۔ وہ سب مجھ سے پہلے نکل چکے تھے مگر مجھے ان کے قیام کی جگہ معلوم تھی۔ اس لیے ایک آس تھی کہ میں اُن سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔ ایسا ہی ہوا۔

''آپ کو جتنی جلدی ہو سکے، یہاں سے چلے جانا چاہئے اور جب تک میں نہ کہوں، واپس مت آیئے گا۔ باقی کی بات میں فون پر سمجھا دونگا۔'' بس یہ جملے تھے جو میں نے ان سے کہے تھے۔ ان کے چہرے پر کئی سوال تھے۔ جن کا جواب جاننا ان کا حق تھا مگر وقت کی قلت تھی۔ وہ سمجھ گئے اور وہاں سے چل دیئے۔ میری جان میں جان آئی اور وہ سب نامراد لوٹ آئے تھے۔

''ابھی تو ایک موقع ہاتھ سے نکلا ہے مگر ہم اپنی آخری سانس تک دیوتا تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔'' ان کا یقین غالب تھا، میرے چہرے پر بظاہر پریشانی تھی مگر دل شاد تھا۔ ایک تمکنت تھی۔

''اور میں بھی اپنی آخری سانس تک اپنے بھائی کی حفاظت کرتا رہوں گا۔'' ایک بار پھر میں نے اپنے عزم کو سامنے رکھا تھا۔

اس وعدے کو میں پورا تو کر رہا تھا مگر دل...... وہ اندر ہی اندر سے تمہیں دیکھنے کے لیے مچلتا رہا۔ بس ایک بار اپنے بھائی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ تم سے بات کر کے سکون حاصل کرنا چاہتا تھا مگر سب کی موجودگی میں ایسا کرنا ناممکن تھا۔

ادھر دربان نے آگاہ کیا کہ شہر میں جو سونا بیچا جاتا ہے۔اس کی آمدنی کم ہوگئی ہے۔اگر ایسا ہی چلتا رہا تو دیوتا کے ملنے سے پہلے ہی یہ گاؤں صفحہ ہستی سے مٹ جائے گا۔یہ سن کر سب پریشان ہوگئے۔

اس گاؤں کا ذریعہ معاش ایک خاص قسم کی جڑی بوٹیاں تھیں۔جو بظاہر فصلوں کی مانند دیکھائی دیتی تھیں اور دیکھنے والا بھی انہیں کسی اجناس سے ہی تشبیہ دیتا تھا مگر حقیقت کچھ اور تھی۔یہ جڑی بوٹیاں پانچ سے چھے ماہ تک زمین کی خوبصورتی میں اضافہ کرتیں اور پھر انہیں کاٹ لیا جاتا تھا اور ان کی بالیوں سے دانے چنے جاتے تھے۔ان دانوں میں سے اچھی قسم کے دانوں کو علیحدہ کیا جاتا اور ادنی قسم کے دانوں کو جانوروں کے چارے کے طور پر استعمال کی جاتا۔جو اعلی قسم کے دانے علیحدہ کیے جاتے تھے،اصل میں وہی اس گاؤں کی قسمت تھے۔

ان دانوں کو چاند کی خاص تاریخوں میں آدھی رات کے بعد کھلے آسمان تلے ایک بڑے سے برتن میں ڈالا جاتا خوب بھونا جاتا اور جب وہ دانے پانی چھوڑنے لگتے اور ایک خاص قسم کی بو پیدا ہوتی تو پانی ڈال کر اسے جوش دیا جاتا،یہاں تک کہ پانی کا رنگ بدل جاتا،پھر اس میں کوئی ادنی قسم کی کوئی دھات ڈال دی جاتی تھی۔جیسا کہ لوہا وغیرہ۔پھر اس برتن کا منہ ڈھانپ دیا جاتا اور تین دن تک اسے کھولا نہ جاتا اور جب تین دن گزر جاتے تو برتن کا ڈھکن ہٹایا جاتا اور لوہے کی جگہ سونے کی دھات آنکھوں کے سامنے ہوتی تھی۔یہ سب اتفاق تھا یا پھر قدرت کا تحفہ؟ گاؤں والے تو اسے تم سے منسوب کرتے تھے۔منسوب کرتے بھی کیوں ناں؟ کیونکہ یہ دانا عام پانی سے پیدا نہیں ہوتا تھا۔اسے اگنے کے لیے بارش کا پانی درکار رہتا تھا۔اگر ایک قطرہ بھی دوسرا پانی شامل ہوجاتا تو ساری فصل بے کار ہوجاتی۔مال ضائع ہوجاتا۔محنت رائیگاں چلی جاتی مگر اس گاؤں سے بارش اکثر خفا ہی رہتی تھی۔اردگرد کے گاؤں میں خوب بارشیں ہوتی مگر یہاں خشک سالی کا دور رہتا۔جب آس پاس کے گاؤں سے پانی مانگا جاتا تو شروع میں دے دیتے مگر جب یہ راز عیاں ہوا تو انہوں نے گردن پھیر لی اور اندر ہی اندر سازشیں کرنے لگے۔

ایسے میں نجومی نے تمہارے آنے کی پیش گوئی کی اور بتایا کہ تمہارے آنے سے خشک سالی کا دور ختم ہوجائے گا۔بارش عین وقت پر ہونگی اور گاؤں ایک بار پھر ترقی کرے گا۔جب اس کی خبر ساتھ والے گاؤں کو ہوئی تو وہاں کا مکھیا یہ برداشت نہ کرسکا اور اس نے اس آنے والے بچے کو ہی مارنے کا منصوبہ بنانا شروع کردیا۔

سب اس بچے کے منتظر تھے۔تب تمہارے اس دنیا میں آنے کی خبر ملی اور تمہاری حفاظت سب نے مل کر کی کیونکہ ساتھ والے گاؤں کے لوگوں نے کئی بار ہم پر حملہ کرکے ہمیں نقصان پہنچانا چاہا مگر خدا کی قدرت......تم بحفاظت رہے۔

تمہارے دنیا میں آتے ہی بارش ہوئی تو لوگوں کا یقین تمہارے اوپر اور بڑھ گیا لیکن اب ایسا کچھ نہ تھا۔نہ بارش تھی اور نہ ہی سونا بناتی جڑی بوٹیاں......اور پھر لوگوں کی مکاریاں بھی کھل کر سامنے آنے لگیں۔میں اگرچہ ان سب کے عقائد سے بے نیاز تھا مگر تھے تو وہ میرے اپنے ہی۔آخر انہی لوگوں میں میں نے ایک وقت گزارا تھا۔ان کا درد مجھ سے دیکھا نہ گیا اور میں نے سارا سونا اپنی نگرانی میں میں

شہر لے جانے کا حکم جاری کیا۔ اس طرح کوئی بھی دیو خاص کو دھوکا دینے کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

میرا اپنی نگرانی میں سونا شہر لے جا کر بیچنا کافی سودمند ثابت ہوا۔ منافع پہلے سے کہیں زیادہ ہوا۔ اس طرح مجھے تمہاری کفالت کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجنا بھی آسان ہو گیا۔ میں اب باقاعدگی سے تمہارا خرچہ پاکستان بھیجنے لگا تھا۔ یہاں بھی ایک بزنس کی بنیاد رکھی تاکہ جو منافع ملے وہ آگے چل کر تمہارے کام آئے۔

وقت بدلتا رہا اور میرے لیے یہ بزنس سنبھالنا مشکل ہو گیا اسی لیے میں نے وہ سب کچھ جہانزیب صاحب کے حوالے کر دیا اور انہوں نے ایک بار پھر میرے بھروسے کا مان رکھا۔ اس بزنس کو ویسے سنبھالا، جیسا سنبھالنا چاہیے تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتے، میں ان سے تمہاری بابت دریافت کرتا۔ وہ تمہارے بارے میں بتاتے، کہ کیسے نظر آتے ہو، کیا کرتے ہو، کیسی باتیں کرتے ہو؟ سب کچھ۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ جنم لیتی اور ایک پل کے لئے ایسا لگتا جیسے تم میرے سامنے ہی ہو مگر وہ سب ایک حسین خیال تھا۔ ایسے میں میرا دل تمہاری آواز سننے کو کرتا تھا تاکہ اپنے بھائی کی آواز سے سماعت کی تشنگی بجھا سکوں۔ خود کچھ بول نہیں سکتا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں تمہاری آواز بھی نہیں سن سکتا۔

ایسے میں جہانزیب میری مدد کرتے تھے۔ جب جب تم اکیلے ہوتے، مجھے فون کر کے بتا دیتے۔ پھر میں تمہیں فون کرتا۔ تم جانتے ہو اریب جب پہلی بار میری سماعت سے تمہاری آواز ٹکرائی تھی تو مجھے کیسا محسوس ہوا تھا؟......شاید نہیں، جذبات کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ جذبات کی انتہا تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے مگر زبان پر خاموشی کی مہر ثبت تھی۔

"ہیلو......اریب عالمگیر از سپیکنگ ہیئر۔" تم بار بار انہی الفاظ کو دہرا رہے تھے اور میں اپنی آواز کو دبائے بس تمہیں سنتا جا رہا تھا۔ پھر میں نے خود ہی رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ میں تمہیں پریشان نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ پھر کافی عرصہ یونہی گزر گیا اور پھر دوبارہ تمہاری آواز سننے کو دل چاہا۔

ایسے میں یہ تسلسل جڑتا چلا گیا۔ دل مچلتا...... میں تمہیں فون کرتا اور تمہاری آواز سنتا...... تمہارے سوالوں کا جواب خاموشی سے دیتا۔

سترہ برس ایسے ہی بیت گئے۔ یہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے رہے اور میں ان لوگوں سے تمہیں چھپاتا رہا اور کبھی کبھار تمہیں فون کر لیتا تھا لیکن مجھے کیا خبر تھی میرا ایسا کرنا ہی تمہیں واپس لانے کا موجب بنے گا۔ اگر معلوم ہوتا تو کبھی تم سے رابطہ نہ کرتا۔ دل کو ایسے تیسے سمجھا لیتا مگر تمہیں واپس اس جہنم کی طرف نہ دھکیلتا۔

ایک بار جہانزیب نے مجھے تمہاری غیر معمولی صلاحیت کے بارے میں آگاہ کیا۔ تم لوگوں کی پیشانی پڑھ لیتے ہو۔ یہ سن کر میرے اندر ایک نئے ڈر نے جنم لیا کیونکہ اگر یہ خبر کسی بھی طرح پھیل گئی تو اِن لوگوں کا تم تک پہنچنا آسان ہو جائے گا۔ پھر میرے ہی کہنے پر انہوں نے تم پر پابندیاں لگانا شروع کی تھیں۔ تمہیں ہر وقت میرے ہی کہنے پر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ کبھی اکیلا نہ چھوڑتے تھے۔ تمہیں

فون نہ دیا۔ کبھی باہر اکیلا نہ جانے دیا جاتا۔ ایسے میں تمہاری طرف سے بغاوت کا بھی ڈر تھا مگر تم نے میرے اس ڈر کو غلط ثابت کر دیا۔ تم ایک اچھے بیٹے ثابت ہوئے اور اپنے والدین کی ہر بات پر عمل کرتے چلے تھے۔

اُس وقت مجھے ایک دھچکا لگا تھا جب تم نے پہلی بار جہانزیب سے موبائل لینے کی ضد کی تھی۔ جہانزیب نے یہاں آ کر مجھے آگاہ کر دیا تھا مگر ان دنوں میں اکیلا شہر نہیں آیا تھا۔ میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی تھے۔ ایسے میں میرا اُن سے ملنا کسی خطرے سے خالی نہ تھا مگر ملنا بھی ضروری تھا۔ ایسے میں بیچ کی راہ نکالی گئی تھی۔ میں نے ایک اینویلپ کا سہارا لیا۔ اس میں اپنا پیغام لکھ کر ان تک پہنچا دیا۔

''اریب کا خیال رکھیے گا۔'' میں تمہیں کسی قسم کی پریشانی میں نہیں دیکھ سکتا تھا تبھی تمہاری اس ضد کو پورا کرنے کی اجازت دے دی۔ واپسی پر انہوں نے تمہارے لیے ایک اچھا سا فون خریدا۔ مجھے یہ جان کر کافی خوشی ہوئی کہ تمہیں وہ گفٹ اچھا لگا۔ اب میرا تم سے رابطہ مزید آسان ہو گیا تھا۔ جہانزیب نے تمہارا نمبر مجھے سینڈ کر دیا۔ اب میں جب چاہتا تمہیں فون کر سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا مگر بھول چکا تھا کہ تمہارا ذہن میرے یوں بلینک فون پر نت نئے خیالات کو جنم دے گا۔

اسی دوران مجھے تمہاری پسند کے بارے میں بھی بتا دیا گیا تھا۔ تم حاعفہ کو پسند کرتے تھے، مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میرا بھائی، جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں، وہ اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ اُس کے دل میں کسی کی محبت گھر کرنے لگی تھی۔ مجھے اس رشتے پر کوئی اعتراض بھی نہ تھا مگر میں تمہاری یونیورسٹی لائف سے بھی بے خبر نہ تھا۔ وہاں پر مجھے ہانیہ کے بارے میں علم ہوا۔ تم دونوں میں کافی مقابلہ چلتا تھا۔ وہ تم سے آگے نکلنا چاہتی تھی اور تمہیں ہر مقام پر پچھاڑنا چاہتی تھی مگر تم بھی اریب تھے، میرے بھائی۔ کہاں باز آنے والے تھے؟ بنا کوئی چال چلے اسے مات دے دیتے۔ اس واقعے سے مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم زندگی کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو چکے ہو۔

حسام کی منگنی والی رات بھی میں نے تمہیں فون کیا تھا اور اس رات فون کرنے کے بعد میرے اندر جس قدر بے چینی اور بے قراری نے جنم لیا اتنا شاید کبھی نہ ہوئی ہو گی۔ نفرت میں کہے گئے تمہارے لفظوں نے میرے اندر تک ضرب لگائی تھی۔

''گو ٹو ہیل......!'' ایک بھائی کے بھائی کے لئے کہے گئے الفاظ یقیناً نامناسب تھے مگر یہ کہنے پر میں نے ہی تو مجبور کیا تھا تمہیں۔ میں کئی دن تک ڈسٹرب رہا تھا۔ گمان کیا تھا کہ میں جانے انجانے میں اپنے خلاف تمہارے اندر نفرت کو جنم دے رہا ہوں اور یہ خیال، بہت جلد درست بھی ثابت ہونے والا تھا۔

مجھے جہانزیب کے توسط سے خبر مل رہی تھی کہ تم انڈونیشیا کے بارے میں سوال بہت کرنے لگے ہو۔ یہاں بزنس کے علاوہ اور کوئی رشتے دار تو نہیں یا پھر کوئی دوست واحباب وغیرہ، مگر وہ تمہیں ٹال دیتے۔ ایسا اس لیے کرتے تھے کیونکہ وہ مجبور تھے۔ میں نے ہی انہیں تمہارے سامنے اپنے جذبات اور پیشانی کی لکیروں کو نارمل رکھنے کا کہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ تم دوسروں کی طرح اُن کی لکیریں بھی پڑھ کر بات کی گہرائی تک پہنچ جاؤ۔ وہ اس میں کافی حد تک کامیاب ہو چکے تھے۔ تم جہاں بھر کے انسانوں کو پڑھ لیتے مگر اُن کو پڑھنے سے

قاصر رہے جو میرے لیے باعث راحت بات تھی مگر ساتھ ساتھ وہ بات کھٹک رہی تھی کہ تم یہاں آنے سے پہلے اپنی طاقتوں سے بے خبر ہو گے۔ بس اسی کشمکش میں میں اُس دن دیپاسار میں عالمگیر انڈسٹری بھی آیا تھا۔ میٹنگ روم میں میٹنگ جاری تھی مگر مجھے اس سے لینا دینا نہیں تھا۔ مجھے تو کنٹرول روم جانا تھا۔ اپنے تمام تر ریکارڈ ڈیلیٹ کرنے جو میرا اس کمپنی سے جڑے ہونے کا ثبوت تھے۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے خلاف ثبوت بنا دیئے اور خود کو اس کمپنی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا تا کہ اگر تم اس کمپنی کی باریکیوں کو بھی جاننے کی کوشش کرو تو میرا نام تمہاری آنکھوں کے سامنے سے نہ گزرے۔

ایسے ہی کئی دن گزر گئے اور کئی دن تک تمہیں کال نہ کی مگر دل نے ایک بار پھر زبردست وار کیا تھا۔ تمہاری آواز سننے کے لئے ان کانوں نے بھی مجھ سے بے اعتنائی برت لی۔ کوئی مجھے کوئی کچھ کہتا تو یہ سننے کے لئے منع کر دیتے۔ انہیں تو بس تمہاری آواز سننی تھی۔ چاہے تمہاری کڑوے بول ہی کیوں نہ ہوں مگر انہیں تو تمہاری آواز سننا تھی۔ میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں کال ملائی تھی مگر اس بار جو کانوں میں آواز گونجی اس نے میرے جذبات کا خون کر دیا تھا۔ تم نے تو بس لفظ ادا کیے تھے۔

''آئی وِل کِل یُو (میں تمہیں مار ڈالوں گا)۔'' مگر میں نے دیکھا تھا اپنی آنکھوں کو اشک بہاتے۔ تمہارا غصے میں کال ڈسکنیکٹ کرنا میرے اندر تک روح کو گھائل کر گیا۔ تمہاری نفرت شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ میں خاموشی کا لبادہ توڑ نہیں سکتا تھا کہ تمہیں چیخ چیخ کر بتا سکوں کہ ایسے الفاظ مت استعمال کرو اپنے بھائی کے لئے۔ میں سب کچھ سہہ سکتا ہوں مگر تمہاری نفرت نہیں۔ اپنے اکلوتے بھائی کی نفرت سہنے کے قابل نہیں ہوں میں مگر سب بے سود رہا۔ مجھے اس نفرت کو سہنا تھا وہ بھی تمہارے لیے۔ تمہاری سلامتی کے لئے مجھے تمہاری نفرت کا زہر پینا تھا اور میں ایسا ہی کر رہا تھا۔

اگر یہ زہر بس میرے جذبات کا ہی قاتل رہتا تو ٹھیک تھا مگر اس نے میری روح کو بھی گھائل کر دیا اور اس وقت تو میرا سانس لینا بھی دشوار ہو چکا تھا جب مجھے معلوم ہوا کہ تم یہاں آنے کے لیے بضد ہو اور تم نے پہلی بار محض یہاں آنے کے لیے جہانزیب سے بدتمیزی کی ہے۔ یہ سن کر مجھے انتہائی دکھ ہوا کہ فقط ایک خواہش کی تکمیل کے لئے تم ان کے سامنے کھڑے ہو گئے جنہوں نے تمہاری پرورش کی۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا مگر میں جانتا تھا کہ تمہارا خون تمہیں ملامت ضرور کرے گا اور تم خود معافی مانگو گے اُن سے اور ایسا ہی ہوا۔ تمہیں اپنے کیے پر پچھتاوا تھا لیکن میرے اندر ایک ڈر بیٹھ چکا تھا۔ تم دوسری کوشش ضرور کرو گے اور مجھے اس کوشش کو ختم کرنا تھا مگر جانتا نہیں تھا کیسے؟

بہت سوچ و بچار کے بعد جہانزیب نے ایک مشورہ دیا تھا کہ دیپاسار سے جڑی ہر شے کو ہی ختم کر دیا جائے۔ میں اس جملے پر کافی چونکا تھا۔

''میرا مطلب ہے، اگر انڈونیشیا کا بزنس ہی پاکستان ٹرانسفر کر لیا جائے تو؟'' انہوں نے دانستہ اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی جبکہ میں ایک وقت تک سکتے میں رہا تھا۔

''ایسا کرنے سے اس کے یہاں آنے کی ہر امید ہی ختم ہو جائے گی اور شاید وہ کبھی یہاں آنے کے بارے میں بھی نہ سوچے۔'' ان کی بات میں دم تھا۔ تبھی نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ایک کڑوا گھونٹ پیا تھا۔

''ٹھیک ہے، اگر اریب کی سلامتی کے لیے صرف یہی ایک راستہ ہے تو یہی کیجیے آپ۔'' دل مضطر نے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا کیونکہ ایسے میں تمہیں دیکھنے کی آخری امید بھی ٹوٹ سکتی تھی۔

''لیکن اس کام میں وقت درکار ہے۔ کم و بیش تین سال تو لگیں گے۔'' اس جملے پر میں کافی چونکا تھا۔

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ بزنس کو ٹرانسفر کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ہم اگر یک دم بزنس ٹرانسفر کریں گے تو ہمارے کلائنٹ پر برا تاثر پڑ سکتا ہے۔ ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا اور سب سے بڑھ کر اریب پر بھی یہ بات عیاں نہیں ہونی چاہیے کہ ایسا صرف ہم اسے یہاں آنے سے روکنے کی خاطر کر رہے ہیں۔'' انہوں نے خود ہی بتایا تھا۔

''کتنا وقت درکار ہے؟''

''یہی کوئی تین سال لیکن بے فکر رہو تم، اریب کی پڑھائی مکمل ہونے میں ابھی تین سال باقی ہیں۔ پڑھائی مکمل ہونے سے پہلے ہم اسے کہیں جانے نہیں دیں گے۔ یہ وعدہ رہا۔'' انہوں نے ایک بار پھر وعدہ کیا تھا۔ میں خاموش رہا کیونکہ جانتا تھا وہ اپنا وعدہ کبھی جفا نہیں کریں گے۔

وہ ایسا ہی کر رہے تھے مگر ایک بار پھر تم بازی لے گئے۔ سب سے چھپ کر تم نے ایک نیا پلان بنایا اور اس پلان پر عمل کرنے کے لیے عکاس کا سہارا لیا۔ عکاس کو جواز بنا کر تم یہاں آنا چاہتے تھے اور یہ بات تم اچھے سے جانتے تھے وہ عکاس کو منع نہیں کر سکتے۔ مصلحتاً انہوں نے ہاں کر دی اور جب انہوں نے مجھے بتایا تو مجھ پر جیسے پہاڑ آن ٹوٹا تھا۔ میں اپنا ضبط بری طرح کھو چکا تھا اور زندگی میں پہلی بار کسی پر چلایا تھا۔

''یہ مت بھولیے مسٹر جہانزیب! اگر اریب یہاں آیا تو آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا کیونکہ اگر میں اریب کی خاطر دنیا جہاں کی آسائشیں آپ کے نام کر سکتا ہوں تو ان سب کو چھیننے کی طاقت بھی رکھتا ہوں۔'' پہلی بار میں نے انہیں اپنا احسان جتلایا تھا۔

''جو کرنا ہے کیجیے مگر اریب کو یہاں آنے سے روکیے۔ چاہیں تو عکاس کا پلان بھی کینسل کر دیں یہاں آنے کے لیے لیکن اریب یہاں کسی بھی قیمت پر نہیں آنا چاہیے۔ سمجھے آپ؟'' میں نے غصے میں رابطہ منقطع کر دیا اور ان کے ردِعمل کا منتظر رہا۔

ابھی چند گھڑیاں ہی بیتی تھیں کہ ان کا دوبارہ فون آیا۔

''بولیے!'' میرے اندر کا لاوا ابھی تک مشتعل تھا۔

''وہ وہاں نہیں آئے گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں حیران ہوا کہ اتنے سے وقت میں انہوں نے کیا کیا کہ وہ یہ

بات اتنے وثوق سے کہہ رہے تھے کہ تم اب نہیں آسکتے۔

کچھ دنوں بعد یہ بات خود ہی عیاں ہوگئی۔ انہوں نے اپنے سگے بیٹے کی شادی اسی ہفتے طے کردی۔ اپنے بیٹے کے سپنوں کو تم پر قربان کردیا۔ مجھے تب انتہائی شرمندگی ہوئی اور اپنے الفاظ پر دکھ ہوا۔

میں نے معافی مانگنا چاہی مگر انہوں نے اپنا بڑا پن دیکھایا۔

''نہیں......اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ تم نے تو اپنے بھائی کی زندگی بچانے کی خاطر یہ سب کیا۔ مجھے کوئی شکوہ نہیں ہے۔'' یہ سن کر میرے دل میں ان کی عزت مزید بڑھ گئی۔ اب میرے لیے وہ صرف تمہاری پرورش کرنے والے ہی نہیں تھے بلکہ تمہارے والدین تھے۔ جنہوں نے تمہیں جنم تو نہیں دیا مگر پرورش ضرور کی اور تمہیں وہ سب سیکھایا جو شاید ہم بھی نہیں سیکھا سکتے تھے۔

میں جانتا تھا کہ تم اس بار ٹوٹے ہو مگر بہت جلد سنبھل جاؤ گے اور ایک نئی تگ و دو شروع کرو گے اور ہوا بھی یہی۔ کچھ عرصے بعد میں نے جان بوجھ کر تمہیں بلینک کال دوبارہ کی تھی تا کہ تمہارے اندر کیا چل رہا ہے؟ اس کے بارے میں معلوم کیا جا سکے۔

میرا شک صحیح نکلا تھا۔ تم نے نیا راستہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ تمہارے خطابات نے مجھے اتنا چونکایا نہیں تھا جتنا تمہارے اس جملے نے چونکا دیا۔

''آپ کے پاس صرف دو منٹ ہیں بولنے کے لئے۔ اگر دو منٹ میں نہ بولے آپ تو یاد رکھیے میں آپ کا پتا لگانے و یپاسا رہا ہوں'' اس جملے نے واقعی میرے لبوں پر چپ کی مہر لگا دی تھی۔ میں ایک لمحے تک سکتے میں رہا مگر یہ پوچھ نہ سکا کہ تم کیا کرنے جا رہے ہو؟

اب مجھے یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ تم کون سا حربہ استعمال کرنے جا رہے ہو؟ مسٹر جہانزیب کو فون کیا مگر وہ لاعلم تھے۔ میں نے خود ہی تمہاری چال کے بارے میں جاننا شروع کیا۔

تمہارا صرف ایک دوست کامیش تھا اور اب وہی راستہ تھا۔ اسے کال کرنے کے بعد میں نے اسے پوری سچائی سے آگاہ کردیا تا کہ وہ اس سلسلے میں میری مدد کر سکے اور یہ سچائی میں نے ایسے ہی اس کے سامنے عیاں نہیں کی۔ اس کے بارے میں مکمل چھان بین کی تھی۔ وہ حقیقت میں تمہارا مخلص تھا۔ بس یہی سوچتے ہوئے اس کے سامنے اپنا اور تمہارا سچ رکھا اور اس نے بھی اپنی تیئں مدد کرنے کی حامی بھر لی۔

کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ اس کا فون آیا اور اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا تھا۔

''میں زیادہ تو نہیں جان سکا مگر اتنا پتا چلا ہے کہ وہ سٹوڈنٹ ایکسچینج پروگرام میں اپلائے کرنے کی کوشش کررہا ہے اور شاید اس کا نام آ بھی جائے گا کیونکہ اس نے جس یونیورسٹی میں اپلائے کیا ہے وہاں فقط چار لوگوں نے ہی اپلائے کیا ہے پاکستان سے جبکہ پاکستانی سٹوڈنٹس کی سیٹ پانچ ہیں۔'' یہ سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تم نے واقعی ایک زبردست چال چلی تھی۔ اب میرے پاس صرف چند گھڑیاں تھیں کہ تمہیں یہاں آنے سے روکا جا سکے۔ سب سے پہلے مجھے اس یونیورسٹی کا پتا معلوم کرتا تھا پھر وہاں سے تمہارا نام کیسے نکالا جائے، یہ سوچنا تھا۔

بلا آخر میں تمہیں یہاں آنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا لیکن اس سے پہلے کہ تمہیں اس بارے میں علم ہوتا تمہارے ذہن کو منتشر کرنا بھی ضروری تھا۔اسی غرض سے میں نے کامیش کے ذریعے تمہیں بلینک کال کروائی تھی۔ جو کافی کارآمد ثابت ہوئی۔ لیکن ایک بار پھر تم بازی لے گئے۔ میرے ہزار روکنے پر بھی تم نے یہاں آنے کی تمام تر تیاریاں کر ہی لی تھیں۔ جہانزیب نے جب مجھے بتایا کہ تمہارا یہاں یونیورسٹی میں نام آچکا ہے تو میں بری طرح ہار چکا تھا۔

اس بار تنگ ودو کا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں جان چکا تھا کہ تم اب یہاں آکر ہی دم لو گے تبھی میں نے اپنی سوچ کے زاویے کو بدلا اور جہانزیب کو تمہیں یہاں آنے کی اجازت دے دی مگر اس سے پہلے مجھے کئی انتظامات کرنے تھے۔

تمہارے لیے گرینڈ مراج ہاٹل کا سب سے خاص کمرہ بک کروایا تا کہ انجانے میں ہی صحیح تم اپنا مقام جان سکو۔ جو کچھ تمہارا ہے، تم اس کی اصل پہنچان سکو۔

پریشے، علوی سمیت تمام ہاٹل کو تمہاری نگرانی پر لگا دیا گیا۔ میں نے ہی انہیں تم پر نظر رکھنے کا کہا تھا اور وہ سب اپنی ڈیوٹی اچھے سے سرانجام بھی دے رہے تھے۔ مگر یہ سب ہاٹل کی حد تک ٹھیک تھا یونیورسٹی میں یہ سب تم پر نظر نہیں رکھ سکتے تھے ۔اس لئے مجھے وہاں کا بھی انتظام کرنا پڑا۔

ایشا اور کرسن، تمہیں یاد تو ہونگے۔ انہیں میں نے ہی بھیجا تھا۔ میرے کہنے پر ہی انہوں نے تمہارے ساتھ دوستی کی تھی تا کہ تم سے جڑی چھوٹی سی چھوٹی باتوں کو مجھ تک پہنچائیں اور سب سے بڑھ کر پردیس میں تم اپنوں کے پیار سے محروم نہ ہو جاؤ۔

اب تم یہاں آتو گئے تھے مگر یہاں سے بھیجنا بھی ضروری تھی۔ اس لیے تمہیں میں نے جان بوجھ کر ٹارچر کرنا شروع کیا تھا تا کہ تمہارا ذہن منتشر ہو جائے اور اپنے مقصد سے ہٹ کر تم یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ غیروں سے تکلیف پہنچے، اس سے بہتر تھا کہ تمہیں میں خود تکلیف پہنچاؤں۔ ایسا کرنے کو دل تو نہیں چاہا مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔

دیپا سار میں پہلی بار کال کر کے میں نے اپنے آپ کو تم پر آشکار کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم یہ جان کر حیران ہونگے کہ میں تمہارے بارے میں پوری طرح خبر رکھے ہوئے ہوں مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ تم ڈسٹرب تھے کہ میں چار دیواری میں تم پر کیسے نظر رکھے ہوئے ہوں تو یہ بات بھی آج عیاں کر دیتا ہوں میں اس وقت تمہارے سامنے کی بلڈنگ میں رہائش پذیر تھا اور دوربین سے تمہاری حرکات کو نوٹ کر رہا تھا۔

جب تمہارا میسج آیا کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو تو میں ذرا بھی حیران نہ ہوا کیونکہ مجھے تم سے یہی امید تھی لیکن کچھ وقت کے لئے اپنا فون آف ضرور کر دیا تا کہ تم فی الحال ٹینس میں رہو اور میں تمہیں یہاں سے بھیجنے کے بارے میں سوچ سکوں۔ تبھی ایشا اور کرسن کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ تم نے پوری دلجمعی کے ساتھ اسائنمنٹ بنائی ہے اور یہ اسائنمنٹ اس سمیسٹر کے لیے کتنی اہم ہے۔ تبھی میں نے اس

اسائنمنٹ کے ذریعے ایک اور چوٹ پہنچانا چاہی تھی لیکن اس کے لیے مجھے کچھ کرنا نہیں پڑا۔تم خود ہی اپنی اسائنمنٹ ہاٹل بھول گئے اور جب دوبارہ فون کیا تو میں نے ہی علوی سے کہہ کر تم سے جھوٹ بولنے کو کہا۔اب میں جانتا تھا کہ تم خود واپس ہاٹل ضرور جاؤ گے تبھی تمہارا پیچھا کیا لیکن تبھی وہ ہولناک حادثہ ہوا۔تمہارا سامنا یہاں کے آوارہ لڑکے سے ہوا۔تم بری طرح اس کے جال میں پھنس چکے تھے۔اب میں تماشابین بن کر یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔سامنے آنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن خدا کی کرنی ایسی ہوئی تم مجھے اپنا مسیحا سمجھ بیٹھے اور پل دو پل کی ملاقات ہی صحیح، مگر میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا تھا۔تمہیں پہلی بار چھوا تھا۔اپنے بھائی کا لمس ایک عرصے بعد محسوس کیا تھا۔وہی خوشبو......وہی معصومیت۔ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے میں اپنا ضبط کھو بیٹھوں گا مگر خدا نے مجھے ایسا کرنے سے بچا لیا۔تمہارے سامنے میں جذبات پر بند باندھے رہا مگر تمہارے جاتے ہی آنکھوں سے آنسو عیاں تھے۔تمہارے اپنے دیس میں تمہارے دشمن انتہا کے تھے اور تم بے خبر تھے۔

ہاٹل پہنچ کر تم سے فون پر بات ہوئی۔تمہارا لہجہ میرے دل کی کیفیت پر گراں تھا مگر میں مجبور تھا۔اپنے آپ کو مار کر تم سے سخت لہجے میں بات کرنے لگا مگر اس وقت میرے وجود کی کرچیاں بکھر گئیں جب تم نے اس لڑکے کو میری طرف منسوب کر دیا۔

''تم اتنی نیچ اور گھناؤنی سوچ کے مالک ہو یہ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا۔تم جانتے ہو، پہلے میں نے سوچا تھا کہ شاید میرا تمہارے ساتھ کوئی تعلق ہے مگر یہ حرکت کر کے تم نے میرے اس گمان کو بھی دور کر دیا۔تمہارا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔تم جیسے رزیل لوگوں سے ہم شریف زادوں کا کوئی تعلق نہیں۔''

یہ الفاظ مجھ پر پہاڑ ثابت ہوئے تھے کیونکہ میرا تعلق محض تم سے تھا۔میری دنیا تم سے شروع ہو کر تم پر ہی ختم ہوتی تھی۔تم مجھے ہیل پرسن کہتے یا پھر بلیک میلر مجھے اتنی تکلیف نہ پہنچتی، شاید رزیل کہنے پر بھی مجھے اتنا دکھ نہ پہنچا تھا مگر جب تم نے کہا کہ تمہارا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، اس وقت میرے تمام تر حوصلے جواب دے گئے۔میں اپنے آپ کو واقعی تم سے ایک مسافت پر محسوس کرنے لگا۔اپنے آپ کو تم سے انتہا کا دور پایا مگر ایک بار پھر وقت نے سچائی کو عیاں ہونے نہ دیا لیکن جانتا تھا تم اس واقعے کو لے کر کافی ڈسٹرب ہوئے ہو اسی لئے ایشا اور کرسن کو تمہارے ساتھ پیزا شاپ بھیجا تھا۔

وہاں پر وہ vegetarian pizza پیزا میں نے ہی آرڈر کیا تھا اور تمہارے عین پیچھے ہی چیئر پر براجمان تھا مگر تم نے وہاں بھی اپنی نفرت کا اظہار کیا اور اسے ڈسٹ بین کی نذر کر کے واقعی میں میرا دل توڑا تھا لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ تم اب اپنے آپ کو سنبھالنا سیکھ چکے ہو۔

ادھر میں تمہیں واپس بھیجنے کی تگ و دو کر رہا تھا ادھر پادریوں کو تمہارے یہاں آنے کی خبر ہو چکی تھی۔نجومیوں نے تمہاری بو سونگھ لی تھی۔وہ اب باقاعدہ تمہاری طرف بڑھنے لگے تھے اور پھر عین اسی وقت تمہارا میسج آیا تھا کہ تم آ رہے ہو۔میں کافی گھبرا گیا۔جانے اب تم

کیا کرنے والے تھے؟

ایشا اور کرسن کی کہانی کو میں نے جنم دینے کو کہا تھا۔ وہ اصل میں ایک دوسرے کے کزن بھی ہیں اور منگیتر بھی مگر تمہارے سامنے بالکل انجان رہتے تھے۔

محبت کی اس کہانی کو میں نے ایک نیا موڑ دیا تھا مگر تم اس سے بھی با آسانی نکل گئے اور نئی چال چلی۔ تم نے مجھے میسج کر کے اپنے اوپر آئی مصیبت سے آگاہ کیا تو میں نے فی الفور کرسن کو فون کر کے دریافت کیا۔ تم بخیر تھے تبھی مجھے سمجھ آ گئی کہ تم مجھے دیکھنے کی خاطر یہ سب ڈرامہ کر رہے ہو۔ جہانزیب سے تم نے یہاں کی انڈسٹری کا ایڈریس تو لے لیا مگر وہاں گئے نہیں۔ اس کا مطلب میں کافی حد تک پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔

وہ دن تو شاید اپنے تمام تر اثرات کے ساتھ گزر گیا مگر وہ دن میرے اندر ڈر کو مزید بٹھا گیا۔ تم پر جو حملہ ہوا، اس سے میرے حواس ہی بکھر چکے تھے۔ میں اِندر کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں، اُتنا ہی کم ہے۔ اس کی مہارت سے ہی تم زندہ بچ گئے تھے مگر میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ وہ حملہ کس نے کیا تھا مگر یہ سچ بھی بہت جلد عیاں ہونے جا رہا تھا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے تمہیں کسی محفوظ جگہ بھیجنا تھا اور وہ جگہ پاکستان کے سوا کون سی ہو سکتی تھی؟ میں نے ہی جہانزیب سے کہہ کر تمہیں پاکستان واپس بلوایا۔ اس دن تمہارا جنم دن بھی تھا مگر محض جنم دن کی خاطر تم وہاں زیادہ عرصہ نہیں رک سکتے تھے تبھی میں نے ہی تمہاری نسبت طے کرنے کا کہا تھا۔ حاعفہ ایک اچھی لڑکی ہے اور مجھے یقین تھا وہ زندگی کے ہر مقام پر تمہارا ساتھ دے گی اور سب سے بڑھ کر تم بھی اس سے محبت کرتے تھے۔

یہ شادی بھی تمہیں زیادہ عرصے تک پاکستان نہیں روک سکی اور تم ایک بار پھر اس دیس میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ کہانی کو ایک نیا موڑ دینے اور میں اس کے لیے اب بالکل تیار تھا۔

اسی اثنا میں مجھے خبر ہوئی تم ابدال کو ایک بزنس مین سمجھ بیٹھے ہو تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ کیوں نا اس گمان کو سچ ثابت کر دیا جائے تبھی اس دن تم ابدال کے آفس آئے تھے۔ دراصل وہ آفس میرا نہیں تھا۔ وہ تو میرا ایک دوست تھا بس بزنس کا نام مجھ پر رکھا گیا تھا اور تم خوش ہو رہے تھے کہ تم نے مجھے ڈھونڈ نکالا، وہ تمہاری خوش فہمی تھی۔ میں خود تمہارے سامنے آیا تھا تا کہ تمہیں نئی چال نہ چلنی پڑے اور سامنے سے آ کر میں تمہیں سمجھا سکوں مگر کہانی کو ایک نیا موڑ ملا اور وہ کچھ تمہارے ساتھ ہوا، جو میں نے وہم و گمان میں بھی نہ سوچا تھا۔

میرے کہنے پر ہی ایشا اور کرسن تمہیں لانگ ویک اینڈ پر باہر لے کر گئے تھے مگر مجھے کیا خبر تھی کہ تمہارے دشمن تمہارا پیچھا کر رہے ہیں۔ انہوں نے جب فون کر کے بتایا کہ تم نہیں مل رہے تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس وقت میں سیٹیا وان گاؤں میں ہی تھا۔ گاؤں کے لوگ وہیں جمع تھے یعنی ان میں سے کسی کو تم نہ ملے تھے تو آخر کس نے تم تک رسائی حاصل کر لی تھی؟

وہ وقت سوچنے کا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سب کچھ پڑے دھکیلا اور تمہاری تلاش میں نکلا۔ تبھی شہر میں میرا سامنا ایک گینگ

سے ہوا جو انسان سپلائی کرتا تھا۔ ان کے سرغنا نے اپنے ساتھیوں کو ایک لڑکے کو سمگل کرنے کا کہا تھا۔ میں سمجھ گیا وہ تم ہو کیونکہ جو انہوں نے حلیہ بتایا تھا وہ تم تھے۔ میرا دل چاہا ابھی ان کا گریبان پکڑ لوں اور پوچھوں ایسا کیوں کیا انہوں نے تمہارے ساتھ؟ مگر وہ وقت جوش سے نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا تھا۔ میں نے خاموشی سے ان کا پیچھا کیا۔ وقت کم تھا اور ٹاسک بہت سخت۔ میں نے نہ صرف تمہاری جان بچانی تھی بلکہ تمہیں اس دلدل میں کودنے سے بھی بچانا تھا جس میں تم دھنسنے والے تھے کیونکہ میں جانتا تھا تم بظاہر کتنے ہی بڑے ہو چکے ہو مگر دنیا کا سامنا نہیں کر سکتے کیونکہ ایک عرصے تک تم سب سے انجان رہے ہو۔

میں جب ان کے ٹھکانے تک پہنچا تب تک واقعی بہت دیر ہو چکی تھی۔ تمہارا حال بے حال تھا۔ تم غنودگی میں کراہ رہے تھے اور وہ درندے تمہارے ناخنوں کو ایسے نوچ رہے تھے جیسے کوئی شکاری نوچتا ہے۔ ان کا مقصد تمہیں اپاہج بنا کر اس دلدل سے نکلنے والے تمام تر دروازوں کو ہمیشہ کے لیے بند کر دینا تھا۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ اب انتظار کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ پولیس کو میں فون کر چکا تھا مگر ان کے آنے سے پہلے مجھے تمہیں بچانا تھا۔ وہ سیاہ حبشی گرم سلاخیں لے کر تمہاری آنکھوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"تمہاری اتنی ہمت؟" ایک وار پیچھے سے اس حبشی کے سر پر کیا گیا تھا۔ وہ وار واقعی جان دار تھا۔ اس حبشی کے ہاتھ سے سلاخیں نیچے جا گریں۔

"کون ہو تم؟" باقی تمام اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے جبکہ اریب زمین بوس ہو چکا تھا۔ آنکھیں ادھ کھلی تھیں مگر سامنے کا منظر دیکھنے سے عاری تھیں۔

"تمہارا دشمن۔" انتہائی حقارت سے جملہ کہا گیا۔ تمام ایک ساتھ اس پر حملہ آور ہوئے مگر وہ مقابلہ کرنا جانتا تھا۔ لاتوں اور گھونسوں کے بیچ سے اپنے بھائی کی طرف بڑھا اور جو درمیان میں آتا اس کو سمندر میں دے پھینکتا۔ ہر جگہ افراتفری کا عالم تھا۔ تبھی ایک سائرن سنائی دیا۔ وہ پولیس کا تھا۔

"پولیس آ چکی ہے۔" اس نے سوچا اور اریب کی طرف بڑھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ پاؤں خون میں رنگ چکے تھے۔ اس نے اریب کو اپنی گود میں لیا اور ہوش میں لانے کی کوشش کی تھی۔

"اریب...... میرے بھائی۔ ہوش میں آؤ۔ دیکھو ادھر۔" میں تمہارا چہرہ تھپتھپاتا رہا مگر تم نے آنکھیں نہ کھولیں۔ پولیس کے آدمی سب کو گرفتار کر رہے تھے۔ تبھی میں نے تمہیں وہاں سے لے کر جانے میں عافیت جانی کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات کسی پر عیاں ہو اور تمہیں اس گھر میں لے آیا جہاں سے اکثر میں تمہیں کال کیا کرتا تھا۔ جس گھر کو میں نے تمہارے نام منسوب کر دیا تھا۔

"اریب عالمگیر ہاؤس۔"

تمہارے جاگنے پر وہاں ابدال نہیں بلکہ عالمگیر تھا جسے تم اپنا مسیحا سمجھتے تھے۔ معمولی سی ڈاڑھی مونچھیں میری شخصیت کو ایک نئے

انداز میں تمہارے سامنے پیش کر رہی تھیں۔ایک ذات وہ تھی جسے تم انتہا کی نفرت کرتے تھے اور دوسری ذات کے تم انتہا کے احسان مند تھے اور اسے خوش قسمتی کہوں یا بدقسمتی، وہ دونوں ذات میرے اندر ہی موجود تھیں۔

خیر، تم اس واقعے کے بعد خود پاکستان چلے گئے مگر کچھ دن بعد ہی لوٹ آئے اور مجبوراً مجھے ایک بار پھر تمہارے سامنے آنا پڑا اور اپنا انتہائی بداخلاقی والا چہرہ دیکھانا پڑا مگر یقین جانو اریب وہ سب میں نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تھا۔میں جان چکا تھا کہ تمہاری ذات کے دشمن کون ہیں۔ایک طرف میرے گاؤں والے تمہیں دیوتا کی کرسی تک پہنچانے کے در پر تھے تو دوسری طرف اس گاؤں کے دشمن یہاں کے دیوتا کو دیوتا بننے سے پہلے پھانسی کے پھندے پر چڑھانا چاہتے تھے۔ہاں اریب! تمہیں اس دلدل میں پہنچانے والے نہ ہی اس گاؤں کے لوگ تھے اور نہ ہی میں بلکہ وہ تو تمہارے اور میرے دشمن تھے۔جو تمہاری طاقتوں کو تمہارے جاننے سے پہلے ختم کرنا چاہتے تھے اور ان سب کے پیچھے ان کا حسد تھا۔وہ جانتے تھے اگر تم یہاں آ گئے تو اس گاؤں والوں کی قسمت بدل جائے گی اور یہ گاؤں ترقی کرنے لگے گا اور ایسا وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے۔وہ یہاں کے لوگوں کو فاقوں مرتا دیکھنا چاہتے تھے۔تبھی بارش کی ایک بوند بھی یہاں آنے نہیں دیتے تھے۔

اُس دن کے بعد میں نے تم سے رابطہ نہیں کیا اور نہ ہی تم نے کوئی کال بیک یا میسج کیا۔ہاٹل سے بھی مجھے خبر ملی کہ تم چپ چپ رہنے لگے ہو۔مجھے تشویش ہوئی اور تمہیں کال کی تھی مگر تمہارا انداز پھیکا سا تھا۔تم وہ اریب نہیں تھے جو مجھ پر گرجتے تھے، مجھ سے نفرت کرتے تھے بلکہ تمہاری آواز میں کسی اپنے سے ملنے کی چاہ تھی۔ایک درد تھا جو تمہارے لہجے سے ٹپک رہا تھا مگر تم نے مجھ پر عیاں نہ ہونے دیا۔میں پریشان ہوا اور پاکستان کال کر کے وجہ دریافت کرنا چاہی تو انہوں نے بتایا کہ آج پہلی بار تم نے انہیں بلینک کال کی تھی۔میرا شک سچ ثابت ہوا۔تم واقعی کسی تکلیف میں تھے۔مگر کون سی؟ میں نہیں جانتا تھا۔میں نے تم سے ملنے کا پروگرام بنایا اور اسی وقت ہاٹل آن پہنچا مگر وہاں تم موجود نہ تھے۔کافی سوال و جواب کے بعد علوی نے بتایا کہ کچھ دن پہلے اُس نے تمہیں سر درد کا چیک اپ کروانے کا کہا تھا۔اُس دن کے بعد تم خاموش ہو۔میں کافی حیران ہوا۔یہ بات معمولی تھی مگر ہر درد معمولی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔مجھے اس بات کی تہہ تک پہنچنا تھا۔تبھی تمہارے تمام تر ریکارڈ چیک کیے تو معلوم ہوا تم اپنا آپریشن کروانے گئے ہو۔یہ سن کر مجھے دھچکا لگا۔بھلا ایک معمولی سے سر درد کے لئے آپریشن۔میں فوراً اس اسپتال کی طرف چل دیا۔

ابھی میں وارڈ میں داخل ہی ہوا تھا کہ تمہیں ایک بار پھر غنودگی میں پایا۔وارڈ بوائے تمہیں انجیکشن لگا چکا تھا۔میری سانسیں اکھڑ گئیں۔وہ وارڈ بوائے بھی مجھے وہاں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

''آپ......کون ہیں؟ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' وہ ہکلا رہا تھا اور اس کے ہکلانے سے صاف ظاہر تھا اس نے کوئی غلط کام کیا ہے۔میں نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان نوچ لیا اور کافی دیر بعد اس نے حقیقت عیاں کر ہی دی۔

اسے اور ڈاکٹر کو ایسا کرنے کے لئے پیسے دیئے گئے تھے۔

"اریب کو کوئی خطرناک بیماری نہیں ہے۔ بس معمولی سر درد تھا مگر انہوں نے رپورٹ تبدیل کرنے کو کہا اور اس آپریشن کا مقصد بھی اسے ذہنی طور پر ماؤف کر دینا تھا۔ اس کے بعد وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہتا" خدا کے فضل سے ابھی کچھ نہیں کیا تھا انہوں نے۔ صرف بے ہوشی کا انجیکشن دیا گیا تھا۔

یہ جان کر مجھے کچھ حوصلہ ملا مگر اس کی خبر میں تمہیں نہیں ہونے دے سکتا تھا تبھی تمہیں کچھ عرصے تک غنودگی میں ہی رکھا مگر اب وقت آچکا تھا کہ تمہیں یہاں سے بھیجنے کا مکمل انتظام کیا جائے کیونکہ اب وہ دوسری بار تم پر حملہ کر چکے تھے، نہیں دوسری نہیں بلکہ تیسری بار۔ تمہارے ہوش میں آتے ہی تمہارے سامنے عالمگیر تھا مگر اس کی پیشانی پر منافقانہ شکنیں۔ میں جانتا تھا تم ابھی نہیں تو کچھ وقت بعد ہی سہی اس بارے میں لازماً سوچو گے۔ میں نے جان بوجھ کر تمہارے دل میں عالمگیر کے خلاف شک پیدا کیا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ محبت کا پیکر مجسم دھوکہ برداشت نہیں کر سکتا۔ جو محبت بانٹنے کا عادی ہو دھوکہ دہی پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور تمہاری سلامتی کے لیے تمہارا ٹوٹنا لازمی امر تھا۔ اب تمہیں توڑنا میرا مقصد تھا۔ تا کہ تم اپنے آپ کو جوڑنے پاکستان کی راہ اختیار کرو۔

تمہارے دل میں نہ صرف عالمگیر کے لیے شک نے جنم لیا تھا بلکہ تم پریشے، علوی اور اِندر پر بھی شک کرنے لگے تھے اور ساتھ ساتھ کرسن اور ایشا پر بھی اور یہی تو میں چاہتا تھا۔ تمہیں ہر طرف سے دھوکہ ملے، درد ملے۔ تبھی میں نے وہ پزل بھیجا مگر تم اسے نہ سلجھا سکے اور تم سونے جا رہے تھے تبھی میں نے ہی فون کر کے تمہیں یاد کروایا تھا کیونکہ اس رات تمہارا پزل سلجھانا ضروری تھا۔ وہ رات تمہاری آخری رات تھی پردیس میں۔ میں ٹکٹ کا انتظام پہلے ہی کر چکا تھا۔

سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا میں نے چاہا تھا۔ تم نے پزل سلجھایا اور تمہیں بری طرح مات ہوئی۔ تم نے اپنے بابا جان کا بزنس اپنے سامنے راکھ ہوتا دیکھا مگر یہ سب ضروری تھی۔ بڑے نقصان سے بچنے کی خاطر کبھی کبھی چھوٹا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ تمہاری جان کے بدلے مجھے یہ مال قربان کرنا پڑا۔ مجھے اس پر کوئی پچھتاوا بھی نہ تھا۔ ہر شے راکھ کا ڈھیر تھی اور میں تمہارے سامنے کٹھور بنے کھڑا تھا۔ تم پوری طرح باہر سے ٹوٹے ہوئے تھے اور میں اندر سے۔ تم ابھی ابھی کرسن اور ایشا کو مجھ سے بات کرتا سن کر آئے تھے۔ وہ سب بھی جان بوجھ کر کیا گیا تھا تا کہ ایشا اور کرسن کا باب تمہاری زندگی سے ختم کیا جا سکے۔

یہ آخری وار تھا جو اُس نے تمہارے اوپر کیا تھا۔ تم یہ تو جانتے ہو اُس دن میں نے تمہارے اوپر بندوق تانی تھی مگر یہ نہیں جانتے کیوں؟ تمہارے پیچھے ایک پے کلر کھڑا تھا۔ اس کا نشانہ تم تھے، خوش قسمتی سے میری نظر وقت پر اُس پر پڑ گئی اور اس کے گولی چلانے سے پہلے میری بندوق کی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ تم سمجھے کہ میرا نشانہ خطا ہوا اور تمہاری جان بچ گئی مگر حقیقت یہ نہیں تھی۔ ایک بھائی کبھی اپنے بھائی کی جان نہیں لے سکتا۔ میں تمہاری خاطر اپنی جان تو دے سکتا ہوں مگر تم پر ایک خراش تک نہیں آنے دے سکتا۔

اس بار تم سب کچھ چھوڑ کر پاکستان چلے گئے اور میں خوش تھا مگر آنکھوں میں آنسو۔ تمہیں اپنے سے اتنا دور بھیج چکا تھا کہ اب

واپسی کبھی ممکن نہ تھی۔ میں جیت کر بھی ہار چکا تھا اور تم ہار کر بھی جیت چکے تھے۔تمہارا مقصد مجھے پچھاڑنا تھا اور تم نے مجھے پچھاڑ دیا تھا۔ میرے جذبات کا خون کر دیا تھا مگر مجھے شکوہ نہ تھا۔ایسا ضروری تھا۔

جب میں نے جہانزیب سے فون کر کے تمہاری سلامتی کی خبر لینا چاہی تو میرے سر پر جیسے آسمان آگرا تھا۔ بقول ان کے تم ابھی تک وہاں پہنچے ہی نہ تھے۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ تم انڈونیشیا ہو مگر یہاں سے رخصت ہوئے تمہیں ایک وقت ہو چکا تھا۔ میں ایک بار پھر اسی پوائنٹ پر آکھڑا ہوا جہاں سے کہانی شروع ہوئی تھی یعنی تم اسی دلدل میں واپس پلٹ آئے تھے۔ یہاں کے آدمی تمہیں پہچان چکے تھے اور پاکستان سے یہاں واپس لانے میں انہی کا ہاتھ تھا۔

☆......☆......☆

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا

یونہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ اس نے اپنی آپ بیتی سنائی تھی۔ اریب کی آنکھیں بھی اشک بار تھیں۔ ابدال کی پشت اریب کی طرف جبکہ اریب کی نگاہیں اس زخم کی طرف جو اس کی خاطر برسوں پہلے اس نے برداشت کیا تھا۔ بلکتے ہوئے ہونٹ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر جذبات کی شدت اتنی تھی کہ ایک لفظ بھی زباں بے کراں سے جاری نہ ہوا۔

وہ ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھا۔ کپکپاتے ہاتھوں کو ابدال کے شانے کی طرف بڑھایا۔ وہ بھی اپنے آنسوؤں پر بند باندھے ہوئے تھا۔ دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی نے اس زخم کو ہلکا سا مس کیا تھا۔

"بہت درد سہنا پڑا ناں آپ کو میری خاطر؟" بمشکل الفاظ ادا کیے گئے تھے۔ وہ دفعتۃً پلٹا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے رخسار کو اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"مجھے معاف کر دو بھائی۔" بلکتے ہونٹوں نے کہا تھا۔ سماعت لفظ بھائی کی چاشنی کو سمیٹ رہے تھے۔ جذبات نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ عرصے بعد بھائی بھائی کی شناخت حاصل کر چکا تھا۔ قسمت نے انہیں لاکھ جدا کرنا چاہا مگر تدبیر نے انہیں آخر ملا ہی دیا تھا۔

"میں بہت برا ہوں بھائی...... جو آپ کو غلط سمجھتا رہا۔ مجھے معاف کر دو۔" وہ اپنے کیے پر معافی مانگ رہا تھا۔ آنکھوں سے اشک جاری تھے جبکہ وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا اس کے ہر شکوے کی نفی کر رہا تھا۔

"نہیں اریب...... اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ یہ سب ہونا تھا سو ہو گیا۔ تم نے کبھی کچھ غلط نہیں کیا۔" اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے یہ الفاظ ادا کیے گئے۔

"نہیں بھائی، آپ نے میری خاطر یہ سب کیا اور میں نے آپ کو اپنا دشمن سمجھا۔ آپ سے بدتمیزی سے بات کی، آپکو حقیر جانا۔

آپ کو برے برے القابات سے پکارا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔'' وہ علیحدہ ہوا اور ہاتھ جوڑ کر اپنے کیے کی معافی مانگ رہا تھا۔
ابدال نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس کے ہر شکوے کی دوبارہ نفی کر دی۔
''نہیں اریب۔ ایسا سوچنا بھی مت۔ تم نے کبھی مجھے ٹھیس نہیں پہنچائی اگر پہنچائی بھی تو میں نے تمہیں مجبور کیا تھا۔ تم کبھی غلط نہ تھے۔'' ایک بار پھر وہ گلے سے لگ گیا۔ آنکھوں سے آنسو ابھی تک نہ تھمے تھے۔
بھائی کا بھائی سے ملن ہو چکا تھا۔ برسوں کی مسافتیں ختم ہو چکی تھیں مگر ایک قیامت ابھی آنا باقی تھی۔ جوان کی منتظر تھی۔ وہ اشک بہا رہے تھے تبھی باہر سے ایک زوردار کھٹکے کی آواز آئی۔ دونوں بری طرح چونکے تھے۔ استفہامیہ آنکھوں نے باہر کی طرف دیکھا اور سانسیں اٹکتے ہوئے محسوس ہوئی تھیں۔
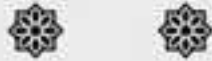
العطش

عکس کوئی ہو خدوخال تمہارے دیکھوں
بزم کوئی ہو مگر بات تمہاری نکلے

باہر سب پریشان تھے۔ حسام کی آنکھوں میں درد انتہا کا تھا۔ جبیں اور سحر فاطمہ ویٹنگ ایریا میں تھے جبکہ جہانزیب فارملیٹی پوری کرنے میں مصروف دیکھائی دیتے تھے۔ حاعفہ کا ہونا، نہ ہونا برابر تھا۔ اس کا وجود اگرچہ یوں تو سب کے سامنے تھا مگر روح پر لگے زخموں کو کوئی بھی دیکھنے سے قاصر تھا۔

''اب کیسی ہے طبیعت صبا کی؟'' ایک نرس اپنا ماسک ہٹاتے ہوئے آپریشن تھیٹر سے باہر آئی تھی۔ حسام کی نگاہیں شاید دروازے پر ہی اٹکی ہوئی تھیں تبھی لڑکھڑاتے قدموں نے بینچ کو بھی نہ دیکھا، جس سے اس کا پاؤں بری طرح ٹکرایا تھا۔ سحر فاطمہ نے ہاتھ بڑھا کر سنبھالنا چاہا تھا۔

''دیکھیں ابھی کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب اندر موجود ہیں۔'' مختصر الفاظ کہے اور وہ ریسیپشن کی طرف چلی گئی۔ یاسیت پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔

''اللہ......!'' جب انسان کو ہر جگہ سے مایوسی کا سامنا ہو اور روشنی کا دیپ نظر نہ آئے تو واحد ایک ذات باقی رہتی ہے۔ جس کا نام خود بخود لبوں سے جاری ہوتا ہے۔ حسام کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ بھائی کا درد اور شریک حیات کا غم دونوں یکجا ہو چکے تھے۔ آنکھوں میں ابر اترتا چلا گیا۔

''کچھ نہیں ہوگا بھابھی کو۔'' جبیں نے آگے بڑھ کر حسام کے شانوں پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ پلٹا تو اس کی آنکھوں میں امید کے ایک دیے کو روشن پایا۔ وہ پلکیں جھپک کر رہ گیا۔

گھڑی پر وقت جیسے تھم چکا تھا۔ ہر لمحہ قیامت کے مترادف تھا۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ آنسو آنکھوں سے بہنے کے لیے بے تاب تھے مگر وقت کے ہاتھوں مجبور تھے۔ حاعفہ بھی سحر فاطمہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ خود کو سنبھال کر، اب اوروں کو سنبھالنے کا فریضہ سرانجام دے رہی تھی۔

''ماما جان! یہ وقت آزمائش ہے۔ دیکھنا، بہت جلد یہ آزمائش ختم ہو جائے گی۔'' جذبات سے پر لہجہ ہمت باندھنے کی کوشش کر رہا

تھا۔خوابیدہ آنکھوں میں ایک چہرہ چھلک رہا تھا۔ہنستا مسکراتا،تھوڑا سا نٹ کھٹ،تھوڑا سا لجاجت سے بھرپور چہرہ......بھیگی پلکوں نے اس عکس کو بھی مبہم سا کر دیا تھا۔

تبھی آپریشن تھیٹر کی سرخ لائیٹ آف ہوگئی۔حسام کی تو سانسیں اٹک گئیں۔سحر فاطمہ اور باقی بھی دروازے کے قریب آ چکے تھے۔اب بس اندر سے نکلنے والے وجود کو راہیں تک رہی تھیں۔دروازہ کھلا،تو دل جیسے سکڑنے لگا تھا۔جانے کون سی خبر سنائی جانی تھی۔

وہاں سے ایک نرس باہر آئی تھی۔اس کا چہرہ کسی بھی تاثر سے پاک تھا۔

''اب کیسی ہے صبا؟'' حسام کا پہلا سوال اپنی شریک حیات کے بابت تھا۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے،ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے اور آپ کو مبارک ہو،آپ کے گھر میں ننھے سے وجود نے آنکھیں کھولی ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے خوش خبری سنائی تھی۔کئی غموں کے بعد ملنے والی خوشی جیسے کسی نعمت سے کم نہ تھی۔سب کی آنکھیں چھلکنے لگی تھیں۔گویا غم کے آنسو خوشی کے سبب بہنے لگے۔

''میرا بچہ......!'' حسام کے لبوں سے برجستہ جاری ہوا تھا۔

''جی بالکل......آپ ایک بیٹے کے باپ بن چکے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ بائیں جانب کو چل دی۔جہانزیب نے حسام کو اپنے گلے سے لگالیا اور اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے مبارکباد دی تھی۔جبیں اور سحر فاطمہ بھی خوش نظر آ رہی تھیں مگر انہی میں ایک وجود آنسو بہا رہا تھا۔حاعفہ کی آنکھوں میں بھی چمک تھی مگر اس چمک میں ایک یاسیت کا عنصر تھا۔اریب کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

''اگر اریب یہاں ہوتے تو کتنے خوش ہوتے اپنے بھتیجے کو دیکھ کر۔'' اس کی زبان سے برجستہ جاری ہوا تھا۔حسام کے چہرے پر چھائی خوشی کی لہر بھی چھٹ چکی تھی۔وہ دھیرے قدموں سے آگے بڑھا۔

''میرا بھائی واپس آئے گا۔مجھے یقین ہے اپنے بھائی پر حاعفہ۔'' حسام کے لہجے میں یقین غالب تھا۔کئی لمحے ایسے ہی بیت گئے۔اتنے میں صبا کو آئی سی یو میں شفٹ کر دیا گیا اور بچے کو بھی انڈر آبزرویشن رکھا گیا تاکہ معاملات کو کلئیر کیا جاسکے۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ صبا۔تم نے مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔میں تمہارا جتنا بھی شکریہ ادا کروں،اتنا کم ہے۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا کہ اب کوئی مجھے بھی بابا،بابا کہہ کر پکارے گا۔آئی ڈانٹ بیلیو دس۔'' وہ اپنے دل کی کیفیت سے صبا کو آگاہ کر رہا تھا۔ڈاکٹر نے صرف ایک حسام کو صبا سے ملنے کی اجازت دی تھی۔اس کی آنکھوں میں بھی خوشی نمایاں تھی۔اپنے شوہر کو خوش دیکھ کر جیسے اس کے درد کو دوا مل گئی۔

''آپ کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے حسام۔'' اس نے حسام کے ہاتھوں کو تھاما تو اُس نے پیار سے ان ہاتھوں پر اپنے ہونٹوں کی چاشنی کو ثبت کر دیا۔

"کیسا نظر آتا ہے ہمارا بیٹا؟" صبا نے پوچھا تھا۔

"ابھی ڈاکٹر نے اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی، انڈر آبزرویشن ہے لیکن مجھے یقین ہے وہ یقیناً میرے اریب جیسا ہوگا۔"

ایک بار پھر درد نے اپنا رخ بدلا تھا۔خوشیوں کو غم نے ایک بار پھر نگلنا چاہا تھا۔

خاموشی کے تسلسل نے دورانیہ کو طول دے دیا۔صبا کی آنکھوں میں بھی یاسیت نمایاں تھی۔حسام کی آنکھوں میں بھائی سے دوری کا غم وہ خاموش لبوں سے بھی پڑھ سکتی تھی۔تبھی دھیرے سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے یقین پر مستحکم رہنے کی تلقین کی تھی۔اذیت کے ساتھ مسکراتے ہوئے اس نے صبا کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔

ایک دن بعد صبا کو ڈسچارج کر دیا گیا اور سب نے اس ننھے وجود کا بھرپور استقبال کیا مگر ایک جگہ ابھی تک خالی تھی اور اس خالی پن کو کوئی پر نہیں کر سکتا تھا۔

☆......☆......☆

کبھی گریباں کے تار گنتے، کبھی صلیبوں پہ جان دیتے

گزر گئی زندگی ہماری سدا یہی امتحان دیتے

اس آواز کو سن کر دونوں چونکے تھے۔ابدال نے اریب کو وہیں رہنے کا کہا اور خود جا کر حالات کا جائزہ لیا۔وہاں ایک دشمن گاؤں کے سرغنہ کو گرفتار کیا گیا تھا۔وہ اریب کی جان لینے آیا تھا مگر صحیح وقت پر اسے پکڑ لیا گیا۔ابدال نے اس کے بارے میں اریب کو آگاہ کر دیا۔

"اب تم اس کمرے سے باہر مت نکلنا کیونکہ تمہیں ابھی کچھ معلوم نہیں ہے کہ کون اپنا ہے کون پرایا۔یہ لوگ تمہاری پرواہ کرتے ہیں اور کہیں ایسا نہ ہو برسوں کی پیاسی زمین کی پیاس یہاں کے لوگوں کے خون سے بجھے۔" ابدال نے فکرمندی کے ساتھ کہا تھا۔اس بات پر اریب بری طرح چونکا تھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی جان؟ میری وجہ سے خون؟" وہ بات کا مطلب نہیں سمجھا تھا تبھی حیرت سے استفسار کیا۔

"بات کو سمجھانے کا وقت نہیں ہے اریب۔مجھے اس وقت جانا ہے، وقت ملا تو بعد میں سمجھاؤں گا لیکن میری بات کا پاس رکھنا۔چاہے کچھ بھی ہو جائے اس کمرے سے باہر مت نکلنا۔" یہ کہتے ہی ابدال وہاں سے چلا گیا جبکہ اریب کے ذہن میں کئی سوال تھے جن کا جواب جاننا وہ چاہتا تھا اور ان شکنوں کا مطلب بھی جو ابدال کے چہرے پر اس نے ابھی ابھی پڑھی تھی۔ایک ایسی مصیبت جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اے خدایا! یہ سب کیا ہے؟ میری زندگی کا اتنا بڑا راز...... جسے پیدا ہوتے ہی مجھے جان لینا چاہیے تھا۔آج برسوں بعد میرے سامنے آ رہا ہے۔کیسے یقین کروں میں ان سب باتوں پر؟" وہ بے بسی کے ساتھ پہلی بار خدا کو یاد کر رہا تھا۔وہ شکست خوردہ شخص کی طرح

بستر پر آبیٹھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں چہرے کو سمویا اور گہری سانس لیتے ہوئے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

کئی عکس سامنے تھے۔ جو ایک وقت تک اس کے اپنے تھے مگر جانے کیوں اب سب اجنبی اجنبی سا تھا۔ کسی رشتے میں اپنائیت نہیں تھی مگر خلوص ان میں انتہا کا تھا۔

سحر فاطمہ کا راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کے کمرے میں آنا، اس کی ضروریات کا خیال رکھنا۔ اس کی خوشی میں خوش ہونا اور اس کے درد میں کراہ اٹھنا کیا وہ سب ایک فریب تھا؟ کیا وہ سب محض ایک فریب تھا؟ محبت کا مجسم اندر سے کھوکھلا تھا؟ کیا وہ پرواہ جو راتوں کو ان کو جگائے رکھتی تھی، سب ایک کنٹریکٹ تھا۔ کیا ان کے دل میں اس کے عوض کوئی محبت، کوئی پرواہ نہیں تھی؟ کیا وہ پیار، محبت سب ایک ہمدردی تھی، جو جتلائی جاتی تھی؟

جہانزیب، جو اسے حسام سے بڑھ کر پیار دیتے تھے۔ تھوڑا سا کرخت لہجے میں بات کرتے اور بعد میں کسی نرم کلی کی مانند ہو جاتے۔ ایک دوستانہ سا ماحول جو اسے باقی سب سے فیملی سے جدا لگتا تھا، سب ایک چھل تھا؟ کیا اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کیا وہ سب پیار محض ایک احسان کا قرض تھا؟

حسام اور جبیں جن کے ساتھ اس کی زندگی کے شب و روز گزرے، اس سچائی سے آشنا تھے؟ اگر ہاں تو کیا ان کا پیار بھی چھل تھا؟ اور اگر نہیں تو کیا وہ یہ حقیقت جان کر بھی اسے اپنا بھائی تسلیم کریں گے؟

حاعفہ...... اس کی شریک حیات، اس کی محبت، کیا یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اسے قبول کرے گی؟ ایک ایسے وجود کی بیوی بنے گی جو اکیس سالوں تک اپنی شناخت سے محروم رہا۔ جس نے اکیس سال گمنامی کے اندھیروں میں گزارے۔ جس کا جنم کسی مسلمان گھرانے میں نہیں بلکہ غیر مسلموں میں ہوا۔ جس کی بنیاد کسی غیر مسلم گھرانے سے شروع ہوتی ہے۔ کیا وہ اسے پھر بھی چاہے گی؟ کیا ایک بار پھر محبت اس سے بے اعتنائی برتے گی؟

ایسے ہی کئی سوال تھے جو اس کے ذہن میں کھٹک رہے تھے۔

''اریب...... آپ نماز پڑھا کریں، اپنے غم کو اللہ کے آگے بیان کیا کریں۔ دیکھیے گا، وہ ذات آپ کے غموں کو خوشیوں میں تبدیل کر دے گی۔'' حاعفہ کے پہلو میں گزاری گئی اس رات کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ وہ ایک یقین اور وقار کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ بائیں جانب دیکھا تو پانی سے بھرا ایک بڑا سا برتن تھا۔ اس نے اسی سے وضو کیا تھا۔ واپس پلٹا تو کوئی ایسا کپڑا نظر نہ آیا جسے جائے نماز کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

''اگر دیکھا جائے تو پوری زمین ہی مسجد ہے۔ انسان جب چاہے، جہاں چاہے اس کو سجدہ کر سکتا ہے۔'' مبہم سے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ اس نے وہیں اپنے خدا کے حضور دو رکعت نفل نماز کی نیت کی تھی۔

زندگی میں پہلی بار وہ عیدین یا پھر جمعہ کے علاوہ کوئی نماز پڑھ رہا تھا۔ آنکھوں میں بے سکونی تھی مگر اعضا مطمئن تھے۔ ناف سے ذرا اوپر ہاتھ باندھے وہ ایک وقت تک قیام کی حالت میں رہا تھا۔ شاید برسوں کی قضا کو آج ادا کرنے کی ٹھانی تھی۔ رکوع میں بھی اس کا دورانیہ غیر معمولی تھا۔ سجدے میں تو جذبات کی انتہا ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ زندگی بھر خشک رہنے والی آنکھیں آج کسی بچے کی طرح آنسو بہاتی جا رہی تھیں۔

رات کے کئی پہر وہ اسی نماز میں مشغول رہا تھا اور جب سلام پھیر کر ہاتھ اٹھائے تو لب بلک اٹھے تھے۔ جذبات کی شدت انتہا کی تھی۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں چھپا درد اب سامنے آ رہا تھا۔

''اے اللہ! زندگی بھر تیرے در سے بے اعتنائی برتی رکھی اور کبھی تیرے سامنے اپنی جبیں کو نہیں جھکایا۔ شاید اسی کی سزا مل رہی ہے مجھے۔ کون اپنا ہے اور کون غیر؟ ایسی الجھن میں الجھ چکا ہوں جس سے لکھنا محال دیکھائی دے رہا ہے۔ انسان جہاں آنکھ کھولتا ہے، جن ہاتھوں میں پلتا ہے۔ انہی کو اپنا مانتا ہے۔ انہی ہاتھوں کو اپنا ہمدرد سمجھتا ہے مگر میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک طرف میری ماما جان اور بابا جان ہیں تو دوسری طرف ابدال بھائی۔ اگر پلٹ کر دیکھتا ہوں تو انہیں اپنا خیر خواہ سمجھتا ہوں اور اگر سامنے دیکھتا ہوں تو ابدال بھائی کی آنکھوں میں اپنے لیے تڑپ دیکھتا ہوں۔ ان کی قربانیاں جو انہوں نے میری ذات کی خاطر برداشت کی، میں کیسے فراموش کر سکتا ہوں؟ اے اللہ! میری مدد کر۔ مجھے اس الجھن سے نکال دے۔ ہدایت کو مجھ پر عیاں کر دے۔ زوال کے ہر راستے کا در بند کر دے۔ میرے قدم اس راستے کی طرف موڑ دے، جہاں سچائی بستی ہے۔ جہاں میری الجھنوں کو سلجھنے کا موقع ملے گا۔ جہاں مجھے اپنے غموں کا مداوا ملے گا۔ تُو تو اپنے بندوں کی فریاد کو سننے والا ہے۔ میری بھی فریاد کو سن لے...... اے اللہ مجھے سچائی سے ہمکنار کر دے......!'' وہ اشک بہاتے فریاد کر رہا تھا اور شاید آج کی رات وہ ایسے ہی بتانے والا تھا تبھی اس کے ہاتھ ابھی تک فضا میں بلند تھے۔

☆......☆......☆

دل خوں ہوا کہیں تو کبھی زخم سہہ گئے
اب حادثے ہی اپنی وراثت میں رہ گئے

وہ کھڑکی کے ساتھ کھڑا باہر کھلے آسمان کو تکتا جا رہا تھا۔ جانے کتنے دن اسے یہاں بیت چکے تھے؟ وہ تو شمار کرنا ہی بھول گیا تھا۔ دونوں بازوؤں کو سینے پر لپیٹے نگاہیں آسمان پر بکھرے بادلوں کو دیکھ رہی تھیں۔

''کیا ہوا کن خیالوں میں گم ہو؟'' یہ وہی آواز تھی، جو ہمیشہ سے اس کے ساتھ تھی۔ پہلے دشمن بن کر اور اب ایک بھائی کی صورت میں۔ بنا پلٹے ہی اس نے گہری سانس لی تھی۔

''سوچ رہا ہوں کہ ان کی توہم پرستی کیسے ختم کی جائے؟ کیسے گاؤں والوں کو یقین دلایا جائے کہ آج کے زمانے میں کوئی دیوتا

نہیں ہوتا۔اگر کسی میں غیر معمولی صلاحیتیں قدرت نے ڈالی ہیں تو وہ فقط آزمائش ہیں اور کچھ نہیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ابدال دھیرے سے آگے بڑھا اوراس کے بالمقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

"کافی بڑی بڑی باتیں کرنے لگ گئے ہو؟" وہ ہمیشہ کی طرح اریب کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔جیسے کبھی اس نے حالات سے ہارنا سیکھا ہی نہ ہو۔دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے عکس اور مجسم لگ رہے تھے۔اریب نے چہرہ ابدال کی طرف گھمایا اور برسوں سے دماغ میں کھٹکتے ہوئے سوال کا جواب مل گیا۔

وہ ہمیشہ سے جانتا تھا کہ ابدال اوراس کا کوئی نہ کوئی رشتہ ضرور ہے مگر کیا؟ وہ نہیں جانتا تھا۔آج وہ رشتہ خود ماضی کے پنوں سے نکل کراس کے سامنے آیا تھا۔ایک بھائی کا رشتہ...... جو دنیا میں بہت مضبوط رشتہ ہوتا ہے۔جس رشتے کو سونے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔

وہ ابدال کی جانب دیکھے آج آنکھوں کی اس حدت کو بجھا رہا تھا جواس نے اپنے دل میں پال رکھی تھی۔آگ جو نفرت کی تھی، آج دھیرے دھیرے بجھتی جا رہی تھی۔دل میں سوائے محبت کے اب کچھ نہ تھا۔وہ اریب جو نفرت کی انتہا کی پہنچ چکا تھا۔اب دوبارہ محبت کا مجسم بننے جا رہا تھا۔

"حالات نے سکھا دیا ہے۔" اس نے مختصر کہا تھا۔وہ ایک بار پھر مسکرا دیا۔اس بار مسکرانے سے اس کے دونوں رخسار تھوڑے سے پچکے تھے۔اسے حیرت ہوئی۔سماعت میں سحر فاطمہ کے الفاظ گونجے۔

"بناوٹی مسکراہٹ مجھ پر کوئی اثر نہیں کرے گی۔" اس دن اس کا منہ اترا ہوا تھا۔سب کے سامنے ہنستے ہوئے سب کچھ نارمل دیکھانا چاہا مگر سحر فاطمہ نے اس کی چوری پکڑ لی تھی۔وہ چونکا اور حیرت سے انہیں دیکھنے لگا۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ میں بناوٹی مسکراہٹ ہنس رہا ہوں؟"

"کیونکہ جب تم دل سے مسکراتے ہو تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے۔" سحر فاطمہ نے اس کے رخسار کو حسب عادت پیار سے نوچا تھا۔

"کیسے؟" وہ تذبذب کا شکار ہوا۔

"جب تم دل سے ہنستے ہو ناں تمہارے رخسار معمولی سے پچک جاتے ہیں اور دونوں جانب چھوٹے گڑھے سے ابھر آتے ہیں۔"

آج وہی انداز ابدال کا تھا۔وہ واقعی اس کا بھائی تھا۔اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور دفعتہً آگے بڑھ کر ابدال سے بغل گیر ہوا۔وہ بوکھلایا۔

"آپ ہی میرے بھائی ہو۔مجھے اب آپ پر پورا یقین ہے۔آپ سے بڑھ کر میرا خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا۔جب تک آپ میرے ساتھ ہیں، مجھے کسی شے کا خوف نہیں ہے بھائی۔" وہ جذبات میں کہتا جا رہا تھا۔ابدال پہلے تو کچھ نہ سمجھا، پھر مسکراتے ہوئے اس کی پشت کو تھپتھپایا۔

''اور مجھے تمہارے بھائی ہونے پر فخر ہے۔ میری تو اپنے رب سے التجا ہے کہ وہ میری عمر بھی تمہیں دے دے اور تمہاری زندگی خوشیوں سے بھرپور ہو۔'' اس کو اپنے سامنے رکھ کر پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ عرصے بعد بھائی کی پیشانی پر دیا گیا بوسہ ماضی کی تلخ یاد کو تازہ کر گیا تھا۔ تبھی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''نہیں بھائی...... ہم دونوں کی عمریں لمبی ہوں کیونکہ اب میں ایک سانس بھی آپ کے بنا نہیں لے سکتا۔ زندگی کے اکیس سال آپ کے بغیر گزارے ہیں اور جب ملے تو آپ کی کو اپنا دشمن سمجھا لیکن اب...... اب نہیں۔ سب کچھ جان لینے کے بعد میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' اس نے جذبات کی بپھری ہوئی موجوں کے سنگ بہتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ ممکن نہیں ہے اریب۔'' اس کا لہجہ دفعتہً سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اریب چونکا اور استفہامیہ نگاہیں اس کے چہرے کی طرف کیں۔

''مگر کیوں؟''

''کیونکہ تمہیں یہاں سے جانا ہوگا اور میں ایسا کر کے ہی دم لوں گا۔ تم اس دنیا کے لیے نہیں بنے اور......'' وہ مزید کچھ کہتا مگر اریب نے مداخلت کی۔

''اور آپ بھی اس دنیا کے لیے نہیں بنے۔ آپ کو بھی میرے ساتھ جانا ہوگا۔'' اس نے ادھورا جملہ مکمل کیا تھا۔ پیشانی پڑھ لینے کے بعد اسے یہی کہنا چاہیے تھا۔

''نہیں اریب! ایسا ممکن نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ مجھے یہیں رہنا ہے۔ میری زندگی یہاں گزری ہے اور مجھے یہیں رہ کر ان لوگوں کے ذہنوں سے توہم پرستی کو دور کرنا ہے۔ تم جانتے ہو اریب میں نے ایک وعدہ ماں سے کیا تھا کہ میں تمہیں اس دنیا سے دور رکھوں گا اور دوسرا وعدہ میں نے اپنے آپ سے بھی کیا تھا کہ میں ان لوگوں کے ذہنوں کو صاف کر کے ہی دم لوں گا تاکہ اگر بعد میں کوئی اریب جنم لے تو اس کو اپنوں سے دور نہ جانا پڑے۔ وہ اپنی شناخت سے محروم نہ رہے کیونکہ اپنوں کی جدائی کا درد کیا ہوتا ہے؟ میں اچھے سے جانتا ہوں۔ انسان زندہ تو ہوتا ہے مگر زندوں میں شمار نہیں ہوتا۔'' اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری تھی۔

''ٹھیک ہے۔ آپ نے ماں سے کیا گیا وعدہ تو پورا کر دیا اور اب آپ کا اپنے آپ سے کیا گیا وعدہ میں پورا کروں گا۔'' اس نے پختگی سے کہا تھا اور ایک ولولے کے ساتھ باہر کی جانب چل دیا۔ ابدال ہچکچایا اور اس کی جانب بغور دیکھا۔

''اریب...... تم کیا کرنے جا رہے ہو؟'' اس نے روکنا چاہا مگر وہ کہاں سننے والا تھا؟ تیز قدموں کے ساتھ بس آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ پیچھے سے ابدال نے کئی بار روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔

''رکو اریب...... کہاں جا رہے ہو؟ میری بات تو سنو؟'' وہ اس کے تعاقب میں رہا تھا۔ اس کی بلند آواز سے کئی دربان بھی اس طرف متوجہ ہوئے مگر کسی کے اندر ہمت نہ تھی کہ اپنے دیوتا کے راستے میں آ سکیں۔ گاؤں کی سرحد سے وہ نکل نہیں سکتا تھا اور سرحد کے اندر

جہاں چاہے جا سکتا تھا۔ اس لیے اس کے راستے خود بخود صاف ہوتے گئے۔ ہر کوئی اسے جھک جھک کر سلام کر رہا تھا اور اس کا چہرہ دیکھنا اپنے لیے سعادت کا باعث سمجھ رہے تھے۔ ابدال کی فکر مزید بڑھ گئی۔

''اریب...... میری بات سنو، تم کیا کر رہے ہو؟ مجھے بتاؤ تو صحیح۔'' اس کے دل میں کئی طرح کے وساوس جنم لے رہے تھے۔ جنہیں جھٹک کر بس وہ اریب تک رسائی چاہتا تھا مگر وہ تو برق رفتاری سے اس کھنڈر نما حویلی سے باہر آیا تھا۔ پرانے طرز سے بنی حویلی اریب کے لیے کھنڈر کے سوا کچھ نہ تھی۔ وہ اسی حویلی کے عین سامنے میدان کے وسط میں آ کھڑا ہوا تھا۔

''گاؤں والو! ادھر آؤ آپ سب۔ تمام مذہبی پیشوا بھی ادھر آئیں۔'' اس نے بلند آواز سے سب کو پکارا تھا۔ جس جس کی سماعت میں اریب کے الفاظ گئے تھے وہ سب وہاں جمع ہو گئے۔ جو یہ آواز نہ سن سکے، وہ بھی دوسروں سے پوچھ پوچھ کر وہاں جمع ہوتے چلے گئے۔ لوگوں کی بھیڑ میں سے ہوتے ہوئے ابدال بھی اریب کے بالمقابل آ کھڑا ہوا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' وہ جبڑے بھینچے سرگوشی والے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''ابھی بتاتا ہوں بھائی جان، بس سب کو یہاں جمع ہونے دیں۔'' اس نے تمانت کے ساتھ جواب دیا تھا جبکہ ابدال کے چہرے کے رنگ ہر لحظہ بدل رہے تھے۔ اسے اریب کی فکر تھی۔ کہیں وہ نادانی میں کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے جس کا خمیازہ اسے بعد میں بھگتنا پڑے اور شاید وہ ایسا ہی کرنے جا رہا تھا۔ بن سوچے ایسا قدم اٹھانے جا رہا تھا جس کے اندر وہ خود ہی دھنسنے جا رہا تھا۔

''دیوتا کا اقبال بلند ہو! آپ نے ہمیں کس لیے یاد کیا؟'' ایک مذہبی پیشوا نے ادب کے لبادے میں رہ کر پوچھنے کی جسارت کی تھی۔

''سب سے پہلے تو مجھے یہ دیوتا شیوتا کہنا بند کریں۔ میں کوئی دیوتا نہیں ہوں بلکہ ایک عام انسان ہوں۔ جس نے اپنی زندگی کے اکیس سال عام انسانوں میں گزارے ہیں۔'' اس نے با آواز بلند کہا تھا۔ سب اس کی بات سن کر چونکے تھے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

''نہیں دیوتا...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ بھلا عام انسانوں میں رہے ہوں مگر آپ عام انسان نہیں ہیں۔ آپ کو قدرت نے خود چنا ہے۔'' اسی پیشوا نے سب کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا تھا۔

''صحیح کہا آپ نے قدرت نے مجھے چنا ہے۔ تبھی کچھ غیر معمولی صلاحیتیں مجھے عطا کیں مگر اس لیے نہیں کہ قدرت کے قانون کو بدلوں مگر یہ صلاحیتیں میری اور آپ کی آزمائش کے لیے ہیں۔ انسان کے اندر جو بھی خوبی ہوتی ہے وہ اس کی آزمائش ہوتی ہے۔ اگر کوئی حسن کا مجسمہ ہے تو وہ حسن اس کے لیے آزمائش ہے۔ اگر کوئی مالدار ہے تو وہ مال اس کے لیے آزمائش ہے۔ اگر کوئی ذہین ہے تو وہ ذہانت اس کے لیے آزمائش ہے اور اگر کوئی محنتی ہے تو وہ محنت اس کے لیے آزمائش ہے۔ بالکل اسی طرح میرے اندر جو لوگوں کی پیشانی پڑھ لینے کی خوبی ہے، دلوں کی باتوں کو چہرے پر بچی شکنوں کو جان لینے کی صلاحیت ہے۔ یہ سب مجھے دیوتا نہیں بنا دیتی بلکہ یہ سب میری آزمائش

کے لیے ہے کہ میں اس صلاحیت کو کس کام کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ کیا میں ان صلاحیتوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنے رب کی بندگی کرتا ہوں یا نہیں؟ کیا ان صلاحیتوں کی وجہ سے کسی کو اپنے سے حقیر تو نہیں جانتا؟ کیا ان صلاحیتوں کو اپنا حق سمجھ کر مغرور تو نہیں ہو جاتا؟ انسان کے پاس جو بھی خوبی ہوتی ہے وہ سب آزمائش ہے اور اس آزمائش پر پورا اترنا آسان نہیں ہوتا۔ میرے لیے بھی آسان نہیں ہے اور میں ہاتھ جوڑ کر آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ میری اس آزمائش کو مزید کٹھن نہ بنایئے۔ میں عام انسان ہوں۔ مجھے عام انسان بن کر زندگی گزارنے دیں۔ میرا بھائی، ایک انسان ہے۔ کوئی دیو خاص نہیں۔ اسے میرے بھائی کی نظر سے دیکھیے، کسی دیوتا کے بھائی کی نظر سے نہیں۔ جب میری حقیقت کچھ نہیں ہے تو میرے بھائی کو جو سمان دیا جا رہا ہے، وہ میری وجہ سے کیوں؟ انہیں اگر عزت دینی ہے تو ان کی اپنی شناخت ہے۔ اس کی بدولت دیں۔ وہ آپ لوگوں کے درمیان ایک عرصہ رہے ہیں۔ انہیں ان کی ایمان داری، ان کی سچائی کے بدولت عزت دیں۔ کسی دیو خاص کے عوض نہیں۔" اس نے ایک ایک چہرے کو مخاطب کیا تھا۔ ابدال کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اس کے دل میں جو اریب کے لیے محبت تھی، وہ پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اب اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ اپنی بقا کے لیے خود لڑ سکتا ہے۔ جس تو ہم پرستی سے بچانا اس کا فرض تھا۔ وہ اس چنگل سے اب باہر نکل چکا ہے۔ اب اس دنیا سے شاید اسے کوئی خطرہ نہیں مگر جن کی عقل پر پردے پڑے ہوں، وہ بھلا سچائی کیونکر قبول کر سکتے تھے؟ اندھیروں میں رہنے والے اکثر روشنی سے نفرت ہی کیا کرتے ہیں۔ ان کے جسم کو ظلمت کی عادت ہو جایا کرتی ہے۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں دیوتا؟ شاید آپ اپنی طاقتوں سے بیگانہ ہیں۔ اس لیے ایسا بول رہے ہیں۔ جب آپ اپنی طاقتوں سے باخبر ہو جائیں گے تو آپ کو یقین آئے گا کہ ہم ٹھیک ہی کہا کرتے ہیں۔"

"مجھے کسی بات پر یقین نہیں کرنا بلکہ یقین کرنے کی آپ کو ضرورت ہے۔" اس نے اس بار کرخت لہجے میں کہا تھا مگر کوئی اس کی باتوں پر یقین کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔ ابدال کے چہرے پر فکر مندی کی شکنیں ابھری تھیں۔ کہیں یہ پیشوا اسے اپنے جال میں پھانس نہ لیں۔ اس نے اریب کو وہاں سے لے جانا چاہا مگر وہ ہٹنے کو تیار ہی نہیں تھا۔

تکرار کافی دیر تک جاری رہی۔ اریب دلیل سے ان کے عقیدے کو رد کرتا مگر وہ اپنی توہم پرستی میں اس دلیل کو ہی در کر دیتے بس ایک ہی رٹ لگائی ہوئی تھی کہ وہ ان کا دیوتا ہے۔ اب وہ بھی خود بھی تھک چکا تھا اور ان کی عقل کو انہی کے راستے پر چل کر پچھاڑنا چاہتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک پتھر نظر آیا۔ وہ پتھر جہاں پڑا تھا۔ وہاں کی زمین بھی بنجر تھی اور جگہ جگہ سے کٹاؤ کا شکار ہو رہی تھی۔ اس کے دماغ میں ایک پلان آیا تھا۔ وہ اس طرف چل دیا۔

"ٹھیک ہے! آپ کو لگتا ہے میں آپ کا دیوتا ہوں اور میری کہی گئی بات کبھی غلط نہیں ہو سکتی؟" اس نے استفہامیہ انداز میں کہا تھا۔ سب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابدال کو ایک زبردست جھٹکا لگا تھا۔

''اور آپ نے میرے جنم سے پہلے یہ بھی پیشین گوئی کی تھی کہ جہاں میرے قدم زمین کو مس کریں گے، وہاں سے پانی ابل پڑے گا۔'' اس نے دوبارہ استفسار کیا تھا۔ مذہبی پیشواؤں نے تصدیق کی۔ ابدال کا دل بری طرح جکڑ چکا تھا۔ کہیں وہ ان لوگوں کے جال میں پھنس تو نہیں گیا۔ کہیں اس کے ذہن میں بھی تو ہم پرستی کا مرض پروان تو نہیں چڑھنے لگا؟ ایسے ہی کئی سوال تھے، جو یکے بعد دیگرے اس کے دل ودماغ میں کھٹک رہے تھے مگر افسوس زبان خاموش تھی۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں یہاں قدم رکھ چکا ہوں اور میں کہتا ہوں یہاں سے پانی نکلے گا۔ اب نکالیے پانی یہاں سے۔'' یہ سن کر سب ٹھٹک کر رہ گئے۔ ابدال بھی مسکرا دیا۔ وہ اریب کی چال سمجھ چکا تھا۔

''اگر آپ کو اپنے دیوتا پر یقین ہے تو یہاں سے پانی نکال کر دکھایے ورنہ بھول جائیے کہ اس دنیا میں کسی دیوتا نے جنم بھی لیا تھا اور مجھے آئندہ دیوتا کہنے کی جسارت بھی مت کرنا۔'' اس نے سب کو تنبیہہ کی تھی۔ یہ کہتے ہی وہ ابدال کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ سب گاؤں والے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔

''یہ دیوتا نے کیسی بات کر دی؟ اس بنجر زمین سے پانی؟ ناممکن؟'' ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''کہیں یہ لڑکا ٹھیک تو نہیں کہہ رہا کہ یہ دیوتا ہی نہیں ہے۔ ورنہ دیوتا اور ایسی بات...... ناممکن!'' دوسری آواز سماعت سے ٹکرائی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

''چلو...... سب کام پر لگ جاؤ۔ دیوتا کا کہنا سر آنکھوں پر۔ آج سورج ڈھلنے سے پہلے یہاں سے کھدائی کر کے کنواں جاری کرنا ہے۔'' پیشوا کی آواز سن کر وہ برجستہ پلٹے تھے۔ وہ اس کی اندھی تقلید کر رہے تھے۔ اپنے پیشوا کا حکم نامہ جاری ہونے پر وہ بھی کام میں جت گئے۔ ابدال اور اریب کی آنکھوں میں تفکر نے جنم لیا تھا۔

سارا دن وہ کھدائی کرتے رہے مگر پانی تو درکنار ایک نرم زمین کا ذرہ بھی ان کے ہاتھ نہ لگا تھا۔ اریب اور ابدال کھڑکی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔

''بھائی جان یہ سب تو وہاں سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔'' ابدال نے فکرمندی سے کہا تھا۔

''تم فکر مت کرو اریب۔ انہیں وہاں سے کچھ نہیں ملنے والا۔ وہ زمین برسوں سے خشک رہی ہے۔ وہاں گھاس نے بھی برسوں پہلے اگنا بند کر دیا تھا۔ وہاں سوائے خشکی کے کچھ بھی نہیں ہے۔'' اریب کے ٹوٹے ہوئے یقین کو ابدال نے جوڑا تھا۔

''یقین تو میرا بھی یہی کہتا ہے لیکن یہ لوگ تو لگتا ہے زمین کی تہوں میں اتر جائیں گے پانی کا ایک قطرہ لینے کی خاطر۔'' اریب کے لہجے میں تاسف تھا جو ابدال سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ اس نے اریب کے شانے کو تھپتھپایا اور تسلی دی۔ چند لمحے یونہی بیت گئے تبھی ماحول میں ایک شور بلند ہوا تھا۔ دونوں حیرت سے پلٹے۔ نگاہیں برجستہ اسی میدان کی طرف گھومی تھیں۔ آنکھیں ٹھٹک کر رہ گئیں۔ سانس لینا بھی

جیسے محال ہو چکا تھا۔ سماعت میں ایک ہی جملہ گونج رہا تھا۔

''دیوتا کا اقبال بلند ہو...... بنجر زمین بھی اب سونا اگلے گی۔'' یہی جملہ تھا جو زبان زد عام تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف پل بھر کی طرف دیکھا۔ کہیں یہ خواب تو نہیں تھا؟ دوبارہ نگاہیں دوڑائی۔ وہاں واقعی پانی تھا۔ بنجر زمین پانی کا چشمہ ابل رہی تھی اور وہ پانی بہتا ہی جا رہا تھا۔ اردگرد کا بنجر پن بھی اس پانی سے دور ہو رہا تھا۔ سب اریب کی حویلی کی طرف پلٹتے تھے اور اس کے آگے ذرا سا جھک کر اپنے ادب وسلام پیش کر رہے تھے۔ اس کی نگاہوں میں غیر یقینیت نمایاں تھی۔ وہ نہ ہی کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ہی کچھ سن سکتا تھا۔

ابدال یہ حالت بھانپ چکا تھا۔ تبھی ایک جھٹکے سے کھڑکی کے دونوں پلڑے بند کر دیئے جبکہ اریب وہیں کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دیوار کے پار بھی وہ بخوبی دیکھ سکتا تھا۔ اندر لاوا ابل رہا تھا۔

''اریب...... اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔'' ابدال نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اپنے ہونے کا یقین دلایا تھا۔

''بھائی...... یہ سب...... کیسے؟ پانی...... خشکی؟'' وہ غیر یقینی لہجے میں کہہ رہا تھا۔ دماغ کا ایک حصہ ماؤف ہو چکا تھا۔

''کچھ نہیں ہوا اریب...... میرے بھائی...... یہ سب اتفاق ہے۔ اپنے ذہن پر بوجھ نہ ڈالو'' وہ اس کو تسلی دے رہا تھا۔ اس کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے، بالوں کو سہلاتے ہوئے۔ اس کے وجود کو جھنجوڑتے ہوئے۔

''مگر ایسا کیسے؟ وہ زمین تو بنجر تھی۔'' اس کا ذہن وہاں سے ہٹنے کو تیار ہی نہ تھا۔ ابدال کو اسی بات کا ڈر تھا مگر اب وہی ڈر حقیقت کا روپ دھاڑ چکا تھا۔ یہ اس کی پہلی شکست تھی اور ان لوگوں کی پہلی جیت۔ جہاں تک اریب کی ذات کا سوال تھا وہ تو ایک لہر تھی، جو اپنا وجود ڈھونڈنے کی سعی کر رہی تھی۔ کبھی سمندر کی طرف بڑھتی تو اسے بپھرا ہوا پاتی، اور کبھی ساحل کی طرف پیش قدمی کرتی تو اسے بھی بیگانہ محسوس کرتی۔

☆......☆......☆

مجھ سے یہ شکایت ہے مرے چارہ گروں کو

میں زخم چھپانے کو علامت نہیں رکھتا

صبا کو گھر آئے ایک ہفتہ بیت چکا تھا۔ سب کی توجہ کا مرکز وہ نیا مہمان تھا۔ جو صبا کے آنچل کی خوشبو تھا۔ ہر کوئی اس ننھے وجود پر اپنا پیار نچھاور کر رہا تھا۔ حاعفہ کا وجود بھی اگرچہ پارہ پارہ تھا مگر ننھے سے وجود نے یہاں سے بھی اپنے حصے کا پیار سمیٹا تھا مگر عاطی شاید یہ برداشت نہ کر سکا تھا۔

ننھی سی جان کے آنے سے پہلے ہر کوئی اس کا خیال رکھتا، اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا مگر اب ایسا کچھ نہ تھا۔ عاطی نے اپنے حصے کا پیار بھی کم ہوتا محسوس کیا تھا۔ ماں تو پہلے ہی اس دنیا سے جا چکی تھی۔ باپ کا چہرہ بھی اس نہ دیکھا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی سے انجان یہ ننھا

وجود اپنے دل میں نئے نئے خیالات کو جگہ دینے لگا تھا۔

حاعفہ کی شفقت میں اگرچہ کمی نہ آئی تھی مگر اریب کا سچ آنے پر اس کا اداس چہرہ عاطی سے ڈھکا چھپا نہ تھا۔ وہ اس خفگی کا مطلب اپنی ذات سے منسوب کرنے لگا۔ تبھی اس کے دل میں اس ننھے وجود سے نفرت پیدا ہوگئی۔

''کیا نام سوچا ہے آپ نے بھابھی اس کا؟'' جبیں نے منے کو پیار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''میرے بیٹے کا نام ہوگا سعدی حسام......!!'' حسام ابھی ابھی اندر آیا تھا۔ فوراً بول اٹھا۔

''واؤ...... یہ تو بہت اچھا نام ہے۔ میرا بھتیجا سعدی حسام عالمگیر۔'' اریب سنے گا تو کتنا خوش ہوگا ناں؟'' اس کو پیار کرتے ہوئے برجستہ جبیں کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ سب کے چہرے پر خزاں کی ایک ہوا کا جھونکا لہرایا تھا۔ حاعفہ بھی وہیں موجود تھی۔ فوراً آگے بڑھی۔

''خوش کیوں نہیں ہوگا۔ بالکل اپنے چاچو پر گیا ہے؟ کیوں صحیح کہا ناں حسام بھائی؟'' سعدی کو اپنی گود میں لیتے ہوئے حاعفہ نے پوچھا تھا۔ حسام مسکرا دیا اور اثبات میں گردن ہلا دی۔ عاطی نے جب دیکھا کہ حاعفہ سعدی کو بوسہ دینے جارہی ہے تو بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''میرے ساتھ چلو آپ...... مجھے ڈرائنگ بنانی ہے۔'' اس نے اس دفعتہً حاعفہ کا پلو کھینچا تھا جس سے اس کے ہاتھ بوکھلائے اور ہاتھوں میں موجود سعدی گرنے والا تھا۔ جسے حسام نے فوراً تھام لیا۔ صبا کی جان میں بھی جان آئی۔ سب کی تلخ نظروں کا سامنا اس عاطی کو کرنا پڑا تھا۔

''یہ کیا حرکت تھی عاطی؟'' حسام چلایا تھا۔ اپنے بیٹے پر آئی مصیبت پر اس نے کیسے نگاہیں پھیر لی تھیں۔ حاعفہ اس بات کو نوٹ کر رہی تھی۔ جبیں اور صبا بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔

''میرے ساتھ چلو ناں آپ۔'' وہ مسلسل حاعفہ کو کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ جانے پر مجبور کر رہا تھا۔ جبیں نے حاعفہ کے ہاتھوں سے سعدی کو لیا۔

''آپ جائیں اس کے ساتھ ورنہ جانے کون سی نئی مصیبت کو جنم دے گا۔'' جبیں کی زبان سے ایسے الفاظ سن کر حاعفہ کو کافی مایوسی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں بیگانہ پن نمایاں تھا۔ وہ دھیرے سے پلٹی اور عاطی کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر آگئی۔

''ٹھیک تو ہے ناں میرا بچہ؟'' صبا نے ممتا نچھاور کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ حسام بھی سرگوشی والے لہجے میں کچھ کہہ رہا تھا۔ حاعفہ کا دل بھر آیا۔ عاطی کے ساتھ وقت گزارنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آئی تو وہی منظر آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی ریل کی طرح بار بار چل رہا تھا۔

سب کی بے اعتنائی برتتی آنکھیں، عاطی کا ننھا وجود اور سب کا سعدی کی طرف جھک جانا تھا۔

''نہیں...... میں یہ سب عاطی کے ساتھ نہیں ہونے دے سکتی۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ آنکھوں میں اریب کا چہرہ لہرایا۔

''کہاں ہو آپ اریب...... پلیز جلدی آجاؤ۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔'' اس نے یہ خفگی اپنے عوض بھی محسوس کی تھی۔ آج جب عاطی ان کے لیے غیر ہو گیا، کہیں کل اریب بھی تو نہیں......؟ اور پھر اس کا تعلق بھی تو اریب کی وجہ سے ان سب سے جڑا ہوا تھا۔ اگر اریب کے ساتھ رشتہ ٹوٹا تو اس کا کیا وجود رہ جاتا؟

اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں ٹھونس لیا تھا۔ آنکھوں میں نمی آگئی۔

''پلیز اریب...... جلدی آجاؤ۔ میں بہت اکیلی ہو چکی ہوں۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ پلیز جلدی آجائیں۔'' دل اشک بہاتے بہاتے وہیں خوابوں کی دنیا میں کھو چکا تھا مگر درد تھا کہ چہرے پر عیاں تھا۔

☆......☆......☆

کتنا چپ چاپ ہے ماحول مری بستی کا
ماتمی خانہ بدوشوں کے بسیروں جیسا

وہ یک دم اٹھ بیٹھا تھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسے کسی نے آواز دی تھی۔ دل کی دھڑکنیں بھی بے ترتیب تھی۔ جیسے یہ دھڑکنیں کسی کے ہونے کا یقین دلا رہی ہوں۔ وہ بے یقینی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ مایوسی کے ساتھ وہ دوبارہ بستر پر آ بیٹھا تھا۔

''ایسا کیوں لگ رہا ہے جیسے مجھے کوئی یاد کر رہا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے استفسار کیا تھا اور پھر خود ہی اس خیال کو جھٹک دیا۔

''مجھے کون یاد کرنے لگا؟ آخر کیا تعلق ہے کسی کا میرے ساتھ؟ پرائی دنیا میں پیدا ہونے والا، بھلا کسی کو کیونکر پیارا ہو سکتا ہے؟'' ایک درد اس کے لہجے سے چھلک رہا تھا۔ آنکھیں اس درد کی ترجمان تھیں۔ باہر کی طرف نگاہ دوڑائی تو رات کی تاریکی نے ہر شے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ اس یاد کو ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا سمجھا تھا۔ باہر کی جانب چہرہ کیا اور یونہی بیٹھ کر رات گزرنے کا منتظر رہا۔

صبح ہوتے ہی ایک بار پھر گذشتہ دن کے واقعات نے اس کے دل و دماغ پر دستک دی تھی۔ وہ کھڑا ابھی سوچ رہا تھا کہ کیسے اس بنجر زمین سے پانی جاری ہو سکتا تھا؟ ادھر ابدال اس کے شک کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے یقین دلا رہا تھا کہ وہ سب اتفاق تھا۔ زیادہ سوچنے کی جسارت نہ کرنے پر مگر جو شک ایک بار جنم لے لے اس کا نکلنا محال ہوا کرتا ہے۔

اس کے دل میں بھی ایک شک نے جنم لیا تھا۔ اب اس شک کو دور کرنے کی خاطر اس نے دوسرا قدم اٹھایا تھا۔ ابدال نے ایک بار پھر روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ اپنے قدم آگے بڑھائے اور سب کے سامنے برملا کہا۔

"تمہارے دیوتا کی زبان میں کتنی سچائی ہے۔ یہ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ آج رات مجھ پر جانی حملہ ہونے والا ہے۔" اس نے عبادت خانے میں سب کے سامنے کہا تھا۔ سب یہ سن کر بوکھلا گئے۔ ابدال کی بھی جیسے جان پر بن آئی تھی مگر وہ بے فکر تھا۔ اسے تو اپنے کہے کو غلط ثابت کرنا تھا اور انہیں یقین دلانا تھا کہ جو وہ کہتا ہے یا کرتا ہے، ہر بار ایسا ہو۔ ضروری نہیں۔

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟ یہ سب تم نے کیوں کہا؟" کمرے میں واپس آتے ہی ابدال نے غصے اور فکر مندی کے ملے جلے تاثر میں کہا تھا۔ وہ اب اس بار ابدال کو تسلی دیتا دکھائی دے رہا تھا۔

"تا کہ اس شک کو دور کیا جا سکے کہ وہ سب اتفاق تھا۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھ ابدال کے شانوں پر رکھے تھے۔

"مگر ایسا کہنا ضروری تھا؟ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو ان سب میں؟" اسے اریب کی فکر تھی، تبھی ایسا کہہ رہا تھا۔

"اور کس کا نام لیتا؟ میں کسی کو جان بوجھ کر مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔"

"لیکن اپنا ہی کیوں؟ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو؟" ابدال کا لہجہ فکر کے تاثر سے لبریز تھا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا بھائی جان...... مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے؟ جیسے آپ بھی ان کی باتوں پر یقین کرنے لگے ہو؟" پہلے جملے پر اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا تھا اور پھر مشکوک انداز میں تصدیق چاہی تھی۔ ابدال نے نفی میں گردن ہلانے میں ذرا دیر نہ کی۔

"ایسا سوچنا بھی مت۔ مجھے بس تمہاری پرواہ ہے۔" اس کے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو یقین رکھیں، یہ بھرم آج ٹوٹ کر رہے گا۔ نہ ہی مجھ پر ایسا کوئی حملہ ہوگا اور نہ ہی ان کا گمان یقین کا روپ لے گا۔" اریب کی آنکھوں میں یقین غالب تھا۔ ابدال کے پاس بھی سوائے خاموش رہنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔

رات تک دربانوں کی ایک جماعت کو اریب کے کمرے کے گرد تعینات کر دیا گیا تھا۔ سب چوکنا تھے اور اس حملہ آور کو پکڑنے کے لیے بے قرار دکھائی دیتے تھے۔ ابدال کو بھی کچھ وقت کے لئے اس کے کمرے میں جانے سے روک دیا گیا۔

"لیکن میں اریب کا بھائی ہوں۔ مجھے کیوں روکا جا رہا ہے؟" ابدال نے جبڑے بھینچے کہا تھا۔

"معاف کرنا دیو خاص مگر بڑے پیشوا کا حکم ہے کہ آج کی رات کوئی بھی دیوتا کی آرام گاہ میں داخل نہیں ہوگا۔" ایک دربان نے مودب انداز میں جھکتے ہوئے معذرت چاہی تھی۔ ابدال کی آنکھوں میں نفرت کی ٹیسوں نے جنم لیا تھا مگر وہ برداشت کر گیا اور واپس پلٹ گیا۔

ادھر اریب بھی ان سب حالات سے بے خبر نہ تھا۔ نیندیں اس کی بھی اڑ چکی تھیں۔ کئی بار سونے کی کوشش کی مگر ایک عجیب سی بے چینی اس کے حواس پر طاری تھی۔ کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم ہلکان ہو چکا تھا۔

"کب گزرے گی یہ رات؟" اس نے اکتاہٹ کے ساتھ باہر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ وہاں ہر شے تاریک تھی۔ وہ اٹھا اور پانی کے برتن کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کے جسم سے جیسے جان نکل گئی۔

وہاں کسی نے اس کے ہاتھ کو بری طرح نوچا تھا۔ چیخنا چاہا مگر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا۔ پانی کا برتن نیچے زمین پر آ گرا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز پوری حویلی میں گونجی تھی۔ دربان فوراً اندر داخل ہوئے۔ روشنی کمرے میں کر دی گئی تو سب یہ دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئے کہ وہاں ایک سیاہ لبادے میں آدمی کھڑا تھا۔ ایک ہاتھ اریب کے منہ پر رکھے اور دوسرے ہاتھ میں خنجر لیے وہ اریب پر حملہ کرنے کے لیے تیار دکھائی دیتا تھا۔

"دیوتا......!" سب نے بروقت کاروائی کی اور اس حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔ اریب تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اپنے کہے الفاظ ایک بار پھر سماعت کا حصہ بنے اور آنکھوں کی پتلیاں جیسے پھیلتی چلی گئیں۔ دربان اس حملہ آور کو کھینچتے ہوئے وہاں سے تو لے گئے مگر اس کی ذات کو ایک اندھیر وادی میں دھکیل گئے۔ ایک ایسی وادی جہاں روشنی کا داخلہ ممنوع تھا۔ جس کا آسمان ظلمت کی چادر میں لپٹا ہوا انتہا کا تاریک دکھائی دیتا تھا۔ چاند، ستارے سب بے نور تھے۔ زمین انتہا کی بنجر، جہاں صدیوں تک کسی کھیتی کی امید نہ ہو۔ وہ ایسی ہی وادی میں دھکیلا جا چکا تھا۔

تبھی وہاں پر ابدال بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اریب کو ایسے اکڑوں بستر پر سمٹا ہوا دیکھ کر آگے بڑھا۔ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں گویا ہوا۔

"اریب تم ٹھیک تو ہو ناں؟ کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی تمہیں؟" وہ تو کچھ بھی سننے سے عاری دکھائی دیتا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ابھی تک وہ حملہ آور تھا جو کسی بھی لمحے اس پر خنجر سے وار کر سکتا تھا۔

"اریب...... کیا ہوا تمہیں؟ کچھ بولتے کیوں نہیں؟" اس بار اس کا وجود جھنجھوڑا گیا تھا۔ گردن کو خم دیتے ہوئے اس نے ابدال کی طرف دیکھا تھا۔ بے یقینی کا عنصر دیکھ کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

"میرا کہا پھر سچ ہو گیا۔" اس نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ابدال نے نفی میں سر ہلایا اور اس کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

"نہیں اریب...... یہ سچ نہیں ہے۔ سب جھوٹ ہے۔ سب اتفاق ہے۔ تم بس میرے بھائی ہو۔ سمجھے تم۔" شک یقین کی راہیں طے کر رہا تھا اور جھوٹ سچ بننے کی سعی میں سرگرداں دکھائی دیتا تھا۔

"مگر وہ کہتے ہیں، میں دیوتا ہوں۔" بے یقینی اپنی ذات کے خلاف جنم لے چکی تھی۔ جس توہمات سے بچانے کی خاطر ابدال ساری عمر قربانیاں دیتا رہا، بالآخر اریب اس جال میں پھنس ہی چکا تھا۔ اپنی کہی باتوں کو سچ ہوتا دیکھ کر اس کا دل اس اندھیر دنیا کو اپنا سمجھنے لگا اور یہاں کے باسیوں کے الفاظ کو سچ کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔

"وہ جھوٹ کہتے ہیں۔" دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ سموتے ہوئے اس کے وجود کو جھنجھوڑا تھا مگر ایسے جیسے کوئی مرجھایا ہوا پھول ہو اور اسے سیراب کر کے کھلنے کی امید کی جا رہی ہو۔

"نہیں بھائی...... وہ جھوٹ نہیں بولتے...... میں دیوتا......!" ہکلاتے ہوئے اس کے لبوں سے آدھے ادھورے الفاظ جاری

ہو رہے تھے۔ ابدال کی آنکھوں میں بھی تفکر نے جنم لیا تھا۔ نفی میں سر ہلاتا ہوئے، بکھرے وجود کو اپنے گلے سے لگایا۔ پشت تھپتھپائی اور اس کے اشک پونچھتے ہوئے حوصلہ دیا۔

''تم میرے بھائی ہو......صرف میرے بھائی اور کچھ نہیں۔'' سچائی کو سمجھانے کی اپنی تئیں کوشش کی جا رہی تھی مگر شک نے تو جیسے بنیادیں ہلا دی تھیں۔ تبھی حقیقت بھی ظلمت میں کہیں کھو کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

پلٹ کے آ گئی خیمے کی سمت پیاس مری

پھٹے ہوئے تھے سبھی بادلوں کے مشکیزے

یہ فیصلہ درست تھا یا غلط؟ وہ نہیں جانتی تھی مگر عاطی کے لیے یہ سب کرنا ضروری تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عاطی محرومیوں کے سائے تلے پرورش پائے۔ جہاں اس کو صبح شام اس کے غیر ہونے کا یقین دلایا جائے۔

آج صبح ہی اس نے عاطی کے کمرے سے اس کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ دل اگرچہ خون کے آنسو رو رہا تھا مگر وہ ان آنسوؤں کو اپنی ذات میں ہی سمیٹے ہوئے تھی۔ ایک دکھ اریب کا تھا اور اب عاطی کا۔ دونوں جو اسے اپنی جان سے زیادہ پیارے تھے، دور ہوتے جا رہے تھے۔ عاطی اس کے سامنے بیڈ پر لیٹا تھا۔ اپنی ذات کے متعلق ہونے والے فیصلے سے لاتعلق۔ خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا۔

''مجھے معاف کر دینا آپی! میں آپ کے احسان کا بدلہ نہیں اتار سکی۔ عاطی کو وہ خوشیاں نہیں دے سکی جو میں نے اسے دینا کا خود سے وعدہ کیا تھا۔ مجھے معاف کر دینا۔'' خدیجہ کی یاد نے آج پھر دستک دی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے عاطی کے بالوں کو سہلایا اور پیار سے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ آج اس بوسے میں بھی کسی اپنے کی چاشنی محسوس ہوئی تھی۔ ایسی خوشبو، جو وہ پہلے محسوس کر چکی تھی۔ آج پھر اس کے جسم میں تحلیل ہونے لگی تھی مگر درد کے پنوں میں لپٹی یہ ذات آج کسی بھی شے کو خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ اس نے اپنے رخسار پر بہتے آنسوؤں کو بائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھا اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

''نہیں......اب اور نہیں...... مجھے کرنا ہوگا یہ سب۔'' وہ فوراً وارڈروب کی طرف پلٹی تھی۔ جہاں ایک سوٹ کیس تھا۔ اسے کھولا اور عاطی کے تمام کپڑے اس میں رکھنے لگی۔ وہ تمام تر کھلونے جو گھر والوں نے اس کے لیے خریدے تھے۔ انہیں ہاتھ تک نہ لگایا بس چند ایک کھلونے جو بذاتِ خود اس نے خریدے تھے وہ بھی کپڑوں کے ساتھ رکھ دیئے۔

دس منٹ تک وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔ پلٹ کر دیکھا تو عاطی ابھی تک سویا ہوا تھا۔

''مجھے معاف کر دینا میرے بچے! مگر تمہاری بھلائی کے لیے مجھے تمہیں خود سے دور بھیجنا پڑ رہا ہے لیکن میں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی......کبھی نہیں۔'' اس نے عاطی کی ذات کو سامنے رکھتے ہوئے خود سے وعدہ کیا تھا اور آگے بڑھ کر اسے اٹھایا۔

"عاطی بیٹا!اٹھو......صبح ہو گئی ہے۔" آنسوؤں میں رندھا ہوا لہجہ گویا ہوا تھا۔

"آنٹی......آج تو سنڈے ہے۔" اس نے کمبل کو چہرے تک کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

"آج آنٹی تمہیں کہیں لے کر جا رہی ہے۔" اس نے ہکلاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

"لیکن مجھے کہیں نہیں جانا......مجھے بس سونا ہے۔" وہ اٹھنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔

"ضدمت کرو عاطی......اچھے بچو کی طرح اٹھو۔" کافی دیر تک وہ اسے اٹھانے کی کوشش کرتی رہی مگر وہ ہر بات کو ٹال دیتا۔ جب صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو ایک تلخ آواز فضا میں گونجی تھی۔

"سنتا نہیں ہے تمہیں عاطی؟ چلو......اٹھو۔" وہ ایسے چیخنا نہیں چاہتی تھی مگر اپنی ذات پر جبر کرتے ہوئے اس نے خود کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔

حاعفہ کا یہ تلخ انداز دیکھ کر ننھا سا وجود سہم کر رہ گیا۔ دفعتہً اٹھ بیٹھا۔ استفہامیہ نگاہوں نے خود میں سمٹے ہوئے وجود کی طرف دیکھا تھا۔

"چلو میرے ساتھ......اور خبردار اب اگر ایک جملہ بھی زبان سے جاری کیا تو!" اس نے تنبیہ کی تھی۔ وہ سہا سہا اس کا کہا مانتا چلا گیا۔ عین اسی وقت دروازے سے جبیں بھی گزری تھی۔ اس نے یہ سب دیکھا تھا مگر خاموش رہی۔ پلٹ کر ایک سوال بھی نہ کیا کہ حاعفہ تم عاطی سے ایسے بات کیوں کر رہی ہو؟ اس رویے نے اسے مزید توڑ کر رکھ دیا تھا۔

"چلو عاطی......!" اس نے بائیں ہاتھ سے عاطی کا بازو پکڑا اور دائیں ہاتھ سے سوٹ کیس گھسیٹتے ہوئے باہر لاؤنج کی طرف آئی۔ جہاں سب موجود تھے۔ سحر فاطمہ جہانزیب کو چائے دے رہی تھیں۔

"میں عاطی کو ہاسٹل میں داخل کروانے جا رہی ہوں۔ یہاں رہ کر شاید وہ اچھے سے اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکے گا۔" اس نے دل پر پتھر رکھ کر یہ جملہ کہا تھا اور گمان کیا تھا کہ شاید کوئی اس سے جواز پوچھے پر مگر کسی نے سوال نہ کیا۔ سب خاموش تھے۔ جو زہر قاتل کے مترادف تھا۔

بھیگتی پلکوں کے ساتھ وہ آگے بڑھی۔ عاطی نے مزاحمت کرنا چاہی مگر وہ نہ رکی۔

"آنٹی ...... مجھے کہیں نہیں جانا...... مجھے یہیں رہنا ہے۔ آئندہ میں کسی کو تنگ نہیں کروں گا۔" وہ کہہ رہا تھا مگر شاید سب اس معصوم کے الفاظ سننے سے عاری تھے۔ وہ ننھا وجود پہلے بھی یتیم خانے کی زندگی گزار کر آ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ اکیلے رہنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ تبھی آہ بکا کر رہا تھا مگر کوئی سننے والا تو ہو......کوئی اس کے درد کو سمجھنے والا تو ہو......!

وہ اپنی طرف سے شہر کے ایک اچھے سے ہاسٹل میں داخل کروا کر اب واپس آ رہی تھی۔ تمام فارمیلیٹیز پوری کرنے کے بعد اب وہ واپس جانے کے لیے پلٹی تھی۔ آخری بار اس نے عاطی کو پیار کرنا چاہا تبھی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھی تھی۔

"میں جانتی ہوں آپ مجھ سے خفا ہو عاطی مگر میں کیا کروں ایسا کرنا ضروری تھا۔" اس نے اس کے رخسار کو چھونا چاہا تھا مگر وہ دو قدم پیچھے کھسک گیا۔ معصوم دل اپنے من میں جانے کیا گمان کیے ہوئے تھا۔ آنکھوں میں نفرت اور اپنے لیے فقط حقارت محسوس کر رہا تھا۔

"مجھے کوئی بات نہیں کرنی...... چلی جائیں آپ یہاں سے۔" وہ غرایا تھا اور بھاگتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر رہ گئی۔ آنکھوں میں آنسو تھے اور دل میں ایک دردِ گراں کا مداوا کرنے والا کوئی نہ تھا۔

"مجھے معاف کر دینا...... معاف کر دینا......" زبان سے فقط یہی کلمات جاری تھے۔

☆......☆......☆

کون ہے معتبر زمانے میں......!

کس کے وعدے پہ اعتماد کریں؟

ہر لمحہ الجھتی زندگی میں ماضی کہیں مدفون ہو چکا تھا۔ اس کی سوچ کا زاویہ اپنی ذات کی حدوں سے باہر نکلنے کو تیار ہی نہ تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ اس کی زندگی کا ایک حصہ اسی دنیا میں کہیں منتظر ہے۔ جو پل پل اس کی راہیں تکتا ہے مگر اسے کہاں پروا تھی؟ جب اپنی ذات سوالوں کی بھنور میں پھنس کر رہ گئی ہو اور جواب کا پہلا حرف بھی آپ کے سامنے نہ آئے تو دنیا جہاں کی ہر شے ایسے شیشے کے غلاف میں قید ہو کر رہ جاتی ہے جس کے آر پار دیکھا تو جا سکتا ہے مگر درد کو محسوس کرنا آسان نہیں ہوتا یا شاید ناممکن ہوتا ہے۔

وہ بھی اپنی ذات کی کھوج لگا رہا تھا۔ کون ہے؟ کیوں ہے؟ آسمان کو تکتے ہوئے دل میں ابھرتے سوالوں کا جواب تراش کر رہا تھا حالانکہ جواب دینے والا ماخذ خود اس کے پاس تھا مگر وہ من پسند جواب چاہتا تھا۔ تبھی دل کو سکون میسر نہ آیا تھا۔

ذہن پچھلے منظر کی، کسی فلم کے فلیش بیک کی طرح عکاسی کر رہا تھا۔ جہاں کچھ لوگ بنجر زمین سے آب رواں جاری کر رہے تھے تو کہیں کوئی اس کے وجود پر حملہ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

ایک کے بعد ایک ضرب استادہ کھڑے وجود پر لگ رہی تھی۔ چہرے کے نقش ہر لمحہ بدل رہے تھے۔ جب ضرب ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ برجستہ چلایا تھا۔

"نہیں......! یہ سب جھوٹ ہے۔ سب جھوٹ......!" مٹھیاں بھینچے وہ آنکھیں زبردستی بند کیے ہوئے تھا۔ ہر شے ہنستی دکھائی دے رہی تھی مگر وہ یاسیت کے بھنور میں الجھا کھڑا تھا۔

"بھائی جان ٹھیک کہتے ہیں...... میں کوئی دیوتا نہیں ہوں...... نہیں ہوں میں دیوتا...... میں اریب ہوں...... میری پہچان ایک عام انسان کی سی ہے......اور کچھ نہیں...... کچھ بھی نہیں۔" زبان سے ایسے الفاظ جاری تھے جن کی تصدیق، خود اس کا دل کرنے سے عاری دکھائی دیتا تھا۔

اندر کا شور سن کر باہر سے ایک پیشوا اندر داخل ہوا۔اس کا چہرہ مضطرب دکھائی دیتا تھا۔شاید وہ اریب کو لے کر خاصا پریشان تھا۔

''آپ ٹھیک تو ہیں دیوتا؟'' آتے ہی اس نے مؤدب لہجے میں کہا تھا۔

''بند کرو اپنی بکواس......میں اریب ہوں۔سمجھے تم۔'' وہ غرایا تھا۔پیشوا ٹھٹک کر رہ گیا۔اریب غصے میں کھڑکی کی طرف بڑھا مگر ذہن ماؤف سا ہو چکا تھا۔تبھی دو قدم پیچھے ہٹا۔پانی کے گلاس کی طرف دیکھا، جو مٹی کا بنا ہوا تھا۔ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھایا مگر ہونٹ کے قریب لے جاتے ہی اس کی آنکھوں میں جیسے قہر اتر آیا تھا۔گھونٹ جسم میں اتارنے کی بجائے زمین کا مقدر بنا دیا اور گلاس کو غصے میں زمین پر دے مارا۔پیشوا یہ سب کھڑا دیکھ رہا تھا۔

''آپ اپنے آپ کو اتنی مشکل میں نہ ڈالیں دیوتا......آپ کی صحت کے لیے یہ بات اچھی نہیں ہے۔'' اسے اریب کی فکر تھی تبھی اس کی آواز میں درد تھا۔

''اب تم لوگ مجھے سمجھاؤ گے کہ میرے لیے کیا بہتر ہے کیا نہیں؟ جو لوگ اپنی اوقات نہیں سمجھ سکتے......!'' اس نے طنزیہ جملہ کسا تھا۔آنکھیں حقارت سے پھیر لی گئیں۔

''آپ اس وقت غصے میں ہیں......آپ کو آرام کی ضرورت ہے دیوتا۔'' وہ اگرچہ اس سے عمر میں بڑا تھا۔ایک دو سال نہیں بلکہ شاید اس کی باپ کی عمر کا تھا مگر لہجے میں شفقت انتہا کی تھی۔ایسا محض اس لیے تھا کہ وہ اسے دیوتا سمجھتے تھے اور دیوتا کے سامنے اپنے لہجوں کو نرم رکھنا ان کے لیے ضروری تھا۔

''میرے صبر کو مت آزماؤ، مجھے بار بار دیوتا کہہ کر......کہیں ایسا نہ ہو، اس بار میں تمہارے دیوتا کو جان سے ہی نہ مار دوں؟'' اس نے جبڑے بھینچے اشتعال بھرے انداز میں کہا تھا۔یہ سن کر اُس کی روح تک کانپ اٹھی تھی۔

''نہیں......دیوتا......ایسا ہرگز مت کیجیے گا۔'' وہ فکر والے لہجے میں گویا ہوا تھا۔آگے بڑھ کر اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سینتا۔اریب اس کی حرکات کو استفہامیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔اگرچہ آنکھوں میں اس کے لیے حقارت تھی مگر پھر بھی لب خاموش تھے۔

''آپ نہیں جانتے آپ کی اس گاؤں کو کتنی ضرورت ہے۔آپ کے واپس آنے کی امید میں ہی تو یہ گاؤں ابھی تک اپنے آپ کو برقرار رکھ سکا ہے۔اگر آپ کے آنے کی امید نہ ہوتی تو یقین مانیں، اس گاؤں کے باسی کب کے اپنے آپ کو فنا کر چکے ہوتے۔دنیا بھول چکی ہوتی کہ استیاوان نامی گاؤں بھی کبھی اس دنیا کا حصہ تھا۔جو زمین سے فصلوں کی بجائے سونا اگاتا تھا۔خدارا! دیوتا دوبارہ اپنے آپ کو اس گاؤں سے الگ کرنے کا سوچیے گا بھی مت! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔'' اس کے لب و لہجے کی عاجزی نے اریب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔طبیعت کا اشتعال دھیرے دھیرے ٹھنڈا ہوتا چلا گیا۔شکن پڑھنے کی خو نے سب کچھ اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔سامنے والا سچائی کا پیکر دکھائی دے رہا تھا۔صداقت اس کے وجود سے ٹپک رہی تھی۔آنکھوں میں آنسو اور بے بسی سب سچ تھے۔

''اگر آپ کہو تو میں آپ کے پاؤں میں گر کر بھیگ مانگنے کے لیے تیار ہوں۔'' اس نے اب انتہا کر دی تھی۔ وہ آدمی جو اریب سے دوگنی عمر کا تھا۔ اس کے پاؤں پکڑ رہا تھا۔ اریب کا وجود تڑپ اٹھا تھا۔ برق رفتاری سے جھکا اور اس پیشوا کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟'' اس کی پیشانی پر شکنوں کا جواز بدل چکا تھا۔ حیرت چہرے پر انتہا درجے کی تھی۔

''ہمارے گاؤں کو چھوڑ کر جانے کی پھر کبھی بات مت کیجیے گا۔ ہمارا گاؤں آپ کے سوا مٹی کے ذرے کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہاں جو کچھ بھی ہے، سب آپ کی بدولت ہے۔'' اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا تھا۔ اریب نے گہری سانس لی اور اپنے حواس کا بخوبی استعمال کرتے ہوئے اس کو حقیقت سے آگاہ کرنے کی سعی کی۔

''میں نہیں جانتا کہ آپ کی باتوں میں کتنی سچائی ہے لیکن یقین مانیں میں عام انسان ہوں...... میرا یقین کریں۔ بالکل آپ کی طرح، یہاں جو کچھ بھی ہوا، سب اتفاق تھا۔ میرا ان سب میں کوئی بھی عمل دخل نہیں تھا۔'' جب سمجھنے والوں کی عقل پر پردے ہوں تو سچائی سامنے اگرچہ چیخ چیخ کر اپنے ہونے کا ثبوت دے رہی ہوں مگر وہ نہ ہی اسے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی سن سکتے ہیں۔ ایسا ہی اس کے ساتھ تھا۔ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے اس نے اریب کی باتوں کو جھٹلا دیا۔

''ایسا آپ کو لگتا ہے مگر ایسا ہے نہیں۔''

''ایسا ہی ہے...... یقین کرنے کی کوشش تو کریں۔'' وہ برجستہ پلٹا تھا۔ آنکھوں میں ایسی چمک جسے دیکھ کر کوئی بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے اور ان آنکھوں میں ڈوبتا چلا جائے۔ وہ بھی اب ان آنکھوں کا شکار ہو چکا تھا۔ ایک قدم پیچھے کی جانب کھسکا۔

''ٹھیک ہے۔ مان لیتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے کہا وہ سچ ہے۔'' یہ سننا تھا کہ اریب کا چہرہ چہک اٹھا تھا۔ اس کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ دل کو قدرے سکون ملا تھا۔

''لیکن یہ اتفاق آپ کے ساتھ ہی کیوں ہوا؟ میرے ساتھ کیوں نہیں؟ گاؤں میں موجود کسی اور کے ساتھ کیوں نہیں؟ اور سب سے بڑھ کر آپ کے بھائی دیوخاص کے ساتھ کیوں نہیں؟ صرف آپ کے ساتھ ہی کیوں؟'' وہ اس کے وجود پر یکے بعد دیگرے ضرب لگا رہا تھا۔ اریب کی آنکھیں بھی پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ دیکھ تو اس پیشوا کی طرف رہا تھا مگر جانے کون سا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

پتھر سے پانی کا نکلنا اور جانی حملہ ہونا اور سب کا اس کو دیوتا پکارنا۔

ایک کے بعد ایک منظر اپنی جگہ بدل رہا تھا۔ آنکھیں یک ٹک اسی پیشوا پر تھیں۔ قدم پیچھے کی جانب کھسکے تو پیشوا کو اپنا پلڑا بھاری ہوتا دکھائی دیا۔ اریب کے لب بھی بڑبڑائے تھے مگر کوئی بھی کلام جاری ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''بتائیے دیوتا! کیا یہ سب اتفاق تھا؟ نہیں...... یہ سب اتفاق نہیں بلکہ حقیقت تھا اور اس حقیقت کو آپ جتنی جلدی قبول کر لیں اتنا ہی آپ کے لیے اور ہم سب کے لیے بہتر ہوگا۔'' خود ہی سوال پوچھ کر جواب دیا جا چکا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں میں ذرا سی جنبش ہوئی۔

غیر یقینیت یقین کا سفر طے کرتی دیکھائی دی۔

پیشوا نے اپنے چہرے کا رخ پھیرا اور باہر کی راہ لی۔ اریب اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ قدموں کی چاپ مدہم ہو رہی تھی مگر وہ ان قدموں کی چاپ کو سن سکتا تھا۔ کچھ سرگوشیاں...... جو بہت دور ہو رہی تھیں۔ وہ سن سکتا تھا۔ چڑیوں کی چہچہاہٹ جو باہر میدان میں پانی کی تلاش کرتے فضا میں گونج رہی تھیں۔ جانے انجانے میں اس کی سماعت کا حصہ بن چکی تھی۔ ہر وہ آواز جو ایک عام آدمی کے لیے نا قابل سماعت تھی۔ اس کے لیے ایک عام امر تھا۔

''میں عام نہیں...... میری ذات، عام نہیں...... میری شخصیت، میری نہیں...... سب سچے...... میں جھوٹا...... میں ہی ہوں ان کا......؟'' بکھرے لفظوں کے جال میں وہ خود بری طرح الجھ کر رہ گیا۔ سر پر کوئی یکے بعد دیگرے ہتھوڑوں سے ضرب لگاتا جا رہا تھا۔ نفی میں سر ہلاتا تو کبھی حیرت سے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتا، جب کچھ سمجھ نہ آیا تو زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح، وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ حالات نے اسے ہیجانی کیفیت سے دوچار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

☆......☆......☆

میں جانتا ہوں عدالت کی دسترس کو مگر

میں کیا کروں کہ مرے ہر طرف کٹہرے ہیں

ابدال کے لئے یہ سب نا قابل یقین تھا۔ یہ سب روکنے کی اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی مگر سب کچھ جیسے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ برسوں کی محنت ایک پل میں رائیگاں ہوتی دیکھائی دی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا بھائی اس نشست پر براجمان ہونے جا رہا تھا جس سے دور کرنے کے لیے اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

''اریب! تم ایسا نہیں کر سکتے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ سب کچھ غلط ہے تم کیسے ہاں کر سکتے ہو؟'' دیوتا کے منصب پر فائز ہونے کا سنتے ہی جیسے ابدال کے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ وہ بھاگتا ہوا اریب کے پاس آیا تھا۔ جہاں کئی دربان موجود تھے۔ جنھوں نے ابدال کو باہر ہی روک لیا۔ اریب کی نظر پڑی تو اس نے اندر آنے کی اجازت دی اور باقی سب کو باہر بھیج دیا۔ اس کا چہرہ سفاک دیکھائی دیتا تھا۔ گردن پھیر کر وہ کوئی شے ڈھونڈنے کا بہانہ کر رہا تھا۔

''خاموش کیوں ہو اریب؟ میری بات کا جواب دو؟ کیوں تم اس دلدل سے نکلنے کی بجائے اس میں دھنسنے کی کوشش کر رہے ہو؟'' اس نے دونوں شانوں سے پکڑ کر اسے جھنجوڑا تھا مگر وہ تو جیسے ساکت تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں میں ذرا سی جنبش ہوئی، سانسوں میں بھی ہڑبڑاہٹ محسوس ہوئی تھی مگر ایک خنکی تھی جو جسم میں سرایت کر چکی تھی۔ نگاہیں جھکی جھکی سی تھیں۔ جیسے کوئی چوری پکڑے جانے کا خوف ہو۔

''نظریں جھکانے سے کچھ نہیں ہوگا اریب...... تمہیں میرے سوالوں کے جواب دینے ہونگے۔ کیوں تم دیوتا کے منصب پر فائز

ہونے جا رہے ہو؟ سب جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب تو ہم پرستی ہے، پھر بھی؟''

''ہاں......پھر بھی......!'' وہ برجستہ چلایا تھا۔ آواز میں سختی دیکھ کر ابدال کا جسم جیسے ساکت رہ گیا۔ آنکھیں یک ٹک اسے دیکھتی رہیں۔

''مگر کیوں؟'' کھوئے کھوئے انداز میں سوال داغا گیا تھا۔

''کیونکہ میں تھک چکا ہوں۔ اپنی شناخت ڈھونڈتے ڈھونڈتے......!'' اس کی حالت کسی ایسے مسافر کی مثل تھی جو برسوں سے عرب کے صحرا میں منزل کا متلاشی ہو مگر منزل دہکتے سورج کے نیچے تانبے کی مثل زمین میں کہیں کھو کر رہ گئی ہو۔ تاحد نگاہ فقط ریت کے بلند و بالا ٹیلے ہوں، جنہیں اس امید پر پار کیا جا رہا ہو کہ شاید اُس پار منزل کا کوئی سراغ ملے مگر افسوس......ایک مسافت طے کرنے کے بعد نئی مسافت منتظر رہتی ہے۔

اریب کی اس حالت کو ابدال اچھے سے سمجھ سکتا تھا۔ تبھی دھیرے سے آگے بڑھا۔ اس کے شانوں پر شفقت بھرے ہاتھوں کو رکھا۔

''تمہاری پہنچان اریب ہے۔'' لہجے میں ایک مٹھاس تھی۔

''اور دیوتا......وہ کون ہے؟ وہ کس کی ذات ہے؟'' ایک تشنگی باقی تھی۔ جو اس لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

''وہ سب شعور سے بالاتر ہے......جس کی کوئی حقیقت نہیں۔'' سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی۔

''اگر اُس کی کوئی حقیقت نہیں ہے تو یہاں کے لوگ کسی دیوتا کے منتظر کیوں تھے؟ کیوں انہوں نے اپنی زندگی کے شب و روز کسی ایک انسان کی تلاش میں گزار دیئے؟ آخر کچھ تو حقیقت تھی ناں اس ذات میں۔'' وہ رندھے ہوئے لہجے میں کہتا جا رہا تھا۔ آنکھوں میں چمک ابھرنے لگی تو ابدال کے دل میں ایک ڈر بیٹھ گیا۔ کسی اپنے کے کھو جانے کا ڈر......!

''وہ سب نادان تھے۔ نہیں جانتے تھے کہ انسان انسان ہوتا ہے کوئی دیوتا نہیں۔'' وہی جملہ دہرایا گیا جو شاید سننے کی اسے امید تھی۔

''تو آپ نے کیوں مجھے ان سب سے بچایا؟ اگر یہ نادان تھے تو آپ تو اپنے آپ کو عقل مند سمجھ رہے تھے ناں......آپ نے کیوں مجھے دیوتا سمجھ کر یہاں سے دور لے جانا چاہا۔'' اریب کے اس جملے نے ابدال کے ذہن پر گہری ضرب لگائی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

''آپ لاکھ جھٹلائیں مگر حقیقت تو یہی ہے ناں بھائی جان کہ آپ نے بھی مجھے دیوتا سمجھا تھا۔ مثبت پہلو میں نہ سہی مگر سمجھا تو تھا ناں......!'' وہ لاجواب تھا۔ اریب کا ایک ایک لفظ سچ تھا۔ اریب کو سب سے دور لے جانے کا جواز کیا تھا؟ شاید وہ اب سمجھ چکا تھا۔ ہاتھ خود بخود اریب کے شانوں سے پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ اریب کو اپنے سوالوں کا جواب مل چکا تھا۔ ایک آنسو جو کب سے پلکوں پر چمک رہا تھا۔ ہوا کے پروں پر سوار اپنی منزل پر گامزن ہو گیا۔ وہ اذیت سے مسکرایا اور اپنا چہرہ پھیر لیا۔ ہاتھ ایک گلدان پر رکھا، جس میں کئی پھول تھے۔ جو افسردہ دیکھائی دیتے تھے۔

''لیکن اریب......!'' وہ ہکلاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ اریب برجستہ پلٹا اور نفی میں گردن ہلائی۔

"اب وقت گزر چکا ہے بھائی جان۔ شاید قسمت میں یہی لکھا تھا۔" وہ دھیرے سے کہتے ہوئے ذرا قریب ہوا۔ ابدال یک ٹک اریب کو دیکھے جا رہا تھا۔ آنکھوں میں درد اور دل میں بے چینی و تڑپ یکساں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ بڑھا کر ابدال کا دائیاں ہاتھ پکڑا تھا۔ جسم میں ایک لہر سرایت کر گئی اور درد کی شدت بھی بڑھنے لگی تھی۔

"مجھے معاف کر دینا بھائی جان...... میں آپ کی قربانیوں کا صلہ نہیں دے سکا۔ آپ نے محض میری خاطر نا جانے کتنی مصیبتیں کاٹیں اور میں آج ان کا صلہ اس روپ میں دے رہا ہوں لیکن کیا کروں میں؟ اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نظر نہیں آتا۔ آپ سچے...... میں سچا مگر پورا گاؤں؟ ان سب کو کیسے یقین دلاؤں؟ ہم دونوں چیخ چیخ کر بھی کہیں گے ناں مگر یہ لوگ ماننے والے نہیں۔" وہ ہار تسلیم کر چکا تھا مگر ابدال ایسا نہ تھا۔ زمانے نے اسے وقت کے آگے سر خم کرنا نہیں سکھایا تھا۔ وہ آخری سانس تک جستجو کے حق میں تھا۔ اپنے ہاتھوں کو جھٹکے سے کھینچا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی توہم پرستی کی بھینٹ چڑھ جاؤ؟" گردن کو ہلکا سا خم دیئے سوال داغا گیا۔

"اور کیا کروں میں؟" ایک شکست خوردہ لہجہ جھلاتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ اس بار ابدال اذیت کے ساتھ مسکرایا تھا۔ اریب تلملا کر رہ گیا۔

"مجھے بھائی جان کہتے ہو مگر اپنے بھائی جان کا کہا نہیں مانتے۔ میری قربانیوں کا احترام کرتے ہو مگر ان قربانیوں کے پیچھے پیاس کو نہیں پہنچانتے...... اس سے بہتر ہے کہ تم نہ ہی مجھے اپنا بھائی کہو اور نہ ہی میری قربانیوں کو اپنی یادداشت کا حصہ بناؤ۔" ایک ایک لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ اریب کی آنکھیں پرنم دکھائی دینے لگیں۔ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگا تو ابدال نے اسے ہاتھ کے اشارے سے ایک فیصلے پر ہی روک دیا۔

"نہیں اریب...... اگر تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی عزت ہے ناں تو یہ سب چھوڑ دو گے...... چھوڑ دو گے سب۔" وہ دھیرے سے کہتے ہوئے پیچھے کی طرف کھسکنے لگا تھا۔ بے چین اور الجھنوں میں الجھا ہوا وجود اب ایک ایسی دیوار پر کھڑا خود کو محسوس کر رہا تھا جس کے ایک طرف بھائی کا ساتھ ہے تو دوسری طرف موت۔ اسے چاہیے تھا کہ بھائی کا ساتھ چنے مگر جانے کیوں اس کے قدم خود بخود موت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ موت جسم کی نہیں بلکہ روح کی موت تھی۔ ضمیر کی موت تھی۔ توہم پرستی کی دنیا میں خواہشوں اور تمناؤں کی موت تھی۔

"دیوتا...... سب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔" پیچھے سے ایک آواز سنائی دی تھی۔ پلکوں پر چمکتا ایک آنسو ہوا کے سنگ ہو لیا۔ گردن ہلائی اور دائیں ہاتھ سے اپنے رخسار پر بہتے خشک راستوں کو پونچھا۔

"معاف کر دینا بھائی جان...... مگر میں مجبور ہوں۔" دل ہی دل میں اسے کہا تھا اور قدم مرکزی عبادت خانے کی طرف اٹھنے لگے تھے۔ وہ ابھی راہداری میں ہی تھا کہ پورا عبادت خانہ دیوتا کے حق میں نعروں سے گونج اٹھا تھا۔ ہر نعرہ اس کے وجود پر ضرب لگاتا۔ اس

کے ضمیر کو ملامت کرتا۔ ایک بھائی کی قربانیوں کا مذاق اڑاتا۔

''رک جاؤ اریب...... خدا کے لیے رک جاؤ۔'' ابدال ایک فاصلے پر کھڑا سب دیکھ رہا تھا اور خاموش لبوں سے اس سے فریاد کر رہا تھا۔ اریب کی نگاہیں اس جانب اٹھیں اور لمحہ بھر کے لیے قدم رک گئے۔

''میں شاید آپ کا بھائی بننے کے قابل ہی نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دینا۔'' خاموش لبوں سے ہی جواب دیا گیا تھا۔ پیچھے سے ایک پیشوا نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے تھے۔ وہ آگے کی جانب بڑھا۔

سرخ لباس، جو شاید ہی اس نے آج سے پہلے زیب تن کیا ہو، ایک عجیب و غریب کے نقش و نگار سے چمک رہا تھا۔ روشنی کا فوارا اس کے لباس سے پھوٹتا اور ہر آنکھ کو جھکنے پر مجبور کر دیتا۔ کئی مذہبی پیشوا اس کے آس پاس تھے۔ ابدال کو ان سب سے دور رکھا گیا۔ کسی کو بھی اب اریب کے پاس آنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ اب ایک عام آدمی تھا۔ جس کی کوئی وقعت نہ تھی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ سب اپنی عبادت میں مصروف تھے جبکہ اریب اور ابدال کی آنکھیں ایک دوسرے کے سوالوں کے جواب دے رہی تھیں۔ حلق خشک ہو چکا تھا۔

''اب رسم شروع کرنی چاہیے۔'' ایک بزرگ بول اٹھا تھا۔ سامنے ایک تخت نما شے تھی۔ جہاں ایک تھال تھی۔ جس میں ایک پگڑی تھی۔ جسے پہن کر وہ دیوتا کے منصب پر فائز ہو جاتا، اس کے بعد وہ چاہ کر بھی خود کو ان بیڑیوں سے آزاد نہیں کروا سکتا تھا۔

''بالکل۔'' اثبات میں جواب دیا گیا اور ایک بڑی عمر کا پیشوا آگے بڑھا۔ اُس کا ہر اٹھتا قدم جیسے وہ زمین پر نہیں ابدال کے دل پر تھا۔ اس کا پورا وجود تلملا اٹھا تھا مگر مجبور تھا۔ خاموش لب کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔

ابھی اس نے وہ پگڑی اٹھائی ہی تھی کہ باہر سے ایک شور سنائی دیا۔ سب کا دھیان باہر کی طرف متوجہ ہوا۔ بزرگ کے ہاتھ، جن میں پگڑی تھی، ہوا میں معلق تھے۔

''یہ شور......؟'' سوال پوچھنے والے نے پوچھا تھا۔ اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتا، دربان سامنے سے آتے ہوئے نظر آئے وہ کسی شخص کو بری طرح پکڑ کر گھسیٹ رہے تھے۔

''گستاخی معاف دیوتا...... مگر یہ شخص جس نے آپ پر جانی حملہ کیا تھا۔ یہاں سے بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' یہ سن کر پیشواؤں کا خون کھول اٹھا تھا۔

''دیوتا کو ہم سے دور کرنے والے کی سزا فقط موت ہے۔'' رہبر نے کہا تھا جو سب کا مذہبی امام تھا۔

''کون سا دیوتا...... یہ؟ ایک عام انسان؟'' اُس شخص نے طنزیہ انداز میں قہقہہ لگایا تھا۔ اگرچہ اس کے دونوں بازو دربانوں کی گرفت میں تھے مگر اسے کچھ خوف نہ تھا۔ سب کے دل میں جیسے بے چینی بڑھنے لگی تھی۔ اپنے دیوتا کے خلاف بھلا وہ کیونکر کچھ سن سکتے تھے؟

”تمہاری اتنی ہمت......تم جانتے نہیں ہو لڑکے، دیوتا ہمارے لیے کیا ہیں؟ بس دیوتا کی رسم پوری ہو جائے تو سب سے پہلے تمہیں پھانسی پر لٹکایا جائے گا۔“ رہبر نے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا اور اپنے ہاتھوں میں موجود پگڑی کو اریب کے سر کی طرف بڑھایا۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں۔ بس وہ اب کسی کرامت کا ہی منتظر تھا۔ جو اسے اس دلدل میں ڈوبنے سے بچا لے۔ ابدال بھی خاموش تھا۔ ساری محنت تو رائیگاں جا چکی تھی۔ اب بھلا کون سی تدبیر کام آتی؟

”مجھے اپنی موت کا کوئی غم نہیں......لیکن کیا اس شخص کو بھی تختہ دار پر چڑھایا جائے گا جس نے تمہارے اس دیوتا نامی انسان کو تم سے اکیس سال دور رکھا؟“ اس نے طنزیہ کہا تھا۔ سب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ابدال اور اریب بھی ٹھٹک کر رہ گئے۔ آنکھیں برجستہ اس شخص کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ ہاتھ جو پگڑی پہنانے جا رہے تھے واپس پلٹ گئے۔ اریب آنے والے خطرے کو بھانپ چکا تھا۔ رہبر کی طرف دیکھا تو مبہم سی تحریر وہ پڑھ چکا تھا۔

”جلدی کیجیے......یہ پگڑی پہنائیں مجھے۔“ وہ رندھے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا مگر وہ تو کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہ تھے۔

”کون ہے وہ شخص؟ بتاؤ کون ہے وہ گستاخ جس نے ہمارے دیوتا کو ہم سے دور لے جانے کا گناہ کیا؟“ سب کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ رہبر نے پاس جا کر اس کا گریبان پکڑا تھا۔

”دیو خاص......اریب کا بھائی......ابدال۔“ ہاتھ سے پگڑی نیچے زمین پر جا گری تھی، اریب بھی ساکت رہ گیا مگر ابدال وہ حالات کو شاید سمجھ چکا تھا اور کسی حد تک تسلیم بھی کر چکا تھا۔ آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔ رہبر کی دہکتی آنکھوں نے ابدال کا رخ کیا تو انہیں جھکا ہوا پایا۔ سوالوں کا جواب مل گیا۔ اریب نے کچھ بولنا چاہا مگر جانے کیوں لبوں پر مہر لگ چکی تھی۔ رہبر کے قدم اب ابدال کی طرف اٹھنے لگے تھے۔

”تم ہمارے دیوتا کو ہم سے دور لے کر گئے تھے؟“ جبڑے بھینچے سوال داغا گیا تھا مگر جواب ہوا میں ہی کہیں گم ہو چکا تھا۔ نہ لب ہلے اور نہ قدم اپنی جگہ سے ہٹے مگر اریب کی جان ہر لمحہ نکلتی جا رہی تھی۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے، تم لے کر گئے تھے ہمارے دیوتا کو؟“ لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ خاموشی بڑھتی چلی گئی۔ وہی خاموشی جو ایک عرصے تک اریب کی سماعت کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ آج پورے ماحول پر طاری تھی۔ اریب کے ہاتھ آگے بڑھے، قدم بھی اٹھنا چاہتے تھے مگر جانے کیوں اپنی جگہ پر ساکت تھے۔

ابدال نے اثبات میں سر ہلایا تو جیسے ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ پیشوا جو کل تک ابدال کو دیو خاص پکارتے نہیں تھکتے تھے اور اس کی آؤ بھگت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔ محض ایک سوال کے جواب میں گردن ہلانے پر اس کے دشمن بن گئے۔ ایک طمانچہ اس کے بائیں رخسار پر پیوست کیا گیا۔ وہ دور جا گرا۔ اریب کی پھٹی پھٹی نگاہیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مٹھیاں بھینچے جذبات کو ضبط کیے ہوئے تھا۔

”تمہاری اتنی ہمت......جس تھال میں کھاتے ہو، اسی میں سوراخ کرتے تمہیں شرم نہیں آئی؟“ اس بار ہاتھوں کی جگہ پیروں کا

استعمال کیا گیا۔ ابدال خاموش تھا مگر اریب کے لیے سب کچھ ناقابل برداشت تھا۔ آگے بڑھا مگر راستہ روک دیا گیا۔

''آپ اس معاملے سے دور رہیں دیوتا...... یہ ہمارا اور اس کا آپسی معاملہ ہے۔'' سخت الفاظ میں تنبیہ کی گئی تھی۔ اریب کے قدم رک گئے۔ ایک آدمی آگے بڑھا اور گریبان نوچتے ہوئے اسے کھڑا کیا۔ قدم ڈگمگائے تھے مگر وہ ہاتھوں کی گرفت مضبوط تھی۔

''کیوں کیا تم نے ایسا؟'' جبڑے بھینچے سوال داغا گیا تھا۔ اب خاموش رہنا بے کار تھا، تبھی ابدال نے بھی حقیقت سب کے سامنے رکھ دی۔

''ہاں...... ہاں...... میں نے ہی تم سب سے دور کیا تھا اریب کو۔ جانتے ہو ایسا کیوں کیا میں نے؟ اپنی ماں کے کہنے پر۔ اپنی ماں کے کہنے پر ہی میں نے اپنے بھائی کو اس دلدل سے اتنا دور بھیج دیا کہ یہاں کی گندگی بھی اس کے سائے کو چھو نہ پائے۔'' اس کے لہجے سے نفرت کے سوا کچھ بھی عیاں نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنائیت جو کبھی چھلکتی تھی، آج کہیں کھوئی کھوئی سی تھی۔ اریب بھی اس رویے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ آگے بڑھنے کی ہر ممکن سعی کر رہا تھا مگر راستہ روکا جا رہا تھا جبکہ وہ ایک ایک سچائی سے سب کو آشنا کر رہا تھا۔ سب کے چہرے پر غصے کے تاثر نمایاں تھے۔

''ابدال......!'' اس نے انتہائی غصے کے عالم میں کہا تھا۔

''اب بہت ہو گیا...... میں اپنے بھائی کو اب مزید اس دلدل میں رہنے نہیں دونگا۔ اگر آپ سب کی آنکھوں کے آگے پردے گرے ہوئے ہیں تو اس کا مطلب یہ تو نہیں میں بھی اپنی آنکھوں کے آگے پردے گرا لوں؟ نہیں...... میں اپنی آخری سانس تک اپنے بھائی کی حفاظت کروں گا اور یہاں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش بھی کروں گا۔'' اس نے برملا سب کو للکارا تھا۔ اب پیشواؤں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

''لے جاؤ اس کو یہاں سے...... اس کی سزا کا تعین ابھی کیا جائے گا تاکہ سب کو معلوم ہو کہ دیوتا کو ہم سے دور کرنے کا انجام کیا ہوتا ہے۔'' رہبر نے کرخت لہجے میں حکم نامہ جاری کیا تھا۔

دربان آگے بڑھے اور اس کو بازو سے پکڑتے ہوئے وہاں سے باہر میدان کی طرف لے گئے۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کئی کوششیں کی مگر بے سود رہیں۔

''اریب...... چلو یہاں سے...... ان لوگوں کی باتوں میں مت آنا۔ یہ تمہیں برباد کر دیں گے۔ تمہاری آخرت کو تہس نہس کر دیں گے۔ سنبھل جاؤ......'' وہ چلاتا ہوا اریب کو دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہاں کوئی بھی ان باتوں کا اثر قبول کرنے سے عاری نظر آ رہا تھا۔

اریب اپنے بھائی کو اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا تھا، تبھی آگے بڑھا مگر رہبر درمیان میں آ گیا۔

"آپ کہیں نہیں جاسکتے دیوتا......اس رسم کے مکمل ہونے تک۔"

"مجھے نہیں کروانی یہ رسم ...... مجھے ابھی اپنے بھائی سے ملنا ہے۔" اس نے سخت مگر درد سے بھرے لہجے میں کہا تھا اور بائیں جانب سے کھسکنے کی کوشش کی مگر رہبر نے اس کی کلائی کو اس قدر مضبوطی سے پکڑا کہ ایسا لگا جیسے وہ انگلیاں نہ ہو بلکہ لوہے کی زنجیریں ہوں جو اس کے ہاتھوں میں دھنستی ہی جارہی ہوں۔

"میں نے کہاناں؟ آپ کہیں نا جاسکتے۔ اگر آپ نے اب ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو ابدال کی لاش بھی اس دنیا میں نہیں رہے گی۔" اس دھمکی پر جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ پورا وجود تڑپ اٹھا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اس کے پاؤں میں گر کر اپنے بھائی کے لیے بھیگ مانگنے لگا تھا۔

"نہیں......ایسا مت کیجیے گا۔ چاہے تو میری جان لے لیں مگر میرے بھائی کو کچھ مت کہیں۔ عرصے بعد مجھے اپنے بھائی کا ساتھ نصیب ہوا ہے۔ خدا کے لیے اس ساتھ کو مت چھینیں مجھ سے۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا مگر بھائی کو چھوڑ دیں۔" وہ ہاتھ پھیلائے رندھے ہوئے لہجے میں فریاد کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن آپ کو ابھی یہ رسم ادا کرنی ہوگی۔" اس نے بے اعتنائی کے ساتھ منہ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ اپنے بھائی کی خاطر وہ یہ بھی کرنے کو تیار تھا۔

جو کہا گیا وہ سب کچھ اس نے کیا۔ ہر رسم کو اس نے اپنے بھائی کی زندگی کی خاطر ادا کیا تھا۔ سر پر پگڑی رکھ دی گئی۔ اب وہ محض اریب نہ تھا۔ اس کی پہنچان فقط اریب ہی باقی نہ تھی بلکہ وہ اب ایک دیوتا بن چکا تھا۔ ایسا دیوتا جس سے اس گاؤں کی خوشحالی وابستہ تھی۔ جس کے پاؤں اس گاؤں کے لیے مبارک سمجھے جاتے تھے۔ جس کی دعا سب سے معتبر جانی جاتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہے اور دل میں اپنے آپ کو ملامت کیا۔

"میرا بھائی......؟" لب ہلے تو سب خاموش بت بنے نظر آئے۔ ہر آنکھ اس کے آگے جھکی تھی۔ پیشانی کی لکیریں چیخ چیخ کر ہونی کو بیان کر رہی تھیں مگر وہ جان کر بھی انجان بنا ہوا تھا۔ شاید ایک بار پھر اس کا سوچا غلط ہو۔ شاید جو وہ سمجھ رہا ہو، ایسا کچھ نہ ہوا ہو مگر افسوس سب خاموش تھے۔ کسی نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کسی بات کی نفی نہ کی کیونکہ اب اس کے شانے دوسروں کے دکھ درد کا مداوا کرنے کے لیے مخصوص تھے۔

"نہیں......ایسا نہیں ہوسکتا۔" وہ جیسا تھا، جس حال میں تھا۔ اسی حال میں اٹھ کھڑا ہوا اور باہر میدان کی طرف بھاگا۔ اس بار کوئی بھی راستے کی دیوار نہ بنا۔ تمام راستے صاف کر دیئے گئے۔ ہر کوئی جھک جھک کر اسے ادب سے سلام کر رہا تھا۔

"دیوتا کا اقبال بلند ہو......دیوتا کا اقبال بلند ہو۔" ایک ہی جملہ سب کی زبان سے جاری تھا مگر اس کی سماعت تو جیسے سن ہو چکی

تھی۔ کسی کے الفاظ اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ اسے تو ان کانوں سے اپنے بھائی کے الفاظ سننے تھے۔

''بھائی......!'' وہ چیختا ہوا مرکزی میدان میں آیا تھا۔ سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے جسم جیسے زمین میں آدھا دھنس چکا تھا۔ آنکھوں کے آگے سب کچھ فنا ہوتا دکھائی دیا۔ وہ بھائی جس کو یہ ہمیشہ کوستا رہا، اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا رہا، آج اس کی خاطر زمانے سے ہار گیا۔ اس کی خاطر موت کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ خون میں لت پت بے جان جسم اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔

''بھائی......!'' وہ بھاگتا ہوا ابدال کے پاس آیا تھا۔ پاس پہنچتے ہوئے اس کی ٹھوکر ایک پتھر سے ہوئی اور وہ منہ کے بل زمین پر آگرا۔ وہ پگڑی جو سب نے بڑے چاہ سے اس کے سر پر سجائی تھی۔ آسمان نے زمین پر دے ماری۔ چہرہ مٹی میں آلودہ ہو گیا مگر وہ گھسرتے ہوئے اپنے آپ کو ابدال کی طرف لے جا رہا تھا۔ آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے اور تماشا بین اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔

''بھائی...... یہ کیا کیا آپ نے؟ میری وجہ سے...... پلیز مجھے معاف کر دیں۔ اپنا کہنا نہ ماننے کی اتنی بڑی سزا تو مت دیں مجھے۔ پلیز مجھے چھوڑ کر مت جائیں۔ پلیز بھائی۔'' وہ اپنی گود میں ابدال کا خون سے بھرا سر رکھے، چہرے کو ٹٹول رہا تھا۔ آنکھوں میں غشی طاری تھی۔

''نہیں...... اریب...... مجھے تم سے...... کوئی شکوہ...... نہیں۔'' الفاظ ٹوٹے پھوٹے زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ نزع کا وقت قریب تھا، آنکھیں دونوں جہانوں کو اپنے سامنے دیکھ رہی تھیں مگر بھائی کی محبت اسے اس دنیا کی طرف کھینچے ہوئے تھی۔

''اگر میں آپ کا کہا مانتا...... تو یہ سب نہ ہوتا۔ میں بہت برا ہوں۔ بہت برا۔'' وہ اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ ابدال نے خون میں لت پت اپنے ہاتھوں کو اریب کے چہرے کی طرف بڑھا کر آخری بار اس کے آنسو پونچھے تھے۔ خون اس کے چہرے پر اپنی رعنائیاں بکھیرنے لگا۔

اریب نے ان ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا جیسے وہ انہیں اپنے سے کبھی دور نہیں جانے دے گا۔

''میرا بھائی اتنا کمزور نہیں ہے...... مجھے اپنے بھائی پر پورا یقین ہے۔ وہ کبھی کچھ غلط نہیں کرے گا۔'' سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ بے آب ماہی کی طرح پورا جسم تڑپ اٹھا۔

''بھائی...... نہیں بھائی جان۔ میں بہت برا ہوں۔ بچپن سے آج تک آپ کو اپنا دشمن سمجھا اور آج جب ہمدرد سمجھا تو آپ کی...... موت کا سبب بن گیا۔ مجھ جیسا بدنصیب، بدبخت بھائی کسی کو نہ ملے۔'' ابدال کے لیے یہ سننا گوارا نہ تھا۔ اپنی انگلی اریب کے لبوں پر رکھی تو ہونٹ بھی خون میں نہا گئے۔ اشکوں کی روانی پہلے سے تیز ہو گئی۔

''خبردار جو میرے بھائی کو بدنصیب اور...... بدبخت کہا تو......! میرا بھائی لاکھوں میں ایک ہے۔ میں اپنے بھائی کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتا۔'' یہ الفاظ جیسے اریب کے اندر کو چیرتے چلے گئے۔ اب ہچکیاں بھی ان اشکوں کے سنگ ہو چکی تھیں۔

''میرا بھائی...... مجھے اپنی جان سے بھی پیارا ہے اور مجھے پورا یقین ہے میرا بھائی میرے ادھورے کام کو ضرور پورا کرے گا۔''

اب شاید ساتھ چھوٹنے کا وقت آچکا تھا۔ راہیں جدا ہونے کے عین قریب تھی۔ پورا وجود اس کا فضا میں معمولی سا بلند ہوا اور دوبارہ زمین پر آ گرا۔ سانسوں کی روانی اب نہ ہونے کے برابر تھی۔

"بھائی جان...... میں آپ کو کچھ نہیں ہونے دونگا۔ کچھ بھی نہیں۔" اس نے ابدال کے چہرے کو تھپتھپایا اور پھر ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی بھی مسیحا نظر نہ آیا۔ سب پرائے تھے۔ کوئی بھی درد شناس نہ تھا۔ تماشا بین بس آنکھیں جمائے اس منظر کو یاداشت کا حصہ بنا رہے تھے۔

"بھائی جان......!!" ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ بس آخری سانس تھی۔ جب اس نے اپنا چہرہ اریب کے کان کے عین قریب کیا تھا۔

"ایک وعدہ کرو مجھ سے۔" دونوں ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔

"آپ جو کہیں گے، میں کروں گا۔" ٹوٹا ہوا جسم، اب اپنے بھائی کے ہر حکم کو بجالانے کے لیے تیار تھا۔

"میرے بعد میرے عاطی کا خیال رکھو گے۔" زندگی نے اپنی لگام کھینچ لی۔ ٹوٹے پھوٹے لفظوں کا مفہوم سمجھائے بغیر یہ دنیا اس کے لیے پرائی ہو چکی تھی۔ ایک چیخ نکلی اور پوری فضا کو سوگوار کر گئی۔

"بھائی جان......!!" اریب تو جیسے اپنا آپا ہی کھو چکا تھا۔ اپنی گود میں اپنے اکلوتے خونی رشتے کو کھو دینے کا درد، اس سے بہتر کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ آہ و بکا جاری تھی مگر کسی نے آگے بڑھ کر اس کے شانوں پر ہاتھ نہ رکھے۔ تمام پیشوا اور رہبر سامنے تھے مگر چہرے سپاٹ تھے۔ آسمان بھی اپنے رنگ بدلنے لگا تھا۔ صاف آسمان کالی گھٹاؤں کی زد میں آنے لگا تھا۔ ہواؤں کی تیزی بھی قدرے بڑھنے لگی۔

کئی ساعتیں ایسے بھی بیت گئیں۔ ہچکیوں اور اشکوں کا جب ایک دور ختم ہوا تو اسے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا تھا۔ ابدال کی موت شاید وہ قبول کر چکا تھا۔ تبھی اپنے آنسو کو پونچھتے ہوئے، دھیرے سے ابدال کا سر اس نے زمین پر رکھا۔ آسمان سے پہلی بوند ابدال کی پیشانی پر آ کر گری تھی۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ان پیشواؤں کی طرف بڑھا۔

"اب تو خوش ہیں ناں آپ سب؟ میرے بھائی کو مجھ سے دور بھیج کر...... اتنی دور کہ واپسی کی کوئی راہ نہیں نکالی جا سکتی۔" اس نے طنز کی بجائے درد بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سب خاموش تھے۔

"اب بولتے کیوں نہیں آپ لوگ...... کیوں مار ڈالا میرے بھائی جان کو؟ آخر کیا قصور تھا میرے بھائی کا؟" وہ چیخ چیخ کر اپنے بھائی کی بے گناہی ثابت کر رہا تھا مگر وہاں موجود ہر شے اسے اپنا مجرم سمجھتا تھا۔

"ہمارے دیوتا کو دور کرنے کا انجام یہی ہے۔" رہبر نے سپاٹ لہجے میں کہا تو اریب اب اپنے جذبات ضبط نہ کر سکا۔

"بس...... بہت ہو گیا یہ سب۔ آپ کو اپنا دیوتا چاہیے ناں تا کہ آپ کے بگڑے کام سنور سکیں؟" اس نے اپنے جذبات کو سمیٹا

اور رہبر کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔ آسمان نے اپنے دروازے کھول دیئے اور بارش کی بوندیں ٹپ ٹپ گرتی چلی گئیں۔

''آج میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں، جس نے مجھے پیدا کیا۔ وہ مجھ سے ہر وہ خو چھین لے جو میرے بھائی کی موت کا سبب بنی۔ میرے اندر کی ہر اس طاقت کو جو مجھے کسی بھی عام سے ممتاز کیے ہوئے ہے۔ میرا دوسروں کی شکنوں کا پڑھنا، بن کہے دوسروں کی باتوں کو سمجھ جانا، سب کچھ۔ مجھے خاص سے عام بنا دے اور اس بارش کو اس گاؤں والا کا مقدر بنا دے۔ یہ بارش اس وقت تک نہ تھمے جب تک یہ سب اپنی توہم پرستی سے توبہ نہ کرلیں۔'' اس کی آواز کا سرور جیسے پورا فضا میں گونجنے لگا تھا۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی۔ سب وہاں سے اب جانے لگے تھے۔ پیشوا بھی رخصت ہوگئے۔ میدان خالی ہوگیا۔ اب وہاں صرف ابدال کی لاش اور ایک زندہ مجسم تھا۔ جس کی سانسیں بس چلنے کا بہانہ کر رہی تھیں۔ وہ پلٹا اور دوبارہ ابدال کے پاس آیا۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں بھائی جان، اس گاؤں کو توہم پرستی کے دلدل سے نکال کر ہی دم لوں گا۔ چاہے مجھے بھی اپنی جان کیوں ناں قربان کرنی پڑے۔'' اس کے لہجے میں ایک الگ تاثر تھا۔ بارش برستی رہی اور وہ کھڑا اپنے عہد کو اپنی روح کا حصہ بناتا رہا۔ آنکھوں کے آنسو بارش کے قطروں میں تحلیل ہو کر اس زمین کا حصہ بن رہے تھے۔ ابدال کا خون بھی ان آنسوؤں کی نمکینی کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے بے تاب تھا۔ ایک لکیر سیدھی اسی کے قدموں کی طرف آتی تھی۔

اس پرائے دیس میں اس نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے بھائی کے کفن دفن کا انتظام کیا تھا۔ اپنی سسکیوں کو اپنی کمزوری نہ بننے دیا۔ ہر اٹھتا قدم اس کے سامنے ابدال کی جیتی جاگتی تصویر کو سامنے لا رہا تھا مگر وہ جذبات کو ضبط کیے ہوئے تھا۔ بارش برستی رہی اور وہ اسے سپرد خاک کر کے لوٹ آیا تھا۔

☆......☆......☆

کتنے دھندلے ہیں یہ چہرے جنہیں اپنایا ہے
کتنی اجلی تھی وہ آنکھیں جنہیں چھوڑ آیا ہوں

آج کافی دنوں بعد اس نے اپنے سامان کو ہاتھ لگایا تھا۔ ننھی جان جو اپنے اندر اٹھنے والے جذبات سے نابلد تھی۔ اب وقت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ اسے اب کسی کی ضرورت نہ تھی۔ کمرے میں آنے کے بعد اس نے اپنے سامان کو بستر پر رکھا اور کئی چیزوں کو بکھیر دیا۔ ہر شے میں یاد جمع تھی۔ ماں کا احساس آج بھی اس کے اندر زندہ تھا۔ کچھ پرانے کپڑے، کچھ کتابیں اور ایک عدد ڈائری ......سب کچھ اس کے سامنے تھا۔

''امی جان آپ کیوں چھوڑ کر چلی گئیں مجھے؟ دیکھیں ناں آج کوئی میرے ساتھ نہیں ہے۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ بہت زیادہ اکیلا۔'' اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی تھی مگر وہ انہیں پونچھنا سیکھ چکا تھا تبھی اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے پلکوں پر چمکتے آنسوؤں کو پونچھا

اور ایک دوپٹے کو اپنے سینے سے لگایا۔ سفید رنگ کا دوپٹہ...... جو پاکدامنی کا ثبوت ہوا کرتا ہے۔ اس کے آنسوؤں کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا۔

"میرا عاطی بہادر ہے ناں...... کبھی روتا نہیں ہے۔" اپنی ماں کے الفاظ آج اس کی سماعت کا حصہ بن رہے تھے۔

"امی جان...... میں بہادر نہیں ہوں۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ واپس آجائیں ناں......!" اس کی آواز میں وہی درد شامل تھا جو ایک بچے کے دل میں ہوتا ہے جب وہ کھو جائے اور دور دور تک کوئی اپنا دیکھائی نہ دے۔ وہ بھی اس وقت اکیلا تھا۔ آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے اس نے ڈائری کی طرف دیکھا۔

"امی جان...... یہ ڈائری میں کیا لکھا ہے؟" خدیجہ نے ایک دن خود اسے یہ ڈائری دی تھی اور ساتھ میں کچھ تاکید بھی کی تھی۔

"بیٹا! آپ ہمیشہ اپنے بابا جان کے بارے میں پوچھتے ہو ناں؟ اس میں تمہارے بابا جان کے بارے میں لکھا ہے لیکن وعدہ کرو، اسے اُس وقت پڑھو گے جب تم بڑے ہو جاؤ گے۔"

"امی جان! اب میں بڑا ہو گیا ہوں ناں؟ اس لیے اب تو پڑھ سکتا ہوں ناں یہ ڈائری؟ کون ہیں میرے بابا؟ کہاں ہیں؟ کیوں میرے ساتھ نہیں ہیں؟" اس نے معصومانہ انداز میں اس ڈائری سے کئی سوال کیے تھے مگر خاموشی کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ خود ہی جواب اخذ کیا اور ہاتھ بڑھا کر ڈائری اٹھائی۔ سفید رنگ کی جلد جس میں کہیں دھبہ نہ تھا۔ برسوں سے سنبھالی گئی ڈائری آج بھی نئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سنبھالنے والے نے اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کی ہو۔ آنکھ ایک بار پھر اشک بار ہوتی دیکھائی دی تھی۔ جب عاطی کے ننھے ہاتھ اس ڈائری کو کھول رہے تھے۔ ہوا نے بھی ایک لمحے کو سرگوشی کی تھی۔

"پیارے بیٹے عاطی کے لیے!" وہ لکھائی جانتا تھا۔ سکول کا ہوم ورک کرتے ہوئے اکثر خدیجہ اس کی لکھنے میں مدد کرتی تھی۔ تبھی اس نے اُس کی لکھائی ذہن نشین کر لی تھی۔

ورق الٹ دیا گیا۔ ایک خط نما تحریر سامنے تھے۔ وہ اب با آسانی ان لفظوں کو پڑھ سکتا تھا۔

"میں جانتی ہوں عاطی تمہیں اپنے بابا جان کا نام جاننے کی بہت خواہش ہے اور تم ہمیشہ سے اس بات کا شکوہ کرتے آئے ہو کہ تمہارے بابا ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟ کئی بار تم اس بات کو لے کر اپنے بابا سے بدگمان بھی ہوئے لیکن میرے بیٹے! اپنے بابا سے کبھی بدگمان مت ہونا۔ وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں لیکن ان کی کئی مجبوریاں ہیں، بہت سے کام ان کے ذمے ہیں، جن کو پورا کیے بغیر وہ ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے اور شاید وہ کام وہ آخری سانس تک ختم نہ ہو نگے۔ اگر وہ کام ان ذات سے وابستہ ہوتا تو شاید میں انہیں روک لیتی۔ کبھی ایک باپ کو اپنے بیٹے سے جدا نہیں ہونے دیتی مگر عاطی یہ کسی کی زندگی کا سوال تھا۔ کسی کے ایمان کا سوال تھا۔ ان کا دور جانا قسمت نے لکھا تھا اور انہیں ایسا کرنا تھا۔ اگر وہ ہمارے ساتھ رہتے تو شاید کوئی کسی کا ایمان ڈگمگا جاتا اور جس دلدل سے تمہارے بابا اُسے نکالنے کی کوشش کر رہے تھے وہ واپس اسی دلدل میں پھنس جاتا۔

میں جانتی ہوں عاطی! جس وقت تم یہ تحریر پڑھو گے یا تو اس وقت تک تم بہت بڑے ہو چکے ہو نگے یا پھر میں تمہارے درمیان موجود نہ ہونگی اور اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ میں بھی تمہیں اس دنیا کے حوالے کر کے بہت جلد رخصت ہو جاؤں۔ اپنے چاند سے بیٹے کو اکیلا چھوڑ کر، غم تو ہے مگر مجھے یقین ہے میرے بعد تمہارے بابا تمہارے لیے واپس لوٹ کر ضرور آئیں گے۔ تب تم اپنے بابا کے ساتھ رہنا، ان کو کبھی تنگ مت کرنا۔ جیسے میرا حکم بجالاتے تھے۔ ویسے ہی ان کا بھی کہا ماننا۔ میری پرورش پر کبھی آنچ مت آنے دینا۔

میں یہ تو نہیں جانتی ایسا ہوگا بھی یا نہیں...... شاید ایک امید ہے مگر کہتے ہیں ناں امید پر ہی دنیا قائم ہے۔ مجھے بھی امید ہے مگر جو خلش جنم لے چکی ہے۔ اس کا ختم ہونا ناممکن ہے۔ ایک دوری جب رشتوں میں قائم ہو جائے تو برسوں لگ جاتے ہیں ان دوریوں کو ختم ہوتے ہوتے اور تم نے تو آج تک اپنے بابا کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ وہ کیسے نظر آتے ہیں؟ تم ان سے کتنا ملتے ہو؟ تم تو یہ بھی نہیں جانتے۔

عاطی! اب میں مزید نہیں لکھ سکتی۔ ان یادوں کو کھریدنا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ ایسا لگتا ہے وہ دور دوبارہ شروع ہو جائے گا اور پھر تم بھی تو سکول سے آنے والے ہو اگر تم نے آج ہی مجھے یہ سب لکھتے ہوئے دیکھ لیا تو تم ابھی پڑھنے کی ضد کرو گے مگر یہ تحریر ایک وقت کے لیے مخصوص ہے۔ جب تم اسے اچھے سے پڑھ بھی سکو گے اور سمجھ بھی سکو گے۔

عاطی، تمہارے بابا کا نام ابدال عالمگیر ہے اور تمہاری پہچان عاطی ابدال عالمگیر اور تمہارا آبائی وطن پاکستان نہیں ہے۔ تم ضرور یہاں پیدا ہوئے ہو مگر تمہارے بابا یہاں کے نہیں ہیں۔ وہ اس وقت بھی وہاں ہیں جہاں ان کی پیدائش ہوئی یعنی انڈونیشیا مگر وہ ہم سے ناراض ہو کر وہاں نہیں رہ رہے بلکہ وہ ایک وعدہ نبھا رہے ہیں۔ اپنی ماں سے کیا گیا وعدہ۔ اپنے بھائی کو بچانے کا وعدہ۔ عاطی، میرے جانے کے بعد بھی تم اکیلے نہیں ہونگے۔ تمہیں چاہنے والے تمہارے بابا ہونگے، تمہیں پیار کرنے والے تمہارے چاچو ہونگے اور کئی رشتے تمہارے منتظر ہونگے۔

یہی سچائی ہے میرے بیٹے! تم ابدال کے بیٹے ہو، عاطی ابدال ہو تم!

ڈھیروں دعائیں، اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی امان میں رکھے، کوئی درد، کوئی دکھ، تمہارے سائے کو بھی نہ چھو سکے۔ آمین۔

تمہاری ماما جان۔

خدیجہ ابدال عالمگیر۔"

آنکھوں کے آنسو کچھ وقت کے لیے تھم چکے مگر ایک حیرت اور جستجو ان خاموش آنکھوں میں صاف صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ کچھ پلوں کے لیے آنکھیں برجستہ اسی ورق پر ٹھہری رہیں جیسے معصوم چہرہ کئی سوالوں کے جواب حاصل کر رہا ہو۔ کمرے کی ہر شے اس وقت ساکت تھی۔ مانو وقت رک گیا ہو۔ ہوا کی سرگوشیاں بھی اس ننھے وجود کے سنگ ہوں۔ اس کے غم میں برابر کی شریک ہوں مگر پھر بھی بے بس ہوں۔

پھر لمحہ بیتا اور اس نے ڈائری بند کی۔ ایک ہچکی فضا میں گونجی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک دوبارہ شروع ہوئی۔ وقت نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ چمکتی آنکھوں نے بھی آنسوؤں کے آگے بند باندھ دیا تھا۔ ننھے خواب ننھی سی آنکھوں میں بیدار ہونے لگے۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر واپس رکھا اور ایک عظم لیے وہ بستر پر دوبارہ آ بیٹھا تھا۔

''اب میں نہیں روؤں گا۔'' اس نے کہا تھا۔ چمکتی آنکھوں نے ایک وجود کی عکس بندی کی تھی۔ ایک چہرہ اس کے ننھے سے وجود میں چھلک رہا تھا۔ اریب کا چہرہ...... جسے جہانزیب اور حاعفہ پہلے ہی دیکھ چکے تھے مگر سمجھنے سے عاری تھے۔ خون بولتا تھا، اپنا حق جتلاتا تھا مگر خاموش لبوں کو کوئی سنے تو بات بنے......!

☆......☆......☆

اب گرد کی تہہ کو کیا ہٹائیں

ملبوں یہ تن پہ بچ گیا ہے

سعدی کی آج رپورٹ آنا تھی۔ حسام اور صبا کے لیے تو چند لمحے بھی صدیوں کے مترادف تھے۔ جبیں صبا کو حوصلہ دے رہی تھی۔

''بھابھی! حوصلہ رکھیے، کچھ نہیں ہوگا ہمارے سعدی کو...... ننھی سی جان کو کچھ نہیں ہوگا۔'' حوصلہ دیتے دیتے اس کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ چکا تھا۔ ننھا سا سعدی جو اس وقت صبا کی گود میں تھا۔ اس کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔ صبا کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔

''میری تو اپنے رب سے یہی دعا ہے کہ میری زندگی بھی میرے بیٹے کو لگ جائے مگر میرے سعدی کو کچھ نہ ہو...... کچھ نہ ہو میرے سعدی کو۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی ہی مر جاؤں گی۔'' سعدی کو اپنے لبوں کے قریب لے جا کر اس نے رونا شروع کر دیا۔ حسام جو کچھ فاصلے پر ہی کھڑا تھا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ذرا سا قریب آیا۔ نرمی والے ہاتھ بڑھائے اور صبا کے شانوں پر رکھے۔ زبان خاموش تھی۔ وہ خود بھی بری طرح ٹوٹا تھا۔ ماضی ایک بار پھر حال میں ضم ہو رہا تھا۔ وقت اپنے آپ کو دہرا رہا تھا۔ اب تلاش تھی تو ایک مسیحا کی یا پھر ایک امید تھی کہ وقت آنے سے پہلے ہی ٹل جائے۔

موبائل کی ٹون ماحول میں داخل ہوئی۔ حسام نے گہری سانس لیتے ہوئے جینز سے موبائل نکالا۔ وہ جہانزیب کا فون تھا۔ گلا کھنکارتے ہوئے اس نے فون ریسیو کیا تھا۔

''السلام علیکم بابا جان......!'' رندھا ہوا لہجہ ہوا گویا ہوا تھا۔ آج بات کرنے والا ایک بیٹا نہیں بلکہ ایک باپ تھا۔ آج اسے معلوم ہوا کہ برسوں پہلے جہانزیب بھی اس کے لیے کس قدر مجبور تھے؟

''وعلیکم السلام...... سعدی کی رپورٹ کیسی آئی؟'' فوراً نکتے کی بات کی گئی۔

''ابھی پانچ منٹ بعد رپورٹ آئے گی۔'' اپنے ہونٹوں کو بھینچتے ہوئے اس نے بمشکل کہا تھا۔ جہانزیب کا لہجہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ خاموشی کا ایک دور شروع ہوا۔ جسے جہانزیب نے خود توڑا تھا۔

''یقین رکھو بیٹا! کچھ نہیں ہوگا سعدی کو۔ سب کچھ اچھا ہوگا۔''

''دعا کیجیے گا بابا جان......!'' ایک آنسو پلکوں پر چمکنے لگا تھا۔

''مجھے اپنے رب پر یقین ہے۔ جس دور اہے سے میں گزرا ہوں، ان راستوں سے تم کبھی نہ گزرو، یہی دعا ہے میری اور تمہاری ماما جان کی۔'' اشک بار لہجے نے دعا دی تھی اور اب بس دعاؤں کا ہی سہارا تھا۔

بات جاری تھی کہ دروازہ کھلا تو حسام کی توجہ اس طرف گئی۔

''اچھا بابا جان...... بعد میں فون کرتا ہوں، ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔'' یہ کہتے ہی اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے فون بند کیا اور راہداری کی طرف بڑھا، جہاں سے ڈاکٹر ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ صبا اور جبیں بھی کھڑی ہوگئیں اور حسام کے پیچھے پیچھے چل دیں۔

''ڈاکٹر کیا آیا ہے رپورٹ میں؟'' حسام کے سوال پر ڈاکٹر کے قدم منجمد ہو گئے۔ سپاٹ انداز جسے اریب سمجھ لیتا مگر وہ یہاں نہیں تھا بھی سب بول کے منتظر تھے۔

''بتائیں ڈاکٹر صاحب! میرا بیٹا ٹھیک تو ہے ناں؟ اس کی رپورٹ کلئیر تو ہے ناں؟'' ہر گزرتا لمحہ صبا کے لیے جیسے کٹھن ہوتا جا رہا تھا۔ سانسیں کسی دھونکی کی مانند چل رہی تھیں۔ جنہیں اب بیٹے کی صحت یابی کی خبر ہی ٹھنڈا کر سکتی تھیں۔

''دیکھیں...... آپ سب اپنے آپ کو پرسکون رکھیے اور خاص طور پر آپ مسٹر حسام، آپ کو تو امید کا دامن قطعاً نہیں چھوڑنا چاہیے کیونکہ آپ تو اس لڑائی میں فتح یاب ہو چکے ہیں۔ اب باری آپ کے بیٹے کی ہے۔'' ڈاکٹر کی گول مول باتوں کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ ٹھٹکا۔

''مطلب یہ ہے کہ سعدی کو اگلے چند روز میں بلڈ کے ساتھ ساتھ وائیٹ بلڈ سیلز کی ضرورت ہے۔ بچے کے جسم نے وائیٹ بلڈ سیلز بنانا بند کر دیے ہیں۔ اب اگر وائیٹ بلڈ سیلز ٹرانسپلانٹ نہ کیے گئے تو اس کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' یہ سننا تو جیسے قیامت کو گلے لگانے کے مترادف تھا۔ سب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ جبیں بھی حیرت کا مجسمہ بنے کھڑی رہی۔ حسام تو کئی لمحے سانس ہی نہ لے سکا تھا اور صبا نے آواز سے رونا شروع کر دیا۔ سعدی کو اپنی بانہوں میں سمیٹے، اشک بہاتی جا رہی تھی۔

''دیکھیں...... حوصلہ رکھیں آپ سب ۔ ابھی چند دن ہیں۔ آپ ریڈ بلڈ سیلز اور وائیٹ بلڈ سیلز کا انتظام کر لیں۔ اگر مقررہ مدت میں یہ ٹرانسپلانٹ ہو جائے تو بچے کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔'' یہ کہتے ہی انہوں نے دھیرے سے حسام کے شانے کو تھپتھپایا تھا اور وہاں سے آگے کی طرف چل دیا۔

ڈاکٹر کے یہ الفاظ کئی لمحے سب کی سماعت میں گونجتے رہے اور جو ہمیشہ اب گونجتے ہی رہنے تھے۔

☆......☆......☆

بارش سنگ میں جب قحط نمو یاد آیا

تیرا سچ بولتا، بے باک لہو یاد آیا

آج بارش کو برستے ہوئے تیسرا دن گزر چکا تھا۔ ابدال کو بھی اس دنیا سے رخصت ہوئے تیسرا دن تھا۔ ابدال کے چلے جانے کے بعد اریب نے بھی اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ کھانا پینا، کسی سے بات کرنا سب کچھ ترک کر دیا تھا۔ دربان کمرے کے باہر پہرہ دیتے اور وقت فوقتاً اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے مگر وہ کوئی جواب نہ دیتا۔ رہبر اسے کھانا بھجواتا اور پھر اگلے کھانے کے وقت جب برتن سمیٹنے آتا تو پہلا کھانا ویسے ہی پاتا۔

''دیوتا......آپ نے ابھی تک کھانا نوش نہیں فرمایا؟'' وہ مودب انداز میں پوچھتا تھا مگر خاموش نگاہیں ہر سوال کا جواب ہوتیں۔

''آپ کو کچھ اور کھانے کی طلب ہے؟'' ماحول میں خاموشی بدستور قائم رہتی۔

''آپ حکم فرمائیں......آپ کا من پسند کھانا آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا جائے گا۔'' وہ منتظر رہتا کہ اب جواب آئے مگر وہ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارا نہ کرتا۔

کھڑکی کے ساتھ کھڑے باہر سیاہ بادلوں میں گھرے آسمان کو یک ٹک دیکھتا رہتا۔ جیسے وہ ان سے کچھ کہہ رہا ہو۔ بادلوں کی گرج ہوتی۔ رہبر اپنی آنکھیں میچ لیتا اس ڈر سے کہیں یہ گرج اور یہ روشنی اس کی سماعت اور بصارت کو اچک نہ لے جائے مگر وہ ایسے ہی کھڑا رہتا ۔نہ کان کے آگے ہاتھ رکھتا اور نہ ہی آنکھیں موندتا۔

''دیوتا......آپ ٹھیک تو ہیں؟'' وہ چھوتا تو زندگی کا احساس پا کر پیچھے ہٹ جاتا مگر نگاہیں نہ پلٹتیں۔ ابدال کی موت نے جیسے اس کی زندگی سے ہر خوشی اور ہر امید ہی چھین لی تھی۔

رہبر مایوس پلٹ آتا مگر وہ وہیں کھڑا رہتا۔ برستی بارش میں اپنے بھائی کا چہرہ بنتا۔ اپنے الفاظ سماعت سے ٹکراتے۔

''آپ ہی میرے بھائی ہو۔ مجھے اب آپ پر پورا یقین ہے۔ آپ سے بڑھ کر میرا خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ جب تک آپ میرے ساتھ ہیں، مجھے کسی شے کا خوف نہیں ہے بھائی۔''

''نہیں......اریب......مجھے تم سے......کوئی شکوہ......نہیں۔'' ابدال کے الفاظ نے آنسوؤں کو جاری ہونے کا بہانہ فراہم کیا تھا۔

''اگر میں آپ کا کہا مانتا......تو یہ سب نہ ہوتا۔ میں بہت برا ہوں۔ بہت برا۔'' اپنے لفظوں اور اپنے عمل سے اسے نفرت ہونے لگی تھی۔

''کاش......میں آپ کا کہا مان لیتا بھائی جان......! کاش......! اگر مان لیتا تو آپ اس وقت میرے ساتھ ہوتے۔ میرے پاس ہوتے۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کو کبھی نہ آنے دیتے۔ میری تنہائی کو میرا مقدر نہ بننے دیتے۔'' وہ دل ہی دل میں کہتا جا رہا تھا مگر

اب اس حسرت کے کوئی جواز باقی نہ تھا۔ وقت گزر چکا تھا۔ پچھتاوے کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا تھا۔

وہ برستی بارش میں اب اپنی اس پیاس کو بجھانے کی سعی کر رہا تھا جس کا بجھنا اب تا حیات ناممکن تھا۔ ایک بھائی کی محبت کی تشنگی جو دنیا کا کوئی رشتہ نہیں بجھا سکتا۔ ایسا خلوص جو بھائی کی محبت میں ہوتا ہے کوئی فراہم نہیں کر سکتا۔

اس نے پلکیں جھپکیں تو نمکین آنسو زمین بوس ہو گیا۔ ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے جسم کو چھوتے ہوئے آگے نکل گیا۔ بوندوں نے بھی اس کے وجود کا رخ کیا مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ پورا جسم ان بوندوں سے بھیگ گیا مگر اسے اپنی ذات کی کہاں پرواہ تھی؟ پرواہ کرنے والا تو اس دنیا سے کوچ کر چکا تھا۔

ادھر یہ اپنی ذات میں غرق تھا تو دوسری طرف مرکزی عبادت خانے میں مسلسل ہونے والی بارش سے پریشان تھے۔

"دیوتا سے کہیں اس بارش کے تھمنے کی دعا کریں وگرنہ ہماری فصلیں برباد ہو جائیں گی۔" ایک فریادی نے اپنی حالت زار پر دہائیاں دیتے ہوئے کہا تھا۔

"ہم نے کئی بار دیوتا سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو کچھ بھی سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔" رہبر نے کہا تھا۔

"لیکن ایسے کام تو نہیں چلے گا ناں؟ دیوتا کا کام گاؤں کو راحت فراہم کرنا ہے۔" کہنے والے نے کہا تھا۔

"لیکن اب تو دیوتا ہی زحمت بنے ہوئے ہیں۔" فریادی کی زبان سے جاری ہوا تھا۔ رہبر کی پیشانی غصے کا تاثر دینے لگی مگر زبان پر مہر رہی۔ سب کے دل میں اب یہ بات بیٹھ چکی تھی۔

"لیکن بددعا بھی تو دیوتا نے ہی دی تھی کہ بارش نہ رکے۔ اب دیوتا ہی اس بددعا کو واپس لے سکتے ہیں۔" ایک جملہ فضا میں گونجا جس نے سب کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"اب ہمیں دیوتا سے بات کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے۔" تمام پیشوا ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ رہبر نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا اور سب دیوتا کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ دربان نے راستہ دیا تو سب دیوتا کے کمرے میں جا داخل ہوئے۔

اریب بدستور کھڑکی کے ساتھ کھڑا تھا۔

"دیوتا دعا کیجیے بارش بند ہو جائے۔ اب یہ بارش ہمارے لیے زحمت بن چکی ہے۔" جملہ اس کے وجود میں اترتا چلا گیا۔

"آج میں اپنے رب سے دعا کرتا ہوں، جس نے مجھے پیدا کیا۔ وہ مجھ سے ہر وہ خوبی چھین لے جو میرے بھائی کی موت کا سبب بنی۔ میرے اندر کی ہر اس طاقت کو جو مجھے کسی بھی عام سے ممتاز کیے ہوئے ہے۔ میرا دوسروں کی شکنوں کا پڑھنا، بن کہے دوسروں کی باتوں کو سمجھ جانا، سب کچھ۔ مجھ خاص سے عام بنا دے اور اس بارش کو اس گاؤں والا کا مقدر بنا دے۔ یہ بارش اس وقت تک نہ تھمے جب تک یہ سب اپنی توہم پرستی سے توبہ نہ کر لیں۔" اپنے ہی الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔

وہ دھیرے سے ہنسا اور ان سب کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

''میں دعا کرتا ہوں کہ بارش بند ہو جائے۔'' اس نے بے دلی سے کہا تھا۔ سب اس لہجے کو سمجھتے تھے اور باہر کی طرف دیکھنے لگے۔ بادلوں کی گرج میں تیزی آ گئی۔ سیاہی پہلے سے زیادہ پھیل گئی۔ وحشت اب دلوں میں اترنے لگی تھی۔

''لیجیے، مانگ لی دعا آپ کے دیوتا نے۔ جایئے خوش ہو جایئے۔'' یہ کہتے ہی اس نے دونوں بازو سینے کے گرد باندھ لیے اور یک ٹک ان کے چہروں کو ٹٹولنے لگا۔ سب حیران تھے اور اس طنز کا جواب دینے سے قاصر تھے۔

''لیکن یہ کیا بارش رکی نہیں؟'' اس نے حیرت سے پلٹ کر دیکھا تھا۔

''کیونکہ یہ دعا دل سے نہیں مانگی گئی۔'' کہنے والے نے کہا تھا۔

''اتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں آپ کہ دل سے مانگی گئی دعا ہی قبول ہوتی ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''اتنے بھی عقل کے اندھے نہیں ہیں ہم۔'' رہبر نے آگے بڑھ کر سب کی طرف سے کہا تھا۔

''تو میرے معاملے میں آپ نے اپنی عقل پر پردے کیوں گرا دیے؟ کیوں بھول گئے کہ ایک انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسے آپ ہیں ویسا ہی میں ہوں۔ جس طرح آپ کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ ویسے ہی میری دعائیں بھی آسمان پر پہنچتی ہیں فرق صرف ایمان کا ہے۔ اگر آپ اپنے دل میں ایمان کی روشنی کو منور ہونے دیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ کو کسی کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنا معاملہ خود پروردگار کے سامنے رکھیے گا اور مجھے پورا یقین ہے میرا رب آپ کے مسئلے ضرور حل کرے گا۔'' اپنے بھائی سے کیا گیا وعدہ پورا کرنا اب اس کا آخری مقصد تھا اور وہ ایسا ہی کر رہا تھا۔

''کیا کہنے چاہتے ہیں آپ؟'' ضرب عین نشانے پر جا لگی تھی۔ پتھر دھیرے دھیرے موم ہو رہے تھے۔ ابدال کی قربانی رنگ لا رہی تھی۔ ان مجسموں کے اندر کی انسانیت کو بیدار کر رہی تھی۔

''وہی...... جو میرے بھائی آپ کو سمجھا رہے تھے۔ کوئی انسان دیوتا نہیں ہوتا، کوئی انسان برتر نہیں ہوتا۔ سب برابر ہیں۔ میں بھی آپ ہی میں سے ایک ہوں۔ سمجھیں اس حقیقت کو اور توبہ کریں اس توہم پرستی سے۔ یہ توہم پرستی ایک ایسا دلدل ہے جو انسان کو غرق کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان اس توہم پرستی میں بعض اوقات اس قدر آگے نکل جاتا ہے کہ ہلاقت کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ یہ توہم پرستی ہی تو ہے جو عقلوں کا زائل کر دیتی ہے۔ بینا کو نابینا کر دیتی ہے۔ بصیرت کو اندھا کر دیتی ہے۔ سماعت کو بہرہ کر دیتی ہے اور ایسے ایسے نئے انکشافات کرتی ہے جس کے بارے میں نہ کبھی سنا ہوتا ہے اور نہ ہی دیکھا ہوتا۔ ان کی حقیقت مکڑی کے جالے کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ جو دیکھنے میں انتہائی بھدے اور بے کار محسوس ہوا کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سانس لیا اور جواب کا متلاشی رہا مگر سب خاموش تھے۔ آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔

''اب بھی وقت ہے لوٹ آئیں اور اپنا معاملہ اپنے رب سے صاف کرلیں۔ مجھے یقین ہے اگر آپ نے توبہ کرلی تو یہ گاؤں دوبارہ ترقی کرے گا۔ اس گاؤں کو پھر کسی دیوتا کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ پھر کسی ماں کو اپنے لخت جگر کو دور بھیجنا نہیں پڑے گا۔ پھر کبھی کسی بھائی کو اپنے بھائی کی حفاظت کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کرنا پڑے گا۔''

''لیکن......!'' رہبر کی زبان ہکلائی تھی۔

''اب بھی لیکن کی گنجائش باقی ہے کیا؟'' اس نے پل بھر کے لیے توقف کیا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو سوائے افسوس کے کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے۔'' اس نے بے دلی سے کہا اور اپنا چہرہ پھیر لیا۔ سب خاموش تھے، پھر خود ہی پلٹا۔

''جہاں تک میرے یہاں رہنے کی بات ہے۔ میں یہیں رہوں گا، جو آپ کہیں گے کروں گا مگر اس بات کی امید مت رکھیے گا کہ میری وجہ سے آپ کے کام بن جائیں گے کیونکہ اب میں پہلے والا اریب نہیں ہوں کیونکہ میری دعا میرے رب نے قبول کرلی ہے۔ اب نہ میں کسی کی پیشانی پڑھ سکتا ہوں اور نہ ہی بن کہی باتوں کو سمجھ سکتا ہوں۔ نہ ہی میرے بنجر زمین پر پاؤں رکھنے پر پانی کے چشمے جاری ہونگے۔ اب میں عام ہوں۔ بالکل اپنے بھائی جان ابدال کی طرح......!'' اس کا ٹوٹا ہوا لہجہ اپنی گواہی دے رہا تھا۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ سب اس کو ہونقوں دیکھتے رہے اور دوبارہ پلٹ آئے۔

اریب کے الفاظ ہر کے اندر اترے تھے۔ تبھی کسی نے کسی سے کوئی بات نہ کی۔ بس خاموشی سے الفاظ پر غور کرتے رہے۔

☆......☆......☆

اور کیا ہے متاع تشنہ لبی؟

دھوپ، صحرا، تھکن، سراب، عذاب

آج کی رات سیٹیاوان کی قسمت بدل دینے والی تھی۔ سب نے اریب کے پاس آکر بارش کے رک جانے کے لیے دعا کی درخواست کی تھی۔ اریب سب کے کہنے پر دعا کرتا اور پھر خاموش ہو جاتا۔ باہر آسمان کی طرف دیکھا جاتا مگر بارش نہ رکتی۔ سب کے یقین اب ڈگمگانے لگے تھے۔ رہبر یہ سب دیکھ رہا تھا اور اچھے سے سمجھ بھی رہا تھا۔

''لگتا ہے اریب سچ کہہ رہا ہے۔'' پہلی بار ان میں سے کسی نے اس کا نام لیا تھا۔ سننے والے چونکے تھے۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' دوسرے پیشوا حیران ہوئے۔

''وہی...... جو مجھے سچ لگ رہا ہے۔ ہم شاید غلطی پر تھے۔ اس کو اپنا دیوتا سمجھ بیٹھے۔ میرے خیال سے ہمیں ایک بار اریب کے کہے گئے راہ عمل کو اختیار کرنا چاہیے اور خود اپنا معاملہ صاف کرانا چاہیے۔'' یہ کہتے ہی رہبر وہاں سے چل دیا۔ اریب کا کمرہ بھی خالی ہو گیا۔

بس رات کا اندھیرا تھا اور بجلی کی چمک تھی یا پھر بادلوں کی گرج۔

"آپ کیسے ہیں؟" رات کے اندھیرے میں ایک آواز سنائی دی۔ وہ چونکا اور حیرت سے باہر کی طرف دیکھا۔

"کون؟"

"یہ میں ہوں......" چہرہ سامنے آیا تو رہبر سامنے تھا۔ چہرے پر عاجزی تھی۔ وہ ٹھٹکا اور آگے بڑھا مگر خاموش رہا۔

"کیا کرنا ہوگا مجھے۔"

"مطلب؟"

"اپنا معاملہ صاف کروانے کے لیے؟" اس کی آنکھیں جھکی جھکی تھی۔ اریب کے چہرے پر تبسم پھیلتی نظر آئی۔ وہ آگے بڑھا اور نرمی کے ساتھ گویا ہوا۔

"کچھ بھی تو نہیں......بس ایک بار اس در پر جھکنا ہوگا جو اس جہان کا پالنے والا ہے۔ اپنے کیے پر معافی مانگنی ہوگی اور آئندہ اس گناہ کو نہ کرنے کا عظم کرنا ہوگا۔" اس نے مختصر کہا تھا۔

یہ سنتے ہی وہ چلا گیا۔ کچھ دیر یونہی بیت گئی تو اس نے باہر دیکھا۔ بارش تھمتی چلی گئی۔ کچھ دیر پہلے جہاں بادلوں کی گرج ماحول کو وحشت ناک بنائے ہوئے تھی۔ اب کم ہوتی جا رہی تھی۔ صاف آسمان ان بادلوں کے حصار سے سامنے آ رہا تھا۔ چاند جو کہیں منہ چھپائے ہوئے تھا۔ اب اپنی چاندنی کو اس گاؤں کا مقدر بنانے کی سعی کر رہا تھا۔

برجستہ باہر سے ایک شور کی آواز آئی۔ بارش کے تھم جانے پر اب ہر چہرہ کھل اٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر شادابی جنم لینے لگی۔ وہ ابھی یہ سب دیکھ ہی رہا تھا کہ قدموں کی چاپ نے اسے پلٹنے پر مجبور کیا۔ سامنے وہی رہبر تھا۔ آنکھیں شرمندہ......اور اپنے کیے پر معافی کے تاثر لیے۔

"جو ایک بار اپنے رب سے اپنا معاملہ صاف کروالے تو وہ اسے کبھی دوسروں کے سامنے گرنے نہیں دیتا۔" اریب کے الفاظ اترتے چلے گئے۔ وہ مسکرایا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منزل آن پہنچی تھی۔

☆......☆......☆

مربوط ہیں تجھ سے بھی یہی ناکس و نااہل

اس باغ میں ہم نے گلِ بے خار نہ پایا

سورج وہی تھا مگر انداز بالکل نیا۔ آج اس روشنی میں تمازت بالکل نئی جیسی تھی۔ کچھ تو بدلا ضرور تھا۔ وہ بھی اپنے کمرے سے باہر آیا۔ اب پہرے ختم ہو چکے تھے۔ وہ کھلی فضا میں سانس لے سکتا تھا۔ جہاں چاہتا، جا سکتا تھا۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ ابدال کا خواب

تعبیر کی بلندی چھو چکا تھا اور اس تعبیر کے پیچھے اریب کا بھی ہاتھ شامل تھا۔

اگرچہ اس وقت وہ اس کے ساتھ نہیں تھا مگر اس کا احساس آج بھی اریب کے اندر موجود تھا۔ شفقت بھرا ہاتھ آج بھی وہ اپنے شانوں پر محسوس کر سکتا تھا۔ ہریالی...... جنہیں کھلتا ہوا ابدال اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ آج وہی ہریالی وہ اریب کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

''آج یہ گاؤں اپنی حقیقت کو پہنچان چکا ہے بھائی جان...... جیسا آپ چاہتے تھے۔ بالکل ویسا ہی ہوا ہے۔'' اس نے ایک لمحے لئے رک کر لہلہاتی کھیتی کو چھوا تھا۔

''اگر آج آپ یہاں ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔'' آنکھوں میں ایک چمک ابھر آئی۔

''اریب بیٹا! یہاں آؤ ناں۔'' ایک بزرگ نے ہل جوتتے ہوئے پکارا تھا۔ وہ مسکرایا اور ادھر دیکھا، نفی میں سر ہلایا۔

''ابھی نہیں چچا...... واپسی پر آتا ہوں۔'' اس نے با آواز بلند کہا تھا اور آگے بڑھ دیا۔ اس کا دل جانے کس وجود سے محو گفتگو تھا۔ تبھی دل کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

''آج یہاں کوئی دیوتا کو نہیں پہنچانتا...... کوئی دیوتا کا نام نہیں لیتا۔ سب اپنی حقیقت کو پہنچان چکے ہیں۔ اپنی حقیقت اور میری حقیقت۔'' وہ ایک نالے کو پار کر رہا تھا۔ بچے کھیل رہے تھے۔ پانی کی چھینٹ اس کے کپڑوں پر آ گری۔ وہ ہنس دیا۔ ایک بچے کے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔

''آپ بہت اچھے ہو اریب بھائی۔'' سب اس کے گرد جمع ہو گئے۔ وہ کچھ دیر وہاں رہا اور پھر آگے بڑھ دیا۔

''آج میری ذات ان کے لیے صرف اریب ہے۔ میں کوئی دیوتا نہیں...... نہ ہی کوئی خاص انسان، جس کے بارے میں کسی نے پیشین گوئی کی تھی۔ سب اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں۔ اب میں ان کی نزدیک ایک عام انسان ہوں۔ وہ انسان جو ان جیسا ہی ہے۔ ان جیسے احساسات رکھتا ہے۔''

''اریب...... آج کافی خوش نظر آ رہے ہو؟'' پیچھے سے رہبر کی آواز پر وہ رکا اور مسکرا دیا۔ وہی ہنسی جو ابدال کی ہوا کرتی تھی۔ آج اس کے لبوں پر عیاں تھی۔ رہبر ایک لمحے کے لیے اسی ذات میں کھو گیا۔

''کیوں ناں خوش ہوں؟ آج تو ہم پرستی کی تدفین ہو چکی ہے۔ ایک نئی صبح کا آغاز ہوا ہے۔ بس اسی لیے۔'' اس نے دوٹوک کہا تھا۔ وہ مسکرایا اور اس کے چہرے کو ہلکا سا تھپتھپایا۔

''اور یہ سب تمہارے یقین کی وجہ سے ہوا، ورنہ شاید ہم سب اسی جہالت میں اس دنیا سے کوچ کر جاتے اور اپنا سب کچھ برباد کر لیتے۔'' وہ اپنے کیے پر نادم تھا۔

''مگر ایسا ہوا تو نہیں ناں؟'' ایک بار پھر وہ مسکرا دیا، کیونکہ افسردگی کے دن بیت چکے تھے۔ وہ ابدال کے خواب کی تعبیر کو اپنی مسکراتی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔

''تم بالکل ابدال کی طرح ہو۔'' لبوں پر معمولی سی جنبش ہوئی تھی۔

''ہو بھی کیوں ناں؟ آخر میرے بھائی جان تھے وہ۔'' ایک کسک ابھری تھی مگر آنکھوں میں آنسوؤں نے بسیرا نہ کیا۔ وہ آگے بڑھا، رہبر بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

''اب آگے کا کیا سوچا ہے؟'' پیچھے سے آواز آئی۔ وہ رکا۔ گہری ضرب لگی تھی۔ خیالات کا بھنور اس کی اور بڑھنے لگا تھا۔

''سوچا تو بہت کچھ ہے لیکن ابھی اس بارے میں سوچنا نہیں چاہتا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تھا اور آگے بڑھ دیا۔ رہبر کافی دیر سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر اریب کا تعاقب کیا تھا۔

''مطلب؟''

''مطلب کچھ نہیں۔'' وہ آگے بڑھ دیا۔ ایک عورت اس کی بلائیں لینے لگی۔ وہ مسکرا دیا۔ پھر ایک کھیت آیا۔ نوجوان پھول توڑ رہے تھے اور اپنے اپنے ٹوکرے میں ڈال رہے تھے۔

''تم یہیں رہو گے ناں؟'' وہ بھی آگے بڑھ کر پھول توڑنے لگا تھا اور کئی پھولوں کو ایک ساتھ توڑ کر ان میں سے ایک کے ٹوکرے میں ڈال دیئے۔

''نہیں۔'' اس نے مختصر کہا تھا۔ اس لڑکے نے شکریہ کے طور پر اپنی کلائی میں بندھے دھاگے کو کھول کر اریب کے ہاتھوں میں باندھ دیا۔

''میری ماں نے یہ دھاگا مجھے نظر بد سے بچانے کے لیے باندھا تھا۔'' دھاگا باندھتے ہوئے اس نے تمہید باندھی۔ اریب نے مسکراہٹ کے ساتھ شکریہ ادا کیا۔

''لیکن کیوں؟ اب تو سب ٹھیک ہو گیا ہے ناں۔ اب تو اس گاؤں کو چھوڑ کر مت جاؤ۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں اور سب سے بڑھ کر ہمیں اپنی غلطی سدھارنے کا ایک موقع دو۔'' اس لہجے میں ایک ملال تھا جو ابدال کی موت کے باعث تھا۔ نوجوان آگے بڑھ گئے اور وہ اپنی کلائی میں بندھے دھاگے کو دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے اسی میں کھویا رہا۔

''صحیح کہا......آپ سب میرے اپنے ہیں۔ میرے بھائی ابدال کے اپنے، جن کے درمیان انہوں نے اپنی زندگی کا ایک حصہ گزارا۔ میرا بس چلتا تو اپنی ساری زندگی یہیں گزر دیتا۔ ان در و دیوار کے درمیان جہاں میرے بھائی کی یادیں بستی ہیں۔ جن کو بھائی جان نے اپنے ہاتھ سے چھوا تھا۔ جن پر آج بھی بھائی جان کا لمس محفوظ ہے مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ چاہ کر بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔'' اس بار اس

کے لہجے میں ملال واضح تھا۔اس نے دھیرے سے اس کے شانوں کو پکڑ کر اپنی طرف اس کا چہرہ کیا تھا۔آنکھوں میں ایک کمک تھی۔

''مگر کیوں؟ کیا تم نے ہمیں معاف نہیں کیا؟''

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔''اس نے تردید کی۔

''پھر کیسی بات ہے؟''وہ اب مزید کچھ نہیں چھپا سکتا تھا تبھی آنکھیں چراتا ہوا اس انداز سے گویا ہوا۔

''دراصل بہت سے کام ہیں جو مجھے نمٹانے ہیں۔کچھ وعدے ہیں جو مجھے نبھانے ہیں۔میں ان کاموں کو،ان وعدوں کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتا۔بس انہیں ہی وفا کرنے واپس جانا ہے مگر میرا وعدہ ہے زندگی سے فرصت ملی تو واپس ضرور آؤں گا۔انہی فضاؤں میں سانس لینے جدھر میرے جسم کا خمیر بنا تھا۔جو میرا اصل ہے۔میں واپس آؤں گا۔جیسے ابابیل لوٹ آتی ہیں،بالکل ویسے ہی میری ذات بھی دوبارہ لوٹ آئے گی اور اس بار مجھے روکنے والا کوئی نہیں ہوگا......کوئی بھی نہیں۔''اس کی آنکھوں میں ایک آنسو چمکنے لگا تھا۔

''میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔خدا تمہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔''اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا تھا۔وہ مسکرایا اور پھر قدموں کو پیچھے کی جانب کھسکانے لگا۔

سورج نے اب سمٹنا شروع کر دیا تھا۔افق نے آسمان کی خوبصورتی میں اضافہ کیا تو اسے کچھ یاد آیا۔وہ دوبارہ پلٹا۔

''میرے بعد میرے عاطی کا خیال رکھو گے۔''ابدال کے آخری الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔

''آپ کو معلوم ہے عاطی کون ہے؟''بے چین لہجے نے استفسار کیا تھا مگر نفی میں سر ہلا دیا گیا یعنی زندگی نے ایک نئی پہیلی اس کے سامنے رکھی تھی۔پہلے بلینک کالز کی الجھن کو سلجھانا مقدر تھا اور اب عاطی کو کھوجنا اور اس رشتے کا پتا لگانا جو عاطی کا ابدال کے ساتھ تھا۔

''آخر کون ہے یہ عاطی اور کیا رشتہ ہے اس کا بھائی جان کا؟''وہ زیر لب بڑبڑا رہا تھا۔

''بھائی جان نے تو کہا تھا کہ میرا ان کے سوا کوئی نہیں ہے اور ان کی میرے سوا کوئی جینے کی آس نہیں......تو پھر یہ عاطی؟ آخر کیا اہمیت ہے بھائی کی زندگی میں اس نام کی؟''وہ نئی راہوں پر چل نکلا تھا۔اس گاؤں کو الوداع کہنے کا ارادہ تو وہ کر ہی چکا تھا مگر پہیلی کا سرا اسے سلجھانا تھا۔

''اور کہاں ملے گا یہ عاطی؟ پاکستان میں یا پھر اسی دیس میں؟''اس کا سر ایک بار پھر چکرایا تھا۔وہی الجھن،وہی بے چینی،دھیرے دھیرے دوبارہ اس کا مقدر بن رہی تھی۔

جب کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنے دماغ کو پرسکون کرتے ہوئے ایک عزم کیا تھا۔

''میں نہیں جانتا بھائی جان کہ عاطی کون ہے۔آپ کے ساتھ اُس کا کیا رشتہ ہے اور آپ نے کیوں مجھے اس کا خیال رکھنے کے لیے کہا؟ مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میرا بھائی رشتے نبھانا جانتا ہے۔جو بھی رشتہ تھا آپ کا عاطی کے ساتھ،یقین رکھیں میں اس رشتے کو کبھی

کمزور پڑنے نہیں دونگا۔ میں تلاش کرونگا آپ کے لیے عاطی کو اور اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا عاطی کو۔ یہ وعدہ ہے میرا آپ سے۔ ایک بھائی کا اپنے بھائی سے۔"

☆......☆......☆

اب دیکھ لے کہ سینہ بھی تازہ ہوا ہے چاک
پھر ہم سے اپنا حال دکھایا نہ جائے گا

ساری امیدیں اب دم توڑ چکی تھیں۔ واپسی کی راہیں بھی اب وہ بھلا بیٹھی تھی مگر ایک امید تھی، ایک آس تھی جو اسے اپنے رب سے تھی کہ وہ اس کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ بس اسی آس کو لیے وہ ہر نماز میں اریب کی واپسی کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ ہر تہجد میں اس کی سلامتی کے لیے وضائف کرتی اور اپنے رب کے آگے اس کی محبت میں آنسو بہاتی۔ لیکن شوہر کی غیر موجودگی اسے پل پل ڈستی رہتی۔

آج بھی وہ اسی تنہائی کا شکار تھی۔ اپنے کمرے میں بیڈ پر بیٹھی وہ اریب کی تصویر سے باتیں کر رہی تھی۔

"کہاں ہو اریب آپ؟ آپ کو معلوم بھی ہے کہ آپ کی بیوی آپ کی راہ تک رہی ہے۔ مانا کہ آپ کی شناخت یہ وطن نہیں، یہاں کے رہنے والے نہیں مگر میں...... میں تو آپ کی اپنی تھی ناں۔ مجھ سے رشتہ تو آپ نے جوڑا تھا۔ مجھ سے محبت تو آپ نے سچے دل سے کی تھی ناں......! تو پھر آج وہ محبت مجھے اس تنہائی میں محسوس کیوں نہیں ہو رہی؟ کیوں آپ حقیقت کی دنیا میں جا کر اس خواب کو بھول گئے۔ اس خواب کو جہاں آپ نے ایک رشتہ جوڑا تھا۔ مجھے اپنے حسین خواب دیکھا کر کیوں انہیں تعبیر کی بلندیوں تک نہیں لے جا پائے؟" وہ تصویر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شکوہ کر رہی تھی۔ ہچکیاں ایک بار پھر بندھ چکی تھی۔ اس نے تصویر کو سینے سے لگایا اور پشت کو گاؤ تکیے سے لگایا۔

"آپ کو واپس آنا ہوگا اریب...... اگر آپ واپس نہ آئے تو میرے جینے کی تمنا ختم ہو جائے گی اریب۔ خدا کے لیے آپ واپس آ جائیں۔" اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں۔

"اریب واپس ضرور آئے گا۔" یہ جبیں کی آواز تھی۔ اس کے پیچھے حسام کھڑا تھا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ وہ سیدھے سے بیٹھی اور اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

"یہ ایک بیوی کی امید ہی نہیں بلکہ ایک بہن کا یقین بھی ہے۔ اریب واپس آئے گا۔" وہ حاعفہ کے ساتھ آ بیٹھی تھی۔ حسام بیڈ کے پہلو میں کھڑا تھا۔ یاسیت یہاں بھی نمایاں تھی۔

"میری تو ہر دعا میں اریب شامل ہوتا ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب اریب کی یاد میرے دل پر دستک نہ دیتی ہو۔ ہر وقت یہی فکر رہتی ہے جانے اریب ٹھیک بھی ہوگا یا نہیں۔" جذبات کا دریا ایک بار پھر رواں ہونے جا رہا تھا۔ جبیں نے اس چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور نفی میں گردن ہلا دی۔

’’نہیں حاعفہ۔‘‘اس آواز میں بھی درد شامل تھا۔

’’اریب کو واپس میں لے کر آؤں گا حاعفہ۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ جیسے برسوں پہلے اس نے میری جان بچائی تھی، آج پھر اسے میرے بچے کی جان بچانی ہوگی کیونکہ صرف وہی ہے جس کی بدولت میرے بچے کو زندگی مل سکتی ہے اور اگر وہ نہ آیا تو......!‘‘بات ادھوری رہ گئی اور انجام کی سوچ نے ہی اس کے دل کو دہلا کر رکھ دیا۔ انگلی اور انگوٹھے سے آنسوؤں کو بہنے سے پہلے ہی پونچھنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ جبیں اور حاعفہ کا بھی دل بھر آیا۔ سحر فاطمہ کا گزر وہاں سے ہوا تو ان کی باتیں سن کر اندر چلی آئیں۔

حسام کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ پلٹا۔ ماں کو دیکھ کر سب بندھن ٹوٹ گئے۔ سحر فاطمہ نے اس کا سر اپنے شانے پر رکھا۔

’’نہیں حسام......اگر تم ہی اپنا ضبط کھو دو گے تو سب کو کون سنبھالے گا۔ تمہیں حوصلہ رکھنا ہوگا۔‘‘ماں کا لہجہ بھی غم سے لبریز تھا۔

’’کیسے رکھوں حوصلہ ماما جان؟ ایک طرف اریب ہمارے ساتھ نہیں ہے تو دوسری طرف سعدی؟ میرے بچے کے پاس وقت بہت کم ہے ماما جان۔ بہت کم وقت ہے۔ اگر اریب نہ آیا تو......؟‘‘ایک مجبور و لاغر باپ اپنی بے بسی کی دہائیاں دے رہا تھا۔

سحر فاطمہ نے حسام کو اپنے سامنے کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ٹپکتے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کے پوروں سے پونچھا تھا۔

’’ایسا سوچنا بھی مت...... سمجھے تم۔ لاغر و مجبور ہم تھے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے پاس تمہارا بھائی ہے۔ جو تمہارے لیے اپنی جان بھی دینے سے دریغ نہیں کرے گا۔ جب تک اریب کا تم سے رشتہ جڑا ہے تب تک وہ تمہارا ساتھ نبھائے گا۔ یہ ایک ماں کی تربیت کہہ رہی ہے۔‘‘آنکھوں میں یقین غالب تھا۔

’’اور اگر وہ نہ لوٹ کر آیا تو؟‘‘بے یقینی نے اپنی راہ خود بخود بنائی تھی۔ حاعفہ کا وجود تڑپ اٹھا۔

’’آئے گا لوٹ کر وہ۔ انسان اپنوں سے کتنا ہی دور کیوں نہ چلا جائے، ایک نہ ایک دن لوٹ کر ضرور آتا ہے۔ مجھے بھی اپنے بیٹے پر یقین ہے۔ اپنے بیٹے اریب پر......اور ایک ماں کا یقین کبھی غلط نہیں ہوتا۔‘‘انہوں نے حسام کو حوصلہ دیا تھا۔ اثبات میں گردن ہلا دی گئی مگر آنکھوں کے اشکوں کو بھلا کون روک سکتا تھا۔

انہوں نے حاعفہ کی طرف دیکھا تو وہاں بھی سوالوں کا ایک انبار لگا تھا۔ بے قرار آنکھیں اپنے جواب کی منتظر تھیں۔ اثبات میں ہلایا گیا سر، پل بھر کے لیے ان کا مداوا بنا تھا۔

’’لوٹ آؤ ناں اریب......!‘‘حاعفہ نے دل ہی دل میں اپنی محبت کو پکارا تھا۔ جس کی پکار پر لبیک کہنا اب محبت کا فرض بنتا تھا۔

☆......☆......☆

مشکل سے عمر کاٹی تلوار کے تلے

سر میں خیال گو کہ رکھیں یار عشق کا

عرصے بعد اِس نے اُس دیس میں قدم رکھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا۔ان راستوں سے گزرتے ہوئے ہر یاد کو جیسے دوبارہ ابھرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ شہرِ اقتدار کی سڑکوں پر ایک لمبے سے اوور کوٹ میں ملبوس، دونوں ہاتھوں کو جینز میں ڈالے آگے بڑھ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا اس کے بالوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی، کان کی لو کے نیچے گردن کو گدگداتی اور پھر آگے بڑھتی مگر وہ تو جیسے ان کا اثر قبول کرنے سے گریزاں دیکھائی دے رہا تھا۔

ہلکے ہلکے قدم وہ ایسے اٹھاتا جیسے دنیا جہاں سے اسے کچھ لینا دینا نہیں۔ بس اپنی ہی دھن میں مگن، یادوں کے تسلسل میں ڈوبا ہوا، حقیقت کی راہوں سے بہت دور مگر پھر بھی حقیقت کی دنیا میں سانس لیتا وجود، رات کی تاریکی میں دائیں طرف دیکھنے کے لیے پل بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔

"رات کافی ہو چکی ہے، اب گھر چلنا چاہیے۔" ماضی کی کتاب سے کچھ عکس باہر نکل آئے تھے۔ وہ اب مکمل طور پر دائیں جانب مڑا تھا۔ راہگیر اسے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے تھے مگر اسے پرواہ نہ تھی۔

"آپ اسے رات کہتے ہیں بھائی جان؟ جبیں ذرا سنو! حسام بھائی کے لیے سات بجے ہی رات ہو گئی ہے۔" اپنی ہی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ پھر قہقہہ گونجا، جس میں جبیں کے قہقہے کی بھی آمیزش تھی۔

"شرم نہیں آتی، اپنے بڑے بھائی کا مذاق اڑاتے ہوئے۔ میں تمہاری فکر کر رہا ہوں کیونکہ تم دونوں بچے تو میرے ساتھ ہو۔ ورنہ میں تو رات بارہ بجے تک بھی یہاں رک سکتا ہوں۔" حسام نے دونوں کے کان پکڑے تھے۔

"اوہو! ہم اور بچے۔ آپ تو جیسے سو سال کے بوڑھے ہو۔" جبیں بھی کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ وہ ان عکس کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا تبھی آگے بڑھا مگر آگے جنگلہ تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اس نوکیلے لوہے کے جنگلے پر رکھے تھے۔

"بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ چاہے ایک سال بڑے ہوں یا پھر ایک گھڑی کے، سمجھی تم اور باتیں جتنی بھی ہیں ناں، کار میں بیٹھ کر کرنا۔ ماما جان اور بابا جان فکر مند ہو رہے ہونگے۔ تمہیں تو کچھ کہیں گے نہیں، بس میری شامت آ جائے گی۔" اس نے جیکٹ کی زپ بند کی تھی۔

"تو آپ کو لائے کس لیے ہیں؟" اریب نے دھیرے سے سرگوشی کی تھی۔ جبیں ہنس کر ہنس دی۔ حسام کو کچھ دیر بعد احساس ہوا۔

"تمہیں تو میں......!" یہ کہتے ہوئے وہ اس کے پیچھے بھاگا تھا جب کہ وہ کار کی طرف دوڑ پڑا۔

ماضی کی حسین یاد جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سبب بنی تھی۔ وہ ہنسنا چاہتا تھا مگر ہنس نہ سکا۔ بس ایک آنسو رخسار کو چھوتا ہوا زمین بوس ہوا۔

"کاش......!" ایک حسرت دل میں ابھری تھی مگر اس حسرت کے پیچھے کیسا جہاں آباد تھا۔ کسی کو خبر نہ تھی۔

''صاحب......! اللہ کے لیے کچھ کھانے کو دو ناں......!'' ایک بچی نے پیچھے سے اس کا اوور کوٹ کھینچا تھا۔ حسین خواب ٹوٹا اور حال میں داخل ہوتے ہی اسے اپنی حالت کا علم ہوا۔

ایک میلی سی چادر میں لپٹی سانولے رنگ کی دس سالہ بچی ہاتھ پھیلائے کچھ کھانے کو مانگ رہی تھی۔ وہ بے یقینی کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''کیا میری حالت بھی یہی ہوتی؟'' جانے کیوں اس کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا تھا مگر کیوں؟ وہ جواز نہ جان سکا۔

''دو ناں...... اللہ کے واسطے۔'' اس نے دوبارہ صدا بلند کی تھی۔ اس نے جھرجھری لیتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور اوور کوٹ کی جیب سے کچھ پیسے نکال کر اسے دیئے، وہ انہیں تھام کر بھاگتی ہوئی سامنے ایک ٹھیلے پر گئی اور ایک نان ٹکی لے کر اپنے فاقے کو مٹانے کا سامان پیدا کیا۔

وہ کچھ دیر تو کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر آگے بڑھ دیا۔ اب منزل کا تعین کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ ذہن میں کئی آوازیں گونج رہی تھی مگر وہ ہر ایک کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کیونکہ اگر قدم رکتے تو شاید منزل بھی کھو جاتی۔ جہاں اسے جانا تھا، نہ جا سکتا اور جو اسے کرنا تھا۔ وہ نہ کر سکتا۔

''آپ جانتے ہیں عاطی کو؟'' اس کی نگاہ جیسے ہی اس در پر گئی، جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ایک منظر آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ گاؤں سے نکلنے سے پہلے اس نے آخری بار کسی سے ابدال سے کیے گئے اس وعدے کے بابت سوال دراز کیا تھا۔

''عاطی...... نام کچھ سنا سنا سا لگ رہا ہے۔'' وہ ابدال کا ایک دوست تھا۔ جس سے وہ اکثر اپنے راز بانٹ لیا کرتا تھا اور اس دوست کے متعلق بھی ابدال نے خود اریب کو بتایا تھا۔ لہٰذا اگر عاطی کے بارے میں کوئی جانتا تھا تو شاید یہی دوست تھا۔

''پلیز کچھ یاد کرنے کی کوشش کریں اور بتائیں کہ کون ہے عاطی...... کیا رشتہ ہے اس کا میرے بھائی کے ساتھ؟'' اس کی آنکھیں یک ٹک بس اسی جانب دیکھتی جا رہی تھیں۔

''عاطی...... ایک بار میرے ساتھ دیو خاص نے یہ نام تو لیا تھا...... مگر صحیح سے یاد نہیں آرہا کہ رشتہ کیا بتایا تھا انہوں نے؟'' وہ دماغ پر زور ڈالتے ہوئے ماضی میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ اریب کی تو جیسے سانسیں اٹکی ہوئی تھیں۔

''پلیز...... ذرا زور ڈالیں۔'' اس نے آنکھیں پھیلائے حسرت وافسردگی کے ساتھ کہا تھا۔

''میں یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا لیکن غالب گمان ہے کہ وہ ان کا بیٹا تھا۔'' یہ سن کر تو جیسے اریب ٹھٹک کر رہ گیا۔ آنکھیں یک ٹک اس کی جانب دیکھتی رہی۔ سماعت میں کئی لمحے یہی جملہ گونجتا رہا۔

''کیا؟ عاطی ابدال بھائی جان کا بیٹا ہے؟ میرا بھتیجا؟ میرا اپنا...... میرا سگا؟'' آنکھوں میں ایک کمک پیدا ہوئی۔ ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ مچلنے لگی مگر اشکوں نے نیا بہانہ جیسے تراش لیا تھا۔

''میں آچکا ہوں۔'' یادحال میں ضم ہوئی اور اس نے لوہے کا گیٹ کھولا۔ رات کے سناٹے میں ایک چرچراہٹ کی آواز گونجی۔ ہر شے جیسے اس کے آنے سے دوبارہ کھل اٹھی تھی۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا، اب کوئی اسے اغوا کرنے والا نہیں تھا۔ پیچھے کی کہانی بہت پیچھے رہ چکی تھی۔ ایک نئی زندگی......ایک نئی کہانی اس کی منتظر تھی۔ جو عالمگیر ہاؤس میں اس کے دوبارہ قدم رکھتے ہوئے جنم لینے والی تھی۔

وہ دھیمے قدموں کے ساتھ اندرونی دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ اس دن کی طرح آج بھی وہ ادھ کھلا تھا۔ رات کی تاریکی ایک لکیر کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کھڑا کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ ہاتھ بڑھا کر ہینڈل کو پل بھر کے لیے پکڑا۔ سماعت میں کئی آوازیں گونجنے لگیں۔ وہ ان کو پہنچانتا تھا بس سننا نہیں چاہتا تھا۔

''خیالات کے اس نئے بھنور کو اس نے بری طرح جھٹکا تھا اور گہری سانس لیتے ہوئے اندر قدم رکھا۔ خاموشی کا نیا دور شروع ہوا تھا۔ وہ اب مضبوط قدم آگے بڑھاتا تھا۔ سب کا سامنا کرنے کے بالکل تیار تھا۔

وہ راہداری پار کرتے ہوئے عین کنارے پر آیا تھا۔ جہاں پچھلی بار ایک راز سے پردہ اٹھا تھا۔ آج بھی پل بھر کے رکا۔ سامنے لاؤنج میں سب موجود تھے مگر اس بار سب خاموش تھے۔ کوئی لب اپنی آپ بیتی بیان نہیں کر رہا تھا۔

''کتنے پرسکون چہرے ہیں ناں سب کے؟'' اس نے خود سے گمان کیا تھا اور آگے بڑھا۔

خاموش فضا میں قدموں کی چاپ سنائی دی تو نگاہیں برجستہ راہداری کی جانب اٹھتی چلی گئیں۔ خوفناک خواب کے بعد حسین صبح کا آغاز ہوا تھا۔ حاعفہ جو سامنے ہی کھڑی تھی۔ اریب کو دیکھتے ہی آنسوؤں کی جھڑی جاری کر دی۔ سحر فاطمہ کی سانسوں کو بھی تازگی کا نیا احساس مل چکا تھا۔ جہانزیب جو اریب کے جانے کے بعد بالکل ٹوٹ چکے تھے۔ سامنے اس کا چہرہ دیکھ کر دوبارہ جڑتے چلے گئے۔

سب کھڑے ہوئے اور حقیقت پہنچاننے کی کوشش کرتے رہے۔

''اریب......! تم واپس آگئے؟'' سب سے پہلے حسام آگے بڑھا تھا۔ بھائی کو اپنے سامنے صحیح وسالم دیکھ کر وہ ہواؤں میں اڑنے لگا تھا۔ خوشی کو کس طرح عیاں کرے؟ وہ سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔ آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔ اریب کا چہرہ ہر تاثر سے پاک دیکھائی دے رہا تھا۔ جو خوشی تھی، انہی کے چہرے پر تھی۔ وہ وجود کوئی بھی اثر قبول کرنے سے عاری تھا۔

''مجھے یقین تھا میرا بیٹا واپس ضرور آئے گا۔'' سحر فاطمہ نے بھی آگے بڑھ کر اریب کی بلائیں لی تھی۔ اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے لبوں کی تشنگی کو اریب کی پیشانی کے بوسے سے بجھایا تھا۔

''میں بہت خوش ہوں بھائی کہ آپ واپس آگئے۔'' اس بار وہ ٹھٹکا تھا۔ گردن میں ذرا سا خم آیا اور دائیں جانب اس نے دیکھا تھا۔

سب حیران تھے۔ زندگی میں پہلی بار جبیں کے لبوں سے اریب کے لیے بھائی کا جاری ہوا واقعی حیران کن تھا۔ سحر فاطمہ کا چہرہ مزید کھل اٹھا تھا۔

''اریب میرے بیٹے!'' جہانزیب بھی گویا ہوئے تھے۔ اریب کی نگاہیں ان پر جا ٹھہریں۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ حسام دائیں جانب جبکہ سحر فاطمہ بائیں جانب کو مڑ گئیں۔ جہانزیب اور اریب آمنے سامنے تھے۔ باپ کی آنکھوں میں درد اور محبت

کے تاثر ملے جلے تھے۔ وہ اپنے لختِ جگر کو، جسے اگرچہ انہوں نے جنم نہیں دیا تھا، اپنے سینے سے لگانا چاہتے تھے۔

''مجھے یقین تھا، تم واپس ضرور آؤ گے۔ ہم سب کی محبت تمہیں زیادہ دیر تک ہم سے دور نہیں رکھ سکے گی۔'' رندھا ہوا لہجہ گویا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور اس کے دونوں شانوں کو پیار سے پکڑا تھا۔ آنکھیں آنکھوں کو تکتے ہوئے اپنی تشنگی بجھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

وہ اپنے لبوں سے اس کی پیشانی کا بوسہ دینے جا رہے تھے کہ اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور جہانزیب کے ہاتھوں کو دھیرے سے جھٹک دیا۔ سب کو ایک بہت بڑا جھٹکا لگا تھا۔ آنکھوں نے حیرت سے اریب کی جانب دیکھا۔

''اریب......!'' جہانزیب کشمکش اور الجھنے ہوئے لہجے میں گویا ہوئے۔

''مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' اس کی آنکھوں میں سفاکیت نمایاں تھی۔ سب پر جیسے ایک قہر نازل ہوا تھا۔ حاعفہ جو سب سے پیچھے کھڑی تھی۔ اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ کر سکی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو اریب؟'' سحرا فاطمہ نے فاصلے پر کھڑے ہی سوال کیا تھا۔

''وہی جو آپ لوگوں نے سنا...... مجھے ان لوگوں سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا جو میرے اور میرے بھائی ابدال کے درمیان دوریوں کا سبب بنے۔'' اس نے کرخت لہجے میں کہا تھا۔

سب کو اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آیا تھا۔ خوشی کے سبب بہنے والے آنسوؤں نے اب بہنے کا کوئی اور ہی جواز بنا لیا تھا۔

''اریب......!'' حاعفہ کے لب ہلے تھے۔ نگاہیں برجستہ اس وجود پر جا ٹھہریں جس کی واپسی کے لیے ہزاروں دعائیں سجدوں میں مانگی گئی تھیں۔ اب وہی وجود جب نگاہوں کے سامنے تھا تو ایک اجنبی محسوس ہو رہا تھا۔

اریب سب کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھا تو پیچھے سے جہانزیب نے اس کا بازو پکڑا تھا اور اس بے اعتنائی کا جواز جاننا چاہا مگر دل میں چھپا درد ظاہر ہو گیا اور اُس نے بری طرح ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''مجھے چھونے کی دوبارہ غلطی مت کیجیے گا۔'' آنکھوں میں نفرت، حقارت اور غصے کے ملے جلے تاثر تھے۔ اریب کے اس رویے پر جیسے سب دنگ رہ گئے۔ آنکھوں نے اسے حقیقت ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید یہ ایک خواب تھا یا پھر ایک بھیانک حقیقت، جو ان کی زندگی میں زہر گھولنے جا رہی تھی۔

محاذ ابھی جاری ہے

وہم گماں کا گماں، عیشِ یقیں ہے یہاں
یہ بھی گماں ہے گماں، شہر بگولوں کا ہے

گزرا ہوا ہر پل شفاف آئینے کی طرح تھا۔ کوئی دھول، کوئی غبار نہ تھا جس کے زیرِ اثر وہ پل آلودہ ہوں۔ آسمان بھی صاف تھا۔ بس ایک بادل تھا جو دیکھنے میں تو سفید تھا مگر اپنے اندر بہت سا ابر سمیٹے سر پر منڈلاتا جا رہا تھا۔ یہ ابر نہ تو نینوں سے بہا کر ضائع کیا جا سکتا تھا اور نہ اس کا بوجھ ہر وقت اٹھائے جانے کے قابل تھا۔ بس ایک تلخ یادیں اور گزرے پل، حسین و جمیل زندگی کو زنگ لگائے جا رہے تھے۔ اپنوں اور غیر کی جنگ میں دل مضطر ہی غم اٹھا رہا تھا۔ یہ آنکھیں جو ابھی تک اپنے اندر ایک عجب شعلے کو بھڑکائے ہوئے تھیں۔ کسی ایسے ہاتھوں کی متلاشی دکھائی دیتی تھیں جو آ کر ان آنکھوں میں چمکنے والے موتیوں کو اپنے انگلیوں کے پوروں سے سمیٹے، بہتی ندیا پر نرم گداز ہاتھوں سے بندھ باندھے اور جو کندھے اپنی سچائی عیاں ہونے پر بری طرح ٹوٹ چکے ہیں، ان کو آ کر سہارا دے۔ وہ سر جن پر سچائی، بار بار ضرب لگا رہی ہے، اس کو اپنے کندھے پر رکھ کر سکون مہیا کرے۔

سفید لباس میں کھڑا وہ ٹکٹکی باندھے بس سیاہ آسمان کو دیکھے جا رہا تھا۔ بظاہر ایک چاند تھا، جس کے گرد کوئی تارا نہ تھا۔ جیسے سب اس سے خفا ہو کر اپنی اپنی خواب گاہوں میں آرام کے لیے جا چکے ہوں اور وہ بالکل تنہا ہو، اکیلا پن اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ ہاتھوں سے ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے وہ اپنی اضطرابی کیفیت کو ضبط کرنے کی سعی کر رہا تھا۔

”ہر کہانی کا اختتام اتنا دردناک کیوں ہوتا ہے؟ وہ کہانی جو خوشیوں اور محبتوں میں پروان چڑھتی ہے۔ اپنے اینڈ تک پہنچتے پہنچتے آنسوؤں کے پانی میں غوطے کیوں کھانے لگ جاتی ہے۔ وہ چاہتیں جو کہانی کے آغاز انسان کا مقدر بنتی ہے، انسان کو ہنسنا سکھاتی ہے، اپنے انتہا تک پہنچنے سے پہلے رلانا کیوں سکھا دیتی ہے؟ جس کہانی کے شروع ہونے سے پہلے آنسوؤں کا ذکر بھی نہیں کیا جاتا، کہانی کے آغاز پر یہی آنسو مقدر کیوں بنا دیئے جاتے ہیں؟ جس دل میں پہلے اپنوں کی چاہت کو پروان چڑھایا جاتا ہے، اپنوں کے ساتھ خوشیاں بانٹنا سکھایا جاتا ہے، اُن کے ساتھ رہنا سکھایا جاتا ہے، اُن کے غم کو اپنا بنانا سکھایا جاتا ہے پھر انہی اپنوں کو ایک پل میں پرایا کیوں کر دیا جاتا ہے؟ کیوں ہر کہانی کے اختتام میں اپنوں کا ساتھ نصیب نہیں ہوتا؟ کیوں ہر کہانی کا انجام ایسی سچائی پر ہوتا ہے جسے برسوں کی محبت کو

ایک پل میں بھلا دیا کرتی ہے؟ جہاں صدیوں تک اس سچائی کو چھپایا گیا؟ آخر میں بھی کیوں نہیں چھپایا جاتا؟ کیوں راحتوں میں پلے وجود کا پرخار راستوں پر چلنا مقدر بنا دیا جاتا ہے؟ کیوں آخر میں محبت کا پیکر مجسم ہی محبت کا بھکاری بن جاتا ہے؟ ہر رشتہ، ہر محبت دامن سے ایسے چھنتی چلی جاتی ہے کہ انسان ان کی ایک جھلک دیکھنے کو ترس جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیوں؟" خوابیدہ وجود نے تنہا چاند کو دیکھ کر استفسار کیا تھا مگر وہ تو خود ان جواب کا متلاشی تھا۔ جس کا دامن خود داغدار ہو وہ بھلا دوسروں کے داغوں کو کیسے بھر سکتا ہے؟

ایک چمکتا ہوا موتی پلکوں پر اپنے ہونے کا وجود دے رہا تھا، جب سماعت نے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ اس نے گہری سانس لی اور معجل اپنے دائیں ہاتھ کی پشت سے اس موتی کو نیچے لان کی گھاس کا وجود بنا دیا۔ رات کے اندھیرے میں یہ موتی کب اور کیسے زمین بوس ہوا؟ ہوا نے بھی اسے محسوس نہ ہونے دیا۔

"اریب......!" وہاں حاعفہ تھی، جو اپنے شریک حیات کے اس رویے پر حیرت کا شکار تھی۔ جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا تھا، جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا تھا، وہ ایسا تو نہ تھا۔ وہ اریب تو کوئی اور تھا۔ جس کے لیے اپنے ہی سب کچھ تھے۔ جو اپنوں کے لیے جیتا تھا اور اپنوں کے لیے ہر خوشی قربان کر دینے کو تیار تھا۔ آج کیسے اتنا بدل گیا۔ وہ ماں باپ جن کے سامنے کبھی اس نے تلخ لہجے میں بات نہیں کی، آج کیسے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، ان کا نام لے کر پکار رہا تھا۔

"مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔" آبدیدہ لہجہ کٹھور بننے کی کوشش کر رہا تھا مگر روح سے جڑا رشتہ اس درد کو سمجھ سکتا تھا، جو دل کے کسی کونے میں اسے کسی کانٹے کی مثل چبھ رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھی۔ دھیمے قدم اگرچہ اپنی آواز نہیں رکھتے تھے مگر رات کے سناٹے میں ہوا کی ان سرگوشیوں سے تیز تھے جو اکثر ہوا کانوں میں کیا کرتی ہے۔

وہ اس کے وجود سے لاعلم نہ تھا۔ تبھی گہری سانس لیتے ہوئے اپنے دانتوں سے نچلے ہونٹ کو بھینچا تھا۔ درد کی ایک لہر جسم میں سرایت کر گئی جب اس نے اپنا ہاتھ اریب کے شانے پر رکھا تھا۔

"تمہیں سمجھ نہیں آتا...... مجھے کسی سے کوئی بات نہیں کرنی۔" وہ دفعتہً پلٹا تھا۔ لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ حاعفہ کا ہاتھ ہوا میں ہی معلق رہا۔ آنکھیں استفہامیہ اس کے چہرے کو تکتی رہیں۔ لمحے بیتے تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ نظریں چراتے ہوئے وہ دوبارہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

"پلیز...... مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔" وہ بس یہی کہہ سکا تھا۔

"وہی تو کوشش کر رہی ہوں...... آپ کو سمجھنے کی۔ اپنے اریب کو سمجھنے کی، جو اپنوں سے اس انداز میں کبھی بات کرنا تو درکنار، ایسا کرنے کا بھی سوچ نہیں سکتا۔ پھر آخر ایسی کیا وجہ ہے جس نے میرے اریب کو اتنا بدل دیا۔" وہ اس وجود کو جھنجوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"حالات اور وقت بہت کچھ بدل دیا کرتے ہیں۔" اس نے سامنے بالکونی کی طرف دیکھا۔

''ٹھیک کہا آپ نے وقت بہت سی چیزوں کو بدل دیتا ہے مگر اپنوں کو نہیں ......ان رشتوں کو نہیں جو قدرت بناتی ہے۔'' وہ اسے سمجھا رہی تھی۔

''کون سے اپنے......کون سے رشتے......؟ شاید تم جانتی نہیں کہ......!'' حاعفہ نے مخل مداخلت کی تھی۔

''میں سب جانتی ہوں۔ ماما جان اور بابا جان نے ہم سب کو ساری سچائی بتا دی ہے۔'' یہ سن اریب چونکا تھا۔

''تو پھر بھی تم مجھے سمجھا رہی ہو؟'' اس کی پیشانی پر حیرت کی شکنیں عیاں تھیں۔

''ہاں...... کیوں کہ اپنوں سے بدگمان ہونا اچھی بات نہیں اور پھر سب سے بڑھ کر انہوں نے وہی کچھ کیا جو انہیں کرنے کو کہا گیا تھا۔ آپ کے بھائی کی خواہش بھی تو یہی تھی کہ آپ کو کچھ بتایا نہ جائے۔''

''مگر وہ اتنا تو بتا سکتے تھے ناں مجھے کہ میرا ایک بھائی ہے۔ میرا اپنا بھائی...... جو مجھ سے اپنی جان سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔'' وہ کوئی بات بھی سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وقت نے اسے جو زخم دیا تھا، اسے بھرنے کے لیے ایک وقت درکار تھا۔

''یہ سب بھی تو آپ کو اپنی جان سے زیادہ پیار کرتے ہیں ناں......!'' حسرت سے بھرا لہجہ گویا ہوا تھا۔

''ایسے دیکھاوے کے پیار کو میں نہیں مانتا...... کیا معلوم اس پیار میں ان کا اپنا مطلب شامل ہو۔ آخر بھائی نے اتنے پیسے تو دیئے تھے انہیں۔'' کڑواہٹ کے ساتھ بولے گئے الفاظ جیسے جہانزیب کو اندر سے بری طرح توڑ گئے تھے۔ وہ ابھی ابھی اریب کے کمرے میں آئے تھے اور یہ الفاظ سن کر اپنے آپ کو ضبط میں نہ رکھ سکے اور ایک تھپڑ اس کے بائیں رخسار پر مارا تھا۔

''خبردار! جو ہمارے پیار پر شک کرنے کی غلطی بھی کی تو۔ ماں باپ کا پیار کبھی جھوٹا نہیں ہوتا۔ اس پیار میں کبھی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ سمجھے تم۔ ہم نے تمہیں اپنے دل سے چاہا ہے۔ اپنے دل سے تمہیں اپنا بیٹا مانا ہے اور یہی سچائی ہے، میرے بیٹے۔ یہ دھن، یہ دولت ہمارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔'' وہ اپنی محبت کی وضاحتیں پیش کر رہے تھے۔

''تو پھر یہ آسائشیں...... کیا ہے یہ سب کچھ؟ کیا یہ سچ نہیں ہے؟'' شک کے بیج نے نفرت کو پروان چڑھانا شروع کر دیا تھا۔ آنکھوں میں ایسی خفگی تھی جو شاید ختم کرنا ناممکن تھی۔

''نہیں...... حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو آپ بتائیں، مجھے کیا ہے یہ سب کچھ؟ کیوں آپ نے میری پرورش کے بدلے ان آسائشوں کو تقاضا کیا؟'' وہ دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھے کھڑا تھا۔

''یہ سب ابدال نے اپنی مرضی سے تمہارے لیے دیا ہے۔'' دھیمہ لہجہ گویا ہوا تھا۔

''تو آپ لینے سے منع بھی کر سکتے تھے۔ اگر آپ نے سچے دل سے مجھے اپنا بیٹا مانا ہوتا تو آپ کبھی ابدال بھائی سے پیسے نہ لیتے،

یہ آسائشیں جو ابدال بھائی کے عوض آپ کا مقدر بنے تھے، ان کو نہ لیتے مگر نہیں...... آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا، آپ نے ابدال بھائی کو منع نہیں کیا بلکہ اپنی زندگیوں کو پُرآسائش بنانے کے لیے مجھے بطور مہرا استعمال کیا۔'' قیاس آرائیں اپنوں حدوں سے تجاوز کر رہی تھی۔ بدگمانیاں بڑھتی جارہی تھیں۔

''نہیں...... یہ سچ نہیں ہے۔''

''یہی سچ ہے۔ آپ نے مجھے بطور پیسہ کمانے والی مشین سمجھا تھا اور کچھ نہیں اگر بیٹا سمجھا ہوتا تو یوں میری بولی نہ لگاتے۔ پرورش تو غریب ماں باپ بھی اپنے بچوں کی کرلیا کرتے ہیں تو آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

''تمہارے لیے...... کیونکہ ہم تمہیں وہ راحتیں نہیں دے سکتے تھے، جس کے تم حقدار تھے۔''

''بند کیجیے جھوٹ بولنا...... اور کتنے جھوٹ بولیں گے آپ مجھ سے؟''

''یہ جھوٹ نہیں ہے بیٹا...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ہم نے یہ صرف تمہارے لیے کیا تھا۔ ہم تمہیں کھو نہیں سکتے تھے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ تم ہمارے بیٹے نہیں ہو، ہم نے تمہیں پیدا نہیں کیا مگر ایک سچ یہ بھی ہے کہ میں نے اور تمہاری ماما جان نے کبھی تمہیں حسام اور جبیں سے کم نہیں سمجھا۔ جتنا پیار ہم دونوں حسام اور جبیں سے کرتے ہیں۔ اتنا ہی تم سے بھی کرتے ہیں اور شاید ان سے بھی زیادہ۔''

''بالکل وہ تو کرنا بھی چاہیے۔ آخر جتنا پیار آپ مجھ سے جتلاتے، اتنے ہی تو پیسے آپ لوگوں کو ملتے۔'' وہ ہر بات کا مطلب الٹ سمجھ رہا تھا۔ حاعفہ کے لیے اب خاموش کھڑا رہنا محال ہو چکا تھا۔

''بس بہت ہوگیا اریب...... اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی۔''

''یہ بدگمانی نہیں ہے...... ایک اٹل حقیقت ہے۔ جسے سمجھنے میں، میں نے بہت دیر کردی۔'' وہ انہیں نفرت سے بھری آنکھیں دیکھاتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔

''اریب......!'' جہانزیب نے ہاتھ بڑھا کر روکنا چاہا تھا مگر وہ اس سے پہلے ہی وہاں سے جا چکا تھا۔ آنکھوں میں درد اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ حاعفہ بھی اپنے بکھرے وجود کو سمیٹے حالات کو سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

☆......☆......☆

ہیں اب ہم اور زَد ہے حادثوں کی

ہمیں آزاد فرمایا گیا ہے

ماریہ کچن میں دوپہر کا کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ سحر فاطمہ خیالوں میں گم لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ جہانزیب زینے سے اتر رہے تھے۔ ایک نظر راہداری کی طرف ڈالی اور پھر سحر فاطمہ کے عین سامنے صوفے پر جا بیٹھے۔ ان کی نگاہیں بھی کسی شے کی متلاشی دیکھائی دے

رہی تھیں۔

''سب پریشان ہیں عکاس...... یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ سوچا تھا کہ اریب کے واپس آنے پر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر حالات تو مزید بگڑ گئے ہیں۔'' جبیں زینے سے اترتے ہوئے فون پر بات کر رہی تھی۔ آواز اگرچہ دھیمی تھی مگر خاموشی کا لبادہ پہنے گھر میں آواز گونجتی جا رہی تھی۔

''کیا سمجھاؤں؟ کہاں سے بات شروع کروں؟ یقین جانو...... اب تو مجھے اریب کے پاس جاتے ہوئے بھی اجنبیت محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اس سچ نے ہمارے درمیان ہر رشتے کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔'' مضطرب وجود اپنے کرب کا اظہار کر رہا تھا۔

''کاش تم یہاں ہوتے...... مجھے یقین تھا کہ وہ تمہاری بات ضرور سنتا۔'' گہری سانس لیتے ہوئے اس نے جواب کا انتظار کیا تھا۔ سحر فاطمہ کے ساتھ آ کر وہ دھیرے سے بیٹھی تو سرسری نگاہ اس پر ڈالی گئی تھی۔

''حسام بھائی بھی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ تو خود پریشان ہیں۔ سعدی کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی ہے۔ اب بھی بھائی اور بھابھی اسے اسپتال لے کر گئے ہوئے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔'' اس نے کھوئے کھوئے انداز میں اپنے ناخنوں سے صوفے کے کور کو کھرچنا شروع کر دیا۔

''اریب نے ناشتہ کیا تھا؟'' سحر فاطمہ نے دفعتہً سوال کیا تھا۔ موبائل کو کان سے ذرا پیچھے ہٹاتے ہوئے جبیں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''حاعفہ جی ناشتہ لے کر گئی ہیں اریب جی کے پاس۔'' ماریہ ابھی ابھی کچن سے باہر آئی تھی۔ ٹیبل سے خالی جگ اٹھا کر واپس جاتے ہوئے جواب دینا اپنا فرض عین سمجھا تھا۔

''اللہ......! اریب کو ہم سے بدگمان نہ کر۔'' حسرت سے بھرے لہجے نے بنا ہاتھ اٹھائے دعا مانگی تھی۔

''اللہ نے چاہا تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' جہانزیب نے دھیمے لہجے میں گردن کو خم دیتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا میں بعد میں بات کرتی ہوں؟ اپنا خیال رکھنا۔'' جبیں نے یہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور کچھ لمحے چمکتی سکرین کو دیکھنے کے بعد اسے اپنے دائیں جانب رکھ کر سحر فاطمہ کی جانب دیکھا۔ ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں سمیٹتے ہوئے ذرا اس جانب کو کھسکی۔

''ماما جان! آپ اتنی ٹینشن کیوں لے رہی ہیں؟ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔'' وہ حوصلہ دے رہی تھی مگر آواز خود لرزیدہ تھی۔

''کیسے ٹھیک ہو جائے گا؟ میں نے اریب کی آنکھوں میں کبھی کسی کے لیے اتنی حقارت نہیں دیکھی، جتنا کہ آج اپنے لیے دیکھ رہی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ برسوں کا رشتہ ایک لمحے میں ہی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ گیا ہے۔ اب کچھ باقی نہیں بچا...... کچھ بھی نہیں۔'' آنکھوں میں خود بخود اشک بھر آئے تھے۔ جبیں اپنی جگہ سے اٹھی اور سحر فاطمہ کے عین سامنے زمین پر گھٹنوں کے بل آ بیٹھی تھی۔

''نہیں ماما جان...... ایسا مت سوچیں۔ کچھ بھی نہیں بگڑا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا'' اس کا لہجہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔

''لیکن کب؟'' استفہامیہ نگاہوں کا کسی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ جہانزیب نے بھی اپنی نظریں چرالیں۔

خاموشی نے طول پکڑا مگر جبیں اپنی جگہ سے نہ اٹھی تھی۔

''جب سے وہ واپس آیا ہے، ایک بار بھی میرے پاس آکر نہیں بیٹھا۔ پہلے تو ماما جان ماما جان کہتے اس کی زبان نہیں تھکتی تھی اور آج...... یہ الفاظ اس کی زبان سے سننے کو میرے کان ترس گئے ہیں۔ پتا نہیں وہ مجھے اپنی ماں تسلیم بھی کرے گا یا نہیں'' صبر کا پیمانہ اب لبریز ہو چکا تھا۔ ممتا سے بھرے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے انہوں نے ہاتھوں کا سہارا لیا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں چہرے کو چھپالیا۔ جبیں نے آگے بڑھ کر ان کو دلاسا دینا چاہا تھا۔

''نہیں ماما جان...... آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟ اریب آپ کا ہی بیٹا ہے۔ ہمارا بھائی ہے۔ یہ حقیقت کوئی نہیں بدل سکتا۔'' وہ کہہ رہی تھی مگر دل میں ایک خلا جنم لے چکی تھی۔

سحر فاطمہ کے آنسوؤں میں پہلے سے زیادہ تیزی آگئی تو جبیں نے پلٹ کر جہانزیب پر نگاہ دوڑائی۔ ان نگاہوں کا مقصد وہ اچھے سے سمجھتے تھے۔ گہری سانس لیتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھے اور پاس آکر ان کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔

''سب ٹھیک ہو جائے گا'' لڑکھڑاتی آواز نے حوصلے کے دو بول بولے تھے۔

☆......☆......☆

جب تجھ سے ناتا ٹوٹا تو پھر اپنے سے کیا ناتا

پر اب بھی تو اِک ناتا ہے، وہ ناتا ہے اَن بَن کا

صبح کا منظر اگرچہ دل کو فرحت بخش دینے والا ہوتا تھا۔ لان سے آتی بھینی بھینی خوشبو سانسوں کے سنگ جسم میں تحلیل ہو کر ایک نیا جوش جنم دیتی تھی مگر آج وہ انداز کہیں مدفون سا ہو چکا تھا۔ ماحول میں چھائی ویرانی ان در و دیوار کے غم کو آشکار کر رہی تھی۔

درختوں کی ٹہنیوں پر چہکتی چڑیاں اور دوسرے پرندے ہوا میں اپنا ترنم تو بکھیر رہے تھے مگر اس گھر کے مکین کے لیے یہ ترنم کسی سوگ سے کم نہ تھا۔ بے جان سی اداسی جو جسم سے جینے کی تمنا چھین لے، اب دھیرے دھیرے گھاس کے تنکوں پر اثر انداز ہو رہی تھی تبھی ان میں وہ پہلے کی سی تازگی نہ رہی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ خزاں رسیدہ پتہ جسے پودے نے اپنا حصہ ماننے سے انکار کر دیا تھا، ایک جھٹکے سے ہوا کے دوش پر سوار ہو گیا۔ اداس ہوا اسی پتے کو اپنے دامن میں سموئے نیچے آرہی تھی۔ اندرونی دروازہ جو ادھ کھلا تھا اور کسی کے باہر آنے کی نشاندہی کر رہا تھا، یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

وہ پتا زمین سے اب کچھ فاصلے پر تھا جب ایک نگاہ اس پر مرکوز ہوئی تھی۔ کسی سروس شوز جو دور سے ہی چمک رہے تھے، اس پتے

کی بے بسی پر ہنسنے لگے۔

''تم اپنی قسمت دیکھو! کتنا مان تھا تمہیں اپنی ہریالی پر...... کیسے اتراتے تھے تم میری سیاہی کو دیکھ کر۔ آج دیکھو اپنی اوقات...... کیسے تمہارے اپنوں نے تمہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ تم نے اپنا رنگ کیا بدلا، تمہیں تمہارے گھر سے نکال دیا گیا۔ تمہیں آسمان سے زمین پر گرا دیا گیا۔'' قدم اس زمین بوس پتے کی طرف ہی بڑھ رہے تھے اور بے جان چیزیں آپس میں محو گفتگو تھیں۔

''نہیں...... یہ سچ نہیں ہے۔ بظاہر جو ہمیں نظر آتا ہے اکثر وہ سچ نہیں ہوتا۔ سچ اعتماد و یقین کی تہوں میں لپٹا ہوتا ہے۔ تم نے ابھی مجھے جو طعنہ دیا ہے، اس کا کوئی جواز نہیں۔ میرے اپنوں نے مجھے میرے گھر سے نہیں نکالا بلکہ میں نے خود اپنی جگہ خالی کی ہے۔ میں عمر کا ایک حصہ اس ٹہنی پر گزارا ہے۔ موسم کی رعنائیاں دیکھی ہیں۔ ہوا کے ساتھ سرگوشیاں کی ہیں۔ آسمان سے گرتی بوندوں کو اپنے سینے پر بکھیرا ہے مگر اب وقت نے نئی زندگی کا تقاضا کیا ہے۔ یہ اس دنیا کا دستور ہے۔ جو آیا ہے، اس نے ایک ناں ایک دن جانا ضرور ہے۔ میری زندگی کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ ایک نئی زندگی نے جنم لینا ہے۔ اگر میں اس جگہ قائم رہتا تو شاید وہ نئی زندگی کبھی جنم نہ لے سکتی تھی۔ اس لیے میرا وہاں سے ٹوٹنا برحق تھا۔ میرا گرنا میرے حق میں عروج تھا کیونکہ عروج کا مطلب زوال نہیں بلکہ انتہا ہے۔'' اس پیلے پتے کے جواب پر ماحول پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا مگر اس چمکتے جوتے نے جیسے کانوں میں انگلیاں ڈالی ہوئی تھیں۔ وہ بھول چکا تھا کہ آج جس پر وہ ہنس رہا ہے۔ کل یہی اس کا بھی حال ہونے والا ہے۔

قدم آگے بڑھے اور اس کی آخری سانس نکلی۔ کرچ کی آواز نے ماحول میں ایک شور برپا کیا تھا۔ خود اس کے دل میں بھی ایک آہٹ محسوس ہوئی تھی۔ تبھی وہ رکا تھا۔ سیاہ جینز و شرٹ میں ملبوس وجود ہلکے بادلوں کے نیچے قدرت کا ایک شاہکار لگ رہا تھا۔ چمکتے چہرے پر سیاہ سن گلاسز جو ماحول کا تقاضا نہیں تھا، مگر وہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے حسن میں چار چاند لگا رہی تھیں۔

اس نے اپنے دائیں جانب دیکھا۔ ویران کرسیوں کو پایا۔ سفید کرسیاں جن پر کوئی نہ بیٹھا ہو مگر کچھ پرچھائیاں سامنے موجود تھیں۔ اس کا دل موم ہونے لگا مگر وہ مٹھیاں بھینچے پلٹا تھا۔ نظر سامنے کار کی طرف گئی۔ جو اس کے لباس کی طرح سیاہ تھی۔ وہ اس جانب بڑھا۔ کئی نگاہیں اس جانب متوجہ تھیں جنہیں وہ نظر انداز کیے ہوئے تھا۔ چابی سے دروازہ کھولا اور اس میں جا بیٹھا۔

''اریب......!'' ایک مدہم سی آواز نے جنم لیا تھا مگر وہ ونڈ سکرین اوپر کر چکا تھا۔ سیاہی چھا چکی تھی۔ سامنے دیکھنا بے کار تھا۔ آواز دینے والا اپنے ہاتھ بڑھا کر رہ گیا اور وہ جانے کس موڑ پر اپنے قدم بڑھا چکا تھا۔

☆......☆......☆

شہر ہا شہر گھومنے والو!

تم کو وہ بھی کہیں نظر آیا

’’خدا کے لیے کچھ تو کریں حسام...... میں اپنے سعدی کو یوں پل پل مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ نہیں دیکھ سکتی میں اپنے بچے کو اس تکلیف میں۔‘‘ آنکھوں سے اشک بہتے جا رہے تھے۔ وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو دونوں بانہوں میں سمیٹے ہوئے بیٹھی تھی۔ جس وجود کو مخاطب کیا جا رہا تھا۔ وہ بھی سامنے تھا مگر مجبور تھا۔ ہاتھ اس کے بھی بندھے ہوئے تھے۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ الفاظ کو مجتمع کیا تو لہجے نے ساتھ نہ دیا۔

’’آپ اریب سے بات کریں...... پلیز......!‘‘ ایک فریاد کی گئی تھی۔ اس کی نگاہیں اوپر کی جانب اٹھیں۔

’’تمہیں کیا لگتا ہے؟ میں نے ابھی تک اریب سے بات نہیں کی؟ کیا مجھے اپنے بچے کی فکر نہیں ہے؟‘‘ شکوہ کناں لہجہ دھیمے لہجے میں گویا ہوا تھا۔ آنکھوں میں بے بسی تھی۔ نگاہیں اپنے بچے پر ٹکٹکی باندھے ہوئے تھیں۔

’’فکر ہے تو کوئی عملی قدم کیوں نہیں اٹھاتے آپ؟‘‘ وہی شکوہ تھا مگر الفاظ تبدیل ہو چکے تھے۔

’’کیسے اٹھاؤں عملی قدم؟ اب اریب کو مجبور تو نہیں کر سکتا ناں؟ اس کے سامنے ہاتھ بھی جوڑ کر دیکھ لیے مگر اس کا دل تو جیسے ہم سب سے بدظن ہو چکا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں رہا کہ جو کچھ ہوا اس میں بھلا ہمارے اس بچے کی کی غلطی تھی؟ یہ تو معصوم ہے۔ اگر ہم سے کوئی گناہ ہوا بھی ہے تو اس کی سزا ہمارے بچے کو تو نہیں دی جا سکتی ناں؟‘‘ اشک بار آنکھیں اپنے درد کو سینتے ہوئے تھیں۔

’’اگر میرے بچے کو کچھ ہو گیا تو......!‘‘ بات ادھوری رہ گئی۔ بلکتے ہوئے ہونٹوں نے معصوم وجود کو چوما تھا۔ آنکھوں سے اشک ننھے وجود کے جسم پر گر رہے تھے۔

’’نہیں......!!‘‘ حسام نے آگے ہاتھ بڑھایا تھا مگر خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے تھے۔ خاموش نگاہوں نے تسلی دینے کی اپنی تئیں سعی کی تھی مگر جس کا دل خود تسلی کا طلب گار ہو وہ بھلا کسی کے آنسو کیسے پونچھ سکتا تھا؟

’’کچھ نہیں ہو گا ہمارے بچے کو......!‘‘ ایک مدہم سی سرگوشی فضا میں گونجی تھی مگر سوگ مناتی ہوائیں ان لفظوں کو اپنے اندر سمونے سے قاصر دکھائی دے رہی تھیں۔

☆......☆......☆

یوں تو سو طرح میں خود اپنی پہنچ سے پار ہوں

وہ جو پہنچ کے پار ہے، اس کے ہے پار کیا بھلا

شہر اقتدار کی سڑکیں آج بھی پر رونق تھیں۔ وہی ہوائیں...... وہی چہل پہل...... وہی لوگ...... جو اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ کسی کو کسی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ بس اپنی دھن میں مگن۔ کوئی کسی پیشی کو نمٹانے اعلیٰ عدلیہ کا راستہ لیے ہوئے تھا تو کوئی اپنے چینل کی ریٹنگ بڑھانے کی جستجو میں ایک خبر کو کئی زاویوں سے بیان کر رہا تھا۔ کسی کو بدلتے موسم کی فکر تھی تو کسی کو اپنی کرسی بچانے کی فکر...... بچے بھی اس تنگ و دو سے عاری دکھائی نہ دیتے تھے۔ معصوم کندھے جانے کس جرم کی پاداش میں بھاری بھرکم بستے اٹھائے ایک

نئی دنیا میں داخل ہو رہے تھے۔

یہ سب بہت پرانا تھا مگر جانے کیوں وہ کار کو پارک کرنے کے بعد بھی یہ سب دیکھتا رہا تھا۔ گلاسز ابھی تک اس کی آنکھوں کی چمک کو چھپائے ہوئے تھے۔ ہاتھ ڈور لاک پر منجمد تھا اور سانسوں کی روانی میں بھی مدھم سی سرگوشی تھی۔ سینہ تانے وہ سیٹ کے ساتھ پشت لگائے ہوئے تھا۔

''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا'' ذہن میں ابھرتے کئی سوالوں کو اس نے اس جملے سے جھٹکا تھا۔ وہ پہلے والا انسان نہیں رہا تھا۔ اس نے معتجل گلاسز اتار کر پچھلی سیٹ پر پھینکیں اور لاک کھول کر اگلے لمحے کار سے باہر کھڑا تھا۔ کار کو اچھے سے لاک کرنے کے بعد وہ تیز قدموں کے ساتھ سڑک کے عین وسط میں چلتے ہوئے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ عام شاہرہ نہیں تھی۔ کسی خاص بلڈنگ کی طرف جاتی چار دیواری کے درمیان واقع تھی۔

نگاہوں کو قدموں میں جھکائے وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا جب وہ ایک وجود سے ٹکرایا تھا۔ کسی کے دوپٹے کا پلو اس کی رسٹ واچ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ وہ اسے چھڑانے کی مکمل کوشش کر رہی تھی مگر پلو تھا کہ بغیر اس کی مدد کے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ جتنا جلدی کر رہا تھا، وہ لڑکی اس کے لیے اتنی ہی دیری کا باعث بنی ہوئی تھی۔

غصے میں اپنی مٹھی بھینچے وہ برجستہ پلٹا تھا۔

''نظر نہیں آتا کیا؟'' وہ انگارہ برساتی آنکھوں کے ساتھ پلٹا تھا۔ آواز کا رعب و دبدبہ اس کے اندر بڑی تبدیلی کا باعث بن چکا تھا۔

مخالف وجود کا چہرہ لہراتی زلفوں کی اوٹ میں کہیں چھپا تھا۔ ان حسین زلفوں کے پیچھے ایک حسین چاند چھپا ہے یا پھر کوئی ہیرا...... اس کو کچھ لینا دینا نہ تھا۔ وہ بس اسے گھورتا جا رہا تھا۔

بائیں ہاتھ سے اپنی زلفوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے اپنی نگاہوں کو اس آگ پا مجسم کو دیکھا تھا۔

آب جیسے اس ٹھاٹھے مارتے آتش گیر سمندر کو بجھا چکا تھا۔ چہرے پر چھایا تعش لحہ بھر میں جیسے غائب ہو چکا تھا۔ پیشانی کی شکنیں جنہیں پہلے ہو پڑھ سکتا تھا، آج خود اس کے وجود پر جنم لے رہی تھیں۔

ماضی کے پنوں سے نکل کر وہی چہرہ جو خاص تو نہیں تھا مگر عام کہنا بھی مناسب نہ تھا، اس کے سامنے کھڑا تھا۔ جس کے عوض اس نے ایک مسافت طے کی تھی۔ جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے شب و روز میں ایک اجنبی احساس کی طرح موجود تھا۔ جس کی باتیں اکثر اسے رات کی تاریکی میں، جب ہر جگہ سکون ہوتا ہے، سنائی دیا کرتی تھیں۔

جس کا چہرہ وہ اکثر بھلانا چاہتا تھا مگر وہ رخ یادداشت کی ایک ایسی دیوار پر نقش ہو چکا تھا جس پر سے لکھا گیا کبھی مٹتا نہیں۔

آج وہی وجود ایک بار پھر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"اریب......!" لہجہ بھی وہی تھا۔ مٹھاس بھی وہی تھی۔ انداز بھی ویسا ہی تھا جیسا پہلے ہوا کرتا تھا۔ وقت کے اس چکر نے کچھ بھی نہ بدلا تھا، اگر بدلا تھا تو اریب کو...... جو پہلے کی طرح پیشانی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس تڑپ کو نہیں پڑھ سکتا تھا جو اسے دیکھتے ہی اس وجود میں جنم لینے لگی تھی۔

پہلے پہل وہ محبت کا پیکر ہوا کرتا تھا اور اب نفرت و شک کے سوا کوئی شے اس کے دل میں نہ تھی۔ دنیا کا ہر رشتہ اس کے لیے ایک سوال تھا۔ جس کا جواب نہ ہی اس کے پاس تھا اور نہ ہی مخالف جنس کے پاس۔

"تم......!" دوسرا لفظ سماعت سے ٹکرایا۔ تھما ہوا وقت ایک بار پھر سست روی سے چلنے لگا تھا۔ وہ ہوش میں آیا۔ پلکیں جھپکائیں اور نگاہوں کا رخ خود بخود رسٹ واچ کی طرف گیا۔ جہاں ابھی تک وہ پلو الجھا ہوا تھا۔

اس نے ایک جھٹکے سے وہ پلو کھینچا تو ایک حصہ گھڑی میں ہی رہ گیا۔ دوسری بار اس وجود کی طرف دیکھنا اس نے اپنی توہین سمجھا تھا تبھی چہرہ پھیر کر اپنی منزل کا رخ کیا۔

"انسان کبھی نہیں بدلتے......!" دل نے کہا تھا۔ قدم منجمد تھے۔ پیچھے کھڑا وجود ابھی تک اس کی کمر کو تک رہا تھا کہ شاید وہ پلٹ کر دیکھے۔ اپنے ایک ہاتھ میں فائل کو لیے دوسرے ہاتھ سے دوپٹے کے پلو کو کندھے پر رکھ رہی تھی۔

"تم آج بھی ویسے ہی ہو......" اس بار پیچھے کھڑے وجود نے سوچا تھا۔ دلوں میں کہے گئے الفاظ جانے کیسے وہ سمجھ رہے تھے۔ اریب کا پہلا قدم آگے بڑھا تھا۔

"مگر میں بدل چکا ہوں...... حالات نے بدل دیا ہے۔" چہرے پر دوبارہ سے بے چینی و کرب اپنا ڈیرہ جمانے لگے تھے۔

"اگر حالات تمہیں بدل دیتے تو تم اپنا چہرہ نہ پھیرتے۔" گہری آنکھیں یک ٹک اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"تمہارا چہرہ آج بھی مجھے گزرے وقت کی یاد دلاتا ہے ہانیہ۔" ماضی کے الفاظ...... ڈائری پر لکھی تحریر...... ایک بار پھر سماعت و بصارت کا حصہ بننے لگی تھی۔

"شاید تم بہت آگے بڑھ چکے ہو۔ ایک میں ہی تھی جو......!!" الفاظ ادھورے رہ گئے۔ کسک جو اریب کو دیکھ کر اس کے دل میں جنم لینے لگی تھی اگلے ہی لمحے کہیں کھو کر رہ گئی۔ برسوں کے انتظار کے بعد محبت کو سامنے پا کر جو جنت کا سماں اس کے لیے بندھا تھا۔ ایک لمحے میں ہی خزاں کی زد میں آ گیا۔ برسوں پہلے جیسے وہ اسے بیچ راہ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ آج بھی اسے دیکھ کر اپنا رخ پھیر لیا۔

پلکیں جھپکیں تو آج ان میں کہیں آنسو نہ تھا۔ کوئی ندامت نہ تھی۔ محبت پر نادم نہیں ہوا جاتا۔ آج اسے یقین ہو چلا تھا۔ محبت محبت ہوتی ہے۔ چاہے پتھر سے ہو یا پھر پتھر دل بشر سے۔

☆......☆......☆

تم کو جہانِ شوق و تمنا میں کیا ملا

ہم بھی ملے تو درہم و برہم ملے تمہیں

کمرے کا دروازہ لاک کیا تو بیڈ اس سے چار فٹ کے فاصلے پر موجود تھا مگر اس کے اندر اتنی بھی سکت نہ تھی کہ وہ یہ فاصلہ طے کر سکے۔ سانسیں کسی دھونکنی کی مثل گرم تھیں اور روح میں عجب سی کشمکش کا عالم تھا۔ پلکیں جھپکیں تو وہی چہرہ ایک بار پھر اس کے سامنے تھا۔

''کیوں؟'' بمشکل یہ الفاظ نکلے تھے۔ ہاتھوں میں موجود فائل اگلے لمحے زمین بوس ہو چکی تھی۔ سر دروازے پر ٹکایا گیا تھا۔ نیم مدہم سی روشنی میں وہ چھت کو گھورے جا رہی تھی جیسے اسے اپنی نگاہوں کی حدت سے پھاڑ ڈالے گی۔

''تم واپس کیوں لوٹ کر آئے ہو؟'' وہ زمین بوس ہو رہی تھی۔ جیسے ہر گزرتا لمحہ اس کے جسم سے جان نکال رہا ہو۔ وہ نڈھال سی ہو چکی تھی۔ کسی سوکھی ہوئی لکڑی کی مثل جس کی بہاریں موسم کی نذر ہو چکی ہو۔ جس کی شاداب ٹہنیاں غم شب کا شکار ہو چکی ہوں۔ جس کے پتوں سے ٹکراتی موسم بہار کی گنگناتی ہوائیں اب تھم چکی ہوں۔ پتے جل چکے ہوں۔ وہ بھی ایسے ہی تھی۔

گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں بند کی تھیں۔

''تمہیں لوٹ کر نہیں آنا چاہیے تھا اریب...... میرے اس درد کو کھریدنا نہیں چاہیے تھا جسے میں کئی عرصے سے اپنے آپ سے بھی چھپاتی آ رہی ہوں۔'' خوابیدہ لہجہ شکوہ کر رہا تھا۔

''تم نے پہلے بھی مجھے دکھ دیا تھا اور اب پھر۔'' اس نے اپنا سر دونوں گھٹنوں کے درمیان اڑیس لیا تھا۔

وقت تیزی سے ماضی کی مسافت طے کرنے لگا تھا۔ ہر شے برق رفتاری سے پلٹنے لگی تھی اور منزل وہ تھی جب وہ آخری بار اریب سے ملی تھی۔

اس دن وہ گھر آ کر بہت روئی تھی۔ اتنے آنسو تو اس نے کبھی اپنے نمبر کم آنے پر بھی نہیں بہائے تھے۔ آج اسے محسوس ہوا تھا کہ زندگی میں سب کچھ آگے بڑھنا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ کسی دوسرے کو پچھاڑنے سے ہی جیت نہیں ملتی۔ کبھی کبھار دل کا قرار حاصل کرنے کے لیے ایک قدم پیچھے بھی ہٹنا پڑتا ہے۔ کسی دوسرے کو اپنی جگہ آگے بڑھا کر بھی خوشی حاصل کی جا سکتی ہے مگر اسے یہ سمجھنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ اپنی محبت کو پہچاننے میں اس نے بہت دیر کر چکی تھی۔

''اریب...... تم نے میرے لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کی نہیں کی؟ کیا ایک بار کی غلطی معاف نہیں کی جا سکتی؟ کیوں تم نے میرے اس جرم کی سزا دی جو انجانے میں مجھ سے سرزد ہوا تھا؟'' وہ اب دیواروں سے باتیں کر رہی تھی۔ اپنے حالات کا شکوہ خاموش فضاؤں سے کر رہی تھی۔

''میں مانتی ہوں میں نے تمہیں ٹھیس پہنچائی ہے مگر مجھے اتنی بڑی سزا تو مت دو کہ میں ٹوٹ ہی جاؤں......'' اپنے آپ سے

باتیں کرتے ہوئے اس نے وہ رات بسر کی تھی۔ آنسو بہاتے...... اریب کے وجود کو اپنے سامنے گمان کرتے ہوئے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے مگر افسوس...... ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ اس کی زندگی سے بہت دور جا چکا تھا۔

اگلے روز جب وہ یونیورسٹی گئی تو اسے ہر شے میں خلا نظر آیا تھا۔ کوئی منظر اس کی آنکھ نہ بھایا تھا۔ ہر جگہ اس کے سامنے ایک وجود تھا اور وجود اریب کا تھا۔ جو اب پرائے دیس جا چکا تھا۔

''تم کافی اداس دکھائی دے رہی ہو۔'' کامیش نے اس کا چہرہ پڑھ لیا تھا۔ تبھی ہنستے ہوئے اس کے سامنے آیا تھا۔

''بس ویسے ہی......'' پھیکے سے انداز میں وہ گویا ہوئی تھی۔ نظریں چراتے ہوئے وہ کوریڈور کی مخالف سمت دیکھنے لگی۔

''اریب کی کمی محسوس ہو رہی ہے ناں۔'' اریب کا نام سن کر جیسے اس کے جذبات مچلنے لگے تھے۔ بمشکل اس نے اپنی دھڑکنوں کو ضبط کیا تھا۔

''نن نہیں...... ایسی بات نہیں ہے۔'' اس نے ایک بار پھر سچ سے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔

''ایسی ہی بات ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تم اریب کو پسند کرنے لگی تھی۔'' ان لفظوں نے جیسے اس کی جان نکال لی تھی۔ وہ جھماکے سے پلٹی تھی اور کے چہرے کو استفہامیہ انداز میں دیکھنے لگی۔

''لیکن ایک بات میں آج تمہیں بتانا چاہتا ہوں ہانیہ۔'' اس نے الفاظ کو وہیں سے جوڑنا شروع کیا تھا۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ بہت محبت کرتا ہوں۔'' وہ جیسے آسمان سے نیچے گرادی گئی تھی۔ چمکتی آنکھوں کے آگے کامیش کا وجود اوجھل ہوتا گیا۔ اس کے لبوں نے متحرک ہونا چاہا تھا مگر ذہن ساتھ چھوڑ گیا۔ وہ بت بنے کھڑی تھی۔

''میں نے تمہیں اسی دن سے چاہا ہے جس دن پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ تمہارے چہرے میں کچھ تو تھا جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ تمہارا انداز، تمہاری انا میرے دل میں خود بخود اترتی چلی گئی۔'' وہ کہہ رہا تھا اور یہ ہونقوں سنتی جا رہی تھی۔ جیسے اسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

''میں جانتا ہوں کہ تم یہ سوچو گی کہ تمہارے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ہم دونوں کا اندازِ زندگی الگ ہے مگر میں وعدہ کرتا ہوں اگر تم ہاں کر دو تو میں یہ فاصلے بھی مٹانے کے لیے تیار ہوں۔ یہ دوریت ہے، میں ڈھہہ دوں گا۔ تم جو کہو گی، میں اسی راہ پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ برملا اپنے جذبات کا اظہار کر رہا تھا۔

''میرے نزدیک صرف تم اہمیت رکھتی ہو اور کچھ بھی نہیں...... پلیز تم مجھے اپنا لو۔'' وہ اپنے آپ کو کسی شے کی مثل اس کے سامنے پیش کر رہا تھا۔

''میری محبت کو اپنا لو۔'' وہ اب گھٹنے کے بل بیٹھا تھا اپنا ہاتھ آگے بڑھائے اس کے جواب کا منتظر تھا۔ آنکھوں میں کئی سوال

پروئے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔

''ہانیہ۔'' ایک کشش اس کی آواز میں تھی۔ دنیا کی ہر شے جیسے ساکت تھی۔ بس یہ دونوں تھے۔

''کامیش......!'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ الجھی ہوئی ڈوری میں ایک نئی گرہ لگ چکی تھی۔ جس محبت کو سمجھنے میں اس نے کافی دیر لگا تھی اب وہی دیر کامیش کے سوالوں کا جواب دینے میں لگ رہی تھی۔

''میں تم سے زور زبردستی نہیں کرنا چاہتا ہے۔'' اسے شاید اس کے حال دل کی خبر ہو چکی تھی۔ تبھی کھڑا ہوا اور اپنا سینے عین اس کے سامنے کیا تھا۔

''اگر تمہیں میری محبت قبول نہیں تو میں تمہیں ہاں کہنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔'' چہرے پر ایک افسردگی نے جنم لیا تھا۔ آنکھوں میں ہجر کی کسک ابھرنے لگی تھی۔

''کامیش......تم...... جانتے تو ہو کہ......'' ٹوٹے پھوٹے لفظ بکھرے ہوئے دل سے ادا کیے جا رہے تھے۔ اُس کے قدموں نے واپسی کی راہ ابھی اختیار ہی کی تھی کہ ان لفظوں کو سن کر منجمد ہو گئے۔ گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بغور ہانیہ کے چہرے کو دیکھا تھا۔

''میں جانتا ہوں مگر شاید تم حقیقت نہیں جانتی۔'' کامیش کے اس جملے پر وہ بری طرح چونکی تھی۔ حیرت اس کے چہرے پر واضح تھی۔ پیشانی کے بالوں کی لٹیں شکنوں کو چھپانے سے عاری دکھائی دے رہی تھیں۔

''حقیقت......کیسی حقیقت؟'' لب ہکلائے تھے۔

''یہی کہ اریب تم سے کسی اور سے محبت کرتا ہے۔'' یہ الفاظ جیسے اس کی سماعت کو سُن کر گئے تھے۔ بینائی بھی جیسے گرجتے بادل اچک لے گئے تھے اور وہ شل کھڑی بس انجانے وجود کو دیکھی جا رہی تھی۔ موتی کا ایک قطرہ سیپ سے نکل کر کنارے پر دھنک کے ساتوں رنگوں کو منعکس کر رہا تھا۔

''یہ سچ نہیں...... ہو سکتا۔'' پرانی داستانوں کے کرداروں کی طرح اس کے دل نے بھی حقیقت سے فرار ہونے کا راستہ تراشا تھا مگر ذہن کا ایک گوشہ جیسے اسے تسلیم کر چکا تھا۔ اُس کی بے اعتنائی، اس کا لب ولہجہ سب کچھ پہلے ہی آویزاں کر چکا تھا مگر دل تھا کہ اسے تسلیم کرنے کو تیار ہی نہ تھا۔

''یہی سچ ہے ہانیہ۔ تم سے دور رہنے اور تمہاری محبت کو نہ سمجھنے کی وجہ بھی اریب کی پہلی محبت تھی۔ جو وہ پچھلے کئی سالوں سے کرتا آ رہا تھا۔'' اس کے ذہن پر جیسے کوئی ہتھوڑوں سے مسلسل وار کرتا جا رہا تھا۔ نفی میں خود بخود گردن ہل رہی تھی۔

کامیش نے دھیرے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر محبت کے لمس کو محسوس کروانے کی اپنی تئیں سعی کی تھی۔

"نہیں.......! یہ سچ نہیں ہے۔" معجل اس نے اپنا ہاتھ کھینچا اور رخسار پر بہتے قطروں کو بائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھتے ہوئے برجستہ پلٹی تھی۔ کامیش نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکنا چاہا مگر وہ اسے کیونکر روک سکتا تھا؟

☆......☆......☆

نہ تو دل کا، نہ جاں کا دفتر ہے

زندگی اِک زیاں کا دفتر ہے

سچائی آشکار ہوتے ہی جیسے اس کے اندر سے جینے کی تمنا ختم ہو چکی تھی۔ وہ لڑکی جس کے لیے سب کچھ اپنی خواہشیں تھیں، جانے کیوں محبت کے آگے ہار چکی تھی۔ محبت کی پہلی ضرب نے ہی اس کے اندر سے انا کو اجل کے سپرد کر دیا تھا۔ دوسروں کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھنے والی، آج خود کو ایک کانٹا محسوس کر رہی تھی۔ بہتے ہوئے آنسوؤں نے اس کانٹے کو سیراب کرتے ہوئے مزید تیز کر دیا تھا۔

"تم میری محبت کو یوں جھٹلا نہیں سکتے اریب...... میں صرف تم سے محبت کرتی ہوں...... سمجھے تم...... صرف تم سے۔" اُس رات سیاہی عام راتوں سے زیادہ تھی۔ چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں گم صم سا تھا۔ تارے نے بھی اپنی روشنی کو جیسے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔ ہواؤں کی گود بھی گداز سے عاری تھی۔ انتہا کا سناٹا...... جیسے کسی کا سوگ منایا جا رہا ہو یا پھر کسی آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔

کھڑکی کے عین سامنے بیڈ کا سہارا لیے وہ بیٹھی اپنی زندگی کو کوس رہی تھی۔ سیاہ لباس میں عام سا گندمی رنگ اگرچہ چاند سے تشبیہ دینے کا حق نہیں رکھتا تھا مگر یہ عام سا چہرہ عام لوگوں سے یکسر مختلف تھا۔ خود اریب بھی اس بات سے اتفاق کرتا تھا۔

"تم فی الوقت مجھے نہ اپناؤ اریب...... لیکن ایک وقت آئے گا جب تم مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرو گے۔" ایک وقت کے بعد اس کے دل نے کہا تھا۔ اپنے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے وہ معمولی سی اپنی جگہ پر متحرک ہوئی تھی۔

"قصے کہانیوں میں محبت اپنے مخالف کو ایک ناں ایک دن زیر ضرور کر دیتی ہے۔ محبت اپنا لوہا منوا کر ہی دم لیتی ہے۔ مجھے بھی اب اس دن کا انتظار ہے جب تم خود میرے پاس آؤ گے۔ تب تک میں تمہارا انتظار کرونگی اریب۔" بچوں کی طرح بلکتے ہوئے دل نے کہا تھا۔

ایک ایسے خواب کو اپنی زندگی کا حصہ بنا کر اس نے آگے بڑھنے کی تھامی تھی جس کی بظاہر کوئی تعبیر نہ تھی۔ جس کی کوئی منزل نہ تھی مگر وہ ہار ماننے والی نہ تھی۔ پہلے آگے بڑھنے کی جستجو تھی اور اب کسی کو اپنا بنانے کی چاہ۔ خواہشیں تو ہوتی ہیں تبدیل ہونے کے لیے ہیں۔ اس نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔

☆......☆......☆

تم کو حریم دیدہ و دل ہے اگر عزیز

شہروں کے ساتھ آؤ، دیاروں کا ساتھ دو

"میں فیصلہ کر چکی ہوں کامیش۔" وہ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ بظاہر اس نے گفتگو کا آغاز ہی کیا تھا مگر وہ بن کہے سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ تبھی ایک پھیکی سی مسکراہٹ نے ماحول سے لگاؤ لگانے کی سعی کی تھی۔

"میں ہر فیصلے میں تمہارے ساتھ ہوں۔" پلک جھپکتے ہوئے اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"بنا میرا فیصلہ جانے تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم میرے فیصلے پر راضی ہو، تمہیں کوئی اعتراض نہیں۔" اس نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

"جس سے محبت کی جاتی ہے۔ اس کے فیصلوں کو بھی بنا جانے تسلیم کیا جاتا ہے ہانیہ۔" اس کے لفظوں میں ایک کسک تھی، محبت کی چاشنی تھی۔

"لیکن اندھا اعتماد کبھی کبھار انسان کو ہلاک بھی کر دیا کرتا ہے۔" اس نے تنبیہ کی تھی۔

"مجھے پرواہ نہیں۔" اس نے پورے اعتماد سے کہا تھا۔

"انسان کو اپنی پرواہ کرنی چاہیے۔ آخر جسم و جان کا بھی حق ہوتا ہے انسان پر۔"

"ہوتا ہوگا......" اس نے شانے اچکائے اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں دھنسائیں۔ لمحہ بھر خاموشی کا راج رہا اور پھر اس نے خود ہی اسے توڑ دیا۔

"اچھا چھوڑو...... یہ بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا؟" وہ پوری طرح اُس کی طرف متوجہ تھا۔

ویٹر ٹیبل پر چپس اور چائے کے کپ لا کر رکھ چکا تھا۔ کامیش نے پلیٹ آگے بڑھائی اور پہلے فرائے چپس اٹھائی تھی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ میں نے تمہیں پسند کیا ہے۔" پہلی بائیٹ اس نے ابھی لی ہی تھی کہ یہ الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ کھانسی کا ایک دورہ لگا۔ اسے ان لفظوں پر یقین نہ آیا تھا۔

"کک...... کیا؟" وہ بری طرح چونکا تھا۔

"ہاں...... لیکن اپنے لیے نہیں۔" اس نے جیسے بہار کی ایک جھلک دیکھا کر اس پر خزاں کے موسم کے دروازے وا کر دیئے تھے۔ چہرے پر چھائی شادابی جو لمحہ پہلے ہی دیکھائی دی تھی، دوبارہ غائب ہوگئی۔

"اپنے لیے نہیں...... کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ اسے سمجھ نہ سکا تھا۔

"بات یہ ہے کہ...... میں نے تمہیں اپنی آپی کے لیے پسند کیا ہے۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے الفاظ مکمل کیے تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ وہ لمحہ بھر کے لیے سانس بھی نہ لے سکا تھا۔

کچھ لمحے خاموشی بدستور قائم رہی۔ پھر اس نے پوری حقیقت سے کامیش کو آگاہ کر دیا۔

"سچ یہی ہے کامیش۔ میں نے کوئی حقیقت تم سے نہیں چھپائی۔ اب سب کچھ تمہارے اوپر منحصر ہے۔ تم چاہو تو اس رشتے سے

منع بھی کر سکتے ہو لیکن اگر تم کسی انسان کی زندگی کو سمیٹنا چاہو تو سمیٹ لو۔ میری آپی بری نہیں ہے مگر حالات نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ انہیں وہ دکھ دیے جن کی وہ حقدار نہیں تھیں۔ میں بس یہی چاہتی ہوں کہ آپی کی زندگی میں وہ رنگ دوبارہ لوٹ آئے، جو کہیں کھو کر رہ گیا ہے۔'' وہ نظریں چراتے ہوئے پورے اعتماد سے کہہ رہی تھی جبکہ کامیش کی بے یقین نگاہیں اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔

''اب فیصلہ تمہارے اوپر منحصر ہے۔'' اس نے کامیش کی نگاہوں میں پہلی بار اترنے کی کوشش کی تھی۔ پرنم آنکھوں میں اترتی ہوئی بے یقینی، محبت کے ہاتھوں ایسا فیصلہ لینے پر مجبور کر رہی تھی جو شاید اس نے خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا۔

''ہانیہ......!'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ بھول گیا۔ پلکیں جھپکیں تو پہلی بار ایک موتی اس کی پلکوں کے کنارے کو بھگو رہا تھا۔ خود ہانیہ بھی اس کو دیکھ کر حیران تھی۔ لبوں پر خوشیوں کی ایک مہک بکھیرنے والا آج اداس ساحلوں پر تن تنہا کھڑا تھا۔

''مجھے تمہارے فیصلے کا انتظار ہے لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں نے آج تک جس چیز کو چاہا ہے، اس کو پا کر ہی دم لیا ہے اور یہاں بات تو میری محبت کی ہے۔ اریب میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ میں اریب کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر اس نے میری محبت کو قبول نہیں کیا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں میں کسی اور کو چن لوں؟'' وہ پورے اعتماد کے ساتھ کہہ رہی تھی۔

''اپنے لیے تو تم نے محبت منتخب کر لی اور میرے لیے......؟'' اس نے استفہامیہ انداز میں گردن کو ذرا سا بائیں جانب جھکایا تھا۔ ضرب عین نشانے پر لگی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکتی چلی گئیں۔ ہمیشہ سے خود غرضی اور انا میں پلنے والی آج بھی خود غرضی کی انتہا پر تھی۔

''میں تمہیں فورس نہیں کر رہی......!'' حسب روایت نے عام سا جملہ کہا تھا۔

''تم کر بھی نہیں سکتی۔'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ ایک گہری نگاہ کامیش پر ڈالی تو اس کے چہرے کے تاثر نا قابل بیان تھے۔ وہ انہیں سمجھ نہ سکی اور معجل وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

ابھی اس نے اپنے چہرے کا رخ ہی بدلا تھا کہ کسی کے ہاتھوں کا لمس اسے اپنے ہاتھوں پر محسوس ہوا۔ وہ برجستہ پلٹی تو کامیش نے داہنے ہاتھ سے اس کی کلائی کو پکڑا ہوا تھا۔

وہ دھیرے سے کھڑا ہوا۔

''ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔'' وہ اِس کی کلائی آزاد کر چکا تھا مگر وہ اسے نیچے کرنا بھول چکی تھی۔ ہوا میں معلق ہاتھ...... نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز...... ایک ساکت بت کھڑا تھا۔

''کہنے سننے کے لیے شاید کچھ باقی ہی نہیں رہا۔'' اس نے افسردگی اور تاسف میں ڈوبے ہوئے لہجے کے ساتھ کہا تھا۔

''ابھی تو بہت کچھ کہنا ہے......اور بہت کچھ سننا ہے مگر شاید یہ وقت مناسب نہیں۔'' وہ ذومعنی انداز میں حسرت سے بھرے لہجے میں کہتا ہوا میز کے بائیں جانب سے نکل آگے بڑھ رہا تھا۔ قدم بھی سبک رفتاری سے بڑھ رہے تھے۔

کیا مطلب ہے تمہارا؟'' پیشانی پر کچھ شکنوں نے جنم لیا۔

''مطلب صاف ہے۔ تم مجھے وہ تو نہ دے سکی جس کی مجھے تمنا تھی لیکن میں تمہاری طرح مطلب پرست نہیں ہوں جو محبت کو خالی ہاتھ لٹا دے۔ جس دل میں محبت ہوتی ہے وہ کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہیں لٹاتا اور محبوب کو تو کبھی نہیں۔ محبت کرنے والا تو دوسروں کے دکھ درد کو بنا کہے، بنا سنے سمجھ لیا کرتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم اتنی پتھر دل کیسے ہوگئی۔ ایک طرف کہتی ہو کہ تمہیں اریب سے محبت ہے اور دوسری طرف میری محبت کے محل ہوا اپنے لفظوں کے سنگ سے ریزہ ریزہ کر رہی ہو۔ ایک طرف کہتی ہو کہ تمہارے دل میں چاہت کے جذبات پروان چڑھ رہے ہیں تو دوسری میری خواہشوں کا قتل کر رہی ہو۔ یہ محبت نہیں ہوتی ہانیہ......اسے خودغرضی......مفاد پرستی......انا......اور غرور کہتے ہیں کہ دوسروں کو کچھ نہ ملے بس سب کچھ مجھے ہی ملتا جائے۔'' وہ اس کے وجود کو جھنجوڑنے کی اپنی تئیں سعی کر رہا تھا۔

سامنے کھڑا مجسم بھی ان لفظوں کے نشتر کو سہہ رہا تھا۔ الفاظ کڑوے سہی مگر سچ تھے۔ حقیقت کے عین مساوی تھے مگر جانے کیوں وہ نفی میں گردن ہلانے سے بھی عاری تھی۔

''تمہیں جو سمجھنا ہے سمجھ سکتے ہو۔ مجھے جو خطاب دینا ہے، دے سکتے ہو۔ میں کچھ نہیں کہوں گی۔'' اس کی نگاہوں میں ذرا بھی عاجزی نہ تھی۔ وہی اکڑ......وہی سپاٹ انداز عیاں تھے مگر ایک کسک......ایک ادھوری......دم توڑتی خواہش ضرور سسک رہی تھی۔

''مجھے یہی امید تھی تم سے۔'' اس نے بناوٹی انداز میں ہنسنا چاہا تھا مگر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ مسکرایا بھی نہ گیا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ دوبارہ پلٹی تھی مگر ایک قدم اٹھا کر اس کے پاؤں منجمد ہوگئے۔

''مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔'' یہ الفاظ کہنے کے لیے اس نے کون سا سنگ تراشا تھا؟ دل پر کیسے ستم ڈھائے تھے؟ اس کا علم سوائے قدرت اور اس کی ذات کے کسی کو نہ تھے۔

وہ پلٹی۔ لبوں پر ایک مسکراہٹ نے جنم لیا مگر اس مسکراہٹ میں حقیقت نہیں تھی۔ ایک گلہ......ایک شکایت......ایک کسک تھی جو شاید ہمیشہ اس کی زندگی کا خاصا بنتے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

مرا زوال ہے اس کے کمال کا حاصل

مرا زوال تو مرا زوال ہے بھی نہیں

پاکیزہ اور کامیش کا رشتہ تو ہوگیا مگر اس رشتے میں بندھنے سے پہلے اُس نے اپنا مذہب ضرور تبدیل کیا تھا۔ اریب کی جو خواہش

تھی، آج اریب کی عدم موجودگی میں پوری ہو رہی تھی۔

مفتی صاحب کی موجودگی میں اس نے کلمہ پڑھا اور جب نام رکھنے کی باری آئی تو اس نے اپنا نام ارمان رکھا۔ شاید اپنی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے۔

پاکیزہ کی رخصتی کے بعد ایک کہانی تو پار لگ چکی تھی مگر زندگی کے اگلے امتحان سے وہ بالکل بے خبر تھی۔

جس رات پاکیزہ کی رخصتی ہوئی اسی رات ابان کی کار حادثے میں اچانک موت ہو گئی۔ ٹوٹے ہوئے دل پر جیسے ایک نئی قیامت آن پڑی تھی۔ اس صدمے کو زلیخا بی بی زیادہ عرصے تک سہہ نہ سکی اور خالق حقیقی سے جا ملیں۔

زندگی کے اس دوراہے پر وہ بالکل اکیلی ہو چکی تھی۔ جان سے زیادہ پیار کرنے والا بھائی، کڑوے بول کے پیچھے چھپی محبت کو جتلانے والی ماں...... دونوں اس کے ساتھ نہیں تھے۔ ارمان پاکیزہ کو لے کر اپنے گھر جا چکا تھا۔

پاکیزہ نے ہانیہ کے اکیلے پن کو دیکھتے ہوئے کئی بار اسے اپنے ساتھ جانے کو کہا مگر وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ ارمان کا چہرہ اس کو ماضی کی یاد دلاتا۔ خود وہ بھی ایک نئی کشمکش میں تھا۔ وہ ہانیہ کی مدد تو کرنا چاہتا تھا مگر پاکیزہ کو دھوکہ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ پاکیزہ سے نکاح کرنے سے پہلے اس نے جو خود سے وعدہ کیا تھا۔ اب ہر دم نبھانا اس کا فرض تھا۔

بس اس تنہائی کو دور کرنے کی خاطر اس نے بار پھر زندگی کا رخ کیا۔ وہی راستہ چنا جسے محبت نے بھلا دیا تھا۔ وہی کامیابی کی سیڑھی جو محبت نے کمزور کر دی تھی۔ ایک بار پھر اس کا ہمزاد بن گئی۔

☆......☆......☆

دو جہاں سے گزر گیا پھر بھی

میں رہا خود کو عمر بھر درپیش

وہ آئینے کے سامنے اپنے بالوں کا کنگا کر رہا تھا۔ سفید اور سیاہ دھاریوں والی شرٹ پر بلیو جینز اچھی خاصی جچ رہی تھی۔ سپاٹ نگاہوں سے ہی اپنے عکس کو دیکھ رہا تھا۔

''اریب......!'' حاعفہ کافی دیر سے اریب کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جب بھی کچھ کہنے کی کوشش کرتی، وہ اپنا رخ بدل لیتا۔ اب بھی اس نے زبردستی اسے مخاطب کیا تھا۔

''ہاں۔'' وہ کف کے بٹن بند کر رہا تھا۔ جب وہ اس کے عین عقب میں آ کھڑی ہوئی۔ وہ برجستہ پلٹا تو اس سے ٹکرا گیا۔

''آپ ایسے تو نہ تھے۔ اتنی بے رخی...... ایسی بے اعتنائی...... آخر کیوں؟'' وہ گردن کو ذرا سا خم دیئے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''بس یہی پوچھنا تھا یا کوئی اور بات ہے؟'' سپاٹ لہجہ گویا ہوا تھا۔

''یہ بس نہیں ہے اریب...... آپ کو معلوم ہونا چاہئے ماما جان اور بابا جان آپ کو لے کر کتنے فکر مند ہیں۔'' اس نے دایاں ہاتھ اُس کے بائیں شانے پر رکھا تھا۔ ایک احساس کی کسک ابھارنا چاہی تھی جو شاید کہیں گم ہو چکی تھی۔

''تو کس نے کہا ہے انہیں میری فکر کرنے کو؟'' اس نے بے اعتنائی برتتے ہوئے اپنے شانے اچک دیئے۔ پلٹ کر الماری کی طرف گیا اور دروازہ وا کرتے ہوئے اندر کچھ ڈھونڈنے لگا تھا۔

''وہ آپ کے والدین ہیں اریب...... انہیں فکر نہیں ہوگی تو کس کو ہوگی؟''

''نہیں ہے میرے وہ والدین...... میرے والدین مر چکے ہیں۔ میرا بھائی مر چکا ہے، میں بالکل اکیلا ہوں۔ بالکل اکیلا۔'' وہ گرجتی ہوئی آواز میں پلٹا تھا مگر اس آواز میں ایک تاسف تھا۔ ایک درد تھا۔ جیسے کسی نے دلِ معصوم کو کسی قفس میں قید کر کے ہنسنے کا کہا ہو۔ کسی جادوگر کی جان کو اپنی گرفت میں لے کر زندگی سے حظ اٹھانے کا کہا ہو۔

''میرا کسی سے کوئی رشتہ تھا تو صرف ابدال بھائی سے...... ان کے بعد مجھے کسی رشتے پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔'' ٹوٹا ہوا مجسم اپنے آپ کو سنبھالنے کی جستجو میں تھا۔ رندھا ہوا لہجہ اپنے تئیں کرب کو ضبط کر رہا تھا۔

وہ نظریں چراتے ہوئے یک لخت بیڈ پر آبیٹھا۔

''ایسا نہ کہیں آپ...... ہم سب آپ کے اپنے ہیں۔ ہم سب آپ کے خیر خواہ ہیں۔'' وہ اریب کے قدموں میں آبیٹھی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں کو اس کی رانوں پر رکھ کر اس کی نگاہوں کے راستے دل میں جھانکنا چاہا تھا۔

''ہنوں...... سب دیکھاوا ہے۔'' اس نے گردن جھٹک کر اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ حاعفہ کو شدید مایوسی ہوئی۔ اپنے ہاتھوں کو دھیرے سے اریب کے چہرے کی طرف بڑھایا اور محبت سے بھرے لمس کے ساتھ اس کی نگاہوں کا مرکز اپنے وجود کو بنانا چاہا تھا۔

''نہیں...... اریب۔ یہ دیکھاوا نہیں ہے۔ اگر یقین نہیں آتا تو آپ اپنی پیشانی پڑھ لینے کی طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ تو کہا کرتے تھے ناں کہ آپ کے سامنے کسی کو اپنے دل کی بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں...... پھر آج کیا ہوا؟ آج کیوں آپ کو اپنوں کے دل کی آواز سنائی نہیں دیتی؟'' اس نے اریب کے وجود کو جھنجوڑنا چاہا تھا۔ اس محبت کا احساس دلانا چاہا تھا جسے وقت کے بدلتے تقاضوں نے بدل دیا تھا۔

''مجھے سچ جاننے کے لیے کسی طاقت کی ضرورت نہیں اور ویسے بھی میں وہ سب کچھ کھو چکا ہوں جو مجھے باقیوں سے ممتاز بناتی تھی۔'' اس نے افسردگی سے کہا تھا۔ آنکھوں میں کسی کے کھونے کا ایک بار پھر درد لہرایا تھا۔ ان طاقتوں کی آڑ میں بھائی کا بہتا خون دل کو نئے کرب میں مبتلا کر رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلنے لگی تھیں۔ پیشانی پر بھی استفہامیہ شکنیں ابھر آئیں۔ اریب نے اپنے چہرے کا رخ اس کی طرف کیا تو واقعی تو پیشانی پڑھنا بھول چکا تھا۔ کئی شکنیں مگر تحریر کچھ بھی نہیں......۔

ماضی کے الم ناک ورقوں کو پلٹتے ہوئے اس نے ایک ایک سچ سے حاعفہ کو آگاہ کیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے چلے گئے۔ دیپا سار سے لے کر سٹیوان میں ہونے والے حادثے اب اریب کے ساتھ ساتھ حاعفہ کے بھی علم میں آ چکے تھے۔

"اب بتاؤ...... کیا اب بھی میں غلط ہوں؟ کیا اب بھی میرا رویہ جارحانہ ہے؟ کیا میرا درد ان سب سے بڑھ کر نہیں ہے؟ کیا میری ذات کو دھوکے کے سوا کچھ ملا بھی ہے؟" اس نے حاعفہ کے ہاتھوں مضبوطی سے تھام کر گردن کو دائیں جانب جھکاتے ہوئے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔

لبوں پر مہر خاموشی...... آنکھوں میں ندامت اور دل میں ہمدردی...... اریب کے عوض چاہت مگر اپنوں کا بھی درد عیاں تھا۔ وہ واقعی ایک نئی الجھن میں تھی جہاں تصویر کے دونوں رخ اپنی اپنی جگہ صحیح نظر آ رہے تھے۔

"آپ کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا...... مگر آپ نے ہمیں بتایا بھی نہیں۔" موتی رخسار پر بہہ رہے تھے۔ اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں کو اریب کے انگوٹھوں پر رکھ کر گرفت کو مضبوط بنا یا دیا۔

"بتاتا بھی تو کیسے؟ اور بتاتا بھی تو کیا؟ میں تو خود نہیں جانتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کون سا کھیل میرے وجود کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے؟ میں ایک زندہ انسان تھا مگر مجھے کسی بے جان گیند کی طرح کبھی ادھر پھینک دیا جاتا تو کبھی ادھر......" وہ دفعتہً کھڑا ہوا اور بھیگی پلکوں کے کنارے کو پونچھا۔

"کیا ایک انسان ہونے کے ناتے مجھے اپنی شناخت جاننے کا حق نہیں تھا؟ اگر ماما جان اور بابا جان حقیقت میں میرے خیر خواہ ہوتے تو مجھے برسوں میری شناخت سے دور نہیں رکھتے۔" وہ بری طرح ٹوٹا ہوا تھا۔ جہاں محبت کے جذبات ابھر تو رہے تھے مگر خلش نے ان جذبات کو مندمل کر دیا تھا۔

"لیکن اریب......!" اُس نے کچھ کہنا چاہا تھا جس پر وہ برجستہ پلٹا۔

"لیکن ویکن کیا حاعفہ؟ انسان لے پالک بچوں کو بھی ان کے باپوں کا نام بتا دیئے کرتے ہیں۔ اپنا نام ضرور دیتے ہیں انہیں مگر ان سے کسی قسم کی سچائی نہیں چھپاتے...... تو پھر میرے ساتھ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ کیا انہیں مجھ پر بھروسہ نہیں تھا؟ کیا انہیں اپنی پرورش پر بھروسہ نہیں تھا؟" اس نے حاعفہ کے دونوں شانوں کو پکڑ کر جھنجوڑا تھا۔ وہ خاموش تھی۔ تمام تر وار عین نشانے پر کیے گئے تھے۔ وہ چاہ کر بھی اریب کے اندر جنم لی رنجش کو مٹا نہیں پا رہی تھی۔

"نہیں ہے ناں تمہارے پاس بھی کوئی جواب...... یہی حال میرا بھی ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں ان رنجشوں کو بھلا دوں۔ اس زچ

کو ختم کر دوں مگر کیسے؟ جب جب میں اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتا ہوں تب تب مجھے اپنی شناخت جھنجوڑتی ہے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے کہ کیسے میں زندگی کے کئی برس اپنی شناخت سے دور رہا؟ کیوں اپنی حقیقت جاننے کے بارے میں جستجو نہیں کی؟'' وہ پلٹ کر بالکونی کی طرف بڑھا۔ گلا کھنکارا اور آواز میں چھایا ملال ختم کیا۔ انداز کو جارحانہ بنا کر اگلا جملہ ادا کیا۔

''میرے لیے واپس لوٹنا اب ناممکن ہے۔'' اشکوں سے بھرے نیناں جھرجھری لے کر رہ گئے۔

''لیکن تمہیں واپس لوٹنا ہوگا'' وہ برجستہ پلٹا تھا۔ آواز کا تعاقب حاعفہ نے بھی کیا تھا۔ دونوں کی نگاہیں دروازے پر جا ٹھہریں۔ وہاں حسام کھڑا تھا۔ بنا کسی تاثر کے...... ایک دم سپاٹ مگر اس سپاٹ انداز کے پیچھے چھپے کرب کو ویسے ضبط کیے ہوئے تھا؟ فی الوقت اس کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔

''میرے لیے...... ماما جان کے لیے نہیں...... بابا جان کے لیے لوٹنا نہیں چاہتے تو نہ لوٹو...... ہم میں سے کوئی تمہیں مجبور نہیں کرے گا لیکن ایک رشتہ ہے جس کی خاطر تمہیں واپس لوٹنا ہوگا۔'' وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔ آنکھوں میں اشک بڑھتے جا رہے تھے۔ حاعفہ اپنی جگہ پر ساکت تھی۔ خوداریب بھی اپنی جگہ پر منجمد تھا۔ ایک ذرے کے برابر بھی اس میں جنبش نہ تھی۔

''میرے بچے کی خاطر...... خدا کے لیے واپس لوٹ آؤ۔'' اریب کے عین سامنے آکر وہ کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح زمین بوس ہوتا چلا گیا۔ گھٹنوں کے بل کسی فقیر کی طرح وہ اس کے سامنے ہاتھ باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں میں تڑپ کے آنسو تھے۔

''میرے بچے کو بچا لو اریب...... میں نے آج تک تم سے کچھ نہیں مانگا مگر آج مانگتا ہوں...... خدا کے لیے اریب، میرے بچے کو بچا لو۔ میرے سعدی کو بچا لو...... میں تم سے بھیگ مانگتا ہوں۔'' ضبط کا ہر بندھن ٹوٹ چکا تھا۔ وہ بھائی جس کے ہاتھ ہمیشہ اریب کے شانوں پر ہوا کرتے تھے۔ جن سے اکثر وہ مزاح میں اس کے بال خراب کیا کرتا تھا۔ آج اس کے سامنے بندھے ہوئے تھے۔ کسی غلطی کی پاداش میں نہیں...... بلکہ اپنے لخت جگر کی چاہت میں۔ اپنی اولاد کو نئی زندگی بخشنے کی تمنا میں۔

آج تک تو سنا تھا کہ اولاد ماں باپ کو مجبور کر دیا کرتی ہے۔ آج وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مظاہرہ دیکھا جا رہا تھا۔ ایک بھائی اپنے ہی بھائی سے اپنے بچے کی خاطر چند قطرے خون کی بھیگ مانگ رہا تھا۔ حاعفہ کی آنکھیں یہ سب دیکھنے پر اشک بہائے بغیر نہ رہ سکیں۔ خوداریب کی نگاہیں بھی ٹھٹک کر رہ گئیں۔ حسام کو اس نے کبھی اس قدر مجبور و لاغر نہیں دیکھا تھا۔ بے بسی کی انتہا دیکھ کر اس کا دل بھی پسیجنے لگا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس بھائی کے رشتے کو دوبارہ جوڑنا چاہا تھا جسے اس نے خود توڑ دیا تھا۔ تمام تر رنجشیں بس ان آنسوؤں کے قطروں میں بہنے لگی تھیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے، اپنی زندگی کے ایک حصے کو ہاتھ پھیلائے بھیگ مانگتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''میں تم سے کچھ نہیں مانگتا اریب...... تم جو کہو گے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم کہو گے کہ میں تمہارا مجرم ہوں تو تسلیم کروں گا۔ تم جو سزا دو گے...... میں بھگتنے کے لیے بھی تیار ہوں۔ بس میرے بچے کی جان بچا لو۔ اسے تمہارے خون کی ضرورت ہے۔ برسوں پہلے

تم نے میری جان بچائی تھی۔ آج میرے بچے کی بھی جان تمہارے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ آج میرا بیٹا بھی اسی دورا ہے سے گزر رہا ہے۔ خدا کے لیے اریب...... مجھے خالی ہاتھ مت لوٹانا۔ ایک باپ تم سے اپنے بچے کے لیے بھیگ مانگتا ہے۔" سر اپنے ہی ہاتھوں پر جھکاتے ہوئے اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ حاعفہ کے لیے دیکھنا اب برداشت سے باہر تھا۔ وہ ہاتھوں کو لبوں پر رکھ کر باہر کی طرف برق رفتاری سے نکل گئی۔

اریب نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس جھکے ہوئے کندھے کو اپنے سینے سے لگا کر تشنگی کو بجھانا چاہا جو ایک وقت سے بڑھتی جا رہی تھی۔ ہاتھ کی انگلیاں ابھی اس کے شانوں سے بال برابر ہی دور تھیں۔ حسام کی ہچکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں اور ساتھ میں ایک بیٹے کی محبت میں نکلے گئے الفاظ بھی...... تبھی انا نے ایک جھرجھری لی۔ گزرا وقت آنکھوں کے سامنے لہرایا اور نفی میں گردن ہلاتے ہوئے لب بھی متحرک ہوئے تھے۔

"نہیں۔" شکوہ کناں نگاہیں اوپر اٹھیں۔ اریب کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بڑھا ہوا ہاتھ واپس لوٹ آیا تھا۔

"اریب......!" حسرت سے بھری آواز فضا میں گونجی تھی مگر دل سنگ مرمر کی طرح سخت ہو چکا تھا۔ قدموں کا رخ موڑا اور باہر کی طرف چل دیا۔ اشکوں میں تیزی آ چکی تھی۔

دروازے کے پاس صبا اسے ملی تھی۔ معصوم سی جان، جس نے اپنی پہلی بہار بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے سامنے تھی۔

"اریب...... میرے بچے کو بچا لو۔" ایک ماں بھی ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔ ضرب عین نشانے پر لگائی گئی تھی۔ رشتے دوبارہ اسے مجبور کر رہے تھے مگر جانے کون سی خلش تھی، کون سا جرم تھا جو اسے واپس لوٹنے سے روک رہا تھا۔ گردن جھٹکتے ہوئے وہاں سے مڑا اور پیچھے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

☆......☆......☆

اپنے سے ہم کو بیر تھا، خود اپنا آپا غیر تھا

اپنے سے ہم بیزار تھے، ہم کون تھے، ہم کون تھے

کمرے میں وہ بالکل اکیلی تھی۔ اریب ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ نگاہیں بار بار دروازے پر جاتیں اور ناکام پلٹ آتیں۔

"کس راستے پر چل نکلیں ہیں آپ اریب؟ اپنوں سے دور رہ کر سکون نہیں ملتا۔ کرب ہی بڑھتا ہے۔" وہ مبہم سے وجود کو سامنے گمان کرتے ہوئے مخاطب کر رہی تھی مگر وہ اُس دل تک یہ آواز پہنچتی تب ہی تو بات بنتی۔

بیڈ شیٹ کو صحیح طریقے سے بچھاتے ہوئے اس نے کئی بار دروازے کی طرف دیکھا تھا۔ ذہن میں اریب کو فون کرنے کا خیال آیا تو نگاہ سائیڈ ٹیبل پر جا ٹھہری، وہاں اریب کا فون رکھا تھا۔

''وہ تو اپنا فون بھی گھر بھول گئے۔'' اسے شدید مایوسی ہوئی مگر ساتھ ساتھ فکر بھی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ رات گہری ہوتی جا رہی تھی اور اُس کی کوئی خبر بھی نہ تھی۔

''اب کیسے ان سے رابطہ کروں؟'' وہ آگے بڑھی اور اُس موبائل کو اٹھا کر پلٹا۔ تبھی اس موبائل کی رنگ ہوئی۔ الجھا ہوا ذہن ذرا سا سمٹا۔ اس خیال سے کہ شاید اریب کا فون ہو مگر وہاں ایک نمبر تھا۔

''یہ نمبر کس کا ہے؟'' اس نے سوچا اور بے دھیانی سے کال ریسیو کی۔

''السلام علیکم!'' رندھے ہوئے لہجے سے مخاطب کیا گیا تھا۔

''وعلیکم السلام! یہ اریب کا ہی نمبر ہے ناں؟'' ایک انجان لڑکی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

''جی۔ یہ انہی کا نمبر ہے۔'' اس نے تصدیق کی تھی۔

''اریب سے بات ہو سکتی ہے؟'' اس نے فوراً مدعا بیان کیا تھا۔

''معاف کیجیے۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ آپ کو کوئی خاص بات کرنی ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''آپ کون ہیں؟'' دوسری طرف سے سوال داغا گیا۔

''میں اریب کی بیوی حاعفہ ہوں۔'' یہ سننا تھا کہ ماحول میں خاموشی چھا گئی۔ رابطہ منقطع تو نہ ہوا مگر ایک خاموشی نے ضرور جنم لیا تھا۔ ایسا لگا جیسے دوسرے کو ایک جھٹکا لگا تھا۔

''جی آپ کون؟'' اس نے دھیرے سے استفسار کیا تھا۔

''جی میں ......اریب کی کلاس فیلو...... ہانیہ عمر دراز۔'' اس بار لبوں پر مہر لگنے کی باری حاعفہ کی تھی۔ الجھی ہوئی ڈوری قدرے سلجھنے لگی تھی۔ اس نے ایک بار اریب کے منہ سے یہ نام سن رکھا تھا اور پھر وہ کہانی جو ابھی تک اس سے پنہاں تھی۔ وہ سامنے آنا باقی تھی۔

''مجھے آپ سے ملنا ہے۔'' ہانیہ نے کہا تھا۔

''مجھ سے ملنا ہے مگر کیوں؟'' اسے حیرت ہوئی تھی۔

''آپ کے ہر سوال کا جواب مجھ سے ملنے پر مل جائے گا۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔

''ٹھیک ہے میں کل آپ سے ملتی ہوں۔'' بے یقینی کا عنصر پیشانی پر عیاں تھا۔ کال ڈسکنیکٹ ہونے پر بھی وہ ایک وقت تک اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

☆......☆......☆

دل پریشاں ہے، کیا کیا جائے

عقل حیراں ہے، کیا کیا جائے

"کیا آپ کا یہ فیصلہ درست ہے؟" سحر فاطمہ نے بے یقینی سے استفسار کیا تھا۔ جہانزیب صوفے پر بیٹھے کچھ امپورٹنٹ ڈاکیومنٹس الٹ پلٹ کر رہے تھے۔ ان ڈاکیومنٹس میں کچھ قرار نامے بھی شامل تھے جن پر کورٹس کی مہر بھی تھیں۔ وہ ان قرار ناموں پر اپنے سائن کی تصدیق کر رہے تھے۔

"میں نہیں جانتا لیکن جو حالات جا رہے ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے مجھے یہی فیصلہ ٹھیک لگا تھا۔" انہوں نے بنا دیکھے جواب دیا تھا۔ ورق پلٹتے ہوئے ان کی نظر ایک ڈاکیومنٹ پر گئی، جہاں ابھی تک ان کے دستخط نہیں ہوئے تھے۔

"اچھا ہوا ڈاکیومنٹس دوبارہ دیکھ لیے ورنہ اس ڈاکیومنٹ پر دستخط نہ ہونے کے باعث کام مزید رک جاتا۔" انہوں نے بال پوائنٹ اٹھائی اور اس پر بھی اپنے سائن کر دیے۔ سائن کرنے کے بعد آخری نقطہ جو اکثر وہ اپنے سائن کے ساتھ لگایا کرتے تھے، لگاتے ہوئے ان کے ہاتھ ذرا سا کپکپائے تھے۔ آنکھوں میں مایوسی نے جنم لیا۔

"اپنے بیٹے کو واپس پانے کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑتی تو میں اس سے بھی دریغ نہ کرتا۔" حسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"جی بیگم صاحبہ! آپ نے بلایا مجھے؟" ماریہ وہاں آموجود ہوئی تھی۔

"ہاں! اریب کو بلا کر لانا۔" سحر فاطمہ نے کہا تو وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے وہاں سے چل دی۔ سحر فاطمہ نے دوبارہ جہانزیب کی طرف دیکھا تو وہ فائل کر بند کرتے ہوئے اپنی پشت صوفے کی ٹیک سے لگا رہے تھے۔ خراماں خراماں چلتے ہوئے وہ ان کے پاس آبیٹھی تھی۔

"کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں یہ وقت بھی آئے گا۔" نگاہیں فائل کو بظاہر تک رہی تھیں مگر مرکز شاید کچھ اور ہی تھا۔

"زندگی میں اکثر وہی حالات ہمارے سامنے آتے ہیں جن کے بارے میں ہم گمان بھی نہیں کرتے۔ ہم سوچتے تو کچھ ہیں مگر ہوتا کچھ اور ہی ہے۔ گمان تو ہمارے سحر انگیز ہوا کرتے ہیں مگر حالات ان زرخیز وادیوں سے کہیں دور خشک صحرا کے ماحول سے میل کھاتے ہیں۔ جہاں لحہ لحہ تشنگی، الجھنیں اور تپش ہوتی ہے۔" انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا تھا۔ آنکھیں بند کیے وہ اب ستا رہے تھے۔ شاید اب تھک چکے تھے۔ آرام کی ضرورت تھی مگر حالات اپنی کروٹ ہر لحہ بدل رہے تھے۔

"صحیح کہا آپ نے۔ ہماری زندگی بھی شاید اسی گرداب کی لپیٹ میں ہے۔" انہوں نے تائید کی تھی۔ جہانزیب نے اپنے ہاتھ سر پر پھیرتے ہوئے جھرجھری لی۔

"بس دعا کیجیے گا کہ اس کے بعد ہمارا بیٹا ہمیں واپس مل جائے۔" آنکھیں کھولیں تو سامنے سفید رنگ کا آسمان تھا۔ کوئی گرہن تھا

اور نہ ہی کوئی شگاف۔ وہ اسی آسمان کی تلاش میں تھے جو اسی سنگ مرمر کی طرح بے داغ ہوا۔

''میری تو ہر سانس کے ساتھ یہی دعا ہوتی ہے کہ ہمارے دونوں بیٹے...... ہمارے ساتھ رہیں۔'' ہاتھ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر دعا نکلی تھی۔

وہ ابھی باتیں کر رہے تھے کہ قدموں کی چاپ ان کی سماعت سے ٹکرائی جو عین ان کے کمرے کی چوکھٹ پر آ کر دم توڑ چکی تھی۔ نگاہیں باہر کی جانب اٹھیں تو وہاں اریب کھڑا تھا۔ وہی سپاٹ انداز اپنائے ہوئے جو لوٹنے کے بعد اس نے اپنایا تھا۔ پرائے دیس میں جا کر اکثر انسان بدل جاتے ہیں۔ حقیقت ان کے سامنے تھی۔

''مجھے بلایا آپ نے؟'' لہجہ اگرچہ سخت تھا مگر آواز مدہم تھی۔ شاید وہ عزت، وہ لحاظ آج بھی کہیں ناں کہیں زندہ تھا۔

''ہاں...... اریب۔ اندر آؤ۔'' جہانزیب صحیح ہو کر بیٹھے تھے۔ سحر فاطمہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''میرے پاس آؤ۔'' جہانزیب نے ساتھ ہی نشست پر ہاتھ مارتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں بیٹھ گیا۔

''بیٹا! میں نے تمہیں یہاں کوئی نصیحت کرنے کے لیے نہیں بلایا اور نہ ہی اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے۔ تم سمجھدار ہو۔ اپنے بارے میں خود فیصلے کر سکتے ہو۔ ہمارا کام تو تمہیں صحیح تربیت دینا تھی۔ اچھے اور برے میں فرق سمجھانا تھا۔ تمہیں ایک اچھا انسان بنانا تھا۔ جو ہم نے کیا۔ لیکن پھر بھی تمہیں لگتا ہے کہ ہم دونوں سے اس معاملے میں کوئی چونک ہوگئی تو ہم تم سے معافی مانگتے ہیں۔'' انہوں نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کے دل میں جیسے بھونچال آ گیا۔ وہ باپ جس کے ہاتھ ہمیشہ اس کے سر پر رحمت و شفقت سے بھرے ہوتے تھے۔ آج اس کے سامنے تھے۔ وہ مٹھیاں بھینچے جذبات کو ضبط کئے ہوئے تھا۔

''کون کہتا ہے، ماں باپ سے غلطیاں نہیں ہوتیں؟ ماں باپ بھی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اگر ان کی اولاد صحیح اور غلط میں فرق نہ کر سکتے تو ان کی تربیت میں غلطی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے کی صحیح سے تربیت ہی نہیں کر پاتے۔'' گندھا ہوا لہجہ اپنا کرب بیان کر رہا تھا۔

''شاید ہم بھی انہی والدین میں سے ہیں۔ جو اولاد کا حق ادا نہیں کر سکے۔ ہمیں معاف کر دینا تم۔'' اس جملے پر وہ برجستہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی برداشت کا امتحان لیا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں خلش نے جنم ضرور لیا تھا مگر دل آج بھی وہی تھا۔ اپنوں کو اپنے سامنے ایسے ذلیل ہوتا وہ کیسے دیکھ سکتا تھا؟

''بس یہ باتیں کرنے کے لیے مجھے بلایا تھا آپ نے؟'' اس نے لہجے میں سختی لانے کی سعی کی تھی مگر آنسوؤں کے حلق میں اٹکنے کی آمیزش صاف عیاں تھی۔

''نہیں ...... دراصل میں تمہیں یہ فائل دینا چاہتا تھا۔'' اپنے جذبات کو ضبط کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ فائل کو سامنے رکھی ٹیبل سے اٹھا کر اس کے سامنے کیا۔

''کیا ہے یہ؟'' بنا اسے پکڑے استفسار کیا تھا۔

''تمہاری امانت۔'' نگاہیں برجستہ اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''مطلب؟''

''تمہیں لگتا تھا ناں کہ ہم نے یہ سب کچھ پیسے کے لیے کیا۔ تمہیں پیسوں کی خاطر تمہارے بھائی سے جدا کیا اور پیسوں کی ہی خاطر تم سے تمہاری سچائی بتائی تو یہ لو سب کچھ۔ اس فائل میں عالمگیر انڈسٹریز کے تمام تر پیپرز ہیں اور اس کے علاوہ تمام تر بینک سٹیٹمنٹس بھی اس فائل میں رکھ دی گئی ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں کتنا پیسہ کمپنی سے لیا گیا۔ اس کی بھی تفصیل اس فائل میں درج ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر تمہیں لگے کہ کچھ کمی ہے تو میں حاضر ہوں۔ تمہیں ایک ایک پائی کا حساب دے دونگا۔'' یہ فائل اس کے ہاتھ میں تھما دی گئی تھی۔ اس کا دل ایک پہاڑ تلے آ دبا تھا۔ ایک ضرب مسلسل اس کے سر پر لگ رہی تھی۔ ایک ملال نے جنم لیا تھا۔ آنکھیں بھی قدرے بھیگ چکی تھیں۔ سحر فاطمہ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری تھے۔

''تھینک یو سو مچ مسٹر جہانزیب۔'' اس نے اپنا انداز بدل کر ان کے درد کو مزید بڑھا دیا تھا۔ سحر فاطمہ کا دل جو پہلے ہی کانچ سا تھا ، یہ کہہ کر کرچی کرچی کر دیا۔ خود وہ بھی ٹوٹا تھا مگر مجسم انتہائی سخت تھا۔

''ویلکم مائے ڈیئر۔'' حسرت بھری مسکراہٹ چہرے پر ابھری تھی۔ کپکپاتے ہاتھ، جو عمر کے باعث نہیں بلکہ بیٹے کی بے رخی کے باعث کمزور ہو چکے تھے۔ آگے بڑھے اور اس کے شانوں کو تھپتھپانے لگے۔

''ماما جان ...... بابا جان ......!'' یہ حسام کی آواز تھی۔ جو پر جوش انداز میں دوڑتا ہوا وہاں آیا تھا۔ سحر فاطمہ اور جہانزیب کے ساتھ ساتھ اریب بھی اسے دیکھنے کے لیے پلٹا تھا۔

اریب کو وہاں دیکھ کر حسام کی خوشی قدرے ماند ضرور پڑ چکی تھی مگر جہانزیب اور سحر فاطمہ کی موجودگی اس کے لیے باعث آسودگی تھی۔ سحر فاطمہ نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اس کے خوش ہونے کی وجہ دریافت کی۔

''کیا ہوا حسام؟ سب خیریت ہے ناں؟ سعدی تو ٹھیک ہے ناں؟''

''جی ماما جان ...... سب خیریت ہے اور ہمارا سعدی بھی اب بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ نہیں ہوگا ہمارے سعدی کو۔'' وہ آگے بڑھا اور سحر فاطمہ کے عین سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ محبت اور خوشی کے سبب ان کے ہاتھ تھام کر بوسہ دیا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟ اریب نے ہامی بھر لی؟'' ان کی نگاہیں اریب کی جانب اٹھی تھیں۔ جن میں ایک کسک تھی۔

"اب ہمیں کسی کا کوئی احسان لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ نے وسیلہ بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر کا فون آیا تھا انہوں نے کہا کسی نے خون ڈونیٹ کیا ہے اور اس کا بلڈ گروپ سمیت سب کچھ ہمارے سعدی سے میچ کرتا ہے۔ اب فکر کی ضرورت نہیں۔ ٹرانسپلاٹ کا عمل آج سے ہی شروع کیا جا سکتا ہے۔" اس نے اریب سے ایسے آنکھیں چرائی تھیں جیسے اس کی موجودگی اس کے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ جہانزیب کے چہرے پر بھی خوشی کا ایک جھونکا لہرایا تھا۔ سحر فاطمہ نے اس کی پیشانی چومی۔

"خدا کا شکر ہے۔" آنکھوں سے اس بار خوشی کے آنسو بہنے لگے تھے۔

"اللہ بھلا کرے اس نیک انسان کا۔" آگے بڑھ کر حسام کے کندھے تھپتھپائے تھے۔

"بس میں اور صبا ابھی اسپتال جانے کے لیے نکل رہے ہیں۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے مزید۔" اس نے کہا تھا۔

"ہاں...... ضرور۔ ہمارا سعدی جتنی جلدی صحت یاب ہو کر گھر لوٹے۔ اتنا ہی اچھا ہے۔" سحر فاطمہ نے گندھے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ وہ واپس پلٹا تو اریب کے الفاظ نے اسے رکنے پر مجبور کیا تھا۔

"مبارک ہو آپ کو۔" اس کے الفاظ میں کوئی تاثر نہ تھا یا شاید وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے کسی غیر کی مبارک باد کی ضرورت نہیں۔" اس نے پلٹ کر انتہائی سفاکیت سے جواب دیا تھا۔ جسے سن کر سحر فاطمہ اور جہانزیب کو شدید جھٹکا لگا۔

"حسام...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟ اریب غیر کب سے ہو گیا؟" جہانزیب نے ملامت کی تھی۔

"اُس وقت سے بابا جان جب سے اس نے میرے بچے پر رحم نہیں کیا۔ میں کتنا گڑ گڑایا تھا اس کے سامنے...... اپنے بچے کی زندگی کی بھیگ مانگی تھی مگر اس کا تو دل بھی نہیں پگھلا۔ اگر ہمارے عوض اس کے دل میں کسی قسم کا بغض اور کینہ تھا تو رکھتا مگر ان سب میں میرے بچے کو لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اس نے مجھے اپنا بھائی سمجھا ہوتا تو میرے بچے کو کبھی اس تکلیف میں نہ دیکھتا۔ مجھ سے پہلے یہ تڑپتا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اسے تو میرے بچے کی تکلیف سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا اور جس کو میرے بچے کی تکلیف سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔" زندگی میں پہلی بار حسام کی آنکھوں میں اریب کے لیے ایسی سفاکیت نے جنم لیا تھا۔ سحر فاطمہ اور جہانزیب حسام کے اس بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئے۔

"حسام...... یہ کیا کہہ رہے ہو؟" ہکلاتے ہوئے سحر فاطمہ نے کہا تھا۔

"وہی ماما جان...... جسے یہ شخص جتلانے کی کب سے کوشش کر رہا ہے۔ اب تو میں بھی کہتا ہوں یہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا۔" یہ جملہ سحر فاطمہ کے لیے انتہائی گراں گزرا تھا۔ تبھی زندگی میں پہلی بار حسام پر ہاتھ اٹھایا۔ اریب بھی ٹھٹک کر رہ گیا۔ حسام کو بھی یقین نہ آیا۔ خود سحر فاطمہ کی آنکھوں سے بھی اشک بہہ نکلے تھے۔

”خبردار...... اگر آئندہ اس جملے کو دہرایا تو...... میرے تین بچے ہیں۔ جتنی حیثیت تمہاری ہے میری نظر میں، اتنی ہی اریب کی بھی۔“ گندھا ہوا لہجہ ممتا کا امتحان لے رہا تھا۔

”مجھے اپنے بچے کو لے کر اسپتال جانا ہے۔“ وہ رندھے ہوئے لہجے کے ساتھ کہتا ہوا پلٹا تھا۔ اریب کی نگاہوں نے سحر فاطمہ کو دیکھا تو انتہا کا درد عیاں تھا۔ پیشانی پڑھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے باعث بھی وہ اس درد، اس ممتا کو پڑھ سکتا تھا جو اس وقت سحر فاطمہ کے چہرے سے عیاں تھی۔

”آئی ڈانٹ کیئر۔“ سپاٹ انداز میں خیالات کو جھٹکا اور پاؤں پٹختے ہوئے وہ بھی وہاں سے چل دیا۔ فائل اس کے ہاتھ میں ہی تھی۔

سحر فاطمہ کی استفہامیہ نگاہوں نے اس کی پشت کی طرف دیکھا تو وہ ٹوٹ کر رہ گئیں۔

”آخر میرے دونوں بچے ایک دوسرے سے اتنے بدظن کیوں ہو گئے؟“ ان کے جسم سے جیسے جان نکل ہی چکی تھی۔ تبھی جہانزیب نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے انہیں بیڈ پر بٹھایا تھا۔

”آپ حوصلہ رکھیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ خود بھی ان کے ساتھ آ بیٹھے تھے۔

”یہ آزمائش کی گھڑی ہے۔ دیکھنا، جب یہ آزمائش کی گھڑیاں ختم ہو گی تو ہمارے دونوں بیٹے، ایک ساتھ ہونگے۔“ ایک بار پھر حسین خواب بُنا جا رہا تھا۔ جس کی کوئی تعبیر ہو گی بھی یا نہیں؟ فی الوقت کچھ بھی کہنا قبل از وقت تھا۔

☆......☆......☆

ہم تھے نیاز مندِ شوق، شوق نے ہم کو کیا دیا

صبح کا دکھ بڑھا دیا، شام کا دکھ بڑھا دیا

آج بمشکل حاعفہ اسے باہر لے جانے میں کامیاب ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول تو شاید اسے ہر شے سے گریزاں رکھتا مگر وہ اس کی طبیعت کو سمجھتی تھی۔ مرد کی خصلت میں رومانوی رنگ زیادہ پایا ہے تبھی وہ اسے ایک سحر انگیز ماحول کی طرف لے جا رہی تھی۔ شہر کے عقب میں ایک پرسکون اور سرسبز جگہ جہاں لوگ دور دراز سے حسین لمحوں کو یادوں کی کتاب کا حصہ بنانے آیا کرتے تھے۔ وہ بھی اریب کے ساتھ وہیں جا رہی تھی۔

اگرچہ اریب یہاں آنے کے لئے قطعاً رضامند نہ تھا لیکن وہ اسے زبردستی یہاں لائی تھی۔

”میں نے آپ کی ایک نہیں سننی...... آپ کو میرے ساتھ چلنا ہے تو بس چلنا ہے۔“ وہ زیادہ مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے آپ کو کٹھور پیش کر کر کے وہ اب ہلکان ہو چکا تھا۔ حاعفہ نے خود اس کے لیے بلیک پینٹ کوٹ پسند کیا تھا۔ وہ انہیں پہن کر وجیہہ اور سحر انگیز شخصیت کا مالک لگ رہا تھا۔ حاعفہ بھی اسے دیکھ کر اپنی قسمت پر رشک کرنے لگی۔ پیشانی پر شکنیں...... جو شاید نہیں یقیناً اس کی شخصیت کو

چار چاند لگا رہی تھیں۔ سنجیدہ چہرہ...... بھی اس کی پرسنیلٹی سے عین بھاتا تھا۔

وہ خود بھی ایک سیاہ جوڑے میں ہی تھی جو خود اریب نے ہی اس کو گفٹ دیا تھا۔ اپنے تحفے کو زیب تن دیکھ کر اس کے لبوں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ ابھری تھی مگر وہ اسے ضبط کر گیا تھا۔

"جب دل ہنسنے کا چاہے تو ہنس لینا چاہئے۔ یوں ہنسی کو ضبط کرنا اپنے آپ کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔" آج وہ اریب کا رول ادا کر رہی تھی۔ عرصہ پہلے اسی سے میل کھاتے الفاظ اریب نے ادا کیے تھے اور آج وہ ادا کر رہی تھی۔

"مجھے ضرورت نہیں کسی کے مشورے کی۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں اپنا چہرہ ونڈ سکرین کی جانب پھیر لیا۔ وہ پلٹ کر مسکرائی اور دوبارہ ڈرائیونگ کرنے لگی۔ وقت نے ایک سو اسی کے زاوے کی کروٹ بدلی تھی۔ جگہ کے ساتھ ساتھ انداز بھی دونوں کا الٹ تھا۔

"آپ کو نہیں لگتا؟ سفر کے درمیان اگر کچھ بول لیا جائے تو سفر اچھا گزرتا ہے؟" اس نے پلکیں اچکاتے ہوئے اریب کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر گردن جھٹک کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"لگتا ہے موصوف کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہیں مگر اب نہیں رہیں گے۔ چلیں اتریں ہماری منزل آگئی ہے۔" اس نے کار کو پارک کرتے ہوئے اریب کو کہا تھا۔ اریب نے ذرا بھی دیر نہ کی، کار سے اترنے میں۔

سامنے دیکھا تو اس کے قدم آگے بڑھنے کی بجائے وہیں منجمد ہو گئے۔ اس کے من پسند پھولوں سے آراستہ ٹیبل، اس کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ بھینی بھینی خوشبو ہوا کے سنگ ماحول کو معطر کر رہی تھی۔ ایسا ماحول جن لمحوں کا خواب کبھی اس نے کیا تھا۔ آج اس کے سامنے تھا مگر اس ذکر کبھی اس نے حاعفہ سے نہیں کیا تھا۔

"کیا ہوا؟ چونک گئے؟ ابھی تو اصل سرپرائز باقی ہے۔" اس نے پیچھے سے اریب کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ وہ واقعی بری طرح چونکا تھا۔

"سرپرائز؟" وہ ہکلایا۔

"جی ہاں...... لیکن یہاں نہیں...... آگے بڑھیں ذرا" وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں کچھ نہ کچھ الگ ضرور تھا۔ حاعفہ کا یہ انداز اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

"میں تمہیں سمجھ نہیں پا رہا۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"سمجھ بھی نہیں سکیں گے۔ آخر اب وہ صلاحیت تو نہیں رہی آپ کے پاس۔...... لیکن کوئی بات نہیں۔ میں آپ کو سب سمجھا دونگی۔" وہ اسے گول میز کے عین سامنے لے آئی تھی۔ جس کو سرخ و سفید رنگ کے پھولوں سے سجایا ہوا تھا۔ اسی رنگ کے غبارے دن کے وقت بھی ٹمٹماتی برقی روشنیاں ماحول کو ایک الگ انداز سے پیش کر رہے تھے۔

''بیٹھیں۔'' حاعفہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ جھرجھری لے کر بیٹھ گیا۔

''یہ سب کس لیے؟'' اس نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''آپ کے لیے۔'' وہ بھی اس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ کہنیوں کے بل دونوں ہاتھوں کو کھڑا کیا اور پھر ہتھیلی پر اپنی ٹھوڑی ٹکا کر یک ٹک اریب کے دیدار سے اپنی تشنگی بجھانے لگی۔

''مگر کیوں؟'' ذہن میں یکے بعد دیگرے کئی سوال ابھر رہے تھے مگر جواب ندارد۔

''اب ایک بیوی اپنے شوہر کے لیے کیا اتنا بھی نہیں کر سکتی؟ آپ نے میری خوشی کے لیے کتنا کچھ کیا؟ مجھے اس رشتے کو سمجھنے کے لیے وقت دیا۔ میرا ہمیشہ ساتھ دیا۔ مجھے جس چیز کی ضرورت ہوئی آپ نے بنا کہے مجھے لا کر دی۔ اب جب میری باری آئی تو بھلا میں کیسے پیچھے ہٹ سکتی تھی۔ آپ کی خوشی کو کیسے پسِ پشت ڈال سکتی تھی؟ آپ کی خواہش سے کیسے منہ موڑ سکتی تھی؟'' اس نے ذومعنی انداز میں کہا تھا۔ لبوں پر ذرا سی بھی افسردگی یا شکایت نہ تھی۔ ایک تبسم اپنی جگہ بنائے ہوئے تھی۔

''کیا کہنا چاہتی ہو تم؟ میں سمجھ نہیں پا رہا۔'' ذہن مزید الجھ چکا تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔

''آپ ذہن پر زیادہ زور مت ڈالیں اریب۔'' اس نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پلکیں جھپک کر یقین دہانی کرائی۔ محبت کا پہلا لمس اس کے جسم میں سرایت کرنے لگا تھا۔ دل کی بے چینی دھیرے دھیرے کنارے لگ رہی تھی۔

''آپ یہ بتائیں...... آپ کو یہ سب کیسا لگا؟'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اچھا ہے۔'' چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

''بس اچھا ہے؟ یعنی کے دل کو نہیں بھایا۔'' اس کا چہرہ مرجھا سا گیا تھا۔ اس کھلے گلاب کو مرجھاتا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ آخر تھی تو وہ اس کی محبت۔ کیسے اپنی محبت کا چہرہ یوں لٹکا ہوا دیکھ سکتا تھا؟ رنجشیں اور خلش لاکھ سہی مگر محبت ان سب پر بازی لے گئی۔

اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کے نرم ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر اپنی طرف بڑھایا تھا۔

''مجھے بہت اچھا لگا۔ اتنا اچھا کہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ سچ پوچھو تو مجھے میری آنکھیں یقین کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ ایک حسین خواب ہے۔ ابھی میری آنکھ کھلے گی اور یہ خواب چکنا چور ہو جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو یقین مانو، مجھے بہت دکھ ہوگا۔ اگر یہ خواب ہے تو میری دعا ہے کہ تا قیامت میں اسی خواب میں ہی رہوں۔ کبھی آنکھ نہ کھلے اور اگر یہ حقیقت ہے تو وقت یہیں رک جائے۔ آگے بڑھنا بھول جائے اور میری آخری سانس انہی حسین لمحوں میں نکلے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسا نہیں کہتے...... آپ کا ساتھ تو میرے لیے زندگی ہے۔'' اس نے برجستہ اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے آزاد کرواتے ہوئے، اس کے لبوں پر رکھ دیے۔

''اگر آپ ہیں تو میں ہوں۔آپ کے بنا میرا کوئی وجود نہیں۔میری زندگی اب آپ سے شروع ہو کر آپ پر ہی ختم ہوتی ہے۔زندگی کا وجود میرا آپ کے بنا کچھ بھی نہیں۔جب سے آپ کی محبت نے میرے دل میں جنم لیا ہے یقین مانیں میرے دل میں کسی اور کا خیال بھی نہیں آیا۔ہر لمحہ بس آپ کی سلامتی کی دعائیں ہی میرے لبوں سے جاری ہوتی ہیں۔آپ کی خوشی کی خاطر تو میں کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' جذبات کے سمندر میں ڈوبتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

اریب نے اپنے ہاتھوں میں دوبارہ اس کے ہاتھ تھامے۔

''کیا واقعی تم مجھ سے محبت کرنے لگی ہو؟'' اس نے تصدیق چاہی تھی۔آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھے مار رہا تھا۔

''اس سوال کا جواب آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔اگر انسان کسی کو سچے دل سے چاہتا ہے تو ایک ناں ایک دن اسے اپنا بنا ہی لیا کرتا ہے اور مجھے آپ سے محبت کرنے پر آپ نے ہی مجبور کیا ہے۔''

''شکریہ......!'' اس نے دھیرے سے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا۔اس کا دل جن لفظوں کو سننے کے لیے اکثر بے قرار رہتا ہے۔آج انہیں اپنی سماعت کا حصہ بنا چکا تھا

''شکریہ کس لیے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

''میری ذات کو تسلیم کرنے کے لیے......مجھ سے محبت کرنے کے لیے......مجھے اپنانے کے لیے۔'' اس نے آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا تھا۔لہراتی زلفوں کی لٹ جو چہرے پر رقص کر رہی تھی۔اس نے اپنے ہاتھ بڑھا کر اُس کے کانوں کے پیچھے کی۔محبت کا دوسرا لمس محسوس کیا گیا تھا۔

''آپ کی ذات کو میں نے نکاح کے وقت ہی تسلیم کر لیا تھا اریب اور محبت آپ کے رویے نے کرنے پر مجھے اکسایا تھا۔جہاں تک آپ کو اپنانے کی بات ہے تو میاں بیوی جب تک ایک دوسرے کو دل سے نہیں اپناتے ،زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔نکاح کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم ہو جاتے ہیں۔ایک کا نام دوسرے سے جڑ جاتا ہے اور دوسرے کی زندگی پہلے سے منسوب ہو جاتی ہے۔نکاح کے بعد ایک دوسرے کو نہ اپنانا اس رشتے کی توہین ہے اور انجام پھر جدائی کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔''

ہوا کے ایک جھونکے نے دونوں کے درمیان ایک فاصلہ قائم کرنا چاہا تھا۔اس حسین محبت کے لمحے کو اپنے انداز میں سمیٹنا چاہا تھا لیکن محبت کے ہمراہی تو شاید اس کو کسی خاطر میں ہی نہیں لا رہے تھے۔ہوا کے سنگ حاعفہ کی جھومتی زلفیں ،اریب کے دل کو مزید لبھا رہی تھیں۔ہر قسم کی رنجش کو وہ اس لمحہ بھول چکا تھا۔ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پہلے والا اریب لوٹ آیا ہے۔وہی مزاح کرنے والا......رومانوی انداز کا مالک......دوسروں کی چاہت کا خیال رکھنے والا......اریب عالمگیر۔

''شاید موسم خراب ہونے جا رہا ہے۔'' اریب نے حاعفہ کا خیال کرتے ہوئے کہا تھا۔

''نہیں اریب...... موسم تو اب ٹھیک ہونے جا رہا ہے۔'' اس بار پھر ذو معنی انداز اپنایا گیا تھا۔ وہ مسکرایا اور خود ہی مطلب اخذ کیا۔

''سچ؟'' اس کا انداز رومانوی تھا۔

''مچ۔'' وہ مسکرائی اور سامنے رکھے ایک بکٹ سے پھول توڑ کر اریب کے سامنے کیا۔

''یہ آپ کے لیے۔'' اریب نے اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور محبت سے پھول کی بجائے اس کی کلائی کو پکڑ لیا۔

''گلاب کو گلاب دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس پھول سے کہیں زیادہ بڑھ کر خوشبو مجھے تمہارے وجود سے آتی ہے۔'' اس نے حاعفہ کے ہاتھ کو اپنی طرف بڑھایا اور تیسری بار محبت کے لمس کو اس کی مٹھی پر نقش کیا۔

گہری سانس لیتے ہوئے اس کی گرفت ذرا سی کمزور ہوئی اور وہ پھول اس کے ہاتھ سے جا گرا۔

''مجھے معلوم ہے...... لیکن کسی کی محبت کو اجاگر کرنے کے لیے کبھی کبھار گلاب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔'' اس نے دوبارہ ذو معنی انداز اپنایا تھا۔ اس بار اس نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنی نشست سے کھڑے ہو کر حاعفہ کے پاس گیا۔ شانوں سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔

''ایک منٹ اریب۔'' وہ پلٹی اور چہرہ اریب کی طرف کیا۔ اریب حیران ہوا۔

''کیا ہوا؟ میں نے کچھ غلط کیا؟''

''نہیں...... آپ نے کچھ غلط نہیں کیا لیکن ابھی ایک سرپرائز رہتا ہے میرا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ حیران ہوا۔

''اس حسین ماحول سے بڑھ کر بھلا کون سا سرپرائز ہو سکتا ہے؟'' اس نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''ہے...... ایک ایسا سرپرائز...... جس کا آپ کی زندگی میں بہت بڑا حصہ ہے۔ جو سرپرائز آپ کے بنا ادھورا ہے۔ جو شاید آپ کے لیے ہی بنا ہے۔'' اس نے اریب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا...... پھر تو میں بھی دیکھنا چاہوں گا کہ میری محبت نے ایسا کون سا سرپرائز میرے لیے چنا ہے جو سب سے بڑھ کر ہے۔'' اس دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھتے ہوئے رومانوی انداز اپنایا تھا۔ ایک کسک اس کے لبوں پر پھیلتی چلی گئی۔

''وہ سرپرائز تو میں آپ کو دکھاؤں گی لیکن اس سے پہلے آپ کو مجھ سے وعدہ کرنا ہوگا کہ میں جو مانگوں گی اس سرپرائز کے بدلے آپ مجھے دیں گے۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور وعدہ لینا چاہا تھا۔

''واہ...... اب تو ادلے کا بدلہ چل رہا ہے۔'' اس نے بات کا رخ مزاح میں بدلا۔ واقعی پرانا اریب لوٹ آیا تھا۔

''ایسا ہی سمجھ لیں...... بس آپ وعدہ کریں۔'' چہرے پر سنجیدگی عیاں تھی۔ اس نے ایک لمحے تک بھرپور اس کا چہرہ دیکھا اور پھر اپنا داہنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''تم جو مانگو گی، میں دوں گا۔ یہ وعدہ رہا۔'' اس وعدے پر وہ مسکرائی۔

''اب مسکراتی ہی رہو گی یا پھر وہ سرپرائز بھی سامنے لاؤ گی؟'' اس کے اندر ایک تجسس جنم لینے لگا تھا۔

''ذرا طبیعت میں سکون رکھیں۔ سرپرائز بھی سامنے لے آتی ہوں مگر پہلے اپنی آنکھیں بند کریں۔''

''یہ کیا؟ اب آنکھیں بھی بند کرنا پڑیں گی؟ کہیں تم مجھے کڈنیپ تو نہیں کرنے لگی؟'' اس نے سرگوشی والے لہجے میں کہا تھا۔ چہرے پر یک دم مسکراہٹ پھیل گئی۔

''اگر کڈنیپ بھی کر لیا تو آپ کیا کر لیں گے؟ میرا پورا حق بنتا ہے آپ پر۔'' اس نے پورے مان سے کہا تھا۔

''ہاں...... ہاں...... بالکل...... حق تو بنتا ہے آپ کا۔ اب بھلا آپ کا نہیں ہو گا مجھ پر حق تو کس کا ہو گا؟'' اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا تھا۔ لبوں پر شرارت بھری مسکراہٹ تھی۔ جو اگلے ہی لمحے غائب ہونے جا رہی تھی۔

''میرا......!'' ماضی سے ایک آواز باہر نکل آئی تھی۔ اس آواز کو وہ کیسے بھول سکتا تھا؟ برجستہ آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔ سامنے جو وجود تھا وہ حاعفہ کا نہ تھا۔ وہ تو کوئی اور ہی تھا۔ وہ وجود جسے دیکھ کر ہمیشہ اس کے کرب میں اضافہ ہوتا تھا۔ جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہونے کی بجائے، ایک درد میں مبتلا ہوتی تھیں۔ جس کو دیکھتے ہی پہلا تاثر منفی پیدا ہوا تھا۔ آج پھر وہی وجود سامنے کھڑا تھا۔

''تم؟'' اس کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ وہ انداز جو پہلے تھا۔ اب وہاں موجود نہ تھا۔ حیرت سے استفسار کیا گیا تھا۔

''ہاں میں...... ہانیہ...... ہانیہ عمر دراز'' وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس کا ہر اٹھتا قدم اس کو ماضی میں غرق کر رہا تھا۔ ہر لمحہ اس کے سامنے آ رہا تھا۔

''میں نے کہا تھا ناں...... تمہیں لوٹ کر آنا ہو گا۔'' اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی وہ پلٹا۔ حاعفہ بائیں جانب کھڑی تھی۔ اس جانب بڑھا۔

''حاعفہ...... کیا ہے یہ سب کچھ؟'' وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔

''جو کچھ بھی ہے تمہارے سامنے ہے۔'' اس نے بنا تاثر دیئے کہا تھا۔

''مطلب؟'' وہ کچھ نہ سمجھا تھا۔

''مطلب میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔'' ہانیہ نے پیچھے سے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کہنا چاہا تھا جس پر وہ برجستہ پلٹا۔

''شٹ اپ...... جسٹ شٹ اپ۔ میں اپنی بیوی سے بات کر رہا ہوں۔ تمہیں درمیان میں مداخلت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' وہ کرخت انداز میں گرجا تھا۔ حاعفہ اس رویے کو دیکھ کر سہم گئی مگر ہانیہ کے وجود میں ذرا سی بھی جنبش نہ آئی۔ شاید وہ اس کی عادی تھی۔ یہی انداز ہی تو اس کے دل کو بھایا تھا۔

''تم ذرا بھی نہیں بدلے اریب۔'' وہ مسکرائی تھی۔ یہ طنز نہیں تھا بلکہ محبت کا ایک انداز تھا۔

''شیٹ اپ...... اپنی بکواس بند کرو۔'' وہ دوبارہ پلٹا اور اس بار حاعفہ کے دونوں شانوں کو پکڑتے ہوئے ذرا سخت انداز میں پوچھا۔

''تم تو مجھے سرپرائز دینا چاہ رہی تھی۔ کہاں ہے وہ سرپرائز؟''

''یہی تو ہے میرا سرپرائز۔ ہانیہ عمر دراز۔ تمہاری کلاس فیلو۔'' اس نے آدھی ادھوری بات کی تھی۔ اریب یہ سن کر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ذرا کمزور ہوئی۔ آنکھیں حیرت سے پھیلتے ہوئے اُس کے چہرے سے ہٹیں۔

''یہ سرپرائز...... مطلب کیا ہے تمہارا؟'' وہ ذرا سا پیچھے کھسکا تھا۔

''مطلب واضح ہے اریب۔ اب انجان بننے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' ہانیہ نے کہا تھا۔ اس کی آواز اس کے دل کو جیسے جکڑ رہی تھی۔

''حاعفہ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔ ہمارے درمیان ہانیہ کیسے آ گئی؟'' وہ چلایا تھا۔

''جس طرح میں تمہارے اور اس کے درمیان آئی تھی۔'' اریب کے پاؤں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ وہ آنکھیں پھیلائے بس دیکھتا رہ گیا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ماضی کا انتہائی کڑوا سچ بھانک روپ دھاڑ کر اس کے سامنے آئے گا۔ جس کہانی کو وہ سمجھا تھا کہ وہ دفن ہو چکی ہے۔ ایک بار پھر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

''ہاں...... اریب ہانیہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' وہ آگے بڑھی۔ اریب کو پکڑ کر کرسی پر بٹھایا جو اپنے سر کو پکڑے ہوئے تھا۔ اس کے دائیں جانب حاعفہ کھڑی تھی تو بائیں جانب ہانیہ۔ دونوں کی نگاہوں کا مرکز فقط اریب کی ذات تھی۔

''یہ سچ نہیں ہے۔ سب جھوٹ ہے۔'' اس نے تردید کی تھی۔

''جھوٹ...... تمہیں یہ سب جھوٹ لگتا ہے اریب؟'' ہانیہ پلٹ کر اس کے سامنے آئی تھی۔ اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کرتے ہوئے حقیقت اس کے سامنے آشکار کی تھی۔

''کیا وہ سب جھوٹ تھا؟ کیا میری چاہت جھوٹ تھی؟ کیا میری محبت جھوٹی تھی جس کی خاطر میں نے اپنا سب کچھ کھو دیا؟ کیا وہ احساس جھوٹا تھا جس نے میرے اندر کی انا کو ختم کر دیا؟ کیا وہ دوستی جھوٹی تھی جو کبھی تم نے مجھ سے کی تھی؟ بتاؤ اریب کیا یہ سب جھوٹ تھا؟'' وہ چلاتے ہوئے استفسار کر رہی تھی مگر وہ خاموش تھا۔ ایک لفظ بھی ادا کرنے سے قاصر تھا۔

''نہیں اریب وہ جھوٹ نہیں حقیقت تھا۔ میری محبت...... میری پرواہ...... میری چاہت...... تمہاری دوستی...... اور تمہاری دوستی کو محبت سمجھنے کی بھول...... سب کچھ حقیقت تھا اریب۔'' اس نے آواز میں درد عیاں تھا۔ وہ چاہتا تو سمجھ سکتا تھا مگر یقین...... یقین کرنے کے لیے اعتماد کا ہونا ضروری تھا جو اسی وقت ٹوٹ چکا تھا جب اس نے ڈائری کے الفاظ پڑھے تھے۔

''مجھے نہیں معلوم...... مجھے بس یہ معلوم ہے کہ تم ایک جھوٹی...... مکار...... اور خود غرض لڑکی ہو...... اور بس۔'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

''نہیں اریب...... یہ سب سچ نہیں ہے۔ ہاں میں مانتی ہوں، اس محبت کی شروعات انہی چیزوں سے ہوئی تھی۔ میں نے جھوٹ کہہ کر تم سے دوستی کی تھی۔ مکاری کے ساتھ تمہیں اپنا بنانا چاہا تھا۔ خود غرضی کے لبادے میں تمہیں پچھاڑنا چاہا تھا مگر یقین مانو اریب...... مجھے ان سب نے شکست دی۔ میں ان سب سے ہار گئی۔ تمہاری ذات نے مجھے پچھاڑ دیا تھا اور آج تک تمہاری ذات ہی مجھے پچھاڑتے آئی ہے۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور یہ حقیقت میں اُس وقت بھی تم پر عیاں کی تھی اور آج بھی اسی حقیقت کو زندگی بنائے ہوئے ہوں۔ ''اس کی پلکیں بھیگنے لگی تھی۔

''مجھے تمہارا اعتبار نہیں؟'' اس نے اپنا رخ پھیر لیا۔

''اگر بات اعتبار کی ہے تو جو تم کہو گے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم جس کسوٹی سے گزرنے کا کہو گے۔ میں گزروں گی مگر میری محبت کو جھوٹا مت کہو۔ میں تھک چکی ہوں اپنی کوتاہیوں کی سزا بھگتے بھگتے...... پلیز مجھے مزید سزا مت دو۔'' وہ ہاتھ جوڑے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ہنوں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں گردن جھٹکی۔

''حاعفہ...... چلو یہاں سے۔'' اس نے اُس کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھنے لگا مگر حاعفہ کے قدم اپنی جگہ پر ہی منجمد تھے۔ وہ متحرک نہ ہوئے تھے۔ وہ حیرت سے پلٹا اور استفہامیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' پیشانی پر شکن ابھر آئی تھی۔

''کیا آپ نے کبھی ہانیہ کو چاہا؟'' اس کے لبوں سے یہ الفاظ جاری ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ ہاتھوں کی گرفت کمزور ہو گئی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ آنکھیں چراتے ہوئے گویا ہوا۔

''یہ کیسا سوال ہے؟''

''سوال کسی بھی قسم کا ہو مگر جواب بہت آسان ہے اریب۔ مجھے بتائیں آپ نے کبھی ہانیہ کو چاہا۔'' اس نے دوبارہ وہی سوال دہرایا تھا۔

''حاعفہ...... تم اس کی باتوں کا یقین کر رہی ہو۔ جس نے مجھے دھوکہ دیا۔ اس کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ لڑکی جیسی نظر آتی ہے، ویسی ہے نہیں۔'' اس نے ہانیہ کے کردار پر انگلی اٹھائی تھی۔ جسے وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے جھٹلا رہی تھی۔ حاعفہ کی نگاہیں ابھی تک اریب کے چہرے پر مرتکز تھیں۔

''آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ کیا آپ کے دل میں کبھی ہانیہ کے لیے جذبات ابھرے تھے؟'' وہ اپنے سوال پر بدستور قائم تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اریب اس سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ خفگی اس کا حصہ بن سکتی ہے مگر جھوٹ اور اریب...... کبھی نہیں۔

''حاعفہ......!'' اس نے حسرت کے ساتھ کہا تھا۔ آواز میں سختی پہلے جیسی نہ تھی۔ جیسے بے یقینی بڑھ چکی ہو۔

''اریب! جواب بہت آسان ہے۔ میں اعتبار...... اعتماد...... یقین...... کا تو کچھ پوچھ ہی نہیں رہی۔ ویسے بھی یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ اگر آپ ہانیہ کو اعتماد کے قابل نہیں سمجھتے تو یہ بات ان دنوں کی جب آپ پیشانی پڑھ لیا کرتے تھے۔ اگر آج بھی آپ ہانیہ کو اپنے اعتماد کے قابل نہیں سمجھتے تو کوئی ثبوت ہونا چاہیے؟ کیا آپ نے ابھی اس کی پیشانی پڑھی ہے؟'' اس سوال پر اریب نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''تو پھر کس بنیاد پر آپ اس پر یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ وہ آج بھی جھوٹی اور مکار ہے۔ ماضی میں جو ہوا...... اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ہو سکتا ہے آپ جو کہہ رہے ہوں۔ حقیقت بالکل وہی ہو۔ ہانیہ نے آپ کو دھوکہ دینے کی خاطر ہی آپ سے دوستی کا رشتہ بنایا ہو لیکن اریب انسان اپنی غلطیوں سے ہی سیکھتا ہے۔ جب تک انسان ٹھوکر نہیں کھاتا۔ نہیں سنبھلتا۔ میری مثال بھی تو آپ کے سامنے ہے۔ کیا میں شروع سے ایسی تھی؟ کیا میں نے آپ کی محبت کو جھوٹا نہیں کہا؟ کیا مجھے آپ کی محبت پر ہمیشہ سے یقین تھا؟'' وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ جواب ندارد۔

''نہیں...... اریب...... میں نے بھی شک کی نگاہ سے ہی آپ کو پہلے دیکھا تھا مگر قدرت کی لگائی ایک ٹھوکر نے میری آنکھیں کھول دیں۔ وہ حقیقت میرے سامنے عیاں کی، جس سے میں نابلد تھی۔ ہو سکتا ہے ہانیہ کے ساتھ بھی یہی ہوا ہو۔ آپ تو دینا پاسار چلے گئے۔ پیچھے سے اس کی زندگی میں کیا کچھ ہوا؟ آپ نے جاننے کی کوشش کی؟ آپ کے جانے کے بعد وہ کس قدر تنہا ہو گئی۔ آپ نے جاننا چاہا؟ نہیں...... آپ نے تو بس اسے غلط سمجھا۔'' ایک لمحہ توقف کیا گیا تھا۔

''آپ جانتے بھی ہیں آپ کے جانے کے بعد اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ اپنی ماں...... اپنا بھائی۔ وہ بالکل تنہا ہو چکی تھی اور اتنے عرصے سے آپ کی محبت کے سہارے سے ہی جیتی آئی ہے۔'' وہ خاموش تھا اور اس تنہائی کا سن کر گہری نگاہ ہانیہ کے وجود پر ڈالی تھی۔ اس نگاہ میں ہمدردی تھی یا پھر محبت...... یا شاید افسوس۔ وہ خود بھی نہ سمجھا تھا۔

''اب بتائیں آپ...... کیا یہ سب جان کر بھی آپ ہانیہ کو قصوروار ٹھہرائیں گے؟ کیا اب بھی اس کی محبت کو جھٹلائیں گے؟''

''حاعفہ میں تم سے محبت کرتا ہوں ہوں۔'' ہر بات کا جواب اس نے اس جملے میں دیا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں اس کے چہرے کو سموتے ہوئے اس نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔

''آپ کو اسی محبت کا واسطہ...... آپ ہانیہ کی محبت کو اپنا لیں۔'' اس جملے نے جیسے اسے کسی پہاڑ سے نیچے گرایا تھا۔ جہاں کوئی زمین نہ تھی۔ وہ بس نیچے گہرائی میں دھنستا ہی جا رہا تھا۔ ہاتھ پیچھے کی جانب کھسکے اور آنکھیں پرنم ہوتی چلی گئیں۔

''کک...... کیا؟'' وہ ہکلایا۔

''میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا...... آج مانگتی ہوں۔ اگر آپ نے مجھ سے محبت کی ہے تو آپ ہانیہ کو بھی اس کی محبت سے

نوازیں گے۔ آپ بھلا اس کی محبت کو تسلیم نہ کریں مگر میں نے اس کی آنکھوں میں آپ کے لیے سچی محبت دیکھی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میں محبت کے اس جذبے کو پل پل سسکتا ہوا دیکھوں۔'' اس نے آگے بڑھ کر اریب کے ہاتھوں کو تھاما تھا۔

''میری ذات کا مقصد حیات فقط تمہاری ذات ہے۔'' اس نے حقیقت آشکار کی تھی۔

''میری بھی زندگی آپ سے شروع ہو کر آپ پر ختم ہوتی ہے۔'' اس نے تائید کی تھی۔

''پھر ہمارے درمیان کسی تیسرے کو کیوں لا رہی ہو؟'' اس نے وجہ دریافت کرنا چاہی تھی۔

''کوئی کسی کے درمیان نہیں آتا اریب...... ہر انسان کی حیثیت الگ ہوتی ہے۔ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ یہ حقیقت ہے اور اس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا اور نہ ہی کبھی یہ محبت کم ہو گی۔ مگر اس حقیقت کے ساتھ ساتھ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ ہانیہ بھی آپ کی زندگی کا حصہ ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے۔'' وہ اس جملے پر حیران تھا اور یک ٹک اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔

''حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے اریب...... بس آپ اپنے اندر جھانکیں۔ حقیقت آشکار ہو جائے گی۔ آپ کی زندگی میں ...... آپ کے دل میں ایک گوشہ ایسا ہے، جہاں ہانیہ زندہ ہے۔ اس گوشے کو پہچانیں۔ اسے تسلیم کریں۔''

''یہ سچ نہیں ہے۔'' اس نے جھٹلایا تھا۔

''یہی سچ ہے اریب۔ ابھی میں نے آپ سے سوال کیا تھا کہ آپ نے کبھی ہانیہ کو چاہا؟ کیا اس کے لیے آپ کے دل میں کسی قسم کے جذبات ابھرے؟ تو آپ نے نفی میں جواب نہیں دیا اور نہ ہی آپ نے نفی میں سر ہلایا بلکہ آپ نے اعتبار...... یقین اور دوسری چیزوں کو بنیاد بنا کر اس سوال کے جواب کو ٹالنا چاہا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آپ نے کبھی نہ کبھی...... کسی نہ کسی لمحے ہانیہ کو چاہا ضرور تھا اور آج بھی وہ چاہت دل کے ایک گوشے میں زندہ ہے۔ تبھی آپ نے اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دیا۔'' حاعفہ کے اس جواب پر اریب کے ساتھ ساتھ ہانیہ بھی حیران تھی۔ وہ اس جواب کی تردید نہ کر سکا۔ نظریں چرا کر بس حقیقت سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

''دیکھیں اریب......! میری فکر مت کریں۔ میں ہمیشہ آپ کے ساتھ تھی...... آپ کے ساتھ ہوں...... اور آپ کے ساتھ رہوں گی۔ جب ہم دو زندگی کو خوبصورت انداز میں گزار سکتے ہیں تو ہم تین کیوں نہیں؟ مجھے ان بیویوں میں شمار مت کیجیے گا جو اپنے شوہر کو دوسری شادی کرنے سے روکتی ہیں۔ جب ہمارا مذہب مرد کو دوسری شادی کرنے سے نہیں روکتا تو ہم عورتوں کی کیا مجال؟ کیا ہم اسلام کے قانون سے بڑھ کر علم رکھتی ہیں؟ جو اپنی ناقص عقل کے بل بوتے پر مرد کو جائز راہ اختیار کرنے سے روکتی ہیں۔ اگر مرد دونوں بیویوں کے حقوق ادا کر سکتا ہے تو اسلام میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ میں بھی آپ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گی اور نہ ہی کبھی کوئی شکوہ اپنی زبان پر لاؤں گی اور مجھے یقین ہے اس معاملے میں ہانیہ بھی میرا ساتھ دے گی۔'' اس نے پلٹ کر ہانیہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے مثبت میں گردن ہلا دی۔ آنکھوں سے اشک جاری تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زندگی اس انداز سے اریب کو اس کے قریب لائے گی، تشکر بھرے آنسو بہتے جا

رہے تھے۔اب دونوں کی نگاہوں کا مرکز اریب تھا۔جو خاموش تھا۔الجھنوں میں بری طرح الجھا ہوا۔ذہن تو جیسے ماؤف ہی ہو چکا تھا۔کسی بھی فیصلے پر پہنچنے سے قاصر دیکھائی دے رہا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟ کیا آپ میری خاطر ہانیہ کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں گے؟" وہ استفسار کر رہی تھی جبکہ وہ خاموش تھا۔اس خاموشی سے ہانیہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ایک بار اریب اسے بیچ راہ میں چھوڑ کر جا چکا تھا۔اس بار اس میں ہمت نہ تھی۔اگر اس بار بھی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ جی نہیں سکتی تھی۔

"مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا...... کچھ بھی......" وہ سر پکڑتے ہوئے ایک بار گھوما تھا، جیسے بری طرح سر چکرایا ہو اور پھر تیز قدموں کے ساتھ کار کی طرف بڑھ گیا۔ہانیہ کا دل بری طرح ٹوٹا تھا۔درد نے ایک بار پھر کروٹ لی تھی۔

"کتنی بری ہوں میں......خوشیاں ہر بار مقدر بنتے بنتے رہ جاتیں۔" شکوہ کرتے ہوئے وہ زمین بوس ہوئی تھی۔آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے۔

"شکوہ نہیں کرتے ہانیہ۔تم فکر نہ کرو۔اریب میرا کہا کبھی نہیں ٹالے گا۔میرا یقین کرو۔" وہ اسے حوصلہ دے رہی تھی۔

"یقین......مگر جو اریب مجھ پر نہیں کرتا......" وہ ہکلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جب یقین ٹوٹتا ہے تو انسان کو سنبھلنے میں وقت لگتا ہے۔اریب بھی اسی دوراہے پر ہے۔جس طرح وہ تمہارے حالات سے لاعلم تھا بالکل تم بھی اس کی زندگی میں پیش آنے والے حادثات سے لاعلم ہو۔تم نہیں جانتی کہ وہ زندگی کے کس دوراہے سے گزر رہا ہے۔اگر تم مجھے یہ حقیقت ابھی نہ بتاتی تو شاید میں اسے اس حادثے سے نکالنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔مگر اب ایسا لگتا ہے جیسے اس بات کو سامنے رکھتے ہوئے وہ اُن باتوں کو بھول جائے گا جس نے اسے کئی راتوں سے بے قرار کیے ہوئے ہے۔وہ کہتے ہیں ناں لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے۔شاید اریب کے اس یقین کو بحال کرنے کے لیے اس یقین کا قائم ہونا لازمی تھا۔تبھی قدرت نے تمہیں واپس بھیجا۔" وہ کیا کہہ رہی تھی، فی الوقت ہانیہ کی عقل سے بالاتر تھا۔وہ بس جانتی تھی تو یہ کہ اریب اس کی واپسی سے خوش نہیں ہے۔اسے واپس چلے جانا چاہیے۔اسی تاریکی میں، جو شاید اس کا مقدر ہے۔جسے اس نے خود اپنے لیے چنا تھا مگر حاعفہ اسے واپس جانے نہیں دے سکتی تھی۔وہ تو اسے لینے آئی تھی اور اسے اپنے ساتھ لے جا کر ہی دم لیا۔

☆......☆......☆

نہ پوچھ اُس کی جو اپنے اندر چھپا
غنیمت کہ میں اپنے باہر چھپا

سب بہت خوش تھے۔آج سعدی صحت یاب ہو کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔گھر میں خوشی کا سماں تھا۔سحر فاطمہ تو خوشی سے پھولے

نہیں سما رہی تھیں۔ جبیں بھی گھر کو رنگ برنگے غباروں سے آراستہ کر رہی تھی۔ حاعفہ کیسے پیچھے رہ سکتی تھی؟ جہانزیب صوفے پر یہ سب دیکھ رہے تھے۔ اریب اگرچہ ان سب میں کوئی حصہ نہیں لے رہا تھا مگر اس کے چہرے پر بھی کوئی تاسف نہ تھا۔ ہانیہ جسے حاعفہ نے اسی گھر میں رہنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ بھی اس گھر کی خوشیوں میں شریک ہوگئی۔ یوں پورا گھر ایک خوشی میں شریک تھا سوائے اریب کے جو سب سے الگ تھلگ زینے کے سہارے کھڑا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

ہارن کی آواز آئی تو سب دروازے کی طرف لپکے۔ سب کی نگاہیں اب بس سعدی کی متلاشی تھیں۔ اریب پیچھے کھڑا صحیح سے دیکھ نہیں پا رہا تھا مگر اس نے وہاں سے ہلنا بھی اپنی توہین سمجھا تھا۔ تبھی گردن جھٹک کر صوفے کی طرف بڑھا اور نیوز پیپر پڑھنے کا ڈھونگ کرنے لگا۔

”السلام علیکم ماما جان...... السلام علیکم بابا جان......!“ حسام کی آواز سن کر اس کی گردن خود بخود اٹھی تھی اور نگاہیں دروازے کی جانب اٹھیں۔ جنہیں لگام دیتے ہوئے اس نے دوبارہ نیوز پیپر پر مرتکز کیا۔

”وعلیکم السلام...... میرے بچے کو مجھے دو۔ اپنے بچے کو میں بھی تو گود میں لوں۔“ سحر فاطمہ نے آگے بڑھتے ہی سعدی کو گود میں لیا تھا۔ جو کچھ چڑچڑا ہو گیا تھا اور مسلسل رو رہا تھا۔

”وہ تین دن اسپتال میں رہا ہے ناں......شاید اسی لیے چڑچڑا ہو گیا۔“ صبا نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤ۔“ جہانزیب نے حسام کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جگہ دی۔ سب اندر کی طرف آنے لگے۔

”آخر اپنے چاچو پر گیا ہے۔ جس طرح وہ ضدی اور چڑچڑے سے رہنے لگے ہیں بالکل اسی طرح اُن کا بھتیجا بھی ان جیسا ہو گیا ہے۔“ حاعفہ نے بلاواسطہ اریب کو مخاطب کیا تھا۔ جس پر گہری نگاہ اریب نے حاعفہ پر ڈالی تھی۔ حسام بھی خاموش رہا مگر ناپسندیدگی کے تاثر نمایاں تھے۔

”بچے ہمیشہ اپنے والدین پر جاتے ہیں۔ کسی اور پر نہیں۔“ اس نے سعدی کو واپس گود میں لیتے ہوئے کہا تھا۔ اریب نے اپنی نگاہیں دوبارہ نیوز پیپر پر جمالیں۔ وہ سب اب ہال میں آچکے تھے۔ اریب کی ترچھی نگاہیں بار بار سعدی کو دیکھ رہی تھیں۔ جو حاعفہ کی نظروں سے نہ چھپ سکا۔

”حسام بھائی......کیا میں سعدی کو لے سکتی ہوں؟“ حاعفہ نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔

”ہاں......کیوں نہیں؟ یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے؟“ حسام نے بخوشی اس کی گود میں سعدی کو دیا تھا۔

”میں آپ سب کے لیے چائے لاتی ہوں۔“ جبیں کچن میں چلی گئی۔ جہاں ماریہ پہلے ہی موجود تھی۔ ہانیہ اریب کے عین پیچھے کھڑی تھی۔

’’کتنا پیارا ہے میرا بیٹا! اتنے دن گھر سے دور رہا ہے ناں...... اپنی چچی جان کو بھول گیا؟‘‘ وہ اس سے باتیں کرتے ہوئے اریب کے قریب آئی تھی۔

پاس سے گزرتے ہوئے اس کا قدم لڑکھڑائے اور سعدی جیسے گرنے ہی لگا تھا کہ اریب نے اسے سنبھال لیا۔ سعدی چیخا تو اریب نے اسے اپنے سے گلے لگالیا۔ حسام اور صبا کے ہاتھ بھی آگے بڑھ کر رہ گئے۔

’’اگر بچہ سنبھالنا نہیں آتا تو اسے گود میں لینے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر سعدی کو کچھ ہو جاتا تو؟‘‘ وہ اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے حاعفہ کو تنبیہہ کر رہا تھا۔ سب اریب کے رویے پر حیران تھے۔ اریب کے سہلانے پر وہ بھی خاموش ہو گیا اور اس کا چڑچڑا پن بھی جیسے ختم ہو چکا تھا۔ بالکل پرسکون تھا۔ حاعفہ مسکرائی تو اریب ٹھٹک کر رہ گیا۔ حاعفہ کی چال وہ اچھے سے سمجھ گیا۔ جہانزیب اور سحر فاطمہ بھی دھیرے سے مسکرا دیئے تھے۔ جبکہ باقی اس سب کو نہ سمجھ سکے۔

’’واہ اریب...... آپ کی گود میں آکر تو سعدی بالکل خاموش ہو گیا۔ جیسے آپ سے دلی لگاؤ ہو اس کو یا پھر آپ کا......!‘‘ اس سے پہلے کہ جملہ مکمل کرتی اریب نے مداخلت کی۔

’’شیٹ اپ۔‘‘ اس کے علاوہ کوئی اور بھی بچہ ہوتا تو میں یہی کرتا۔ پکڑو اسے۔‘‘ دوبارہ اسے دیتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب مڑا تھا۔

’’مسٹر جہانزیب عالمگیر یہیں رہتے ہیں؟‘‘ باہر سے آواز آئی تھی۔ سب باہر کی جانب مڑے اور اس آواز کو اندر آنے کی اجازت دے دی گئی۔ وہ گورنمنٹ کے ادارے کی وردی میں ملبوس تھا۔

’’مسٹر جہانزیب عالمگیر کون ہیں؟‘‘ اس نے استفسار کیا تھا۔

’’جی میں ہوں۔ بولیں کیا کام ہے؟‘‘ جہانزیب آگے بڑھے تھے جبکہ اریب جو زینے چڑھ رہا تھا۔ اس کی رفتار ذرا سست ہو گئی اور درمیان میں پہنچ کر وہ پلٹا تھا اور فی الوقت اوپر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

’’یہ کورٹس سے کچھ پیپرز آئے ہیں۔ شاید پراپرٹی کے ہیں۔‘‘ اس نے کہا۔ اس بات پر سب کے چہرے پر ایک فکر نے جنم لیا تھا جبکہ اریب پرسکون تھا۔ کوئی فکر، کوئی تاثر اس کی پیشانی پر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ حاعفہ پلٹی اور اریب کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں طمانیت تھی۔ وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکی۔ واپس مڑ کر جہانزیب کی طرف دیکھا جو پیپر وصول کر رہے تھے۔

’’کس کی طرف سے آئے ہیں؟‘‘ انہوں نے دھیرے سے خود کلامی کی تھی۔

’’یہ تو نہیں معلوم مگر اتنا بتا سکتا ہوں کہ پراپرٹی ٹرانسفر کے کینسل ہونے پر ایسے کاغذات بھیجے جاتے ہیں۔‘‘ جہانزیب کو ایک دھچکا لگا۔ حسام بھی حیران تھا جبکہ حاعفہ اب سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ دوبارہ اریب کی طرف دیکھا جو دھیرے سے مسکراتا ہوا واپس پلٹ

گیا۔حاعفہ کے دل میں بھی اریب کے لیے محبت پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔واقعی اریب لوٹ آیا تھا۔اُن اندھیر وادیوں سے......جس میں کھو کر اس نے اپنا سب کچھ دیا تھا مگر احساس نے اسے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔وہ جان چکا تھا کہ اپنوں سے دور رہنے پر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔کبھی انسان خوش نہیں رہ سکتا اگر اُس کے اپنے اُس سے دور ہیں۔

''پراپرٹی کینسل......مگر کون سی پراپرٹی؟''اس آدمی کے جانے پر حسام آگے بڑھا۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟میں نے تو تمام کاغذات صحیح سے چیک کیے تھے۔ان میں کسی قسم کی کوئی غلطی نہ تھی۔''وہ بڑبڑائے تھے اور اُس پیپر کو پڑھا تو اس میں لکھا تھا کہ یہ پراپرٹی ناقابل ٹرانسفر ہے۔یہ کبھی کسی اور کے نام ٹرانسفر نہیں ہو سکتی۔اس سٹیٹمنٹ کو پڑھ کر ان کی پریشانی میں کافی اضافہ ہو گیا۔جو فاصلے مٹتے دیکھائی دیئے تھے۔اس سٹیٹمنٹ کو پڑھنے کے بعد شاید دوبارہ بڑھ جائیں گے۔

''بابا جان......مجھے تو بتائیں آخر کون سی پراپرٹی آپ ٹرانسفر کر رہے تھے؟اور کس کے نام پر؟''حسام کی کشمکش اپنی جگہ بجا تھی۔
سحر فاطمہ نے آگے بڑھ کر اس گتھی کو سلجھایا تھا اور حقیقت حسام سمیت سب کے سامنے رکھ دی۔

''اتنا بڑا فیصلہ آپ نے کر لیا تھا؟کیا آپ نے سوچا بھی تھا کہ اس فیصلے کے کیا نتائج مرتب ہو سکتے ہیں؟''اس نے شکوہ کناں لہجے میں کہا تھا۔

''ہمیں فیصلے سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔یہ تو بس امانت تھی جو واپس لٹائی تھی ہم نے اریب کو لیکن اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ حقیقت جان کر وہ ہم سے مزید بدظن نہ ہو جائے۔''جہانزیب کی فکر اپنی جگہ بجا تھی۔سحر فاطمہ کے چہرے پر بھی افسردگی نے جنم لیا تھا۔

''بدظن ہونے کا تو اب سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔''حاعفہ آگے بڑھی۔سعدی کو صبا کو تھمایا اور سحر فاطمہ کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں حوصلہ دیا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہو حاعفہ......تم اچھے سے جانتی ہو کہ اریب کے دل میں ہمارے لیے جو زچ جنم لے چکی ہے۔وہ شاید پراپرٹی کے ٹرانسفر ہونے پر ہی ختم ہونے کی امید کی جا سکتی تھی۔اس کے گمان کو ایسے ہی ختم کیا جا سکتا تھا مگر اب شاید وہ ہمارے خلاف مزید بدظن ہو جائے گا۔وہ سمجھے گا کہ ہم جان بوجھ کر اس کے نام پراپرٹی نہیں کرنا چاہتے۔''جہانزیب نے خود سے ہی ڈوری کو سلجھانا چاہا تھا۔

''آپ اتنی فکر کیوں کرتے ہیں بابا جان؟آپ تصویر کا ایک پہلو دیکھ رہے ہیں۔دوسرا پہلو آپ سے ابھی تک پنہاں ہے۔جس کے بارے میں آپ کا خیال تک نہ گیا۔''حاعفہ کے چہرے پر مسلسل ایک مسکراہٹ تھی۔

''تصویر کا دوسرا پہلو......کیا مطلب ہے تمہارا؟''سحر فاطمہ نے حیرت سے استفسار کیا تھا۔

''مطلب صاف ہے ماما جان۔''اس نے مسکراتے ہوئے سحر فاطمہ کی طرف دیکھا اور اپنی بات آگے بڑھائی۔

''آپ سب یہ تو جانتے ہیں کہ سعدی کے لیے خون اور بون میرو ٹرانسپلانٹ کا انتظام ہو گیا مگر کیسے؟کس شخص نے ڈونیٹ کیا؟

اس کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ اوراب پراپرٹی ٹرانسفر کینسل ہوگئی مگر کیوں اور کیسے؟ اس کے بارے میں بھی کسی نے نہیں سوچا۔'' اس پر سب ایک سوچ میں ڈوب گئے۔ شائد وہ ابھی تک نہیں سمجھے تھے۔

''حاعفہ ڈاکٹر نے فون کیا تھا کہ کسی شخص نے ڈونیٹ کیا ہے۔ اب دنیا میں ہزاروں بلکہ لاکھوں خدا ترس لوگ موجود ہیں۔ اور جہاں تک پراپرٹی کے کینسل ہونے کی بات ہے ہوسکتا ہے باباجان سے کسی پیپر میں مسٹیک ہوگئی ہو۔'' حسام نے خود سے ہی تخمینہ لگایا تھا۔ جس پر وہ مسکرادی۔

''نہیں بھائی......کبھی کبھی ہمارا اندازہ غلط بھی ہوجایا کرتا ہے۔'' اس کے چہرے کی مسکراہٹ کو دیکھ کر سب حیران تھے۔

''آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ صاف صاف کہو۔'' سحر فاطمہ نے پوچھا تھا۔

''میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ ان سب کے پیچھے اریب ہے۔''

''اریب؟'' سب نے یک زبان ہوکر کہا تھا۔

''جی ہاں اریب...... جب آپ پیپرز دیکھ رہے تھے تو میں نے اریب کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جیسے وہ ان سب کے بارے میں پہلے سے ہی جانتا ہو اور پھر میں نے ٹرانسپلانٹ کی خبر کی تصدیق کرنے کے لیے اسپتال کال کی۔ ڈاکٹر نے پہلے پہل تو مجھے سچ بتانے سے گریز کیا مگر جب میں نے اصرار جاری رکھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ شخص اریب ہی تھا۔ جس نے ڈونیٹ کیا تھا اور نام بتانے کے لیے اس نے خود منع کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ پراپرٹی ٹرانسفر کے کینسل ہونے میں بھی اریب کا ہی ہاتھ ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ آپ ساری پراپرٹی اُس کے نام کریں۔'' حقیقت سب کے سامنے آچکی تھی۔ جس پر سب کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

''اس کا مطلب یہ سب اریب نے کیا؟ میرے بچے کو دوبارہ زندگی بخشنے کا وسیلہ بننے والا کوئی اور نہیں اریب تھا...... میرا بھائی۔'' حسام کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو ابھر آئے تھے۔

''اور میں نے اسے جانے کیا کیا کچھ کہا؟ اسے اپنا بھائی ماننے سے انکار کردیا۔ اسے طعنہ دیا۔ اللہ......! یہ میں نے کیا کردیا؟ اپنے بھائی پر جھوٹا الزام لگایا۔'' اسے اپنی غلطی کا احساس تھا۔ اب حقیقت عیاں ہونے پر اس میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہ تھی۔ صبا نے آگے بڑھ کر اسے حوصلہ دیا۔

''ہم نے بہت غلط کیا اریب کے ساتھ۔'' اسے بھی اپنی غلطی کا احساس تھا۔

''میرا بچہ......ہماری اتنی فکر کرتا ہے اور ہم ہی اسے سمجھ نہ سکے۔'' سحر فاطمہ بھی جذبات میں آ گئی تھیں۔

''بالکل...... اریب ہماری فکر کرتا ہے اور ہم سے ناراض بھی ہے بس اس کی ایک خامی ہے اسے صحیح سے ناراض بھی ہونا نہیں

آتا۔'' حاعفہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے ابھی جا کر اریب سے معافی مانگنی چاہیے۔'' حسام برجستہ کھڑا ہوا تھا۔ سب نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''ہم سب کو اکٹھے جانا چاہیے۔ دیکھیے گا، اس بار وہ ہم سے نظریں نہیں چرا سکے گا۔'' حاعفہ کی اس بات پر سب ساتھ تھے۔ سب اکٹھے اس کے کمرے کی طرف گئے تھے۔

☆......☆......☆

ضبط کر کے ہنسی کو بھول گیا

میں تو اُس زخم ہی کو بھول گیا

وہ سفید کرتا پاجامے میں بیڈ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ جس کا مطالعہ کرنے کی جستجو میں تھا۔ شاید اس کا دل بھی نیچے جانے کے لیے بے قرار تھا تاکہ سب کی خوشی میں شریک ہو سکے مگر خود مجبور کر کے وہاں رکا ہوا تھا۔

دفعتہً قدموں کی چاپ اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ ہڑبڑایا اور سنبھل کر سنجیدگی سے کتاب کا مطالعہ کرنے لگا۔

قدموں کی چاپ قریب سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ وہ حیران تھا مگر آنکھ اٹھا کر دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا تھا۔ تبھی اسے کمرے میں کسی کے داخل ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے کتاب کو مزید قریب کر لیا تھا۔

سب اریب کو دیکھ کر مسکرانے لگے۔

''اریب......!'' حاعفہ آگے بڑھی تھی مگر اس نے ان سنا کر دیا اور ایسے ظاہر کیا جیسے وہ کتاب میں مگن ہے۔

''اریب دیکھیں کون آیا ہے۔'' وہ آگے بڑھی اور کتاب کو کھینچ کر ایک طرف رکھ دیا۔

''کیا ہے؟ تمیز نہیں ہے تمہیں؟'' بناوٹی انداز میں چلایا تھا۔ سمٹ کر بیٹھا اور پیشانی پر سلوٹیں بکھیرتا ہوا سب کی طرف دیکھا۔

''کوئی کام ہے آپ سب کو؟'' اس نے اس بار بھی بناوٹی انداز اپنایا تھا۔

''کام ہے تو صحیح......مگر مجھے نہیں لگتا تم کر پاؤ گے۔'' جہانزیب آگے بڑھے تھے۔

''اگر امید ہی نہیں تھی تو آئے کیوں؟ وہ راستہ ہے آپ سب واپس جا سکتے ہیں۔'' اس نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ آنکھوں میں بے اعتنائی نمایاں کرنے کی سعی کی جا رہی تھی۔

''ہم یہاں واپس جانے کے لیے نہیں آئے بلکہ تمہیں واپس لے جانے آئے ہیں۔'' حسام نے آگے بڑھ کر کہا تھا۔ چہرہ کسی بھی تاثر کو ظاہر کرنے میں ناکام تھا۔ حسام نے اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھا تو وہ انہیں جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور بالکونی کی طرف چل دیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ......میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اس کی آواز میں ہکلاہٹ شامل تھی۔ حسام مسکرایا اور آگے بڑھا۔

""تمہیں پتا ہے اریب...... تمہاری ایک کمزوری مجھے معلوم ہے۔"اس نے سرگوشی والے لہجے میں کہا تھا۔

""کمزوری...... کیسی؟"ایک بار پھر ہکلاہٹ شامل تھی مگر غصے کا تاثر دیا جا رہا تھا۔نظریں چرائی جا رہی تھیں۔

""تمہاری ہکلاہٹ...... جب تم کسی سے جھوٹ موٹ ناراض ہونے کا ناٹک کر رہے ہو تو تم ہکلانے لگتے ہو۔"اس کے شانوں کو پکڑ کر اُس کا چہرہ اپنی طرف کیا تھا۔

""آئی ڈانٹ کیئر۔"اس نے گردن جھٹکی۔

""تمہیں تو صحیح سے ناراض ہونا بھی نہیں آتا میرے بھائی۔"اس نے دائیں ہاتھ سے اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا۔ آنکھوں میں کئی سوال تھے مگر چہرہ کسی بھی قسم کے تاثر سے پاک۔

""مجھے معاف کردو...... اریب۔ میں نے تمہیں بہت ٹھیس پہنچائی اپنے الفاظ سے۔ مجھے معاف کردو۔"اس کو اپنے گلے سے لگا کر اپنے کیے کی معافی مانگ رہا تھا۔چہرے سے ندامت عیاں تھی۔سحر فاطمہ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

""اپنے اس بھائی پر شک کیا جس کو میں اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ مجھے معاف کردو۔"اس کے چہرے کو اپنے سامنے کر کے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا تو اریب نے جان چھرانا چاہی تھی۔اگرچہ اس کی آنکھیں بھر آئیں مگر وہ ان کو ضبط کر گیا۔دونوں ہاتھوں سے مزاحمت کرتے ہوئے اس کو پیچھے کیا۔

""پیچھے ہٹیں...... بند کریں اپنا دیکھاوا۔"وہ منہ بگاڑ کر کہہ رہا تھا۔

""تم جو بھی کہو...... آج کے بعد مجھے تمہاری کسی بات کا برا نہیں لگے گا۔آخر میرے بچے کی جان تو بچائی ہے تم نے۔"اس بات پر وہ طنزیہ ہنسا۔

""ایسا کس نے کہہ دیا آپ کو؟"وہ ہنس رہا تھا جبکہ سب کو تشویش ہو رہی تھی۔

""میں اور آپ کے بچے کا محسن...... امپاسیبل۔رشتہ ہی کیا ہے میرا آپ کے بچے کے ساتھ۔"وہ نظریں چراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔آنکھوں میں پانی تیرنے لگا مگر حقیقت سے فرار ہونے کی ہر ممکن سعی کی جا رہی تھی۔

""یہی بات تم میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہو۔"اس کا چہرہ اپنی جانب کیا اور سپاٹ لہجے میں حسام نے کہا تھا۔

""چھوڑیں مجھے۔ان...... فرسودہ باتوں پر میرا یقین نہیں ہے۔"ہکلاتے ہوئے اس نے اپنے آپ کو آزاد کرایا تھا۔

""ٹھیک ہے، مان لیتے ہیں کہ تم نے میرے بچے کی جان نہیں بچائی تو تمہارے بازو پر کسی بھی قسم کا کوئی نشان نہیں ہونا چاہیے۔ٹھیک کہا ناں میں نے؟"حسام کے اس جملے پر وہ چونکا تھا۔اپنے بائیں بازو کی آستین ہتھیلی تک کی اور اس کو مضبوطی سے انگلیوں میں دبوچ لیا۔

"نن نشان...... کیسا نشان؟" اس نے رخ پھیر کر بالکونی کی طرف کیا۔

"وہی نشان...... جسے تم اس وقت چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔" یہ کہتے ہی اس نے اریب کا بائیں بازو پکڑ کر آستین اوپر چڑھانے کی کوشش کی جبکہ وہ مسلسل مزاحمت کر رہا تھا۔

"چھوڑیں...... مجھے۔ چھوڑیں۔" ساری مزاحمت بے سود رہیں۔ شبہ حسام کا مقدر بنی۔ سچ عیاں ہو گیا۔ جہانزیب اور سحر فاطمہ کو اپنے بچے پر فخر محسوس ہوا۔ لبوں پر تمکنت نے بسیرا کیا۔

"آئی لو یو مائے ڈیئر...... میں مر کر بھی تمہارا یہ احسان نہیں بھول سکتا بھائی۔" حسام کی آنکھیں خود بخود نم ہوتی چلی گئیں۔ اس کو دوبارہ اپنے سینے سے لگا کر جذبات کو بند باندھنے کی کوشش کی۔ اریب ابھی تک نظریں چرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میرے بچے اب تو چھوڑ دو ناراضگی...... اب تو معاف کر دو ہمیں......" جہانزیب آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا مگر اس نے نظریں چرالیں اور باہر کی جانب جانا چاہا مگر حسام نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"اب تمہیں کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اگر تمہیں روکنے کے لیے تمہارے پاؤں بھی پکڑنے پڑے تو میں اس سے بھی دریغ نہیں کرونگا۔" یہ کہتے ہی وہ اس کے پاؤں پکڑنے لگا تو وہ بھلا کیسے گوارا کر سکتا تھا؟ جن جذبات و احساسات کو وہ دبانے کی کوشش میں تھا، اچھل کر سامنے آ گئے۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ بھائی جان؟" اس نے حسام کے ہاتھ کھینچ لیے۔

"بڑے چھوٹوں کے پاؤں نہیں پکڑتے۔" اس زبان سے برجستہ جاری ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔

"اریب......! میرا بھائی۔" حسام کی آواز گلوگیر تھی۔ اریب کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔ اپنے کیے نادم ہوا اور اس بار وہ خود حسام سے بغل گیر ہوا تھا۔

"مجھے معاف کر دے میرے بھائی۔" حسام نے کہا تھا۔

"نہیں بھائی جان...... معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے۔ بہت تکلیف پہنچائی۔ مجھے معاف کر دیں۔" گلے شکوے سب ختم ہو چکے تھے۔ درد جو ایک عرصے تک انجان مہمان کی طرح موجود تھا۔ آج اس کے رخصت ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ دوریاں قرابت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رنجشیں دوبارہ محبتوں میں ضم ہونے لگی تھیں۔ وہ خلوص جو کبھی رشتوں میں ہوا کرتا تھا، واپس لوٹ آیا تھا۔

"میرے الفاظ...... میرے رویے آپ پر بہت گراں گزرے ہیں۔ مجھے نادان سمجھ کر معاف کر دیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ اپنے اندر پیدا ہوئی اس انا کو مٹا رہا تھا جو فاصلوں نے جنم دی تھی۔

"نہیں...... مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں اریب...... تم کل بھی میرے چھوٹے بھائی تھے اور آج بھی ہو۔ یہ حقیقت کوئی نہیں بدل

سکتا۔'' آنکھوں سے اشک تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

''ماما جان! مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بھی بہت تکلیف پہنچائی۔'' سحر فاطمہ کے گلے لگ کر بھی اس نے آنکھوں کو خوب سیراب کیا۔ ممتا کو جب تک راحت نصیب نہ ہوئی، وہ علیحدہ نہ ہوا۔

اب جہانزیب کی باری تھی۔ جن سے وہ صبح سے نظریں بھی ملا نہیں پا رہا تھا۔

''مجھے معاف کر دیں بابا جان۔ میں آپ کا بہت برا بیٹا ہوں۔ اپنے اس برے بیٹے کو معاف کر دیں۔'' وہ نظریں جھکائے، ہاتھ باندھے ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جہانزیب کی گردن نفی میں متحرک تھی۔

''نہیں میرے بیٹے! میں ناراض نہیں ہوں تم سے۔'' بیٹے کے ایک آنسو نے سب گلے شکووں اور خلشوں کو مٹا کر رکھ دیا تھا۔

''اب کوئی مجھ سے بھی معافی مانگے گا یا نہیں؟'' جبیں نے ہمیشہ کی طرح ماحول کو کروٹ دی تھی۔ اداس چہروں پر ایک کسک ابھر آئی تھی۔

''تم سے کون معافی مانگے گا؟'' حسام نے اریب کا کردار ادا کرتے ہوئے اس کی ٹانگ کھینچی تھی۔

''نہیں بھائی جان...... آپ سب کے ساتھ ساتھ میں نے جبیں کا بھی دل دکھایا ہے۔ مجھے معاف کر دینا جبیں۔'' اریب کو اپنے سے معافی مانگتا دیکھ کر اس نے اپنے فرضی کالر کھڑے کیے۔ ذرا سا اکڑتے ہوئے گویا ہوئی۔

''جب اتنا اصرار کر رہے ہو آپ تو معاف کیا...... کیا یاد رکھو گے اریب بابو۔'' ڈائیلاگ کو ایک الگ ڈھنگ سے کہا تو سب کے چہرے مسکرا دیے۔ ہانیہ سب سے پیچھے کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھی۔

''حاعفہ تم بھی مجھے معاف کر دو۔'' آگے بڑھ کر اس نے معافی چاہی تھی مگر اس نے الفاظ کو مکمل ہی نہ ہونے دیا اور اس کے لبوں پر انگلی رکھ دی۔

''میں آپ سے ناراض ہی کب تھی؟ جو آپ معافی مانگ رہے ہیں۔'' اپنے سینے لگاتے ہوئے اس نے ہر شکوے کو مٹا دیا تھا۔ گہری سانس لیتے ہوئے وہ ذرا پیچھے ہٹی اور اریب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اگر معافی مانگنی ہی ہے تو ایسے انسان سے مانگیں جس کے واقعی آپ مجرم ہیں۔ جس واقعی میں آپ نے دل دکھایا ہے۔ جس کی محبت کو آپ نے کبھی نہیں سمجھا۔'' حاعفہ کی اس بات کو سن کر وہ خاصا حیران ہوا تھا کیونکہ تقریباً سب سے وہ معافی مانگ چکا تھا۔

''اور کس کا دل دکھایا ہے میں نے؟ تم جس سے کہو گی میں معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔'' اریب کے یہ الفاظ سن کر حاعفہ ذرا سا پیچھے ہٹی اور ہانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ اریب اس کو بالکل فراموش کر چکا تھا مگر سب کے سامنے اس سے معافی مانگنے کا مطلب حقیقت کو عیاں کرنا تھا۔

''تمہیں ہانیہ سے بھی معافی مانگنی ہوگی۔'' حاعفہ کے کہنے پر اس کے چہرے کے تاثر یکسر بدل گئے۔ وہ ایک عجب کشمکش میں تھا۔ جہانزیب نے پیچھے ہاتھ اس کے کندھے پر رکھے تو وہ چونکا۔

''ہمیں حاعفہ نے سب کچھ بتادیا تھا اور بیٹا اگر تمہیں یہ رشتہ منظور ہے تو ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں۔'' جہانزیب کے الفاظ سن کر اس نے سحر فاطمہ کی طرف نگاہیں کی تو انہوں نے بھی اثبات میں گردن ہلادی۔

وہ خوشی سے جہانزیب کے گلے لگ گیا تھا۔

''تھینک یو بابا جان...... آئی ایم ویری ہیپی۔ مجھے فخر ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں۔'' جہانزیب نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔

''اور مجھے فخر ہے کہ تم میرے بیٹے ہو۔''

''واؤ...... اس کا مطلب ہے میری دو نہیں تین تین بھاوج ہونگی۔'' جبیں نے خوش ہو کر کہا تھا۔

''ہونگی...... ابھی تو فقط دو ہیں۔'' صبا نے اس کے کان کھینچے تھے۔

''تو بننے میں کتنا وقت لگے گا؟ ہم اپنے بیٹے کی شادی اسی جمعے کریں گے۔ کیوں حاعفہ ٹھیک رہے گا ناں؟'' سحر فاطمہ نے آگے بڑھ کر ہانیہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔

''جی جی بالکل...... لیکن مجھ سے پوچھتے تو میں آج ہی نکاح کا مشورہ دے دیتی۔ بھلا نیک کام میں دیری کیسی؟'' حاعفہ کی بات پر اریب بھی مسکرا کر رہ گیا۔

''لیکن حاعفہ...... تیاریاں بھی تو کرنی ہیں ناں۔ جمعے میں بھی بس چار دن بقایا ہیں۔'' جبیں نے اپنے نکتہ پیش کیا تھا۔

''چار دن بھی بہت زیادہ ہیں۔ کوئی دلہا دلہن سے تو پوچھے۔'' حسام نے شریر لہجے میں کہا تھا۔ اریب اور ہانیہ کے چہرے شرما گئے۔

''چلو پھر...... دلہا دلہن کو ذرا سا اکیلا بھی چھوڑ دیا جائے۔'' حاعفہ نے کہا تھا۔ سب نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''معافی ضرور مانگنا۔'' حاعفہ نے اریب کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

سب باہر چلے گئے۔ اب کمرے میں وہ دونوں اکیلے تھے۔ اریب کی نگاہوں میں ایک شرارت سی تھی جبکہ وہ سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

''تو تم جیت ہی گئی۔ مجھے مات دینا تمہارا خواب تھا ناں۔ آج تم نے مجھے مات دے کر مجھے اپنا بنا ہی لیا۔'' اس نے رومانوی انداز میں آگے بڑھتے ہوئے کہا تھا۔

''مجھے کوئی بات نہیں کرتی تم سے۔'' اس بار وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

''او...... ہو...... تم مجھ سے ناراض ہو۔ پھر تو مجھے معافی مانگنی چاہیے۔'' اس نے بناوٹ کے ساتھ کہا تھا اور ہانیہ کے سامنے آ کر اپنے دونوں کان پکڑے۔

''دیکھو...... کان پکڑ کر معافی مانگ رہا ہوں۔ معاف کر دو اپنے اس ہونے والے شوہر کو۔'' وہ ناک کو ذرا سا سکیڑ کر کہہ رہا تھا جبکہ وہ اس کی طرف دیکھنے کے لیے بھی تیار نہ تھی۔

''سوچوں گی۔'' اس نے ایک ادا سے اپنے بالوں کو پیچھے کی جانب جھٹک دیا۔ دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے دوپٹہ صحیح کیا۔

''اچھا...... پھر ایسا کرو تم سوچو...... میں جا کر اس رشتے سے منع کر دیتا ہوں۔ کہتا ہوں کہ ہانیہ کو یہ رشتہ منظور نہیں۔'' یہ کہہ کر باہر جانے لگا تو اس نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ وہ بھی رومانوی انداز اپنائے ہوئے تھا سیدھا بیڈ پر جا گرا مگر ہانیہ کا ہاتھ نہ چھوڑا، جس بنا پر وہ بھی اس کے اوپر آ گری۔

آنکھوں سے آنکھیں باتیں کرنے لگیں اور برسوں کی رنجشیں آج ختم ہو گئیں۔ وہ خلش جو شروع سے ان میں چلتی آ رہی تھی۔ آج ایک نیا رنگ لے چکی تھی۔

''بہت بدتمیز ہو تم۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''آخر تم پر ہی تو گیا ہوں۔'' اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے کہا تھا۔ وہ شرما گئی اور اس کے سینے پر پیار بھرا تھپڑ مارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں اتنی بدتمیز نہیں ہوں، سمجھے مسٹر اریب۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تھا۔

''او...... اچھا......'' اس نے دونوں ہاتھ سر کے نیچے کیے اور ان کو اپنا سرہانا بنایا۔

''مجھے پھر شمار کرنا ہو گی تمہاری بدتمیزیاں۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا تھا۔ ہانیہ نے ناک چڑھائی اور ادھر ادھر دیکھا تو کشن اٹھا کر اس کی طرف لپکی۔

''اریب کے بچے۔'' ایک کشن اس پر دے مارا تھا۔

''میرا بچہ...... کہاں...... کہاں؟'' اس نے استہزائیہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی۔'' وہ ذرا سا پیچھے کھسکی تھی۔

''ابھی تو آتی ہے مگر شادی کے بعد نہیں آئے گی۔'' وہ بھی پورا ڈھیٹ تھی۔ ہانیہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ بھی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ چہرے پر ایک کسک تھی۔

''برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟'' برجستہ اس کے چہرے پر سنجیدگی نے جنم لیا تھا۔

''اس بار تو لازمی مانوں گا برا...... بھلا تمہیں بات کرنے سے پہلے یہ جملہ کہنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی؟'' مزاح میں رخ بدلا گیا تھا۔ پھر بھنویں اچکا کر سوال پوچھنے کو کہا۔

''کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟ یا پھر حاعفہ کے کہنے پر شادی کے لیے ہاں کی؟''

''سوال کا جواب اتنا سادہ تو نہیں ہے لیکن تمہیں جاننے کا پورا حق ہے۔'' وہ بھی اب سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''سچ تو یہ ہے کہ جس وقت میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو تبھی تمہارے لیے اپنے دل میں بغض پال لیا تھا۔ جس کو میں نے بمشکل ختم کیا۔ انسان کی بعض اوقات غیر معمولی صلاحتیں دوسروں سے دوری کا سبب بھی بن جایا کرتی ہیں۔ یہ مجھے اس وقت معلوم ہوا تھا۔ پھر ایک دم تم نے اپنا ہاتھ مجھے دیکھنے کو کہا تھا۔ اس وقت مجھے ایک زبردست جھٹکا لگا تھا کیونکہ اسی دن میں نے تمہارے ہاتھ کی لکیروں میں اپنا ساتھ دیکھا تھا۔ میں کئی دن تک اس شاک سے باہر ہی نہیں نکل سکا تھا کیونکہ اس وقت میرے دل میں فقط حاعفہ تھی اور کوئی نہیں۔ میرے لیے یہ سب یقین کرنا اتنا آسان نہیں تھا مگر جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مگر میں نے اس کو بھلانے کی ہر ممکن سعی کی جو قدرے کامیاب رہی مگر جو قسمت میں لکھا تھا وہ ہو کر گزرا۔ میرے دل میں تمہارے لیے ایک جذبہ...... ایک احساس جنم لینے لگا تھا۔ وہ احساس دوستی کا نہیں تھا، اتنی بات گارنٹی کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں مگر کیا وہ احساس محبت کا تھا؟ میں نے اسے کبھی تسلیم ہی نہیں کیا۔'' اس نے یہ کہنے کے بعد توقف کیا۔ وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔

''وہ دن ہے اور آج کا دن ہے۔ احساس وہی ہے...... مقام وہی ہے۔ مگر میں آج بھی اس جذبے کو پہچاننے سے قاصر ہوں۔ تم مجھے پسند ہو یا میری محبت ہو؟ میں تفریق نہیں کر پا رہا۔'' وہ ایک کشمکش میں مبتلا تھا۔

''تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری محبت ہوں یا پسند؟ مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے لیے تمہارے دل میں ایک الگ جگہ ہے۔ میرا وجود تمہارے دل میں ایک حیثیت رکھتا ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔'' اس نے اریب کی مشکل آسان کر دی تھی۔

''شکریہ......!'' اس نے تشکرانہ اس کے ہاتھ تھامے تھے۔

''مگر یہ بات یاد رکھنا اریب...... میری محبت صرف تم ہو۔ تم ہی میری پسند ہو۔ تم ہی میری محبت ہو۔''

''یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں۔'' وہ مسکرا دیا تھا۔

☆......☆......☆

اُڑتی ہے ہر اِک شور کے سینے سے خموشی

صحراؤں کو پرشور دیاروں سے گلہ ہے

دس سال بعد

وہ بالکل جدا تھا۔ سب سے الگ تھلگ۔ کسی سے کچھ بھی میل نہ کھاتا تھا۔ نہ رنگت اور نہ نسب۔ وہ سب میں ممتاز تھا۔ سیاہ جھیل آنکھیں۔ سفید رنگت، درمیانہ قد، ستواں ناک، چھوٹے چھوٹے ایک بناوٹ سے تراشے گئے کان، باریک ہونٹ، خاکی رنگ کی پتلون اور سفید رنگ کی شرٹ پر ایک لمبا سا سیاہ اورکوٹ میں ملبوس وہ خراماں خراماں آگے بڑھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھ اوورکوٹ میں دھنسائے ہوئے وہ آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ موسم کی پرواہ کیے بغیر اس کی نگاہ زمین پر مرکوز تھی۔ آسمان پر اڑتے پرندے اس سہانے موسم میں انگڑائیاں لیتے دیکھائی دے رہی تھے۔ بادلوں کے غول کے غول دائیں جانب سے بڑھتے دیکھائی دیتے اور دھیرے دھیرے بائیں جانب سرک جاتے۔ ہوا کے جھونکے جسم کو چھوتے ہوئے ایسے گزر رہے تھے جیسے وہ ان سے کوئی کھیل کھیل رہے ہوں۔ اس کا اوورکوٹ بھی ہوا کے سنگ مست ہو رہا تھا مگر وہ انہیں اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔ سن گلاسز جسے اس نے اپنی نگاہوں کو چھپایا ہوا تھا، اب اس کے چہرے پر نہ تھیں۔ بال ہوا کے سنگ اڑنے لگے تو اس نے اپنی بیلٹ کے ساتھ لٹکی ایک بڑی سی ہیٹ اتاری اور اسے سر پر رکھ دیا۔ وہ اب کسی ملک کا جاسوس یا پھر پرانے زمانے کے گھڑسوار کے مشابہہ تھا مگر وہ ان دونوں میں سے ایک بھی شخص نہ تھا۔ یہ تو آج کا زمانہ تھا۔ جہاں ایسا لباس پہننے والے کو ہی لوگ عجیب نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اسے بھی دیکھ رہے تھے مگر اسے کہاں پرواہ تھی۔ وہ تو بس فٹ پاتھ پر جو گذشتہ رات ہونے والی بارش کے سبب گیلی تھی، چلتا جا رہا تھا۔ دوسرے راہگیر بھی اس کے ساتھ تھے۔ کچھ تیز اور کچھ سبک رفتاری سے اپنی اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ وہ سب سے پہلے ایک پارک کے پاس سے گزرا تھا۔ جہاں سے بھینی بھینی خوشبو اس کی سانسوں میں تحلیل ہو کر جسم کا حصہ بنی مگر اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔ سیدھا آگے بڑھا۔ جہاں پر وہ ایک آدمی سے ٹکرایا تھا۔ ایک لمبا تڑنگا آدمی جس سے مس کرتے ہی اس کے جسم میں ایک کشمکش نے جنم لیا تھا۔

"پاگل ہو نظر نہیں آتا۔" ایک غیر معروف زبان میں کہتا ہوا وہ پاس سے گزرا تھا۔ اتنی دیر چلنے کے بعد اس نے پہلی بار نگاہیں اوپر اٹھائی تھیں۔ یہ زبان دوسروں کے لیے تو غیر معروف تھی مگر اب اس کے لیے نہ رہی تھی۔ وہ کئی عرصے ہی زبانوں کا ہی علم حاصل کر رہا تھا۔ چائنیز، انگلش، اردو، ترکش کے ساتھ ساتھ وہ انڈونیشین زبان بھی بول سکتا تھا اور سمجھ سکتا تھا۔ پاس سے گزرنے والا ترکش تھا۔ اس نے جواب دینے کے لیے لب ہلائے تھے مگر وہ دور جا چکا تھا۔ کچھ بھی کہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بس حقارت سے گردن جھٹک دی اور دوبارہ اپنی راہ لی۔

کچھ فاصلے پر جا کر اس کی سماعت سے سنگیت ٹکرایا تھا۔ یہ سنگیت اسی ملک کا تھا مگر اسے ان سب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ تبھی وہ لوگوں کے ہجوم کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھا۔ لوگ اس کا میوزک اور گانا سن کر اپنے پیسے لٹا رہے تھے مگر وہ ان کو سٹوپڈ کہتا ہوا آگے بڑھ دیا۔

اب وہ ایک پر رونق بازار کے عین سامنے سے گزر رہا تھا۔ جہاں لوگوں کی تعداد خریدار تھی۔ سب کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگ اور دیگر سامان تھا۔ اس نے ایک بک شاپ کے سامنے کھڑے ہو کر ایک اخبار خریدا۔ جو انگلش زبان میں تھا۔ اس کے بعد وہ تقریباً دس

منٹ تک وہاں کھڑا رہا اور اخبار کو اپنے اوورکوٹ کی جیب میں اڑیس کر دوسری کتاب دیکھتا رہا۔ شاک کیپر نے اسے ایسا کرنے سے نہ روکا کیونکہ وہ پہلے ہی ایک اخبار خرید چکا تھا اور اُس کا گمان تھا شاید کوئی کتاب پسند کر کے وہ بھی خرید لے گا مگر وہ اس کی بھول تھی۔ پورے دس منٹ بعد اس نے اپنی جیب سے اخبار نکالی اور اسے واپس اسی جگہ رکھا، جہاں سے اسے نکالا تھا۔ پھر آگے بڑھ دیا۔ شاپ کیپر کا دھیان اس کی طرف نہ گیا ورنہ ضرور اس کی وجہ دریافت کرتا۔

اب وہ ایک پبلک کیئر آفس کے عین سامنے تھا۔ وہاں لوگ اپنے پیاروں سے بات کرنے آیا کرتے تھے۔ اس نے بھی ایک جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور ریسیپشن پر بیٹھے شخص کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے بھی کوئی سوال جواب کیے وہ نمبر ملا کر کاؤنٹر نمبر ۵ پر جانے کا کہا۔ پوری شاپ کی نیٹ ورکنگ کی گئی تھی۔

وہ سبک رفتاری سے کاؤنٹر ۵ پر گیا مگر اس سے پہلے کہ وہ بات کرنے کے لیے فون اٹھاتا کال ڈسکنیکٹ کی جا چکی تھی۔ وہ دوبارہ پلٹا اور نمبر دوبارہ ملانے کا کہا۔ کال دوبارہ ملائی گئی مگر اس بار بھی اس کی سست روی نے کال سننے والے کو رابطہ منقطع کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب اس کا دوبارہ کال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ریسیپشن پر بل پے کیا اور وہاں سے پلٹ کر واپسی کی راہ لی۔ اس بار وہ برق رفتاری سے چل رہا تھا۔ چہرہ قدرے مطمئن تھا۔ جیسے کوئی خاص کام مکمل ہو گیا ہو۔

☆......☆......☆

کچھ کہوں، کچھ سنوں، ذرا ٹھہرو

ابھی زندوں میں ہوں، ذرا ٹھہرو

عالمگیر ہاؤس میں آج شادی کا سماں تھا۔ خوب چہل پہل تھی مگر کسی کی شادی تھی اور نہ کوئی تہوار تھا بلکہ آج اریب اپنی فیملی کے ساتھ آئندہ کے کچھ سالوں کے لیے انڈونیشیا شفٹ ہونے جا رہا تھا۔ اسی سلسلے میں آج رات گرینڈ ڈنر کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جو جبیں اور عکاس نے مل کر کیا تھا۔ آج کی رات صرف اریب نے ہی گھر چھوڑ کر نہیں جانا تھا بلکہ جبیں نے بھی اپنے پیا کے سنگ اپنے گھر چلے جانا تھا۔ وہ بھی اریب کو الوداع کرنے یہاں آئی تھی۔ پھر واپس کراچی جانے کے بعد اس نے بھی دبئی کی تیاری پکڑنی تھی۔ عکاس کو جاب کے سلسلے میں آئندہ کے پانچ سال دبئی اور عرب عمارات میں گزارنے تھے، اسی لیے اس نے جبیں کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کا پروگرام بنایا تھا کیونکہ بیوی کا اصل مقام شوہر کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ جہاں شوہر ہو، بیوی کے رہنے کی بھی اصل جگہ وہی ہے۔

سب کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے۔ بچوں کی بھی خوب چہل پہل تھی۔

”آرام سے بچو...... یہ کچن ہے۔ یہاں کھیلنا اچھی بات نہیں۔“ جبیں نے اپنے گرد منڈلاتے ہوئے نور، مبین، کشش اور شاداب کو کہا تھا۔

"ماما جان......شاداب بھیا ہمیں پکڑ رہے ہیں۔" نور نے بھاگتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹا......باہر جا کر کھیلو۔ کچن میں کھیلتے ہوئے کوئی چیز آپ کے لگ جائے گی۔" اس نے سب کو مخاطب کیا تھا۔

"باہر چھوٹی ماں ڈائننگ ٹیبل پر چیزیں رکھ رہی ہیں۔" کشش نے کہا تھا۔

"تو آپ سب لاؤنج میں جا کر کھیلو۔" اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بچے وہاں سے چل دیے۔

"ماریہ ذرا تم کچن سنبھالو میں ذرا ہانیہ بھابھی کی ڈائننگ ٹیبل پر مدد کروں۔" یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دی۔ ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بھابھی......میں کچھ مدد کروں؟" جبیں نے ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں یہاں کا کام تو میں نے سمیٹ لیا۔ تم ایسا کرو حاعفہ کی مدد کر دو۔ وہ پیکنگ کر رہی ہے۔ اُس کو شاید ضرورت ہو۔" اس نے تقریباً اپنا کام مکمل کر ہی لیا تھا۔ تب ہی حاعفہ کا ہاتھ بٹانے کو کہا۔

"حاعفہ بھابھی سے تو میں نے پہلے بھی پوچھا تھا مگر انہوں نے کہا کہ وہ پیکنگ کر لیں گی۔" جبیں اب صوفے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"ایک تو حاعفہ بھی ناں......سارے کام خود ہی کرتی ہے۔" ہانیہ نے دھیرے سے گردن ہلائی تھی۔

"بالکل آپ کی طرح......جیسے آپ مجھے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ اگر میں زبردستی کچن کا کام نہ لیتی تو آپ نے تو میرے ساتھ مہمانوں والا سلوک برتنا تھا اور کچن میں جانا تو درکنار اس کے گرد بھی منڈلانے نہیں دیتیں مجھے۔" اس بات پر وہ مسکرا دی۔

"آخر مہمان تو ہو تم۔" ہانیہ نے کہا تھا۔

"اور آپ بھی مہمان ہیں۔ یہ مت بھولیں۔" جبیں نے جملے کی تصیح کرائی تھی۔

"بالکل......آپ دونوں ہی مہمان ہیں۔ میزبان تو ہم ہیں جو آرام کر رہے ہیں۔" صبا کمرے سے ابھی آئی تھی۔ اس کے سر میں درد تھا۔ جس بنا پر اسے کسی کام کو بھی ہاتھ لگانے سے منع کر دیا گیا تھا۔

"اپنے گھر میں کوئی مہمان نہیں ہوتا اور کوئی میزبان نہیں ہوتا بھابھی۔" ہانیہ نے کہا تھا۔

"تو پھر آپ سب میرے ساتھ کیوں مہمانوں والا سلوک کرتی ہیں؟" جبیں نے ابرو اچکائے تھے۔

"وہ اس لیے کہ بیٹیاں شادیوں کے بعد اپنے میکے میں مہمان ہی ہوا کرتی ہیں۔" حاعفہ نے زینے سے اترتے ہوئے کہا تھا۔

"واہ......ساری بہوئیں ایک طرف اور نند بے چاری ایک طرف......اللہ کتنے ستم کیے جا رہے ہیں مجھ بے چاری نند پر۔" اس نے ایک انداز سے اپنے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ جس پر سب ہنس دیں۔

''ماما جان یہ ستم کیا ہوتا ہے؟'' نور نے کھیلتے ہوئے جبیں کے پاس آ کر پوچھا تھا۔

''کچھ نہیں بیٹا! آپ جا کر کھیلو۔'' ہنستے ہوئے اس نے نور کو ٹالا تھا۔

''یہ ماما جان اور بابا جان کہاں ہیں؟'' صبا نے پوچھا تھا۔

''ہم یہاں ہیں۔'' وہ سعدی اور ضارف کے ساتھ آئے تھے۔

''ہم اپنے دونوں پوتوں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔'' سعدی نے جہانزیب کا جبکہ ضارف نے سحر فاطمہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا۔

''واہ......صرف اپنے پوتوں کا خیال ہے۔اپنی نواسی کا نہیں۔'' جبیں نے شکوہ کیا۔

''تمہاری بیٹی بھی تو تمہاری جیسی ہے۔ایک جگہ ٹکے تو تب ہی۔میرے یہ دونوں پوتے تو اپنے اپنے باپ پر گئے ہیں۔ضارف تو بالکل اریب کی طرح ہے۔اس کو دیکھتے ہی اُس کا بچپن یاد آ جاتا ہے۔'' سحر فاطمہ نے کہا تھا۔

''اور میں چھوٹی ماں کی طرح۔'' کشش بھاگتے ہوئے ہانیہ کے پاس آئی تھی۔

''ہاں ہاں بالکل۔'' ہنستے ہوئے سحر فاطمہ نے کہا تھا۔

''میں بھی بابا کی طرح لگتا ہوں۔ ہیں ناں بڑی ماں۔'' شاداب نے حاعفہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔جس پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا آپ سب بچے جا کر کھیلو۔جب سب کے بابا جان آ جائیں تو کھانا کھائیں گے۔ٹھیک ہے؟'' جہانزیب نے کہا تو سب لاؤنج میں صوفے کے گرد منڈلانے لگے۔سعدی اور ضارف بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

باقی ڈائنگ ٹیبل پر بیٹھ کر حسام،اریب اور عکاس کا انتظار کر رہے تھے۔جو ابھی تک بازار سے لوٹ کر نہ آئے تھے۔

''ابھی تک آئے نہیں وہ۔'' حاعفہ نے کہا تھا۔

''آپ نے پکارا اور ہم چلے آئے۔'' یہ اریب کی آواز تھی۔جو ایک ادا سے بانہیں پھیلائے چوکھٹ کے پار کھڑا تھا۔اس انداز کو دیکھ کر سب مسکرا دیئے۔

''بابا جان......!'' اریب کو دیکھتے ہی کشش،شاداب اور ضارف اریب کی طرف دوڑے۔مبین اور سعدی بھی حسام کے ہاتھوں میں موجود سامان اندر لانے کے لی اٹھ کھڑے ہوئے۔ایسے میں بھلا نور کہاں پیچھے رہ سکتی تھی؟ وہ بھی عکاس کے گلے جا لگی تھی۔

''بچو! انہیں اندر تو آنے دو۔آتے ہی حملہ کر دیا تم سب نے تو۔'' ہانیہ نے آگے بڑھ کر بچوں کو پیچھے کرنا چاہا۔

''اسے حملہ کرنا نہیں بلکہ پیار کرنا کہتے ہیں۔'' اریب نے منہ چڑھا کر کہا تھا۔

''آپ کو پتا ہے بچو،آپ کی چھوٹی ماما ہم سے جیلس ہو رہی ہیں کہ آپ ان سے زیادہ ہم سے پیار کرتے ہیں۔'' اریب نے

سرگوشی والے لہجے میں گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

"جی نہیں...... ہم جیلس نہیں ہوتے۔" ابھی تک اس کا انداز ویسا تھا۔ سب ہنس دیئے۔

"چلو بیٹا! آپ سب جا کر کھیلو اور یہ کھلونے آپس میں بانٹ لو۔ ہم فریش ہو کر آپس میں باتیں کرتے ہیں ٹھیک ہے؟" حسام نے بچوں سے کہا تو انہوں نے سر ہلا دیا اور وہ وہاں سے چل دیئے۔

اریب، حسام اور عکاس سب کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھے اور ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ مزید ار ڈشز جو جبیں، ہانیہ اور ماریہ نے مل کر بنائی تھی۔ نوش فرمائی گئیں۔ کھانے کے بعد بھی کافی دیر تک وہ محو گفتگو رہے۔ گذشتہ برسوں کو ایک رات میں دہرایا گیا۔ کھٹی میٹھی یادیں، سب کے چہروں پر مسکراہٹ کا سبب بنی تھیں۔

"اور آپ کو یاد ہے جب بچے ہانیہ اور حاعفہ میں کنفیوز ہو گئے تھے تو کیا بنا تھا۔ کشش ہانیہ کو ماما جان کہتی تھی جبکہ شاداب اور ضارف حاعفہ کو اور جب بابا کا پوچھا جاتا تو اریب کا نام لیتے۔" حسام کا نے پرانی یادوں میں سے ایک یاد کا تذکرہ کیا تھا۔

"اور یاد ہے اُس وقت ضارف نے کہا تھا کہ ہمارے بابا ایک ہیں تو ماما ایک کیوں نہیں؟" جبیں نے ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تو اس کا حل بھی تو میں نے نکال لیا تھا ناں...... ہانیہ چھوٹی ماما جان اور حاعفہ بڑی ماما جان۔" اریب نے ابرو اچکاتے ہوئے کہا۔

"میں اتنی بھی بڑی نہیں ہوں جناب...... جو مجھے بڑی ماما بنا دیا۔" حاعفہ نے منہ بگاڑ کر کہا تھا۔

"شادی تو آپ کی پہلے ہوئی تھی ناں اریب کے ساتھ تو اس ناتے سے ہوئی ناں بچوں کی بڑی ماما۔" ہانیہ نے فی الفور جواب دیا۔ سب اس حسین پر مسکرا دیئے تھے۔

وقت لمحہ گزرتا گیا اور کافی دیر تک وہ اسی طرح پرانی یادوں کا تذکرہ کرتے گئے۔ جب وقت کی طرف دھیان گیا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔

"یہ کیا صرف چار گھنٹے رہ گئے فلائیٹ میں۔" اریب نے متجل انداز میں کہا تھا۔ سب ایک دم سے چوکنا ہو گئے۔

"صرف چار گھنٹے؟ جلدیں کریں پھر آپ۔" عکاس اور جبیں نے برجستہ کہا تھا۔ جہانزیب اور سحر فاطمہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

بھاگ دوڑ میں سب کام کیے گئے۔ پیکنگ تو پہلے ہو چکی تھی۔ بیگ کو نیچے لایا گیا اور پھر آخری وقت قریب آ گیا۔

بچے بچوں سے دعا سلام لے رہے تھے اور بڑے بڑوں سے۔

"کاش تم یہیں رہتے۔" سحر فاطمہ نے افسردہ لہجے میں کہا تھا۔

"ماما جان...... دل تو میرا بھی نہیں کر رہا مگر بزنس کو ٹرانسفر کرنے میں وقت تو درکار ہے ناں اور پھر میں کوئی ہمیشہ کے لیے جا

رہا ہوں بس پانچ سال کی تو بات ہے۔ پھر ہم سب دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔'' اریب نے ان کا حوصلہ باندھا تھا۔

''تم سب کے بغیر گھر کتنا سونا ہو جائے گا۔'' صبا کے چہرے پر بھی تاسف تھا۔

''اب بھلا اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے تو کہا تھا کہ میں اکیلا چلا جاتا ہوں مگر بابا جان نے ہی کہا کہ پوری فیملی کو لے کر جاؤں۔'' اریب نے کہا تھا۔

''بالکل...... جہاں شوہر ہوتا ہے۔ وہیں اس کی بیویاں۔'' جہانزیب نے کہا تھا۔

''اور کیا...... تمہارا کیا بھروسہ وہاں جا کر تیسری بیاہ لاؤ۔'' عکاس نے پھلجڑی چھوڑی تھی۔ سب مسکرا دیے۔

''ویسے خیال اچھا ہے۔'' اریب نے خوشی سے پھیلتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسا سوچنا بھی مت۔'' حاعفہ اور ہانیہ یکجا ہو کر بولی تھیں۔

''اللہ......! دونوں میں اتنا اتحاد؟ اللہ بچائے مجھے۔'' اریب نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''اسی لیے ان دونوں کو تمہارے ساتھ بھیج رہے ہیں ہم۔ اس کا اچھے سے خیال رکھنا ہے تم دونوں نے۔'' سحر فاطمہ نے دونوں کو نصیحت کی تھی۔

''آپ تو فکر ہی نہ کریں ماما جان۔ اچھے سے خیال رکھیں گی ان کا۔ کیوں ہانیہ؟'' حاعفہ نے کہا تھا جس پر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اُفف...... پتا نہیں اب کیا ہوگا میرا پرائے دیار میں؟'' حسرت بھرے لہجے میں اس نے اپنے آپ پر افسوس کیا تھا۔

''بابا جان ہم پرائے دیار جا رہے ہیں؟ لیکن آپ نے تو کہا تھا ہم انڈونیشیا جا رہے ہیں۔'' کشش نے معصومانہ لہجے میں کہا تو سب کے چہرے پر ہنسی امڈ آئی۔ اریب نے اسے اپنی گود میں لیا۔

''بیٹا جی! ہم پرائے دیار میں ہی جا رہے ہیں۔ انڈونیشیا پرایا ہی ہے ہمارے لیے۔'' اس نے تصیح کرائی تھی۔

''اچھا اب تمہیں چلنا چاہیے ورنہ دیر ہو جائے گی۔'' حسام نے رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اچھا ماما جان...... اب اجازت دیں۔'' ہانیہ اور حاعفہ سحر فاطمہ سے گلے لگ رہی تھیں۔ اریب نے بھی عکاس اور حسام کو الوداع کہا۔ ضارف کے ہاتھ میں اریب کا فون تھا جو رنگ کرنے لگا۔

''بابا جان کسی کا فون آ رہا ہے۔'' ضارف نے کہا تھا۔

''ریسیو کر کے پوچھو کون ہے؟'' اریب کے کہنے پر اس نے کال ریسیو کی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ فقط خاموشی تھی۔ دو سے تین بار اس نے سلام کیا مگر یہ تسلسل نہ ٹوٹا پھر اس نے کال خود ہی ڈسکنیکٹ کر دی۔ کچھ لمحوں بعد دوبارہ رنگ ہوئی تو اس نے دوبارہ کال ریسیو کی مگر

وہی دستور قائم رہا۔کوئی جواب نہ آیا۔اس بار ضارف نے غصے میں پہلی بار سلام کرنے کے بعد ہی کال کاٹ دی تھی۔

''کس کا فون تھا بیٹا؟''اریب نے پوچھا تھا۔

''پتا نہیں بابا جان۔بلینک کال تھی کوئی۔''اس نے مختصر کہا،جس پر اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا اور باقیوں سے سلام دیا میں مصروف ہو گیا۔

''کافی دور جا رہی ہو۔بھولنا مت ہمیں۔''جبیں نے کشش سے کہا تھا۔

''نہیں پھپھو جان۔میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''اس نے معصومانہ لہجے میں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔

''گڈ گرل۔''اس کی ناک کو ذرا سا بھینچا۔

حسام نے بیگ پکڑے اور کار کی طرف چل دیا۔اریب بھی جہانزیب کے گلے لگ گیا۔

''اچھا بابا جان......!اب میں چلتا ہوں۔''سلام دعا لینے کے بعد وہ اب دہلیز پر کھڑے تھے۔کشش جو سب سے چھوٹی تھی،اس وقت اریب کی گود میں تھی۔جبکہ ضارف نے اریب کا موبائل سنبھالا ہوا تھا اور شاداب نے حاعفہ کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

''اپنا خیال رکھنا اور وہاں پہنچ کر فون ضرور کرنا۔''سحر فاطمہ کی آنکھوں میں اشک امڈ آئے اور دل بھی ویران سا ہو گیا مگر جانا ضروری تھا۔صرف پانچ سال کی دوری تھی۔اس کے بعد یہ خاندان مکمل ہو جانا تھا۔اس لیے وہ خاموش تھیں۔بچوں نے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا۔اریب،ہانیہ اور حاعفہ سمیت گیراج کی طرف پلٹا۔جہاں حسام مسلسل آوازیں دے رہا تھا۔

''آ رہے ہیں بھائی جان......ذرا صبر کریں۔''اریب نے اونچی آواز میں کہا تھا اور کشش کے سے سرگوشی کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔

☆......☆......☆

زندگی کی دھوپ میں مرجھا گیا میرا شباب

اب بہار آئی تو کیا،ابر بہار آیا تو کیا

وہ اس وقت ایک میدان کے کنارے پر تھا۔وہ فٹ بال گراؤنڈ تھا۔جہاں دو ٹیموں کے درمیان مقابلہ جاری تھا۔ایک ٹیم کی یونیفارم پیلے رنگ تھی جبکہ دوسرے کی سرخ رنگ کی۔دونوں کا سکور فی الوقت زیرو تھا۔اس نے گہری نگاہ سکور بورڈ پر ڈالی اور پھر میدان کے اس حصے کی طرف چل دیا جہاں بالکل خاموشی تھی۔جہاں سے پورے میدان کا جائزہ تو با آسانی لیا جا سکتا تھا مگر کومنٹری کی آواز سنائی دے سکتی تھی کیونکہ عوام کے کم ہونے کے باعث وہاں سپیکر کا انتظام نہیں کیا گیا۔

''وہ ایک سیڑھی پر جا بیٹھا۔آج بھی وہ اوور کوٹ میں تھا۔بس سیاہ رنگ کی جینز اور شرٹ کی تبدیلی تھی۔وہ کچھ دیر یونہی دیکھتا رہا۔

ایک کھلاڑی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کرر ہا تھا۔اس کے لب مسکرائے مگر اس مسکراہٹ کا سبب کچھ اور تھا۔اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو وقت ہو چکا تھا۔یہاں سے جانے کا نہیں بلکہ فون کرنے کا۔اس نے اوور کوٹ سے ایک موبائل نکالا اور ایک غیر ملکی نمبر ملایا۔جو بند جا رہا تھا۔

''بہت خوب۔''لوگ کال نہ ملنے پر اکثر افسردہ ہوتے ہیں مگر وہ مسکرا رہا تھا۔جیسے اس کا کام مکمل ہو چکا ہو۔

''ویلکم ٹو مائے ہوم......مائے کنٹری......مائے انڈونیشیا......مائے ڈیپا سار''اس نے لبوں پر عجب مسکراہٹ کو بکھیرا تھا۔

اسے اب اس میچ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔تبھی ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور باہر میدان کے دوسرے کنارے چل دیا۔جو بظاہر میدان کا ہی حصہ تھا مگر وہاں نہ کوئی کھلاڑی تھا اور نہ ہی کوئی تماشائی۔

''برسوں کا انتظار ختم ہونے جا رہا ہے میرا۔میرا دشمن خود میرے پاس چل کر آ رہا ہے۔''وہ استہزائیہ انداز میں کہہ رہا تھا۔نہ کوئی وجود تھا نہ کوئی انسان جس سے یہ مخاطب تھا۔

''جس نے مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا۔اُس کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ خوش رہے۔تمام تر حساب چکانے کا وقت اب آ چکا ہے۔میری محرومیوں کا سبب بننے والا اب خود بہت جلد محروم ہونے جا رہا ہے۔''وہ استہزائیہ ہنسا تھا۔قہقہے میں عجب کشش تھی۔ایک تاسف......ایک محرومی کا اثر نمایاں تھا۔

''مسٹر اریب عالمگیر......میں انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔تمہارے بیٹے ضارف کا۔''اس نے چہرہ آسمان کی طرف بلند کیا۔ہوا کا جھونکا آیا اور اس کے بال ہوا کے سنگ لہرانے لگے۔وہ دونوں بانہیں پھیلائے اب پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔تبھی آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔وہ نمی جن کو پونچھنے والا کوئی نہ تھا۔جن کا سبب جاننے والا کوئی نہ تھا۔

''جس طرح تمہاری وجہ سے میرے بابا جان،میری ماما جان میرے ساتھ نہیں ہیں۔بالکل اسی طرح میں تم سے تمہارے بچے ضارف کو چھین لوں گا۔میرے بابا جان ابدال نے تمہاری خاطر اپنی جان قربان کر دی۔تمہاری خاطر میری ماما جان میرے بابا جان سے دور رہیں۔تمہاری وجہ سے میں اپنے والدین سے دور رہا۔تمہاری وجہ سے میں نے اپنا بچپن کھو دیا۔تمہاری وجہ سے ہر جگہ مجھے دھدکارا گیا۔تمہاری وجہ سے میں یتیم بنا۔اب میں قرضہ چکانے کا وقت آ چکا ہے۔''اس نے نمی کو اپنے بائیں ہاتھ کی پشت سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں عاطی......تمہارا بھتیجا مگر تم نے مجھے کبھی اپنا بھتیجا نہیں سمجھا۔اگر سمجھا ہوتا تو مجھے ڈھونڈتے۔ڈھونڈتے سے کیا کچھ نہیں مل جاتا؟میں نے بھی تو تمہیں ڈھونڈ نکالا ہے۔بس تڑپ ہونی چاہیے۔جیسے مجھ میں ہے۔تم سے بدلہ لینے کی تڑپ''وہ چلایا تھا۔

ایک لمحہ کے لیے اس نے اپنے اوپر پرندوں کو دیکھا جو سب سے بے نیاز اپنی اپنی منزلوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔اس کا ہاتھ خود بخود کوٹ کی طرف گیا۔جہاں کچھ اس کے ہاتھ لگا تھا۔اسے باہر نکالا تو وہاں ایک تصویر تھی۔

''تو یہ ہیں میرے ٹارگٹ......!!''وہاں ایک تصویر تھی۔جس میں دو شخص تھے۔ایک اریب اور دوسرا اس کا بیٹا ضارف۔جس کو

سیاہی سے سرکل کیا گیا تھا۔

"جیسے کان کے بدلے کان...... آنکھ کے بدلے آنکھ...... ہاتھ کے بدلے ہاتھ...... بالکل اسی طرح بیٹے کے بدلے بیٹا اور باپ کے بدلے باپ۔" اس نے حقارت کے ساتھ کہا تھا۔

"چھین لوں گا تمہارا بیٹا تا کہ تمہیں بھی علم ہو کہ جب کسی سے کوئی اپنا چھینا جاتا ہے تو کتنا درد ہوتا ہے۔ کتنی تکلیف پہنچتی ہے؟" اس کا لہجہ گلوگیر تھا۔

ایک لمحہ کے لیے توقف کیا گیا تھا۔

"تم کیا سمجھے تھے سب کچھ ختم ہو گیا؟ نہیں...... گزرا وقت دوبارہ لوٹ آیا ہے۔ بلینک کالز کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوگا۔ وہ کہانی دوبارہ شروع ہوگی، جسے تم بھول چکے ہو مسٹر اریب عالمگیر۔ سب کچھ وہیں سے شروع ہوگا۔ جہاں سے تسلسل ٹوٹا تھا کیونکہ محاذ ابھی جاری ہے۔"